بھید 2

ایم اے راحت

''ارے واہ۔'' کامران نے قہقہہ لگایا۔ ''بڑے مزے کی کہانی ہے تمہاری۔ رام چرن چلو اب مجھے راستہ بتادو۔''

''سیدھا راستہ ہے سرکار۔'' آگے چل کر سوکھے صنوبر کے جنگل ملیں گے انہیں پار کریں گے تو جھیل کنارے پہنچ جائیں گے۔ مگر سرکار ایک بات آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ بائیں ہاتھ کی سمت نہ جائیں۔ وہ جگہ اچھی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے شکریہ۔ اب میں چلتا ہوں۔''

''سرکار ہمارے ساتھ کچھ جل پانی اچھا ٹھہرو۔'' اور اس کے بعد رام چرن نے اسے ایک بہت مزے کی چیز کھلائی۔ کامران کو وہ چیز بڑی پسند آئی تھی اور اس نے پوچھا۔

''رام چرن یہ کیا ہے۔''

''سرکار پنیر اور مولیاں ہیں ہم لوگ یہاں یہ بناتے ہیں۔''

''بہت اچھی ہیں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

کامران نے کہا اور پھر وہ وہاں سے آگے چل پڑا۔ رام چرن کی باتیں بڑی مزے دار تھیں اور اب وہ اس کہانی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایسی لاتعداد کہانیاں ہر جگہ بکھری ہوتی ہیں۔ آخر کار یہ فاصلہ طے ہوگیا تھا اور وہ جھیل ایم سن پہنچ گیا۔ یہ جھیل...... تقریباً ایک میل چوڑی اور نہ جانے کتنی گہری تھی۔ آس پاس کے مناظر دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس کے آس پاس کوئی تند دریا بھی ہوگا اور کسی زلزلے نے چٹانی تودوں سے اس دریا کا راستہ بند کردیا ہوگا۔ جس کی وجہ سے یہ جھیل وجود میں آئی۔ ایک خانقاہ کے علاوہ یہاں اور کوئی آبادی نہیں تھی اور اسی خانقاہ کا حوالہ سیتا نے دیا تھا۔ اندھیرا شدید ہوتا جارہا تھا اور آس پاس کے مناظر اس میں ڈوب چکے تھے۔ کامران نے سوچا کہ اب اسے خانقاہ کے پاس تیزی سے پہنچ جانا چاہیے۔ اجنبی راستے پر نہ جانے کس جگہ...... کون سا خطرہ منتظر ہو۔ چنانچہ اس کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے اور وہ خانقاہ کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے ایک جگہ منتخب کی۔ اور وہاں جا کر بیٹھ گیا اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ نہ جانے کیسی کیسی ہولناک آوازیں ابھر رہی تھیں۔ واقعی بڑی خوفناک جگہ تھی یہ۔ خانقاہ کے

بارے میں بھی کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کوئی ہے یا نہیں۔ اس پراسرار اور ہیبت ناک ماحول میں عجیب وغریب خیالات ذہن میں آرہے تھے۔ رام چرن کی کہانیاں بھی ذہن میں آرہی تھیں۔ اور سیلاب کی آواز کانوں میں ابھر رہی تھی۔ وقت تھا کہ گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ دفعتاً کسی طرف سے روشنی سی محسوس ہوئی اور کامران اچھل پڑا اس نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ روشنی کا یہ احساس اس کا وہم نہیں تھا۔

خانقاہ میں کوئی چراغ روشن ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی اندر موجود ہے۔ حالانکہ اتنی دیر یہاں گزر چکی تھی اور ہلکی سی سانسوں کی آہٹ تک نہیں ابھری تھی۔ چند لمحات وہ سوچتا رہا۔ پھر اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ خانقاہ کے بوسیدہ دروازے سے کوئی برآمد ہوا اور کامران اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

بدھ بھکشو کے لباس میں ایک طویل القامت سایہ برآمد ہوا تھا۔ ابھی وہ اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کے پیچھے پیچھے یکے بعد دیگرے کئی سائے باہر نکل آئے وہ سب بدھ بھکشوؤں کے لباس میں تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں یہ لوگ کامران کو انتہائی پراسرار لگ رہے تھے۔ وہ ایک قطار بنائے ہوئے آگے بڑھنے لگے اور خانقاہ کے بائیں سمت کے دالان میں اتر گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ مشینی انسان ہوں۔ کامران تو یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور سیتا کسی نئے عمل کا اظہار کرے گی۔ بہرحال کامران دھڑکتے دل کے ساتھ انہیں دیکھتا رہا۔ دالان میں اتر کر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ خانقاہ کا چراغ اب بھی روشن تھا۔ چاند آہستہ آہستہ نکلتا آرہا تھا اور ماحول کی پراسراریت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ چاندنی چاروں طرف پھیل گئی۔ گھڑی کی سوئیوں نے رات کے دس بجائے تو کامران اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ہمت کر کے خانقاہ کے دروازے پر آ گیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سیتا کہاں سے آئے گی۔ کیا اس ہولناک رات میں وہ یہیں سے نمودار ہو گی۔ خانقاہ کے دروازے کے پاس پہنچا تو چاندنی میں اس نے سیتا کو کھڑے دیکھا۔ دل دہل کر رہ گیا تھا سیتا ایک پراسرار کردار ایک زندہ وجود۔ لیکن جس کے بارے میں ابھی تک کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ کامران کی نگاہیں گرشک کی تلاش میں بھٹکنے لگیں۔ لیکن گرشک آس پاس نظر نہیں آرہا تھا۔ سیتا چند قدم آگے بڑھی اور اس نے دونوں ہاتھ سامنے کر کے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

”پدم ماترا...... پدم ماترا پاتال پربھو پاتال پربھو۔“

”سیتا میں بہت دیر سے یہاں موجود ہوں۔“

”ہاں آجاؤ اندر آجاؤ۔ باہر کی فضا ٹھیک نہیں ہے۔ آؤ۔“

اس نے کہا...... اور ایک بار پھر ہاتھ کے اشارے سے کامران کو تعظیم دی۔ کامران نے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”فضا ٹھیک نہیں ہے سے تمہاری کیا مراد ہے۔“

”کچھ لوگ سائے کی طرح ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور یہ لوگ ہمارے دوست نہیں ہیں۔“

”اوہ۔ ابھی ابھی اس خانقاہ سے کئی افراد باہر نکلے ہیں۔“

”ہاں مجھے معلوم ہے اس نے کہا اور دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ خانقاہ میں بدن ٹھٹھرا دینے

والی سردی تھی جب کہ باہر بالکل سردی نہیں تھی یا پھر خوف کا احساس تھا جو کامران کے وجود میں جاگزیں تھا۔ خانقاہ باہر سے تو چھوٹی نظر آتی تھی لیکن اندر سے اتنی چھوٹی نہیں تھی جس راہداری سے وہ گزر رہے تھے وہ انتہائی طویل تھی۔ یہاں تک کہ اس کا اختتام ہوا اور وہ ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ کامران اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کمرا خالی تھا۔ فرش اور ننگی دیواریں اور بس لیکن ایک دیوار کے پاس جا کر سیتا نے کچھ ٹٹولا تھا۔ پھر کھٹکنے کی آواز سنائی دی اور تیز روشنی سے کمرا منور ہو گیا۔“

”آؤ۔“ سیتا نے کہا۔ یہ کسی تہ خانے کی سیڑھیاں تھیں۔ کئی سیڑھیاں طے کر کے کامران نیچے پہنچا۔ یہاں دیواروں میں تین مشعلیں روشن تھیں اور یہاں اوپر کی نسبت خاصی تیز روشنی تھی۔ اس روشنی میں ایک شخص ہرن کے مرگ چھالے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے جسم پر سیاہ لباس تھا۔ بڑی عجیب سی شخصیت تھی اس کی...... سیتا کے منہ سے نکلا۔

”اکال ستو...... اکال ستو...... اکال ستو یہ راکان ہونزا ہے کامران کے حواس پر بجلی سی گری تھی۔ راکان ہونزا جس کی تلاش امینہ سلفا کو تھی تاریخ کی اس عورت کو جس کی شخصیت نہ جانے کیا تھی۔ اس وقت سیاہ کفن میں لپٹے ہوئے شخص نے پہلو بدلا اور صاف ستھری انگریزی میں بولا۔

”تمہارا نام کامران ہے؟“

”ہاں“

”سیتا نے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ تم پاتال پرمتی ہو۔“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا مسٹر راکان ہونزا۔“

آپ کو انگریزی بولتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ کم از کم میں آپ سے اپنے دل کی تمام باتیں کر سکتا ہوں۔“

”ہاں ضرور آؤ بیٹھو۔“ اس نے دوستانہ انداز میں کہا اور کامران اس کے نزدیک آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا پھر اس نے کہا۔

”پہلے مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتایئے۔ مسٹر راکان ہونزا جو ابھی اس خانقاہ سے باہر نکل گئے ہیں۔“

”وہ...... کچھ نہیں کہا جا سکتا۔“

”ابھی سیتا نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ دشمن تھے۔“

”ہاں یہ لوگ دشمن ہی تھے یہ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ شاید اناطوسیہ کے لئے۔ اناطوسیہ وہ ہے جسے تمہارے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ بہت لمبا چکر چل رہا ہے بہت ہی لمبا چکر ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ بدھ مت کی تاریخ میں ایسے مشکل حالات کبھی نہیں آئے ہوں گے۔“

”آخر یہ لوگ کیا چاہتے تھے؟“

”شاید انہیں تمہارے ذریعے مجھے شکار کرنا تھا۔“

”میرے ذریعے؟“

''ہاں۔''

''میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں کامران! یہ لوگ تمہیں پاتال پرمتی پربھو کہتے ہیں میں تمہیں ابھی احترام کا وہ درجہ دینے سے گریز کروں گا جو دیوتاؤں کو دیا جاتا ہے اگر تم ہمارے دیوتا ہی نکلے اور وقت تمہارے دماغ میں سوگیا ہے تو اس وقت ہم تمہارا وہ احترام کریں گے۔ جب تم جاگو گے۔ یہی بات میں نے گرشک کو بھی بتائی تھی اور یہی سیتا کو بھی اور دوسروں کو بھی۔ وہ جو پاتال کی گہرائیوں میں اس کے منتظر ہیں جو سونے والوں کو جگا دے گا اور آبادیوں کو زندگی دے گا۔ اگر وہ تمہاری ہی شکل میں ہے تو ہم تمہارا تحفظ بالکل صحیح کررہے ہیں۔ ویسے بھی اپنے بارے میں بتاؤں کہ ابھی ہم سب لوگ مصیبت زدہ ہیں اور کسی کو پوری تفصیل نہیں بتا سکتے۔ ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر ہم تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتائیں گے تو تم اسے سمجھ نہیں پاؤ گے اور الجھ جاؤ گے کے اور ہمیں جھوٹا سمجھو گے اس لئے ہمارے بارے میں سب کچھ جاننے کی کوششیں نہیں کرنا ابھی ہمیں صرف تمہاری مدد کی ضرورت ہے ایک اچھے انسان کی حیثیت ہی سے سہی۔ سمجھ رہے ہونا۔ ویسے ایک بات بتاؤ کامران' کہ تم اس خزانے سے دلچسپی رکھتے ہو جس کی کہانی ان سب کے ذہنوں میں ہے۔ کامران نے کیونکہ اپنے اندر نمایاں تبدیلی پیدا کی تھی اور اپنی سوچ کا انداز بدلا تھا۔ چنانچہ اس نے کہا۔

''ہاں کیوں نہیں' کیونکہ میں بھی اسی دنیا کا انسان ہوں اور خزانے زندگی گزارنے میں بڑے معاون ثابت ہوا کرتے ہیں۔''

''اور اگر میں تم سے وعدہ کرلوں کہ میں تمہیں اتنا بڑا خزانہ دوں گا کہ تمہاری نسلیں تک اسے نہ ختم کرسکیں تو کیا تم اس بات کا یقین کرلو گے۔''

''میں اپنے ضمیر کے خلاف کوئی کام نہیں کرسکتا۔ دولت بے شک ایک بہت بڑی شے ہے لیکن میں آنکھیں بند کرکے وہ خزانہ حاصل کرنے کی خواہش نہیں کروں گا جس کے عوض مجھے کچھ کام کرنا ہوگا۔ مجھے اس کام کی تفصیل ضرور معلوم ہونی چاہیے تاکہ میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرسکوں۔''

''اور اگر کام تمہارے ضمیر کے خلاف نہ ہوا تو؟'' راکان ہونزا نے سوال کیا۔

''تو اسے کرنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' کامران نے جواب دیا۔

''تم......'' راکان ہونزا ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا' پھر بولا۔

''تم ہماری امیدوں کا مرکز ہو۔ ایک ایسی عجیب وغریب مشکل پیش آگئی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ یوں سمجھ کہ ایک دھرم مشکل میں پڑگیا ہے اور ہزاروں زندہ انسان موت کی نیند سو گئے ہیں لیکن مصنوعی موت کی نیند۔ کچھ لوگوں کی محنت انہیں زندگی سے روشناس کرسکتی ہے بس یہ سمجھ لو کہ وہ کسی کے منتظر ہیں اور ایک ایسی ستی ساوتری جو اپنی محبت کا شکار ہوئی ہے۔ کسی کے لئے پاتال پرمتی میں سکون کی نیند سو رہی ہے۔ لیکن کون جانے کہ ستی پرکھنہ سکون میں ہے یا نہیں تم اس سنسار میں دھرم وستو کی شکل میں آئے ہو۔ اب یہ تو پاتال پربھو ہی جانیں کہ تمہارا مصرف کیا ہے؟ سیتا اور گرشک کہتے ہیں کہ تم وہی ہو انہیں ثبوت مل گیا ہے لیکن میرے دوست یہ ثبوت میرے لئے ناکافی ہے۔ پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ اس دنیا کے ایک انسان کی حیثیت

سے تم ہمارے دست راست بن جاؤ کیونکہ تم سے اور کچھ...... نہ سہی لیکن شکل وصورت کا ایک رشتہ ہے۔ اب یہ تو آکاش والا ہی جانے کہ اس نے یہ رشتہ کیوں قائم کیا ہے۔ بہرحال یہ ساری باتیں اپنی جگہ ہیں۔ ہم تمہیں فولاد بنا دینا چاہتے ہیں۔ تمہارے اندر لوہے کی کاٹ پیدا کردینا چاہتے ہیں تاکہ ہمارے مقصد کے لئے تم ہمارے دشمنوں سے جنگ کرسکو۔''

''ایک سوال راکان ہونزا'...... بات جب یہاں تک آگئی ہے تو میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔''

''اگر تم کچھ چھپاؤ گے ہم سے تو یقین کرو ہماری ساری محنت خاک میں مل جائے گی۔''

''ایک عورت ہے جس کے مختلف نام سامنے آئے ہیں۔''

''ہاں۔ وہ ہمارے لئے ایک بھیانک کردار ہے یوں سمجھ لو کہ تاریخ میں چھپا ہوا ایک ایسا کردار جسے ہم بھی تلاش نہیں کرسکے۔ ہم ہندو ماترا پر یقین نہیں رکھتے لیکن دو ہی باتیں ہیں اناطوسیہ یا تو بار بار جنم لیتی رہی ہے اور اگر نہیں تو اس نے ایک لمبی عمر پالی ہے اور اس کا طریقہ صرف وہی جانتی ہے کہ کیسے لیکن وہ ایک تاریخی کردار ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ ہماری تلاش میں سرگرداں ہے'' کامران کے ذہن میں ایک چھنا کا سا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

''تو کیا تم یہ جانتے ہو راکان ہونزا کہ وہ میرے ذریعے تمہیں تلاش کررہی ہے۔''

''ہم اس سے بھی زیادہ جانتے ہیں۔ اگر نہ جانتے تو اتنی رازداری نہ برتی جاتی۔''

''ٹھیک ہے' اب میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میں تمہارے لئے کام کرنے کو تیار ہوں۔ ویسے اگر مجھے اتنا سا اور پتا چل جاتا کہ اناطوسیہ یا موجودہ امینہ سلفا تمہاری تلاش میں کیوں ہے تو مجھے آسانی ہوجاتی۔''

''وہ میرے ذریعے گرشک تک پہنچنا چاہتی ہے۔ گرشک پوشیدہ نہیں ہے وہ ہمارے اس مشن کا اہم ترین کارکن ہے اور تم یوں سمجھ لو کہ ہمارے لئے عظیم ترین کارنامے سرانجام دے رہا ہے۔ گرشک کے بارے میں تم یہ سمجھ لو کہ ہم نے اسے خود چھپایا ہوا ہے تاکہ وہ اناطوسیہ کے ہاتھ نہ لگ جائے بہرحال ساری باتیں اپنی جگہ ہیں۔ تمہارے اس اقرار سے مجھے خوشی ہوئی اور یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم ایک بڑے انسان ہو۔ سچ بولنے والے سچ کے پجاری۔''

''شکریہ''

''سیتا میں پورے اعتماد کے ساتھ اس شخص کو تمہارے حوالے کررہا ہوں اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہمارے آگے کے اقدامات کیا ہیں؟'' سیتا نے ایک ہاتھ سینے پر لپیٹا آدھی جھکی اور سیدھی کھڑی ہوگئی اور اس کے بعد وہ کامران کی جانب دیکھ کر مسکرائی۔

''خوشی تو اس بات کی ہے کہ وقت نے مجھے تمہاری قربت کا موقع دیا۔'' یہ الفاظ ادا کرنے کے بعد وہ ایک دم چونک سی پڑی جیسے اسے اس بات کا احساس ہوگیا ہو کہ یہ الفاظ ذرا الگ ہی نوعیت کے حامل ہیں اور انہیں ادا کرتے ہوئے تھوڑی سی احتیاط برتنی چاہیے تھی۔ اس کے بعد سیتا اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرکے چل پڑی اور خاصا طویل سفر طے کرنے کے بعد غاروں کے ایک ایسے سلسلے کے پاس پہنچ گئی جو اس سے پہلے کامران کی نگاہوں میں نہیں آسکا تھا۔

''واہ یہ تو اچھی جگہ ہے غالباً تم پہلے سے...... یہاں سے واقف تھیں کیا گرشک یہیں ہے۔'' سیتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک لمحے کے لئے رک کر کامران کی طرف دیکھا پھر سنجیدگی سے بولی۔

''آؤ'' کامران اس کے ساتھ غاروں میں داخل ہوگیا۔ انتہائی وسیع و عریض غار میں جہاں پتھروں کی سلوں کو ایسے بچھایا گیا تھا کہ آرام دہ عیش گاہیں بن جائیں اور وہاں سکون اور اطمینان کا وقت گزارا جائے اس نے کامران سے بیٹھنے کے لئے کہا۔

''گرشک۔''

''وہ ابھی غائب ہے۔''

''لیکن راکان ہونزا نے تو کہا تھا......''

''ہاں کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں پدم ماترا کہ انسان کو لفظوں کا الٹ پھیر کرنا پڑتا ہے۔ وہ ہے اور نہیں ہے۔''

''مگر میں اسے تلاش کرنا چاہتا ہوں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''ہم ضرور اسے تلاش کرلیں گے۔ میں بے حد پر امید ہوں۔''

''ٹھیک ہے'' کامران نے کہا اکال بھورنا' پدم ماترا' پاتال پرمتی یہ سارے الفاظ اسے عجیب سے لگتے تھے' لیکن فطرتاً ذرا مختلف قسم کا انسان تھا بہت سی عورتیں اس کے قریب پہنچی تھیں۔ یعنی عروسہ وغیرہ لیکن اس نے ان سے فاصلہ رکھا تھا اور ذہن کو اس حد تک نہیں جانے دیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس میں ایک نئی الجھن پوشیدہ ہوتی ہے۔ بہرحال وہ غار کے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ تب سیتا نے کہا۔

''میں اس سے بہت گہرا تعلق رکھتی ہوں۔ ہم لوگ ایک دوسرے کی بو پہچانتے ہیں۔ ہمیں علم ہوجاتا ہے کہ کون کہاں ہے۔ ہم ایک دوسرے کی بو پہچان لیتے ہیں۔

''معنوی طور پر یا حقیقتاً''

''نہیں حقیقتاً۔ بہرحال ہمارے دشمن ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں' اس لئے گرشک ابھی پوشیدہ ہے اس لئے راکان ہونزا نے جس طرح تم سے کہا ہے کہ گرشک کو تلاش کرلینا مشکل نہیں ہے تو ٹھیک کہا ہے۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ۔ اناطوسیہ جس کے بارے میں مجھے خود پتا نہیں ہوتا کہ کس وقت کہاں ہے۔ اگر تمہارے سامنے آجائے تو کیا تمہیں اس سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے تمہیں اور گرشک کو کرنل گل نواز کی کوٹھی میں...... جسمانی ورزش کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ تم لوگ ہواؤں میں اڑکر ایک دوسرے پر وار کررہے تھے۔''

''ہاں۔ واقعی ہمیں شبہ ہوا تھا کہ ہمیں کسی نے دیکھ لیا ہے۔ ابھی راکان ہونزا نے کہا کہ وہ تمہیں فولاد بنادینا چاہتا ہے۔ ہمیں کچھ وقت کے لئے...... تمہیں ان لوگوں سے دور کرنا ہوگا۔''

''واہ یہی تو میں تم سے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں کرنل گل نواز تک جانا چاہتا ہوں۔ عجیب سے انداز میں میرے راستے روکے گئے ہیں۔''

''دیکھو تھوڑی سی الجھنوں کا سامنا تو بے شک کرنا پڑے گا لیکن ہمارے اندازے کے مطابق میرا

مطلب ہے کہ جو صورتحال میرے سامنے ہے اس کے تحت تمہیں تھوڑی سی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا مثلاً تمہیں ایک بار پھر والش کے قریب جانا ہے۔ کیونکہ وہاں تمہاری بہتری ہے البتہ والش کا ساتھی گورڈن بہت خطرناک آدمی ہے۔ ابھی بہت سے ایسے راز الجھے ہوئے ہیں جنہیں بتادینا ذرا مشکل کام ہے۔ یوں سمجھ لو کہ بے شمار لوگ ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں اور ہمیں کسی ایسے ٹھوس انسان کی ضرورت ہے جو ماحول سمجھتا ہو ہر چیز سے واقف ہو۔ اب ہمیں گرشک کو تلاش کرنا ہے اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ ابھی وہ کچھ جواب نہ دے پایا تھا کہ دفعتاً کچھ آہٹیں سنائی دیں اور کامران اور سیتا خاموش ہوگئے۔

''کوئی ہے۔'' کامران نے سرگوشی کی۔ ایک بار پھر دھماکے سنائی دینے لگے۔ پتا نہیں یہ کیسے دھماکے تھے۔ بہت دیر تک یہ دھماکے ہوتے رہے۔ پھر سیتا نے کہا۔

''خطرہ ہے کہ وہ لوگ غاروں کی تلاشی لیتے پھر رہے ہیں۔ ضرور انہیں کسی طرح کا شبہ ہوا ہے۔ آؤ ہمیں یہ جگہ فوراً چھوڑ دینی چاہیے۔'' کامران فوراً کھڑا ہوگیا اور اس کے بعد وہ ایک سمت بڑھ گئے۔ غار در غار گزرتے ہوئے وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں خلا تھا وہ اس خلا میں اتر گئے۔ غالباً کوئی سرنگ تھی جس میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سیتا نے کہا۔

''میرے قدموں کی آواز پر چلے آؤ۔ یہاں کوئی رکاوٹ نہیں ہے ہمیں زیادہ سے زیادہ سو گز کا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ کامران نے خاموشی سے اس کے کہنے پر عمل کیا تھا۔ واقعی سو گز چلنے کے بعد چڑھائی شروع ہوگئی۔ مزید تھوڑا سا آگے بڑھے تھے کہ تیز ہوا کے جھونکے اور روشنی محسوس ہوئی۔ یہ لوگ غاروں سے گزرنے کے بعد جب اوپر نکلے تو وہ خانقاہ کا احاطہ ہی تھا۔ باہر چاند نکلا ہوا تھا اور اس کی پراسرار روشنی میں یہ احاطہ نمایاں تھا۔ کامران ششدر رہ گیا۔

''غاروں کا یہ سلسلہ خانقاہ سے جاملتا ہے۔''

''اور بھی بہت کچھ ہے رفتہ رفتہ تمام چیزوں سے واقف ہوجاؤ گے۔ ویسے اصل دروازے سے نکلنے کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا۔ وہ احاطے کے قریب پہنچ گئی۔ احاطے کی دیوار اتنی بلند نہیں تھی کہ اسے عبور کرنے میں کوئی خاص مشکل پیش آتی اور پھر سیتا تو ویسے بھی جسمانی طور پر چھلاوہ تھی۔ وہ اطمینان سے احاطے کی دیوار کود گئی تھی۔ ایک طرف وسیع میدان تھا لیکن کسی قدر ڈھلوان تھا۔ آس پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جس کی آڑ لے کر آگے بڑھا جائے۔ بہرحال مجبوراً اسی راستے پر آگے بڑھنا پڑا۔ لیکن زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے کہ فضا میں سیٹیوں کی آواز ابھرنے لگی۔ یہ سیٹیاں منہ سے بجائی جارہی تھیں۔

''دوڑو۔'' سیتا نے کہا اور کامران اس کے ساتھ تیزی سے بھاگنے لگا۔ لیکن پھر اچانک ہی گولیاں چلنے لگی تھیں اور بیشتر چنگاریاں ان کے جسموں کو چھوتی ہوئی گئی تھیں۔ کامران نے بدحواس ہوکر سیتا کی طرف دیکھا۔ سیتا بھی ان گولیوں سے بچ گئی تھی پیچھے سے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں------ان کا تعاقب کررہے تھے۔ اچانک ہی پیچھے سے راکان ہونزا کی آواز سنائی دی۔

''نیچے' نیچے' نیچے لیٹ جاؤ۔ نیچے راکان ہونزا کی آواز ہی ایک بم دھماکے کی مانند تھی۔ پتا نہیں وہ کب خانقاہ سے باہر نکلا تھا اور ان لوگوں کے ساتھ دوڑنے لگا تھا۔ تعجب کی بات تھی اس سے پہلے اس کی

قربت کا احساس بھی نہیں تھا۔ بہر حال کامران اور سیتا نیچے لیٹ گئے۔ راکان ہونزا نے سیتا سے کچھ کہا اور سیتا فوراً بولی۔

''ہاں کامران اب ان سے مقابلہ کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔'' کامران نے کہا دوڑتے ہوئے لوگ برق رفتاری سے ان کی طرف آ رہے تھے۔ کامران کے ذہن میں ایک خیال گزرا کہ وہ لوگ جو آتشیں اسلحہ رکھتے ہیں اتنے اناڑی نہیں ہوتے کہ کھلے میدان میں...... دوڑتے ہوئے تین آدمیوں کو نشانہ بنا سکیں۔ لگتا ہے کہ انہوں نے صرف ان لوگوں کو روکنے کے لئے گولیاں برسائی تھیں۔ اچانک ہی کامران نے راکان ہونزا کو ایک عجیب و غریب حرکت کرتے ہوئے دیکھا اس نے اپنی کلائی میں پڑے ہوئے کڑے کو کلائی سے اتار لیا۔ ویسا ہی ایک دوسرا کڑا اسی کلائی میں پڑا ہوا تھا۔ اتارا ہوا کڑا کوئی دو فٹ دور ہو گیا لیکن وہ ایک باریک تار سے منسلک تھا کیونکہ وہ راکان ہونزا کے ہاتھ کی حرکت کے ساتھ ہی جنبش کر رہا تھا۔ کامران نے ان لوگوں کو دیکھا جو اب انکے سروں پر پہنچ گئے تھے۔ ان کی تعداد چھ سات تھی اور وہ ننجا اسٹائل کے لبادوں میں لپٹے ہوئے تھے لیکن ان کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ ان میں چار مقامی باشندے تھے اور دو سفید فام۔ مقامی باشندوں کے ہاتھوں میں سیاہ چمک دار ڈنڈے دبے ہوئے تھے وہ بہت ہی پھرتیلے نظر آ رہے تھے۔ خاص طور سے ایک مقامی آدمی تو لگتا تھا جیسے نحوست کا دیوتا ہو اس کا چہرہ انتہائی مکروہ تھا۔

انہوں نے ان لوگوں کے گرد گھیرا ڈال دیا پھر ایک سفید فام نے جس کے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا۔ کڑک کر کہا۔

''اگر تم نے کوئی جنبش کی تو......''

''کیا چاہتے ہو؟'' راکان ہونزا نے صاف ستھری انگلش میں کہا۔

''ہاتھ اوپر رکھو اوئے تم بھی'' دوسرے سفید فام نے کامران کے بدن پر ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

کامران راکان ہونزا کو دیکھنے لگا۔ خود کو کنٹرول کرنا ضروری تھا لیکن پھر جب مقامی آدمی نے سیتا کے بال پکڑ کر اسے کھینچنے کی کوشش کی تو کامران اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکا۔ اس نے ایک زبردست ٹھوکر اس مقامی شخص کی پنڈلی میں ماری اور اس کے حلق سے ایک کریہہ چیخ نکل گئی۔ ادھر سیتا نے نہ جانے کیا کیا کہ وہ فضا میں بلند ہو کر نیچے گری اور اس کی دوسری آواز بڑی دردناک تھی۔ سیتا نے جو کچھ بھی کیا تھا اس انداز میں کیا تھا کہ وہ شخص بری طرح پتھریلی زمین سے ٹکرایا تھا اور اس کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ ظاہر ہے اس کے بعد کھیل تو شروع ہونا ہی تھا۔ ایک انتہائی پھرتیلے مقامی آدمی نے اچانک کامران کے شانے پر ہاتھ مارا یہ وہی شخص تھا جس کا چہرہ انتہائی منحوس تھا۔ کامران اپنا توازن نہ سنبھال سکا۔ جونہی وہ نیچے گرا منحوس چہرے والا اس کے سینے پر سوار ہو کر اپنے چوڑے ہاتھ سے اس کی گردن دبانے لگا۔ لیکن کامران کو بھی بہت کچھ آ چکا تھا اس نے عقب سے دونوں پاؤں اٹھا کر اس کے کنپٹیوں پر مارے جس کی بناء پر کامران کی گردن آزاد ہو گئی اور اس نے اسے خود پر سے دھکیل دیا۔ پھر دفعتاً فضا میں ایک عجیب و غریب آواز گونجی جیسے تیز ہوا لکیریں بناتی ہوئی گزر رہی ہو اور اس کے ساتھ ہی ایک سفید فام جو راکان ہونزا کا نشانہ لے رہا تھا۔ بری طرح چونک پڑا۔

شائیں شائیں کی آوازیں اب مسلسل ترنم پیدا کر رہی تھیں اور کامران کی نگاہوں کے سامنے دنیا کا سب سے حیرت انگیز منظر تھا۔ سفید فام کی کلائی کٹ گئی تھی اور پستول اس کے کٹے ہوئے ہاتھ کے ساتھ اچھل کر دور جا پڑا تھا۔ بات اسی حد تک ہوتی تو قابل قبول ہوتی۔ لیکن دوسرے لمحے سفید فام کے جسم پر پڑنے والی لکیروں سے خون کی دھاریں پھوٹ بہیں اور پھر اس کے پورے بدن کے بے شمار ٹکڑے زمین پر بکھر گئے۔

شائیں شائیں کی آوازیں راکان ہونزا کی کلائی سے منسلک اس کڑے سے بلند ہو رہی تھیں جس کا دوسرا حصہ فضا میں گردش کر رہا تھا۔ دوسرے سفید فام پستول بردار کا بھی یہی حشر ہوا۔ پستول صرف انہی دونوں کے پاس تھے باقی لوگوں نے سیاہ چمک دار ڈنڈے سنبھال رکھے تھے۔ سفید فام تو شاید راکان ہونزا کے اس انوکھے ہتھیار سے واقف نہیں تھے اس لئے وہ مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئے لیکن مقامی لوگ شاید اس ہتھیار کی کاٹ سمجھتے تھے چنانچہ وہ پیچھے ہٹ گئے۔ ادھر زمین پر گرے ہوئے منحوس چہرے والے شخص نے کسی مینڈک کی طرح زمین پر ہاتھ پاؤں ٹکا کر کامران پر چھلانگ لگائی۔ وہ شاید کامران کو زمین سے اٹھنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ کامران بھی غافل نہیں تھا اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور اس کی چھلانگ خالی گئی لیکن منحوس چہرے والے نے ایک لمحہ رکے بغیر دوسری چھلانگ بھی لگا دی۔ وہ بڑی خوف ناک انداز میں مینڈک کی طرح اچھل کود رہا تھا اور اگر کامران بجلی کی طرح نہ تڑپ رہا ہوتا تو اس کا بچنا مشکل تھا اس کے بعد کامران نے ایک اور ترکیب کی اس بار جونہی وہ کامران کے اوپر آیا کامران نے پاؤں سیدھا کر دیا اور پوری قوت سے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔ اس بار وہ الٹ گیا تھا ادھر سیتا پیچھے ہٹ گئی تھی اور تین مقامی باشندے اس سے الجھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ڈنڈے سنبھالے پینترے بدل رہے تھے۔ راکان ہونزا خاموشی سے کھڑا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا دفعتاً تین مقامی باشندے دھاڑتے ہوئے راکان ہونزا پر حملہ آور ہوئے اور شائیں شائیں کی آوازیں پھر گردش کرنے لگیں۔ کامران نے ان تینوں کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ڈنڈوں کو ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے ہوئے دیکھا اور اس کے ساتھ ہی ایک مقامی نوجوان درمیان سے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا بس اس منظر کو دیکھتے ہوئے چوک ہو گئی۔ اس بار منحوس شکل والے مقامی باشندے نے اسے چھاپ لیا۔ اس نے کامران کے بال پکڑ کر اس کا سر زمین پر دے مارا اور کامران کی آنکھوں کے سامنے ستارے ناچ گئے' لیکن فوراً ہی سیتا نے پیچھے سے ان کی گردن پکڑی اور اسے اٹھا کر دور اچھال دیا۔ وہ غالباً اس بات پر آمادہ تھا کہ کامران کا بھیجا پاش پاش کر دے لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا البتہ کامران کی آنکھوں میں ستارے ناچ گئے تھے اور پھر ستارے بجھنے لگے اس نے دماغ پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن سر پر لگنے والی چوٹیں اتنی شدید تھیں کہ وہ ہوش میں نہ رہ سکا۔ نہ جانے کتنی دیر بے ہوش رہا تھا پھر ایک عجیب سی آواز نے اسے ہوش میں لانے میں مدد کی تھی۔ آواز واقعی بڑی عجیب سی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے صور پھونکا جا رہا ہو۔ لیکن وہ صور نہیں ناقوس تھا۔ ناقوس بجائے جا رہے تھے اور آس پاس بھجن کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ کامران نے آنکھیں کھول کر دیکھا ماحول پر غور کیا تو خود کو ایک چھولداری میں پایا۔ آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ اٹھنے کی کوشش کی تو پنڈلی کے پاس چبھن کا احساس ہوا۔ بہر حال وہ اٹھ بیٹھا۔ پنڈلی کو ٹٹولا تو یہاں ایک باریک سی سوئی پیوست تھی۔ کامران نے حیرت سے اس سوئی کو دیکھا۔ پنڈلی کے علاوہ پاؤں کی پانچوں انگلیوں میں ویسے ہی

ساخت کی سوئیاں پیوست پائیں۔ ایسی ہی کچھ سوئیاں اس کی کنپٹیوں میں پیوست تھیں۔ نہ جانے دل میں کیوں ایک عجیب سے خوف کا احساس امڈ آیا۔ یہ سب کیا ہے کون سی جگہ ہے۔ پھر گزرے ہوئے واقعات کو ذہن میں دوڑایا تو آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔ وقت کا اندازہ کیا تو احساس ہوا کہ صبح کی روشنی پھوٹ رہی ہے۔ رات گزر چکی تھی لیکن یہ سب کچھ کیا تھا۔

کامران نے پھر ایک بار چھولداری کا جائزہ لیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ چند گز کے فاصلے پر یہ ایک عبادت گاہ نظر آرہی تھی۔ بھجن کی آوازیں وہیں سے بلند ہو رہی تھیں اور بے شمار افراد قطار در قطار ادھر سے ادھر آجا رہے تھے۔ آس پاس بہت سی چھولداریاں بکھری ہوئی تھیں۔ کامران پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا لیکن اسے کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا تھا۔ ''کہاں گئے یہ سب۔'' اس نے پریشانی کے انداز میں سوچا اور اس کے بعد وہ ان چھولداریوں کے درمیان انہیں تلاش کرنے لگا' لیکن ناممکن ہی رہا۔ کوئی ایک شکل جو نظر آئی ہو۔ پھر وہ وہاں سے چل پڑا اور یونہی ایک بے نام منزل کی طرف قدم اٹھا دیئے۔ قرب و جوار میں عمارتیں نظر آرہی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اچھا خاصا شہر ہے لیکن راکان ہونزا' سیتا یا پھر اس کے وہ ساتھی یعنی سلازار شاہیری اور نشینہ یا امینہ سلفا کسی کا کہیں پتا نہیں تھا۔ پتا نہیں رات کو ان کا کیا حشر ہوا۔ جوں جوں حالات پر غور کر رہا تھا عقل ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔ وہ لمحے یاد آئے جب راکان ہونزا ایک خطرناک جنگ لڑ رہا تھا۔ وہ انوکھا ہتھیار جو صرف دو لوہے کے کڑوں پر مشتمل تھا اور اس کی کاٹ خدا کی پناہ۔ جسم کی ہڈیاں صابن کی طرح کٹ جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی سیتا کی پھرتی اور قوت۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا اور پھر یہ سوئیاں اسے یاد آیا کہ گرشک بھی یہ کمال ایک بار دکھا چکا ہے۔ اچانک ہی ایک اور خیال ذہن میں آیا اس چھولداری میں اسے کسی خاص مقصد کے لئے تو نہیں پہنچایا گیا۔ ممکن ہے وہ لوگ تعاقب کر کے کامران کے ساتھیوں کا پتا لگانا چاہتے ہوں۔ بہر حال ابھی کوئی فیصلہ کرنا بڑا مشکل تھا۔ سوائے اس کے کہ یہ جائزہ لیا جائے کہ کون سی جگہ ہے اور کس حیثیت کی حامل۔ سب سے پہلے کامران نے اپنے جسم سے وہ عجیب و غریب سوئیاں نکال کر پھینکیں جن سے اسے تکلیف تو بالکل نہیں ہو رہی تھی لیکن پھر بھی وہ بہت عجیب و غریب لگ رہی تھیں اسے کوئی جسمانی تکلیف بالکل نہیں تھی۔ وہ شہر میں گھومتا رہا۔ شہر کا نام بھی معلوم ہو گیا تھا اسے۔ لیکن اس وقت اس کے پورے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں جب اس نے علی سفیان کو ایک شاندار سے ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ علی سفیان ٹیکسی سے اُترا تھا۔ وہ ٹیکسی کا بل ادا کر کے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ کامران فوراً ہی اس کے پیچھے دوڑ پڑا تھا۔

کہیں وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ ایک لمحے کے لئے تو اس نے سوچا تھا کہ ممکن ہے کہ کرنل گل نواز وغیرہ بھی وہیں موجود ہوں اور ان سے ملاقات کی جا سکے لیکن وہ علی سفیان کے سامنے نہیں آیا تھا۔ ہوٹل کی پانچویں منزل پر علی سفیان ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ کامران نہایت احتیاط سے اس منزل کی نگرانی کرنے لگا۔ بہر حال جائزہ لینا ضروری تھا اور اس کا اندازہ درست نکلا اس نے شعورا کو دیکھا جو اسی پانچویں منزل کے ایک کمرے میں تھی قزل ثنائی اور شعورا بہر حال معتدل لوگ تھے اور بڑی اچھی حیثیت کے حامل اس کے بعد بہت دیر گزر گئی لیکن کامران کو اور کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

آخر کار اس نے قزل ثنائی ہی کی کمرے کا رخ کیا۔ دستک دی تو شعورا نے ہی دروازہ کھولا تھا ایک لمحے کے لئے وہ بھونچکی رہ گئی تھی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا ہو۔ پیچھے سے قزل ثنائی کی آواز سنائی۔

''شعورا کون ہے؟'' شعورہ نے فوراً ہی کامران کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آؤ کامران اندر آجاؤ''

''کامران'' اندر سے قزل ثنائی کی متحیر آواز سنائی دی۔ کامران اندر داخل ہوا لیکن اس نے دروازہ فوراً ہی اندر سے بند کر دیا تھا تاکہ کوئی اور اندر نہ آجائے قزل ثنائی حیرت بھری نظروں سے کامران کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''تم زندہ ہو؟''

''کیا آپ کو میری موت کی اطلاع ملی تھی؟''

''نہیں۔ کوئی اطلاع ہمیں نہیں ملی لیکن یہاں سبھی نے تمہیں مردہ تصور کر لیا تھا۔ بیٹھو پلیز۔ کدھر تھے تم اس دوران''

''لمبی کہانی ہے۔ مجھے آپ یہ بتایئے کرنل گل نواز کون سے کمرے میں ہیں؟''

''اوہ تو تمہیں کچھ نہیں معلوم؟''

''کیا مطلب......''

''کرنل صاحب سخت بیمار ہو گئے تھے ہم لوگ کافی آگے نکل چکے تھے لیکن کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ ہمیں واپسی کا سفر طے کرنا پڑا اور ہم یہاں پہنچ گئے۔''

''کرنل بیمار ہو گئے تھے۔''

''ہاں۔''

''تو پھر۔''

''واپس چلے گئے۔''

''واپس چلے گئے؟''

''ہاں۔''

''مم......مگر۔''

''نہیں ان کی کیفیت کافی خراب ہو گئی تھی اصل میں انہیں ایک زہریلی مکھی نے کاٹ لیا تھا جس کے اثرات نہایت مضر ہوتے ہیں۔ رانا چندر سنگھ انہیں لے کر واپس چلے گئے۔''

''رانا چندر سنگھ بھی گئے۔''

''ہاں اب صرف علی سفیان اس کی بیوی امینہ سلفا' میں اور شعورہ یہاں رہ گئے۔ ہم لوگوں نے اپنا ایک الگ گروپ بنایا ہے بلکہ بنایا گیا ہے بنا رہے ہیں یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی کہ تم یہاں آگئے تمہیں بھی ہم ساتھ رکھیں گے لیکن تم اس دوران کہاں غائب ہو گئے تھے ان لوگوں کو مکمل تفصیل بتانا کامران نے مناسب نہیں سمجھا۔ کرنل گل نواز کے لئے وہ پریشان ہو گیا تھا اور اب سچی بات یہ ہے کہ یہاں رکنا اسے بالکل بے

مقصد لگ رہا تھا ظاہر ہے کرنل ہی کے لئے یہاں تک آیا تھا اور اب اگر کرنل صاحب ہی یہاں سے واپس چلے گئے تو اسے ان تمام چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی باقی سارے کام تو بالکل بے مقصد ہی تھے قزل ثنائی نے اس سے بہت سی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔ قزل ثنائی نے کہا۔

''تمہارے پاس کوئی کمرا تو ہوگا نہیں۔ میں تمہارے لئے ایک کمرا بک کرائے دیتا ہوں۔''

''نہیں میں ایک اور ہوٹل میں مقیم ہوں بعد میں آپ سے مل لوں گا۔ اینہ سلفا بھی یہاں موجود ہے۔''

''کیوں خاص طور سے تم نے اسی کے بارے میں کیوں سوال کیا۔؟''

''نہیں کوئی خاص بات نہیں علی سفیان کو تو میں نے دیکھا تھا' ایسے ہی معلوم کرنا چاہتا تھا' وہ یہیں ہے۔''

''ہاں بالکل'' قزل ثنائی نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

''نہیں میرا مطلب تھا میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ وہ کافی دن یہاں سے غائب رہیں۔''

''اینہ سلفا۔''

''جی''

''نہیں بھئی جس نے بھی یہ تمہارے علم میں اضافہ کیا ہے دھوکا دیا ہے غلط کہا ہے وہ یہیں موجود تھی'' کامران کا ذہن چکرا کر رہ گیا تھا زمانہ قدیم کی پراسرار روح واقعی اپنے اندر اسرار کے خزانے رکھتی تھی کامران اس کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ خاصے عرصے سے وہ اس کے قریب نہیں پہنچی تھی۔ سلاز ارنشینہ وغیرہ بھی۔ فی الحال غائب ہی تھے۔ کامران ابھی...... کوئی فیصلہ کر رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے بہرحال تھوڑی دیر تک ان کے ساتھ رہنے کے بعد وہ خاموشی سے باہر نکل آیا۔ اینہ سلفا کے مسئلے میں اس کا ذہن بری طرح چکرایا ہوا تھا پھر اس نے فیصلہ کیا کہ خود بھی کسی مناسب جگہ قیام کرے۔ یہاں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے خاصا وقت گزر چکا ہے فیصلہ کرنا تھا کہ گرشک اور سیتا کے مشن پر کام کیا جائے راکان ہونزا سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کیا جائے یا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے گھر کا رخ کیا جائے۔ وہ وہاں سے نکل کر پیدل چلتا ہوا بہت دور آ گیا جن پراسرار واقعات میں وہ الجھا ہوا تھا انہوں نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا دی تھیں پھر ایک اور ہوٹل کا بورڈ نظر آیا تو اس نے ادھر کا رخ کیا یہ بھی ایک اچھا ہوٹل تھا۔ اسے کمرا حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی اور وہ ہوٹل کے اس کمرے میں منتقل ہو گیا پھر تقریباً چوبیس گھنٹے اس نے بالکل سکون سے گزارے تھے صرف کھانے پینے کی اشیا طلب کرنے کے علاوہ اور کوئی عمل اس نے نہیں کیا تھا اور سکون سے وقت گزارا تھا لیکن سکون بعض لوگوں کی تقدیر ہی میں نہیں ہوتا وہ اب بھی اپنے کمرے میں ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ سمجھا یہی تھا اس نے کہ ویٹر ہوگا لیکن آنے والی سیتا تھی جو بڑے اعتماد سے اندر داخل ہوئی تھی۔

''ارے۔'' کامران اچھل کر بیٹھ گیا۔ سیتا مسکرا دی پھر بولی۔

''نہیں جا سکتے ناممکن ہی نہیں ہے۔''

''سیتا تم یہاں؟'' کامران حیرت سے بولا۔

''یہی تو کہہ رہی ہوں نا کہ نہیں جا سکتے کہیں بھی نہیں جا سکتے تم' ہم سے دور نہیں جا سکتے یہ وقت کی تحریر ہے۔''

''مگر تم یہاں کیسے آ نکلیں؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں اس کمرے میں مقیم ہوں۔''

''اس لئے کہ تمہارے بالکل سامنے والے تیسرے کمرے میں ہم لوگ ہیں'' سیتا نے جواب دیا۔

''ہم لوگ''

''ہاں' میں اور راکان ہونزا۔''

''اوہ...... کیا واقعی۔''

''جھوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا آؤ وہیں بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔'' کامران ایک گہری سانس لے کر کمرے سے باہر نکل آیا تھا اپنے کمرے کو لاک کر کے وہ سیتا کے ساتھ باہر نکل آیا اور آخر وہ دونوں سامنے والی روکے...... تیسرے کمرے میں داخل ہو گئے سیتا نے پلٹ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ کمرے میں بستر پر ایک شخص دراز تھا جس نے سلیپنگ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ یہ راکان ہونزا کا نیا روپ تھا جو کامران دیکھ رہا تھا۔ سیتا دروازہ بند کر کے واپس مڑی راکان ہونزا بھی اٹھ کر بیٹھ گیا اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹھئے مسٹر کامران''

''کمال کے لوگ ہیں آپ' میں تو بالکل اتفاقی طور پر اس ہوٹل میں آ کر مقیم ہو گیا ہوں۔''

''بس تو ہم تمہیں سونگھتے ہوئے یہاں تک آ گئے۔''

''وہاں کیا ہوا تھا کچھ پتا چل سکا میرے ساتھ جو واقعات پیش آئے تھے وہ آپ کے علم میں ہیں۔''

''ہاں' بالکل علم میں ہیں ہم نے تمہیں اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں کیا ہمیں وہاں سے فوراً ہی پلٹنا پڑا کیونکہ خانقاہوں میں اب ہمارے لئے کوئی جگہ نہیں رہی ہے ہمارے دشمن ہمیں تلاش کر رہے ہیں وہ گرشک کی تلاش میں زمین اور آسمان ایک کئے ہوئے ہیں چنانچہ ہم نے یہاں قیام کیا۔''

''بڑی بات ہے میں حیران ہوں' میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ وہ لوگ کون ہیں؟''

''وہ تمہیں مختصراً یہ بتاؤں کہ وہ بہت پراسرار لوگ ہیں ان لوگوں نے کئی جگہ مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے میں انسانوں کی زندگی سے کھیلنے کا شوقین نہیں ہوں لیکن جب صورتحال ناگزیر ہو جائے تو پھر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوتا ہے چنانچہ بہ حالت مجبوری مجھے ان لوگوں کا قتل کرنا پڑا۔ راکان ہونزا کے لہجے میں افسردگی جھلک رہی تھی۔ اگر آپ انہیں قتل نہ کرتے راکان ہونزا تو وہ آپ کے لئے بہت بڑی مصیبت بن سکتے تھے۔ بہرحال مجھے حیرانی ہے کہ آپ اس طرح یہاں تک آ گئے لیکن میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

''تم شدید اذیت میں تھے' اگر راکان ہونزا تمہارا فوری علاج نہ کرتے تو تمہیں ایک آدھ مہینے تک بستر پر پڑے رہنا پڑتا تمہیں اس علاج کے بعد وہاں پہنچایا گیا تھا۔''

''علاج''

''ہاں کیا تم نے ہوش میں آنے کے بعد اپنے جسم کے مختلف حصوں میں سوئیاں چبھی ہوئی محسوس نہیں کیں یہ ایک خاص طریقہ علاج ہے اور اس کے ذریعے تمہیں اس شدید تکلیف سے آزاد کر دیا گیا جو بعد میں تمہیں نڈھال کر دیتی۔ اصل میں ہمارے پاس اپنا کوئی ٹھکانا نہیں تھا' اسی حالت میں ہم نے تمہیں وہاں

سے اٹھایا اور خانقاہ کے اس خیمے میں لے گئے۔ ہمیں یقین تھا کہ تم وہاں سے اپنی منزل پر واپس لوٹ آؤ گے۔ کیونکہ خانقاہ کا انتخاب غلط نہیں کیا گیا تھا وہ شہر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ کامران واقعی حیران رہ گیا۔ گویا ان سوئیوں کے ذریعے اس کا علاج کیا گیا تھا انوکھا اور عجیب طریقہ علاج تھا جس نے اسے واقعی کسی تکلیف کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

''اچھا اب یہ بتاؤ اب کیا کرنا ہے۔؟''

''ہم اپنا مشن جاری رکھیں گے ہم کوئی جرم نہیں کر رہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم مصیبتوں کا شکار ہیں اور اپنی مصیبتوں کو رفع کرنا چاہتے ہیں ہم اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ہم اس شہر کے باسی ہیں جو پا تال کی گہرائیوں میں سو رہا ہے اس سوتے ہوئے شہر کو جگانا ہمارا فرض اولین ہے اور تم سے بھی ہم اسی سلسلے میں مدد حاصل کر رہے ہیں۔''

''کیا اس میں وہ خزانہ بھی شامل ہے؟'' کامران نے سوال کیا اور راکان ہونزا کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کہا۔

''خزانہ صرف وہ ہوتا ہے جو کسی زندہ وجود کی ضرورتیں پوری کر دے۔ ہمارا خزانہ وہ چمک دار دھات یا چکنے پتھر نہیں ہیں' بس ہمارا خزانہ کچھ اور ہی ہے اور تم یقین کرو جس خزانے کے طلب گار دنیا کے انسان ہوتے ہیں یعنی وہ جو اس کے چکر میں اپنا سب کچھ کھوئے ہوئے ہیں' وہ جتنا تم چاہو گے ہم تمہیں دے دیں گے۔ آہستہ آہستہ تمہیں ہمارے بارے میں تفصیل معلوم ہو جائے گی اس سے قبل بھی ہم نے چند لوگوں کو اپنا راز دار بنانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ غلط راستوں کے انسان تھے اور ہمیں اس غلط فیصلے سے شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ دراصل وہ لوگ یہ بات تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں تھے کہ...... اچانک ہی راکان ہونزا اس طرح خاموش ہو گیا جیسے اسے اپنے زیادہ بولنے کا احساس ہو گیا ہو پھر اس نے کہا۔

''تم ایک ذہین انسان ہو اور جیسا کہ میں نے تم سے کہا کہ تم خصوصی حیثیت کے حامل ہو ہمارے لئے اس لئے کہ تم پاتال پرمتی کی امیدوں کا مرکز ہو تم پدم ماترا ہو' ہمارے لئے اب تم وہ صورت کہاں سے لے کر آئے یہ جاننے والا جانتا ہے ہمیں تم سے جو مدد کی ضرورت ہے بس اس میں تم ہمارے معاون رہنا۔''

''بے فکر رہو۔ میں تمہارے مقصد کی تکمیل کے لئے مکمل طور پر تیار ہوں' کسی لالچ کے بغیر۔''

''بہت بہت شکریہ۔ اصل میں سب سے بڑی مشکل جو ہمیں اس وقت پیش آگئی ہے وہ گرشک کی غیر یقینی گم شدگی ہے سیتا کو بھی پہلے احساس نہیں تھا کہ ہواؤں میں سونگھ کر بھی وہ گرشک کو تلاش نہیں کر پائے گی' لیکن گرشک اس طرح غائب ہو گیا ہے کہ اب تو اس بات کا شبہ ہونے لگا ہے کہ کہیں وہ کسی سازش کا شکار نہ ہو گیا ہو۔ اس لئے ہماری پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی ہے ہم جانتے ہیں کہ ہمارے بے شمار دشمن ہمارے اردگرد بکھرے ہوئے ہیں گرشک کی تلاش کے بغیر ہمارا تمام کام بے مقصد ہو جاتا ہے۔ بس گرشک ہم میں شامل ہو جائے تو صورتحال آگے بڑھے ورنہ ہمارے قدم ایک طرح سے رک گئے ہیں۔''

''گویا سونگھ کر تم اس کے بارے میں معلومات حاصل نہیں کر سکتے'' کامران نے سوال کیا اور سیتا افسردگی سے گردن ہلانے لگی۔ پھر بولی۔

''ہاں وہ ہماری سونگھنے کی حد سے باہر ہے۔''

''ہوں' بہرحال میں تمہارا ساتھی ہوں جس طرح تم پسند کرو میں تمہاری مدد کے لئے حاضر ہوں ویسے بڑی حیرانی کی بات تھی میرے لئے جس طرح تم نے اس ہتھیار سے ان لوگوں کا مقابلہ کیا۔''

''مجبوری تھی' مجبوری میں نے بالکل عاجز آ کر اس وقت تمہارے سامنے ان لوگوں پر ہتھیار اٹھایا تھا جب میرا تعاقب کرنے والوں نے زندگی مجھ پر تنگ کر دی تھی اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ اب میں ان کا خاتمہ کر دوں۔ یہ مقدس ہتھیار جب کھلتا ہے تو خون چاٹ کر ہی واپس آتا ہے' ورنہ اسے کھولنا گناہ ہے۔ یہ ہمارا مذہبی ہتھیار ہے اور اس ہتھیار سے ایک عہد وابستہ ہے اسے رکھنے والے اس کی قیمت ادا کرتے ہیں یہ جب کھلتا ہے تو اسے خون میں ڈبوئے بغیر واپس نہیں پہنا جا سکتا۔''

''بڑی دلچسپ بڑی انوکھی باتیں ہیں تم سب حیرت انگیز ہو۔ اچھا ایک بات بتاؤ کہ کیا یہاں قیام محفوظ ہے؟''

''مجبوری ہے وہ لوگ خانقاہوں میں ہمیں تلاش کر رہے ہیں حالانکہ ان ہوٹلوں کی دنیا کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں خاموشی سے اپنے آپ کو چھپانا چاہتا تھا اور اس کے لئے یہ جگہ غیر محفوظ ہے بہت جلد ہم کوئی اچھی رہائش گاہ تلاش کر لیں گے بس گرشک ہمیں مل جائے اس کے بعد ہم آگے کے سفر کا آغاز کریں گے' لیکن اب تم ہمارے لئے سب سے قیمتی انسان ہو۔ آہا۔ یاد آیا ہم تمہارے ساتھ ایک مذاق کرنا چاہتے ہیں۔ راکان ہونزا کے لہجے میں ایک کھلنڈرا پن جھلکنے لگا۔

''مذاق......'' کامران نے تعجب سے کہا۔

''ہاں براہ کرم ہمارے اس مذاق کو برداشت کر لو۔''

''کیسے'' کامران پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

''آؤ اس جگہ بیٹھ جاؤ۔'' سیتا نے کہا کامران نے ان کے ساتھ تعاون کرنے کا فیصلہ کیا تھا یہ لوگ جس طرح پراسرار شخصیتوں کے مالک تھے اس لحاظ سے ان کا کوئی بھی عمل باعث حیرت نہیں تھا چنانچہ کامران نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور جوتے اتار کر کمرے کے فرش پر بیٹھ گیا۔ ان دونوں نے بھی جوتے اتار دیئے تھے کامران دلچسپی سے ان کی حرکتیں دیکھتا رہا۔ پھر دونوں نے ہاتھ پاؤں زمین پر ٹکائے اور چوپایوں کی طرح چلتے ہوئے کامران کے قریب پہنچ گئے سیتا نے کامران کے پیروں کے تلوؤں پر ناک رکھی اور گہری گہری سانسیں کھینچنے لگی۔ وہ ہٹی تو راکان ہونزا نے بھی وہی حرکت دہرائی۔ وہ پیروں کے تلوؤں کو سونگھتے ہوئے پنڈلیاں پھر کامران کے سر تک پہنچ گئے' لیکن دونوں انتہائی سنجیدہ تھے اور نہایت انہماک سے یہ کام کر رہے تھے یہ عمل دیر تک جاری رہا پھر دونوں سیدھے کھڑے ہو گئے۔ کامران اس پراسرار حرکت کے بارے میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے شکریہ ادا کیا اور خود بھی جوتیاں پہن کر بیٹھ گئے کامران نے خود بھی اپنے جوتے پہن لئے تھے۔

''یہ کچھ انوکھا مذاق نہیں تھا مسٹر راکان ہونزا۔''

''ہاں تھا تو انوکھا لیکن اسے مذاق نہ کہو ہم نے تمہیں بتایا تھا کہ ہماری قوت شامہ بہت تیز ہے ہم

فضاؤں میں سونگھ کر اپنے جانے پہچانے لوگوں کا پتا چلا لیتے ہیں ہم نے تمہارے بدن کی خوشبو اپنے ذہن میں اتار لی ہے اور تم ہماری سونگھنے کی حد میں ہو گے تو ہم تمہارا بہ آسانی پتا لگا سکتے ہیں وجہ یہ ہے کہ اب تم ہماری ایک ضرورت بن چکے ہو۔" کامران نے ایک گہری سانس لی تھی پھر اس نے کہا۔

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ یہاں کب تک قیام ہوگا؟"

"تھوڑا وقت بس ذرا یہ اندازہ لگا لیا جائے کہ ہمارے دشمن ہم سے کتنے فاصلے پر ہیں۔"

"ٹھیک ہے میرے باہر نکلنے پر تو کوئی اعتراض نہیں ہے تمہیں۔"

"احتیاط بس احتیاط رکھنا" چنانچہ کامران وہاں سے نکل آیا۔ اس کے کمرے سے باہر نکلنے کے بعد سیتا نے پھر دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ کامران اپنے کمرے میں نہیں گیا بس دل چاہا تھا کہ آوارہ گردی کرے نہ اب اسے کسی خطرے کا احساس تھا نہ ہی کوئی ایسی طلب جو اس کے دل میں خاص طور سے ہو۔ اب اس نے اپنے آپ کو ان واقعات میں ضم کر لیا تھا۔ کرنل گل نواز کے جانے کے بعد ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ وہ خود بھی یہاں سے چلا جاتا' کیونکہ اب بھی یہ بات پورے اعتماد سے کہی جا سکتی تھی کہ خزانہ اس کی طلب نہیں تھا وہ سارے لوگ اس کے لئے دیوانے ہو رہے تھے اسے بالکل پروا نہیں تھی۔ یہ تمام احساسات اس کے لئے عجیب سی کیفیت کے حامل تھے اور وہ انہی میں الجھا ہوا تھا دیکھنا یہ تھا کہ اب اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ کرنل گل نواز کے جانے کے بعد دل تو یہی چاہتا تھا کہ وہ خود بھی واپس چلا جائے اور وہاں اپنی دنیا میں مست ہو جائے لیکن یہ ایک عجیب و غریب کہانی شروع ہو گئی تھی اور وہ پراسرار باتیں جو ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آسکی تھیں اسے متاثر کر رہی تھیں یعنی ایسی ستی ساوتری جو پاتال کی گہرائیوں میں اس کا انتظار کر رہی ہے جب کہ راکا ن ہونزا نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ وہ کردار وہ خود نہیں ہے بلکہ کسی ایک اہم کردار کا ہم شکل ہے اس کا ہم شکل اصل کردار کہاں ہے یہ بھی علم نہیں تھا جب بھی وہ اس بارے میں سوچتا ذہن عجیب سے تصور کا شکار ہو جاتا اور آخر کار یہی فیصلہ کرنے پر مجبور ہوتا کہ اب جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا بہت دیر تک وہ شہری آبادیوں کا جائزہ لیتا رہا۔ ایک مخصوص ثقافت ایک مخصوص انداز اور اس کے بعد اسے چونکنا پڑا۔

ایک انتہائی انوکھا کردار نظر آیا تھا اور یہ والش تھا والش نے اسے دیکھ لیا تھا جب کہ اس نے والش کو نہیں دیکھا تھا۔ پھر جب عقب سے ایک ہاتھ اس کے کاندھے پر آ کر ٹکا تو وہ چونک پڑا اس نے پلٹ کر دیکھا اور اس کے چہرے پر عجیب و غریب تاثرات پھیل گئے۔

"ہاں اور بھلا اس بات میں کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے کہ تم کامران ہو۔"

"ہاں مسٹر والش شک و شبے کی تو واقعی بات نہیں ہے۔ آپ کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہوں۔ لیکن تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے جس قدر حیرانی ہوئی ہے میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"اوہ مجھے...... تعجب ہے مسٹر والش کہ آپ نے مجھے کہاں گم کر دیا تھا۔" والش نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک طرف اشارہ کر کے بولا۔

"آؤ' وہ اوپن ایئر ریسٹوران نظر آ رہا ہے ہم وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" والش کا انداز نہایت دوستانہ تھا کامران اس کے ساتھ چل پڑا والش کے مل جانے سے اسے ایک عجیب سی الجھن کا احساس ہو رہا تھا' لیکن ریسٹوران تک جاتے ہوئے اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ اسے والش سے کیا بات کرنی ہے شام جھک چکی تھی اور روشنیاں جلتی جا رہی تھیں والش ایک خوبصورت سوٹ میں ملبوس بہت ہی اسمارٹ لگ رہا تھا۔ کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد اس نے کافی طلب کر لی اور خاموشی سے کافی آنے کا انتظار کرتا رہا۔ کامران پر خیال نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے اچھی طرح احساس تھا کہ والش اس کے چہرے کا گہری نگاہوں سے جائزہ لے رہا ہے' چنانچہ اس نے خود ہی سوال کر ڈالا۔

"آپ کچھ مشکوک' مشکوک سے نظر آ رہے ہیں۔ مسٹر والش۔"

"نہیں مشکوک کا لفظ مناسب نہیں ہے میں تو تمہیں غور سے اس لئے دیکھ رہا ہوں کہ میں اس دوران تمہاری گمشدگی کے بارے میں بے حد پریشان رہا ہوں۔ تم مجھے خاصی بہتر حالت میں نظر آ رہے ہو۔"

"ہاں۔ میں بہتر حالت میں ہوں' لیکن میں یہ بات جاننا چاہتا ہوں کہ آخری بار جب ہماری ملاقات ہوئی تھی تو ہم کن حالات میں تھے اور پیش آنے والا سارا کھیل کیا تھا؟"

"تم اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"میں نے تو ایک طویل سفر کیا ہے اور جن حالات کا شکار رہا ہوں آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"انہی حالات کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"مسٹر والش میں جن حالات کا شکار رہا ہوں ان کی کچھ تفصیل پیش خدمت ہے" کامران نے کہا اور والش کو نہایت احتیاط کے ساتھ کچھ ایسے واقعات سنا دیئے جو تھوڑے بہت حقیقت تھے اور زیادہ تر مختلف۔"

"واقعی بڑی سنگین صورت حال ہے تم بلاشبہ بہت سی پراسرار قوتوں کی توجہ کا مرکز بن گئے ہو اور مجھے اس بات پر بڑی تشویش ہے اچھا ایک بات بتاؤ اس وقت کیا تم کرنل گل نواز کے ساتھ ہو۔"

بڑی سنگین کیفیت ہے کرنل گل نواز واپس جا چکا ہے اس کے ساتھ رانا چندر سنگھ بھی تھا وہ بھی واپس چلا گیا ہے اصل میں کرنل گل نواز بیمار ہو گیا تھا۔ رانا چندر سنگھ اسے لے کر چلا گیا' لیکن قزل ثنائی' اس کی بیوی شعورا' علی سفیان اور اس داستان کا سب سے خوف ناک کردار اناطوسیہ یا امینہ سلفا یہ ابھی موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کرنل گل نواز بے وقوف تھا' جن لوگوں کو اس نے اپنی مہم جوئی میں ساتھ لیا وہ بہت چالاک لوگ ہیں اور اپنا مقصد حل کرنے کے لئے سارے کام کر رہے ہیں اور تم' تم جیسے لوگوں کو وہ اپنے جوتے کے برابر تصور کرتے ہیں لیکن اتفاق کی بات یہ ہے کہ تم اس سلسلے میں تاریخ کا ایک پراسرار کردار بن گئے ہو۔ ایک ایسا کردار جس کے سلسلے میں بھی ابھی تک الجھا ہوا ہوں' جن لوگوں نے ہم پر حملہ کیا تھا وہ معمولی لوگ نہیں تھے بلکہ اس سلسلے میں انتہائی ٹھوس کردار کے حامل تھے میرا ایک بہترین ساتھی یعنی گورڈن شدید زخمی ہو گیا تھا' اتنا زخمی کہ عرصے تک زندگی اور موت کی کشمکش کا شکار رہا تھا بے شک اب وہ بہتر حالت میں ہے لیکن پھر بھی بہرحال وہ خطرناک عورت جو قزل ثنائی اور علی سفیان کے ساتھ ہے اس کہانی کا سب سے بھیانک کردار ہے اور اب میں تمہیں بتا دوں کہ میری اصل جنگ ہی اس کے ساتھ ہے وہ بے وقوف پروفیسر جس کا

نام قزل ثنائی ہے اور بس یوں سمجھ لو کہ ایک ثانوی کردار ہے اور تم...... خیر چلو اٹھو یہاں سے چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے" کامران والش کے ساتھ باہر نکل آیا فٹ پاتھ کے ساتھ ایک قیمتی گاڑی کھڑی ہوئی تھی والش نے اس کا لاک کھولا اور اسٹیئرنگ پر جا بیٹھا۔ کامران کے لئے اس نے برابر کی سیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی کامران تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

"مسٹر والش ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں؟"

"جہاں میں تمہیں لے جا رہا ہوں وہاں سے تمہیں بہت سی قیمتی معلومات حاصل ہوں گی" کار تقریباً آدھے گھنٹے تک دوڑتی رہی پھر اس نے اسے سڑک سے نیچے اتار دیا کامران راستے پر غور کر رہا تھا۔ والش کار کو اس طرح چلا رہا تھا جیسے یہ راستہ اس نے اچھی طرح دیکھ رکھا ہو۔ کچا اور ناہموار راستہ تھا لیکن اس کا اختتام ایک عمارت کے سامنے ہوا یہ خانقاہ نہیں تھی لیکن اس کی تعمیر کسی خانقاہ ہی کی مانند تھی بدصورت اور بھدی عمارت کے احاطے میں درخت بے ترتیب سے اگے ہوئے تھے سامنے ایک بڑا دروازہ تھا جس کے رخنوں سے روشنی چھن رہی تھی اچانک ہی والش نے سوال کیا۔

"ریوالور ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں۔" کامران نے سادگی سے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے کوئی بھی ایسا ہتھیار جس کو ہم اپنے تحفظ یا کسی پر حملہ کرنے کی شکل میں استعمال کریں۔"

"اوہو۔ میرے ذہن میں بالکل ایسا کوئی خیال نہیں تھا کہ کسی ایسی چیز کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔"

"ضرورت کا امکان تو بالکل نہیں ہے لیکن پھر بھی احتیاط اچھی چیز ہوتی ہے۔"

"افسوس اس وقت میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔"

"خیر آؤ" والش پر خیال انداز میں بولا اور کامران اس کے ساتھ چلتا ہوا عمارت کے اس بڑے دروازے کے پاس پہنچ گیا جو سامنے نظر آ رہا تھا والش نے دروازے کے پٹ کو دھکیلا تو دروازہ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھل گیا دروازے کے دوسری طرف ایک کشادہ ہال بنا ہوا تھا جس میں لاتعداد تخت بنے ہوئے تھے ہال میں کئی ستون تھے اور ان ستونوں میں چربی سے جلنے والی مشعلیں نصب تھیں یہ مشعلیں ہی ہال کو روشن کر رہی تھیں والش نے اندر داخل ہو کر چاروں طرف دیکھا اور پھر کامران کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے ایک جگہ رک گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"وہاں اس پتھر پر بیٹھ جاؤ یہ اشارہ ایک ستون کی طرف تھا۔"

"بڑی پراسرار جگہ ہے۔" کامران نے متاثر لہجے میں کہا۔

"اور بے حد خوف ناک بھی ہے۔"

"ہاں مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔"

"میں نے تم سے کہا تھا کہ احتیاط اچھی چیز ہوتی ہے تمہیں کوئی ہتھیار ضرور ساتھ لانا چاہیے تھا خیر جو کچھ ہوتا ہے تقدیروں سے ہوتا ہے اور بڑے اہتمام سے ہوتا ہے دیکھو یہ ادھر دیکھو" والش نے کوٹ کی

جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا اور بولا۔

"اور اب دیکھو اس ریوالور کی نال کا رخ تمہارے دل کی طرف ہے نشانہ ٹھیک ہے نا" کامران چونک پڑا والش کے چہرے کی سنجیدگی دیکھ کر اس نے حیرانی سے گردن ہلائی اور بولا۔

"کک۔ کیا مطلب؟"

"میری انگلی کا ہلکا سا دباؤ تمہارے دل میں سوراخ کر دے گا۔ دل کے سوراخ کا مطلب تم ضرور جانتے ہو گے" والش کا لہجہ بدل گیا تھا۔

"کوئی دلچسپ مذاق لگ رہا ہے یہ مجھے" کامران نے اپنے وجود میں پھیل جانے والی سنسنی کو چھپانے کی کوشش کی۔

"ہرگز نہیں۔ یہ ایک سنگین حقیقت ہے یہ پرسکون جگہ تمہاری آخری آرام گاہ بھی بن سکتی ہے"

والش کا لہجہ اب بے حد سفاک ہو گیا تھا۔ کامران نے کہا۔

"میں بالکل نہیں سمجھا مسٹر والش"

"بے وقوف کے بچے تم خود سے کہیں زیادہ ذہین لوگوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہو یہ بات پہلے ہی دن سے میرے علم میں تھی کہ تم مجھ سے مخلص نہیں ہو میں نے تمہیں پوری چھوٹ دی تھی کہ تم اپنی ذہانت استعمال کرتے رہو۔ میں عین وقت پر تمہاری گردن پکڑوں گا" کامران اپنی حیرتوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ والش کا سفاک لہجہ اسے سنگین صورتحال کے بارے میں بتا رہا تھا پھر اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا یہاں آنے کا یہی مقصد تھا مسٹر والش۔"

"سو فیصدی۔"

"تو پھر اب کیا پروگرام ہے؟"

"اب میں تم سے سچ سننا چاہتا ہوں۔ صرف سچ۔"

"وہ کس سلسلے میں؟"

"تم انہی لوگوں کے لئے کام کر رہے ہو میری مراد اب علی سفیان اور امینہ سلفا کے کردار سے ہے۔"

"میں نے جو کچھ تمہیں بتایا ہے وہی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔"

"کچھ ایسے کردار تمہارے ارد گرد نظر آتے رہے ہیں جن کی حقیقت تو نہیں معلوم ہو سکی لیکن ان کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ گرشک اور سیتا نہ ہوں۔"

"مجھے تعجب ہے مسٹر والش میرے سامنے اپنی مکروہ صورت پیش کرنے سے پہلے تم نے کسی گنجائش پر غور نہیں کیا مطلب یہ کہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری غلط فہمیاں نکلیں اور تم ایک کام کے آدمی سے ہاتھ دھو بیٹھو۔

"بے وقوف لڑکے جس شخص کو تم گورڈن کے نام سے جانتے ہو نا وہ اپنی نگاہ کو اپنا ایمان سمجھتا ہے۔ اس نے کبھی اس بارے میں دھوکا نہیں کھایا تمہارے گرد جو لڑکی نظر آئی ہے خصوصاً اس نے اس کے بارے میں بات کی ہے اور یہ سیتا ہے اس نے اس لڑکی کو پہچان لیا تھا جو اس وقت اس پراسرار راہب کے

ساتھ جنگ کر رہی تھی اور وہ پر اسرار راہب...... وہ پر اسرار راہب صرف اور صرف راکان ہونزا ہے سمجھے اور راکان ہونزا سے تمہارا رابطہ قائم ہو چکا ہے۔ بولو میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"بہت دلچسپ کہانیاں سنا رہے ہو بہت انوکھی۔"

"تم میرے ساتھ شطرنج کھیل رہے ہو۔ کچھ نہیں جانتے تم میرے بارے میں' کچھ بھی نہیں مجھے بتاؤ راکان ہونزا کہاں ہے؟"

"اب کب تک یہ بکواس کرتے رہو گے کوئی وقت ہو سکتا ہے اس کا۔"

"جب تک تمہاری زبان نہ کھل جائے" والش نے کہا اور پھر ایک ستوان کی طرف رخ کر کے بولا۔

"آ جاؤ اسے تمہاری ہی ضرورت ہے" کامران کی نگاہیں بے اختیار اس طرف اٹھ گئیں ستون کے پیچھے کچھ آہٹیں ابھری تھیں اس کے عقب سے گورڈن باہر نکل آیا اس وقت وہ بالکل تندرست و توانا نظر آ رہا تھا اس کا اوپری جسم بے لباس تھا اور مسلز ابھرے ہوئے تھے ایک نظر میں وہ لوہے کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا اس کی پیشانی پر پیلے رنگ کی پٹی بندھی ہوئی تھی جس میں ایک سرخ موتی جگمگا رہا تھا۔ آنکھیں شیشے کی گولیوں کی مانند چمک رہی تھیں کامران نے کہا۔

"مسٹر والش اس سے قبل بھی تم مجھ پر شبہ کر کے شرمندہ ہو چکے ہو۔ ایک بار پھر وہی حرکت دہرا رہے ہو اس وقت بے شک میں تمہارے قبضے میں ہوں جو چاہو سو کر لو لیکن بہتر یہ ہے کہ ایک بار پھر غور کر لو۔"

"اتنا الجھ گیا ہوں میں مسٹر کامران کہ اب ایک ہی ترکیب سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ ان فضول کرداروں کے درمیان سے ہٹا دوں جو میرے لئے شدید الجھنوں کا باعث بنے ہوئے ہیں میں انہیں ختم کرتا چلوں اس سے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہو گا کہ میں بہت زیادہ الجھنوں کا شکار نہیں رہوں گا۔"

"ٹھیک ہے' لیکن میں اب بھی یہی کہوں گا کہ میں آپ سے مخلص ہوں اور آپ جو کچھ کریں گے اس کے لئے آپکو پچھتانا پڑے گا۔"

"یہ مذاق میں بہت عرصے سے برداشت کر رہا ہوں اور پھر گورڈن کا بھی یہی کہنا ہے کہ ایسا ہی کیا جائے۔ گورڈن آگے بڑھ کر کامران کے مقابلے میں پہنچ گیا۔

"سنو! تمہیں مجھ سے جنگ کرنا ہو گی ان لوگوں کے بارے میں بتانا ہو گا جنہوں نے مجھے زخمی کیا اور میرے ساتھیوں کو قتل کیا۔"

"مجھے کچھ نہیں معلوم مسٹر گورڈن" کامران نے کہا ویسے اسے ایک دم اس سنگین صورتحال کا اندازہ ہو گیا تھا کہ گورڈن جیسے دیو کا مقابلہ آسان کام نہیں تھا اس وقت صحیح معنوں میں مشکل پیش آ گئی تھی اس کے لئے ذہانت سے کام لینا تھا۔ وہ اس طرح پیچھے ہٹا جیسے خوف زدہ ہو گیا ہو' لیکن حقیقت میں وہ والش کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا جس کے پاس پستول موجود تھا گورڈن کے بارے میں اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا اسے کہ وہ مارشل آرٹ کا بہت بڑا ماہر ہے۔ جسمانی طور پر اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اگر والش کا پستول ہاتھ آ جائے تو کچھ کام بن سکتا ہے اسی وقت گورڈن فضا میں اچھلا اور پھر جیسے ہی فضا میں بلند ہوا کامران نے والش پر چھلانگ لگا دی۔ گورڈن کسی برق رفتار پرندے کی طرح کامران پر آیا تھا' لیکن کامران

والش کو لپیٹ میں لیتا ہوا دوسری طرف ہٹ گیا' لیکن زمین پر گرتے گرتے بھی اس نے وہ حیرت انگیز منظر دیکھ لیا تھا۔

گورڈن نے فضا میں دو تین قلابازیاں کھائیں اور اس طرح اس نے اپنا رخ تبدیل کر لیا ورنہ وہ ان دونوں پر ہی گرتا۔ کامران کیوں کہ والش کو باقاعدہ نشانہ نہیں بنا سکا تھا اس لئے اس کا پستول بھی کامران کے ہاتھ میں نہ آ سکا والش نے بدحواسی میں پستول کو سیدھا کر کے فائر کر دیا ایک بار پھر گورڈن نے فضا میں اچھل کر اپنی جگہ چھوڑ دی' ورنہ والش کا غلط نشانہ اسے چاٹ جاتا لیکن اس بار وہ کامران کے بجائے والش کے قریب گرا تھا اور اس نے نہ جانے کس طرح والش کے ہاتھ سے پستول نکال لیا۔

"جو میرا شکار ہوتا ہے مسٹر والش اسے میں کسی دوسرے کو مارنے کی اجازت بالکل نہیں دیتا۔"

گورڈن کی غرائی ہوئی آواز ابھری اس وقت وہ ایک انوکھا وحشی نظر آ رہا تھا ادھر والش کامران کی لپیٹ میں آ کر بری طرح گرا تھا اور اس کے جسم پر چوٹیں بھی لگی تھیں وہ خود کو سنبھالنے لگا اور اس دوران کامران کو موقع مل گیا اس نے سوئپ لگا کر گورڈن کی ٹانگوں کو الجھانے کی کوشش کی لیکن اسے ایسا ہی لگا تھا جیسے اس کی ٹانگیں دو پتھریلے ستونوں میں جا پھنسی ہوں البتہ گورڈن کے چہرے پر دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور پھر اس نے ایک پاؤں کامران کی گردن پر رکھ دیا۔ کامران کو ایسا ہی لگا جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی بہ مشکل تمام اس نے اپنے آپ کو نکالا۔

"مار دو اس کتے کو مار دو" والش ہانپتے ہوئے چیخا' لیکن گورڈن کے چہرے پر ایک سفاک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بڑے اطمینان سے ریوالور کا چیمبر خالی کیا اور پھر اسے ایک طرف اچھال دیا۔

"اٹھو۔" اس نے کامران کو مخاطب کیا کامران کی نگاہیں اس دوران چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں کوئی ایسی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی تھی جس کے ذریعے اس مصیبت سے چھٹکارا پایا جا سکے بہرحال وہ اٹھ کھڑا ہوا تو گورڈن کی آواز ابھری۔

"بتاؤ راکان ہونزا کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" کامران نے جواب دیا اور اس بار وہ گورڈن کا شکار ہو گیا اس کی لات کامران کے پیٹ پر پڑی۔ وہ کرب سے جھکا تو اس نے دوسری لات کامران کی ٹھوڑی پر ماری اور کامران اچھل کر دور جا پڑا اچانک ہی گورڈن نے ایک عجیب سے انداز میں پینترے بدلنا شروع کر دیئے اس کی ہلکی پھلکی ٹھوکریں کامران کے بدن پر پڑ رہی تھیں۔ لیکن کامران کو ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے اس کے بدن پر ہتھوڑوں سے ضربیں لگائی جا رہی ہوں۔ ہر ٹھوکر پر اس کے حلق سے ایک کراہ نکل جاتی تھی اس نے کتنی ہی بار ہاتھ ٹکا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن سامنے ایک شان دار مد مقابل تھا جو رقص کے انداز میں پینترے بدل رہا تھا اور اسے اپنے ہاتھوں کا سہارا نہیں لینے دے رہا تھا۔

"جب برداشت کرنے کی قوت ختم ہو جائے تو راکان ہونزا کے بارے میں زبان کھول دینا۔" والش نے کہا۔ کامران کی قوت برداشت واقعی ختم ہوتی جا رہی تھی پورے بدن کی ہڈیاں چیخ رہی تھیں ہڈیوں کے ایک ماہر کی طرح...... گورڈن اس کے جوڑوں پر ضربیں لگا رہا تھا پھر اس کی ایک ٹھوکر کامران کے

سر پر پڑ گئی اور یہ ہر طرح سے ایک بہتر بات ہوئی کیونکہ بے ہوشی نے ان تکلیفوں سے بے نیاز کر دیا جو گورڈن کی لگائی ہوئی ضربوں سے پیدا ہو گئی تھیں اس کے بعد کیا ہوا اس کا اندازہ کامران کو نہیں تھا' لیکن ہوش آیا تو خود کو فضاؤں میں تیرتے ہوئے پایا۔ آسمان کہر آلود تھا' خشک ہوائیں بدن میں زخم ڈال رہی تھیں۔ اس نے کرب سے آنکھیں بند کیں تو آنکھیں دوبارہ نہ کھلیں اور جب کھلیں تو رات کے ہول ناک سناٹے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ کانوں میں شیر کی دھاڑ گونج رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے شیر کہیں قریب ہی موجود ہو۔ کامران کے اندر شدید وحشت بیدار ہو گئی اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو ٹوٹی ہوئی ہڈیاں چیخ پڑیں۔ ایسی تکلیف ہوئی کہ حلق سے کراہوں کے علاوہ اور کوئی آواز نہ نکل سکی اور اس تکلیف سے ایک بار پھر بے ہوشی طاری ہو گئی تیسری بار آنکھ کھلی تو بدن پر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ بینائی نے کام کیا تو ایک چوکور دروازہ نظر آیا جس کے دوسری طرف پانی کا سفید دھارا گرتا ہوا نظر آیا تھا۔ پانی اتنا قریب تھا کہ ایک پتھر پر گرنے کی وجہ سے اس کی پھواریں کامران کے بدن پر آ رہی تھیں اس کے ساتھ ساتھ پانی جس جگہ گر رہا تھا وہاں سے بھی بہت تیز آواز بلند ہو رہی تھی۔ کامران نے ایک بار پھر خود کو سنبھالا اور اٹھنے کی کوشش کی تو ناکامی نہیں ہوئی۔ اسے محسوس ہوا کہ بدن میں اب وہ درد نہیں ہے جو پہلے تھا جب اپنے آپ کو سنبھالا تو دیکھا کہ چوکور دروازہ کسی چھولداری کا ہے جس کی چھت کافی بلند تھی۔ مزید کوشش کی تو اٹھ کھڑا ہوا حیرت انگیز بات تھی کہ جو کیفیت پچھلے ہوش کے عالم میں محسوس ہوئی تھی وہ اب نہیں تھی بلکہ جسم میں ایک انوکھی سی قوت کا احساس ہو رہا تھا کامران کچھ دیر سوچتا رہا پھر آہستہ قدموں سے باہر نکل آیا ایک حسین آبشار اس کی نگاہوں کے سامنے تھی پہاڑوں ک ی بلندیوں سے ایک لمبی چوڑی سفید لکیر زمین کی طرف گر رہی تھی اور اطراف میں ایسے حسین مناظر بکھرے ہوئے تھے لیکن دور دور تک کسی انسانی وجود کا پتا نہیں تھا ماضی کا ایک ایک لمحہ یاد آ رہا تھا گورڈن نے بدن کی ہڈیاں چٹخا دی تھیں لیکن اب وہ کیفیت نہیں تھی بلکہ ایسا لگ رہا تھا کہ بدن اب پہلے سے کہیں زیادہ توانا ہو گیا ہو۔ ایسا کیسے ہوا۔

''کوئی ہے؟'' کامران نے زور سے پکارا اور اسی وقت آبشار سے بہنے والی ندی سے ایک انسانی وجود نے سر ابھار کر دیکھا نگاہوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ وہ کوئی لڑکی ہی تھی جس کے لمبے لمبے بال پانی میں بھیگ کر اس کے بدن سے چمٹ گئے تھے اس نے ایک نگاہ کامران پر ڈالی اور دوبارہ پانی میں غوطہ لگا دیا۔ کچھ دیر تک تو کامران حیرت کا شکار بنا اسی جگہ کھڑا رہا اور اس کی نگاہیں پانی کی گہرائیوں کا جائزہ لیتی رہیں اور پھر وہ اسے نظر آ گئی شفاف پانی میں اس کا وجود بے چینی سے حرکت کر رہا تھا کامران کو احساس ہوا کہ وہ وحشت زدہ ہو گئی ہے یقیناً اس کے کپڑے یہیں کہیں آس پاس ہوں گے اور کامران کی وجہ سے وہ ان تک نہیں پہنچ پا رہی' چنانچہ وہ واپس پلٹ پڑا رخ بدل کر چند لمحے انتظار کرتا رہا اور ایک بار پھر اس نے ادھر دیکھا لڑکی تھی لیکن اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ تاحد نگاہ سناٹے کا راج تھا البتہ چھوٹے چھوٹے جانور ادھر ادھر پھرتے نظر آ رہے تھے۔ ''کہاں گئیں تم سامنے آؤ۔'' کامران نے چیخ کر کہا اور جواب میں قدموں کی چاپ سنائی دی تب کامران نے چاپ کی سمت دیکھا اور ایک لمحے کے اندر اس کے سارے وجود میں ایک سنسنی کی لہر دوڑ گئی اور اس کے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ پانی میں وہی تھی اس

وقت اسے کامران اس لئے نہیں پہچان سکا تھا کہ اس کے بھیگے ہوئے بالوں کا بڑا حصہ اس کے چہرے پر بھی تھا سیتا کی حسین اور پرکشش آنکھوں میں ایک عجیب سی حیا نظر آ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کامران کے قریب آ گئی اس کے بدن پر ڈھیلا ڈھالا لباس تھا لیکن کامران کچھ لمحوں کے لئے حیران رہ گیا تھا سیتا کو شاید اس نے زندگی میں پہلی بار اتنے غور سے دیکھا تھا اور اسے ایک دم ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہوا تھا زندگی ہر رنگ سے آشنا ہو چکی تھی لیکن حسن و عشق کی کیفیت اس پر کبھی طاری نہیں ہوئی تھی اس کی جان دار آنکھیں لاکھوں حسین لڑکیوں پر بھاری تھیں۔ کچھ دیر سکتے کے عالم میں رہنے کے بعد اچانک ہی کامران نے اپنے آپ کو سنبھالا اور تعجب سے بولا۔

''سیتا تم۔''

''ہاں ایسا لگ رہا ہے جیسے تم نے مجھے پہچانا نہیں۔''

''پانی میں تم ہی تھیں نا۔''

''ہاں کیوں۔'' وہ پھر اسی انداز میں بولی اس کے چہرے پر ایک شرمندگی کی مسکراہٹ تھی شرم و حیا سے اس کا سمٹا ہوا وجود اس وقت اتنا دل کش لگ رہا تھا کہ نگاہیں اس پر سے ہٹنے نہ پا رہی تھیں اور شاید کامران کی انہی آنکھوں کے انداز نے اسے شرمسار کر دیا تھا کیونکہ بہرحال عورت تھی یا جو کچھ بھی تھی عورت کے روپ میں ہی تھی۔ کامران کو ایک دم احساس ہوا کہ اس کی نگاہیں بے باک ہوتی جا رہی ہیں چنانچہ اس نے رخ بدلتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں پہچان نہیں سکا تھا سیتا۔'' اور پھر وہ چھولداری کی طرف مڑ گیا۔

''ادھر کیوں جا رہے ہو؟''

''ایسے ہی کوئی خاص بات نہیں۔ کیوں؟''

''آؤ ادھر بیٹھتے ہیں۔'' اس نے کہا اور کامران نے اس کے اشارے کی طرف دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھر پڑے ہوئے تھے جو اوپر سے سپاٹ اور ہموار تھے۔ کامران اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا اسے اس وقت سیتا کے وجود کی ہر شے دل کش محسوس ہو رہی تھی اس کی چال میں بے پناہ کشش تھی آخر کار وہ پتھر تک پہنچ گئی اور پھر وہ آہستہ سے ایک پتھر سے ٹک گئی۔

''ٹھیک تو ہو نا تم پرم پربھو۔'' کامران کو اس وقت اس کے یہ الفاظ بہت گراں گزرے تھے لیکن بہرحال اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولا۔

''ہاں پتا نہیں کیوں میں نے تمہیں پانی میں نہیں پہچانا۔''

اس کے لہجے میں بھی شرم گھلی ہوئی تھی۔

''یہ کون سی جگہ ہے سیتا اور میں یہاں کیسے پہنچ گیا؟''

''پتا نہیں۔''

''تمہیں بھی نہیں پتا۔''

''ہاں مجھے نہیں پتا۔''

"یہ بات تو میں جانتا ہوں کہ مجھے ایک بار پھر زندگی کی طرف لانے والی تم ہی ہو۔"

"میں نہیں' راکان ہونزا۔"

"ایک ہی بات ہوئی تم دونوں الگ الگ تو نہیں ہو۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے' ہم دونوں الگ الگ ہیں۔"

"اچھا یہ بتا سکتی ہو کہ مجھے کیسے بچایا گیا۔" وہ ایک عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔ لیکن کامران کے الفاظ پر اس نے کامران کی طرف دیکھا کامران کو یوں لگا جیسے وہ دل ہی دل میں مسکرا رہی ہو۔ پھر اس نے کہا۔

"یہ بتاؤ تم کیسے ہو؟"

"اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ اپنے آپ کو تندرست پا رہا ہوں۔"

"وہ کون لوگ تھے جنہوں نے تمہیں مارا۔"

"اس سے پہلے تم مجھے ایک بات کا جواب دو کہ میں تمہیں کس حالت میں ملا تھا؟"

"افسوس میں اس وقت ساتھ نہیں تھی۔ راکان ہونزا تمہیں لایا تھا' تم بہت زیادہ زخمی تھے اور اس کے بعد تمہارا علاج کیا گیا۔"

"راکان ہونزا واقعی پراسرار قوتوں کا مالک ہے لیکن یہ بتاؤ کہ بعد میں کیا ہوا؟"

"آؤ پہلے میں تمہیں کچھ کھلاؤں پلاؤں۔" کامران اس کے ساتھ چھولداری والے علاقے میں پہنچ گیا پھر اس نے دیکھا کہ اس کی چھولداری کے پچھلے حصے میں ایک اور چھولداری لگی ہوئی ہے اس نے کھانے پینے کی چیزیں کامران کے سامنے رکھیں اور اس کے بعد چائے کا پانی چڑھا دیا' لیکن چائے بنانے کے بعد وہ بولی۔

"آؤ' جھرنے کے کنارے چلتے ہیں" کامران محسوس کر رہا تھا کہ سیتا اس وقت بہت خوب صورت لگ رہی ہے اور کسی قدر محجوبیت کے عالم میں ہے۔ بہرحال جھرنے کے کنارے بیٹھ کر وہ چائے پینے لگے بہت سی باتیں کی تھیں انہوں نے سیتا کا چہرہ کچھ عجیب سی کیفیتوں کا حامل تھا' ایک بار پھر اس نے وہی سوال کیا۔

"تمہیں مارنے والے کون تھے؟"

"والش اور اس کے ساتھی۔"

"مگر کیوں؟"

"والش اب باقی لوگوں کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے وہ بدل گیا ہے اور خود ہی کام کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح علی سفیان' قزل ثنائی اور شعورا کو بھی خطرہ ہے۔ کہیں وہ ان لوگوں کو بھی راستے سے ہٹانے کی کوشش نہ کرے۔ شام آہستہ آہستہ جھکتی آ رہی تھی کامران سیتا سے بہت سی باتیں کرتا رہا اس دوران سیتا کے انداز میں وہی مخصوص کیفیت جھلکتی رہی تھی شام کے جھٹ پٹے سے پہلے اس نے ایک عجیب سا برتن نکالا۔ ایک آئل اسٹوو پر آگ جلائی اور اس برتن میں کوئی چیز ڈال کر اسے پانی سے بھر دیا۔ کامران اسے غور سے دیکھ رہا تھا اس نے ایک اور غیر مانوس حرکت کی تو کامران چونکے بغیر نہ رہ سکا کچھ نوک دار پتھر جو اس نے ایک

تھیلی سے نکالے تھے' برتن میں ڈالے اور برتن کو اوپر سے بند کر دیا۔ کامران نے ہنس کر کہا۔

"کیا تم یہ پتھر پکا رہی ہو؟"

"تمہارا شام کا کھانا۔"

"اچھا مذاق ہے۔"

"یہ مذاق تو کئی دن سے ہو رہا ہے آج تم پہلی بار ان پتھروں کو پکتے ہوئے دیکھ رہے ہو انہی پتھروں کا عرق تمہیں دیا جاتا رہا ہے تم دیکھو تم خود اپنے آپ کو کتنا فٹ کہہ رہے ہو۔"

"ارے تم کیا واقعی سنجیدہ ہو۔"

"ہاں۔ یہ راکان ہونزا کی تجویز ہے اور میں انہی تجاویز پر عمل کر رہی ہوں۔" کامران ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا بہرحال پتھر ابلتے رہے اور اس کے بعد سیتا نے اسے ایک خوبصورت برتن میں گہرے بھورے رنگ کا یہ سیال پیش کیا کامران نے عجیب سے انداز میں اس کا پہلا گھونٹ لیا تھا' لیکن وہ تو کافی خوش ذائقہ چیز تھی اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"واہ لوگ پتھروں کو کسی قابل نہیں سمجھتے۔" سیتا بھی ہنسنے لگی تھی پھر اس نے کہا۔

"یہ پتھر عام پتھر نہیں ہیں۔" آہستہ آہستہ رات پھیلتی چلی گئی۔ سیتا کا کہنا بالکل ٹھیک تھا جنگلی جانوروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ رات گئے تک دونوں ایک ساتھ رہے اور اس کے بعد سیتا نے کہا۔

"اب تم آرام سے سو جاؤ' تمہیں کوئی خطرہ پیش نہیں آئے گا۔ میں اپنی چھولداری میں جا رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" کامران نے کہا اور اپنی چھولداری میں آرام کرنے لگا' لیکن خیالات کا طوفان ذہن پر سوار تھا اتنی سوچیں ذہن میں تھیں کہ ہر طرف طوفان بنا ہوا تھا۔ کیا کیا عجیب کہانیاں یہاں جنم لے چکی تھیں۔ بہت ہی خوف ناک صورتحال تھی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کرنل گل نواز جس نے اس سفر کے لئے اس قدر شدید محنت کی تھی۔ اب اس مہم میں شریک نہیں رہا تھا۔ کیا اس نے اس مہم کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ رانا چندر سنگھ بھی نہیں تھا جہاں تک بات علی سفیان' قزل ثنائی اور شعورا کی تھی تو کامران کو ان لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ خاور صاحب بھی بیٹی کے ساتھ دنیا چھوڑ چکے تھے۔ بہرحال کیسا بھی کردار تھا لیکن کامران کو تھوڑا ساغرور تھا اب اس کے بعد یہ سوچ بھی دامن گیر تھی کہ کیا یہاں اس مہم میں شریک رہنا ضروری ہے یا جا کر کرنل گل نواز کے حکم پر چلا جائے۔

لیکن ایک عجیب سا احساس ایک عجیب سی بے کلی دل میں جاگزیں تھی۔ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے یہ ساری باتیں تو سوچنے کے قابل تھیں۔ ادھر یہ شخص جس کی تلاش میں خاص طور سے امینہ سلفا' اناطوسیہ یا زمانہ قدیم کی تاریخ کے وہ سارے کردار جو انتہائی بھیانک حیثیت کے حامل تھے' پتا نہیں یہ سب کچھ کیا تھا۔ وہ لوگ کامران کو ایک دیوتا کا درجہ دے رہے تھے اور راکان ہونزا پہلا آدمی تھا جس نے اس احساس کا اظہار کیا تھا کہ ممکن ہے وہ اس دیوتا کا صرف ہم شکل ہو۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا غالباً رات کا آخری حصہ چل رہا تھا۔ کامران نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن نیند نہیں آئی تھی خصوصاً پتھروں کا یہ شوربا اس کے لئے ایک حیرت ناک چیز تھی' لیکن اپنے بدن میں جو توانائیاں وہ محسوس کر رہا تھا وہ بے مثال تھیں آخر کار

صبح کی خنک ہوائیں چھولداری میں داخل ہونے لگیں اور رات بھر کی جگار نیند میں تبدیل ہوگئی جب آنکھ کھلی تو خوب دن چڑھ چکا تھا۔

موسم میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا ہو چکی تھی لیکن یہ تبدیلی ناخوش گوار نہیں تھی۔ کامران اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر نکل آیا لیکن سامنے ہی اس نے راکان ہونزا اور سیتا کو پتھروں پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ راکان ہونزا کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ کھڑا ہوا اور کامران کی طرف بڑھنے لگا اس نے ایک جدید ساخت کا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا ہوا تھا۔ راکان ہونزا نے کہا۔

''اب سب سے پہلے تم نہالو اس کے بعد ہم باقی باتیں کریں گے۔''

''نہیں میرا نہانے کا موڈ نہیں ہے۔'' کامران نے جواب دیا اور پھر ندی کنارے جا کر منہ دھولیا۔ واپس پلٹا تو صرف راکان نظر آیا۔ سیتا غالباً ناشتے کی تیاری کے لئے اندر چلی گئی تھی۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ ناشتہ سنبھالے ہوئے باہر آگئی۔

''ہاں اب پہلے تم مجھے اپنی جسمانی کیفیت کے بارے میں بتاؤ تم اندر سے کیا محسوس کر رہے ہو؟''

''انتہائی حیرت انگیز میں بڑی توانائی محسوس کر رہا ہوں۔ تم نے جو غذا منتخب کی ہے وہ واقعی توانائی کا سرچشمہ ہے۔''

''ہاں میرے دوست' میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تم ہمارے لئے کس قدر اہمیت کے حامل ہو۔ ہم دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں اور یہ صرف تمہاری ذات ہے جو ہمیں دشمنوں سے بچائے گی جس شخص نے تمہیں زخمی کیا تھا میں نے اس کا بھی اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے۔ وہ اب وہاں نہیں جہاں پہلے تھا۔''

''تو اب کیا ارادہ ہے تمہارا۔''

''میں تم سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میرے' سیتا اور گرشک کے اہم ترین مشن میں تم ہمارا ساتھ دو گے؟''

''میرا خیال ہے کہ میں اب تک تو ایسا ہی کرتا رہا ہوں۔''

''اب تک جو کچھ کرتے رہے ہو وہ بے شک ہے لیکن اب تمہاری حیثیت بہت بدل چکی ہے' تم ان لوگوں کے لئے ایک خطرہ بن چکے ہو۔ اپنی دانست میں انہوں نے تمہیں ہلاک کر دیا تھا لیکن میں تمہیں ان پتھروں کی طرح بنادوں گا جن پر کوئی چیز اثر نہیں کرتی۔''

''وہ کیسے......؟'' کامران نے سوال کیا۔

''مارشل آرٹ سکھا کر میں تمہیں اس قدر طاقت ور بنادوں گا کہ تمہارے ساتھ کوئی غلط عمل کرتے ہوئے تمہارے دشمنوں کو ہزار بار سوچنا پڑے گا۔''

''لیکن کیا اس دوران خاموشی اختیار کی جائے گی مسٹر راکان ہونزا۔''

''تمہاری تربیت کے لئے کچھ وقت مخصوص کرنا ہوگا اور دوسرے کام بھی جاری رہیں گے۔''

''اور اگر اس دوران وہ لوگ اپنا کام کر کے نکل گئے تو۔''

''نہیں ان پر بھی نگاہ رکھی جائے گی تم یہ بتاؤ کہ کیا تم مارشل آرٹ سیکھنا پسند کرو گے۔''

''ہاں' جب میں یہاں ان سارے مسائل میں گھرا ہی ہوا ہوں تو بہتر ہے کہ تھوڑی سی جسمانی تربیت بھی ہو جائے۔ کامران صحیح معنوں میں اپنے بارے میں خود کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ سوچتا تو بہت کچھ تھا' حقیقت یہ ہے کہ آج بھی اسے خزانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو صرف کرنل گل نواز کے لئے ہر کام کرنا چاہتا تھا لیکن اب صورتحال کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ اسے اپنے پیروں میں بیڑیاں سی پڑی ہوئی محسوس ہوتی تھیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کچھ پراسرار قوتوں کے جال سے نہیں نکل سکتا۔ بہرحال وہ لوگ اس جگہ کو غالباً محفوظ سمجھتے تھے اور انہوں نے یہیں قیام کا فیصلہ کیا تھا یہ علاقہ بھی ایسا تھا کہ بالکل کوفت محسوس نہ ہو۔ راکان ہونزا اس سے بہت سی باتیں کرتا رہا تھا پھر اچانک ہی انہیں جنگلی جانوروں کی بھاگ دوڑ کی آوازیں سنائی دیں انہوں نے دیکھا کہ ایک چیتا نیل گائے کا تعاقب کر رہا ہے یہ ایک بڑا سنسنی خیز منظر تھا۔ خاص طور سے کامران کے لئے۔

وہ نیل گائے کی زندگی کی حفاظت اور چیتے کی شکار کی جدوجہد کو دیکھتا رہا۔ چیتے نے ایک بار نیل گائے پر چھپا مارا لیکن نیل گائے اسے چکر دے کر جھاڑیوں میں گھس گئی۔

کامران نے آہستہ سے کہا۔

''کافی خطرناک علاقہ ہے' یہاں درندے بھی ہوں گے' اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔''

''لیکن ان سے خوف زدہ نہ ہونا یہ تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔'' راکان ہونزا نے عجیب سے لہجے میں کہا اور کامران چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' لیکن راکان ہونزا نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا تھا۔ اچانک ہی کامران کو احساس ہوا جیسے راکان ہونزا یہ الفاظ کہہ کر خود الجھ گیا ہو۔ کامران نے بھی زیادہ چھان بین نہیں کی تھی۔ ہر بات کے پیچھے پڑ جانا ویسے بھی اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ یہ اندازہ اسے بہ خوبی ہو چکا تھا کہ اس کی زندگی جس پراسرار مشن سے دوچار ہو چکی ہے' اس میں بڑے بڑے لوگ اس کے گرد پھیل گئے ہیں۔ امینہ سلفا ایک تاریخی عورت جس کے بارے میں قزل ثنائی نے بتایا تھا لیکن دوسرے انداز میں۔ سیتا' گرشک' راکان' ہونزا وغیرہ...... رات ہوئی تو وہ لوگ سونے کے لئے چلے گئے اور یہ رات بھی اسی طرح گزر گئی۔ دوسری صبح راکان ہونزا نے سیتا کو کچھ ہدایات دیں اور وہ اپنی چھولداری میں چلی گئی۔ راکان ہونزا کامران کو لے کر ایک سنسان گوشے میں آگیا۔

''وہ تمہارا لباس موجود ہے اسے پہن لو۔'' کامران نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور راکان ہونزا نے انگوٹھوں سے کامران کے بدن کے مختلف حصے دبا کر دیکھے اس دوران وہ کامران سے سوالات بھی کرتا جا رہا تھا وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جو کامران کے ساتھ ہوا ہے اس کے بعد اس کے جسم کے کسی حصے میں تکلیف تو نہیں ہے۔ بہرحال اس کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے کہا۔

''جڑی بوٹیاں ازل سے انسانی جسم کی محافظ ہیں انکے بارے میں جاننا ضروری ہے بڑے بڑے ڈاکٹر ان چیزوں کو جس حصے میں استعمال کرتے ہیں انکی نمود بھی اسی زمین سے ہوئی ہے بس یوں کہو کہ جدید سائنس نے مشینوں کے ذریعے ان کی ہیئت بدل دی ہے چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ آج میں تمہیں مارشل آرٹ کا

پہلا سبق دینا چاہتا ہوں۔ خالی ہاتھ اپنے دشمنوں کے حملوں کا دفاع کرنا' کیا تمہیں اس سے دلچسپی ہے؟''

''ہاں کیوں نہیں' میں وہ قوتیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

کامران نے جواب دیا۔

''تو سنو میرے دوست' انسان گوشت پوست کا لوتھڑا ہے' لیکن مٹی کا یہ پتلا اپنی صلاحیتوں سے ناواقف ہے جسم کی کوئی حقیقت نہیں' ہڈیاں ہلکی سی ضرب لگنے سے ٹوٹ جاتی ہیں لیکن تمہارے جسم میں جو سب سے طاقت ور شے ہے وہ تمہارا دماغ ہے۔ ذہنی قوت کا اگر تم اندازہ لگانا چاہتے ہو تو اس سے لگاؤ کہ پانی کا ایک ریلا عظیم الشان عمارتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے' لیکن پانی کی بے پناہ قوت انسان کے کنٹرول میں ہے سمندر کی گہرائی کو چیر کر اس نے راستے بنائے ہیں۔ خوف ناک طوفان بھی آبی جہازوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتے' جن میں ان طوفانوں سے بچنے کی تیاریاں کر لی ہوتی ہیں' فضاؤں کی تسخیر ناممکن تھی' پرواز کرنے والے پرندوں کو صرف یہ قوتیں حاصل تھیں جو انہیں فضا میں پہنچا دیتی تھیں' لیکن آج کا انسان سیاروں تک پہنچ رہا ہے جنگل کے وحشی جانور جو درختوں کو جڑ سے اکھاڑنے کی قوت رکھتے ہیں' انسان سے دہشت زدہ ہیں اور بلاوجہ ہی نہیں ایک انسان دور کھڑے ہوئے لاتعداد جنگلی جانوروں کا صفایا کر سکتا ہے مجھے بتاؤ کیا یہ جسمانی قوت ہے کیا یہ کام بدن کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ نہیں' اس کا محرک ذہن ہی ہے ذہنی قوتوں نے جسمانی ردعمل کی شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کیا۔

ذہن اس کائنات کی طاقت ور ترین شے ہے اور جب تم اپنے جسمانی نظام کو ذہن کے تابع کر دیتے ہو تو ذہن وہ تمام قوتیں تمہارے معمولی سے جسم کو بخش دیتا ہے جو ناقابل تسخیر ہوتی ہیں چنانچہ اپنے بدن کو ان ذہنی قوتوں کا تابع کرو۔ اپنے آپ کو ذہن کے بتائے ہوئے راستوں پر گامزن کر دو تم ایک فولادی چٹان کی مانند ہو جاؤ گے' جسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تمہارے بدن کو صرف تمہارے ذہن کی طاقت کی ضرورت ہے۔ مارشل آرٹ کا سب سے پہلا اصول یہی ہے کہ اپنی جسمانی قوتوں کو ذہن کے کنٹرول میں دے دو اور ذہن کی قوتوں کو اپنے تابع بنا لو یعنی تم جب چاہو اپنے ذہن کی گہرائیوں میں ڈوب جاؤ اور بدن کو بھول جاؤ' پہلا سبق ذہن نشین کر لو۔ تمہیں اپنے ذہن کو یکسو کر کے جسم کو متحرک کرنا ہے'' یہ کہہ کر راکان ہونزا نے اپنی جیب سے ماچس کی ڈبیا نکالی اور کامران سے کہا۔

''اپنا ہاتھ ذرا پھیلاؤ اور کوشش کرو کہ تم اپنے ذہن کی گہرائیوں میں داخل ہو جاؤ۔ ذہن کی گہرائیوں میں پہنچنے کے بعد اپنے طور پر طے کرو کہ اس ماچس کو جلانے سے جو شعلہ ابھرے گا وہ تمہارے اس ہاتھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ بیٹھو پلیز بیٹھ جاؤ'' راکان ہونزا کی آواز خواب ناک ہو گئی۔ اس نے کامران کی آنکھوں میں دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''اب تم اپنے ذہن کی گہرائیوں کا سفر کر رہے ہو۔ سوچو غور کرو کہ یہ شعلہ بے اثر ہے تم پر یہ شعلہ بالکل بے اثر ہے'' یہ کہہ کر اس نے ماچس کی تیلی جلائی کامران ہوش و حواس کے عالم میں تھا۔ اس کا ذہن بھی کام کر رہا تھا اور آنکھیں بھی اس کی آنکھیں راکان ہونزا کی آنکھوں سے الجھی ہوئی تھیں پھر اس نے تیلی جلنے کی آواز سنی اور اس کے بعد یہ تیلی اس کی ہتھیلی پر آ گئی اور جب تک پوری تیلی جل کر راکھ نہ ہو گئی کامران نے

اپنے ہاتھ کو جنبش نہیں دی پھر جب تیلی جل کر راکھ ہو گئی تو راکان ہونزا نے اس کا ہاتھ پلٹ دیا اور کامران کو ایک عجیب سا جھٹکا لگا اس نے متحیرانہ انداز میں اپنی ہتھیلی کو دیکھا جس پر سفید سفید سا نشان تھا' اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا' نہ سوزش نہ چھالا۔

''ہاں یہ میری دماغی قوت تھی جس نے تمہاری دماغی قوت سے ہم آہنگ ہو کر تمہیں اس شعلے سے کوئی تکلیف نہ پہنچنے دی یہ قوت تمہیں اب اپنے ذہن میں پیدا کرنی چاہیے'' کامران گہری سانسیں لینے لگا تھا۔ بہر حال وقت گزرتا رہا جنگل کی یہ زندگی خوش گوار احساسات کی حامل تھی راکان ہونزا چلا گیا تھا اور یہاں سیتا کے سوا کوئی اور نہیں تھا سیتا کسی خادمہ کی طرح کامران کا خیال رکھتی تھی۔ وہ مسلسل پتھروں کا عرق اسے پلا رہی تھی اور کامران کو اپنے بدن میں فولادی قوتوں کا احساس ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ایک اجنبی بدن کا مالک بن گیا تھا بہر حال دن گزرتے گئے اسے مختلف قسم کی مشقوں سے گزارا گیا راکان ہونزا کبھی کبھی نظر آتا تھا۔ واقعی کامران کے اندر بے شمار قوتیں ابھرتی آ رہی تھیں اور راکان ہونزا اسے ان کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔

اب کامران اپنے ذہن کی قوتوں سے بہت دور دور تک دیکھ لیتا تھا اور راکان ہونزا نے اس سے کہا تھا۔

''بات صرف اتنی سی نہیں ہے کہ ہم تمہیں کچھ سکھا رہے ہیں تم خود بہ ذات خود زبردست قوتوں کے آدمی ہو اور اب تم یہ سمجھ لو کہ تمہاری جسمانی مشقوں کا آغاز ہوگا اور تم جس قدر جلد چاہو اپنے آپ کو اس کام میں ماہر کر سکتے ہو' البتہ ان جسمانی مشقوں سے کامران کو لطف ہی آ گیا۔ پتا نہیں یہ کیا کچھ ہو رہا تھا اس کے ساتھ۔ درختوں کی شاخوں کو نوکیلا بنا کر اسے بیساکھی کی شکل میں کامران کی بغلوں میں دے دیا جاتا اور کہا جاتا کہ وہ اپنی ذہنی قوت سے یہ محسوس کرے کہ یہ نوکیلی شاخیں اس کے بدن میں چبھ نہیں رہی ہیں۔ دو تین دن تک تو شدید تکلیف کا سامنا کرنا پڑا' خون تک نکل آتا تھا بدن سے' لیکن کامران کو ان سے بھی لطف آ رہا تھا اور اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ نوکیلی شاخوں پر لٹکنے لگا اور اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور اس کے بعد گرم ریت کی باری آئی۔ جلتی ریت میں ہاتھ دبا دیئے جاتے اور کھال جھلسنے لگتی لیکن ذہنی قوتیں آخر کار اس تکلیف پر بھی قابو پانے میں کامیاب ہو گئیں۔ کامران کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا بدن کچھ کم ہوا ہے لیکن سارا بدن اب اس قدر ٹھوس ہو گیا تھا کہ وہ خود اپنے آپ پر حیران رہ جاتا۔ مہذب دنیا سے اس کا رابطہ تقریباً ختم ہی ہو گیا تھا۔ اب تو ان لوگوں کی شکلیں بھی آنکھوں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھیں جن سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ ادھر سیتا کی بالکل وہی کیفیت تھی ایسا لگتا تھا کہ وہ لوگ صرف کامران کو تیار کر رہے ہوں اور ان کی زندگی کا اور کوئی مقصد نہ رہ گیا ہو۔ اندازے کے مطابق کوئی ڈیڑھ مہینہ گزر چکا تھا' پھر ایک دن اچانک راکان ہونزا جو کہیں سے واپس آیا تھا کامران کو قریب بلا کر بولا۔

''واہ' ہمارے دشمنوں نے ایک باقاعدہ کام تیار کر لیا ہے۔ خود علی سفیان اور قزل ثنائی نے آگے بڑھنے کے لئے بہترین اقدامات کئے ہیں۔ ان اقدامات میں آٹھ ایسے افراد شامل ہیں جو نہ صرف ان راستوں کے ماہر ہیں بلکہ جن کی کچھ اور حیثیت بھی ہے' یعنی وہ بہت سے پراسرار علوم کے ماہر بھی ہیں ان کے سربراہ کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا ہوں البتہ ایک اطلاع تمہارے لئے اور ہے۔''

''کیا......؟'' کامران نے سوال کیا۔

”والش غائب ہے اور انتہائی پراسرار طور پر غائب ہے۔“

کامران نہ سمجھنے والے انداز میں راکان ہونزا کو دیکھنے لگا تھا۔

راکان ہونزا کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ کسی قدر الجھن کا شکار ہے بہت دیر تک خاموشی طاری رہی، پھر راکان ہونزا نے کہا۔”اس سے پہلے جو لوگ ہمارے دشمن تھے وہ ہمارے لئے اس قدر خطرناک نہیں تھے لیکن اب......“ وہ پھر خاموش ہو گیا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔”میرے خیال میں ہمیں مشورہ کرنا چاہیے۔“

”وہ چلا گیا کامران کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ بہر حال فیصلہ خود راکان کو ہی کرنا تھا۔ راکان نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں صرف ایک بات جاننا چاہتا ہوں۔“

کامران نے کہا۔

”ہاں کہو۔“

”ان لوگوں کا کیا حال ہے کیا نیا گروہ بہت خطرناک ہے۔“

”ہاں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ امینہ سلفا جیسی شاطر عورت ان کے ساتھ ہے اسے کراس کرنا آسان کام نہیں ہے لیکن اب تمہارا ان سے کیا واسطہ۔ کرنل گل نواز اور رانا چندر سنگھ تو واپس جا چکے ہیں راکان ہونزا نے کہا۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے لیکن۔“

”لیکن کیا......آگے کہو۔“

”بس کبھی کبھی الجھ جاتا ہوں۔“

”کیوں......؟“

”ایسے ہی، میں سوچتا ہوں جب خزانے میری منزل نہیں ہیں تو میں گداگری کیوں کر رہا ہوں، کرنل گل نواز ان راستوں سے ہٹ گئے ہیں تو میرا ان معاملات سے کیا تعلق؟“

”ایسا نہ کہو۔ تم بے شمار انسانوں کے لئے زندگی کی نوید ہو۔ خود غرضی اچھی چیز نہیں ہوتی۔“

”تم کوئی عام انسان نہیں ہو وہ ہو جس کے شانوں پر ایک قوم کی ذمے داری ہے“

”جانتا ہوں۔“

”جانتے ہو تو اس انداز میں مت سوچو۔“

”ٹھیک ہے۔“

”میں نے تمہیں صورتحال بتائی ہے۔“

”ہاں“

”ہمیں منتشر ہونا ہے۔“

”جانا کہاں ہے؟“

”ہاں وہ میں تمہیں بتاتا ہوں یہاں سے کوئی بیس کلومیٹر دور سماگری نامی ایک قصبہ ہے اس قصبے

کے نواح میں ایک فارم ہاؤس ہے بے مثال حسن کا مالک، وسیع و عریض، ایک اچھی خاصی وسعت کا پہاڑ اس کے فارم ہاؤس کا ایک حصہ ہے اور اس سے پھوٹنے والا چشمہ ایک آبشار کی شکل میں اس کے فارم ہاؤس کے صحن میں گرتا ہے۔“

”شلوزان اس فارم ہاؤس کا مالک ہے۔“

”شلوزان......“

”ہاں۔ نسلاً گریمک ہے لاتعداد خوبیوں کا مالک ہے۔“

”ٹھیک۔“

”مجھے اس کی زندگی کی پوری کہانی معلوم ہے۔“

”وہ کیسے۔ کیا اس نے تمہیں بتایا تھا۔“

”نہیں۔“

”تو پھر“۔

”میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ شائی تھن کی خانقاہ میں داخل ہوا تھا۔

”شائی تھن؟“ کامران نے سوال کیا۔

”کوشالہ کے جنوب میں ایک بستی ہے۔“

”ہوں پھر......؟ کامران دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

صبح کا نور پھیلنے لگا تھا پتھر کے بنے ہوئے فرش پر شبنم کی نمی چمک رہی تھی سورج نکلتے ہی دھوپ کی کرنیں اسے چاٹ جائیں گی وہ اب تک خانقاہ کے اس ماحول کا عادی نہ ہو سکا تھا نیم خوابیدہ ذہن کے ساتھ جب خانقاہ کے احاطے میں آیا تو شیونگ کٹ اس کے ہاتھ میں تھی۔ پتھریلے فرش پر چلتے ہوئے اس کے کھڑاؤں کی کھٹا کھٹ سن کر کئی بھکشوؤں نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ اس نے ارغوانی رنگ کی ڈھیلی ڈھالی عبا کو ایک جھٹکا دیا اور احاطے کے درمیان میں بنے ہوئے کنویں سے پانی نکالا۔ بانس کے بنے ہوئے ڈونگے سے پانی پی کر اس کی نیند غائب ہو گئی پنی موکھا کے اصولوں کے تحت صبح بیدار ہوتے ہی اسے اپنی آتما کو پوتر کرنا چاہیے وہ ان دس عہد کا پابند تھا لیکن اب تک عادی نہ ہو سکا تھا۔

ڈول سے اپنی کھینچ کر اس نے غسل کیا۔ دوسرے بدھ بھکشوؤں کے درمیان وہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ اس کا دراز قد، رنگ اور خدوخال سب ان سے مختلف تھے۔ کنویں کی منڈیر پر بیٹھ کر اس نے ٹھنڈے پانی سے شیو کیا اور جب سر کے بال صاف کرنے لگا تو ایک بھکشو نے آ کر سیفٹی ریزر اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کے سر کو بالکل صاف اور چکنا کر دیا۔

”کوپ چائی“ اس نے بھکشو کا شکریہ آنری زبان میں ادا کیا۔ حالانکہ ایک دوسرے کی مدد کرنا ان کے فرض میں داخل تھا۔ وہ بھکشو کوئی جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گیا اور احمد شلوزان مسکرا کر رہ گیا بھکشوؤں کے رواج کے مطابق شکریے کا جواب نہیں دیا جاتا۔

احمد شلوزان تازیری کا رہنے والا تھا۔ اپنے دشمنوں سے چھپ کر وہ اس بدھ خانقاہ میں بھکشو بن کر

زندگی بسر کر رہا تھا اس نے اپنی کوٹھڑی میں پہنچ کر عبا تبدیل کی۔ وہ خانقاہ کا واحد بھکشو تھا جس کے پاس دو عبائیں تھیں اپنا کاسہ اور چھتری اٹھا کر وہ بھیک مانگنے روانہ ہو گیا بھکشوؤں کے لئے لازم تھا کہ وہ صبح خود جا کر اپنے لئے ناشتے کی بھیک مانگیں۔ بلند چھری مینار سے گھنٹے کی آواز گونجنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ گھنٹہ ایک سو آٹھ بار بجے گا وہ باہر نکلا تو دھوپ میں ابھی سے تمازت پیدا ہو چکی تھی۔

شہری سڑکیں صاف اور کشادہ تھیں۔ ابھی ان پر سناٹا طاری تھا۔ اکا دکا لوگ یا گاڑیاں نظر آ جاتی تھیں۔ شہر کے دوسرے علاقوں میں بنے ہوئے مندروں اور خانقاہوں کے کلس چمک رہے تھے۔ ربانیہ کی ایک ویران شاہراہ پر وہ آگے بڑھتا رہا۔ وہ مسلسل یہ سوچ رہا تھا کہ آج وہ کس جگہ پر جا کر بھیک مانگے۔ یہ ہر صبح کا مسئلہ تھا کیونکہ ایک ہی علاقے کے لوگوں سے ایک سے زائد بار بھیک مانگنا غیر مہذب تصور کیا جاتا تھا۔

وہ سڑک کے موڑ سے آگے نکل کر ایک بڑے مندر کے قریب پہنچ گیا مندر کے سامنے ایک برف کے گولے والا سڑک کے درمیان کھڑا تھا اور اس کے گرد بچوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

احمد شلوزان اور کنارے ہو گیا تا کہ برف والا کہیں گولا بنا کر اسے بھیک میں نہ دے دے اسی لمحے ایک لمبی سی کار مندر کی سیڑھیوں کے پاس آ کر رکی اور اس میں سے ایک مرد اور ایک لڑکی باہر نکلے۔ مرد خاصی عمر کا تھا لڑکی جوان اور بے حد خوب صورت تھی۔ وہ انگریز معلوم ہوتی تھی کوشش کے باوجود وہ اس کے چہرے سے نگاہ نہ ہٹا سکا۔ وہ شاید سیاح تھے اور مندر دیکھنے آئے تھے۔

وہ ابھی مندر سے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ لڑکی بڑی دلچسپی کے ساتھ مندر کو دیکھ رہی تھی اس نے تصویر لینے کے لئے کیمرا آنکھوں سے لگایا ہی تھا کہ کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا پستہ قد شخص تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اس نے لڑکی کے پاس پہنچ کر بڑی برق رفتاری سے لڑکی کی بغل میں دبا ہوا پرس چھینا اور بے تحاشا بھاگ نکلا۔ لڑکی گھبرا کر مڑی اور حیرت زدہ نگاہوں سے بھاگتے ہوئے پرس چور کو دیکھنے لگی جو احمد شلوزان کی طرف بڑھ رہا تھا...... احمد سڑک کے درمیان میں آ کر کھڑا ہو گیا لیکن چور کو معلوم تھا کہ بھکشو ایسے معاملات میں دخل نہیں دیتے اس لئے اس نے پروا نہیں کی اور یہی اس کی غلطی تھی۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے احمد نے اپنی چھتری اس کی ٹانگ میں اڑا دی چور منہ کے بل گر پڑا۔ پرس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کچھ فاصلے پر جا پڑا، خوف زدہ چور نے گھوم کر ایسی نگاہوں سے احمد کو دیکھا جیسے وہ کوئی بد روح ہو اور پھر پرس چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

لڑکی اور مرد لپک کر احمد شلوزان کے پاس پہنچ گئے۔ احمد خاموش کھڑا رہا اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

''تم انگریزی سمجھتے ہو؟'' لڑکی نے مترنم آواز میں پوچھا۔

''ہاں'' احمد شلوزان نے جواب دیا۔

''تم اپنا پرس اٹھا لو میں اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔''

''کیوں؟'' لڑکی حیران ہو کر مسکرائی۔

''بھکشو'' عورت یا اس کی کسی چیز کو نہیں چھو سکتے'' احمد شلوزان نے جواب دیا۔

''حیرت انگیز'' لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

''کیا تم عورت کو اپنا نام بھی نہیں بتا سکتے؟''

''میرا نام احمد شلوزان ہے میں تازیری کا رہنے والا ہوں۔''

''خوب مسٹر احمد تم بڑے دلچسپ بھکشو ہو۔ میں تمہاری بے حد ممنون ہوں'' لڑکی نے کہا۔

''میرا نام کلاڈیا وارتھن اور یہ مسٹر تھامسن لارڈ ہیں۔ شاید تم کو یہ جان کر خوشی ہو کہ میرے والد جرمن تھے لیکن ماں صومالیہ سے تعلق رکھتی تھی انکی شادی پانامہ میں ہوئی تھی۔

''آپ کی صاف گوئی قابل ستائش ہے مس کلاڈیا۔ اس نے پہلی بار مسکرا کر اسے دیکھا۔

''مس نہیں مسز'' کلاڈیا نے بڑے دل کش انداز میں کہا۔

''میرا خیال ہے اب ہوٹل واپس چلیں۔'' تھامسن نے مداخلت کی۔

''تم کو جلدی ہے تو چلے جاؤ۔'' کلاڈیا نے غصے میں کہا مسٹر شلوزان جیسے بھکشو سے بات کرنے کا موقع بار بار نہیں ملتا۔ ویسے کیا خیال ہے اگر آپ بھی ہوٹل چلیں ہم ساتھ چائے پییں گے۔''

احمد شلوزان ایک لمحہ سوچتا رہا ہوٹل میں ناشتے اور چائے کا تصور بڑا سہانا تھا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے آپ مجھے ناشتے کی بھکشا دے کر اگلے جنم میں ثواب پائیں گی۔''

کلاڈیا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اسے یہ پڑھا لکھا دل فریب بھکشو بہت پسند آیا تھا۔ ہوٹل کے گرل روم میں اسے کلاڈیا کے ساتھ بیٹھنا پڑا کیونکہ تھامسن معذرت کر کے چلا گیا تھا اسے ایک بھکشو کے ساتھ کلاڈیا کی یہ بے تکلفی ناگوار ہوئی تھی گرم گرم چائے اور ناشتے کی لذت احمد شلوزان کو ایک عرصے کے بعد نصیب ہوئی تھی اس لئے اس نے چائے کا دوسرا کپ بھی بنایا اور مزے لے کر پینے لگا۔

''تم ایک سال سے بھکشو بنے ہوئے ہو؟'' کلاڈیا نے پوچھا۔

''یہ تو بڑی طویل مدت ہے۔''

''نہیں یہ مدت سمندر میں قطرے کے برابر ہے۔'' احمد شلوزان نے کہا۔

''لوگ ساری عمر تپسیا کر کے بھی گیان حاصل نہیں کر پاتے۔''

''لیکن تم مسلمان تھے پھر اپنا مذہب کیوں چھوڑ دیا؟''

احمد شلوزان ہنس پڑا'' میں اب بھی مسلمان ہوں۔ میں نے مذہب ترک نہیں کیا صرف ذہن کو سکون پہنچانے کے لئے یہ ریاضت کر رہا ہوں۔'' اس نے بہانہ بنایا۔

''لیکن کیوں؟'' یہ عمر فقیری اختیار کرنے کی تو نہیں؟ تم پر ایسی کیا مصیبت آن پڑی تھی؟ کلاڈیا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''لمبی کہانی ہے تم بور ہو جاؤ گی۔''

''اوہ نہیں احمد! میں بڑی دلچسپی سے سنوں گی۔''

''مجھے صبح کی عبادت میں شریک ہونا ہے۔'' احمد شلوزان نے کہا۔ ''اگر میری داستان حیات اتنی ہی دلچسپ ہے تو میں شام کو آنے کی پھر کوشش کروں گا لیکن اس کے لئے پہلے گرو سے اجازت لینا ہوگی۔''

کلاڈیا نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا احمد مسکرا دیا۔ ''میں نے پہلے بتا دیا تھا کہ بھکشو کے لئے عورت کو ہاتھ لگانا منع ہے۔''

احمد اس کش مکش میں تھا کہ کلاڈیا کے پاس جائے یا نہیں اس عورت کی شخصیت میں اسے ایک ان جانی کشش محسوس ہوئی تھی' لیکن دوسری طرف اتنے دنوں کی ریاضت خطرے میں تھی بدھ اصولوں کے مطابق پانچ باتوں سے پرہیز لازمی تھا۔ کسی جان دار کو ہلاک کرنا' چوری کرنا' نشہ کرنا' دل آزادی کرنا' لیکن بھکشوؤں پر مزید پانچ پرہیز لازم تھے ان کو جنسی تعلقات قائم کرنے' دوپہر کے بعد کسی قسم کی غذا کھانے' رقص و موسیقی' خوشبو اور ہر قسم کے زیور کی سختی سے ممانعت تھی لیکن وہ یہاں بدھ مذہب اختیار کرنے نہیں آیا تھا۔

احمد شلوزان انہی خیالات میں گم تھا کہ ایک بھکشو نے اسے آکر پیغام دیا کہ مہا گرو بلا رہے ہیں۔

وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی چونک پڑا وہ اکیلے نہیں تھے ان کے سامنے کلاڈیا بیٹھی ہوئی چائے پی رہی تھی احمد شلوزان کو دیکھ کر مسکرا دی۔

''آجاؤ۔ آجاؤ......احمد شلوزان'' انہوں نے کہا۔

''مسز کلاڈیا وارتھن جو کچھ کہنا ہے تم خود کہو تو بہتر ہوگا۔''

''مجھے یہاں دیکھ کر تم اتنے حیران نہ ہو۔'' کلاڈیا نے دل آویز انداز میں کہا تمہارے واپس آنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ تم میری مدد کرسکتے ہو اس لئے میں خود یہاں آگئی۔''

''میں ایک بھکشو تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔'' احمد شلوزان نے حیران ہوکر پوچھا۔

''تم نے میرے شوہر ڈاکٹر آئزک کا نام ضرور سنا ہوگا ان کی ایک کتاب ''جنگل'' حال ہی میں شائع ہوئی ہے'' کلاڈیا نے کہا۔ احمد شلوزان نے سر ہلایا۔

''وہ آج کل آئنائل کی سرحد کے قریب گھنے جنگلات میں کسی جگہ کام کررہے ہیں۔ انہیں ہمیشہ سے دشوار گزار اور دور دراز علاقوں کے غریب باشندوں کی مدد کا جنون ہے۔ میں ان کے پاس جانا چاہتی ہوں تم اس علاقے سے واقف بھی ہو اور مقامی زبان بھی جانتے ہو اس لئے مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔''

احمد شلوزان نے ملوکا کی سمت دیکھا۔ ''میری طرف سے تم کو اجازت ہے۔'' انہوں نے فوراً کہا۔ ''ہماری شادی دو سال قبل ہوئی تھی آئزک پہلے بھی کئی صومالیاتی ممالک میں غریبوں کے علاج کے لئے قیام کرچکے ہیں جب انہوں نے اس علاقے میں کام کرنے کا ذکر کیا تو میں نے ہی امدادی ڈسپنسری قائم کرنے کے لئے ان کو سرمایہ دیا تھا اس لئے سچ پوچھو تو غلطی میری ہی ہے۔ دراصل وہ اس علاقے کے مقامی لوگوں پر ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن یہاں آنے کے کچھ عرصے بعد سے مجھے ان کے بارے میں کچھ خبر نہ مل سکی۔ ابتدا میں چند خطوط ملے لیکن پھر شاید وہ ایسی جگہ قیام پذیر ہوگئے جہاں سے خط وکتابت دشوار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتحال میرے لئے تکلیف دہ تھی اس لئے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''کیا میں اس سلسلے میں کچھ کرسکتا ہوں؟'' احمد شلوزان نے پوچھا۔

''میں اپنی ازدواجی زندگی کے سلسلے میں مدد نہیں مانگ رہی ہوں۔'' کلاڈین نے وضاحت کی'' وہ میرا ذاتی معاملہ ہے آئزک یہاں سے واپس نہیں جانا چاہتے۔ ہمیشہ ایک ہی بہانہ کردیتے ہیں کہ بہت مصروف ہوں۔ بے حد اہم کام میں لگا ہوا ہوں اور میں کہتی ہوں کہ طلاق سے پہلے دوبدو بات کرلوں۔ تم کو اس جگہ تک میری رہنمائی کرنا ہے جہاں وہ ان دنوں مقیم ہیں۔''

''اوہ......'' احمد شلوزان نے کہا۔

''ہاں تم میری مدد کرسکتے ہو جانے کیوں اس مختصر سی ملاقات میں مجھے تم پر اعتماد ہوگیا ہے۔ میں تم کو اس کام کا معقول معاوضہ دوں گی؟''

''ہم بھکشو لوگ کوئی خدمت کرکے معاوضہ نہیں لیتے۔'' احمد شلوزان نے آہستہ سے کہا۔

''اوہ مجھے معاف کردو۔'' کلاڈیا نے کہا۔ ''اسے خانقاہ کے لئے عطیہ سمجھ لینا اب تو تم کو کوئی اعتراض نہیں۔''

''ہمیں روانہ کب ہونا ہے؟''

''جتنی جلدی ممکن ہوسکے۔'' کلاڈیا نے کہا۔

کلاڈیا کے جانے کے بعد وہ ایک عجیب سی بے چینی محسوس کررہا تھا۔ ابھی دھوپ کافی تیز تھی گرمی کی پروا کئے بغیر وہ بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا۔ جب دھندلکا پھیلنے لگا تو چہل قدمی کرتا ہوا خانقاہ کی سمت واپس روانہ ہوگیا۔ سڑک سنسان ہوچکی تھی وہ اپنے خیالات میں گم تھا کہ اچانک ایک کار اس کے برابر آکر رکی اور کسی نے پکارا۔

''شلوزان۔''

ایک لمحے کے لئے وہ گھبرا گیا اس نے سوچا کہ شاید ان لوگوں نے اسے تلاش کرلیا ہے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے کار کی سمت دیکھا۔ تاریکی میں وہ کار کے اندر بیٹھے ہوئے شخص کو پہچان نہ سکا۔ اس لئے کار کے قریب پہنچ کر اندر جھانکا۔ آواز دینے والا اس کے وطن کے سفارت خانے کا ارتضٰی تھا۔

''اوہ آپ ہیں'' احمد شلوزان نے کہا۔ وہ ارتضٰی کو پہچانتا تھا ان کی ملاقات ایک مرتبہ اتفاقاً ہوگئی تھی اور ارتضٰی اس کے ساتھ بڑے خلوص سے پیش آیا تھا۔

''فرمایئے......؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر کوئی حرج نہ سمجھو تو کار میں بیٹھ جاؤ'' ارتضٰی نے کہا۔

''میں نہیں چاہتا کہ ہمیں کوئی اس طرح باتیں کرتا ہوا دیکھے'' اس کا لہجہ رازدارانہ تھا احمد شلوزان ایک لمحے ہچکچایا لیکن پھر وہ دروازہ کھول کر ارتضٰی کے برابر بیٹھ گیا۔

''کوئی اہم بات ہے؟''

''ہاں میرے دوست بہت اہم مجھے تمہاری مدد درکار ہے'' ارتضٰی نے کہا۔ احمد شلوزان حیران رہ گیا آج یہ دوسرا اتفاق تھا جو کسی کو اس کی مدد کی ضرورت پڑ گئی تھی۔

''میری مدد......؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں'' ارتضٰی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''مجھے امید ہے کہ تم ایک برادر ملک کی مدد ضرور کرو گے۔''

''لیکن کس سلسلے میں؟''

''پہلے میری بات غور سے سن لو'' ارتضٰی نے کہا۔

''تم جانتے ہو کہ میں اپنے وطن کے سفارت خانے میں سکیورٹی کے شعبے کا انچارج ہوں مجھے ربانیہ میں ایک خاص مقصد کے لئے بھیجا گیا ہے۔ کچھ عرصے سے ہیروئن کی بھاری مقدار وطن کے مشرقی حصے میں پہنچ رہی ہے جہاں سے وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ ملک کے دونوں حصوں کے بڑے شہروں کو اسمگل ہوتی ہے اس کے بعد یہ شہر کے نوجوان طلبہ' کارکن' حکومت کے ملازمین میں چابک دستی کے ساتھ پھیلائی جاتی ہے۔ نئی نسل کو اس خطرناک نشے کا عادی بنانے کی یہ سازش بڑی سمجھ بوجھ کے ساتھ کی جارہی ہے جب وہ اس کے عادی ہوجاتے ہیں تو ان کو تخریبی مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور یہ ساری ہیروئن اس علاقے سے اسمگل ہوتی ہے۔ ہمارے وطن کے علاوہ اس کی بڑی منڈی تنزانیہ' دیالیہ اور دوسرے ممالک ہیں۔ یہ سازش ایک دشمن ملک دمامہ کررہا ہے۔ ممکن ہے تم جانتے ہو کہ پہلے افیون سے مارفین بنتی ہے اور پھر اس سے ہیروئن بنائی جاتی ہے آئر لینڈ کے جنوبی علاقے میں آج بھی قبائل افیون کی کاشت کرتے ہیں حالانکہ یہ ممنوع ہے۔ فرلوس اور دوسرے سرحدی علاقوں سے افیون سمگل ہوتی تھی ربانیہ سمیت ملک بھر میں ہیروئن بنانے کا کوئی پلانٹ نہیں ہے خوش قسمتی سے ہمیں ایک شخص ایسا مل گیا جس نے اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں اس کا نام طاؤس ہے وہ تماکش کے شہر کے قریب ایک پہاڑی گاؤں میں ٹیچر ہے۔ اس کا تعلق مقامی قبائل سے ہے وہ گزشتہ ایک سال سے ہمارے لئے کام کررہا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں آئر سکیورٹی سروس کا تعاون حاصل ہے ہم نے طاؤس کو ایک خفیہ وائرلیس سیٹ دیا تھا جس سے وہ اہم معلومات فراہم کرتا تھا اس نے آخری پیغام یہ دیا تھا کہ اس نے اس گھناؤنی سازش کا پتا چلالیا ہے اور ایسا سراغ مل گیا ہے جو اس گروہ کو بے نقاب کردے گا۔ لیکن اس کو شک ہے کہ کسی کو اس کے اور خفیہ ٹرانسمیٹر کے بارے میں پتا چل گیا ہے اس کے لئے وہ وائرلیس سے تفصیل نہیں بتا سکتا۔ وہ اس پیغام کے بعد وائرلیس سیٹ تباہ کردے گا تاکہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ مل سکے اس کے لئے خود ربانیہ آنا بھی خطرناک ہے کیونکہ ممکن ہے اس کی نگرانی ہورہی ہو۔ ذرا بھی شک ہوا تو وہ کبھی یہاں تک نہ پہنچ سکے گا اس لئے اس نے تاکید کی ہے کہ کسی قابل اعتماد آدمی کو جو آئر زبان جانتا ہو فوراً وہاں بھیجا جائے اور اس کام کے لئے تم موزوں ترین آدمی ہو۔''

''میں......؟ لیکن کیوں؟ میں......''

''پہلے پوری بات سن لو۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم مسز کلاڈیا کے ساتھ جنوبی علاقے کی سمت جارہے ہو۔ تم آئر زبان اچھی طرح جانتے ہو۔ مسز کلاڈیا اپنے شوہر سے ملنے جارہی ہیں جن کا دیہی اسپتال طاؤس کے گاؤں کے بالکل قریب ہے اور تم پر کسی کو شک بھی نہیں ہوسکتا اب بتاؤ تم سے زیادہ موزوں شخص کون ہوسکتا ہے؟''

''لیکن تم جانتے ہو کہ میں بھکشو ہوں اور کسی ایسے کام میں ملوث نہیں ہوسکتا۔''

''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم تازیری کے کمانڈو فورس کے ایک بہادر سپاہی ہو اور صدر جیمس فراڈو کے کٹر حامی تھے اسی لئے جیمس فراڈو کے خاتمے کے بعد ملک چھوڑنے پر مجبور ہوگئے اور اب یہاں بہ ظاہر بھکشو بن کر زندگی گزار رہے ہو۔''

''کیا تم...... مجھے بلیک میل کررہے ہو؟'' احمد شلوزان نے غصے میں پوچھا۔

''نہیں برادر عزیز! ہرگز نہیں' میں تم جیسے مخلص انسان کے لئے یہ تصور بھی نہیں کرسکتا۔ یہ راز

صرف میری ذات تک محدود ہے۔ صدر جیمس فراڈو ہمارے عظیم محسن تھے تم ان کے سپاہی ہو۔ کیا تم ہماری مدد سے انکار کرسکو گے۔''

ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کھانا کھاتے ہوئے کلاڈیا نے شلوزان کی سمت دیکھا بھکشوؤں کا لباس اتارنے کے بعد وہ ریڈی میڈ سوٹ میں بھی بڑا وجیہ لگ رہا تھا۔

دو دن سے وہ ربانیہ کے شہر میں مارے مارے پھرتے رہے تھے تب جاکر سفر کے انتظامات مکمل ہوئے تھے سب سے زیادہ دشواری علاقے کے لئے ٹویوٹا بس ویگن حاصل کرنے میں ہوئی تھی پھر کھانے پینے کا سامان' مچھردانیاں' کمبل' پرائمس اسٹوو' جنگل میں جھاڑیاں کاٹنے والے لمبے چاقو' کمپاس اور دیگر ضروری اشیا خریدنے میں کافی وقت لگا تھا ویگن میں تمام سامان لاد کے جمبو روڈ کے ریلوے اسٹیشن سے ٹرین کے ذریعے روانہ کردیا گیا تھا انہوں نے اپنے لئے بھی سیٹ ریزرو کرالی تھی۔

احمد شلوزان کو ایک طویل مدت کے بعد کسی عورت کا قرب ملا تھا لیکن کلاڈیا عورت سے زیادہ ایک دلچسپ...... ساتھی ثابت ہوئی تھی اس کی بے باکی اور بے تکلفی میں خلوص تھا۔

وہ مغرب کی آزاد خیال عورتوں کی طرح جنس کی بھوکی نہیں تھی وہ ایک اچھی دوست اور ساتھی تھی احمد شلوزان کو یقین تھا کہ اس دشوار گزار سفر میں وہ بار ثابت نہ ہوگی اس نے کلاڈیا کو ارتضٰی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا ان کی دوسری ملاقات سفارت خانے میں ہوئی تھی ارتضٰی اسے رات کی تاریکی میں وہاں لے گیا تھا وہاں ربانیہ سکیورٹی کا ایک اور افسر بھی موجود تھا اس کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ جلد از جلد طاؤس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے۔ شناخت کے لئے اسے کوڈ بتادیا گیا تھا ''شکل خرگوش جیسی' دل شیر جیسا'' آئر زبان کا یہ محاورہ شناختی کوڈ تھا جسے سن کر طاؤس سمجھ جائے گا کہ وہ جو کچھ اطلاع فراہم کرے اسے اچھی طرح ذہن نشین کرکے احمد شلوزان کو تیز رفتاری کے ساتھ تماکش کے شہر پہنچنا تھا اور پھر فون یا تار کے ذریعے اپنی آمد کی اطلاع ارتضٰی کو دینا تھی۔ وہ لوگ فوراً بذریعہ طیارہ وہاں پہنچ کر احمد شلوان سے رابطہ قائم کریں گے۔

احمد شلوزان نے محسوس کیا تھا کہ ارتضٰی کافی فکرمند تھا یہ مشن یقیناً بہت خطرناک ہوگا ورنہ وہ اتنا پریشان نہ ہوتا۔ احمد شلوزان اس مقصد کے لئے اپنی جان کا خطرہ نہ مول لیتا اگر مسئلہ ایک برادر ملک کا نہ ہوتا اب وہ وعدہ کرچکا تھا اور بہرصورت اسے پورا کرنا تھا۔ وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک اس کی نظر برابر والی میز پر پڑی۔ ایک بھاری بھرکم خطرناک شکل والا غیرملکی کلاڈیا کو مسلسل گھور رہا تھا اس کے تینوں ساتھی بھی پیشہ ور بدمعاش لگ رہے تھے شراب کے گھونٹوں کے درمیان وہ سر جھکا کر رازدارانہ انداز میں سرگوشیاں کرتے اور مسکرانے لگتے۔ احمد شلوزان کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ خاموش رہا۔

''کیا سوچ رہے ہو احمد شلوزان۔'' کلاڈیا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''کچھ نہیں' تم کافی پیو میں ابھی آیا۔'' وہ کرسی سے اٹھا اور آرام سے چلتا ہوا باہر نکل گیا مقصد صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں یہ بدمعاش کیا کرتے ہیں۔ وہ جیسے ہی واپس پہنچا اس کی نظر بدمعاشوں کی ٹولی کے اس فرد پر پڑی جو کلاڈیا کے پاس کھڑا تھا اور جھک کر اس سے کچھ کہہ رہا تھا اسے دیکھ کر کلاڈیا مسکرا اٹھی۔

"اچھا ہوا تم آگئے احمد۔" کلاڈیا نے کہا "انہیں بتاؤ کہ مجھے ان کے ساتھیوں کے ساتھ شراب پینے کی دعوت قبول نہیں ہے۔"

"گٹھے ہوئے بدن والے شخص نے بڑی حقارت سے احمد شلوزان کا جائزہ لیا۔

"تم نے سنا نہیں؟" احمد شلوزان نے کہا۔

"ہاں لیکن مجھے یقین نہیں آیا" بدمعاش نے غراتے ہوئے کہا۔

"تم کیا دلال ہو؟"

احمد شلوزان کے جسم میں آگ لگ گئی تھی اس نے بہ مشکل خود پر قابو پایا "تم شاید نشے میں ہو بہتر ہے کہ چلے جاؤ" اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"لڑکی مسٹر ہیپ برزہ کو پسند آگئی ہے اسے جانا پڑے گا۔"

وہ غرایا۔

احمد شلوزان کا ہاتھ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ چلا مکا اتنا بھرپور تھا کہ بدمعاش اپنا پیٹ پکڑ کر کراہنے لگا اسی لمحے بھاری بھرکم شخص آگے بڑھا۔ احمد شلوزان تیار ہوگیا۔ پہلے بدمعاش نے اپنا مکا بلند کیا۔ "خبردار جم!" ہیپ برزہ دہاڑا۔

"اپنی میز پر جاؤ۔"

"لیکن اس کتے نے مجھے مکا مارا ہے مسٹر ہیپ برزہ! میں اسے" مسٹر ہیپ برزہ نے اتنے خون خوار انداز میں اسے گھورا کہ جم کا جملہ پورا نہیں ہوسکا وہ اپنے ساتھیوں کے پاس جاکر بیٹھ گیا اور بڑی خوں خوار نظروں سے احمد شلوزان کو گھورنے لگا۔

"مجھے افسوس ہے مس! جم کچھ زیادہ ہی پی گیا تھا" ہیپ برزہ نے کلاڈیا سے معذرت کی۔

"کوئی بات نہیں اب اس کا نشہ دور ہوگیا۔" کلاڈیا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ بہت خطرناک آدمی ہے کیوں نہ آپ دونوں ہمارے ساتھ بیٹھ کر کچھ پئیں اس طرح تلخی دور ہوجائے گی۔"

"شکریہ مسٹر ہیپ برزہ! لیکن یہ ممکن نہیں" کلاڈیا کا لہجہ بے حد سخت تھا۔

"آج تک میری دعوت سے کسی نے انکار نہیں کیا" ہیپ برزہ نے بل ڈاگ جیسا منہ بنا کر کہا "ہم دوستی چاہتے ہیں۔" "گڈ بائی مسٹر!" کلاڈیا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ہیپ برزہ کی آنکھیں سرخ ہوگئیں وہ زخمی بھیڑیے کی طرح انہیں گھورتا ہوا واپس چلا گیا احمد شلوزان کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"تم واقعی بڑے کام کے آدمی ہو" کلاڈیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کسی بھکشو سے اتنی بہادری کی توقع نہیں ہوسکتی۔"

"میں ہمیشہ سے تو بھکشو نہیں تھا" احمد شلوزان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بہتر یہ ہے کہ ہم یہاں سے اٹھ چلیں۔"

"سنا ہے ربانیہ میں بڑے حسین نائٹ کلب ہیں؟"

"ہاں لیکن میں نہیں جاسکوں گا" احمد شلوزان نے کہا کسی حسین عورت کی عزت کے لئے لڑنا اور بات ہے لیکن رقص وموسیقی۔ یہ ممکن نہیں۔"

"بڑے عجیب بھکشو ہو تم احمد شلوزان" کلاڈیا بے ساختہ ہنس پڑی۔

"جیسے تمہاری مرضی۔"

"یہ دوسری رات تھی تماکش جانے والی ٹرین کی ڈائننگ کار میں بیٹھے وہ کھانا کھا رہے تھے ایک موٹا سا پستہ قد کنڈیکٹر ٹکٹ چیک کرتا ہوا ان کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا وہ آئریوں کی طرح خوش مزاج تھا اور ہر ایک سے شگوفے بازی کرتا چلا آرہا تھا کلاڈیا نے پرس سے ٹکٹ نکال کر اسے دیا احمد شلوزان نے آئری زبان میں پوچھا۔

"کیا اگلا اسٹاپ وجیریری کا ہوگا؟"

کنڈیکٹر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کسی غیر ملکی سے اس روانی کے ساتھ آئری زبان میں گفتگو حیرت انگیز تھی۔

"ہاں۔ اگلا اسٹاپ وجیریری ہوگا" اس نے جواب دیا۔

"کیا اب بھی وہاں فرائیڈ جھینگے ملتے ہیں؟" احمد شلوزان نے کہا۔

کنڈیکٹر بے ساختہ مسکرادیا "ہاں ان میں بڑی توانائی ہوتی ہے" وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

"کیا باتیں ہورہی تھیں؟" کلاڈیا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں' مذاق کررہا تھا" احمد شلوزان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تم زیادہ دن یہاں رہے تو خود بھی آئری باشندوں کی طرح ہوجاؤ گے" کلاڈیا بولی۔

"آخر تم کو اس زندگی میں کیا مزہ آتا ہے؟ تم دنیا میں بہت کچھ کرسکتے ہو؟"

"تمہارا کیا مطلب ہے' دولت کما سکتا ہوں؟ عیش کرسکتا ہوں؟ شہرت اور مقام حاصل کرسکتا ہوں' لیکن کلاڈیا زندگی صرف اسی کا نام نہیں جس نے دکھ نہ جھیلے ہوں' وہ مسرت کا مزہ کیا جانیں' جس نے فاقے نہ کئے ہوں اسے غذا کی لذت کا کیا احساس ہوگا انسان کی سب سے بڑی دولت اس کے ذہن کی آسودگی اس کا بلند ترین مقام خدمت میں ہے کسی کے دکھ درد میں شریک ہوکر جو مسرت ملتی ہے وہی سچی ہے" احمد شلوزان نے بولنا شروع کیا تو سب کچھ بتادیا "میرا باپ تازیری کا ایک امیر اور صاحب اقتدار آدمی تھا میں نے عیش وعشرت کے ماحول میں آنکھیں کھولیں لیکن اپنے وطن کے لاکھوں غریب اور پس ماندہ انسانوں کو دیکھ کر میرا دل روتا تھا باپ کی مخالفت کے باوجود میں انقلاب پسندوں میں شامل ہوگیا۔ اپنے عظیم رہنما جیمس فراڈو کی رہنمائی میں کام کرتے ہوئے میں کمانڈوز میں شامل ہوگیا لیکن دشمنوں کو ہماری آزادی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ جب جیمس فراڈو پر زوال آیا تو میں فرار ہوکر آئرلینڈ آگیا میرے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کیونکہ وہ جیمس فراڈو کے حامی تھے۔ ربانیہ میں مجھے ایک آئرلڑکی سے محبت ہوگئی وہ بڑی معصوم اور البڑی لڑکی تھی پھر کسی ظالم نے اسے مارفین کے نشے کا عادی بنادیا۔ میں نے اسے اس دلدل سے نکالنے کی بہت

کوشش کی لیکن وہ پھر اس کا شکار ہو جاتی اس کی سہیلیوں میں سے کوئی اسے مارفین سپلائی کرتی تھی پھر میں نے اسے اپنی محبت کی قسم دے کر یہ زہر ترک کرنے کی التجا کی اور اس نے واقعی نشہ چھوڑ دیا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی مارفین اس کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی اور اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اس پر شدید دورے پڑنے لگے۔ جب حالت خراب ہوئی تو میں نے اس سے کہا کہ وہ پھر مارفین استعمال کرے لیکن میں نے پہلے اِسے محبت کی قسم دی تھی، وہ تڑپ تڑپ کر مر گئی، لیکن اپنی قسم نہیں توڑی" کلاڈیا مبہوت بنی اس کی داستان سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہم دردی اور غم کے آنسو جھلملانے لگے تھے۔

"اوہ ڈیئر!" کلاڈیا نے پیار سے اس کا بازو دبایا۔ "مجھے اندازہ نہ تھا کہ تم اتنے دکھی ہو۔"

اسی لمحے ایک موٹا سا آدمی ان کے پاس آ کر کھڑا ہوا اس کی توند احمد شلوزان کے بازو سے ٹکرانے لگی باریک سنہری کمانی کی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں کسی مسخرے کی طرح مسکرا رہی تھیں۔ "مداخلت کی معافی چاہتا ہوں۔" اس نے کلاڈیا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ مسز آئزک ہیں؟"

"ہاں فرمائیے؟"

"میرا نام آرٹن ہے میں جنوب مشرقی صومالیہ میں کئی ہسپانوی اخباروں کا نمائندہ ہوں" اس نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر کلاڈیا کی سمت بڑھایا۔

"میری اطلاع کے مطابق آپ اپنے شوہر ڈاکٹر آئزک سے ملنے جا رہی ہیں کیا میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟"

"تشریف رکھیے مسٹر آرٹن" کلاڈیا نے جواب دیا۔

آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"آپ مسٹر احمد شلوزان ہیں؟" اس نے احمد سے پوچھا۔

"ہاں۔ آپ ہمارے بارے میں بہت باخبر معلوم ہوتے ہیں؟" احمد نے کہا۔

"آپ نے ربانیہ میں سفر کی تیاری کے سلسلے میں جو خریداری کی اس کے بعد یہ کوئی راز نہیں رہا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"دیکھیے مسٹر آرٹن!" کلاڈیا نے کہا۔ "میں صرف اپنے شوہر سے ملنے جا رہی ہوں اس سلسلے میں کسی پبلسٹی کو پسند نہیں کرتی۔"

"آپ غلط نہ سمجھیں مسز کلاڈیا! میرا مسئلہ آپ کی ذات سے تعلق نہیں رکھتا یہ بین الاقوامی معاملہ ہے۔" آرٹن نے جواب دیا۔ "آپ کو علم ہے کہ ساؤتھ ایسٹ صومالیہ میں کمیونسٹ گوریلے چھاپہ مار تنظیموں کو تربیت دے رہے ہیں ہمارے ہمسایہ ملک میں نیوگنی آئتائل میں بسما اور آئرلینڈ میں مبو قبائل کی چھاپہ مار سرگرمیاں اسی کا سلسلہ ہیں یہ ساری کارروائیاں قبائلی علاقوں میں جاری ہیں۔ میں کمیونسٹوں کا مخالف نہیں ہوں، لیکن حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں دوسرے صحافیوں کی طرح بعد میں رپورٹنگ مجھے سخت

ناپسند ہے۔"

"بڑی اچھی بات ہے مسٹر آرٹن! لیکن ہمارا اس سے کیا تعلق؟" کلاڈیا نے کہا۔

"آپ آئرلینڈ کے جنوبی پہاڑی علاقے میں ڈاکٹر آئزک کے پاس جا رہی ہیں مسز کلاڈیا؟" آرٹن نے کہا۔ "اسی علاقے میں کرنل گیری سرگرم ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنی ویگن میں ساتھ لے چلیں۔"

"کیا آپ جرمن ہیں مسٹر آرٹن؟" احمد شلوزان نے پوچھا۔

"آپ مجھے جرمن یہودی کہہ سکتے ہیں" آرٹن نے جواب دیا۔

"ویسے میرا تعلق جرمن سے ہے لیکن میں مہاجر ہوں"۔

"احمد شلوزان چونک پڑا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ منع کرتا کلاڈیا نے کہہ دیا۔

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں آپ تماکش سے ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں۔" آرٹن شکریہ ادا کر کے چلا گیا تو کلاڈیا نے احمد شلوزان کے چہرے کی سمت دیکھا "تم کو آرٹن پسند نہیں آیا شاید؟" اس نے کہا۔

"اگر اس کا ساتھ چلنا مناسب نہیں تو......"

"یہ بات نہیں" احمد شلوزان نے جلدی سے کہا "اگر یہ سچ ہے کہ وہ واقعی صحافی ہے تو کوئی بات نہیں۔" اسے ارتضیٰ کی بات یاد آ رہی تھی۔

"اوہ تم بہت شکی ہوتے جا رہے ہو؟" کلاڈیا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ یقیناً صحافی ہے۔"

ڈنر کے بعد وہ اپنے کوپے میں آ کر بیٹھ گیا انہوں نے علیحدہ علیحدہ دو کوپے ریزرو کرائے تھے اسے کلاڈیا کا اس طرح کسی اجنبی کے ساتھ چلنے کی اجازت دینا بلاشبہ ناگوار ہوا تھا اور پھر یہ موٹا یہودی اسے بالکل نہیں بھایا تھا لیکن وہ کلاڈیا کو کسی بات سے منع کرنے کا حق نہیں رکھتا تھا۔ خود کلاڈیا کے بارے میں بھی وہ کیا جانتا تھا سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔

اس کی آنکھ اچانک کھلی تھی تاریکی میں کسی نے اس پر ایک دم چھلانگ لگائی اور پھر احمد کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا اس نے آزاد ہونے کے لئے بڑی جدوجہد کی، لیکن وہ کوئی بھی تھا بہت طاقت ور تھا اور پھر تکیہ اتنی مضبوطی سے احمد کے منہ پر رکھا ہوا تھا کہ سانس لینا ممکن نہیں تھا اسے کچھ نظر بھی نہیں آ رہا تھا اس نے دونوں ہاتھوں سے حملہ آور کے بازو پکڑ کر زور لگایا، لیکن اتنی دیر میں تکیے میں لگی ہوئی کلوروفارم دماغ میں سرایت کر چکی تھی وہ کمزور پڑتا جا رہا تھا تاریکیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا اور پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔

ہوش آیا تو وہ اپنی برتھ پر پڑا ہوا تھا کوپے میں کلوروفارم کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو چکرا گیا بڑی مشکل سے گرنے سے بچا دوبارہ جب حواس کچھ بحال ہوئے تو وہ کوپے کی دیوار کے سہارے کھڑا ہوا تھا درد سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا لڑکھڑاتے قدموں سے اس نے لائٹ جلائی اور حیران رہ گیا اس کا سوٹ کیس فرش پر کھلا ہوا تھا سارا سامان بکھرا ہوا تھا، لیکن وہ سب کچھ چھوڑ کر باہر نکلا اور لڑکھڑاتا ہوا باتھ روم میں پہنچا اسے ایک بڑی سی قے ہوئی لیکن کلوروفارم کی بو پھر بھی دماغ میں بسی رہی واپس آ کر اس نے جائزہ لیا رقم سمیت کوئی بھی چیز غائب نہ ہوئی تھی حملہ آور صرف تلاشی لے کر چلا گیا تھا لیکن اسے کس چیز کی تلاش تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ یہ معما اس کے لئے ناقابل حل تھا۔ وہ بے سدھ ہو کر برتھ پر گرا اور

آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

صبح جب وہ ناشتے کے لئے ڈائننگ کار میں پہنچا تو آرٹن پہلے ہی کلاڈیا کے پاس بیٹھا ہوا تھا احمد شلوزان کو اس منہ پھٹ اور بے باک یہودی کی شکل سے چڑ ہوگئی تھی کلاڈیا نے اسکا مسکرا کر خیر مقدم کیا اور ویٹر کو ناشتہ لگانے کا اشارہ کر کے پوچھا۔ ''اور سناؤ احمد شلوزان آرام سے سوئے کہ نہیں؟''

''اگر کلورو فارم کی بے ہوشی آرام کی نیند میں شمار ہوسکتی ہے تو ضرور سویا۔'' احمد شلوزان نے آرٹن کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

''رات کو کوئی میرے کوپے میں گھس آیا تھا۔ اس نے کلورو فارم سنگھا کر مجھے بے ہوش کر دیا۔''

''کیا......؟'' کلاڈیا نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''احمد شلوزان نے حملے کی تفصیلات بتائیں۔ کلاڈیا حیرت زدہ انداز میں سنتی رہی۔ ''تم کو اس واردات کی رپورٹ کرنا چاہیے۔'' آرٹن نے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ تلاشی کے علاوہ انہوں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا اور تم آئر پولیس کو جانتی ہو۔ وقت بھی ضائع ہوگا اور حاصل بھی کچھ نہیں ہوگا۔''

''لیکن اس حملے کا آخر مقصد کیا تھا؟'' کلاڈیا نے فکر مند لہجے میں کہا۔

''آئر لینڈ میں کم از کم بھکشوؤں سے کوئی دشمنی نہیں رکھتا۔''

احمد شلوزان نے کہا۔ ''ممکن ہے کسی کو اس بات پر غصہ ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیوں سفر کر رہا ہوں؟''

''تم اس شخص کو بھول گئے جسے ہوٹل میں گھونسا مارا تھا۔''

کلاڈیا نے یاد دلایا۔

''مسٹر احمد شلوزان نے؟'' آرٹن نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں۔ وہ مجھے پریشان کر رہا تھا۔'' کلاڈیا نے تفصیل بتائی۔ ''مجھے وہ شخص ہیپ برزہ اور اس کے ساتھی خطرناک لگے تھے۔''

''مائی گاڈ! مسز کلاڈیا کیا تم کو نہیں معلوم کہ وہ کتنا خطرناک بدمعاش ہے؟'' آرٹن نے کہا۔

''واقعی......؟''

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ اسے کسی ملک سے خطرناک جرائم شاید قتل' اسمگلنگ جیسے جرائم میں ملوث ہونے کی بناء پر ملک بدر کر دیا گیا تھا اس کا گروہ اب بھی خطرناک جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ آپ کو اس سے نہیں الجھنا چاہیے۔'' اس نے پریشان لہجے میں کہا۔

''لیکن اس ذرا سی بات کا انتقام لینے کے لئے وہ یہاں تک میرا تعاقب نہیں کرے گا۔'' احمد شلوزان نے کہا۔

''ممکن ہے اس کو تم پر کوئی شک ہوگیا ہو اسی لئے اس نے تمہاری تلاشی لی۔'' کلاڈیا نے کہا۔

''مجھے بہت افسوس ہے کہ میری وجہ سے تم کو یہ پریشانی اٹھانا پڑی۔'' کلاڈیا نے اسے دل آویز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تم کسی ڈاکٹر کو دکھالو احمد شلوزان مجھے لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں کلاڈیا! شکریہ۔'' اس نے کہا۔

''خانقاہ کی تربیت نے تم میں بڑا ضبط پیدا کر دیا ہے۔''

کلاڈیا نے کہا۔

''کسی حد تک...... ہر مذہب نفس کشی سکھاتا ہے۔''

تماکش کی رونق احمد شلوزان کی گزشتہ آمد کے بعد سے اب اور زیادہ ہوچکی تھی شہر کی سڑکیں تنگ اور پر ہجوم تھیں۔ سڑک کے دونوں جانب اشیا بیچنے والے ٹھیلوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ آئر لینڈ کا یہ دوسرا بڑا شہر تھا۔ کلاڈیا نے ایک جیڈ چاپ خریدا تھا۔ یہ ایک قیمتی پتھر کا بنا ہوا تھا جس پر کلاڈیا نے اپنا نام کندہ کرانے کے لئے دیا تھا اور اس وقت احمد شلوزان اسی لئے جا رہا تھا۔ تماکش آئر لینڈ کے جنوب میں ربانیہ سے کوئی پانچ سو میل کے فاصلے پر واقع تھا احمد شلوزان شہر کی رونق سے لطف اندوز ہونے کے لئے دانستہ پر ہجوم سڑکوں پر پیدل سفر کر رہا تھا ایک خوب صورت پہاڑی کے دامن میں یہ شہر دریائے نیل کے کنارے واقع تھا سطح سمندر سے یہ پانچ ہزار میل بلند تھا۔ احمد شلوزان اور کلاڈیا کے علاوہ آرٹن بھی آریل روڈ ہوٹل میں ٹھہرا تھا شہر میں غیر ملکی سیاحوں کے قیام کے قابل یہ واحد ہوٹل تھا۔ کلاڈیا کو جب وہ شاپنگ کے لئے لے کر نکلا تو آرٹن کہیں گیا ہوا تھا۔ احمد شلوزان کو یقین تھا کہ اگر وہ موجود ہوا تو ضرور ساتھ چپک جاتا انہوں نے اپنے سفر کی ضروریات کے لئے مزید خریداری کی تھی اور اسی دوران کلاڈیا نے وہ جیڈ چاپ بھی خریدا تھا۔ صاف وشفاف ہرے پتھر کا بنا ہوا یہ قیمتی تحفہ انہیں ایک کباڑی کی دکان سے مل گیا تھا وہ ایک تنگ راستے پر مڑا ہی تھا کہ کسی نے آواز دی۔

''اے...... جو...... ذرا ٹھہرنا'' احمد شلوزان نے مڑ کر دیکھا ایک پستہ قد چیچک رو شخص تیزی سے اس کی سمت بڑھ رہا تھا وہ پھر روانہ ہوگیا۔ پستہ قد ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

''ٹورسٹ ہو؟ میرے ساتھ آؤ پچاس بھت میں مزے کرادوں گا۔'' احمد شلوزان نے گردن ہلائی اور آگے بڑھ گیا وہ پھر ساتھ لگ گیا۔ ''فرسٹ کلاس مزہ آجائے گا۔''

''بھکشو کسی قسم کی بدکاری نہیں کرتے۔'' احمد شلوزان نے آئری زبان میں کہا۔ ''بھاگ جاؤ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

پستہ قد نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ ''تم نے آئری زبان کہاں سے سیکھی؟'' اس نے پوچھا۔

''جہاں سے تم نے انگریزی سیکھی'' احمد شلوزان نے ہنس کر کہا۔ ''میں صرف شہر سے گزر رہا ہوں مجھے پہاڑی علاقے میں جانا ہے اس لئے پریشان نہ کرو۔''

''تم کو پہاڑی علاقے میں جانا ہے؟ تب پھر...... بڈ گولر سے بہتر گائیڈ نہ ملے گا۔ میں تمام قبائلی زبانیں جانتا ہوں سارے علاقے سے واقف ہوں صرف سو بھت روزانہ لوں گا۔''

''سنو گولر'' احمد شلوزان نے جھنجلا کر اسے غصے میں گھورا۔

''اپنا وقت برباد مت کرو اور میرا پیچھا چھوڑ دو مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔''

''تیز تیز قدم رکھتا ہوا آگے بڑھ گیا لیکن گولر بڑی دیر تک اس کا تعاقب کرتا رہا۔ احمد شلوزان کو اس پر ترس بھی آیا لیکن وہ جانتا تھا کہ ذرا سی بھی ہم دردی کی تو گولر پھر جونک کی طرح چمٹ جائے گا۔ اسے

ایک بوڑھے چینی کاری گر کا پتا معلوم تھا جو پتھر کی کندہ کاری کرنے رات نو بجے تک آ کر جیڈ لے جانے کے لئے کہا۔ احمد شلوزان مطمئن ہو کر واپس چل دیا۔

رات کا کھانا اس نے اطمینان سے کھایا کیونکہ آرٹن باہر گیا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد کلاڈیا نے کہا کہ "کافی کمرے میں چل کر پئیں گے" احمد شلوزان نے اعتراض نہیں کیا کافی کا آرڈر دے کر وہ احمد شلوزان کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی اور لباس تبدیل کرنے باتھ روم میں چلی گئی۔ اس کی واپسی تک احمد شلوزان نے کافی تیار کر لی غسل سے فارغ ہو کر کلاڈیا اپنے بستر پر دراز ہو گئی اس نے کافی کی پیالی کلاڈیا کو دی۔

"میرے پاس ہی بیٹھ جاؤ۔" اس نے کہا۔ "کبھی کبھی مجھے تنہائی کا اس شدت سے احساس ہوتا ہے کہ تم جیسے ہم درد ساتھی کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔"

"ایسی صورت میں بہتر یہی ہوگا کہ تم ڈاکٹر آئزک کو ساتھ لے کر واپس جاؤ۔"

کلاڈیا نے ایک ٹھنڈی سانس لی "شاید میں نے اس سے شادی کر کے غلطی کی تھی احمد شلوزان" کلاڈیا نے کہا۔ "وہ میرے پاس رہ کر بھی مجھ سے دور رہتا ہے

احمد شلوزان نے موضوع بدلنے کے لئے بڈ گولر کا قصہ سنانا شروع کر دیا کلاڈیا بددلی کے ساتھ سنتی رہی "بڑی مشکل سے جان چھڑا کر بھاگا تھا" احمد شلوزان نے ہنستے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

"احمد شلوزان! کیا تم عورتوں سے بہت نفرت کرتے ہو؟"

کلاڈیا نے اچانک پوچھا۔

"نفرت؟" "نہیں تو...... یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟"

"تم مجھ سے نگاہیں ملانے سے بھی گریز کر رہے ہو اس لئے۔" کلاڈیا نے کہا۔

"انسان کبھی کبھی اپنی قسم بھی توڑ دیتا ہے تم کوئی گوتم بدھ تو نہیں ہو۔"

اس کی آواز میں کسک تھی کہ احمد شلوزان تڑپ اٹھا۔

اس نے بے بسی کے عالم میں کلاڈیا کو دیکھا۔

"یہ بات نہیں کلاڈیا! تم بے حد حسین اور دل کش ہو کوئی بھی مرد تمہیں اپنانے سے گریز نہیں کر سکتا میں بھی اس میں شامل ہوں لیکن تم کسی کی امانت ہو میں......"

"اگر ایسا نہ ہوتا' اگر یہ مجبوری نہ ہو تو تم اس دوری کو ختم کر سکتے ہو؟" کلاڈیا نے بات کاٹ کر پوچھا اس کا لہجہ بڑا جذباتی تھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا کلاڈیا" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"احمد شلوزان میں محبت کے معاملے میں ہمیشہ سے بدنصیب ہوں۔ چھوٹی سی تھی تو ماں چل بسی میرے ڈیڈی دولت کو زندگی تصور کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے انہوں نے بے حساب دولت کمائی مجھے بھی اس انداز سے تربیت دی کہ میرا شمار آج ذہین ترین بزنس مینجمنٹ میں ہوتا ہے' لیکن میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے لیکن محبت نہیں بے شمار لوگ مجھ سے شادی کرنے کے لئے بے تاب رہتے تھے خوبرو' نوجوان دولت مند لیکن ان کو مجھ سے نہیں' دولت سے پیار تھا

آئزک مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے وہ دولت مند نہیں تھے میں ان کی سچی ہم دردی کو محبت سمجھ بیٹھی اور شادی کر لی ان کو آج بھی مجھ سے پرخلوص ہم دردی ہے لیکن محبت وہ صرف اپنے پیشے سے کرتے ہیں مجھے تم سے ہم دردی نہیں چاہیے محبت چاہیے احمد شلوزان۔"

"کلاڈیا! میں تم کو پسند ضرور کرتا ہوں لیکن تمہاری مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اس نے کہا اور گھڑی پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھا نو بج رہے ہیں مجھے تمہارا جیڈ لینے جانا ہے۔"

"وہ کل بھی تو آ سکتا ہے؟" کلاڈیا نے کہا۔

"نہیں' میں آج ہی لے آؤں گا۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے' میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

ہوٹل سے باہر تین پہیوں والے کئی سائیکل رکشا کھڑے تھے جنہیں آئر لینڈ میں سملا نگ کہتے ہیں احمد شلوزان جیسے ہی آگے بڑھا تاریکی سے اچانک ایک سایہ اس کی سمت لپکا۔

"ہے جو! اتنی رات گئے کہاں چل دیئے؟"

احمد شلوزان نے بڈ گولر کی آواز پہچان لی اور بے ساختہ ہنس پڑا۔ "تم نے یہ کیسے معلوم کر لیا کہ میں یہاں ٹھہرا ہوں؟"

"تمام غیر ملکی سیاح ہوٹل میں ٹھہرے ہیں بڈ نے اپنی ذہانت پر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔" ساتھ چلو۔ آج کی رات کا لطف تمام زندگی یاد رکھو گے۔"

"اوہ خدا کے لئے بڈ گولر میری جان چھوڑ دو۔" احمد شلوزان نے عاجز آ کر کہا۔

"گولر اچھے گاہک کو پہچانتا ہے جو...... وہ ہرگز تمہاری جان نہیں چھوڑے گا" احمد شلوزان تیز تیز چل رہا تھا اور پستہ قد بڈ گولر کو تقریباً بھاگنا پڑ رہا تھا لیکن وہ پیچھے لگا رہا۔

"سنو بڈ گولر" اچانک احمد شلوزان نے رک کر کہا۔ "تم اگر اس طرح نہ مانو گے تو میں دوسرا طریقہ بھی جانتا ہوں۔"

احمد شلوزان کے لہجے میں ایسے سختی تھی کہ بڈ گولر ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنا سر کھجلانے لگا۔

احمد شلوزان جب دوبارہ روانہ ہوا تو گوارے وہیں کھڑا رہا لیکن رفتار اور تیز کر دی چوراہے سے جب وہ دوسری سڑک پر مڑا تو گھوم کر دیکھا بڈ گولر کا کہیں پتا نہیں چلا اس نے اطمینان کا سانس لیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگا ربانیہ کے مقابلے میں تماکش کی راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں خنک ہوا کے ہلکے جھونکے بڑے لطیف لگ رہے تھے احمد شلوزان کا ذہن کلاڈیا کے بارے میں سوچنے لگا کیا کلاڈیا کے جذبات کو ٹھیس پہنچا کر اس نے غلطی کی ہے؟ آخر وہ کون ہوتا ہے کسی کو اخلاق کا درس دینے والا وہ محبت کی بھوکی ہے اور اس کی محبت ٹھکرانا بھی تو زیادتی ہے۔ کلاڈیا نے بڑے والہانہ انداز میں اسے دعوت دی تھی۔ وہ اچھی اور سمجھ دار عورت ہے پھر وہ کیوں ڈر رہا ہے۔

وہ اپنے خیالات میں گم اس گلی میں داخل ہوا جو چینی کاری گر کی دکان تک پہنچنے کا شارٹ کٹ تھی گلی نیم تاریک تھی۔ اچانک اسے خطرے کا احساس ہوا تاریکی سے دو سائے تیزی سے اس پر جھپٹے تھے۔ احمد

شلوزان پھرتی کے ساتھ گھوما لیکن اسی لمحے ایسا لگا جیسے کھوپڑی پر پہاڑ گر پڑا ہو۔ آنکھوں میں تارے رقص کرنے لگے۔ وہ لڑکھڑایا سنبھلنے کی کوشش کی لیکن گرتا ہی چلا گیا گلی کے پتھریلے فرش پر گرتے ہوئے اسے گندی نالی کی بو محسوس ہو رہی تھی لیکن ہلنے کی سکت نہ تھی اور پھر اسی لمحے زبردست ٹھوکر اس کی پسلیوں پر پڑی وہ درد سے کراہ اٹھا اس کے بعد تو پھر ہر سمت سے ٹھوکروں کی بارش ہوگئی۔ احمد شلوزان بے بسی کے عالم میں پڑا مار کھاتا رہا پھر کسی نے اس کا گریبان پکڑ کر کھڑا کیا اس کے بعد اس کے جبڑوں اور پیٹ پر مکوں کی مشق ہونے لگی اتنے آہنی گھلے کسی انسان کے نہیں ہو سکتے اسے کچھ پتا نہیں کہ مارنے والے کون تھے لیکن کسی کی شرٹ کے بڑے بڑے پھول اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کر رہے تھے یہ پھول وہ پہلے بھی کہیں دیکھ چکا تھا پتا نہیں یہ حقیقت تھی کہ وہ خواب دیکھ رہا تھا اور پھر یہ خواب بھی ختم ہوگیا۔ ہر سمت تاریکی ہی تاریکی تھی اور پھر اسے کچھ یاد نہ رہا۔

"اوہ مائی گاڈ۔ یہ تم کو کیا ہوا؟"

آواز بلڈ گولر کی تھی لیکن کہاں سے آرہی تھی احمد شلوزان کے لئے یہ سمجھنا دشوار تھا بڈ گولر کا چیچک زدہ چہرہ اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں دھندلا دھندلا سا چہرا آہستہ آہستہ واضح ہوتا جارہا تھا تعفن کی تیز بو ناک سے ٹکرا رہی تھی۔ نہیں یہ خواب نہیں تھا اس نے اٹھنا چاہا تو سارا جسم درد سے کراہ اٹھا۔ اس میں ہلنے جلنے کی بھی سکت نہ تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جسم کی ساری ہڈیاں چکنا چور ہوگئی ہوں آہستہ آہستہ اس کے حواس بحال ہو رہے تھے۔

"اوہ خدایا تم تو خون میں لت پت ہو" بڈ گولر تشویش ناک لہجے میں بولا۔

احمد شلوزان نے اٹھنے کی کوشش کی "مجھے سہارا دو گولر۔"

اس نے کراہتے ہوئے کہا اس کے ہونٹ بھی سوج گئے تھے۔

منہ میں خون بھرا ہوا تھا وہ گولر کے سہارے بیٹھ گیا۔

"تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے فوراً کسی ڈاکٹر کو دکھانا ضروری ہے"

"نہیں گولر! بس تم مجھے ہوٹل تک پہنچا دو جلدی سے کوئی سملا تنگ لاؤ۔"

گولر اسے سہارا دے کر بہ مشکل سڑک تک لے آیا درد سے احمد شلوزان کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا ہر جگہ سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں سر چکرا رہا تھا۔ وہ بے ہوش نہیں تھا لیکن حواس کام نہیں کر رہے تھے گولر نے اسے بہ مشکل سملا تنگ میں ڈالا اور پھر خود بھی اسے سہارا دے کر اس میں بیٹھ گیا اس کے بعد وہ کسی طرح کلاڈیا کے کمرے میں پہنچا۔ پھر کچھ یاد نہیں رہا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ کلاڈیا کے بستر پر پڑا ہوا تھا گولر کمرے کے ایک کونے میں کھڑا ہوا تھا کلاڈیا کا پریشان حال چہرہ اس پر جھکا ہوا تھا اس کی گردن کو اپنے نازک ہاتھوں کے سہارے اٹھائے ہوئے وہ کچھ پلانے کی کوشش کر رہی تھی احمد شلوزان کو اپنے گلے میں آگ سی اترتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن برانڈی نے اس کے ہوش و حواس بحال کر دیئے۔

"یہ تم نے مجھے کیا پلا دیا؟" احمد شلوزان نے آہستہ سے کہا۔

"بات کرنے کی کوشش مت کرو۔ آرام سے لیٹے رہو۔"

کلاڈیا نے منع کیا۔

"نہیں اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تم بالکل ٹھیک ہو؟ اپنا چہرہ دیکھا ہے؟ لگتا ہے کسی نے ہتھوڑے سے قیمہ بنانے کی کوشش کی ہے۔"

"معمولی چوٹیں ہیں' ٹھیک ہو جائیں گی' اس نے کہا۔

"ڈاکٹر کو نہ بلوانا تم آر پولیس کو نہیں جانتیں۔ تفتیش میں کئی دن بلکہ کئی ہفتے لگ جائیں گے ہم یہاں رکنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"لیکن تمہاری حالت......"

"ٹھیک ہے صبح تک بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔" احمد شلوزان نے بات کاٹ کر کہا۔

"اچھی بات ہے' لیکن تم آرام سے لیٹے رہو مجھے نہیں معلوم کیا ہوا ہے لیکن صبح پوچھ لوں گی" کلاڈیا نے کہا۔

"میں بتاتا ہوں کیا ہوا؟ دو کتے کے بچوں نے ان پر اچانک حملہ کر کے بڑی بے دردی سے مارا ہے۔ میں ان کا تعاقب کر رہا تھا میں نے سب کچھ خود دیکھا ہے میرے ہی چلانے پر وہ ڈر کر بھاگ نکلے۔"

کلاڈیا نے گولر کی سمت دیکھا پھر احمد شلوزان کی سمت مڑ کر پوچھا "کیا یہ تمہارا دوست ہے۔"

"اب تو واقعی یہ میرا دوست ہے۔" احمد شلوزان نے مسکرانے کی کوشش کی تو درد سے سسکی نکل گئی اس نے آنکھیں بند کرلیں تو غنودگی طاری ہوگئی۔

کلاڈیا باتیں کر رہی تھی گولر اسے بتا رہا تھا کہ وہ ہر فن مولا ہے۔ بہترین گائیڈ ہے' پانچ علاقائی زبانیں جانتا ہے پہاڑی علاقوں کے چپے چپے سے واقف ہے۔ کلاڈیا کے لئے بہترین گائیڈ ثابت ہو سکتا ہے پھر سودے بازی ہونے لگی گولر نے ڈیڑھ سو روپے یومیہ اجرت مانگی لیکن سوا سو پر راضی ہوگیا۔ کلاڈیا نے اس کی خدمات حاصل کرلی تھیں وہ بہت خوش تھا۔ احمد شلوزان یہ سب کچھ سن رہا تھا لیکن غنودگی اتنی شدید تھی کہ بولا نہیں جارہا تھا پھر شاید وہ سو گیا۔

آنکھ کھلی تو کلاڈیا اس کے سرہانے کے برابر کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی وہ کچھ پی رہی تھی احمد شلوزان خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔

"بڈ گولر کہاں ہے؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"تم آرام سے سوتے رہو۔" کلاڈیا نے سختی سے ہدایت کی۔

"نہیں میں اب بالکل ٹھیک ہوں" اس نے اٹھنا چاہا لیکن درد کی ٹیسوں سے مجبور ہو کر ارادہ ترک کر دیا۔

"اوہ ڈارلنگ! خدا کے لئے لیٹے رہو" کلاڈیا نے آبدیدہ نظروں سے اسے دیکھا اور اس کے بالوں کو پیار سے سنوارنے لگی۔ "مجھے بے حد افسوس ہے احمد شلوزان تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے کتنا دکھ پہنچا ہے آخر یہ کس درندے کی حرکت ہے انہوں نے کیوں تم پر وحشیانہ تشدد کیا ہے؟"

"کچھ پتہ نہیں کلاڈیا!" احمد شلوزان نے جواب دیا کلاڈیا کے خلوص نے اسے بڑا متاثر کیا تھا وہ

اس کے لئے بے حد پریشان تھی۔ ''مجھے کچھ یاد نہیں اور نہ یہ اندازہ ہے کہ ان لوگوں نے کیوں یہ کیا ہے؟''

''جب تک تم بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتے ہم یہیں قیام کریں گے۔''

''نہیں کلاڈیا! ہماری ٹویوٹا ویگن آ چکی ہے تمام تیاریاں مکمل ہیں میں صبح تک بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا'' وہ اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ہائیں یہ کیا کر رہے ہو لیٹ جاؤ۔'' کلاڈیا لپک کر اس کے سامنے پہنچ گئی وہ اتنے قریب تھی کہ احمد شلوزان اس کے جسم کی حرارت محسوس کر رہا تھا وہ محبت بھری نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی۔

''میں اپنے کمرے میں جا کر آرام کروں گا۔'' احمد شلوزان نے اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکتے ہوئے کہا جہاں اٹھتا ہوا جوار بھاٹا نمایاں تھا۔

''شب بہ خیر'' کلاڈیا نے سرگوشی میں کہا۔

احمد شلوزان جواب دیئے بغیر باہر نکل گیا نیم تاریک ہال میں پہنچ کر اس نے بازو ہلا کر اندازہ لگایا کہ چوٹ کتنی شدید ہے خوش قسمتی سے ہڈیاں سلامت تھیں۔ صرف درد کی ٹیسیں پریشان کر رہی تھیں۔ اس کے دل میں بار بار ایک ہی شبہ جنم لے رہا تھا۔

''آرٹن......لیکن کیوں، یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ہال سے نکل کر وہ اپنے کمرے کی سمت بڑھا۔ آرٹن کا کمرا پہلے آتا تھا دروازے پر رک کر اس نے دستک دی کوئی جواب نہ ملا اس نے پھر دستک دی لیکن خاموشی طاری رہی۔ مایوس ہو کر جانے کے لئے قدم اٹھا ہی تھا کہ ہلکی سی کراہ سنائی دی احمد شلوزان رک گیا کراہ پھر سنائی دی۔

احمد شلوزان نے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ آہستہ سے پٹ کھول کر اس نے اندر قدم رکھا اور پھر دم بہ خود رہ گیا آرٹن اپنے بستر کے برابر فرش پر پڑا ہوا تھا احمد شلوزان لپک کر آگے بڑھا اور اس پر جھک گیا آرٹن کی قمیض خون میں تر تھی۔ سینے پر تین سوراخ تھے جو بلاشبہ گولیوں کے تھے اس نے آرٹن کی گردن پر ہاتھ رکھ کر نبض دیکھی اور اسی لمحے اس کی گردن کو جنبش ہوئی اس نے آنکھیں کھول کر احمد شلوزان کو دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو اور پھر نحیف آواز میں سرگوشی کی۔ ''رینجر''

''بات کرنے کی کوشش مت کرو میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔''

''نہیں......سنو......رینجر......'' آرٹن نے رک رک کر انگریزی میں تین الفاظ کہے۔

''وہ......وہ......''

''پلیز خاموش رہو'' احمد شلوزان نے جلدی سے کہا۔

لیکن آرٹن پہلے ہی خاموش ہو چکا تھا ہمیشہ کے لئے اس کی کھلی ہوئی آنکھیں بے حس ہو چکی تھیں احمد شلوزان نے پھر نبض دیکھی جو ساکت ہو چکی تھی۔

''اوہ گاڈ! نہیں'' کلاڈیا نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''تم کو یقین ہے کہ وہ......''

''ہاں وہ مر چکا ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں'' احمد شلوزان نے جواب دیا۔

''لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا پہلے تم پر قاتلانہ حملہ اور پھر آرٹن۔''

''ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہو گا کہ دونوں میں کوئی تعلق ہے۔''

احمد شلوزان نے کہا'' لیکن ممکن ہے کہ یہ حقیقت ہو' مجھے اس کا ساتھی سمجھ کر نشانہ بنایا گیا ہو کچھ بھی ہو اب پولیس کو مطلع کرنا ضروری ہے۔''

''نہیں احمد شلوزان'' کلاڈیا نے جلدی سے کہا۔

''لیکن قتل کی واردات ہے اسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا ہے۔''

''اسی لئے تو منع کر رہی ہوں ہم کو لمبے عرصے کے لئے روک لیا جائے گا جو میرے لئے ممکن نہیں ہم ایسا نہیں کر سکتے' ہمیں رات ہی کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

''نہیں ہوش کی بات کرو اس طرح تو لاش ملنے کے بعد پولیس ہم پر ہی شبہ کرے گی یہ نہ بھولو کہ آرٹن کو ہمارے ساتھ دیکھا جا چکا ہے۔''

''احمد شلوزان تم سمجھتے کیوں نہیں؟ اس قتل سے ہمارا کوئی تعلق نہیں' اگر ہم پولیس کے چکر میں پھنس گئے تو جانے کیا ہو؟ وہ ہم کو لمبے عرصے تک روک تو بہرحال سکتے ہیں ٹھیک ہے ہم صبح ہوتے ہی روانہ ہو جائیں گے۔''

''پھر سوچ لو کلاڈیا......ایسا نہ ہو کہ......''

''احمد شلوزان! میں تم کو تو حکم نہیں دے سکتی صرف التجا کر سکتی ہوں'' اس نے اس انداز سے کہا کہ احمد شلوزان خاموش ہو گیا۔

وہ صبح سویرے ہی اٹھ گئے احمد شلوزان اب خود کو بالکل ٹھیک محسوس کر رہا تھا ٹویوٹا ویگن کو قریب پارک کر کے انہوں نے سارا سامان لادا۔ روانگی سے پہلے کلاڈیا سامان کا جائزہ لے رہی تھی ویگن کا پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا کلاڈیا اس میں رکھے ہوئے سامان کا اندراج اپنی نوٹ بک میں کر رہی تھی وہ جلد ہی فارغ ہو گئی احمد شلوزان نے دروازہ بند کیا اور اگلی سیٹ کی سمت بڑھا وہ روانگی کے لئے تیار تھے اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے لئے دروازہ کھولا ہی تھا کہ ہوٹل کی جانب سے ایک باوردی شخص تیزی سے ویگن کی سمت بڑھتا نظر آیا۔ اس کے پیچھے ملیشیا کی وردی میں چار اور آدمی تھے احمد شلوزان رک گیا۔

''[illegible]!'' ایک باوردی شخص نے نرم لہجے میں کہا۔

''[illegible] جا رہے ہیں؟''

''ہم جنوب میں ڈاکٹر آئزک کے مشن تک جا رہے ہیں''

''احمد شلوزان نے کہا۔ یہ مسز کلاڈیا آئزک ہیں۔''

''تب آپ کو کسٹم چیکنگ کرانا ہو گی؟''

''لیکن ہم ملک سے باہر تو نہیں جا رہے ہیں۔''

''آپ ضلع کی سرحد پار کریں گے اس لئے کسٹم چیکنگ ضروری ہے۔''

''ایک منٹ کرنل!'' اس نے دانستہ خوش کرنے کے لئے اسے کرنل کہا تھا گفتگو آئر زبان میں

ہورہی تھی اس لئے احمد شلوزان نے کلاڈیا کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

''لیکن اس طرح تو بہت دیر ہوجائے گی۔'' کلاڈیا نے غصے سے کہا۔

''چہرے سے غصے یا پریشانی ظاہر کی تو انہیں شک ہوجائے گا اور پھر یہ ایک ایک چیز کی تلاشی لیں گے'' احمد شلوزان نے خبردار کیا۔

اور عین اسی لمحے بڈ گولر بڑی تیزی سے آتا ہوا نظر آیا۔ کیا تم گولر کو چھوڑ کر جارہے تھے؟''

''نہیں گولر تمہارے ہی انتظار میں یہ کسٹم کی مصیبت گلے لگ گئی'' احمد شلوزان نے جھوٹ بولا۔

''فکر نہ کرو۔'' میں ابھی ان سور کے بچوں سے نمٹ لیتا ہوں'' گولر اور کسٹم کے لوگوں میں بڑی دیر تک صحبت ہوتی رہی وہ مقامی زبان میں بات کرر ہے تھے بالا آخر کچھ دیر بعد گولر نے واپس آکر بتایا ایک ہزار بھت پر معاملہ طے ہوا ہے''

احمد شلوزان......احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن کلاڈیا نے پرس کھول کر رقم نکالی اور گولر کے ہاتھ پر رکھ دی وہ یہاں رک کر دوسرا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

شہر سے باہر نکل رہے تھے جس سڑک پر سفر کر رہے تھے وہ ناہموار تھی دونوں طرف دھان کے لہلہاتے کھیت پھیلے ہوئے تھے جیپ نما ویگن کو احمد ڈرائیور کر رہا تھا کلاڈیا اس کے برابر بیٹھی ہوئی تھی پیچھے بیٹھا ہوا گولر اپنی شان میں مسلسل بکواس کئے جارہا تھا اس کا منہ پان اور چھالیہ سے بھرا ہوا تھا بکریوں کی طرح جگالی کرر ہا تھا۔ راستے میں بکھرے ہوئے دیہات آہستہ آہستہ دور ہوتے گئے سہ پہر تک وہ میدانی علاقے سے گزر کر ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ہر سمت گھنا جنگل اور پہاڑیاں تھیں ایک جگہ سامنے کی پہاڑی کی گگر پر کوئی چیز دھوپ میں اچانک چمکی گولر نے چونک کر کلاڈیا کے بازو کو ہلایا اے میری! تم گن ساتھ لائی ہو'' اس نے پوچھا۔

''کیا؟'' کلاڈیا چونک پڑی۔ ''گن......؟ ہاں وہ پیچھے کہیں رکھی ہے۔''

''شاید اس کی ضرورت پڑ جائے'' گولر نے کہا'' ان پہاڑیوں پر اکثر ڈاکوؤں کا سامنا ہوجاتا ہے۔''

پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر ایک جگہ احمد شلوزان نے جیپ روک لی قریب ہی ایک چشمے کی صاف شفاف دھار بلندی سے گر کر پھیل رہی تھی ہر سمت سبزہ ہی سبزہ تھا احمد شلوزان نے کہا کہ وہ یہیں قیام کریں گے قریب سے بانس کاٹ کر انہوں نے ویگن کے سامنے گاڑے اور اس پر برساتی ڈال کر خیمہ سا بنالیا بڈ گولر نے بہ ضد ہو کر کھانا تیار کرنے کی ذمے داری خود اپنے سر لی احمد نے ویگن سے ٹن نکال کر اسے دیئے کھانے کے یہ ٹن چور بازار میں سستے داموں مل گئے تھے کافی بن گئی تو کلاڈیا اپنے اور احمد شلوزان کے قریب بیٹھ گئی اور دور تک پھیلے ہوئے جنگل اور پہاڑ کا جائزہ لینے لگی۔

''کتنا حسین منظر ہے' ہر سمت مکمل سکوت' مکمل سکون۔''

کلاڈیا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''کچھ دیر بعد جب مچھر یلغار کریں گے تو سارا حسن بھول جاؤ گی۔'' احمد شلوزان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو یہ ہے کتنے بدذوق ہو'' کلاڈیا نے کہا۔

رات کو وہ آرام سے سوئے کلاڈیا کے لئے اس نے ویگن میں بستر لگا دیا تھا گولر اگلی سیٹ پر سویا تھا لیکن احمد شلوزان خیمے کے نیچے لیٹ گیا تھا۔

احمد شلوزان جب صبح بیدار ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کلاڈیا لباس تبدیل کر کے چشمے کی سمت سے واپس آرہی تھی اس نے خاکی رنگ کا وہ شکاری سوٹ پہن رکھا تھا جو انہوں نے ربانیہ سے خریدا تھا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا گولر نے پھرتی کے ساتھ ناشتہ تیار کیا ناشتہ کرتے ہی وہ روانہ ہوگئے وہ جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے راستہ خراب اور ناہموار ہوتا گیا۔ کہیں کہیں انہیں چکر کاٹ کر اصل راستے پر آنا پڑتا تھا۔ وادیوں اور دروں سے گزرتے ہوئے وہ آگے بڑھتے رہے۔

اب پہاڑیاں کم ہری اور زیادہ پتھریلی ہوتی جارہی تھیں ڈھلوان پر ٹیک کے لمبے درخت کہیں کہیں نظر آرہے تھے دو مرتبہ وہ ایسی جگہ پہنچے جہاں بڑے بڑے آٹو میٹک آرے لگے ہوئے تھے جن سے کٹے ہوئے لمبے شہتیروں کو ہاتھیوں کے ذریعے گھسیٹا جارہا تھا احمد نے کئی جگہ رک کر نقشے کی مدد سے راستے کا تعین کیا لیکن گولر اس سلسلے میں بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ وہ پہاڑی زبان میں مزدوروں سے راستہ پوچھ کر رہنمائی کرر ہا تھا۔

سفر جاری رہا۔ تیسری شام انہوں نے پھر ایک ایسی جگہ قیام کیا جہاں قریب میں چشمہ تھا۔ احمد شلوزان ٹویوٹا کے اوپر مچھر دانی لگانے میں مصروف تھے کہ اچانک وہ نمودار ہوئے۔

وہ تینوں آئرلینڈ کے تھے دونوں نے بوسیدہ پتلونیں اور شرٹ پہن رکھی تھیں تیسرے کے جسم پر صرف ایک جرسی اور جانگیہ تھا جس کے ساتھ اس نے سر پر ایک میلی سی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ تینوں کی بغل میں رائفلوں کی طرح لمبے جنگلی خنجر لٹک رہے تھے وہ جھاڑیوں سے نکل کر کچھ فاصلے پر کھڑے ہوگئے اور مسکرا کر انہیں دیکھنے لگے۔

''تواسری'' احمد شلوزان نے کہا جس کا مطلب تھا سلامتی ہو۔

دونوں نے سینے پر ہاتھ باندھ کر جھکتے ہوئے جواب دیا'' سواسدی کا'' گولر نے آہستہ سے سرگوشی کی۔ ''خبردار رہو' ان بدمعاشوں کی نیت گڑ بڑ نظر آتی ہے۔''

''یہ لوگ کون ہیں؟'' کلاڈیا نے ویگن سے سر نکال کر پوچھا۔

''اندر لیٹی رہو۔ گولر کہتا ہے یہ خطرناک نظر آتے ہیں۔'' احمد شلوزان نے خبردار کیا۔

ان میں سے ایک قدرے دراز قد تھا ذرا سا آگے بڑھا اس نے آئری زبان میں کہا۔'' ہم پریشان نہیں کریں گے۔ ہمیں بھوک لگی ہے لیکن اگر تم پسند نہیں کرو تو ہم کھانا کہیں اور تلاش کرلیں گے۔''

''اندر سے کھانے کے چند ٹن پھینک دو'' احمد شلوزان نے کلاڈیا سے کہا اور پھر نو واردوں سے بولا۔'' مہمانوں کو کھانا دینا باعث برکت ہوتا ہے۔''

''ہم اس نیک دلی کے لئے احسان مند رہیں گے'' دراز قد نے جواب دیا۔

''سور کے بچے دھوکا دے رہے ہیں'' گولر نے سرگوشی کی'' ابھی خاموش رہو'' احمد شلوزان نے کہا اور کلاڈیا سے ٹن لے کر دراز قد کی سمت بڑھائے احمد شلوزان نے سگریٹ کا ایک پیکٹ بھی دیا وہ خوش ہو کر

آگے بڑھے اور وہیں بیٹھ کر کھانے لگے کھانے کے بعد انہوں نے سگریٹ سلگائے اور مزے لے لے کر کش لگانے لگے ''اب تم کہیں اور جا کر آرام کرو۔'' احمد شلوزان نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ چند لمحے تو احمد شلوزان کو گھورتے رہے مسکراہٹ ان کے لبوں سے اچانک غائب ہوگئی تھی ان کی نگاہیں کیمپ کی ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھیں دراز قد نے اپنی انگلی نچاتے ہوئے کہا۔

''مگر تمہارے پاس اتنی بہت سی چیزیں ہیں ہم لوگ غریب ہیں ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔''

''یہ واقعی ایک افسوس ناک حقیقت ہے'' احمد شلوزان نے کہا اور پھر گولر کی سمت مڑ کر انگریزی میں پوچھا۔

''کیا خیال ہے گولر ان کو کچھ رقم دے دیں؟''

''نہیں، اس طرح وہ سمجھیں گے ہم ڈر گئے ہیں اور حملہ کردیں گے ان کو رائفل دکھا کر سختی سے دھمکی دو تو ڈر کر بھاگ جائیں گے۔''

احمد شلوزان نے رائفل مانگنے کے لئے کلاڈیا کی سمت رخ کیا تو یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ اس کے ہاتھ میں ایک ننھا سا پستول پہلے سے موجود تھا اور وہ اس کا سلینڈر چیک کر رہی تھی اس نے تینوں نو واردوں کی سمت دیکھا تو وہ اپنا سامان سمیٹ کر جانے کی تیاری کر رہے تھے ذرا دیر بعد وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

''مجھے ان کے تیور اچھے نہیں لگتے'' گولر نے فکر مند لہجے میں کہا۔

''ممکن ہے وہ واپس آئیں۔''

احمد شلوزان نے کلاڈیا کی سمت دیکھ کر پوچھا ''ڈیئر پستول تمہارے پاس کہاں سے آگیا؟''

ایسے ہی موقع کے لئے چھپا کر رکھا تھا'' کلاڈیا نے مسکرا کر جواب دیا۔

''گولر پریشان نظر آتا ہے''

''اب وہ اپنے چیف کو جا کر بتائیں گے'' گولر نے پریشان کن لہجے میں کہا اور پھر ایک بس وہاں پر آ کر رک گئی اس کا ڈرائیور اتر کر ویگن کے پاس آیا ''سواسری'' اس نے کہا۔

''سواسری'' احمد شلوزان نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ ڈرائیور نے بڑی خوش اخلاقی سے کہا'' شاید آپ کو نہیں معلوم کہ آج واپسی کا دن ہے۔''

''واپسی کا دن؟'' احمد شلوزان نے حیران ہو کر کہا۔

''ہاں آمد کا دن کل ہوگا آج اس راستے سے سواریوں کے آنے کا دن ہے سڑک تنگ ہونے کی وجہ سے آمد و رفت کے لئے ایک ایک دن مقرر ہے۔''

''اوہ ہم اس راستے سے پہلی مرتبہ سفر کر رہے ہیں اس لئے ہمیں پتا نہیں تھا'' احمد شلوزان نے مسکرا کر جواب دیا ''ہم گاڑی بیک کئے لیتے ہیں۔''

خطرناک راستے پر گاڑی بیک کرنا آسان کام نہیں تھا لیکن انہیں جلد ہی ایک کشادہ جگہ مل گئی احمد شلوزان نے ویگن سائیڈ میں لگائی اور بس گزر گئی۔ پھر اس نے کلاڈیا سے کہا کہ کیوں نہ ایک دن گاؤں

میں قیام کریں لیکن وہ راضی نہ ہوئی اس لئے وہ پھر آگے روانہ ہوگئے آگے جا کر سڑک بہت خراب ہوگئی تھی جگہ جگہ گڑھے اور ناہموار زمین تھی۔ دھچکوں کی وجہ سے پتلی سی سڑک پر ویگن سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ گرمی بھی اتنی بڑھ گئی تھی کہ پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں ایسا لگتا تھا کہ بارش ہونے والی ہے ہوا کے بند ہونے سے جو حبس تھا وہ بارش کی پیش گوئی کر رہا تھا وہ اب ڈھلوان پر سفر کر رہے تھے ایک سمت بلند پہاڑی تھی دوسری جانب گہری کھائی۔ احمد شلوزان احتیاط سے ڈرائیو کرتا رہا۔

سہ پہر کے قریب اچانک آسمان پر گہرے اور سیاہ بادل نمودار ہوئے۔ ہوا تیز ہوگئی اور موسم میں تیز خنکی پیدا ہوگئی اور پھر گرج چمک کے ساتھ زوردار بارش شروع ہوگئی۔ بارش کی شدت کی وجہ سے چند گز سے زیادہ فاصلے تک دیکھنا ممکن نہ رہا تھا ویگن بالکل رینگنے کے انداز میں آگے بڑھ رہی تھی وہ سب خاموش بیٹھے تھے کہ بڈ گولر نے ٹرانزسٹر اٹھا کر آن کردیا۔ موسیقی کی تیز آواز اس ماحول میں بڑی روح پرور محسوس ہو رہی تھی۔

تھینک یو گولر'' کلاڈیا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

لیکن موسیقی اچانک بند ہوگئی ریڈیو نے ایک اعلان نشر کرنا شروع کردیا۔

''پولیس کو ایک غیر ملکی صحافی آرٹن کے قتل کے سلسلے میں دو غیر ملکی سیاحوں کی تلاش ہے جن کے بغیر قتل کی تفتیش میں دشواری ہو رہی ہے ان میں سے ایک مسز کلاڈیا آئزک ہیں اور دوسرے کا نام احمد شلوزان بتایا جاتا ہے جو ربانیہ کی ایک خانقاہ کا بھکشو ہے دونوں کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ جنوبی علاقے کی سمت بڑھ گئے ہیں اور......''

کلاڈیا نے ٹرانسسٹر بند کردیا۔ ''مجھے پہلے ہی اس بات کا خدشہ تھا'' کلاڈیا نے کہا۔

''کیا وہ ہمارے تعاقب میں ادھر آئیں گے؟'' لیکن واپسی پر وہ ہمیں بہت پریشان کریں گے''

خدا کرے آئزک یہ خبر نہ سنے'' کلاڈیا نے اچانک کہا۔ ''میں نہیں چاہتی کہ اسے میری آمد کی خبر پہلے سے ہی مل جائے۔''

''لیکن کیوں؟''

''میں اس سے حقیقت معلوم کرنا چاہتی ہوں یہ نہیں چاہتی کہ وہ پہلے سے پھر کوئی نیا بہانہ سوچ کر میرا انتظار کرے۔''

احمد شلوزان نے نقشہ سامنے پھیلا کر دیکھا۔ ''اگر ہم رات بھر سفر کریں تو کل صبح وہاں پہنچ جائیں گے'' اس نے کہا۔

''تو پھر ہم رات بھر سفر کریں گے۔'' کلاڈیا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تاریکی میں اس راستے پر سفر کرنا بہت خطرناک ہوگا۔''

''اوہ تم فکر نہ کرو۔ میں بہر صورت صبح وہاں پہنچنا چاہتی ہوں۔''

رات کو احمد شلوزان نے ویگن کی رفتار بہت دھیمی کردی تاکہ اچانک موڑ یا کوئی گڑھا وغیرہ آنے پر گاڑی قابو میں رکھے لیکن آدھی رات کو بارش اتنی موسلادھار ہوگئی کہ سفر کرنا ممکن نہیں رہا اس لئے احمد

شلوزان نے ویگن کنارے لگا کر کھڑی کردی تمام رات کڑک اور چمک کے ساتھ بارش ہوتی رہی اور جب رکی تو صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا وہ نشیب میں واقع وادی میں داخل ہوئے تو راستے میں اتنا کیچڑ تھا کہ جیپ نما ویگن کراہ کراہ کر چل رہ تھی۔ کچھ دیر بعد انہیں ایک آبادی نظر آنے لگی۔ ڈھلوان پر بیرک نما لمبی عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ احمد شلوزان نے نقشہ دیکھا اور پھر بتایا کہ اس کے خیال میں یہ ڈاکٹر آئزک کا میڈیکل مشن ہے قریب ہی ایک چشمہ نظر آ رہا تھا۔

وہ دوبارہ روانہ ہوئے تو کلاڈیا ایک خوب صورت سوٹ میں ملبوس تھی جس میں اٹھنے والی خوشبو کے جھونکے ویگن کو معطر کر رہے تھے ایک سائیڈ روڈ پر مڑ کر وہ جلدی ہی ان بیرکوں تک پہنچ گئے جن کے سامنے لگے ہوئے بورڈ پر جلی حروف میں انگریزی اور آئری زبان میں لکھا ہوا تھا۔

''ساؤتھ ایسٹ اورینٹ فاؤنڈیشن میڈیکل سینٹر'' لکڑی کے بنے ہوئے بیرک نما کئی مکان برابر سے بنے ہوئے تھے مرد عورتیں اور بچے کنارے لگے ہوئے باغیچوں میں کام کر رہے تھے ویگن کو دیکھتے ہی وہ تجسس آمیز انداز میں کھڑے ہوگئے کہیں قریب ہی سے جنریٹر کے چلنے کی آواز آ رہی تھی جس سے شاید بجلی سپلائی ہوتی تھی کونے میں ایک بیرک نما شیڈ تھا جو کچن معلوم دیتا تھا کیونکہ عورتیں وہاں کھانا پکا رہی تھیں۔ احمد شلوزان نے درمیانی بیرک کے سامنے ویگن روک دی۔

چند منٹ میں لوگوں نے ویگن کو گھیر لیا وہ تعجب کے ساتھ ان نو واردوں کو دیکھ رہے تھے ان کے لباس مختلف تھے کچھ نے مقامی اور کچھ نے مغربی طرز کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ چند ایک کے جسم پر اسپتال کی وردی تھی بیشتر بچے تقریباً ننگے تھے احمد شلوزان ویگن سے اترا ہی تھا کہ بیرک کے دروازے سے ایک نوجوان دراز قد اور خوب صورت آئری عورت ان کی سمت بڑھتی نظر آئی سادے لباس میں بھی اس کا حسن نمایاں تھا متناسب جسم اور بے حد حسین خدوخال والی عورت سب میں الگ نظر آ رہی تھی اس کی چال میں ایک وقار تھا۔

''گڈ مارننگ'' اس نے قریب پہنچ کر بڑی مترنم آواز میں کہا۔

''میں ابونا سارنگ ہوں آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں؟'' اس نے صاف انگریزی زبان میں پوچھا۔

''ڈاکٹر آئزک میرے شوہر ہیں۔'' کلاڈیا نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ''میں کلاڈیا ہوں ان کی بیوی۔''

احمد شلوزان نے ابونا کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک دیکھی۔

''اوہ......'' اس نے کچھ دیر بعد کہا لیکن ڈاکٹر آئزک موجود نہیں ہیں وہ ایک گاؤں گئے ہوئے ہیں آپ آیئے نا......ان کی واپسی تک یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

''شکریہ۔'' کلاڈیا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر بیٹھے ہی تھے کہ سبز چائے اور کیک کا ناشتہ آ گیا اس دوران سب کا تعارف ہو چکا تھا انہوں نے دیکھا کہ تمام ملازمین باورچی اور لڑکے ابونا کے حکم کی بڑے احترام سے تعمیل کر رہے تھے ابونا کو بلاشبہ یہاں ایک اہم حیثیت حاصل تھی۔

''ڈاکٹر آئزک اپنے مہمانوں کی ہمیشہ بہت خاطر کرتے ہیں'' ابونا نے کہا۔

''لیکن یہاں اتفاق سے ہی کوئی غیر ملکی آتا ہے۔''

''ایسا لگتا ہے تم ڈاکٹر کو بہت قریب سے جانتی ہو؟''

ابونا نے کہا۔

''ہاں۔ آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آتا جا رہا ہے'' احمد شلوزان نے کلاڈیا کے لہجے میں حسد کی جھلک محسوس کی۔

''تم کو کچھ اندازہ ہے کہ ڈاکٹر کب تک واپس آئیں گے؟''

احمد شلوزان نے موضوع بدل کر پوچھا۔

ابونا کا لہجہ سنجیدہ ہوگیا۔ ''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی ہم کئی دنوں سے ان کی واپسی کے منتظر ہیں' لیکن کبھی کبھی ایسے سفر میں اندازے سے زیادہ دیر ہو جاتی ہے ممکن ہے کہ کسی علاقے میں مریض زیادہ رہے ہوں'' اسی لمحے ایک موٹی سی ملازمہ اندر داخل ہوئی اس نے بڑے ادب کے ساتھ ابونا سے پوچھا۔

''کیا مہمانوں کے لئے کھانا تیار کروں؟''

ابونا نے ہاں کہی اور ملازمہ چلی گئی احمد شلوزان نے حیرت سے ابونا کو دیکھا ''اس ملازمہ نے تم کو شہزادی کہہ کر مخاطب کیا تھا ابونا؟'' اس نے پوچھا

ابونا کا چہرہ شرم سے گلنار ہوگیا ''اوہ...... یہ صرف اعزازی خطاب ہے دراصل ہمارا تعلق ایک شاہی خاندان سے ہے بہت دور کا اس لئے علاقے کے لوگ مجھے شہزادی کہہ کر پکارتے ہیں'' اس نے کہا'' لیکن حیرت کی بات ہے کہ آپ ہماری زبان سمجھ لیتے ہیں؟''

احمد شلوزان ہنسنے لگا ''ابھی سیکھ رہا ہوں ویسے تم بھی تو انگریزی اچھی بول لیتی ہو۔''

اور وہ یہ سن کر حیران رہ گئے کہ ابونا نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی تھی وہ آکسفورڈ کی گریجویٹ تھی اس کے بعد وہ اپنی قوم کی خدمت کرنے آئرلینڈ آگئی تھی ڈاکٹر آئزک کو کسی طرح اس کے بارے میں معلوم ہوگیا اور انہوں نے خود اس سے ملاقات کر کے قبائلی علاقے میں کام کرنے کی دعوت دی وہ گزشتہ ایک سال سے ڈاکٹر کی معاون بن کر کام کر رہی تھی۔ ''شروع میں مجھے ڈر تھا کہ میں اس زندگی سے اکتا جاؤں گی لیکن ان غریب لوگوں کی بے کسی اور ان کی پرخلوص محبت نے میرا دل موہ لیا اب فی الحال میں انہی کے ساتھ رہوں گی۔''

اس نے بتایا۔

''تمہارے اور آئزک کے نظریات یکساں ہیں'' کلاڈیا نے کہا۔

''ہاں۔ اس میں شک نہیں' وہ صرف اچھے ڈاکٹر ہی نہیں ایک عظیم انسان بھی ہیں۔''

احمد شلوزان نے فوراً موضوع بدل دیا۔ ''وہ جس گاؤں میں گئے ہیں کیا وہ بہت دور واقع ہے؟''

ایک دن کا سفر ہے لیکن بہت دشوار گزار' اسی لئے وہ جیپ میں گئے ہیں'' ابونا نے جواب دیا۔

''ہم انتظار کرنے کے بجائے کیوں نہ وہیں چلیں'' احمد شلوزان نے کلاڈیا سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''ابونا کے چہرے پر پس وپیش کے آثار نمودار ہوئے۔

’’ویسے تو کوئی حرج نہیں‘‘ اس نے کہا۔

’’انہیں گئے ہوئے دن بھی کافی ہوئے ہیں اور عام طور پر جب ان کو واپسی میں دیر ہوتی ہے تو وہ کسی ہرکارے کو بھیج کر اطلاع دے دیتے ہیں لیکن دراصل وہ علاقے کے قبائل کو اپنی خدمت کے ذریعے جیتنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ اب بھی کلینک میں آتے ہوئے ہچکچاتے ہیں ویسے میرے خیال میں سب ٹھیک ہی ہوگا۔‘‘

’’لیکن تم اس سلسلے میں کچھ پریشان نظر آتی ہو؟‘‘ احمد شلوزان نے کہا۔

’’ہاں...... معمولی سی۔‘‘ ابونا نے کہا۔

’’یہ گاؤں کس سمت واقع ہے؟‘‘

’’شمال میں سرحدی علاقے کے قریب اس کا نام پا ہے وہاں خاصی آبادی ہے۔‘‘

احمد شلوزان چونک اٹھا۔’’کیا کہا......؟‘‘ اس نے پوچھا ابونا نے گردن ہلائی ’’کیا اس نام کے اور گاؤں بھی ہیں؟‘‘

’’اس علاقے میں تو یہی ہے‘‘ ابونا نے کہا۔

’’تب ہمیں فوراً وہاں چلنا چاہیے‘‘ احمد نے کلاڈیا سے کہا۔

’’لیکن کیوں؟‘‘

’’بس میری چھٹی حس کہہ لو‘‘ اس نے بات بنائی ’’میں وضاحت نہیں کرسکتا لیکن میرا خیال ہے یہ بہتر ہوگا۔‘‘

ابونا نے ان کو مہمانوں کے لئے بنے ہوئے کمروں تک پہنچا دیا جو بہت آرام دہ تھے۔ رات کے کھانے کے بعد جب وہ کافی پی رہے تھے تو کلاڈیا نے کہا ’’پر یہ طے رہا کہ اگر صبح تک آئزک نہیں آئے تو ہم ان کے پاس چلیں گے؟‘‘

’’ہاں۔ یہی مناسب ہوگا‘‘ احمد شلوزان نے جواب دیا۔

’’کیا خیال ہے، ہم کلینک دیکھنے چلیں؟‘‘

’’تم ابونا کے ساتھ چلے جاؤ میں تو اب آرام کروں گی۔ اس سفر نے بہت تھکا دیا کلاڈیا نے جواب دیا۔

ابونا نے اسے جنریٹر [illegible]

باقی تمام ملازمین مقامی تھے کلینک کے معائنے کے بعد وہ ایک [illegible] لگی ہوئی روشنیوں کے درمیان سے ہوکر پارک کی سمت جاتی تھی احمد ابونا کی معصومیت اور اس کے حسن کی سادگی سے بے حد متاثر ہوا تھا جانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ابونا کو اس کے تحفظ کی ضرورت ہے ’’تم کو یہ جگہ بہت پسند ہے‘‘ اس نے پوچھا۔

’’ہاں‘‘ ابونا نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔’’اس کے باوجود مجھے ایک دن یہاں سے واپس چلے جانا ہے لیکن فی الحال میں ڈاکٹر آئزک کے ساتھ یہاں بہت خوش ہوں۔‘‘

’’تم کو ڈاکٹر بہت پسند ہے؟‘‘

’’بے حد! اس کے دل میں غریب لوگوں کا اتھاہ درد ہے ایسا بے لوث انسان میں نے نہیں دیکھا۔‘‘

’’اس نے اپنی بیوی کے بارے میں تم سے ذکر نہیں کیا؟‘‘

’’صرف ایک مرتبہ‘‘ ابونا نے ذرا دیر توقف کے بعد کہا ’’سچ پوچھو تو میں بھول ہی گئی تھی اسی لئے مسز آئزک کو دیکھ کر تعجب ہوا تھا ویسے بھی ڈاکٹر کو اپنے کام کے علاوہ کسی اور چیز کا ہوش کہاں رہتا ہے‘‘

پارک بے حد حسین تھا درمیان میں ایک پتلا سا چشمہ بہ رہا تھا ’’بڑی خوب صورت جگہ ہے۔‘‘ احمد شلوزان نے کہا ’’تم کو یہاں تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔‘‘

’’کبھی کبھی ہوتا ہے‘‘ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ’’ممکن ہے کبھی میں دوبارہ شادی کرلوں۔‘‘

’’دوبارہ......؟‘‘

’’ہاں‘‘ میرے پہلے شوہر گزشتہ سال کار کے حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے۔‘‘

احمد شلوزان کے دل میں اس دکھی لڑکی کے لئے ایک نیا احساس جنم لے رہا تھا وہ کچھ دیر بعد واپس ہوئے تو خاموش تھے۔

ٹویوٹا ویگن اتنی زور سے اچھلی کہ بڈگولر چیخ اٹھا۔ احمد شلوزان کو بے ساختہ ہنسی آگئی وہ ایک کچے راستے پر سفر کر رہے تھے جو ہاتھیوں کے لئے بنایا گیا تھا وہ صبح سویرے ہی روانہ ہوگئے تھے۔ کلاڈیا نے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی سرسبز پہاڑیوں کو دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ ’’اگر ذہن پریشان نہ ہوتا تو ان حسین منظر کا صحیح لطف آتا‘‘ اس نے کہا۔

’’آپ پریشان نہ ہوں مسز آئزک‘‘ ابونا نے کہا ’’ڈاکٹر ان علاقوں سے اچھی طرح واقف ہیں اور انہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔‘‘

کچھ دیر بعد وہ ایک پہاڑی ڈھلوان سے اتر رہے تھے جو بہت خطرناک تھی اچانک احمد شلوزان نے زور سے بریک لگایا۔ موڑ سے نکل کر ایک عمر رسیدہ شخص ایک دم سامنے آگیا تھا۔ اس کی پشت پر ایک لمبا ٹوکرا لدا ہوا تھا جس کو ایک بند کے ذریعے اس نے پیشانی سے باندھ رکھا تھا اس کے سر پر چینی طرز کی ٹوپی تھی۔ احمد شلوزان نے دیکھا کہ بوڑھا اتنا نحیف اور ناتواں تھا کہ ہڈیاں نظر آرہی تھیں وہ بوجھ سے جھکا ہوا تھا۔

’’یہ غریب پیدل ہی تماکش تک سفر کرے گا‘‘ بڈگولر نے کہا۔

’’تم کو کیسے معلوم؟‘‘ احمد شلوزان نے چونک کر پوچھا۔

’’آپ دیکھتے نہیں اس کی پشت پر ٹوکرے میں افیون لدی ہوئی ہے‘‘ اس نے بتایا۔

’’اس نے پورے سال محنت کر کے یہ جمع کی ہوگی‘‘ ابونا نے بتایا۔ تماکش میں اسے مشکل سے اس ٹوکرے کے سو بھات ملیں گے جو دس ڈالر کے برابر ہوتے ہیں ممکن ہے یہ گرفتار بھی ہوجائے حالانکہ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔‘‘

’’کیا یہ خود بھی افیون کھاتے ہیں۔‘‘ احمد شلوزان نے پوچھا۔

’’بہت کم، یہ افیون کو زہریلا پھول کہتے ہیں‘‘ ابونا نے جواب دیا ’’اور یہ سچ بھی ہے۔‘‘

ایک خوبصورت وادی میں پہنچ کر وہ چشمے کے قریب لنچ کرنے کے لئے رک گئے ان کے چاروں

طرف بلند پہاڑیاں اور سرسبز جنگل تھا بڈ گولر نے ٹیوٹا کے انجن کو چیک کرنا شروع کردیا کلاڈیا ہری بھری گھاس پر لیٹ گئی۔ احمد شلوزان نے دیکھا ابونا ننگے پیر چشمے کی سمت جارہی تھی تو وہ خود بھی اس کے پیچھے چل دیا ابونا نے اسے دیکھا تو مسکرادی۔

''کبھی کبھی مجھ پر اداسی کے دورے پڑتے ہیں'' اس نے کہا'' ایسے لمحات میں تنہائی کا شدید احساس ہوتا ہے۔''

''تم دوسری شادی کیوں نہیں کرلیتی ہو؟ تنہائی دور ہوجائے گی۔''

''ہاں۔ میں اکثر خود یہی سوچتی ہوں لیکن ڈاکٹر آئزک کو چھوڑ کر جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔''

دونوں باتیں کرتے کرتے اتنی دور نکل آئے تھے کہ باقی لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوگئے تھے احمد شلوزان نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابونا! میں ایک بات کہوں؟ تم کلاڈیا کے سامنے ڈاکٹر کا ذکر اتنی اپنائیت سے نہ کیا کرو مجھے ایسا لگتا ہے کہ اسے ناگوار ہوتا ہے۔''

''ہاں۔ میں نے بھی محسوس کیا ہے'' ابونا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ ایک ایسی جگہ پہنچ کر رک گئے جہاں چشمے نے ایک چھوٹے سے تالاب کی سی شکل اختیار کرلی تھی چاروں سمت گھنی جھاڑیاں تھیں اس ویرانے میں یہ بڑا حسین کنج تنہائی تھا۔

''تم ڈاکٹر کی واپسی میں ہونے والی تاخیر سے پریشان کیوں ہو ابونا؟'' احمد شلوزان نے پوچھا'' آخر کوئی وجہ ہوگی؟'' اس نے ابونا کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے یہ صرف بے بنیاد خدشہ ہے لیکن کچھ عرصے سے خبر آرہی ہے کہ کرنل جوزف اس علاقے میں سرگرم ہے۔''

''میں دوسری بار یہ نام سن رہا ہوں'' احمد شلوزان نے کہا'' تمہارے خیال میں یہ کرنل کسی اعتبار سے ڈاکٹر کے لئے خطرناک ہوسکتا ہے؟''

''یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن سننے میں آیا ہے کہ کئی گاؤں کے سرداروں کو اس نے اغوا کرکے بھاری رقم وصول کرنے کے بعد چھوڑا ہے اور چند کو ہلاک بھی کردیا۔ ممکن ہے یہ صرف افواہیں ہوں۔''

''کیا اس کرنل کو مقامی آبادی کی اہمیت حاصل ہے؟''

''حقیقت پوچھو تو مجھے معلوم نہیں' لیکن ان دیہاتی لوگوں کو ورغلانا مشکل کام نہیں ہے۔''

''کیا کرنل نے اس گاؤں' پا کو بھی اپنا نشانہ بنایا جہاں ہم چل رہے ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم میں صرف وہاں ایک مرتبہ گئی ہوں۔''

''اوہ تم وہاں جاچکی ہو؟ تب شاید تم اس شخص کو جانتی ہو جو اس گاؤں کے اسکول میں ٹیچر ہے۔''

''ہاں میں اسے جانتی ہوں'' ابونا نے ہنستے ہوئے کہا۔'' اس بے چارے کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ گاؤں والے تعلیم کے مخالف ہیں بڑی مشکل سے بچوں کو اسکول بھیجنے پر تیار ہوتے ہیں تم اسے کیونکر جانتے ہو؟''

ربانیہ میں ایک شخص نے اس کا ذکر کیا تھا احمد شلوزان نے بات بنائی ابونا غور سے اس شخص کا چہرہ

دیکھ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر ایک درخت کے پاس کھڑا ہوگیا ابونا بھی وہیں آگئی۔

''وہ گولر بتا رہا تھا کہ تم بھکشو ہو'' ابونا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں کم از کم یہاں آنے سے پہلے تک تھا۔''

''یہ جھوٹ ہے بھکشو کسی عورت کو ہاتھ نہیں لگاتے اور تم نے تو میرا ہاتھ پکڑ رکھا ہے'' ابونا نے کہا'' تمہاری قسم تو ٹوٹ گئی۔''

احمد شلوزان نے گھبرا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''میں نے چند روز کی رخصت لے لی'' احمد شلوزان نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں شلوزان اب تو قسم ٹوٹ چکی ہے'' اس نے احمد شلوزان کے شانوں پر سر رکھ کے اسے پکڑ لیا وہ خاموش کھڑا رہا۔ اسے ایک ان جانی مسرت ایک نامعلوم کیف کا احساس ہورہا تھا چند لمحے کو وہ سب کچھ بھول گیا'' میں بہت دکھی ہوں احمد شلوزان! تم پہلے شخص ہو جس نے اتنی مدت کے بعد مجھے یہ احساس دیا ہے کہ...... زندہ رہنے کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت ہے' تم جیسے ہمدرد اور محبت کرنے والے ساتھی کی۔''

احمد شلوزان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا محبت کا بے پناہ اتھاہ اور ناقابل برداشت دھارا اس کے قدم بہا لے گیا وہ اپنے خوابوں سے اس وقت چونکے جب کسی سیٹی کی آواز سنائی دی چند لمحے بعد جھاڑیوں کے درمیان سے بڈ گولر نمودار ہوا۔

''سب تمہارا انتظار کررہے ہیں'' اس نے شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہا احمد کو یقین تھا کہ وہ بہت پہلے سے چھپا ہوا ان کو دیکھ رہا تھا واپسی پر ابونا آگے نکل گئی گولر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ افیون کے کھیتوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔

''اب ہم گاؤں کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں'' ابونا نے کہا۔

کچھ دور جاکر احمد نے ویگن روک دی اور نیچے اتر آیا حد نگاہ تک افیون کے کھیت پھیلے ہوئے تھے لیکن اسکے خیال کے برخلاف افیون کے پودوں کے بیضوی پھول سفید نہیں سرخ تھے۔ اسے یقین آگیا کہ ارتضی نے سچ کہا تھا کہ اس مقدار میں افیون کی کاشت اس کے شبہے کی تصدیق کررہی تھی پھولوں سے عجیب بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی گولر اتر کر اس کے قریب آگیا۔

''کاش! میں اپنا پائپ لے کر آیا ہوتا'' اس نے کہا۔

''دماغ صحیح ہے کبھی بھول کر بھی اسے ہاتھ نہ لگانا۔''

''میں جانتا ہوں یہ زہریلے پھول ہیں بے حد زہر ہے ایک مرتبہ میں ان کھیتوں سے گزر رہا تھا عورتیں پھول توڑنے میں مصروف تھیں ایک عورت نے کھیت میں اپنے ننھے بچے کو لٹا دیا تھا جب کام سے فارغ ہوکر اس نے بچہ اٹھایا تو بچہ مرچکا تھا۔ ان پھولوں کی بو اور ہوا میں بھی زہر ہوتا ہے۔''

احمد شلوزان نے جب دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کی تو کلاڈیا نے پوچھا۔

''تم کیا دیکھ رہے تھے؟''

''زہریلے پھول'' شلوزان نے مسکرا کر جواب دیا وہ اسے کچھ نہیں بتا سکتا تھا ارتضی نے جوزے

داری اسے سونپی تھی اسے اب تک شلوزان نے سختی کے ساتھ راز رکھا تھا بڈ گولر نے اچانک چلا کر کہا۔

''ہے...... ادھر دیکھو وہ...... وہاں ایک جیپ کھڑی ہوئی ہے۔''

شلوزان نے بڈ گولر کی اٹھی ہوئی انگلی کی سمت دیکھا راستے کے بائیں جانب کچھ فاصلے پر واقعی ایک جیپ کھڑی تھی لیکن وہ بالکل خالی تھی۔

''یہ...... یہ تو ڈاکٹر آئزک کی جیپ ہے'' ابونا نے پریشان لہجے میں کہا۔

گاڑی روک کر وہ سب تیزی سے چلتے ہوئے جیپ کے پاس پہنچے لیکن جیپ میں کوئی نہ تھا۔

کلاڈیا نے خوف زدہ نگاہوں سے قریب پھیلے ہوئے جنگل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن آئزک کہاں ہے؟''

''کچھ پتا نہیں'' شلوزان نے کہا اور جیپ کے اندر ہر سمت دیکھا' جیپ بالکل صحیح حالت میں تھی لیکن سامنے ڈیش بورڈ پر گرد جمی ہوئی تھی وہ باہر نکلنے والا تھا کہ رک گیا جمی ہوئی گرد پر کسی نے انگلی سے چند الفاظ لکھے تھے اس نے قریب سے پڑھا ''کرنل''...... وہ ان کا مطلب سمجھ گیا باہر نکلا تو بڈ گولر نے بونٹ بند کرتے ہوئے کہا۔

''انجن بالکل ٹھیک حالت میں ہے۔''

''اوہ شلوزان! میرا دل ڈر رہا ہے'' کلاڈیا نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔''

''میں خود بھی پریشان ہوں'' شلوزان نے کہا۔

''وہ یقیناً واپس آ رہے تھے لیکن اگر جیپ خراب نہیں ہوئی تھی وہ غائب کہاں ہو گئے ممکن ہے کچھ بھول گئے ہوں اور اسے لینے پیدل ہی واپس گاؤں چلے گئے ہوں۔''

''تم مجھے اس طرح تسلی دینے کی کوشش مت کرو۔'' کلاڈیا نے کہا۔

''میرا خیال ہے گاؤں پہنچ کر کچھ نہ کچھ ضرور پتا چل جائے گا'' اس نے کلاڈیا کو اپنے خدشات سے لاعلم رکھتے ہوئے کہا۔

تقریباً بیس منٹ کے سفر کے بعد وہ ایک پہاڑی ٹیلے پر پہنچ گئے جہاں سے راستہ نشیب کو جاتا تھا اس ٹیلے کے نیچے کچھ فاصلے پر لکڑی کے بنے ہوئے بہت سے مکانات دور تک پھیلے ہوئے تھے گاؤں میں داخل ہونے والے راستے کے کنارے ایک بیرک نما مکان کے سامنے فلیگ پوسٹ پر آئرلینڈ کا پرچم لہرا رہا تھا یہ اسکول کی ایک عمارت تھی وہ جیسے ہی گاؤں میں داخل ہوئے مکانوں سے بہت سے گاؤں والوں نے نکل کر ان کی گاڑی کو گھیر لیا ان میں بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ایک دبلا پتلا شخص جس نے سر پر ٹوپی پہن رکھی تھی اور سب میں نمایاں لگتا تھا آگے بڑھا اور ویگن کے اگلے دروازے کے سامنے رک کر بڑی جلدی جلدی شلوزان سے کچھ کہنے لگا لیکن شلوزان کی زبان نہ سمجھ سکا۔

''وہ کہہ رہا ہے کہ گاؤں میں ایک شخص بہت زخمی ہے اور قریب المرگ ہے'' گولر نے بتایا۔ کلاڈیا کا چہرہ سفید پڑ گیا اس نے بہ مشکل پوچھا۔

''آئزک...... کیا وہ آئزک ہے؟''

گولر نے بات کرنے کے بعد بتایا ''نہیں یہ زخمی شخص اسی گاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ شخص بتا رہا ہے کہ ڈاکٹر آئزک صبح سویرے ہی یہاں سے واپس روانہ ہو گئے تھے۔''

شلوزان نے ویگن اسٹارٹ کی اور کچھ فاصلے پر ایک کشادہ جگہ پر پارک کر دی گاؤں والے گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے وہاں پہنچ گئے ان کی رہنمائی میں وہ اس مکان کے سامنے پہنچ کر کے جس میں زخمی شخص پڑا ہوا تھا ابونا اپنے ساتھ فرسٹ ایڈ بکس لیتی آئی تھی زخمی شخص مکان کے کمرے میں بنے ہوئے مٹی کے چبوترے پر لیٹا ہوا تھا ایک لنگی کے علاوہ اس کے جسم پر اور کوئی لباس نہ تھا اس کے سینے پر کئی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ابونا سارنگ نے جلدی سے جھک کر اس کی نبض دیکھی اور پھر شلوزان کی سمت دیکھ کر کہا۔

''یہ طاؤس ہے۔ وہی اسکول ٹیچر۔''

شلوزان نے پیچھے کھڑے مجمعے میں اس شخص کو دیکھا جس نے انہیں زخمی طاؤس کے متعلق اطلاع دی تھی۔

''اس سے پوچھو کہ یہ زخمی کیسے ہوا؟'' اس نے بڈ گولر سے کہا۔

''بڈھے نے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ گاؤں میں کسی کو طاؤس سے دشمنی نہ تھی لیکن دو دن پہلے جینتھر مین کے ایک ساتھی نے اپنی بندوق اٹھائی اور بلا کچھ کہے طاؤس کو گولی ماردی۔ اس کے بعد وہ چلے گئے ان کے بعد وہ جادوگر آیا جو خود کو ڈاکٹر کہتا تھا اس نے اپنے جادو سے طاؤس کی جان بچانے کی بہت کوشش کی لیکن اس مرتبہ جادوگر کا جادو کمزور پڑ گیا اس کے جانے کے کچھ دیر کے بعد سے ہی طاؤس کی حالت پھر خراب ہونے لگی۔

طاؤس نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھنے کی کوشش کی ابونا سارنگ نے جلدی سے اس کا سر پکڑا اور بہت آہستہ سے پھر لٹا دیا۔

''تم بولنے کی کوشش مت کرو'' ابونا نے مقامی زبان میں کہا اور پھر شلوزان کی سمت مڑی ''یہ ذرا دیر کا مہمان ہے۔'' اس نے انگریزی میں بتایا۔

شلوزان نے مجمعے کو وہاں سے ہٹا دیا اور پھر جھک کر طاؤس کے کان کے پاس اس کی زبان میں کہا۔

''میں تمہارے لئے ایک پیغام لایا ہوں چہرہ خرگوش جیسا...... دل شیر جیسا...... تم پیغام سمجھے۔''

طاؤس نے آہستہ سے سر گھما کر شلوزان کی سمت دیکھا اس کی آنکھوں سے شدید کرب نمایاں تھا۔

''کرنل جوزف...... بنان میں۔''

شلوزان...... اسے بات نہ کرنے دو' ابونا نے جلدی سے کہا۔

''جادوگر...... ڈاکٹر......'' طاؤس نے رک رک کر کہا ''اسے معلوم ہے...... میں نے اسے سب بتا دیا ہے...... سب کچھ۔''

ابونا نے زبردستی شلوزان کو پیچھے ہٹا دیا اور طاؤس پر جھکی۔

طاؤس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن وہ مر چکا تھا۔

اسی رات گاؤں کے رواج کے مطابق طاؤس کی لاش کو ایک چتا پر رکھ کر جلا دیا گیا گاؤں سے باہر والے میدان میں تمام لوگ اکٹھے تھے چتا کے شعلے بلند ہو رہے تھے جلتی ہوئی مشعلوں اور چتا کی آگ سے دور تک روشنی پھیل گئی تھی شلوزان' کلاڈیا' ابونا اور بڈ گولر سامنے والے مکان کے برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے تھے کلاڈیا کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا ابونا ساکت بیٹھی تھی بڈ گولر اپنی کرسی پر پہلو بدل رہا تھا شلوزان کا ذہن حالات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا ارتضٰی کے مطابق طاؤس نے پہلے ہی اطلاع دی تھی کہ اسے اپنی کا خطرہ ہے پھر جیفتھر یعنی کرنل جوزف نے اسے اچانک گاؤں پہنچ کر گولی مار دی یہ محض اتفاق تھا کہ اس کے بعد ڈاکٹر آئزک وہاں پہنچ گیا جس نے طاؤس کی جان بچانے کی کوشش کی طاؤس نے یہ محسوس کر کے کہ موت قریب ہے ڈاکٹر آئزک کو وہ تمام راز بتا دیا جو ارتضٰی معلوم کرنا چاہتا ہے ممکن ہے ڈاکٹر نے وعدہ کر لیا ہو کہ وہ کلینک پہنچ کر ساری تفصیل ارتضٰی کو بتا دے گا کلینک میں ڈاکٹر کے پاس طاقت ور وائرلیس موجود ہے گاؤں میں یقیناً کرنل جوزف کا کوئی جاسوس موجود ہے جس نے یہ اطلاع کرنل کو پہنچا دی کہ ڈاکٹر یہاں موجود ہے اور طاؤس کا علاج کر رہا ہے کرنل کو فوراً یہ خطرہ محسوس ہوا ہو گا کہ طاؤس ساری بات ڈاکٹر آئزک کو نہ بتا دے اور ڈاکٹر وائرلیس سے یہ رپورٹ ربانیہ پہنچا دے گا۔ اسی لئے اس نے واپسی میں ڈاکٹر کو بھی ختم کر دینے کا حکم دیا ہو گا ڈاکٹر آئزک نے کرنل کے مسلح دہشت پسندوں کو اپنی سمت بڑھتے دیکھ کر جلدی میں جیپ کے ڈیش بورڈ پر کرنل جوزف کا نام لکھ دیا اسے اپنے انجام کا احساس ہو گیا ہو گا لیکن اگر یہ سچ ہے تو ڈاکٹر آئزک کی لاش کہاں ہے؟ ممکن ہے انہوں نے جنگل میں چھپا دی ہو لیکن جیپ وہاں کیوں چھوڑ دی اگر وہ ڈاکٹر کی موت پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے تو ایسا ہرگز نہ کرتے ویسے بھی ڈاکٹر جرمنی باشندہ ہے۔ اس کی موت کی خبر عام ہوتے ہی آئرلینڈ کی حکومت کرنل جوزف کے خلاف شدید اقدام کرے گی کیا کرنل اس بات کو پسند کرے گا؟ نہیں' بات کچھ اور ہے کرنل جوزف نے ڈاکٹر کو اغوا کر لیا ہے ممکن ہے بھاری تاوان حاصل کرنے کے لئے...... یا پھر...... یہ معلوم کرنے کے لئے کہ طاؤس نے اسے کیا بتایا ایسی صورت میں وہ ڈاکٹر آئزک سے معلومات حاصل کرنے کے لئے تشدد کرے گا لیکن ڈاکٹر کو بھی یہ اندازہ ضرور ہو گا کہ زبان کھولنا خودکشی کے مترادف ہو گا اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر اس وقت کرنل کی قید میں ہے اور شدید خطرے میں ہے عام حالات میں شلوزان کسی کے لئے اپنی جان خطرے میں نہ ڈالتا اس معاملے سے اس کا کیا تعلق؟ لیکن ارتضٰی سے وعدہ کر چکا تھا اور مسئلہ ارتضٰی کا نہیں مسلم ممالک کی سلامتی کا تھا...... وہ لاتعلق نہیں رہ سکتا۔

"کلاڈیا!......" شلوزان نے اچانک کہا "مجھے تمہارے شوہر کی جان بچانے کے لئے بنان جانا ہو گا" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "گولر تم کو معلوم ہے کہ یہ جگہ کہاں ہے؟" "ہاں میں جانتا ہوں یہاں سے ایک دن کی مسافت پر ہے لیکن وہ غیر آباد جگہ ہے لیکن وہ صرف کھنڈر ہیں اور بندہ اب وہاں کوئی نہیں رہتا اور وہاں کوئی سواری نہیں جا سکتی' صرف پیدل جانے کا راستہ ہے۔"

"لیکن تم کو کیسے معلوم ہوا کہ آئزک وہاں ہے اس ویرانے میں وہ کیا کرے گا؟" کلاڈیا نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"لمبی کہانی ہے" شلوزان نے کہا "تفصیل ابھی مت پوچھو بعد میں سب بتا دوں گا۔"

"شلوزان! تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو...... آخر کیوں؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو کلاڈیا" شلوزان نے کہا "لیکن فی الحال صرف اتنا بتاؤں گا کہ ڈاکٹر کے متعلق مجھے طاؤس نے بتایا تھا میرا خیال ہے میں اور گولر وہاں جا کر ڈاکٹر کو تلاش کر سکتے ہیں ممکن ہے اسے وہاں یرغمالی بنا کر رکھا گیا ہو اور کرنل جوزف اس کی رہائی کے لئے بھاری تاوان وصولنا چاہتا ہو"

"لیکن کیوں......"

"اس سلسلے میں ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا' لیکن اگر یہ سچ ہے تو ہم کرنل سے رہائی کی شرائط تو معلوم کر سکتے ہیں۔ بعد میں واپس آ کر تم کو بتا دیں گے۔"

"مجھے پروا نہیں کہ شرائط کیا ہیں؟" کلاڈیا نے آہستہ سے کہا "وہ جتنی بھی رقم طلب کرے گا میں ادا کر دوں گی" لیکن میں تم کو وہاں تنہا نہیں جانے دوں گی۔"

"پاگل مت بنو میں تم کو ساتھ لے کر جا کر خطرہ مول نہیں لے سکتا"

"اور میں تم کو آئزک کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی اجازت نہیں دے سکتی وہ تمہارا کون ہوتا ہے" میں اس کی بیوی ہوں' شوہر کی جان بچانے کی کوشش میرا فرض ہے تمہارا نہیں۔"

"نہیں کلاڈیا! تم اور ابونا فوراً کلینک واپس جاؤ وہاں پہنچ کر وائرلیس سے تماکش کو ساری اطلاع دے کر مدد مانگو اس دوران ہم بنان جا کر جو کچھ ممکن ہے وہ کرتے ہیں۔"

کلاڈیا نے بہت ضد کی لیکن شلوزان اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا کافی دیر کی حجت کے بعد بالآخر کلاڈیا راضی ہو گئی۔

"ٹھیک ہے شلوزان! بڑی احتیاط سے کام لینا ممکن ہے آئزک کو میں کھو چکی ہوں لیکن اس کے بعد تم کو بھی کھونے کے لئے تیار نہیں ہوں" اس نے شلوزان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"بڈ گولر نے سچ کہا تھا راستہ اتنا تنگ تھا کہ پیدل چلنا بھی مشکل ہو رہا تھا کہیں اتنا بڑا جنگل اور جھاڑیاں تھیں کہ گزرنا دشوار ہو جاتا اور کہیں کھلا ہوا میدانی علاقہ تھا سوائے ہاتھیوں کے انسانی قدموں کے نشان کہیں نظر نہ آتے تھے بڈ گولر آگے آگے چل کر رہنمائی کر رہا تھا شلوزان کو بار بار پشت پر لدے سامان کو سنبھالنا پڑا جھاڑیاں کاٹنے والا ایک لمبا چاقو اس کی کمر سے لٹک رہا تھا جس کے استعمال کی بار بار ضرورت پڑ رہی تھی ایسے ویران جنگل میں اس نے پہلے کبھی سفر نہ کیا تھا کبھی کبھی تو اس کو شک ہوتا کہ بڈ گولر راستہ بھول گیا ہے بڈ گولر نے اس خطرناک مہم کے لئے ایک بھاری معاوضہ کے بغیر بنان جانے پر رضامندی کا اظہار نہیں تھا اس لئے وہ بہرحال وہاں تک ضرور جائے گا یہ خیال اسے تسلی دیتا تھا۔

دوپہر کے قریب وہ ایک چشمے کے قریب پہنچے تو لنچ کے لئے ٹھہر گئے بڈ گولر نے پشت پر لدا ہوا سامان کا تھیلا اتار کر رکھا جس میں رائفل بھی شامل تھی اور سگریٹ جلا کر کش لینے لگا۔

"ہے شلوزان!......" اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا پہلے تو جب مجھے معلوم ہوا کہ تم بھشکو ہو تو یقین ہی نہ آ سکا پھر جب تم نے میری ساری پیش کش ٹھکرا دیں تو میں سمجھ گیا کہ بات ٹھیک ہے۔"

"اور اب کیا خیال ہے......؟ شلوزان نے ہنس کر پوچھا "اب مہاتما بدھ کا ایک قول بار بار یاد

آ رہا ہے اپنے کام سے کام رکھو دوسرا خواہ کچھ بھی کر رہا ہو اس میں دخل مت دو کیا خیال ہے؟"

شلوزان بے ساختہ ہنس پڑا" تمہارے لئے یہ قول صادق آتا ہے بڈ گولر! لیکن میری کچھ مجبوریاں ہیں۔"

"میری سمجھ میں تم اب تک نہیں آئے شلوزان! لیکن ایک بات مانو اگر یہ ڈاکٹر مر گیا ہو تو تم اس عورت سے شادی کر لینا وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"

بڈ گولر نے اتنی معصومیت سے کہا تھا کہ شلوزان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا کلاڈیا کی شکل اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئی شاید بڈ گولر نے سچ کہا تھا لیکن اب تک خود اس کے دل میں کلاڈیا کی محبت نے جگہ نہیں پیدا کی تھی وہ بے حد مالدار تھی مغرب کی عورت تھی جانے کب اس کا دل بھر جائے اور ڈاکٹر کی طرح اس کو بھی بوجھ تصور کرنے لگے اس کے برخلاف ابونا...... پھول کی طرح نازک اور معصوم تھی اس نے اپنی محبت کو بلا کسی توقع کے اس کے دامن میں ڈال دیا تھا اور پھر اس طرح بے نیاز ہو گئی تھی جیسے یہ اس کا حق رہا ہو دیر تک وہ ان دونوں عورتوں کا موازنہ نہ کرتا رہا کتنا تضاد تھا مغرب اور مشرق میں۔

وہ جلد ہی پھر چل پڑے۔ بڈ گولر اتنے اطمینان سے آگے بڑھتا رہا جیسے بارہا اس راستے پر سفر کر چکا ہو وہ چلتے چلتے تھک چکے تھے لیکن ابھی ہمت باقی تھی سورج غروب ہونے کے کچھ ہی دیر بعد بڈ گولر ایک جگہ رک گیا یہ جگہ خاصی بلندی پر تھی اور ہر سمت گھنا جنگل تھا اس نے مڑ کر سرگوشی میں کہا" ہے شلوزان! ......ذرا ادھر آؤ" شلوزان تیزی سے آگے بڑھا اور پھر بڈ گولر کے پاس جا کر رک گیا جو نیچے دیر تک پھیلی ہوئی گھاٹ کی جانب اشارہ کر رہا تھا چاند کی صاف وشفاف روشنی میں نیچے بہت سی عمارتوں کے کھنڈرات نظر آ رہے تھے پتھر کی بنائی ہوئی شکستہ عمارتوں کے اوپر بنے ہوئے بعض مینار اب تک محفوظ تھے۔

"بنان......" بڈ گولر نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

کھنڈرات میں کئی جگہ روشنی ہو رہی تھی اور کبھی کبھی روشنی کمپاؤنڈ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتی نظر آتی تھی...... نہ جانے کیا تھا یہ سب......؟"

احمد شلوزان نے اپنی دوربین نکالی اور ٹیلے کے کنارے پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ اس نے شکستہ مندر کے کمپاؤنڈ میں دیکھنا شروع کیا۔ اسے کبھی کبھی چلتے ہوئے آدمی نظر آتے لیکن فاصلہ اتنا تھا کہ صاف دیکھنا ممکن نہ تھا۔ روشنی الیکٹرک جنریٹر سے پیدا کی گئی تھی جس کے چلنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

جس جگہ جنریٹر نصب تھا وہیں قریب میں جیپ کی قسم کی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا ایک ہیلی کاپٹر بھی صاف نظر آ رہا تھا اس کی دوسری سمت پچاس گیلن والے ایک درجن سے زائد پیٹرول کے ڈرم رکھے ہوئے تھے اس نے دوربین بڈ گولر کی طرف بڑھا دی۔

"ایسا لگتا ہے کہ یہ جگہ کرنل کا مضبوط گڑھ ہے؟" احمد شلوزان نے کہا۔

"کرنل نے بڑی عمدہ جگہ کا انتخاب کیا ہے" بڈ گولر نے جائزہ لینے کے بعد کہا۔" آئرلینڈ میں لوگ پرانے مندروں کے کھنڈر سے ہمیشہ دور بھاگتے ہیں ان کے خیال میں ایسی جگہ پر ہر وقت بدروحیں منڈلاتی رہتی ہیں اور ہم لوگ بدروحوں سے زیادہ اور کسی چیز سے نہیں ڈرتے خیر اب یہ بتاؤ کرنا کیا ہے؟"

"اچھا سوال ہے۔" احمد شلوزان نے مسکرا کر کہا" ان کے پاس جدید طرز کے آٹومیٹک ہتھیار ہوں گے اور شاید ہر سمت گارڈ بھی پہرے پر ہوں مجھے نہیں معلوم کہ ہم کتنے قریب پہنچ سکتے ہیں لیکن ہمیں بہر صورت یہ معلوم کرنا ہے کہ ڈاکٹر آئزک یہاں موجود ہے یا نہیں۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے" اچانک بڈ گولر نے کہا اور اسے بتانا شروع کیا" میں وہاں بھٹکتا ہوا پہنچ جاتا ہوں جیسے راستہ بھول گیا ہوں۔ وہ مجھے پکڑ لیں گے اور طرح طرح کے سوال کریں گے لیکن اس طرح میں یہ دیکھ لوں گا کہ ڈاکٹر وہاں ہے یا نہیں کیا خیال ہے؟"

"نہیں بڈ گولر شکریہ۔" احمد شلوزان نے جواب دیا" اگر تم پکڑے گئے تو وہ زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"نہیں فی الحال ہم یہاں سے لیٹ کر باری باری ان کی نقل وحرکت پر نظر رکھیں گے" احمد شلوزان نے کہا" پہلے ایک گھنٹے کی باری میری ہے۔"

احمد شلوزان لمبے انتظار کے لئے تیار ہو کر بیٹھا تھا' لیکن مشکل سے بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ اسے ایک شخص کی شکل نظر آئی جو اس کے خیال میں یقیناً ڈاکٹر آئزک تھا اس نے جلدی سے دوربین کا فوکس ٹھیک کیا قدیم مندر کے کھنڈرات سے کئی افراد نکل کر سامنے والی عمارت کی سمت جا رہے تھے یہ قدیم عمارت بھکشوؤں کی رہائش گاہ کے طرز پر پتھروں کی بنی ہوئی تھی چھت کافی نیچی تھی اور پھر جیسے ہی وہ لوگ روشنی میں آئے اس نے ڈاکٹر کو پہچان لیا کلاڈیا نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر کی عمر ابھی پینتالیس برس کی ہے لیکن بال بالکل سفید ہو چکے ہیں دو مسلح گارڈ ڈاکٹر کو اپنے درمیان میں لے کر چل رہے تھے سامنے والی عمارت کے گیٹ پر ایک مسلح گارڈ پہلے سے کھڑا تھا وہ دونوں ڈاکٹر کو لئے ہوئے اس گیٹ میں داخل ہوئے اور جب ذرا دیر بعد باہر نکلے تو ڈاکٹر ساتھ نہیں تھا انہوں نے گارڈ کے پاس چند لمحے رک کر باتیں کیں اور پھر مندر کی طرف واپس روانہ ہو گئے دروازے پر کھڑے ہوئے گارڈ نے سگریٹ جلائی اور دیوار کا سہارا لے کر کش لگانے لگا۔

احمد شلوزان نے آہستہ سے بڈ گولر کو آواز دی۔ وہ پھرتی کے ساتھ اٹھ کر احمد شلوزان کے پاس آ گیا دونوں کچھ دیر مشورہ کرتے رہے پھر احمد شلوزان نے فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو نیچے چل کر قریب سے جائزہ لینا چاہیے۔ سامان وہیں چھوڑ کر احمد شلوزان نے رائفل اٹھالی۔ بڈ گولر نے کہا نیچے جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے اس لئے سپاٹ ڈھلوان پر پھسل کر اترنا ہو گا۔ جھاڑیاں کاٹنے کے لئے اس نے اپنا لمبا جنگلی خنجر نکال لیا۔ ڈھلوان پر ہر سمت گھنی جھاڑیاں تھیں وہ ان کو پکڑ کر پھسلتے ہوئے بالآخر احاطے کی چار دیواری کے نیچے پہنچ گئے۔

قد آدم پرانی دیوار کے پتھر جگہ جگہ سے گر گئے تھے اور ان سے سوراخ بن گئے تھے۔ اچانک دیوار پر کسی چیز کے رینگنے کی آہٹ ہوئی۔ احمد شلوزان نے پھرتی کے ساتھ کمر سے لگے ہوئے پستول پر ہاتھ ڈالا لیکن وہ صرف ایک بندر تھا دبے پاؤں آگے بڑھتے ہوئے بالآخر احمد شلوزان نے ایک شگاف تلاش کر لیا جہاں سے بھکشوؤں کی اقامت گاہ کی پرانی عمارت صاف نظر آ رہی تھی احاطے کی چار دیواری سے کوئی دس گز کے فاصلے پر واقع اس اقامت گاہ کا پچھلا حصہ ڈھے چکا تھا شکستہ چھت اور دیواروں کا ملبہ صاف نظر آ رہا تھا صرف اگلا حصہ اب تک سلامت تھا جس میں اس جانب سے کوئی دروازہ یا کھڑکی نظر نہیں آ رہی تھی عمارت کے کچھ فاصلے پر مندر اور دوسری عمارتیں تھیں لیکن اقامت گاہ درمیان میں تھی اس لئے دوسری جانب دیکھنا ممکن نہ تھا۔

''ہم جھکے ہوئے بالکل مینڈکوں کے انداز میں آگے بڑھیں گے'' احمد شلوزان نے سرگوشی کی اور رائفل بڈگولر کو تھما دی ''پہلے میں جا رہا ہوں تم مجھے کور کئے رہنا ہم یکے بعد دیگرے آگے بڑھیں گے۔

''بڈگولر ایک لمحہ سوچتا رہا پھر گردن ہلائی اور بندروں کی طرح چار دیواری پھاند کر اندر کود گیا ایک لمحہ رک کر وہ جھکا ہوا بھاگا اور اقامت گاہ کی دیوار کے سائے میں پہنچ کر رک گیا اس نے اتنی پھرتی دکھائی تھی کہ احمد کو اس کو روکنے کا موقع ہی نہ ملا ذرا دیر بعد وہ بھی بڈگولر کے پاس پہنچ گیا گری ہوئی عمارت کے ملبے کے درمیان سے گزرتے پتھروں کو پھلانگتے آخر کار وہ عمارت کے سامنے والے حصے کے پاس پہنچ گئے دیوار کی آڑ سے سر نکال کر احمد شلوزان نے جھانکا اور فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا مسلح گارڈ دروازے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ احمد شلوزان نے ایک پتھر اٹھایا اور اشارے سے بڈگولر کو بتایا کہ اسے سامنے والے پرانے کنویں کی سمت پھینکنا ہے جیسے ہی اس کی پشت ہماری طرف ہوگی ہم چھلانگ لگا کر اسے غیر مسلح کر دیں گے تم مقامی زبان میں اسے خاموش رہنے کا حکم دینا۔

''میرا خیال ہے اسے ختم کر دینا زیادہ بہتر ہوگا'' بڈگولر نے کہا' لیکن احمد شلوزان نے سختی سے منع کر دیا ''قتل و غارت گری نہیں ہوگی'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

پتھر گرنے کی آواز سن کر گارڈ زور سے چونکا اور کنویں کی سمت دیکھنے لگا۔ احمد شلوزان نے دوسرا پتھر پھینکا۔ اس مرتبہ گارڈ نے پھرتی کے ساتھ آٹومیٹک گن کندھے سے اتاری اور آگے بڑھا وہ پوری طرح چوکنا نظر آرہا تھا ذرا دیر بعد اس نے جھک کر کنویں کے اندر جھانکا احمد شلوزان نے گردن سے اشارہ کیا اور بڈگولر کے ساتھ بھاگتا ہوا آگے بڑھا۔ آہٹ بڑھا وہ پوری طرح چوکنا نظر آرہا تھا ذرا دیر بعد اس نے جھک کر کنویں کے اندر جھانکا احمد شلوزان نے گردن سے اشارہ کیا اور بڈگولر کے ساتھ بھاگتا ہوا آگے بڑھا آہٹ سن کر گارڈ نے پھرتی کے ساتھ مڑنے کی کوشش کی لیکن احمد شلوزان اس سے پہلے چھلانگ لگا چکا تھا وہ گارڈ کو ساتھ لے کر نیچے گرا گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری احمد شلوزان نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ گارڈ کی گردن اپنے بازو کی گرفت میں لے کر دبائی اور دوسرا ہاتھ اس کی منہ پر رکھ دیا بڈگولر نے رائفل کی نال گارڈ کے سینے پر رکھ دی اور مقامی زبان میں کچھ کہا احمد شلوزان نے اس کی گردن چھوڑ دی گارڈ کھڑا ہو کر خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا پھر خاموشی سے اقامت گاہ کی سمت بڑھنے لگا بڈگولر نے اسے عقبی حصے کی سمت چلنے کا حکم دیا۔

لیکن چند قدم چل کر وہ بڑی سرعت کے ساتھ جھکا اور ایک سمت بھاگ نکلا احمد شلوزان آٹومیٹک گن سے فائر کرنیکی ہمت نہ کر سکا گولی کی آواز ان کے سامنے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیتی اس لمحے بڈگولر نے رائفل پھینکی اور تیر کی طرح گارڈ کی سمت جھپٹا جو ملبے پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا بڈگولر نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر گارڈ کے پاس پہنچتے ہی اپنا خنجر والا ہاتھ بلند کیا اور تیز دھار خنجر نے گارڈ کی شہ رگ کاٹ ڈالی۔ خرخراہٹ کی آواز ہوئی اور اس کا بے جان جسم ملبے پر ڈھیر ہو گیا بڈگولر پہلے ہی اچھل کر دور ہو چکا تھا تا کہ خون سے کپڑے خراب نہ ہوں سب کچھ پلک جھپکتے ہوا تھا اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہ عمارت کے اندر داخل ہو گئے سامنے ایک لمبی راہداری چلی گئی تھی جس کے دونوں جانب کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ احمد شلوزان نے

اپنی ٹارچ نکال کر لائٹ پھینکی ساری کوٹھریوں کے کواڑ غائب تھے صرف آخر میں ایک کوٹھری میں پرانا آہنی دروازہ نظر آرہا تھا جو شاید حال ہی میں لگایا گیا تھا لیکن اس پر ایک بڑا سا تالا لگایا گیا تھا۔

''کنجی گارڈ کے پاس ہوگی'' احمد شلوزان نے سرگوشی کی ''بھاگ کر جاؤ'' بڈگولر کے جاتے ہی احمد شلوزان نے دروازے کے قریب جا کر آہستہ سے آواز دی ''ڈاکٹر آئزک کیا آپ اندر موجود ہیں؟''

''کون ہو تم'' کسی نے بھاری لہجے میں پوچھا۔

''آہستہ بولیئے۔ ہم آپ کو رہا کرانے آئے ہیں'' احمد شلوزان نے کہا۔ بڈگولر کنجی لے کر آ گیا چند لمحے بعد ہی ہم ڈاکٹر کو لے کر اقامت گاہ سے باہر آگئے ڈاکٹر نے پھر اپنا سوال دہرایا احمد شلوزان نے سرگوشی کی ''صبر سے کام لو ڈاکٹر ابھی خطرہ دور نہیں ہوا ہے۔''

گھنی جھاڑیوں سے گزرتے ہوئے ڈاکٹر آئزک ایک مرتبہ پھر گر پڑا تو احمد شلوزان نے ٹارچ جلا کر اسے اٹھایا اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر پسینے میں نہایا ہوا تھا پانی کی بوتل نکال کر اس نے ڈاکٹر کی سمت بڑھائی جس نے ایک گھونٹ پانی پی کر احمد شلوزان کی سمت دیکھا۔

''میں شراب نہیں پیتا ڈاکٹر'' احمد شلوزان نے اسے بتایا وہ رکے بغیر چلتے رہے بڈگولر آگے تھا ڈاکٹر درمیان میں اور احمد شلوزان سب سے پیچھے اقامت گاہ سے نکلنے میں انہیں کوئی دشواری نہ ہوئی تھی لیکن وہ ابھی ڈھلوان پر چڑھ ہی رہے تھے کہ نیچے شور وغل اور بھاگ دوڑ سی شروع ہو گئی۔

انہوں نے گارڈ کی لاش دریافت کر لی تھی اس لئے وہ دم لئے بغیر وہاں سے روانہ ہو گئے ایک مرتبہ جب ڈاکٹر خستہ حال ہو کر لڑکھڑانے لگا تو احمد شلوزان نے بڈگولر کو روک کر صورت حال بتائی۔ اس کا اندازہ صحیح نکلا بڈگولر کی جیب میں شراب موجود تھی ڈاکٹر چند گھونٹ پی کر تازہ دم ہو گیا تو وہ پھر روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر پوچھنا چاہا تو احمد شلوزان نے منع کر دیا کہ بات نہ کرے۔

صبح کا اجالا پھیلا تو وہ گھنے جنگل میں تھے سورج کی تمازت سے جنگل میں حبس ہو گیا لیکن وہ تھکے ہوئے قدموں سے آگے بڑھتے رہے تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد اچانک ان کو ہیلی کاپٹر کا شور سنائی دیا اس کا مطلب تھا تلاش بڑی سرگرمی سے جاری تھی احمد شلوزان کے اشارے پر وہ پھرتی سے گھنے درختوں کے درمیان ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ فضا کے ساتھ زمین پر بھی ان کی تلاش ہو رہی ہوگی کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے نڈھال لہجے میں پوچھا۔

''کیا ہم کچھ دیر رک کر آرام نہیں کر سکتے؟''

احمد شلوزان کو اس پر رحم آ گیا ''ٹھیک ہے لیکن جلد ناشتا کر کے پھر روانہ ہو جائیں گے۔''

''کیا تمہارا تعلق سکیورٹی سے ہے؟'' اس نے احمد شلوزان کی سمت دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں ڈاکٹر!'' احمد شلوزان نے ہنستے ہوئے کہا'' میں تو ایک ادنیٰ بھکشو ہوں آپ کی بیگم مجھے ساتھ لے کر آرہی تھیں تو سفارت خانے والوں نے مجھے طاؤس سے مل کر ان کا پیغام لانے کی ذمے داری سونپ دی۔

''آہ تو...... کرنل سچ کہہ رہا تھا لیکن مجھے یقین نہ آیا تھا۔

کلاڈیا واقعی یہاں تک پہنچ چکی ہے؟''

''وہ کلینک پر آپ کا انتظار کر رہی ہے۔'' شلوزان نے کہا۔

''وہ ٹھیک تو ہے نا؟ لیکن یہاں کس لئے آئی ہے؟''

''یہ آپ دونوں کا ذاتی معاملہ ہے وہ خود بہتر طور پر بتا سکیں گی اہم بات یہ ہے کہ طاؤس نے آپ کو کیا بتایا ہے؟ میں اس کے آخری لمحات میں اس کے پاس موجود تھا اس نے مجھ سے صرف یہ کہا کہ آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ ہم اس وقت سنگین خطرے میں ہیں اور میں آپ کو تاریکی میں نہیں رکھنا چاہتا ممکن ہے ہم میں سے کوئی زندہ بچ کر نہ جا سکے اور ممکن ہے ایک بچ جائے اس لئے تمام باتیں ہم دونوں کو معلوم ہونا بہتر ہے۔''

''مجھے احساس ہے'' ڈاکٹر آئزک نے جواب دیا۔

''میں طاؤس کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا لیکن اب میرا وہاں رکنا بے کار تھا اس کے بچنے کی کوئی صورت نہ رہی تھی لیکن اس نے جو کچھ مجھے بتایا وہ اتنا سنسنی خیز تھا کہ پہلے مجھے اس کا یقین نہ آ سکا بعد میں اس کے اصرار کرنے پر میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں کلینک پہنچ کر فوراً ہی وائرلیس پر ربانیہ رابطہ قائم کروں گا اور ان حقائق کو بتا دوں گا وہ یہی چاہتا تھا'' ڈاکٹر نے رک کر ایک گھونٹ لیا اور پھر کہنا شروع کیا۔

''طاؤس کا بیان ناقابل یقین ہے ایسا لگتا ہے کہ کرنل جوزف کو کسی طرح یہ علم ہو گیا کہ میں طاؤس کے پاس موجود تھا کیونکہ وہ بار بار یہی سوال کر رہا تھا کہ طاؤس نے مجھے کیا بتایا؟ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا پھر بھی اب تک وہ بڑے اخلاق سے پیش آ رہا وہ خلاف توقع نوجوان اور جوشیلا آدمی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اب وہ تشدد ضرور کرتا کیونکہ طاؤس کے بارے میں......''

''طاؤس نے آپ کو کیا بتایا تھا؟'' احمد شلوزان نے بات کاٹ کر پوچھا۔

''اس کی اطلاع کے مطابق ان کھنڈرات میں کرنل کے پاس ہیروئن بنانے کا جدید ترین برقی پلانٹ موجود ہے شاید تم کو پتا ہو کہ ہیروئن بنانا کتنا دشوار کام ہے اس کے لئے بڑی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ خود مجھے زیادہ تفصیل نہیں معلوم ہے طاؤس کے مطابق ایک غیر معمولی بڑی رقم اس پلانٹ کے لگانے پر خرچ ہوئی ہے جسے ایک غیر ملکی طاقت نے فراہم کیا ہے اور اتنی بڑی مقدار میں ہیروئن تیار ہو رہی ہے کہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا دنیا کے مختلف ملکوں میں یہ زہر فراہم کرنے کے لئے عالمگیر شہرت کے بدمعاشوں اور اسمگلروں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں طاؤس بار بار زور دے رہا تھا کہ اس کے پیچھے جو اصل شخصیت ہے وہ کوئی اور ہے لیکن خود کرنل کو بھی اس کا نام نہیں معلوم تھا یہ پراسرار شخصیت تمام آپریشن کو کنٹرول کرتی ہے کرنل یہ کام صرف رقم کے لالچ میں کر رہا ہے جس سے وہ آئر حکومت کے خلاف ایک چھاپہ مار انقلابی تنظیم قائم کرے گا۔''

احمد شلوزان کے ذہن میں بار بار آرٹن کا خیال آ جاتا تھا موت سے پہلے آرٹن اپنے لبوں سے کچھ الفاظ ادا کرنا چاہتا تھا جو صحیح معنوں میں ادا نہیں ہو سکے تھے۔

''شکریہ ڈاکٹر! میرا خیال ہے اب چلیں۔''

ایک بار پھر وہ گھنے اور دشوار گزار راستے پر آگے بڑھنے لگے اگر بڈ گولر نہ ہوتا تو شاید وہ تمام عمر ان

جنگلوں میں بھٹکتے رہتے کیونکہ زمین پر اتنی گھنی جھاڑیاں تھیں کہ راستہ نظر نہیں آتا تھا کسی پگڈنڈی تک کا نام و نشان نہ تھا ایسا لگتا تھا کہ انسانی قدم یہاں کبھی آئے ہی نہیں۔ انہوں نے پھر فضا میں ہیلی کاپٹر کی آواز سنی لیکن اب وہ کافی دور تھی۔ ایک بار پھر وہ دم لینے کے لئے رکے ڈاکٹر ایک درخت کے سہارے دراز ہو گیا وہ بالکل نڈھال ہو چکا تھا۔

''مسٹر احمد شلوزان اگر اتفاق سے ہم زندہ بچ نکلے تو میں اور میری بیوی تمہارا احسان کبھی نہ بھولیں گے۔'' اس نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ کلاڈیا مجھ سے ناخوش ہے۔ ممکن ہے وہ طلاق چاہتی ہو لیکن میں اسے الزام نہیں دے سکتا۔ وہ ایک امیر ترین عورت ہے میں جنگل کا ڈاکٹر۔ میرے جذبات کو سمجھنا اس کے لئے واقعی مشکل ہے۔''

''میرا خیال ہے اب اٹھنا چاہیے'' احمد شلوزان نے اٹھتے ہوئے کہا سورج ڈھلنے لگا تھا کہ وہ جنگل سے باہر نکلے تازہ ہوا کے جھونکوں میں انہوں نے سکون کا سانس لیا۔

''اس پہاڑی کے نیچے آبادی واقع ہے'' بڈ گولر نے اشارہ کیا لیکن احتیاط سے آگے بڑھنا'' بلندی زیادہ نہیں تھی۔ آبادی پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرائے کم از کم یہاں تک تو وہ بچ کر نکل آئے۔ بڈ گولر نے اچانک کہا۔

''مجھے کچھ گڑبڑ نظر آ رہی ہے گاؤں پر اتنا سناٹا کیوں طاری ہے؟''

احمد شلوزان جھکا ہوا سامنے کا جائزہ لے رہا تھا اچانک اس نے بڈ گولر کا بازو دبایا۔

''یہ دھواں کیسے اٹھ رہا ہے؟'' اس نے دوربین نکالتے ہوئے کہا وہ جس پہاڑی ٹیلے پر لیٹے ہوئے تھے وہاں سے گاؤں بہ مشکل نصف کلومیٹر دور تھا۔ احمد شلوزان نے دوربین کا فوکس ٹھیک کیا تو حقیقت نظر آ گئی سکوت بے سبب نہیں تھا۔ تقریباً سارے مکانات جل چکے تھے بعض سے اب تک دھواں نکل رہا تھا اور ایک بھی آدمی کہیں حرکت کرتا نظر نہیں آتا تھا اس نے خاموشی سے دوربین بڈ گولر کی طرف بڑھا دی۔

''یہ آگ اتفاقی حادثہ نہیں نظر آتی'' احمد شلوزان نے کہا۔ ''خیال ہے کہ ہموادی کا چکر کاٹ کر آبادی کے باہر سے سڑک تک پہنچنے کی کوشش کریں یہ زیادہ محفوظ رہے گا۔''

وہ دوسری جانب کی ڈھلوان سے نیچے اترے وہ پوری طرح چوکنا تھے لیکن یہ کھلا ہوا ہموار علاقہ تھا باوجود یہ کہ گھاس سینے تک بلند تھی اور کسی قدر آڑ کر رہی تھی پھر بھی فضا سے دیکھے جانے کا خطرہ موجود تھا وادی کو پار کرتے ہوئے گاؤں کی دہانی سمت کا حصہ نظر آ رہا تھا اس طرف کے تمام مکانات جل کر ملبے کا ڈھیر بن چکے تھے بیشتر سے اب بھی دھواں نکل رہا تھا احمد شلوزان نے پھر دوربین سے دیکھنا شروع کیا۔

ہیلی کاپٹر کی آواز اتنی اچانک آئی تھی کہ وہ بھاگ بھی نہ سکے۔ وہ جیسے ہی مڑے ہیلی کاپٹر ان کے سر پر پہنچ گیا احمد شلوزان پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا۔ ڈاکٹر اور بڈ گولر نے بھی تقلید کی ہیلی کاپٹر ان کے سروں کے اوپر منڈلانے لگا تھا۔ احمد شلوزان نے لپک کر رائفل بڈ گولر کے ہاتھ سے لے لی اور ہیلی کاپٹر کے روٹر کا نشانہ لے کر گولی چلا دی ہیلی کاپٹر تیزی سے نیچے آیا اور مڑ کر دوسری طرف چلا گیا لیکن گھوم کر پھر ان کے اوپر پہنچ گیا اس مرتبہ وہ کافی بلندی پر تھا داہنی جانب کی کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے شخص نے میگا فون باہر نکالا اور

تیز آواز فضا میں گونجی۔

''ڈاکٹر آئزک اور احمد شلوزان غور سے سنو اس میں تمہاری بہتری ہے۔''

''کرنل جوزف! یہ اسی کی آواز ہے۔'' ڈاکٹر نے گھبرا کر کہا۔

''غور سے سنو ڈاکٹر! تمہاری بیوی اور نرس گاؤں میں ہیں وہ میرے سپاہیوں کی حراست میں ہیں تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ گاؤں جا کر خود کو بھی میرے آدمیوں کے حوالے کر دو ورنہ اپنی عورتوں کے انجام کے ذمے دار تم خود ہوں گے ہم ان کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے لیکن اب یہ تمہارے اختیار میں ہے''

''اوہ...... مائی گاڈ!'' ڈاکٹر نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

احمد شلوزان نے دوربین کا رخ گاؤں کی طرف کر کے فوکس کیا اس مرتبہ کلاڈیا اور ربونا سارنگ نظر آ رہی تھیں وہ کرنل کے خاکی وردی والے سپاہیوں کے نرغے میں تھیں ڈاکٹر آئزک نے غصے میں رائفل اٹھا کر ہیلی کاپٹر پر فائر کیا۔

''احمق نہ بنو!'' میگا فون سے کرنل کی آواز سنائی دی۔

''ایک نظر گاؤں کی سمت ڈال کر دیکھ لو۔''

احمد شلوزان نے دیکھا کہ خستہ وردیوں میں ملبوس سپاہی کلاڈیا اور ربونا کو دھکے دے کر آگے بڑھا رہے ہیں آگے کھڑے ہوئے ایک شخص کے ہاتھ میں ایک ہینڈ ٹرانسمیٹر تھا جس کے ذریعے وہ ہیلی کاپٹر سے رابطہ رکھے ہوئے تھے شاید وہ ہدایات کا منتظر تھا وہ لوگ تقریباً پچاس گز دور آ کر رک گئے۔

''ڈاکٹر آئزک! اب غور سے دیکھو شاید تم یہی چاہتے ہو''

کرنل کی آواز میگا فون پر گونجی۔

احمد شلوزان نے دیکھا کہ دو سپاہی آگے بڑھے انہوں نے کلاڈیا کے ہاتھ جکڑ کر بے بس کر دیا کلاڈیا نے جدوجہد شروع کی تو دو اور سپاہیوں نے اسے پکڑ کر قابو میں کر لیا۔

''دوربین مجھے دو'' ڈاکٹر نے دوربین چھین کر آنکھوں سے لگائی اور پھر بے بسی کے عالم میں چیخا۔

''نہیں...... بہ خدا نہیں''

''خود پر قابو رکھو ورنہ......'' اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ڈاکٹر نے دوربین پھینکی اور رائفل اٹھا کر گاؤں کی سمت بھاگنا شروع کر دیا۔

''ڈاکٹر پاگل نہ بنو رک جاؤ ڈاکٹر'' احمد شلوزان غصے میں چلایا لیکن ڈاکٹر پر جیسے جنون طاری ہو گیا ہو وہ حیرت انگیز تیز رفتاری کے ساتھ بھاگ رہا تھا اور سپاہیوں سے کچھ فاصلے پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی وہ بغیر نشانہ لئے گولی چلا رہا تھا اور پھر ایک سپاہی نے اپنی اسٹین گن بلند کی اور فضا فائرنگ کی تیز آواز سے گونج اٹھی۔ ڈاکٹر آئزک اچھلا اور گر کر ساکت ہو گیا۔

احمد شلوزان نے بڈ گولر کو اشارہ کیا اور بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا بڈ گولر نے ساتھ بھاگتے ہوئے کہا۔

''یہ کتے ان عورتوں کا ستیاناس کر دیں گے۔''

احمد شلوزان نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے معلوم ہے بڈ گولر لیکن ہم ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔''

وہ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ ہیلی کاپٹر سر پر منڈلانے لگا۔ احمد شلوزان نے غصے میں کلاڈیا کا پستول بلند کر کے نشانہ لیا ہیلی کاپٹر پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا لیکن احمد شلوزان جانتا تھا کہ فرار کی کوشش اب بے سود ہو گی۔

''پستول پھینک دو مسٹر احمد شلوزان! ورنہ اپنی موت کے ذمے دار خود ہوں گے'' میگا فون سے آواز آئی لیکن احمد شلوزان نے رفتار اور تیز کر دی ہیلی کاپٹر تیزی کے ساتھ آگے گیا اور سامنے کے میدان میں اتر گیا پائلٹ اور کرنل جوزف کود کر باہر نکلے پائلٹ کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی اس نے ایک برسٹ فائر کیا گولیاں احمد شلوزان سے کچھ فاصلے پر زمین کو چاٹ گئیں لیکن وہ پھر بھی نہ رکا۔ اچانک بڈ گولر خوف زدہ لہجے میں چلایا۔

''خدا کے لئے رک جاؤ'' احمد شلوزان نے پلٹ کر دیکھا بڈ گولر ہاتھ بلند کئے کھڑا تھا اس کے قدم رک گئے۔ شکست خوردہ انداز میں اس نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے۔ دوسرے ہی لمحے کرنل جوزف اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''تم بلاشبہ بڑے جیالے ہو مسٹر احمد شلوزان!'' کرنل نے کہا۔ ''لیکن ایسی ضد حماقت تصور کی جاتی ہے۔''

جب وہ دوبارہ اس علاقے کی حدود میں داخل ہوئے تو صبح کا اجالا پھیل رہا تھا کرنل جوزف احکامات دے کر ہیلی کاپٹر سے واپس چلا گیا دس مسلح سپاہیوں کے نرغے میں وہ تمام رات سفر کرتے رہے تھے کلاڈیا کے چہرے پر سکوت طاری تھا وہ بڑے ضبط و تحمل کے ساتھ سر اٹھائے چلتی رہی تھی۔ احمد شلوزان اس کی ہمت و حوصلے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ربونا سارنگ خاموش تھی لیکن اس کی آنکھوں سے دہشت جھلک رہی تھی بڈ گولر تمام راستے چوکنا رہا تھا جیسے کسی موقع کا منتظر ہو لیکن ان کے محافظوں نے ذرا سی بھی غفلت نہیں برتی تھی۔

قدیم مندر کے احاطے میں پہنچ کر انہیں پہلے مندر کی بڑی عمارت میں لے جایا گیا احمد شلوزان نے دیکھا کہ سخت حفاظتی پہرہ تھا۔ اسلحے کا خاصا انبار جمع کیا گیا تھا اور یہ ایک ملٹری کیمپ نظر آتا تھا۔ جلد ہی ان کو اسی شکستہ عمارت میں پہنچا دیا گیا جہاں ڈاکٹر آئزک کو رکھا گیا تھا لیکن اب ہر سمت پہرے دار نظر آ رہے تھے اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان کے لئے تین اور کوٹھریوں میں دروازے لگا دیئے گئے تھے اور ہر دروازے میں ایک گول سوراخ موجود تھا تا کہ اندر دیکھا جا سکے۔ کوٹھریوں کی دیواریں آہنی شیٹ اور لکڑی کے شہتیروں سے بنائی گئی تھیں۔ احمد شلوزان کو اسی کوٹھری میں رکھا جس میں ڈاکٹر آئزک قید تھا اور اس کے برابر والی کوٹھری میں ربونا اور پھر بڈ گولر اور کلاڈیا کو رکھا گیا دروازہ بند ہونے کے بعد دائرہ نما سوراخ سے اس نے جھانکا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ راہداری میں کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ احمد شلوزان نے حوالات کا جائزہ لیا۔ بیرونی دیوار پتھر کی تھی جس میں بلندی پر بنے ہوئے روشن دان سے نکلنا ممکن نہ تھا کوٹھریوں کی درمیانی دیوار

میں البتہ چھوٹا سا خلا تھا کچھ دیر بعد احمد شلوزان نے ربونا کو آواز دی۔

"ربونا کیا تم میری آواز سن رہی ہو؟ دیوار میں بلندی پر ایک خلا ہے۔"

اس نے فوراً ہی جواب دیا۔ "ہاں۔ تمہاری آواز صاف آرہی ہے اور برابر والی دیوار میں بھی ایسا ہی خلا ہے۔"

"غور سے سنو ربونا!" احمد شلوزان نے کہا "کلاڈیا سے کہہ دو کہ وہ بھی یہ پیغام آگے پہنچا دے۔ میں فرار کی کوئی صورت سوچ رہا ہوں وہ کیا ہوگی' ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا' لیکن تم سب تیار رہنا۔"

ربونا نے ہدایت کی تعمیل کی تھی۔ وہ اس کی آواز سن رہا تھا تسلی دینے کے لئے تو اس نے یہ کہہ دیا تھا لیکن اس کے سامنے کوئی منصوبہ نہ تھا لیکن وہ بھکشوؤں کے تحمل سے کام لے رہا تھا۔ کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکل آئے گی۔ اسی لمحے قدموں کی چاپ سنائی دی کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ دو مسلح محافظوں نے ٹارچ کی روشنی میں اسے باہر آنے کو کہا ایک مرتبہ اس کا دل چاہا کہ محافظ پر چھلانگ لگا دے لیکن پھر اس نے فیصلہ کیا کہ یہ بے سود ہوگا اس لئے وہ باہر نکل آیا اس کی باقاعدہ تلاشی لینے کے بعد باہر چلنے کا اشارہ کیا گیا۔

باہر نکلتے ہی سورج کی تیز روشنی سے اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں لیکن کمپاؤنڈ سے گزر کر اس کے محافظ ایک بار پھر مندر کی بڑی عمارت میں داخل ہوئے جس کا بیشتر حصہ ابھی سلامت تھا پتھر کی اس خوب صورت عمارت کے ایک کمرے میں کرنل جوزف اس کا منتظر تھا۔

"اندر آجاؤ مسٹر شلوزان! اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ تمہاری شخصیت مجھے بڑی دلچسپ لگتی ہے۔"

"تم نے صرف یہ بتانے کے لئے تو مجھے نہیں بلایا ہوگا کرنل۔"

"نہیں۔ میں خود محسوس کر رہا ہوں کہ تم سے دوٹوک بات زیادہ بہتر رہے گی" کرنل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بارے میں مجھے سب کچھ معلوم ہے مسٹر احمد شلوزان! تم مسز آئزک کے ساتھ کس لئے آئے ہو یہاں کیا کر رہے ہو تم طاؤس سے چند اہم باتیں معلوم کرنے آئے تھے جو میری سرگرمیوں سے تعلق رکھتی ہیں تم کو تمہارے ملک کے سفارت خانے نے یہ ذمے داری سونپی ہے تم ایک تجربے کار تربیت یافتہ کمانڈو ہو اور اپنے ملک سے مفرور ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس کے بعد تم حقیقت بتانے میں تامل نہ کرو گے۔"

"اور اگر میں پھر بھی انکار کر دوں تو......؟"

"ہم پھر بھی تمہیں فوراً ہلاک نہ کریں گے' کیونکہ ہمیں یہ ضرور معلوم کرنا ہے کہ طاؤس نے تم کو کیا بتایا ہے؟ اس کے لئے میرے پاس دوسرے طریقے بھی ہیں ہم ڈاکٹر کی طرح تم سب کو ختم کر سکتے ہیں لیکن پھر بھی میں نے تمہارے ساتھیوں کو زندہ رکھا ان کے لئے عجلت میں مہمان خانہ بنوایا۔ یہ سب بلا سبب نہیں ہے اگر تم نے حقیقت بتانے سے انکار کیا تو ہم تم پر نہیں تمہارے دونوں ساتھیوں پر تجربہ کریں گے میرا خیال ہے کہ تم کلاڈیا اور ربونا جیسی حسین عورتوں کو اپنے سامنے بے عزت ہوتے نہ دیکھ سکو گے میرے آدمی عرصہ دراز سے عورتوں کی قربت سے محروم ہیں۔"

"تم اپنے ہیروئن پلانٹ کا راز افشا ہونے سے بہت ڈرتے ہو کرنل؟"

"قدرتی بات ہے ہماری آمدنی میں اضافے کا یہ واحد ذریعہ ہے ہم نے بہت سوچ سمجھ کر

پلانٹ لگایا ہے ہمیں اپنے مال کی منہ مانگی قیمت مل جاتی ہے اور خریدار اس سے اپنے مقصد پورے کرتے ہیں انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے ہمارا یہ عمل کسی طرح بھی ناجائز نہیں ہے اگر طاؤس گڑبڑ نہ کرتا تو بہت سے لوگ تکلیف سے بچ جاتے لیکن ہمارے ٹرانسمیٹر نے اس کے سگنل پکڑ لئے اس طرح اس کی جاسوسی کا ہمیں بروقت علم ہو گیا تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہمیں اس پلانٹ کو محفوظ رکھنے کی کس قدر ضرورت ہے۔"

"لیکن کرنل! مال کی سپلائی تم براہ راست تو نہیں کرتے ہو گے؟" احمد شلوزان نے کہا۔

"کوئی بھی اتنا احمق نہیں ہو سکتا۔ عموماً مال تیار کرنے والے کبھی اپنی شخصیت کو خریداروں پر ظاہر نہیں ہونے دیتے"۔

"میں سمجھ گیا تمہارا مطلب درمیانی آدمی سے ہے۔"

کرنل نے کہا۔

لیکن ہمارا طریقہ کار مختلف ہے مسٹر! ہم کسی ایک درمیانی آدمی کے محتاج بن کر نہیں رہ سکتے اس لئے ہم نے یہ سلسلہ بھی ختم کر دیا ہے اب ہم مال کے سپلائر کو خود منتخب کرتے ہیں۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"اور ہمارے نئے انتخاب کو تم ذرا دیر بعد خود دیکھ لو گے اب تک ہم ایک درمیانی آدمی کے محتاج تھے جو ہم پر اپنی شخصیت بھی ظاہر نہیں کرتا تھا اس نے اس کاروبار کے لئے ایک خفیہ نام "ارینجر" اختیار کر رکھا تھا اور میں کسی ان جانے شخص کا محتاج بن کر نہیں رہ سکتا تھا اس طرح کبھی ہم دھوکا بھی کھا سکتے تھے اس لئے میں نے بہت تلاش کے بعد ایک ایسے مضبوط اور تجربے کار شخص کو تلاش کیا جو مجھ سے دوبدو اور براہ راست رابطہ رکھ سکے تم چند لمحے بعد اس سے مل کر خود اندازہ کر لو گے کہ وہ شخص کتنا کارآمد ہے لو وہ آ ہی گیا شاید یہ تمہاری دوسری ملاقات ہے۔"

اور اسی لمحے ہیپ برزہ کمرے میں اندر داخل ہوا اس نے ایک قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔

"ہیلو بھکشو! آخر ہم پھر مل گئے نا؟" اس نے طنزیہ انداز میں احمد شلوزان سے کہا۔

"مسٹر احمد شلوزان کو ہمارے کاروبار میں بڑی دلچسپی ہے۔" کرنل نے کہا۔

"اسی لئے میں نے سوچا تم سے ملوا دوں سفر میں تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں خصوصاً اس لئے کہ میں اس سر پھرے عاشق سے اس حالت میں ملنے کا بڑا مشتاق تھا" ہیپ برزہ نے کہا۔

"افسوس کہ ایلگر اور جم یہاں نہیں ہیں ورنہ دوبارہ تمہاری مرمت کر کے بہت خوش ہوتے۔"

"اوہ! تو تماکش میں وہ بزدلانہ حملہ کرنے والے وہ دونوں تھے؟" احمد شلوزان نے کہا۔

"لیکن تم نے آرٹن کو کیوں قتل کر دیا ہیپ برزہ......؟"

"میں نے قتل کرا دیا؟ لو اور لو کرنل! یہاں آتے ہی مجھ پر قتل کا الزام بھی لگ گیا جب کہ میں نے مقتول کا نام پہلی بار سنا ہے۔"

"تم نے واقعی اس رپورٹر کو تماکش میں قتل نہیں کرایا؟" احمد شلوزان نے پھر پوچھا۔

"مجھے کسی رپورٹر سے ایسی کیا دشمنی ہوسکتی ہے؟" ہیپ برزہ نے غصے میں کہا "البتہ تم کو جہنم رسید ہوتے دیکھ کر ضرور خوشی ہوگی۔"

"نہیں۔ پہلے ہمیں اس خدائی فوجدار سے بہت سی اہم معلومات حاصل کرنا ہیں جو شاید تمہارے لئے بھی دلچسپ ہوں ہیپ برزہ!"

"پہلے میری بات سنو کرنل!" احمد شلوزان نے کہا اس کا ذہن بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ "آئزک نے مرنے سے قبل مجھے بتایا تھا کہ اسے ٹائیگر نے گولی ماری ہے اور اگر ہیپ برزہ ٹائیگر نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے ٹائیگر کو اگر یہ معلوم ہوگیا کہ اس کی جگہ ہیپ لینے والا ہے تو وہ خاموش نہیں بیٹھے گا۔"

"کیا بکواس ہے؟" ہیپ برزہ نے حقارت کے ساتھ کہا۔ "میں کسی گم نام ٹائیگر سے نہیں ڈرتا میں ہمیشہ صاف اور دوٹوک معاملہ کرنے کا عادی ہوں اور اس بات پر مجھے خیال آیا کہ ہم بے مقصد اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں معاملے کی بات کرو کرنل تاکہ میں جلد اس منحوس جگہ سے واپس جاسکوں۔"

"میں فیصلہ کر چکا ہوں ہیپ برزہ" کرنل نے کہا۔ "اب کام شروع کرتے ہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"اس کا مطلب ہے ابھی کچھ قباحت باقی ہے سنو کرنل! کہیں تمہاری نیت بدل تو نہیں گئی؟"

"نہیں۔نہیں ہیپ! آئندہ ہم صرف تم سے بزنس کریں گے' لیکن ابھی مجھے کسی کی منظوری کا انتظار ہے۔"

"کیا مطلب......؟ کیا تم کو بھی کسی منظوری کی ضرورت ہوتی ہے؟"

"میں ایک فرد واحد نہیں ہوں۔ایک تنظیم کا فرد ہوں اس کے لئے سب کی منظوری لازمی ہے۔"

"اوہ کرنل! یہ کیا مذاق ہے پھر اس ویران مندر میں مجھے بلا کر کیوں پریشان کیا؟"

"ہم نے اس ویرانے میں تمہاری تفریح کا خیال رکھا ہے ہیپ! اگر مسٹر احمد شلوزان اب بھی ہٹ دھرمی سے کام لیتے رہے تو تم کو ایک شان دار تفریح ملے گی۔"

"میری صرف ایک تفریح ہے کرنل!" ہیپ برزہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ہم نے اس کا بھی انتظام کرلیا ہے مسٹر ہیپ برزہ! تم نے مسز کلاڈیا کو تو دیکھا ہے؟ اس کے علاوہ ڈاکٹر آئزک کی ایک حسین آئری معاون بھی ہمارے پاس موجود ہے تم ان میں سے جسے پسند کرو مل سکتی ہے۔"

ہیپ برزہ نے ایک غلیظ سا قہقہہ لگایا "مسز کلاڈیا؟ ہے تو ویسے بڑی شان دار۔"

احمد شلوزان پھر بھی خاموش رہا اس نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا حالانکہ اس کا خون کھول رہا تھا۔

"انہیں مہمان خانے واپس لے جاؤ" کرنل نے غصے میں کہا۔

"ممکن ہے تنہائی میں ان کا دماغ صحیح فیصلہ کرسکے۔"

احمد شلوزان کے لئے یہ تصور بھی انتہائی گھناؤنا تھا کہ ربونا جیسی معصوم اور الھڑ لڑکی ہیپ برزہ کی گندی تفریح کا کھلونا بنے' لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا اس نے سوچا کہ کم از کم ربونا کو ذہنی طور پر آنے والے لمحات کے لئے تیار ضرور کردیا جائے اس لئے اپنی کوٹھری میں پہنچتے ہی اس نے ربونا کو خطرے سے آگاہ

کردیا۔ چند لمحے ربونا بالکل خاموش رہی۔شاید وہ سوچ رہی تھی کہ کیا جواب دے پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"اگر قسمت میں یہی لکھا ہے تو میں کیا کرسکتی ہوں؟"

احمد شلوزان تڑپ کے رہ گیا۔ کتنی بے بسی تھی اس جواب میں "کاش میں اس لمحے کے آنے سے پہلے تم کو یہاں سے نکال سکتا۔" اس نے کہا۔

"میرے پاس کوئی ہتھیار بھی تو نہیں ہے۔"

ربونا خاموش تھی۔ احمد شلوزان کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا بیرونی دیوار پتھر کی تھی اسے توڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کوٹھری کا دروازہ بہت مضبوط تھا اس کو اوزار کے بغیر نہیں توڑا جاسکتا تھا۔ خدایا کوئی نہ کوئی صورت تو ممکن ہوسکتی تھی کاش وہ ربونا کو اس بھیانک اذیت سے بچا سکتا۔ لیکن وقت بالکل نہیں تھا اور پھر اسی لمحے راہداری میں قدموں کی چاپ سنائی دی کسی کے بولنے کی آواز آئی ربونا کی کوٹھری کا دروازہ کھلا اور پھر بند ہوگیا قدموں کی چاپ دور ہوتی گئی اور ایک بار پھر سناٹا چھا گیا احمد شلوزان سر پکڑ کر بیٹھ گیا وہ ہار چکا تھا۔

لیکن پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں آگ سی بھر گئی ربونا کی یہ قربانی رائیگاں نہیں جانا چاہیے اگر وہ یہاں سے نکل نہ سکے تو دشمن اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہوجائے گا۔ نہیں مایوسی گناہ ہے اسے کچھ کرنا چاہیے۔ کاش کوئی ہتھیار پاس ہوتا معمولی سا سہی اور تب اچانک سے خیال آیا اس نے پھرتی کے ساتھ اپنی بیلٹ کمر سے کھولی۔ اس کے مضبوط بکل کی لمبی کیل اپنے ہاتھ میں لے کر آگے بڑھا۔ کوٹھری کے مضبوط دروازے کو کھولنا ممکن نہیں تھا لیکن راہداری والی دیوار دو انچ موٹے تختوں کی تھی جسے کیلوں سے جوڑا گیا تھا۔ اس نے گنا' ہر تختے میں بیس کیلیں لگی ہوئی تھیں اس نے پہلی کیل کو نکالنے کی کوشش کی۔ یہ بہت مضبوطی سے لگی ہوئی تھی لیکن احمد شلوزان نے ہمت نہ ہاری۔ وہ زور لگا رہا اس کی انگلیاں دکھنے لگیں لیکن کیل ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس نے اور زور لگایا کیل ذرا سی سرکی یا صرف اس کا واہمہ تھا اس نے غور سے دیکھا کیل واقعی کچھ باہر آگئی تھی۔ مایوسی گناہ ہے اس نے پھر کوشش شروع کردی اور تقریباً پندرہ منٹ کی مسلسل کوشش کے بعد جب وہ پہلی کیل نکالنے میں کامیاب ہوگیا تو اتنا خوش تھا جیسے کوئی قلعہ فتح کرلیا ہو۔

وہ چھ کیلیں نکال چکا تھا اور ساتویں پر زور لگا رہا تھا کہ ربونا کی کوٹھری کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی احمد شلوزان کام چھوڑ کر سننے لگا جب گارڈ کے قدموں کی آواز دور چلی گئی تو اس نے آواز دی۔

"ربونا......!"

کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر ربونا کی گھٹی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ربونا مرگئی احمد شلوزان! اس کا ناپاک نام اب مت لو۔"

سسکیوں کی آواز دل پر ضربیں لگا رہی تھی۔

"نہیں ربونا ایسا مت سوچو۔ ربونا پاکیزگی کبھی نہیں مرسکتی۔ پاکیزگی روح میں ہوتی ہے ربونا جسے کوئی نہیں مار سکتا۔"

"اوہ احمد شلوزان! وہ درندہ تھا......وحشی درندہ۔" ربونا نے غیظ وغضب کے عالم میں کہا۔

"ہمت سے کام لو ربونا! حوصلہ رکھو۔ ہم جلد یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ سب

سے کہہ دو تیار رہیں۔'' اس نے تسلی دی۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر ربونا نے کہا۔ ''میں تمہارا حکم نہیں بھولی تھی احمد شلوزان! میں اس کا ریوالور چرالائی ہوں۔ میں نے اسے ساڑھی میں چھپالیا تھا۔''

''ربونا تم واقعی بہت بہادر ہو'' احمد شلوزان خوشی سے اچھل پڑا۔

''سنو! دیوار میں جو خلا ہے اس سے ریوالور میری کوٹھری میں پھینک دو۔''

ربونا نے ایک نیا حوصلہ اور تازہ قوت عطا کردی تھی جب آخری کیل بھی نکل آئی تو اس نے تمام کیلوں کو کونے میں چھپادیا تا کہ اگر گارڈ اندر آئے تو اسے کچھ نظر نہ آسکے اور یہ کام اس نے بہت بروقت کیا تھا کیونکہ اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک گارڈ کھانا لے کر اندر داخل ہوا دوسرا اپنی سب مشین گن اس پر تانے دروازے میں کھڑا تھا احمد شلوزان کی بھوک مٹ چکی تھی لیکن پھر اس نے سوچا کہ جسم کو توانا رکھنے کے لئے کھانا کھالینا بہتر ہوگا گارڈ جب برتن لے کر چلا گیا تو احمد شلوزان نے راہداری میں جھانک کر اطمینان کرلیا اور پھر کیل نکلے ہوئے تختے پر زور لگایا۔

تختہ فوراً علیحدہ ہوگیا۔ آزادی کے احساس نے اسے بے پایاں خوشی دی لیکن ابھی یہ پہلا مرحلہ تھا راہداری میں نکل کر اس نے باری باری ہر ایک دروازے پر دستک دے کر یہ خوش خبری سنائی اور تیار رہنے کی ہدایت کی اور پھر بیرونی دروازے کی سمت بڑھا دبے پاؤں آگے بڑھ کر اس نے ذرا سا جھانکا گارڈ دروازے کے بالکل قریب کھڑا ہوا تھا۔ احمد شلوزان جلدی سے پیچھے ہٹ گیا سورج ڈوب چکا تھا۔ لیکن اندھیرا ابھی پوری طرح نہیں پھیلا تھا اس نے سوچا ذرا اور تاریکی بڑھ جائے تو کامیابی آسان رہے گی' لیکن پھر خیال آیا کہ اگر کوئی گارڈ کھانا لیکر آگیا تو ساری محنت رائیگاں جائے گی۔ وہ باہر کھڑے ہوئے گارڈ کو آسانی سے قابو کرسکتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ پہلے دیکھ چکا تھا کہ بہت سے پہرے دار موجود تھے جو ہر سمت بکھرے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر کے فرار کے بعد انہوں نے پہرہ سخت کردیا تھا۔

احمد شلوزان دبے پاؤں چلتا ہوا کلاڈیا کی کوٹھری کے سامنے پہنچا جو دروازے سے تیس فٹ کے فاصلے پر تھی اس نے آہستہ سے دستک دے کر کلاڈیا کو آواز دی۔

''سنو کلاڈیا! چند لمحے کے بعد تم پوری قوت سے چیخنا شروع کردینا۔ چیخ ایسی دہشت ناک ہو جیسے کوئی تمہیں قتل کر رہا ہو اور جب تک ممکن ہو چیختی رہنا۔''

''ٹھیک ہے احمد شلوزان! لیکن تم کیا کر رہے ہو؟'' کلاڈیا نے پوچھا۔

''ابھی کچھ نہ پوچھو بس جو کہا اس پر عمل کرو اور تیار رہو۔''

کلاڈیا کو ہدایت دے کر وہ پھرتی کے ساتھ دروازے کے قریب پہنچ کر تاریکی میں کھڑا ہوگیا اس نے ربونا کا دیا ہوا پستول نکال کر نالی کی سمت سے پکڑلیا اور اسی لمحے کلاڈیا کی دل خراش چیخ فضا میں ابھری۔

کلاڈیا واقعی دہشت زدہ انداز میں چیخ رہی تھی کہ اگر احمد شلوزان کو معلوم نہ ہوتا تو وہ ڈر جاتا اس کی چیخوں کی آواز باہر تک صاف سنائی دے رہی تھی احمد شلوزان تیار ہوکر کھڑا ہوگیا باہر کھڑے ہوئے گارڈ نے چند لمحے انتظار کیا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا راہداری کے اندر داخل ہوا اور کلاڈیا کی کوٹھری کی سمت بڑھا۔

احمد شلوزان نے پستول کا دستہ اتنی زور سے گارڈ کے سر پر مارا کہ وہ کراہتا ہوا فوراً ہی ڈھیر ہوگیا احمد شلوزان نے پھرتی کے ساتھ جھک کر اس کی سب مشین گن ہتھیالی اور جیبوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ کنجی گارڈ کی جیب میں موجود تھی ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس نے باری باری سب کو آزاد کردیا سب مشین گن اس نے بڈ گولر کو تھمادی۔

''اب تم سب غور سے سنو! بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔''

احمد شلوزان نے کہا۔

''ہم سب ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے باہر نکلیں گے پہلے میں' پھر بڈ گولر' پھر ربونا اور آخر میں کلاڈیا۔ آرام سے چلتے ہوئے آگے بڑھنا۔ ذرا بھی آہٹ نہ ہو' جب تک میں نہ کہوں بھاگنا ہرگز نہیں اگر ہم سامنے کے درختوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں تو سب وہیں جمع رہنا یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ شاید ہم فرار نہ ہوسکیں لیکن ویسے بھی کرنل فیصلہ کرچکا ہے کہ ہم میں سے کوئی زندہ واپس نہیں جائے گا اس لئے یہ ہماری آخری کوشش اور آخری موقع ہے'' ٹھیک!'' سب خاموش رہے۔

''چلو......'' اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

زندگی میں احمد شلوزان نے کبھی ایسی صورت حال کا مقابلہ نہیں کیا تھا دروازے کی آڑ میں رک کر اس نے باہر کا جائزہ لیا اور پھر مڑ کر پیچھے دیکھا تو بڈ گولر جھکا ہوا بے ہوش گارڈ کی جیبیں ٹٹول رہا تھا اس نے سرگوشی میں بڈ گولر کو ڈانٹا احاطے کے اندر دور دور بجلی کے بلب روشن تھے لیکن درمیان میں تاریکی کے سائے تھے اقامت گاہ کے دروازے کے بالکل سامنے پرانا کنواں تھا اور پھر ایک چھوٹی سی شکستہ عمارت تھی جس نے مندر کی عمارت کے بیرونی دروازے کی آڑ لے کر رکھی تھی جہاں کرنل جوزف کا ہیڈ کوارٹر تھا کئی اور گارڈ مختلف مقامات پر کھڑے نظر آرہے تھے احمد شلوزان جانتا تھا کہ کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ان پہرے داروں کی نظران پر دیر سے پڑے بہ ظاہر یہ دشوار تھا لیکن بہر حال کوشش کرنا تھی۔

وہ آہستہ سے باہر نکلا اور سب کو چلنے کا اشارہ کیا دبے پاؤں آرام سے چلتے ہوئے آگے بڑھتے اور تاریکی میں اس شکستہ عمارت کی سمت چلنے لگے جو سامنے نظر آرہی تھی چونکہ یہ مندر کے بالکل سامنے واقع تھی اس لئے پہرے داروں کی نظر اس سمت نہ تھی شاید اسی لئے وہ وہاں پہنچنے میں کامیاب ہوگئے عمارت کی آڑ میں آتے ہی وہ پہرے داروں کی نگاہ سے محفوظ ہوگئے اب ان کے اور بیرونی چار دیواری کے درمیان صرف پتھروں کے ڈرم اور برساتی سے ڈھکا ہوا گولہ بارود کے ذخیرے کا انبار رہ گیا تھا۔ چند لمحے انتظار کے بعد وہ بڑے بڑے ڈرموں کی آڑ میں پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ بلاشبہ اس کامیابی میں ان کی خوش قسمتی کو دخل تھا کوئی بھی پہرے دار ذرا سی گردن گھماتا تو انہیں دیکھ سکتا تھا لیکن ان سب کی توجہ شاید صرف اقامت گاہ اور بیرونی چار دیواری پر تھی وہ ڈرم اور گولہ بارود کے ڈھیر کی آڑ میں چھپے بیٹھے تھے اب احمد شلوزان سوچ رہا تھا کہ یہاں سے چار دیواری تک کی کھلی ہوئی جگہ کو کیسے پار کیا جائے تیس گز کے اس فاصلے کو پار کرنے کے بعد ان کے اور جنگل کے درمیان صرف احاطے کی چار دیواری تھی جسے عبور کرنا مشکل نہ تھا لیکن اس کھلی ہوئی جگہ میں پہنچتے ہی کسی نہ کسی پہرے دار کی نظر ان پر یقیناً پڑ جائے گی کیونکہ وہ خاص طور پر چار دیواری پر نگاہ رکھے

ہوئے تھے۔ ''ہے..... اب کیا کرنا ہے؟'' بڈ گولر نے سرگوشی کی۔ احمد شلوزان کو خود نہیں معلوم تھا کہ اگلا قدم کیا ہوگا؟'' اس نے بڈ گولر کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اسی لمحے فضا میں کئی فائر ہوئے اور ہر سمت سے پہرے داروں نے چلنا شروع کر دیا چیری ٹاور پر لگی ہوئی سرچ لائٹ کی تیز روشنی چادیواری پر گھومنے لگی۔

''مارے گئے'' احمد شلوزان نے زیر لب کہا۔

اس نے اس چادیواری کے شمالی حصے کی طرف دیکھا تقریباً تیس گز کا فاصلہ تھا۔ ممکن ہے کہ وہ سب دیوار کے پار نہ پہنچ سکیں لیکن یہ بھی ممکن ہے چند جان بچانے میں کامیاب ہو جائیں اس نے گھوم کر دیکھا کئی مسلح گارڈ ہر سمت بھاگ کر انہیں تلاش کر رہے تھے ان کے آٹو میٹک ہتھیاروں کی نالیں بلند تھیں وہ ذرا سے شبہے پر بے دریغ فائر کر رہے تھے ہر طرف افراتفری کا عالم تھا احمد نے اندازہ کر لیا کہ اب ان میں سے ایک بھی چاردیواری تک زندہ نہ پہنچ سکے گا اچانک اس کی نگاہ پیٹرول کے ڈرم پر پڑی۔

کاش میرے پاس ماچس ہوتی؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''ہے..... یہ لو۔'' بڈ گولر نے مسکراتے ہوئے کہا اور جیب سے ماچس نکال کر اس کی سمت بڑھائی۔ ''وہ چلتے وقت اس گارڈ کی سگریٹ ماچس لیتا آیا تھا۔''

احمد شلوزان نے قمیض کا پچھلا حصہ پھاڑا اور پھر جھکے ہوئے اٹھا اور ہاتھ اٹھا کر ڈرم کا ڈھکن کھولا کپڑے کو لپیٹ کر اس نے اچھی طرح پیٹرول میں بھگویا اور پھر اس کی بتی بنا کر ایک سرا ڈرم کے منہ میں رہنے دیا اور دوسرا سرا زمین تک لے آیا ماچس ہاتھ میں لے کر اس نے اپنے ساتھیوں کی سمت دیکھا۔

''جیسے ہی میں اشارہ کروں آندھی طوفان کی طرح چہار دیواری کی سمت بھاگ نکلنا جتنی تیز ممکن ہو کچھ بھی ہو دیوار پھلانگنے سے پہلے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے باہر نکل کر ایک ساتھ رہنے کی کوشش کرنا۔''

کلاڈیا نے اس کی سمت دیکھ کر پوچھا۔

''اور تم کیا کرو گے......؟''

''میں بھی جلد ہی تم سے آملوں گا'' احمد شلوزان نے کہا۔

''نہیں یہ دھماکے تمہارے چیتھڑے اڑا دے گا میں تم کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔''

''پاگل مت بنو اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہے میرے کہنے پر عمل کرو۔''

اسی لمحے بالکل اچانک ربونا نے ایک جھٹکے کے ساتھ احمد شلوزان کی کمر میں لگا ہوا پستول نکال لیا اس سے پہلے کہ احمد شلوزان کچھ سمجھ سکتا ربونا بجلی کی طرح ایک مخالف سمت بھاگ نکلی احمد شلوزان گھبرا کر پیچھے مڑا اور اس نے دیکھا کہ ربونا کا رخ مندر کی جانب تھا جس کے گیٹ کی سیڑھیوں پر کرنل جوزف کھڑا ہوگیا تھا اس کے برابر میں ہیپ برزہ کھڑا ہوگیا تھا وہ احاطے میں پھیلی ہوئی افراتفری کو دیکھ رہے تھے احمد شلوزان نے ربونا کو خبردار کرنے کے لئے منہ کھولا لیکن فوراً رک گیا اس طرح ان کو خبر ہو جائے گی کہ وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں وہ بدحواسی کے عالم میں ربونا کو دیکھ رہا تھا جس کا رخ اب کرنل جوزف کی سمت تھا۔

اور پھر کرنل کا چہرہ حیرت سے اوپر اٹھا اس نے ربونا کو دیکھ لیا تھا لیکن اسی لمحے ربونا نے پستول بلند کیا پے درپے کئی گولیاں چلیں اور ہیپ برزہ لڑکھڑا کر زینے سے نیچے گرا یہ سب کچھ چشم زدن میں ہوگیا۔

احمد شلوزان کو یقین تھا کہ کسی بھی لمحے قریب کھڑے ہوئے محافظوں کی سب مشین گن ربونا کو چھلنی کر کے رکھ دے گی لیکن ربونا کے اچانک حملے نے ان کو اتنا مبہوت کر دیا تھا کہ وہ منہ پھاڑے کھڑے رہے اور جیسے ہی انہیں ہوش آیا کرنل پھرتی کے ساتھ آگے بڑھا اور درمیان میں آگیا اور ہیپ برزہ کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا اس وقفے نے ربونا کو موقع فراہم کر دیا وہ پلٹ کر پوری رفتار سے احمد شلوزان کی سمت واپس بھاگی لیکن اسی لمحے ایک گارڈ نے آگے بڑھ کر ربونا پر گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ گارڈ کی بدحواسی تھی یا ربونا کے لہراتے ہوئے بھاگنے کا انداز یا محض قسمت...... گولیاں ربونا کے اردگرد کی زمین چاٹتی رہیں اور وہ خراش لگے بغیر آڑ میں پہنچنے میں کامیاب ہوگئی احمد شلوزان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لیا وہ اس کے کاندھے پر سر رکھ کر ہانپنے لگی۔

''میں...... میں نے اس درندے کو ختم کر دیا احمد شلوزان! میں نے اسے ختم کر دیا...... اب وہ کسی بے بس لڑکی کو بے عزت نہ کر سکے گا۔ میں نے اپنا انتقام لے لیا ہے'' وہ جنونی انداز میں چیخی اور سسکیاں لینے لگی۔

''اسے کیا ہوگیا احمد شلوزان......؟ کلایا نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''ہوش میں آؤ تم سب۔'' احمد شلوزان نے غصہ میں کہا اور ماچس کی تیلی ہاتھ میں لے کر کہا۔

''بھاگو...... ورنہ پھر یہ موقع نہ ملے گا۔''

وہ سب بے تحاشا چہار دیواری کی طرف بھاگ نکلے احمد شلوزان نے ماچس جلائی اور پیٹرول سے تر کپڑے کو آگ لگا دی شعلہ ایک بھبکے کے ساتھ بلند ہوا اور احمد شلوزان نے چھلانگ لگا کر بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا وہ حیران تھا کہ اب تک دھماکا کیوں نہیں ہوا۔ شعلہ بجھ گیا لیکن اب کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا اور اسی لمحے ایک زبردست دھماکا ہوا اور احمد شلوزان منہ کے بل کئی گز دور جا گرا شعلوں کی آنچ اسے بالکل قریب محسوس ہو رہی تھی اور پھر دھماکے یکے بعد دیگرے شروع ہوگئے۔ زمین لرز رہی تھی اور چیخ و پکار سے فضا گونجنے لگی تھی احمد شلوزان پھرتی کے ساتھ اٹھا اور بھاگنے لگا اسے کچھ احساس نہیں ہوا تھا سوائے اس کے کہ موت تعاقب کر رہی ہے زمین اس طرح لرز رہی تھی جیسے زلزلہ آگیا ہو لیکن چہار دیواری کہاں چلی گئی؟ اس کو یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ ملبے کے جس ڈھیر کو وہ پھلانگ چکا تھا وہی کبھی چاردیواری تھی اور اگلے ہی لمحے ایک اتنا قیامت خیز دھماکا ہوا کہ احمد شلوزان دور جا کر گرا فضا میں دور تک گڑگڑاہٹ سنائی دیتی رہی زمین دہل کر رہ گئی لیکن وہ زندہ تھا چل سکتا تھا۔

اس نے زمین سے اٹھ کر پھر بھاگنا شروع کر دیا اب سامنے گھنی جھاڑیاں تھیں جو اس کے چہرے کو زخمی کر رہی تھی پھر اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اس کو پکڑ کر سہارا دے رکھا ہے اور آگے دھکیل رہا ہے۔

''اوہ خدایا۔ ابھی بے ہوش نہ ہونا۔''

جب اس کی آنکھ کھلی تو آسمان پر ستارے چمک رہے تھے ہر سمت چاندنی پھیلی ہوئی تھی وہ درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا کلاڈیا اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور ربونا پانی میں بھیگا ہوا کپڑا اس کے ماتھے پر رکھ رہی تھی وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

''وقت ضائع مت کرو اور یہاں سے دور نکل چلو'' اس نے کہا۔

''گھبراؤ نہیں'' بڈ گولر نے مسکرا کر کہا ''اب تعاقب کرنے کے لئے کوئی باقی نہیں بچا۔ ان کے

چیتھڑے اڑ گئے۔"

"احمد شلوزان! ہم تمہارا یہ احسان کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے" سفارت خانے کے اعلیٰ افسر نے کہا "تم نے شجاعت اور دلیری کا جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ بے مثال ہے"

احمد شلوزان اس وقت سفارت خانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے برابر بیٹھا ہوا ارتضیٰ مسکرا رہا تھا" مجھے بتایئے کہ کرنل جوزف کے ہیروئن کے پلانٹ کا کیا حشر ہوا؟"

"تباہ ہو گیا" اس کے ساتھ اس کا گروہ بھی۔ صرف سات افراد زندہ بچے تھے جو آئر لینڈ کی جیل میں ہیں" کونسل نے بتایا" کرنل اور ہیپ برزہ کی لاشیں شناخت ہو چکی ہیں۔"

"لیکن ابھی ایک اصل مجرم باقی ہے وہ لوگ اسے صرف نام سے جانتے تھے...... ٹائیگر" احمد شلوزان نے کہا۔

"وہ بھی نہ بچ سکے گا" ارتضیٰ نے کہا۔ "کرنل کے کاغذات سے وہ خفیہ فہرست مل گئی ہے جس میں مختلف ممالک میں کام کرنے والے ایجنٹوں کے نام پتے تھے ان کی گرفتاریاں جاری ہیں" اس نے بتایا۔" لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کو زہریلی ہیروئن سپلائی نہ ہو سکے گی تم نے پورے عالم اسلام کو اس خطرے سے بچالیا ہے دوست۔"

احمد شلوزان ہوٹل میں داخل ہوا تو بہت خوش تھا وہ سوچ رہا تھا اس نے کہا تھا کہ وہ بے چینی سے انتظار کرے گی اور ربونا نویں منزل پر تھی اس نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کی اداس آنکھوں کو امید کی روشنی درکار تھی اور اچانک اسے تھامسن لارڈ نظر آیا۔ احمد شلوزان نے اسے فوراً پہچان لیا۔ کلاڈیا پہلی مرتبہ اسی کے ساتھ ملی تھی۔

"ہیلو مسٹر تھامسن!" احمد شلوزان نے کہا "تمہارے کاروبار کا کیا حال ہے؟"

"کاروبار...... ؟ تھامسن نے چونک کر پوچھا" اوہ...... تم...... تم وہ بھکشو۔ ہاں سب ٹھیک ہے کلاڈیا واپسی کی تیاری کر رہی ہے" وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا احمد شلوزان اس کی بدحواسی پر حیران رہ گیا۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ آؤ" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر خواب گاہ میں لے گئی۔

احمد شلوزان خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا اس نے اب تک شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا کتنی مختلف ہے مغرب کی عورت اور کتنی بے حیا۔ وہ کلاڈیا کی آنکھوں کا پیغام پڑھ رہا تھا۔ ایک ربونا تھی مشرق کی وفا شعار بیٹی...... جس نے اپنی عزت کے ڈاکو سے انتقام لینے کے لئے جان کی پروا نہیں کی۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ڈارلنگ!" کلاڈیا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "اس سوٹ میں تم کتنے حسین لگ رہے ہو؟"

"تم واپس جا رہی ہو کلاڈیا" اس نے پوچھا۔

"ہاں ڈارلنگ! اور اسی لئے تم کو بلایا ہے" کلاڈیا نے کہا" جانے سے پہلے میں فیصلہ کرنا چاہتی ہوں میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی پہلے میں نے سوچا کہ تم سے شادی کر لوں لیکن پھر سوچا کہ عجلت میں کوئی ایسا فیصلہ نہ کر لوں جیسا کہ آئزک کے سلسلے میں کیا تھا بہتر ہے کہ ہم اس منزل تک پہنچنے سے پہلے ایک

دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں محسوس کر لیں اور مطمئن کر لیں۔ تم سمجھ رہے ہو؟ اس وقت تک کے لئے میں چاہتی ہوں کہ تم میرے بزنس پارٹنر بن کر کام کرو۔ احمد شلوزان تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس میں کتنا منافع ہے؟"

احمد شلوزان غور سے سن رہا تھا وہ کلاڈیا کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا اور اس کا مفہوم بھی سمجھ رہا تھا۔

"لیکن مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ تمہارا بزنس کیا ہے کلاڈیا؟"

کلاڈیا نے اس کے چہرے کو گھورا" میرا خیال ہے میں تم پر اعتماد کر سکتی ہوں احمد شلوزان!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا بزنس خطرناک اور غیر قانونی ہے' لیکن اس میں بے حد منافع ہے" احمد شلوزان خاموش رہا" میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی تم نے کئی بار میری جان بچائی ہے"۔

کلاڈیا نے سوچتے ہوئے کہا۔

"سنو احمد شلوزان! یہ تو تم پہلے ہی جان چکے ہو کہ ہیپ برزہ ایک گم نام شخصیت ٹائیگر سے بزنس چھیننے کی کوشش کر رہا تھا اور کرنل جوزف بھی اس بات پر تیار ہو گیا تھا" احمد شلوزان نے سر ہلایا۔

"ویسے ٹائیگر بڑا خوب صورت' پرانا مردانہ نام ہے لوگ گم نام شخصیت سے جلد مرعوب ہو جاتے ہیں ہیپ برزہ بہت بے وقوف تھا ٹائیگر نے بانیہ میں ایک ایجنٹ مقرر کر رکھا تھا جو اس کے احکامات پر عمل درآمد کرتا تھا' لیکن ٹائیگر اپنے ایجنٹ سے بھی ایک دوسرے شخص کے ذریعے رابطے رکھتا تھا تا کہ اس کی شخصیت کا راز افشا نہ ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ ربانیہ میں ٹائیگر کا ایجنٹ کون تھا؟"

"کہتی رہو کلاڈیا میں سن رہا ہوں۔"

"آرٹن جو ایک جانا پہچانا صحافی تھا اس نے ٹائیگر کے ایجنٹ کی حیثیت سے بڑی دولت کمائی اتنی کہ جس کا وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ بڑا لالچی تھا اس نے دولت کے لالچ میں اپنے محسن سے غداری کی اور ہیپ برزہ کے ہاتھ بک گیا لیکن ٹائیگر کے جاسوس ہر جگہ موجود ہیں وہ اپنے ہر ایجنٹ کی نگرانی کرتے ہیں' اس لئے آرٹن کی غداری کی خبر ٹائیگر کو مل گئی آرٹن اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ٹائیگر کی شخصیت کا راز نہیں جان سکا تھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ اسے تم پر شک تھا۔ تم پر احمد شلوزان!" کلاڈیا نے مترنم قہقہہ لگایا۔

"اسی لئے اس نے تمہیں ٹرین میں بے ہوش کر کے تلاشی لی تھی۔ احمق کہیں کا۔"

احمد شلوزان کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں" کلاڈیا! تم...... تو آرٹن کو تم نے گولی مار کر ہلاک کیا تھا؟"

"ہاں احمد شلوزان! مجبوری تھی وہ اور ہیپ برزہ تماکش میں ملاقات کر کے کرنل جوزف کے پلانٹ پر قبضہ کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے ہیپ برزہ اسی لئے وہاں گیا تھا لیکن پھر بھی مجھے دیر ہو گئی آرٹن نے موت سے پہلے کرنل اور ہیپ برزہ میں رابطہ کرا دیا تھا اس کی سزا اسے ملنا ہی چاہیے تھی۔"

"اوہ! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب سچ ہے" احمد شلوزان نے کہا۔ "تو کیا ڈاکٹر آئزک بھی اس میں......"

"نہیں ڈارلنگ! وہ بے چارا تو بالکل معصوم تھا اپنی شخصیت کو راز رکھنے کے لئے مجھے اس کی آڑ

لینی تھی اور میرے ربانیہ آنے کا مقصد بھی آرٹن کی سازش کو ناکام بنانا تھا۔ آئزک سے ملاقات تو محض ایک خوصورت بہانہ تھی۔ اس بے چارے کے تو وہم وگمان میں بھی نہیں ہوسکتا کہ ایک لڑکی بھی ٹائیگر ہوسکتی ہے۔ اور وہ اس کی اپنی بیوی ہے۔"

"اور تم یہ چاہتی ہو کہ میں ربانیہ میں یہ ذمے داریاں سنبھال لوں......؟"

"ہاں ڈارلنگ!" کلاڈیا نے مخمور لہجے میں کہا" آرٹن اور تھامسن دونوں صرف ملازم تھے تھامسن کو میں عارضی طور پر ربانیہ لائی تھی لیکن تم میرے پارٹنر ہوگے بزنس میں بھی اور زندگی میں بھی۔"

"نہیں کلاڈیا! میں یہ پیش کش قبول نہیں کرسکتا۔ احمد شلوزان نے بستر پر دراز کلاڈیا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس صورتحال کے لئے بھی تیار تھی" کلاڈیا نے مسکراتے ہوئے کہا اور کھڑی ہوگئی فرق صرف یہ تھا کہ اب اس کے ہاتھوں میں پستول تھا' جس کا رخ احمد شلوزان کی سمت تھا۔

"تم مجھے قتل کردو گی کلاڈیا......؟" احمد شلوزان نے اطمینان سے پوچھا۔

"ہاں ڈارلنگ مجھے اس کا دکھ رہے گا تم میرے محسن بھی ہو اور...... میں واقعی تم سے محبت کرتی ہوں اب تک تمہارے علاوہ یہ راز تھامسن کو معلوم تھا کہ میں کون ہوں میں تم کو یہ راز لے کر باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتی" اس نے فون کا ریسیور اٹھایا۔

"شاید تھامسن کا زندہ رہنا بھی مناسب نہیں میں اسے بھی بلائے لیتی ہوں"

"تم ذہنی مریض ہو کلاڈیا!" احمد شلوزان اٹھ کر آگے بڑھا۔

"نہیں احمد شلوزان! خبردار آگے مت بڑھنا" کلاڈیا ریسیور رکھ کر بولی۔

"میں ذہنی مریض نہیں ہوں تم مشرقی لوگ ذہنی مریض ہو کلاڈیا کی اس پیش کش کو نہ ٹھکراتے۔"

احمد شلوزان پھر آگے بڑھا" پھر آگے بڑھا" پستول مجھے دے دو کلاڈیا!"

"رک جاؤ احمد شلوزان......" کلاڈیا تقریباً چیخ اٹھی۔

لیکن احمد شلوزان نے جھک کر چھلانگ لگادی تھی وہ تربیت یافتہ کمانڈو تھا اور کلاڈیا بہرحال عورت تھی احمد شلوزان کی مضبوط گرفت میں وہ زخمی شیرنی کی طرح جدوجہد کررہی تھی احمد شلوزان اس کی پستول چھین لینے کی کوشش کررہا تھا اچانک کلاڈیا نے تڑپ کر گرفت سے نکلنے کی کوشش کی اور کمرے میں فائر کی آواز گونج اٹھی احمد شلوزان نے کلاڈیا کا جسم ڈھیلا ہوتے ہوئے محسوس کیا وہ جلدی سے اٹھا گولی کلاڈیا کے سر میں سوراخ کرتی ہوئی گزر گئی تھی۔

وہ چند لمحے کلاڈیا کے مردہ جسم کو دیکھتا رہا اور پھر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

اس کا رخ نویں منزل پر ریونا کے کمرے کی جانب تھا۔ راکان ہنزہ نے ایک گہری سانس لی اور پھر مسکرانے لگا۔

"تو یہ ہے شلوزان تم سمجھ گئے ہوگے کہ میرا مقصد کیا ہے میں تمہیں اس تک بھیجنا چاہتا ہوں کیونکہ ہمارے مقصد کے لئے وہ ایک کارآمد انسان ثابت ہوسکتا اور تم جب اس سے ملو گے تو تمہیں خوشی ہوگی۔"

"مگر مجھے وہاں جا کر کرنا کیا ہے؟" کامران نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں دوست جیسا کہ میں تمہیں بتاچکا ہوں کہ تم اب اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں ہو دوسرے لوگوں کی نسبت میں نے تمہارے ساتھ زیادہ بہتر رویہ اختیار کیا ہے میں تمہیں بتاچکا ہوں کہ ہوسکتا ہے تم پاتال پربھو کے ہم شکل ہو اور یہی اتفاق تمہیں الجھنوں میں ڈالے ہوئے ہو۔ لیکن اس کے باوجود تم جو حیثیت رکھتے ہو وہ بڑی اہمیت کی حامل ہے ہم تمہیں چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ تم ہماری امیدوں کا واحد مرکز ہو کامران کے ذہن میں جھنجلاہٹ کی ایک لہر اٹھی لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولا۔

"تو مجھے وہاں تک کیسے جانا ہوگا؟"

"میں تمہیں نقشہ بنا کر دے دیتا ہوں اور سفر کے لئے ایک خچر مہیا کئے دیتا ہوں تم ایک بھکشو کی حیثیت سے فارم ہاؤس تک جاؤ گے اور شلوزان تمہیں بتائے گا کہ اس سے آگے تمہیں کیا کرنا ہے۔

"بولو کیا تم تیار ہو۔"

"ٹھیک ہے مجھے کب روانہ ہونا ہوگا" کامران نے سوال کیا۔

"کل صبح سورج نکلنے سے پہلے۔"

"ٹھیک ہے میں تیار رہوں گا" کامران نے یہاں منافقت سے کام لیا تھا پھر ساری رات وہ سوچوں میں ڈوبا رہا تھا جھنجلاہٹ کی جو لہر اس کے ذہن میں اٹھی تھی وہ ابھی تک قائم تھی وہ سوچ رہا تھا کہ میں کیوں جاؤں؟ کیا میرا دماغ خراب ہے کہ ایک گم نام مقصد کے لئے ادھر سے ادھر ڈولتا رہوں میرا دماغ تو خراب نہیں ہے کہ اپنی زندگی داؤ پر لگاؤں کیا کیا ہنگامہ آرائیاں نہیں ہوتی رہیں لیکن میں نے تو سب کچھ کرنل گل نواز کے لئے کیا تھا نہ ذاتی طور پر میرا مقصد خزانے کا حصول ہے اور نہ ہی میں ان میں سے کسی کا وفادار۔ پاتال پرستی اور دوسری احمقانہ کہانیاں جو ہیں مجھے ان سے بھی کوئی غرض نہیں ہے۔ کیا کروں گا ان کی کہانیوں میں الجھ کر کوئی مقصد ہو کوئی خواہش ہو اصولی طور پر مجھے کرنل گل نواز کے پاس واپس چلے جانا چاہیے وہاں کے معاملات سنبھالنا میری زندگی کا زیادہ اہم مقصد ہوگا انسانوں کی طرح زندگی گزاروں گا کرنل گل نواز اگر مجھے مہم جوئی پر آمادہ نہ کرتا تو میں کبھی ان برف زاروں میں نہ آتا بلاوجہ زندگی یہاں آکر تلخ ہوگئی ہے اور پھر خطرات ہر لمحہ۔ ٹھیک ہے مسٹر راکان ہنزہ۔ آپ میرے لئے تیاریاں کریں میں پہلی فرصت میں کوئی بستی تلاش کروں گا اور اس کے بعد واپسی کے سفر کی تیاریاں جہاں تک بات رہی گرشک اور سیتا کی تو رشتہ دار تو نہیں ہیں وہ میرے۔ اگر آسانی سے کرسکتا ان کے لئے کچھ تو ضرور کرتا لیکن اس طرح مصیبت میں گرفتار ہونا عقل کی بات نہیں ہے نہ ہی چاہے وہ علی سفیان ہو قزل ثنائی یا پھر امینہ سلفا جو ایک عجیب وغریب عورت تھی عورت تھی بھی یا نہیں یہ بات بھی میں نہیں جانتا لیکن بہرحال یہ سب کا سب ایک گورکھ دھندا تھا اور اب اصولی طور پر اس گورکھ دھندے سے نکل جانا چاہیے۔

کامران کو جو جسمانی تربیت دی گئی تھی وہ اس قدر شاندار تھی کہ اب وہ ایک انتہائی قوی ہیکل بڑے دل والا نوجوان تھا وہ لمحات تو کبھی کے پیچھے رہ گئے تھے' جن میں وہ اپنی بہن کا انتقام لینے نکلا تھا اور اس کے بعد دنیا ہی بدل گئی تھی دوسری صبح راکان ہنزہ اپنی دانست میں اسے جگانے آیا لیکن وہ کیل کانٹے سے

لیس تیار تھا راکان ہنزہ نے تعریفی انداز میں اسے دیکھا اور بولا۔

''جو لوگ زندگی کے کامیاب تر لوگ ہوتے ہیں ان کے جینے کا انداز یہی ہوتا ہے جو تمہارا ہے میں سوچ رہا تھا کہ میں تمہیں جا کر جگاؤں گا تم اٹھو گے اور میں تم سے کہوں گا کہ جلدی سے اٹھ کر تیاریاں کرو لیکن ایسا لگتا ہے جیسے تم تو ساری رات سوئے ہی نہیں ہو۔ خیر تمہارا ذریعہ سفر تیار کر دیا ہے کھانے پینے کی چیزیں بھی کافی موجود ہیں البتہ یہ بھکشوؤں کا لبادہ اوڑھنا پڑے گا اس لبادے میں سفر کرتے ہوئے تم بالکل محفوظ رہو گے اور پہلی بات تو یہ کہ سردی سے دوسری یہ کہ بھکشو اس طرح کے خچروں پر ویرانوں میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ نہ تو کوئی ڈاکو ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نہ کوئی اور۔

بہرحال میری تمام دعائیں تمہارے ساتھ ہیں شلوزان تمہیں آگے کے مصرف کے بارے میں بتائے گا سفر...... سفر...... زندگی ایک سفر کا نام تو ہے' یہ زندگی ایک سفر کا نام ہے چاہے وہ سفر کسی بھی انداز میں ہو گھر سے دفتر' دفتر سے گھر بیوی بچے یا پھر پہاڑوں میں مہم جوئی اچھا جاؤ تمہاری محافظت ہو'' راکان ہنزہ نے کہا مضبوط خچر پر سامان بھی لدا ہوا تھا اور بیٹھنے کی جگہ بھی مناسب تھی چنانچہ کامران نے سفر کا آغاز کر دیا جب وہ کافی دور نکل آیا تو اسے اپنی حالت پر ہنسی آنے لگی۔''

''واہ! کامران بیٹے کیا زندگی ہے تمہاری کہاں سے آغاز ہوا تھا زندگی کا اور کہاں آ گئے' لیکن نہیں بابا واپس کرنل گل نواز کے پاس جانا تو چاہیے وہ ایک بہت اچھا آدمی تھا اور پھر وہاں کا ماحول اطراف میں پھیلے ہوئے تمام کردار جن میں سے دو افراد کا افسوس ناک طریقے سے خاتمہ ہو چکا تھا خاور اور اس کی بیٹی جو ایک احمقانہ موت کا شکار ہوئے تھے لیکن کیا کرنل گل نواز نے اگر کبھی دوبارہ مہم جوئی کی بات کی تو اس سے معذرت کر لوں گا اور بہ حالت مجبوری کوئی دوسرا راستہ تلاش کروں گا زندگی گزارنے کے لئے مجھے یہ زندگی نہیں چاہیے ایک احمقانہ عمل ہے سفر طے ہوتا رہا۔ کافی دور جانے کے بعد کامران نے راستہ تبدیل کر دیا جو راستہ شلوزان کے فارم ہاؤس کی طرف جاتا تھا اسے ترک کر کے وہ بالکل ہی الگ اور اجنبی راستے کی طرف چل پڑا جس کے بارے میں اسے کچھ بھی نہیں معلوم تھا مطلب یہی تھا کہ جیسے ہی کوئی بستی نظر آئی وہ اس بستی کا رخ کرے گا اور پھر وہاں سے اپنی واپسی کے لئے انتظام کرے گا لیکن بہرحال یہ بات طے تھی کہ تقدیر کا کوئی چکر اس کے ساتھ چل رہا تھا اسے اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ راستے میں کہیں گرشک اور سیتا سے ملاقات نہ ہو جائے اور ایک مرتبہ پھر اسے الجھنوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہ دونوں کردار اسے برے نہیں لگتے تھے لیکن بہرحال کسی کے لئے وہ اپنی زندگی کو ایک احمقانہ شکل نہیں دینا چاہتا تھا۔ ساری باتیں اپنی جگہ اسے اپنی پسند سے جینے کا حق تھا کیونکہ وہ کسی کا احسان مند نہیں تھا اور صرف دوسروں کے لئے کام کرنے کا خواہش مند بھی نہیں تھا گرشک اور سیتا تو نہ ملے لیکن رات کے پہلے قیام کے دوران اسے ایک جگہ آگ جلتی ہوئی نظر آئی تاحد نظر سفید ویرانے بکھرے ہوئے تھے آگ جلانے والے یقیناً انسان ہی ہوں گے انسانی فطرت میں تجسس کا عنصر نہ ہو تو پھر سچی بات یہ ہے کہ انسان انسان نہ رہے نہ جانے کب تک وہ اس آگ کو دیکھتا رہا جو دور سے نظر آ رہی تھی اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون لوگ ہیں۔ خوب سردی ہو رہی تھی اس کے علاوہ تنہائی دفعتاً کامران کے ذہن میں خیال آیا کہ کہیں یہ اسی گروہ

کے لوگ نہ ہوں۔ اگر وہ مل جاتے ہیں تب بھی کوئی حرج نہیں ہے بے شک ان کے ساتھ آگے کا سفر نہ کیا جائے لیکن اگر وہ قزل ثنائی' شعورہ' علی سفیان وغیرہ ہیں تو کم از کم ان لوگوں سے مل لینا بہتر رہے گا۔ باقی وہ اسے اس کی مرضی کے خلاف مجبور تو نہیں کر سکتے۔''

چنانچہ کامران نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور پھر وہ اپنے خچر پر بیٹھ کر ان کی جانب چل پڑا جوں جوں وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا آگ کے پس منظر میں ماحول اس کی آنکھوں کے سامنے نمایاں ہوتا جا رہا تھا گھوڑے بھی نظر آئے تھے تین خیمے بھی لگے ہوئے تھے خاصے افراد تھے گمان یہی گزرتا تھا کہ یہ علی سفیان گروپ ہی ہو سکتا ہے لیکن جب وہ قریب پہنچا تو اسے اجنبی چہرے نظر آئے دو افراد نمایاں تھے سفید چمڑی والے تھے یہ دونوں...... اس کے علاوہ کچھ مقامی ملازم وغیرہ بھی نظر آ رہے تھے وہ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس ویران اور پراسرار ماحول میں بدھ بھکشوؤں کے لبادے میں لپٹے ہوئے کامران کو دیکھ رہے تھے جو خچر پر چلا آ رہا تھا یہاں تک کہ کامران ان کے قریب پہنچ گیا یہ دیکھ کر اسے مایوسی تو ہوئی تھی کہ یہ اجنبی چہرے تھے۔

لیکن بہرحال مقصد یہاں بھی حل ہو سکتا تھا اسے اس شلوزان سے گریز کرنا تھا باقی سب بعد کی باتیں ہیں ممکن ہے یہ لوگ اس کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں اور اسے کسی آبادی کا پتا مل سکے دونوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر خوش آمدید کہا۔

کامران نیچے اتر آیا۔

''لگتا ہے تم کوئی لاما ہو جو کوئی بھی ہو ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں اور تمہیں ایک بہترین قہوے کی پیش کش کرتے ہیں براہ کرم اپنے خچر کو ادھر باندھ دو بلکہ ٹھہرو ہم ملازم سے کہتے ہیں کہ تم آدھی رات کو آنے والے مہمان ہو اور ہمیں تمہاری آمد سے خوشی بھی ہے اور اس کے علاوہ ایک اور بات کا پوری طرح اطمینان کر لو کہ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے بلکہ اس بات کے امکانات ہیں کہ تم ہمارے مددگار بھی ثابت ہو سکو اس نے بہت سی باتیں ایک ساتھ ہی کہہ دیں کامران نے گھوڑوں سے کچھ فاصلے پر خچروں کو باندھ دیا اور اپنے سامان کا گٹھر اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔

''اس سامان کو اگر چاہو تو اپنے خیمے میں پہنچا دو'' ایک بار پھر اس بات کا یقین کر لو کہ تمہارے پاؤں کے ناخن تک کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا ہم اس طرح کے لوگ ہیں ہی نہیں'' کامران نے پہلی بار ان کا شکریہ ادا کیا ملازموں نے سامان لے جا کر ایک خیمے میں رکھ دیا قہوہ شاید تیار ہی تھا اسے قہوے کا ایک مگ پیش کیا گیا وہ لوگ بھی اپنے پلنگ لے کر بیٹھ گئے تب ان میں سے ایک نے کہا۔

''میرا نام ایلیوس ہے اور یہ میرا ساتھی ہارڈی ہم لوگ ایک عجیب حادثے کا شکار ہو گئے ہیں ہمارا ایک ساتھی گورڈن ان پہاڑوں کو کھو گیا ہے جسے ہم تلاش کر رہے ہیں ہماری زندگی کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ ہم گورڈن کو تلاش کریں کیونکہ ہم تین دوست ایک الگ ہی منصوبہ لے کر ان پہاڑوں میں نکلے تھے ہم اس منصوبے پر ہزار بار لعنت بھیجتے ہیں اگر ہمارا ساتھی ہمیں مل گیا تو ہم خاموشی سے شہری آبادی کا رخ کریں گے'' کامران نے ان کے چہروں پر سچائی تلاش کی۔ پھر بھی اسے اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ سچ بول رہے ہیں یا نہیں لیکن بہرحال یہ جملہ اس کے لئے دل کشی کا باعث تھا کہ وہ لوگ اپنے دوست کی تلاش کے بعد شہری

آبادیوں کا رخ کریں گے ایلوس نے کہا۔

''تم نے اپنا نام نہیں بتایا دوست''

''میرا نام کامران ہے'' ایلوس کامران کا صحیح تلفظ ادا نہیں کر پایا تو بولا۔

''مجھ سے نہیں بنتا میں تمہیں کارمن کہوں تو......؟''

''کوئی حرج نہیں ہے''۔

''ویسے تم بدھ بھکشو نہیں ہو''

''ہاں۔ میں بدھ بھکشو نہیں ہوں''

''تو پھر کون ہو......؟''

''ایک آوارہ گرد سیاح''۔

''اگر سیاحت کرنے کے لئے آئے ہو تو......تو......تو''

ایلوس نے اپنے دوست ہارڈی کی طرف دیکھا ہارڈی کی تیز نگاہوں نے شاید اسے کچھ سمجھایا تو وہ جلدی سے رک گیا پھر بولا۔

''تو تم یہاں کے راستوں سے بہ خوبی واقف ہو گے؟''

''نہیں۔ کوئی خاص نہیں''۔

''پھر بھی ہم تم سے درخواست کریں گے کہ تم گورڈن کی تلاش میں ہماری مدد کرو''۔

''میں جس حد تک مدد کر سکتا ہوں ضرور کروں گا''۔

''اس وقت تک تم ہمارے ساتھ ہی رہو گے'' کامران نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور پھر گردن ہلا دی۔

بہرحال یہ لوگ بالکل مختلف تھے اگر تھوڑا سا ساتھ ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے انہیں اپنے کسی ساتھی کی تلاش تھی جس کے بارے میں بعد میں کامران کو تفصیلات معلوم ہو گئی تھیں اگر اس ساتھی کی تلاش میں تھوڑی سی کوشش ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں سے آگے کے سفر کا آغاز کیا جائے بہرحال وہ ان لوگوں میں شامل ہو گیا انہوں نے اس کی اچھی طرح پذیرائی کی مزدور بھی ان کے ساتھ تھے مزدوروں اور ان کے درمیان ایک عجیب سی کیفیت چلی آ رہی تھی یہاں سے خیمے اکھاڑ کر سفر کیا گیا گھوڑے اور خچر اس سفر میں استعمال کئے جا رہے تھے۔ ان کے پاس کھانے پینے کے سامان کی بھی خاصی مقدار تھی جو ملازم عام طور پر اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوا کرتے تھے سفر کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی وہ واقعی ایسا ہی لگتا تھا جیسے کسی کو تلاش کر رہے ہوں لیکن کبھی کبھی کامران کو احساس ہوتا تھا کہ کوئی اور مسئلہ بھی ان کے درمیان میں ہے۔

♥......♥......♥

اس وقت بھی ایلوس اور ہارڈی ایک الگ تھلگ جگہ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے ایلوس نے اپنے خنجر کی نوک سے زمین پر نقشہ بنا کر اپنے ساتھی کو سمجھانا شروع کیا اور بولا۔

''میں پورے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں ہارڈی کہ مغرب میں واقع یہی وہ چوٹی ہے جس کی

ہمیں تلاش تھی تم اس نقشے کو ذہن نشین کر لو یہ ہمارا خیمہ ہے اور یہ اس جانب کا راستہ چوٹی کو جاتا ہے ہم نے اب تک شمال کی جانب سفر کیا' لیکن اس جگہ سے ہمیں مغرب کی سمت مڑ جانا چاہیے تم سمجھ گئے یا نہیں''

''شش......شش'' ہارڈی نے اچانک منہ سے آواز نکالتے ہوئے کہا سامنے سے کامران چلا آ رہا تھا۔ وہ بولا۔ اس نقشے کو زمین سے مٹا دو وہ آ رہا ہے'' ہارڈی نے زمین پر بنا ہوا نقشہ مٹایا اور پھر کھڑے ہو کر زمین اپنے پیروں سے برابر کر دی اور اس طرح ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے گویا کامران کی آمد سے بے خبر ہوں لیکن ہارڈی کہہ رہا تھا۔

''یہ شخص فولاد کی طرح مضبوط معلوم ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے انتہائی جسمانی قوت کے ساتھ ساتھ ذہنی صلاحیتیں بھی رکھتا ہے بہرحال ہم ہر طرح سے محتاط رہیں گے۔ کیونکہ کوئی بھی بات ہمارے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے'' ایلوس نے کوئی جواب نہیں دیا اور چند لمحوں کے بعد کامران ان کے قریب پہنچ گیا۔

''ہم دونوں اس چوٹی کے بارے میں غور کر رہے تھے اس سامنے والی چوٹی کے بارے میں پتا نہیں اس کا کیا نام ہے؟''

''کون سی چوٹی......؟''

''وہ جس پر برف چمک رہی ہے''

''ہاں لیکن مجھے اس کے بارے میں معلوم ہے ان پہاڑوں میں ہر چوٹی کا کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھا گیا ہے تم جس چوٹی کی سمت اشارہ کر رہے ہو اس کا نام ارزک ہے لیکن بہت کم لوگوں کو یہ چوٹی دیکھنا نصیب ہوئی ہے''۔

''ارزک یہ نام عجیب ہی ہے۔ میں نے یہ نام کبھی نہیں سنا'' ہارڈی بولا۔

''اگر ہمیں گورڈن بے چارے کی تلاش کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو اس خوب صورت چوٹی کو نزدیک سے دیکھنے کی کوشش ضرور کرتے''۔

''بشرطیکہ وہاں تک زندہ پہنچ جاتے'' کامران نے کہا۔

''کیوں۔ کوئی ایسی خاص بات ہے کیا؟''

''ہاں۔ یہاں کے بارے میں ضرورت سے زیادہ معلومات مجھے بھی حاصل نہیں ہیں لیکن چونکہ سیاحوں میں بھٹکتا رہا ہوں اور مختلف لوگوں سے بلکہ مقامی لوگوں سے یہاں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی رہی ہیں یہاں کے پہاڑی قبائل کسی غیر ملکی کو اپنے علاقے میں برداشت نہیں کرتے اس لحاظ سے یہ علاقہ بے حد خطرناک کہلاتا ہے''

''بے شک۔ بے شک اور یہ بھی سنا ہے کہ یہاں کے لوگ پتھروں کی پوجا کرتے ہیں اور جادوگر کہلاتے ہیں اس علاقے ہی میں کہیں ایک شہر واقع ہے جس کا نام کونا ہے'' مانی کونا'' اور مانی کون میں ایک بہت بڑی بدھ خانقاہ ہے''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو ادھر کے رہنے والے لوگوں کے بارے میں سنا ہے کہ یہ لوگ شیطان کے پجاری ہوتے ہیں''۔

"مگر مجھے یہ سب بکواس معلوم ہوتی ہے" ایلوس نے کہا۔

"نہیں یہ بکواس نہیں ہے حقیقت ہے وہ شیطان کی پوجا کرتے ہیں ہم اس علاقے کے دراصل بالکل قریب ہیں جس جگہ ہم اس وقت خیمہ زن ہیں یہ قبائل کا علاقہ ہے یہ قبائلی بڑے جیالے لوگ ہوتے ہیں اپنے علاقے میں کسی اجنبی کو نہیں آنے دیتے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے ہمیں ابھی تک نہیں دیکھا۔ خاص طور پر ان لوگوں کو سفید چمڑی والوں سے بے پناہ نفرت ہے" کامران نے بتایا اور ایلوس کے چہرے پر ناخوشگوار کیفیت پھیل گئی لیکن وہ کچھ بولا نہیں تھا تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔

"لیکن اس ویران بنجر علاقے میں کیا رکھا ہے جو وہ اتنا ڈرتے ہیں؟"

"وہ ڈرتے نہیں ہیں کسی سے ان کا تعلق قدیم قبائل سے ہے جو سکندر اعظم اور چنگیز خان کے دور سے آباد ہیں مغل حملہ آوروں کے دور میں انہوں نے اپنے مذہب کو تبدیل کر دیا اور اس کے بعد وہ انگریزوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھنے لگے۔"

"پھر تو یہ علاقہ واقعی ہمارے لئے خطرناک ہے۔"

"ہاں۔"

"اس لئے اب ہم یہاں سے شمال کی جانب سفر کریں گے تاکہ ان قبائل سے واسطہ نہ پڑے امید ہے ایک ہفتے کے اندر اندر ہم کسی مناسب جگہ پہنچ جائیں گے کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارے دوست گورڈن کو اسی علاقے میں اغوا کیا گیا ہے۔"

"ہاں۔ خدا کرے کہ وہ اب تک زندہ ہو" ایلوس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ بالکل اتفاق ہے کہ اس بار والش نے اس علاقے کے بارے میں تفصیلات بتائی تھیں یہ اس وقت کی بات ہے جب خود کامران کو وہاں سے اغوا کر لیا گیا تھا اور اس کے بعد اس نے ایک عجیب وغریب زندگی گزاری تھی چنانچہ اس نے اسی نظریے کو سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"اگر اسے قبائلیوں نے اغوا کیا ہے تو اتنے عرصے تک اس کے زندہ رہنے کا امکان نہیں ہے تاہم مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"اگر دوست تم وہاں تک ہماری رہنمائی کر دو تو ہم تمہارے بہت شکر گزار ہوں گے ظاہر ہے جب تم ان کے بارے میں اس قدر جانتے ہو تو تم یقیناً ہمیں وہاں تک پہنچا بھی سکتے ہو۔"

"کوشش کر سکتا ہوں۔" کامران نے جواب دیا۔

"بہرحال تمہیں شکار وغیرہ سے کوئی دلچسپی ہے؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں۔"

"تو پھر اپنی مہارت کا مظاہرہ کرو۔" ایلوس نے اسے رائفل دیتے ہوئے کہا اور کامران مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا اس نے رائفل کندھے پر ڈالی اور بولا۔

"زندگی تمہارے ساتھ ہی گزارنی ہے کچھ عرصے تک ویسے یہاں شکار کے آثار ہیں میں جا کر دیکھتا ہوں شاید کچھ مل جائے البتہ مجھے دیر ہو سکتی ہے ممکن ہے شام ہو جائے۔"

"کیا پیدل جاؤ گے......؟

"ہاں فکر مت کرو شکار لے کر ہی آؤں گا" کامران نے ہنستے ہوئے کہا کامران جب ڈھلوان پر پہنچ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بلند ٹیلے تک پہنچے اور اوپر پہنچ گئے پھر وہ اسے دیکھتے رہے اور اس کے بعد خاموشی سے کیمپ کی طرف روانہ ہو گئے خیموں کے سامنے ان کے ملازم کام میں مصروف تھے ان میں چار دراز قد تو ان کے ساتھ آئے تھے۔ ایک شخص یہیں انہیں علاقوں میں مل گیا تھا اس نے اپنی خدمات ملازم کی حیثیت سے پیش کر دی تھیں اس نے بتایا تھا کہ وہ اکثر ان علاقوں میں بھٹکتا رہتا ہے اور راستہ بھول جانے والوں کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ لوگ اسے کچھ دے دیا کرتے ہیں۔

بہرحال اس شخص کا نام دیتو تھا۔ دیتو ایک پراسرار سا آدمی تھا اور کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ وہ کس طرح کا انسان ہے لیکن بہرحال اس کی ذات سے اب تک ان لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی پہاڑی ویرانے میں دور دور تک کسی انسانی وجود کا نشان تک نظر نہ آتا تھا ان کے خیالوں کے علاوہ ہر سمت اونچے بلند پہاڑوں کے سلسلے تھے اور ہر وقت مکمل سکوت طاری رہتا تھا۔ ہر طرف ویرانی چھائی رہتی تھی بلند پہاڑیوں کی چوٹیوں پر یہ برف چمکتی رہتی تھی چھوٹی پہاڑیوں کی ڈھلوانوں پر سبزے کا فرش بچھا ہوا تھا کہیں کہیں راستوں کے سلسلے نظر آتے تھے۔ ایلوس اور ہارڈی کی نگاہیں اس پہاڑ کی چوٹی پر جمی ہوئی تھیں جس کا نام ارزک تھا دفعتاً ہی ہارڈی نے کہا۔

"میرے خیمے میں آؤ" ہارڈی اپنے ساتھی کے ساتھ اس کے خیمے میں داخل ہو گیا۔ لیکن ان دونوں کو پتا نہیں تھا کہ پراسرار دیتو کی نگاہیں ان کا تعاقب کر رہی ہیں خیمے کے اندر پہنچ کر وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے اور ہارڈی نے ایک کاغذ نکال کر اس پر پنسل سے پھر وہی نقشہ بنایا جو پہلے زمین پر کھینچا تھا۔

"ہمیں گورڈن سے جو کام لینا تھا وہ اب پورا ہو چکا تھا اور اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس نئے آدمی کو اپنے ساتھ شامل کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کی شخصیت وہ نظر نہیں آتی جو ہے کوئی ایسی بات ضرور ہے اس میں جو نا قابل فہم ہو۔ بہرحال ان قبائلیوں سے ہمیں بچ کر نکلنا ہے ویسے اب اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں جن علاقوں سے گزرنا ہے وہاں کے قبائل پر کوئی اثر نہیں اس بات کا۔"

"تو تمہارا مطلب ہے کہ اسے اب راستے سے ہٹا دیا جائے۔"

"ہاں میں اب پوری طرح سے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ارزک کی چوٹی وہی ہے اور اب وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہم کسی اجنبی کو اپنے ساتھ جگہ نہیں دے سکتے۔"

"اور ہمیں اسی چوٹی کی تلاش تھی......؟

"ہاں چنانچہ اب مانی کونا تک ہمیں پہنچنے کے لئے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے"

"لیکن ہم تو اسے بہت ساری پیش کشیں کر چکے ہیں اور ویسے بھی تم نے اندازہ لگا لیا ہے اس کے بارے میں کہ وہ جسمانی طور پر بہت طاقتور اور ذہنی طور پر بھی بہت طاقتور آدمی ہے۔"

"یہی تو زیادہ خطرے کی بات ہے اگر وہ کوئی نارمل آدمی ہوتا تو ہم آسانی سے اسے ٹھکانے

لگادیتے، لیکن اب ذرا سوچنا پڑے گا کہ ایسے کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟"

"میرا خیال ہے آسانی سے۔"

"وہ کیسے......؟"

"ہم اس سے کسی بات پر جھگڑا کئے لیتے ہیں اور پھر بہانہ بنا کر اس سے صاف کہہ دیں گے کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے وہ غصے سے ہمیں چھوڑ کر چلا جائے گا۔"

"لیکن اس سے جھگڑا کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا وہ ایک پھرتیلا آدمی ہے اور پھر ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ اسے یہ اندازہ ہوسکے کہ ہماری منزل مانی کونا ہے وہ علاقوں سے واقف ہے اور جلد یہ پتا چلالے گا کہ ہم کس طرف گئے ہیں؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو واقعی کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا، لیکن ہر قیمت پر اسے ٹھکانے لگانا ضروری ہے دفعتاً ہی ایلوس چونک پڑا اور اس نے پھرتی کے ساتھ اپنا پستول نکال لیا پھر وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"اسی طرح باتیں کرتے رہو۔"

"بات کیا ہے؟"

کوئی خیمے کے باہر کھڑا ہماری باتیں سن رہا ہے" ہارڈی نے فوراً ہی بلند آواز میں بولنا شروع کردیا جب کہ ایلوس اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھ گیا پھر اس نے پھرتی کے ساتھ خیمے کا پردہ ہٹایا اور جو کوئی سامنے تھا اس کا گریبان پکڑ کر اسے زور سے اندر کھینچ لیا۔

"بدمعاش چھپ کر ہماری باتیں سن رہا تھا" ایلوس نے غضب ناک لہجے میں کہا دیتو اس کی کلائی سے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کررہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔

"اور اب جو ہمارے درمیان باتیں ہوئی ہیں یہ ان کا انکشاف کردے گا۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہیے......؟"

"یار میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی چکر ضرور ہے پہلے یہ ہمیں ملا اور اس کے بعد وہ شخص جس نے اپنا نام کارمن بتایا ہے یا جو کچھ بھی اور ہم سے اس کی صحیح ادائیگی نہیں ہوتی۔"

"اب یہ بتاؤ کیا کیا جائے؟"

"فکر مت کرو ہم نے اتنی محنت اس لئے نہیں کی ہے کہ یہ چوہا اسے برباد کردے" ایلوس نے غصیلے لہجے میں کہا اور پھر پستول لہرا کر بولا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اس سے چھٹکارا پالینا چاہیے" دیتو کا ہاتھ اس کی طرف بلند ہوا۔

"نہیں ایسا نہ کرو" وہ چیخا لیکن اس کی آواز گولی کے دھماکے میں دب کر رہ گئی۔

"یہی کرنا ہوگا اس کے ساتھی کے ساتھ بھی یہ بات اب طے ہوچکی ہے کہ جان بوجھ کر ہمارے درمیان شامل ہوا تھا پتا نہیں ان لوگوں کا منصوبہ کیا ہے یہ تو ایک طرح سے یہ کہنا چاہیے کہ کچھ نئے لوگ ہمارے راستے میں آگئے ہیں۔"

"اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوگا کہ اب اسے بھی ہلاک کردینا چاہیے" گولی کی آواز سن کر

ملازمین خیمے سے باہر آگئے تھے گولی چلنے کی آواز نے انہیں خوف زدہ بھی کردیا تھا ایلوس نے کہا۔

"وہ خود اپنے جال میں پھنس گیا ہے۔"

"کیسے......؟" ہارڈی نے پوچھا۔

"وہ پیدل گیا ہے اس کے پاس بس چند کارتوس ہیں۔ ہم اگر اپنا سامان لاد کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوجائیں گے، اگر وہ پیدل ہمارا تعاقب کرتا ہے تو کرنے دو۔ اس ویران پہاڑی علاقے میں کھانے، گرم لباس اور کارتوسوں کے بغیر وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکے گا ویسے بھی اب ہمیں اس کی منحوس شکل برداشت نہیں کرنی چاہیے بہرحال کامران کے لئے ایک اور مشکل پیدا ہوگئی تھی یہ لوگ اس سے ان علاقوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے کیونکہ انہیں مانی کونا پہنچنا تھا اور ادھر کامران بھی یہی چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ مل کر کسی ایسی آبادی میں پہنچ جائے جہاں سے وہ اپنا راستہ ناپ سکے۔

ان لوگوں کے بارے میں اس کے ذہن میں کوئی غلط خیال نہیں تھا وہ اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ دونوں اپنے ساتھی کی تلاش میں ہیں ظاہر ہے کہ ان علاقوں میں اس طرح بھٹکنے والے خزانوں وغیرہ ہی کے چکر میں پڑے ہوتے تھے اب اتنے سارے لوگ اس چکر میں پڑے ہوئے تھے تو کچھ لوگوں پر کیا توجہ دینی بہرحال وہ تقریباً ایک گھنٹے تک شکار کی تلاش میں گھومتا رہا اور اس کے بعد اسے ایک بارہ سنگھا نظر آیا جو جھاڑیوں کے دوسری جانب چر رہا تھا۔ کامران دبے پاؤں شکار کی جانب بڑھنے لگا وہ جھاڑیوں کی آڑ لے کر بڑھ رہا تھا اچانک اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کا تعاقب کررہا ہے اس نے اپنے عقب میں جھاڑیوں کو ہلتے ہوئے دیکھ لیا تھا پھر اس نے کسی کو پھرتی کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے گولی اس کے کان سے سنسناتی ہوئی گزر گئی اس نے بجلی کی طرح پلٹ کر فائر کیا اور کوئی کراہتا ہوا جھاڑیوں کے اندر گرا۔

کامران تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ جھاڑیوں میں پڑا ہوا شخص بالکل ساکت تھا وہ دبلا پتلا سا نوجوان تھا اور حلیے سے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا البتہ بڑھی ہوئی داڑھی اور کسی قدر بھیانک چہرہ یہ ثابت کرتا تھا کہ ممکن ہے کوئی ڈاکو وغیرہ ہو۔ کامران نے دل میں سوچا کہ شاید اس کا گروہ یہیں کہیں قریب ہی ہوگا اسے یہ اندازہ لگانے میں بھی دیر نہ لگی کہ اس ڈاکو کا گھوڑا بھی کہیں نزدیک ہی ہوگا کیونکہ اسے علم تھا کہ یہ لوگ پیدل کہیں نہیں جاتے اس ڈاکو نے کسی بلند جگہ سے اسے دیکھ لیا ہوگا اور تعاقب کرتا ہوا ادھر آگیا ہوگا۔ کامران آگے بڑھتا ہوا ڈھلوان کو طے کرکے اوپر پہنچ گیا اس کا اندازہ بالکل درست تھا اسے ایک گھوڑا نظر آیا جس پر زین کسی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ گھوڑے کی جانب بڑھا اور پھر اس نے گھوڑے کی پشت پر سوار ہوکر ہر سمت کا جائزہ لیا جنوب کی طرف کچھ فاصلے پر دھواں اٹھتا ہوا نظر آیا تھا یقیناً وہ ڈاکوؤں کا ڈیرہ ہے تاریکی پھیلتی جارہی تھی۔ کامران کو اپنے کیمپ سے نکلے کافی دیر ہوگئی تھی اس سے زیادہ کچھ کرنا بالکل مناسب نہیں تھا ایک ڈاکو اس کے ہاتھ سے مارا گیا تھا اگر اس کے ساتھیوں کو اس کی موجودگی کا علم ہوجائے تو سنگین صورت حال پیش آسکتی ہے نہ جانے ان کی تعداد کتنی ہو چنانچہ واپس جا کر ایلوس اور ہارڈی کو اس کے بارے میں اطلاع دینا ضروری ہے باقی تو سارے ملازم ہیں ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور ڈاکو آسانی سے انہیں مارلیں گے۔

چنانچہ اس نے گھوڑے کا رخ تبدیل کیا اور اس طرف چل پڑا جہاں ان کا کیمپ لگا ہوا تھا۔ کیمپ کے قریب اس نے بڑے ٹیلے پر چڑھ کر دیکھا تو حیران رہ گیا ہر طرف ویرانی تھی نہ خیمے تھے نہ ایلوس نہ ہی گھوڑے وغیرہ اس نے گردو پیش کے ٹیلوں کا جائزہ لیا کوئی مشکوک بات نظر نہیں آئی وہ اپنی رائفل سنبھالے چوکنا ہو کر آگے بڑھا جہاں ہارڈی کا خیمہ تھا وہاں اسے خون کے دھبے نظر آئے لیکن اس کے علاوہ کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے اس کی تجربہ کار نگاہوں نے یہ اندازہ بے شک لگا لیا تھا کہ وہ لوگ لوگ عجلت میں خیمے وغیرہ اکھاڑ کر سامان وغیرہ سمیٹ کہیں روانہ ہو گئے ہیں۔

کیوں کیا کسی حملے وغیرہ کا خوف تھا نہیں۔ پھر کسی چیز سے وہ خوف زدہ ہوئے بہر حال خون کے دھبے اسے پریشان کر رہے تھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون ایسا ہے جس نے یہاں کوئی ہنگامہ آرائی کی ہے اس نے گھوڑوں کے چھوڑے ہوئے نشانات سے یہ اندازہ بھی لگا لیا کہ وہ لوگ مغرب کی بجائے شمال کی سمت گئے ہیں جہاں کوہ ارزک واقع تھا وہ حیران تھا کہ وہ لوگ اس خطرناک علاقے کی طرف کیوں گئے ہیں نشان دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ کسی بھاری چیز کو گھسیٹ کر لے جایا گیا ہے وہ ان نشانات کے ساتھ چلتا ہوا ایک جھاڑی کے قریب پہنچ گیا جہاں ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں وہ اسے مردہ ہی سمجھا تھا لیکن اس نے جھک کر دیکھا تو اس کی سانس چل رہی تھی یہ دیتو تھا اس نے جلدی سے اس کے قریب پہنچ کر اس کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا پانی کی بوتل اس کے منہ سے لگائی نیم بے ہوش شخص نے کراہ کراہ کر آنکھیں کھول دیں اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں نے کامران کو پہچان لیا تھا۔

"کس نے تمہارے ساتھ ایسا کیا ہے؟" کامران نے غم زدہ لہجے میں پوچھا بے چارہ اچھا انسان تھا اور کامران کے ساتھ خاص طور سے اس کا رویہ بہت ہی اچھا تھا بہ مشکل تمام اس کے منہ سے آواز نکلی۔

"ایلوس...... ایلوس۔"

"مگر کیوں......؟"

"وہ لوگ آپ کیخلاف باتیں کر رہے تھے میں ان کے خیمے کے باہر چھپ کر ان کی باتیں سن رہا تھا انہوں نے مجھے گولی مار دی۔"

"کیا کہہ رہے تھے وہ" کامران نے تشویس سے پوچھا۔

"وہ لوگ مانی کونا جا رہے ہیں وہ جس کی تلاش میں نکلے تھے اس کا کوئی وجود نہیں ہے انہوں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا تا کہ آپ کے ذریعے یہاں تک پہنچ سکیں"

"لیکن وہ مانی کونا کیوں گئے ہیں بتاؤ وہ مانی کونا کیوں گئے ہیں؟" کامران نے سوال کیا مگر زخمی کی گردن ڈھلک گئی کامران نے جھک کر دیکھا تو وہ مر چکا تھا وہ ایک لمحے تک اس مظلوم انسان کی صورت دیکھتا رہا اور پھر اس نے گردن ہلا کر کہا۔

"کتے کے بچے سارے کے سارے جھوٹے ہیں سب کے سب فریبی' سب کے سب فریبی ایک معصوم انسان کو اس طرح ہلاک کر دیا جیسے کوئی درندہ کسی کی گردن چبا لیتا ہے غلط ہے نہیں یہ غلط ہے۔ میں امن چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں اس ساری ہنگامہ آرائی کو چھوڑ کر واپس کرنل گل نواز کے پاس پہنچ جاؤں

کوئی دلچسپی نہیں ہے مجھے ان خزانوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مجھے کسی پراسرار علاقے کا حکمراں بننے سے بدھ مذہب سے میرا تعلق ہی کیا ہے جو میں بلاوجہ اس کے چکر میں پڑوں نہ میں پاتال پرمتی ہوں' نہ پربھو...... سب چکر بازی ہے۔ ہو سکتا ہے میں کسی کا ہم شکل ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنی مرضی کے خلاف کام کروں اور آج میرے دل میں انتقام کے جذبے ابھر رہے ہیں یہ تو غلط ہے جس کا جو دل چاہے کر لیتا ہے ٹھیک ہے ایلوس!...... ؟ تم لوگوں نے اگر مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے تو بے فکر رہو میں تمہیں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔

بہر حال اس نے اس لاش کو دفن کیا اور پھر وہ گھوڑے کے قریب آ گیا نہ جانے کیوں اس شخص کی موت اس پر بری طرح اثر انداز ہوئی تھی پھر وہ اپنی فکر میں لگ گیا۔ اس پہاڑی علاقے میں سردی خاصی تھی۔ رات بسر کرنے کے لئے کوئی مناسب جگہ بھی نہیں تھی نہ بستر تھا' نہ خیمہ اور نہ کھانے پینے کا سامان یہ بھی بس ایک اتفاق تھا کہ اس ڈاکو کا گھوڑا اسے مل گیا تھا۔

بہر حال اب اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ سفر جاری کیا جائے یقیناً کوئی نہ کوئی آبادی مل ہی جائے گی وہ دہری کیفیت کا شکار تھا ایک طرف تو دل یہ تمنا کر رہا تھا کہ جلد از جلد کوئی مناسب جگہ مل جائے تو وہ اپنے وطن کا رخ کرے دوسری طرف نہ جانے کیوں اس کے دل میں ایک انتقامی جذبہ ابھر رہا تھا۔

بہر حال اسے یہ حیرت تھی کہ وہ لوگ مانی کونا کیوں گئے ہیں یہ ممنوعہ علاقہ تھا اور اس کی حدود میں کسی اجنبی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی بہت عرصے ان علاقوں میں بھٹکنے کے بعد کامران کو خاصی معلومات حاصل ہو گئی تھی بہر حال اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان لوگوں کی تلاش میں اسی سمت کا رخ کیا جائے تاریکی پھیل چکی تھی لیکن آسمان پر نکلنے والے تارے چمکنے لگے تھے ان کی مدھم سی روشنی میں کامران کے لئے یہ راستہ طے کرنا مشکل نہیں تھا گھوڑا تازہ دم تھا اس لئے وہ اتنا وقت گزارنے کے باوجود ان لوگوں کو پکڑ سکتا تھا اسے یقین تھا کہ وہ تمام لوگ راتوں رات سفر کریں گے اور اس بات سے مطمئن ہوں گے کہ وہ پیدل ہے کتنا ہی تیز کیوں نہ چلے ان تک نہیں پہنچ پائے گا اس نے کوہ ارزک کی برف پوش چوٹی کی طرف دیکھا اور اپنے گھوڑے کا رخ اسی سمت موڑ دیا اسی سمت سے گزرنے کے بعد مانی کونا کا علاقہ مل جاتا تھا راستہ تقریباً معلوم ہی تھا ایک بار جب اینہ سلفا اسے لے کر اس سمت آئی تھی تو اس نے وہاں ایک اقامت گاہ میں کچھ وقت قیام کیا تھا اقامت گاہ کے گنجے پجاری اور بڑے مندر کے فلک شگاف بگل کی آواز اسے اب تک یاد تھی وہ مندر جو کبھی مہاتما بدھ کے راہبوں کی خانقاہ تھی اب شیطان کے پجاریوں کے قبضے میں تھی رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی جب اسے ایک بار پھر روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی آگ سے ہی ہو رہی تھی۔

نشیب میں ایک چشمے کے کنارے آگ روشن تھی وہ غور سے اس آگ کے پس منظر میں لگے ہوئے خیموں کو دیکھنے لگا اور اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ خیمے کم از کم ایلوس' ہارڈی وغیرہ کے نہیں ہیں کچھ دیر بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ ان خانہ بدوش قبائلیوں کا کوئی پڑاؤ ہے جو مانی کونا کے قرب و جوار کی پہاڑیوں میں ادھر ادھر گھومتے رہتے ہیں یہ بڑے خون خوار اور وحشی لوگ تھے ایلوس اور ہارڈی یقیناً ان سے بچ کر ہی نکلے ہوں گے اس نے کافی فاصلے سے چشمے کو پار کرنے کا فیصلہ کیا اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا نشیب میں سے ہوتا ہوا

چشمے کے کنارے جا پہنچا جھاڑیوں کے پیچھے سے اس کی تیز نگاہوں نے گھوڑے پر سوار پہرے داروں کو دیکھا
جو پڑاؤ کے احاطے میں پھیلے ہوئے تھے پھر اس کی نگاہ پڑاؤ کے نزدیک ہی کچھ اور خیموں پر بھی پڑی۔ پڑاؤ
کے بیچ میں تین خیمے نصب تھے اور یہ انہی لوگوں کے خیمے تھے جو بے چارے مظلوم کا خون کر کے یہاں آئے
تھے اگر اس کا اندازہ غلط نہیں تھا تو ان خانہ بدوشوں نے ایلوس اور ہارڈی کو ہلاک کر دیا تھا اندازہ لگانا ضروری
تھا چنانچہ وہ بہت احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا ان خانہ بدوشوں کے ایک شکاری کتے نے کھیل خراب کر دیا
تاریکی میں اچانک ہی ایک غراہٹ سنائی دی اور اس کے بعد وہ کامران پر جھپٹا اس کی غراہٹ سنتے ہی خیموں
سے مسلح افراد نکلے گھوڑوں پر سوار پہرے دار بھی اپنی اپنی کمان سنبھال کر اس طرف دوڑے یہ کس قدر خون
خوار لوگ تھے کامران کو ان کا بہ خوبی اندازہ تھا اب اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ہتھیار ڈال دے
چنانچہ وہ خود ہی ان جھاڑیوں سے نکل کر کیمپ پہنچ گیا۔ گھوڑے پر سواروں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا
تھا لیکن پھر اچانک ہی کامران کو ایک چانس مل گیا ایک گھوڑ سوار اس کے قریب سے گزرا گھوڑے کے ایک
طرف نیام میں ایک تلوار لٹکی ہوئی تھی کامران کا ہاتھ بے اختیار طور پر ہی تلوار پر پہنچ گیا تھا اور پھر نہ جانے
اسے کیا ہوا کہ اس نے تلوار اس نیام سے کھینچ لی اور اس کے بعد ان پر حملہ کر دیا پتا نہیں یہ کون سا جذبہ اور کون سی
قوت تھی یا اسے جو تربیت دی گئی تھی اس میں اعلیٰ درجے کی تلوار بازی بھی شامل تھی تین سوار گر چکے تھے کہ
اچانک ایلوس اور ہارڈی کی آواز سنائی دی وہ چیخ چیخ کر لوگوں کے درمیان میں سے ہٹنے کے لئے کہہ رہے تھے
ایک لمحے کے لئے ان کی آواز سن کر کامران ایک بار پھر حیرت زدہ رہ گیا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ ان
کے قیدی نہیں ہیں اور نہ ہی مارے جا چکے ہیں بلکہ ان کے ساتھ ہیں اس کے لئے اتنے حملہ آوروں میں کچھ
کر لینا ممکن نہیں تھا چنانچہ اب دو ہی باتیں تھیں یا تو ان کے قبضے میں چلا جائے یا زندگی کی جدوجہد کرے۔
اسے خود اپنی اس برق رفتاری پر حیرت ہوئی تھی بے شک ان لوگوں نے اسے پاتال پرمتی کی
حیثیت سے بڑی تربیت بھی دی تھی راکان ہنزہ، گرشک' سیتا' امینہ سلفا کتنے کتنے کردار ایسے تھے جنہوں نے
اسے سنبھالنے میں بہت زیادہ جدوجہد کی تھی جو کچھ اسے حاصل ہو چکا تھا صحیح معنوں میں اسے خود بھی اس کا
تجربہ نہیں ہو سکا تھا ابھی تک' لیکن اس وقت ان لوگوں کے درمیان سے نکل آنے کی یہ یہ حرکت بڑی
زبردست تھی اس نے جھاڑیوں میں چھلانگ لگائی اور تاریکی میں غائب ہو گیا حملہ آوروں نے تعاقب کرنے
کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ چیختے چلاتے اپنے پڑاؤ کی سمت واپس ہونے لگے تھے جو ایک لمحے میں ہو گیا تھا اور
ایک آدمی کے ذریعے ہوا تھا اس کی انہیں امید نہیں تھی پتا نہیں وہ کیسے کیسے خوف کا شکار ہو گئے تھے ممکن ہے
انہوں نے سوچا ہو کہ کامران تنہا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ بڑے گروہ کی موجودگی کے امکانات ہیں بہر حال
وہ ان سے چھپنے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ انہوں نے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی پھر ایک بار دوبارہ
ایلوس اور ہارڈی کی طرف سے عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہو گیا پتا نہیں یہ لوگ مانی کونا کس لئے جا رہے
ہیں یہاں رکنا عقل مندی کی نشانی نہیں تھی چنانچہ وہ تیزی سے چٹانوں کو پھلانگتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں گھوڑا
بندھا ہوا تھا پھر گھوڑے پر سوار ہو کر وہ پوری رفتار سے اس سمت روانہ ہو گیا۔ جس طرف سے آیا تھا۔ اس
کا خیال ٹھیک نکلا جس جگہ ان لوگوں کا کیمپ تھا اس سے دس میل مغرب میں ایک کیمپ کے آثار نظر آ رہے

جلتی ہوئی آگ کی روشنی میں اسے خیمے صاف نظر آنے لگے ایک بلند چٹان کی آڑ میں اس نے گھوڑے کو
تھے۔ جلتی ہوئی آگ کی روشنی میں اسے خیمے صاف نظر آنے لگے ایک بلند چٹان کی آڑ میں اس نے گھوڑے کو
درخت سے باندھ دیا اور نرم گھاس پر چٹان سے ٹیک لگا کر دراز ہو گیا اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن ذہن
جاگ رہا تھا تھکن دور کرنے کے لئے یہ ایک مناسب جگہ تھی۔
آخر کار صبح کا اجالا پھوٹنے لگا حالانکہ ابھی روشنی نہیں ہوئی تھی لیکن کیمپ میں زندگی کے آثار نمایاں
ہو گئے آگ دوبارہ روشن ہو گئی اور کھانے کی خوشبو فضا میں پھیلنے لگی لوگوں کے چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی
آوازیں سنائی دے رہی تھیں یہ ایک خانہ بدوش قبیلہ تھا جو لوٹ مار اور ڈاکہ زنی پر گزارہ کرتا تھا ان کے ساتھ
عورتیں نہیں ہوتی تھیں تا کہ بھاگتے وقت دشواری نہ ہو بہر حال اس وقت بھی وہ لوگ روانگی کی تیاریاں
کر رہے تھے گھوڑوں پر زین کسی جا رہی تھیں۔ ہتھیار باندھے جا رہے تھے کامران ایک لمحے تک سوچتا رہا اور
پھر اس کے بعد اس نے ان کے قریب جانے کا فیصلہ کیا وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اطمینان کے ساتھ آگے بڑھ گیا
اور چند ہی لمحوں میں اسے دیکھ لیا گیا اسے دیکھتے ہی بہت سی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں اور دوسرے ہی
لمحے کئی رائفلوں نے اسے اپنی زد میں لے لیا کامران پر اطمینان انداز میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا اور اسی
جرات مندی کی وجہ سے خانہ بدوشوں کو گولی چلانے کی ہمت نہ ہوئی اس کے سردار نے گھوڑے کو ایڑھ لگائی
اور اس کے پاس پہنچ گیا۔
دونوں گھوڑے رک گئے لیکن کامران کو ایک بار پھر شدید ذہنی جھٹکا لگا تھا یہ چہرہ اس کا جانا پہچانا تھا
بیری سان ایسا شخص نہیں تھا جسے کامران آسانی سے بھلا سکتا وہ خون خوار آدمی تھا اور نہ جانے کیوں جب وہ
پہلی بار کامران کو ملا تھا تو کامران کو ایسا ہی محسوس ہوا تھا کہ جیسے وہ ڈاکوؤں کا سردار ہو بیری سان نے بھی شاید
کامران کو پہچان لیا تھا وہ اسے خون خوار نظروں سے دیکھنے لگا تو کامران نے کہا۔
''کیوں کیا بات ہے بیری سان کیا تم اندھے ہو گئے ہو دیکھو میں نے تمہیں ایک بار پھر تلاش
کر لیا'' بیری سان بری طرح غرایا اور بولا۔
''تم مجھے...... تم...... مجھے امید تھی کہ تم مجھے انہی علاقوں میں ملو گے بیری سان کے ساتھی ڈاکو
کامران کے گرد جمع ہونے لگے ان کی آنکھوں کی خون خواری چمک ماند پڑ گئی تھی لیکن بیری سان مشکوک
نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کامران بیری سان کے بارے میں جانتا تھا کہ یہ انتہائی ظالم اور مکار ہے' نہ
اس کے دل میں کسی کے لئے دوستی کا جذبہ ہے اور نہ اعتبار کا، لوٹ مار یقینی طور پر پہلے بھی اس کا پیشہ ہو گا۔
''کیا دیکھ رہے ہو بیری سان۔''
''تمہارے آدمی کہاں چھپے ہوئے ہیں؟''
نہیں میں اکیلا ہی ہوں۔''
''جھوٹ بول رہے ہو۔''
''میں کہتا ہوں تو بتاؤ کہ یہاں کیا کر رہے ہو تم...... ورنہ میرے آدمی تمہاری کھال اتار دیں گے۔''
''میں تمہاری ہی تلاش میں نکلا ہوں۔''
''بے وقوف بنا رہے ہو مجھے۔''

"تم ہو ہی بے وقوف۔" کامران نے کہا۔

"دیکھو ہوش وحواس درست کر کے بات کرو...... یہ تیرے باپ کی جاگیر نہیں ہے۔" ابھی اس کے جملے پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ کامران کا ایک بھرپور تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا۔ ضرب اتنی غیر متوقع تھی کہ وہ گھوڑے سے گرتے گرتے بچا اس کا ہاتھ پھرتی سے کمر تک گیا لیکن وہیں رک گیا کامران خود بھی تیار تھا پھر اس کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

"اگر تم لوگوں میں سے کسی نے حرکت کی تو اپنی موت کے ذمے دار خود ہو گے میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہے بیری سان سے بھی میری کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن ہم اچھے دوست نہیں ہیں۔"

"پکڑو...... پکڑو اسے میں اس کی کھال اتار دوں گا۔"

لیکن کامران نے ان لوگوں کے انداز میں شدید جھجک محسوس کی اور دوسرے ہی لمحے اس نے تلوار نکال لی یہ وہی تلوار تھی جو اس نے گھوڑے سوار سے چھینی تھی اس نے کہا۔

"تمہارا سردار کتنا بزدل ہے ایک آدمی سے مقابلہ کرنے کے لئے تم سب کو آگے بڑھا رہا ہے کیا یہ تنہا میرا مقابلہ نہیں کر سکتا بڑھتے ہوئے قدم رک گئے وہ اپنے سردار کی سمت دیکھ رہے تھے بیری سان کے منہ سے غصے سے جھاگ نکل رہا تھا قبیلے کے اصول کے مطابق اب اسے اکیلے ہی کامران کا مقابلہ کرنا تھا اور وہ اس چیلنج کے جواب میں خاموش رہتا تو اپنے لوگوں کی نگاہوں میں ہمیشہ کے لئے گر جائے گا یہ بات وہ بہ خوبی جانتا تھا کہ اس نے اسے بڑی چالاکی کے ساتھ ذاتی مقابلے پر مجبور کر دیا ہے اور پھر اسے یہ بھی شک تھا کہ کامران اکیلا نہیں تھا یقیناً اس کے آدمی قریب ہی چھپے ہوئے ہوں گے اس کی خونی نگاہیں نفرت اور غصے سے کامران کو گھور رہی تھی کامران کے ہونٹوں پر ایک مدھم مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی بیری سان نے کہا۔

"کامران میری تیری پہلی ملاقات میں بھی میرے اور تیرے درمیان کوئی جنگی ماحول نہیں پیدا ہوا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت بھی یہ تیری زیادتی ہے۔"

ڈرتا ہے بزدل۔"

"کتے...... اچانک بیری سان دھاڑا اور تلوار کھینچ کر کامران پر جھپٹا۔

"تیری موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہوئی ہے۔" اس نے اچانک حملہ کیا لیکن کامران کی تلوار بھی تیار تھی اس کی تلوار بیری سان کی تلوار سے ٹکرائی سب لوگ دور ہٹ گئے اب وہ اپنے سردار کے انجام کے منتظر تھے دوسرے ہی لمحے دونوں کے درمیان خوف ناک جنگ شروع ہو گئی۔

بیری سان کسی زخمی درندے کی طرح جھپٹ جھپٹ کر حملے کر رہا تھا۔ دونوں کے تربیت یافتہ گھوڑے اپنے سواروں کے اشارے پر گھوم رہے تھے کامران ابھی تک صرف دفاع کر رہا تھا ایک بار پھر بیری سان نے غرا کر حملہ کیا اور بولا۔

"میں تیرا سر اپنے خیمے کے سامنے بانس میں نصب کروں گا کتے۔"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ کامران کی تلوار اس کی گردن پر پڑی اور اس کا سر اچھل کر دور جا گرا وہاں کھڑے لوگوں کے حلق سے آوازیں نکل گئیں۔

کامران نے انہیں گھورا اور بولا۔

"اور کوئی ہے جو موت کا مزہ چکھنا چاہتا ہے۔"

"کوئی کچھ نہ بولا بہت دیر تک خاموشی رہی پھر کسی ایک نے کہا۔

"ہاں۔ سردار مر چکا ہے۔"

"لیکن ہم اسے سردار نہیں مانیں گے" ایک شخص نے کہا "ہم اسے مار ڈالیں گے" دوسرے نے کہا اور کامران اس کی طرف گھوم گیا اس نے اپنے گھوڑے کو اس کی طرف بڑھایا تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلا اس کے بعد کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ کامران گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور انہیں گھورتا ہوا اس طرف چل پڑا جہاں کھانا پک رہا تھا۔ وہاں جا کر وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے انہیں مزید خوف زدہ کرنے کے لئے کھانے کی ہانڈی اٹھائی اور اس میں موجود گرم کھانا کھانے لگا۔

وہ سب اسے خوف زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگے اس کی تلوار نے ہی ان لوگوں کو خوف زدہ کر رکھا تھا کہ اس کے اس انداز سے وہ لوگ اور مرعوب ہو گئے خود کامران کو یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ یہ سب کیسے کر رہا ہے اس وقت وہ...... ایک انتہائی وحشی قبیلے کا کوئی سردار ہی معلوم ہو رہا تھا اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے کوئی اور اندرونی قوت اسے اس طرح کے کام کرنے پر مجبور کر رہی ہے ورنہ خود تو وہ ایک خوش مزاج زندہ دل اور زندگی کی لطافتوں میں ڈوبا ہوا نوجوان تھا پتا نہیں یہ تبدیلی کن پراسرار قوتوں کا کارنامہ ہے واقعی انہیں پراسرار قوتوں کا کارنامہ ہی کہا جا سکتا تھا۔ اس کا مطلب ہے اس نے واپسی کا جو فیصلہ کیا ہے اس پر عمل نہیں کر پائے گا۔ وہ پراسرار قوتیں جو اسے پاتال پرمتی اور نہ جانے کیا کیا کہتی ہیں اسے گھیرے ہوئے ہیں راکان ہنزہ بے شک اپنے عمل ترک کر چکا ہے۔ اور کامران اس کے چنگل سے نکل چکا ہے لیکن اس پراسرار علاقے کی پراسرار قوتیں اس کے اردگرد پھیلی ہوئی ہیں اور وہ اتنی آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی جس طرح وہ اس وقت وحشیانہ انداز میں اس گرم ہانڈی سے کھانا کھا رہا تھا۔ وہ ان لوگوں پر وحشت طاری کرنے کے لئے کافی تھا ایک لمحہ کے اندر کامران نے سوچا کہ اگر ان لوگوں کی غلامی اسے حاصل ہو جائے تو یہاں بہت سے کام ہو سکتے ہیں۔ وہ حیران ہوا کہ اس نے کبھی انسانوں کو غلام بنانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا یہ کون سی پراسرار قوتیں ہیں جو اس کے ذہن پر حاوی ہو کر اسے ایک عجیب و غریب مقصد کے لئے اکسا رہی ہیں۔

اسے اپنی دہری شخصیت کا احساس تھا ایک طرف وہ صرف کامران تھا جو ان ہنگامہ آرائیوں سے ہٹ کر اپنی دنیا میں واپس چلے جانا چاہتا تھا وہاں جہاں اس نے اپنی زندگی کے بہترین شب و روز گزارے تھے اور ایک طرف یہ کیفیت تھی آخر یہ سب کیا ہے کیا اس کی ذات پر کوئی اور شخصیت حاوی ہو گئی ہے کون ہے جو اسے ان سوچوں میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔ غور کرنا پڑے گا اس پر، غور کرنا پڑے گا یہ تو اچھی بات نہیں ہے" وہ اپنے آپ کو کسی کی تحویل میں دینا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے طور پر زندگی گزارنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے اور اب وہ آئینہ سلفا اور اسی طرح کی دوسری شخصیتوں میں سے کسی کے جال میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔

"یہ غلط ہے کامران" اسے اپنے ذہن میں ایک آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ بری طرح

اچھل پڑا۔ آواز دوبارہ اس کے ذہن میں گونجی۔

”ہاں اس دوران تم نے پہلی بار میرا نام اپنی پیاری پیاری زبان سے پکارا ہے کامران مجھے معاف کرنا تم جانتے ہو میری پوری زندگی ایک مشن ہے اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم ان تمام چیزوں سے فرار حاصل کر کے اپنی دنیا میں واپس جا سکتے ہو تو ابھی براہ کرم ابھی ایسے مت سوچو...... اپنے طور پر فیصلے مت کرو۔ تمہیں ایک اہم کام کرنا ہے کتنی پراسرار قوتیں تمہارے پیچھے کیوں نہ لگ جائیں۔ بہر حال وہ اہم کام کرنا ہے جس کے لئے تمہیں مخصوص کر دیا گیا ہے براہ کرم ابھی اس سے بھاگنے کی کوشش مت کرو اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں تمہیں ایک بات بتا دوں کہ نہ صرف میں بلکہ سب جو تمہارے خواہش مند ہیں تمہیں نہیں چھوڑیں گے“ کامران کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا تو اسے پھر ایک آواز سنائی دی۔

”جے اکال بھوتری جے پرم پر ما تم بھلا تم اسے کیسے بھول سکتے ہو جس کا تمہاری زندگی سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ تم سوچ بھی تو سوچ نہ پاؤ نہیں ایسے مت سوچو تمہیں ہمارا کام کرنا ہے ہمارا کام کرنا ہے تمہیں ہر قیمت پر“ کامران کی آنکھوں میں سرخی سی بھر گئی اسے یوں لگا جیسے وہ انوکھی آواز اس کے سارے وجود پر حاوی ہوتی جا رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں خون کی سرخ چادر پھیل گئی ایک بار پھر اسے اپنا دفاع ماؤف ہوتا محسوس ہوا غالباً پراسرار قوتوں نے اس کے ذہن پر اثر ڈالا تھا کیونکہ ان دنوں وہ زیادہ سے زیادہ یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کسی آبادی میں پہنچ کر اپنے مشن پر نکل جائے تب اسے راکان ہنزہ کی آواز سنائی دی۔

”نہیں یہ ممکن نہیں ہے تمہیں ایک قوم کا فیصلہ کرنا ہو گا تم کیا جانو وہ کتنے ہیں جو تمہاری آس پر جی رہے ہیں۔ انہیں سنبھالنا تمہارا اپنا کام ہے اور سنو! یہ جو تمہارے ساتھ ہیں ان کو کنٹرول کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ تم انہیں لالچ دو' خزانے کا یہ علاقہ خزانے ہی کی وجہ سے مشہور ہے اور یہ سب کے سب ایک ہی راستے کے راہی ہیں۔ انہیں صرف اور صرف خزانے کا لالچ کسی قسم کے جرم سے باز رکھ سکتا ہے' ورنہ یہ بالکل مختلف لوگ ہیں تمہیں ان کے ہاتھوں نقصان بھی پہنچ سکتا ہے اور آخری بات یہ کہ ابھی جانے کے بارے میں مت سوچو ظاہر ہے تمہیں اپنی دنیا میں ہی جانا ہے لیکن فیصلہ کرتے جاؤ فیصلہ کرنا بہت ضروری ہے۔“ نہ جانے کیوں کامران کو اپنے دل و دماغ میں ایک عجیب سی کش مکش محسوس ہوئی کچھ آوازیں کچھ سنسناہٹیں اسے عجیب وغریب انداز میں محسوس ہو رہی تھیں وہ سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کیا کرے' کیا نہ کرے' اچانک ہی اس کے ذہن پر ایک سکون کی چادر چھا گئی کون سا ابھی کوئی راستہ اس کے سامنے پڑا ہے وقت بڑے بڑے فیصلے کر لیتا ہے وقت کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے اس نے دل میں سوچا اور اس کے بعد اس پر ایک سکون سا چھا گیا اس نے بیری سان کو قتل کر دیا تھا بیری سان بلاوجہ اس کے راستے میں آیا تھا یہ صورتحال بحالت مجبوری پیدا ہوئی تھی۔ اس نے ان لوگوں کو دیکھا اور کرخت لہجے میں بولا۔

”کون ہے جو میرے ساتھ چلنے کو تیار ہے بولو! تمہارا سردار تو مارا گیا تم جسے چاہو اپنے قبیلے میں اسے سردار چنو لیکن تم میں سے جو میرا ساتھ دے گا اسے اتنی دولت دوں گا جس کا تم لوگوں نے تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔“ کامران نے ان کے چہروں کے تاثرات بدلتے ہوئے دیکھے دولت کے ذکر پر ان کی آنکھیں

چمک اٹھیں لیکن ان کا شبہ دور نہیں ہوا تھا ان میں سے ایک نے کہا

”کیا تم سچ کہہ رہے ہو اس کا ثبوت کیا ہے جواب دو ورنہ ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے“ کامران نے جواب دینے کے بجائے اپنا گھوڑا اس شخص کی طرف گھمایا اور وہ شخص خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا لیکن کامران نے اسے کچھ نہ کہا اور کافی دیر تک اس کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

”اگر تم میں سے کسی کے دماغ میں کوئی سودا سمایا ہوا ہے تو آؤ میں اسے بتا دوں۔“

”یہ گھوڑا کس کا ہے؟۔“

”یہ ہمارے ایک آدمی کا ہے۔“

”ہاں یہ گھوڑا تمہارے ہی ایک آدمی کا ہے اس نے بزدلوں کی طرح مجھ پر وار کیا تھا اس لئے میں نے اسے ہلاک کر دیا۔“ سب کھڑے ہوئے اسے غصے اور نفرت سے دیکھ رہے تھے پھر ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔

”تم ہمیں کہاں لے جاؤ گے اور کیا ہمیں تمہارا پابند رہنا ہو گا۔“

”تم بے وقوف بھی ہو اور بزدل بھی' نہ تمہارا کوئی گھر ہے اور نہ خاندان ان ویرانوں میں بھٹکتے ہوئے جنگلی جانوروں کی طرح مر جاؤ گے اگر تم سب جہنم میں ہی جانا چاہتے ہو تو میری بلا ہے“ وہ خونخوار نظروں سے اسے گھورنے لگے پھر بھاری بھرکم شخص نے کہا۔

”سنو! اگر تم ہمیں اس خزانے تک لے چلو گے تو ہمیں تمہاری رہنمائی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”اور میں تم سے صرف ایک بات کہتا ہوں کہ میں سچ بولتا ہوں کہ میرے ساتھ چلو گے تو خطرات کا مقابلہ کرنا پڑے گا تمہیں تم میں سے بہت سے ہلاک بھی ہوں گے لیکن جو بچ جائیں گے انہیں اتنی دولت ملے گی جس کا کسی نے تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔“

”ہمیں منظور ہے“ ایک شخص نے کہا اور پھر ہر شخص یہی بات دہرانے لگا ”ہمیں منظور ہے' ہمیں منظور ہے۔“

”ایک بات یاد رکھو ہم بڑی خطرناک جگہ چل رہے ہیں“

”ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔“

”تو پھر آؤ“ اب کامران ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔

”مقصد ابھی تک کچھ بھی نہیں تھا بس اچانک ہی جو کیفیت اس پر طاری ہوئی تھی وہ ایک سحر کی سی کیفیت تھی اور وہ اسی پر عمل کر رہا تھا۔ اس علاقے سے اسے اتنی واقفیت تھی کہ وہ آگے بڑھتا رہا۔ وہ لوگ اپنی پیش قدمی کو خفیہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کامران جانتا تھا کہ وہ لوگ اب مانی کوتا پہنچنے والے ہیں۔ اب ممکن ہے بہت جلد وہ لوگ بھی مل جائیں۔ جن کے ساتھ ایلوس اور ہارڈی موجود ہیں۔ بہر حال وہ لوگ اس وادی تک پہنچ گئے جہاں چشمے کے کنارے خانہ بدوش خیمہ زن تھے۔ کامران نے اپنے ساتھیوں کو چٹانوں کے پاس کافی دور چھوڑ دیا اور چھ سات آدمیوں کو لے کر یہاں تک آیا۔ یہاں بلندی تھی اور یہاں سے وہ نیچے کا منظر صاف دیکھ سکتے تھے۔ خانہ بدوشوں کے گھوڑے پڑاؤ کے نزدیک چر رہے تھے ایک سمت بھیڑوں کا

ریوڑ اپنی بھوک مٹانے میں مصروف تھا کئی سوار مختلف سمتوں میں پہرہ دے رہے تھے لیکن ایلوس اور ہارڈی نظر نہیں آرہے تھے۔ پتا نہیں وہ دونوں کہاں غائب ہوگئے۔

"ان کے آدمیوں کی تعداد ہم سے بہت کم ہے ہم آسانی سے انہیں ختم کرکے ان کے سامان پر قبضہ کرسکتے ہیں۔"

"شاید عورتیں دیکھ کر تمہارے منہ میں پانی بھر آیا ہے۔"

"ان کی عورتیں بڑی خوب صورت ہوتی ہیں یہ لوگ کوہ ارزک سے سونا لے کر آتے ہیں اور انہیں تاجروں کے ہاتھوں فروخت کردیتے ہیں۔" کامران کو یاد آیا کہ کوہ ارزک کے بارے میں اس نے سنا تھا کہ یہاں سونے کی کان ہے۔ اس نے پھر بھی کہا۔

"لیکن یہ سب کہانیاں ہیں۔ جہاں میں تمہیں لے جارہا ہوں وہاں مال وزر کے بے شمار خزانے ہیں جو ساری زندگی کے لئے کافی ہوں گے تم سب کو احتیاط سے کام لینا ہوگا...... خبردار! کوئی باہر نہ آئے...... اور تم میرے ساتھ آؤ" اس نے باقی پانچ افراد سے کہا۔

بہرحال جن کو واپس بھیجنے کی ہدایت کی گئی تھی وہ واپس چلے گئے۔ کامران ان چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا نشیب کی سمت بڑھا۔ وہ کیمپ کے قریب پہنچا ایک بلند جگہ جھاڑیوں کی آڑ سے کامران نے ایک بار پھر کیمپ کا جائزہ لیا۔ لیکن اسے اپنے دشمنوں کا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔ پھر وہ ایک بلند ٹیلے پر چڑھنے لگا اس سے وادی کے دوسری طرف دیکھنا بھی ممکن تھا۔ بلندی پر پہنچ کر وہ چٹان کی آڑ میں لیٹ گیا اور اس نے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا اور پھر اچانک وہ اچھل پڑا بہت دور سے چند دھبے حرکت کرتے نظر آرہے تھے۔ کامران کو اندازہ ہوگیا کہ یہ بہت سے سوار ہیں جو وادی کی سمت بڑھ رہے ہیں وہ پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے ہٹا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر اس مقام پر پہنچا جہاں سے ہارڈی اور ایلوس نے چشمے کو پار کیا تھا گیلی زمین پر ان کے بوٹوں کے نشان واضح تھے۔

کامران کو اس بات پر حیرت تھی کہ خانہ بدوشوں نے کیسے ان پر اعتبار کرلیا کہ ان کو تنہا جانے دیا بہرحال بہت سے معاملات علم میں نہیں آتے ادھر وہ نامعلوم سوار وادی کی سمت جن کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ کامران ابھی صورتحال پر غور کررہا تھا کہ گولیاں چلنے کی آوازیں سن کر چونک پڑا اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور بلندی پر چڑھنے لگا اس کے پانچوں ساتھی پیچھے آرہے تھے بلندی پر پہنچ کر انہوں نے جو منظر دیکھا وہ ان کے لئے حیران کن تھا باقی دوسرے لوگوں نے وادی میں موجود خیمہ زن خانہ بدوشوں پر حملہ کردیا تھا اس اچانک حملے سے خانہ بدوشوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا اور ان کے بہت سے آدمی مارے گئے تھے لیکن پھر انہوں نے یہ پوزیشن سنبھال لی اور خیمہ اور گھوڑوں کی آڑ میں مقابلہ کرنے لگے۔ وہ ایک بلندی سے فائر کررہے تھے اور ان کے پاس رائفلیں تھیں اس لئے خانہ بدوشوں کا بھاری نقصان ہورہا تھا۔ وہ اپنی ہلکی بندوقوں سے مقابلہ کررہے تھے اور بعض اپنے تیر کمانوں سے نشانہ لے رہے تھے پھر ہم حملہ آور فتح کے جوش میں نشیب کی طرف لپکے گولیوں کی بوچھاڑ سے کئی سوار نیچے گرے لیکن باقی بھوکے درندوں کی طرح خانہ بدوشوں پر ٹوٹ پڑے۔

کامران کی آنکھوں میں خون اتر آیا اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور نشیب میں اتر کر چشمے

کے کنارے کنارے اس سمت جھپٹا اس نے اپنی تلوار نکال لی تھی جو دھوپ میں چمک رہی تھی۔ اس کے باقی پانچوں ساتھی بھی پوری رفتار سے گھوڑے دوڑا رہے تھے ایلوس اور ہارڈی کے جانے کے بعد ان خانہ بدوشوں پر حملہ بے کار تھا۔ اس حملے نے اس کے تمام منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا اور نہ جانے کیوں اس کے پورے وجود میں غیظ وغضب کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔

وہ کسی طوفان کی طرح کیمپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ انہوں نے اسے تلوار لہراتے ہوئے دیکھا تو وہ سمجھے کہ وہ ان پر حملہ کرنے آرہا ہے وہ بھی مقابلے کے لئے تیار ہونے لگے۔

ادھر خانہ بدوش بھی یہ سمجھے کہ ان پر دوسری سمت سے کوئی نیا حملہ ہورہا ہے انہوں نے اپنی بندوقوں کا رخ کامران اور اس کے ساتھیوں کی طرف پھیر دیا اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حملہ آوروں نے ان کے بچے کچے ساتھیوں کا صفایا کرنا شروع کردیا اس سے پہلے کہ خانہ بدوش سنبھل سکتے وہ ہر سمت سے یلغار میں گر چکے تھے کامران کے ساتھی جنہیں وہ اب اپنا ساتھی ہی کہہ سکتا تھا اور جو اس کے ساتھ سفر کررہے تھے بڑی سفاکی کے ساتھ قتل عام کررہے تھے اور کامران ان کے بارے میں اندازہ لگا رہا تھا کہ یہ لوگ کس قدر بھیانک ہیں یہ حقیقت تھی کہ بھیری سان نے جو گروہ بنایا تھا وہ معمولی حیثیت کا حامل نہیں تھا۔ وہ تو اتفاق کی بات یہ تھی کہ کامران کسی پراسرار قوت کے سہارے کامرانی حاصل کرگیا تھا بیری سان اگر ان لوگوں کو اشارہ کردیتا تو یہ کامران کے اتنے ٹکڑے کرتے کہ گنے بھی نہ جاتے۔ اس وقت وہ ان کی سفاکی دیکھ رہا تھا۔ وہ لوگ عورتوں اور بچوں کو بھی بے دردی کے ساتھ قتل کررہے تھے۔ لیکن یہ صورتحال کامران کے لئے انتہائی تکلیف دہ تھی۔

اس کا غصہ بڑھتا جارہا تھا یہاں تک کہ وہ ان کے قریب پہنچا اور اس نے اپنی تلوار سے اپنے کئی ساتھیوں کو ٹھکانے لگا دیا اس نے اتنے قہر کے عالم میں حملہ کیا تھا کہ وہ لوگ بھاگنے لگے۔ اس دست بدست جنگ میں رائفلوں کے استعمال کا موقع نہیں مل سکا تھا اور پھر بیشتر کی گولیاں بھی ختم ہوگئی تھیں۔ خانہ بدوش الگ جانیں بچا بچا کر الگ الگ سمتوں میں بھاگ رہے تھے اور ان وحشیوں کی زد میں آکر ہلاک بھی ہورہے تھے ذرا سی دیر کے بعد جنگ ختم ہوگئی زندہ بچنے والی عورتوں اور بچوں کی چیخ وپکار سے فضا بھی گونج رہی تھی ادھر وہ لوگ کامران سے خوف زدہ ہوکر دور ہٹ گئے تھے وہ حیرت سے کامران کو دیکھ رہے تھے کامران نے انتہائی خونخوار لہجے میں کہا۔

"کس نے تمہیں حملے کا حکم دیا تھا" غصے میں کامران ایک خونخوار شیر نظر آرہا تھا ان میں سے ایک نے کہا۔

"ڈولاس نے' ڈولاس۔" کامران اس شخص کو جانتا تھا وہ ایک خونخوار شخصیت کا مالک تھا۔

"کیوں۔"

"ہاں' اس نے کہا تھا کہ تم ہمیں دھوکا دے کر بھاگ گئے اور خانہ بدوش ہم پر حملہ کرنے وا

ہیں کامران ایک خوف ناک دھاڑ کے ساتھ ڈولاس کی جانب جھپٹا جہاں وہ کھڑا ہوا اسے غصے سے گھور رہا

اس سے پہلے کہ وہ مدافعت کی کوئی کوشش کرسکے کامران کی تلوار موت بن کر اس پر گری اور اس کی گرد

کٹ کر دور جا گری۔

''درندوں، وحشیو خدا تمہیں غارت کرے اس قتل عام سے تمہیں کیا مل گیا۔ کتنا سونا تمہارے ہاتھ لگا بولو! کتو کیا ملا تم کو۔''

''ان کے پاس سونا تھا ہی نہیں'' ان میں سے ایک نے مایوس کن لہجے میں کہا۔ ڈولاس نے جھوٹ بولا تھا گیدڑ کے بچو میں تم کو یہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ جاؤ تم سب جہنم میں۔''

''چلے جاؤ لیکن تم اس طرح ہماری بے عزتی نہیں کر سکتے۔'' ایک شخص نے چیخ کر کہا۔

''ہم تمہارے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔'' دوسرے نے کہا۔

''چلو ہمیں اس شخص کی ضرورت نہیں ہے'' ''احمقو اب تم بچ کر کہاں جاؤ گے میں نے دیکھا ہے قبائلیوں کا ایک بڑا گروہ اس سمت بڑھ رہا ہے فرار ہونے والے خانہ بدوش تمہارے قتل عام سے انہیں آگاہ کر دیں گے اس علاقے کے سارے قبائل تمہارے دشمن ہیں اب بتاؤ تم بچ کر کدھر جاؤ گے وہ لوگ کامران کے ان الفاظ سے خوف زدہ ہو گئے ان کی لوٹ مار کی وجہ سے علاقے کے تمام قبیلے ان کے دشمن تھے اور وہ اس علاقے میں اس لئے قدم نہیں رکھتے تھے کہ فرار ہونا دشوار تھا۔''

''تم نے اپنی موت کو خود دعوت دی ہے اب ہمیں اس شخص کے علاوہ کوئی اور نہیں بچا سکتا'' ایک بزرگ نے کہا۔

''ہم تمہاری ہر بات مانیں گے ہمیں معاف کر دو۔''

کامران نے تلوار نیام میں رکھی اور جلدی جلدی ان کا جائزہ لینے لگا۔ وہ لوگ اس کی ہدایت پر بلا تامل عمل کر رہے تھے خانہ بدوشوں کے گھوڑے جلدی جلدی جمع کئے جانے لگے اور سورج غروب ہوتے ہی وہ اپنے زخمیوں کو لے کر وہاں تیزی سے روانہ ہو گئے۔

کامران نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا جس پر ایلوس اور ہارڈی گئے تھے باوجود یہ کہ یہ ہموار راستہ تھا۔ اسے شہر جانے کا دوسرا راستہ بھی معلوم تھا کامران کو اعتماد تھا کہ وہ ان دونوں کو آسانی سے جا لے گا لیکن اس وقت اسے ان قبائلی لوگوں سے بچ کر نکل جانے کی فکر لگی ہوئی تھی جن کے گروہ کو اس نے اپنی سمت بڑھتے دیکھا اسے یقین تھا کہ وہ اس کا تعاقب ضرور کریں گے بچے کھچے خانہ بدوشوں نے ان کو قتل عام کے متعلق ضرور بتا دیا ہوگا۔ خانہ بدوش بڑے غیظ و غضب کے عالم میں انتقام لینے کے لئے بڑھ رہے ہوں گے اس لئے سیدھے ہموار راستے پر جانے کے بجائے کامران نے مغرب کی سمت سے ایک دشوار گزار پہاڑی راستے پر آگے بڑھنا شروع کر دیا وہ تاریکی میں کسی شیطانی لشکر کی طرح تنگ دروں اور خطرناک گھاٹیوں کے درمیان ہوتے ہوئے سفر کر رہے تھے صبح سے پہلے وہ چٹانوں کے درمیان بہنے والی ایک ندی کے کنارے پہنچ گئے۔

وہ پانی کے اندر سے ہوتے ہوئے تین چار میل تک آگے بڑھتے رہے اس کے بعد کنارے پر آ گئے۔ کامران کو معلوم تھا کہ قبائلی ان کے نشانات تلاش کرتے ہوئے ان کا تعاقب کریں گے اس لئے اس نے دانستہ پانی میں سفر کیا تھا تا کہ دشمن ان کا سراغ نہ لگا سکیں اس کے علاوہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ دشمن کو یہ اندازہ ہو سکے کہ وہ شہر کی سمت جا رہے ہیں۔

ندی کے کنارے کافی دور تک چلنے کے بعد انہوں نے پہاڑوں کا رخ کیا سورج نکلا تو وہ خطرناک پہاڑیوں کے درمیان پہنچ چکے تھے تھکان سے ان سب کی حالت غیر ہو رہی تھی کامران نے وہاں قیام کرنے کا حکم دیا تا کہ وہ تازہ دم ہو جائیں۔ قبائلی کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ کامران ان کو چھوڑ کر ایک سب سے اونچی پہاڑی پر پہنچا اور دوربین کے ذریعے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا جب اسے اطمینان ہو گیا کہ قبائلیوں کو ان کا سراغ نہیں مل سکا ہے تو اس نے نیچے آ کر اپنی بھوک مٹائی اور خود بھی آرام کرنے کے لئے دراز ہو گیا۔

سورج چڑھتے ہی وہ پھر روانہ ہو گئے۔ یہاں سے راستہ بہت دشوار گزار تھا نوک دار چٹانوں سے گزرتے بلندیوں اور خطرناک ڈھلوانوں کو پار کرتے وہ مسلسل سفر کرتے رہے ایسا سنسان پہاڑی علاقہ تھا کہ قبائلیوں کے چہرے سے خوف جھلکنے لگا انہیں خانہ بدوشوں کے حملے کا بھی اتنا ہی خوف تھا کہ وہ کامران کے ہر حکم کی تعمیل بلا تامل کر رہے تھے کامران نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے ایسا راستہ اختیار کیا تھا جس پر تعاقب کا امکان کم سے کم تھا وہ جیسے جیسے مغرب کی طرف بڑھتے گئے کامران کو وہ نشانات ملتے گئے جو شہر کے راستے کی رہنمائی کرتے تھے ویسے بھی وہ اسی چوٹی سے راستے کا اندازہ کرتا ہوا بڑھ رہا تھا سورج غروب ہونے سے پہلے وہ ایک چوڑی اور کشادہ وادی میں پہنچ گئے جس کی ڈھلوان سے شہر کی فصلیں نظر آ رہی تھیں۔

شہر ایک پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ جہاں سے وہ وادی نظر آتی تھی جنوب میں اونچے نیچے ناہموار پہاڑوں کا سلسلہ کوہ ارزک تک چلا گیا تھا وادی کے شمال اور مغرب کا راستہ بلند پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا مشرق کی سمت ایک ڈھلوان راستہ چٹانوں کے درمیان سے ہوتا ہوا شہر کے بڑے پھاٹک کی سمت جاتا تھا۔

کامران نے اوپر چڑھ کر ہر سمت کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر پڑاؤ پر واپس آ گیا وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک محفوظ گھاٹی میں پہنچا اور ان کو وہیں پوشیدہ رہنے کی تاکید کی یہاں سے ایک ڈھلوان راستہ شہر کے بالکل قریب تک جاتا تھا اور جہاں پر ڈھلوان ختم ہوتی تھی وہ جگہ ہر سمت سے بلند چٹانوں سے گھری ہوئی تھی۔ فرار کی کوئی راہ نہ ہونے کی بناء پر یہ جگہ خطرناک ثابت ہو سکتی تھی لیکن گھوڑے اتنے تھک چکے تھے کہ آرام کے بغیر ان کو استعمال کرنا دشوار تھا اس کے ساتھی بھی تھکان سے نڈھال تھے اس لئے قیام کے علاوہ چارہ نہ تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک گھاٹی تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جو اس درے سے باہر جاتی تھی کچھ لوگوں کو وہاں نگرانی پر مامور کر کے واپس آیا اور ان لوگوں کو بتایا کہ وہ تنہا جا کر پہلے صورتحال کا جائزہ لے گا۔ تا کہ شہر میں داخلے کے لئے کوئی طریقہ سوچ سکے۔ قبائلیوں نے اسے شبہ بھری نگاہوں سے دیکھا لیکن خاموش رہے۔ کامران پر انہیں اعتبار رہا ہو یا نہیں اس کے بغیر وہ خود کو اس علاقے میں بے سہارا محسوس کرتے تھے انہیں ہر لحہ خانہ بدوشوں کے حملے کا خدشہ لگا ہوا تھا۔ لیکن کامران کو اب کوئی فکر نہ تھی اسے یقین تھا کہ اگر قبائلی ان تک پہنچ بھی گئے تو اس پہاڑی علاقے میں مقابلہ دشوار نہیں ہوگا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ شہر کے باشندے اپنی فصلوں سے باہر بہت کم ہی نکلتے تھے اس لئے ان کی جانب سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

کامران خود بھی بہت تھکا ہوا تھا لیکن جب اس پر مہم جوئی کا جنون سوار ہوتا تھا تو وہ سب کچھ بھول جاتا تھا اس وقت بھی وہ بھوکا پیاسا ہونے کے باوجود چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ وہ گھاٹی سے باہر نکلا تو ہر سمت

تاریکی پھیل چکی تھی۔ آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کی روشنی اس کی رہنمائی کے لئے کافی تھی۔ سیدھے جانے کے بجائے وہ چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور شاید اسی لئے اسے غار کا وہ دہانہ نظر آ گیا جس کے اندر وہ چھپے ہوئے تھے۔

یہ غار دو بلند نوکیلی چٹانوں کی آڑ میں تھا۔ پہاڑی سے باہر نکلی ہوئی ایک چٹان نے چھجے کی طرح اس پر سایہ کر رکھا تھا۔ تمارس کی گھنی بیلوں نے دہانے کو تقریباً چھپا رکھا تھا اگر اندر جلتی آگ کی روشنی کی جھلک نظر آتی تو کامران شاید اس میں پوشیدہ ٹھکانے کا پتا کبھی نہ لگا سکتا۔ وہ چٹانوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھا اور گھنی بیلوں کی آڑ سے اس نے اندر جھانکا باہر سے دہانہ چھوٹا تھا۔ لیکن اندر جا کر غار بہت کشادہ ہو گیا تھا۔

آگ کے گرد تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور کھانے کے ساتھ ساتھ باتیں کر رہے تھے کامران نے فوراً انہیں پہچان لیا یہ تینوں ایلوس اور ہارڈی کے ملازم تھے جنہیں وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا غار کے بالکل قریب اندرونی حصے میں گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور دیگر ساز و سامان رکھا ہوا تھا ان کی باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ کیونکہ فاصلہ زیادہ نہیں تھا وہ سوچ رہا تھا کہ چوتھا ملازم اور وہ دونوں کہاں گئے۔

کامران دہانے سے ہٹ کر جھاڑیوں میں انتظار کرنے لگا اور یہ اچھا ہوا کیونکہ ذرا دیر بعد ہی چوتھا ملازم جلانے کے لئے لکڑیوں کو دونوں ہاتھوں میں اٹھائے نمودار ہوا غار کے دہانے کی سمت جاتے ہوئے وہ کامران کے اتنے قریب سے گزرا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا لیکن کامران نے ہاتھ نہیں بڑھایا بلکہ چیتے کی طرح جست لگا کر اس کی پشت پر سوار ہو گیا اور اتنے زور سے اس کی گردن دبائی کہ لکڑیاں اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑیں ملازم نے دہشت زدہ ہو کر چیخنا چاہا لیکن حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

لکڑیاں جھاڑیوں پر گری تھیں اس لئے کوئی آواز نہیں ہوئی کامران کی گرفت اتنی سخت تھی کہ ملازم کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا جلد ہی کامران اسے زمین پر گرا کے سینے پر سوار ہو گیا اور خنجر اس کی گردن پر رکھ دیا ملازم نے اسے پہچان لیا تھا اور وہ اتنا دہشت زدہ ہو گیا تھا کہ اس آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"وہ دونوں کہاں ہیں؟" کامران نے خونخوار لہجے میں سرگوشی کی۔ "جلدی بتا ورنہ گردن کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

"وہ اندھیرا ہوتے ہی شیطانوں کے شہر کی طرف چلے گئے" ملازم نے گھٹی ہوئی کانپتی آواز میں کہا۔

"کیا وہ تنہا تھے؟"

"نہیں......ایک گنجا پجاری ان کے ساتھ تھا وہ اپنے ہتھیار بھی ساتھ لے گئے ہیں۔"

"وہ کس لئے شہر گئے ہیں۔"

"میں قسم کھاتا ہوں مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو ورنہ جان سے مار دوں گا۔"

کامران نے دھمکی دی۔ دوسرے ہی لمحے کمر سے خنجر نکال کر اس نے کامران پر حملہ کر دیا لیکن

کامران نے بڑے اطمینان سے اس کے وار سے بچتے ہوئے جھپٹ کر اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی اپنی فولادی گرفت میں لے کر اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ گردن چٹاخ سے ٹوٹ گئی بے جان جسم کو ایک جانب پھینک کر وہ پھرتی سے جھاڑیوں کی آڑ میں ہو گیا اسی وقت غار کے دہانے پر ایک سایہ نمودار ہوا آنے والے ملازم نے ڈرتے ڈرتے اپنے ساتھی کو آواز دی اور تاریکی میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے دوسرے ساتھیوں کو آواز دی رائفلیں ہاتھ میں لئے ہوئے وہ باہر نکلے اور ہر سمت دیکھنے لگے اچانک ان کی نظر اپنے ساتھی کی لاش پر پڑی وہ لاش پر جھک کر خوف زدہ لہجے میں باتیں کرنے لگے۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ شیطانی جگہ ہے" ایک نے کہا۔

"انہوں نے آخر کار ہمارے ساتھی کی جان لے لی۔"

"وہ ہمیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے" دوسرے نے کہا۔

"یہ حرکت انہی شیطانی پجاریوں کی ہے" تیسرے نے کہا۔

"وہ صاحب لوگ کو بھی مار ڈالیں گے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" پہلے نے کہا۔

"جانوروں پر سامان لدا ہوا ہے آؤ ہم فوراً یہاں سے بھاگ چلیں"

ذرا دیر بعد ہی وہ جانوروں پر لدے ہوئے ساز و سامان کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گئے کامران اپنی خوش قسمتی پر مسکرا رہا تھا۔

کامران کی نگاہیں شہر کی روشنیوں پر مرکوز تھیں وہ ان لوگوں کے خفیہ ٹھکانے سے نکل کر چلتا ہوا شہر کی فصیل کے سامنے پہنچ گیا تھا اور اندر داخلے والے بڑے پھاٹک کی طرف دیکھ رہا تھا ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی اور وہ گھنے درختوں میں چھپا ہوا تھا اس لئے دیکھے جانے کا خدشہ نہ تھا شہر میں داخلے کا بڑا پھاٹک کھلا ہوا تھا مسلح پہرے دار نگرانی کے لئے مستعد کھڑے تھے کامران سوچ رہا تھا کہ شہر پر کسی حملے کا خطرہ بہ ظاہر نہیں تھا پھر مسلح پہرے داروں کی موجودگی کا سبب کیا ہو سکتا تھا اس علاقے کے مسلمان قبائل' شہر کو کافروں کا شیطانی شہر کہتے تھے اور ادھر کا رخ نہیں کرتے تھے اسے یقین تھا کہ ایلوس اور ہارڈی اس وقت شہر میں کسی جگہ موجود تھے انہیں غار میں واپس بھی آنا تھا لیکن وہ کس مقصد کے لئے شہر گئے تھے یہ اسے نہیں معلوم تھا البتہ اندازہ ضرور تھا انتظام کا جنون اس پر سوار تھا اس لئے وہ ہر قیمت پر فصیل کے اندر جانا چاہتا تھا وہ ابھی تاریکی میں کھڑا اندر داخل ہونے کی ترکیب سوچ رہا تھا کہ مویشیوں کا ایک ریوڑ آتا ہوا نظر آیا۔

فوراً ہی ایک خیال اس کے ذہن میں آیا اور وہ جلدی سے اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے مویشیوں کے ریوڑ کو گزرنا تھا۔ ذرا دیر بعد سامان سے لدا ہوا خچروں کا ایک قافلہ آتا نظر آیا جس کے آگے اور پیچھے بہت سے لوگ چل رہے تھے تاریکی کے باوجود ان کے پاس مشعلیں نہیں تھیں۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ راستے سے بہ خوبی واقف ہیں۔ کامران نے پہچان لیا کہ وہ شہر کے باشندے تھے جنہوں نے لمبی عبائیں اور گول ٹوپیاں پہن رکھی تھی موڑ پر واقع ایک چٹان کی آڑ میں کھڑا وہ منتظر رہا حتیٰ کہ خچروں کی قطار گزر گئی اس

کے پیچھے چلنے والے اس کے قریب سے گزرے تو ان کے لباس کی بو اس کی ناک سے ٹکرائی۔

کامران انتظار کر رہا تھا جب آخری آدمی اس کے قریب سے گزرنے لگا تو اس نے جھپٹ کر اپنی کلائی سے اس کی گردن دبوچ لی اور گھسیٹتا ہوا چٹان کی آڑ میں لے آیا دوسرے ہی لمحے ایک فولادی مکا اس کے جبڑے پر رسید کیا جو بے ہوش کر دینے کے لئے کافی تھا اس نے پھرتی کے ساتھ بے ہوش آدمی کا لباس اتار کر خود پہن لیا۔ اس کی کمر سے لگا ہوا پستول اور خنجر اپنی کمر میں لگایا اور آڑ سے باہر نکلا۔ تیز تیز قدم چلتا ہوا وہ خچروں کے ساتھ جانے والے لوگوں کی سمت بڑھا جو شہر کے پھاٹک پر پہنچ چکے تھے وہ دانستہ ان لوگوں کے پیچھے چل رہا تھا۔

وہ پھاٹک سے گزرے تو کسی نے کامران کی طرف توجہ نہ دی۔ شہر کے اندر داخل ہو کر وہ سڑک کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ لباس کے لحاظ سے وہ بھیڑوں کا چرواہا لگ رہا تھا۔ شہر کی روشن اور بارونق سڑکوں سے بہ خوبی واقف تھا یہ شہر ہمالیہ کی ترائی کی ایک پرانی بستی تھی یہاں کے باشندے مقامی اور منگول قوم کی مشترکہ تہذیب کے وارث تھے روایت کے مطابق منگولوں کے دور میں کافر قبیلے کا ایک گروہ یہاں آ کر آباد ہو گیا تھا وہ شیطان کی پوجا کرتے تھے۔ مقامی بدھ راہبوں اور ان کافروں کے درمیان شروع میں بڑی کشیدگی رہی لیکن کافروں نے اپنی چالاکی کے ذریعے مقامی آبادی کو بہت جلد زیر اثر کر لیا۔

وہ لوگ جادو ٹونے کے ماہر تھے جس کی بناء پر مقامی لوگ ان سے ڈرتے تھے اب شہر میں ملی جلی آبادی تھی کامران نے بدھ راہبوں کو بازار میں گھومتے دیکھا جن کے سر گنجے تھے لیکن شکل و صورت سے وہ تبتی نہ لگتے تھے ان کا چہرہ اور خدوخال منگولوں سے زیادہ مشابہ تھے۔ درحقیقت اب یہ لوگ بدھ مذہب کے پجاری بھی نہ تھے راہبوں کا قدیم لباس انہوں نے اپنا لیا تھا لیکن خانقاہ اب بدھ کے بجائے شیطان کی پوجا کا مرکز بن گئی تھی اور انہوں نے خانقاہ کی عمارت کو بھی تبدیل کر کے مندر کی طرح بنا لیا تھا۔

کامران نے وقت ضائع نہیں کیا۔ بلکہ وہ تیز تیز چلتا ہوا اس پرانی خانقاہ کے پاس پہنچا جو شہر سے کافی بلند پر پہاڑی کے ایک جانب واقع تھی اس خانقاہ تک پہاڑی کے کسی اور جانب سے پہنچنا ممکن نہیں تھا کیونکہ یہ شہر میں پہاڑی پر واقع تھا اس کی ڈھلوانیں سپاٹ دیواروں کی طرح تھیں یہ شہر کسی ناقابل تسخیر قلعہ کی مانند بنا ہوا تھا خانقاہ کی سڑھیاں تقریباً سو فٹ چوڑی تھیں کامران کسی بوڑھے پجاری کی طرح آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچا خانقاہ کا کشادہ پھاٹک کھلا ہوا تھا اور وہاں داخلے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ کامران نے اپنے جوتے اتار دیئے اور ننگے پاؤں اندر داخل ہوا ایک بہت وسیع اور کشادہ ہال سامنے تھا۔ جس میں جلتی ہوئی مشعلوں کی مدھم روشنی میں ہر سمت نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ گنجے پجاری خاموشی کے ساتھ ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ کسی نے اس کی سمت توجہ نہ کی مندر میں دور دور سے بہت سے پجاری آتے تھے جو پردے میں چھپے ہوئے ارزک کے بڑے بت کو تعظیم دیتے اس لئے کامران کی وہاں موجودگی کوئی غیر معمولی بات نہ تھی اسے جب یہ اطمینان ہو گیا کہ کوئی اسے دیکھ نہیں رہا تھا تو وہ پھرتی سے ایک سمت نظر آتے ہوئے دروازے میں داخل ہو گیا جس پر ملمع کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ ایک تنگ گلی نما راستے سے ہوتا ہوا وہ دوسرے ہال میں پہنچا۔ جو بالکل تاریک تھا وہ ٹٹولتا ہوا ایک زینے تک پہنچا اور احتیاط کے ساتھ سیڑھیاں طے کر کے ایک

غلام گردش میں پہنچا جو نیم تاریک تھی دریچوں کے پیچھے جلتے ہوئے چراغوں کی روشنی جالیوں سے آ رہی تھی۔

یہ چراغ ان کوٹھریوں میں جل رہے تھے جو پجاریوں کے آرام کرنے کے لئے بنی تھیں یا جہاں پر وہ طویل عرصے کے لئے مراقبہ کیا کرتے تھے تاکہ اپنی روحانی اور ساحرانہ قوتوں کو توانا بنا سکیں۔ اس غلام گردش کے آخر میں ایک اور زینہ تھا کامران اس پر چڑھتا ہوا زینے کے موڑ تک پہنچ گیا یہاں وہ ایک لمحے کے لئے ٹھہر گیا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ زینے کے اختتام پر ایک مسلح پہرے دار موجود ہوگا اسے یہ بھی معلوم تھا کہ عموماً وہ اونگھتا سوتا رہتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں تھا کہ وہ اس وقت بھی سو رہا ہو اس لئے کامران بڑی خاموشی اور احتیاط سے ایک ایک سیڑھی چڑھ کر اوپر پہنچا پہرے دار موجود تھا اس کا دیو قامت اور نیم عریاں جسم کسی گینڈے کی مانند مضبوط تھا وہ گونگا تھا۔ اس کا تیز دھار تیغہ پیروں پر رکھا ہوا تھا اور وہ دیوار کا سہارا لئے بے خبر سو رہا تھا۔

کامران ایک لمحے کے لئے سانس روکے کھڑا رہا...... پھر دبے پاؤں چلتا ہوا پہرے دار کے قریب سے گزر گیا اب وہ ایک بالائی غلام گردش میں تھا جس میں تانبے کے بنے ہوئے لیمپ جگہ جگہ لٹک رہے تھے وہ روشن شمعوں کی ہلکی روشنی میں بڑھتا ہوا ایک محراب دار دروازے کے قریب پہنچا چند لمحے وہ کان لگا کر آہٹ سنتا رہا پھر آہستہ سے دروازے پر تین بار دستک دی۔ چند لمحے خاموشی رہی کامران دم بہ خود کھڑا تھا پھر کسی کے قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی اور دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا سامنے کھڑی ہوئی حسینہ کے حسن و جمال میں ایسا جادو تھا جو کسی شخص کو مبہوت کر دیتا۔ ہلکی روشنی میں اس کا خوب صورت اور سڈول جسم کسی مرمریں مجسمے کی طرح دمک رہا تھا اس کے آتشیں شباب میں ایک ساحرانہ کشش تھی باریک ریشمی لباس اس کی دل کشی کو چھپانے کے بجائے اور نمایاں کر رہا تھا بیش قیمت ہیرے اور جواہرات کی چمک اس کے حسن و شباب کی آب و تاب کے سامنے ماند نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لئے اسے غور سے دیکھتی رہی اور پھر فوراً ہی پہچان لیا۔

''کامران۔'' اس نے خوشی سے بے تاب ہوتے ہوئے کہا۔

''اوہ کامران! مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گے۔''

لیکن کامران نے اس کی وارفتگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اندر داخل ہو کر جلدی سے دروازہ بند کر دیا اس نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا تھا کہ کمرے میں کوئی اور موجود نہیں تھا کمرے کے فرش پر بچھا ہوا دبیز قالین اتنا ملائم تھا کہ پیر دھنس رہے تھے ہر چیز کی سجاوٹ شاہانہ تھی۔ مخملی پردے چاروں سمت لٹک رہے تھے۔ چھت اور دیواروں پر لگے ہوئے جھاڑ اور فانوس کسی شاہی محل سے کم نہ تھے۔ خانقاہ کے بیرونی حصوں کی سادگی کے بعد اس کمرے میں داخل ہو کر یہ محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خوابوں کی دنیا میں آ گیا ہو۔

''تم کو یہ کیسے معلوم تھا کہ میں ضرور آؤں گا شردھا؟''

کامران نے پوچھا۔

''تم نے ضرورت کے وقت کسی دوست کو مایوس نہیں کیا ہے۔''

''اور کس کو میری ضرورت ہے۔''

”مجھے۔“

”لیکن تم تو یہاں کی حکمران ہو لوگ دیوی سمجھ کر تمہاری پوجا کرتے ہیں“

”میں نے یہ سب کچھ تم کو خط میں لکھ تو دیا تھا۔“

کامران نے اسے حیرت سے دیکھا ”خط! مجھے تمہارا کوئی خط نہیں ملا“ شردھا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ”پھر تم یہاں کیسے آئے؟“

”یہ ایک طویل داستان ہے“ اس نے جواب دیا۔

”پہلے تم مجھے یہ بتلاؤ کہ تمہیں کس چیز کی کمی تھی جو اس منحوس جگہ آ کر پھنس گئیں اور ان شیطانوں کی دیوی بن کر ساری دنیا سے ناتا توڑ لیا اس کے باوجود تم کو میری مدد کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟“

”تمہاری مدد کی اس وقت سے زیادہ ضرورت پہلے کبھی نہ تھی کامران“ شردھا نے اداس لہجے میں کہا اس کے لہجے میں فکر و پریشانی کی جھلک تھی کامران نے محسوس کیا کہ وہ بے حد خوف زدہ ہے پھر شردھا کو فوراً ہی خیال آیا۔

”میں بھی کتنی خود غرض ہوں تم جانے کتنی دور سے سفر کر کے آ رہے ہو اور میں اپنا دکھڑا لے کر بیٹھ گئی۔

”ادھر آؤ“ پہلے آرام سے بیٹھ کر کچھ کھا پی لو“ اس نے دیوان کی سمت اسے گھسیٹتے ہوئے کہا جس کے قریب ایک نیچی سی میز پر سونے کے ظروف میں کھانے کی چیزیں اور پھل رکھے ہوئے تھے کامران نے ذرا بھی تکلف نہ کیا اور دیوان پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگا وہ بہت بھوکا تھا لذیذ کھانوں اور بھنے ہوئے گوشت نے اس کو بڑا لطف دیا۔ شردھا قریب بیٹھی اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔

”میں راج نہیں کر رہی ہوں کامران“ شردھا نے کہا۔

”یہاں آ کر میں نے پناہ لی تھی تبت کے راج محل کی زندگی اب خواب بن کر رہ گئی ہے' بابا کی موت کے بعد میرے بھائیوں نے مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے میری شادی ایک راج کمار سے کر دی وہ آدمی نہیں بھیڑیا تھا اس کے ظلم سے نجات حاصل کرنے کے لئے میں ایک رات فرار ہو کر قبائلی لوگوں کے پاس پہنچ گئی اور انہوں نے مجھے پناہ دی۔ میرے بھائیوں نے مجھے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ راج کمار نے مجھے دوبارہ حاصل کرنے کی بہت کوشش کی۔ پھر مجھے اغوا کرنے کے لئے بدمعاش بھیجے اس نے میرے اغوا کے لئے بھاری رقم کے انعام کا لالچ دیا تھا لیکن میں جن لوگوں کے تحفظ میں تھی ان سے مجھے حاصل کرنے میں راج کمار کامیاب نہ ہو سکا پھر اس نے مجھے قتل کرنے کی سازشیں شروع کر دیں میں جانتی تھی کہ ایک دن وہ اس میں کامیاب ہو جائے گا“ وہ خاموش ہو گئی۔

”پھر کیا ہوا شردھا؟“ کامران نے اس سمت دیکھ کر پوچھا۔

”تم یہاں کیسے پہنچ گئیں؟“

”میں زندگی سے عاجز آ گئی تھی مر جانا چاہتی تھی۔“

سردھا نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میرے بابا شہر کے بارے میں اکثر ذکر کیا کرتے تھے وہ بڑے مذہبی آدمی تھے اس علاقے میں یاترا کے لئے آئے تو بدھ مذہب اختیار کر لیا پھر وہ اس خانقاہ کے بڑے لاما بن گئے بچپن ہی سے میں ان کی باتیں سنتی رہی تھی میں نے سوچا شاید من کی شانتی یہاں مل جائے بابا ہمیشہ کہتے تھے کہ بدھ مت شانتی کا مذہب ہے اس لئے میں اس شہر کے لئے روانہ ہوئی میں یہاں کبھی نہ پہنچتی اگر تم راستے میں نہ ملتے۔“

کامران مسکرانے لگا اسے وہ واقعہ یاد آ گیا جب شردھا سے پہلی ملاقات ہوئی تھی لالچی قبائل نے شردھا کو اغوا کر لیا تھا اور زبردستی اپنے علاقے میں لے جا رہے تھے کامران ان دنوں اس علاقے سے گزر رہا تھا اس نے شردھا کو ان وحشیوں سے رہائی دلا کر اس شہر تک پہنچایا تھا اور اسی وقت اسے پہلی بار یہ شہر دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

”تم جانتے ہو کہ میری یہاں آمد پر بدھ راہب کتنے خوش ہوئے تھے یہاں کے لوگ میرے بابا کو بھولے نہ تھے۔ وہ ان کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور باوجود یہ کہ ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ بابا کسی ریاست کے راجہ تھے اور ان کو اس بات پر دکھ بھی تھا کہ وہ خانقاہ چھوڑ کر چلے گئے' پھر بھی انہوں نے میرا پرجوش خیر مقدم کیا لیکن تم کو اس کا اصل سبب نہیں معلوم تھا اس وقت میں بھی نہیں جانتی تھی راہبوں کو اپنے بزرگوں کی ایک پیش گوئی یاد تھی کہ ایک عورت جس کے سینے پر چاند کا نشان ہوگا' اس شہر میں آئے گی اور وہ ان کی دیوی کا اوتار ہوگی ایک دن میری ملازمہ نے میرے جسم پر نشان دیکھ لیا یہ میرا پیدائشی نشان تھا بابا کہتے تھے میں چاند کی راج کماری ہوں۔ لیکن راہبوں نے یہ جانتے ہی مجھے دیوی کا اوتار قرار دے دیا اور مجھے اس خانقاہ میں دیوی بنا کر بٹھا دیا اور میری پوجا کرنے لگے۔“

”ہاں' میں نے یہ بات سنی تھی میں سمجھا تھا کہ تمہارے حسن نے ان پر جادو کر دیا“ کامران نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہارے جانے کے بعد کچھ دن بڑے آرام سے گزرے میں بھی دیوی بن کر عیش کرتی رہی وہ میری پوجا کرتے رہے شروع میں تو پوجا کی رسمیں بڑی دلچسپ لگتی تھیں کبھی کبھی میں خود کو سچ مچ دیوی سمجھنے لگتی تھی یہ لوگ مجھے پوجتے رہے میرے قدموں پر بھینٹ چڑھاتے رہے وہ اپنی منتیں لے کر آتے اور جواہر قدموں پر ڈھیر کر دیتے۔ کبھی کبھی ان کی مرادیں پوری بھی ہو جاتی تھیں لیکن جلد ہی ان کی حقیقت معلوم ہو گئی یہ خانقاہ بدھ مت کے روحانی علوم کا مرکز نہیں رہی یہ شیطان کے پجاریوں کا اڈہ بن چکی ہے وہ یہاں کے لوگوں کو بے وقوف بنا کر لوٹ رہے ہیں۔ ان پر حکومت کر رہے ہیں اور آہستہ آہستہ شہر کے لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بناتے جا رہے ہیں اب مجھے بھی اس مقصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔“

”کیا یہ بات بدھ راہبوں کو نہیں معلوم؟“

”وہ جانتے ہیں لیکن ان کی تعداد برائے نام رہ گئی ہے باقی سب کو بڑے پجاری گروشر نے اپنا ہم نوا بنا لیا ہے مال و زر دے کر ان کے منہ بند کر دیئے ہیں اور وہ بدھوں کا لباس تو پہنتے ہیں لیکن ہیں شیطان کے پجاری۔ عام لوگ مجھے دیوی کا اوتار مان کر خوش ہیں فصلیں اچھی ہو رہی ہیں۔ خوشحالی آ گئی ہے اس لئے وہ یہ سب دیوی کی برکت تصور کرتے ہیں۔ لیکن دراصل اس ڈھونگ کی آڑ میں گروشر ان پر حکومت کر رہا ہے۔“

”میں نے پہلے ہی تم کو خبردار کیا تھا کہ گروشر مجھے بڑا مکار لگتا ہے“ کامران نے کہا۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا لیکن اس وقت مجھے اندازہ نہ تھا۔ میں یہاں شانتی کی تلاش میں آئی تھی لیکن گروشر نے مجھے اپنے شیطانی چکر میں پھانس لیا اور کامران! وہ بڑا مکار اور ظالم ہے مجھے اس سے خوف آتا ہے وہ مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے یہاں کے لوگ اگر میری پرستش نہ کر رہے ہوتے اگر میری وجہ سے اسے اتنی دولت نہ مل رہی ہوتی تو وہ مجھے اب تک ہلاک کر چکا ہوتا لیکن وہ ڈرتا ہے کہ اس طرح لوگ اس کے خلاف ہو جائیں گے۔"

"تم واقعی مصیبت میں ہو۔"

"مصیبت! میں بدترین قید میں ہوں میں اس زندگی سے نجات چاہتی ہوں یہاں سے ہر قیمت پر فرار ہونا چاہتی ہوں۔"

"تو پھر تم اس جگہ کو چھوڑ کیوں نہیں دیتی؟"

"میں مجبور ہوں فرار کی تمام راہیں بند ہیں۔" شردھا نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

"گروشر نے لوگوں کو یقین دلا دیا ہے کہ دیوی اگر یہاں سے چلی گئی تو تمام برکتیں بھی چلی جائیں گی یہاں ایسی تباہی آئے گی کہ یہاں کوئی باقی نہیں رہے گا اس نے مشہور کر دیا کہ دشمن، دیوی کو اغوا کرنا چاہتے ہیں اس نے یہ سب کچھ اس لئے کیا ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ مال و دولت کا نذرانہ دیتے رہیں اور اب وہ ڈرتا ہے کہ اگر میں یہاں سے فرار ہو گئی تو یہاں کے لوگ اسے زندہ نہ چھوڑیں گے اس لئے اس نے مجھے ہلاک نہیں کیا ورنہ وہ مجھ سے اتنی نفرت کرنے لگا ہے کہ اب تک کبھی کا ٹھکانے لگا چکا ہوتا۔"

"کیا تم اس کی قید میں ہو؟"

"یہاں قید بھی بڑی سخت ہے ہر لمحہ نگرانی ہوتی ہے اسے ڈر ہے کہ میں فرار ہو جاؤں گی اس لئے میں نے تم کو خط لکھا تھا"

"تم بار بار کس خط کا ذکر کر رہی ہو؟"

"ایک تاجر مجھے کچھ تحائف نذر کرنے آیا تھا یہ لوگ کبھی کبھی خرید و فروخت کرنے شہر آتے ہیں تو دیوی کو نذرانے دیتے ہیں اس کے ذریعے میں نے تم کو مدد کے لئے خط لکھا جس میں ساری باتیں تحریر کر دی تھیں میں نے اس کو اپنا مقدس نشان بھی دے دیا تھا یہ سونے کا بنا ہوا ایک چاند ہے جس پر جواہرات جڑے ہوئے ہیں اس نشان کو دیکھ کر سب تنظیم میں جھک جاتے ہیں اس شہر کے باہر کے قبائل بھی اس نشان کی تعظیم کرتے ہیں انہوں نے یہ سن رکھا ہے کہ اس کی بے ادبی کرنے والے پر دیوی کا قہر نازل ہوتا ہے میرا خیال تھا کہ تم اس نشان کی مدد سے بلا کسی دشواری کے یہاں پہنچ جاؤ گے۔"

"مجھے نہ خط ملا ہے اور نہ نشان" کامران نے کہا میں تو یہاں مکار انگریزوں کا تعاقب کرتا آرہا ہوں جنہوں نے میرے وفادار ملازم کو قتل کر دیا وہ مجھے دھوکا دے کر کسی اجنبی علاقے تک لائے اور پھر مجھے تنہا چھوڑ کر فرار ہو گئے اور اس شہر میں ہیں۔"

"سفید فام لوگ اور یہاں؟" شردھا نے حیران ہو کر کہا۔

"ناممکن وہ یہاں تک زندہ نہیں پہنچ سکتے۔"

"مجھے ان کی آمد کا راز معلوم ہو چکا ہے۔" کامران نے کہا کسی طرح تمہارا خط اور وہ مقدس نشان ان کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے تمہارا نشان دکھا کر وہ بحفاظت یہاں تک پہنچ گئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں اغوا کرنے آئے ہیں تاکہ تمہیں راج کمار کے حوالے کر کے دولت حاصل کریں۔"

شردھا اچھل کر بیٹھ گئی اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگی تھیں۔ اس راکھشس کے پاس واپس جانے کے بجائے میں مرنا پسند کروں گی کہاں ہیں یہ دونوں کتے؟ میں ابھی ان کے متعلق لوگوں کو بتا دوں گی شہر کے لوگ ان کی بوٹیاں نوچ لیں گے"۔

"لیکن اس طرح تم بھی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔"

کامران نے کہا۔

"ممکن ہے لوگ ان انگریزوں اور گروشر کو بھی ہلاک کر دیں لیکن تمہارا خط ان کے ہاتھ لگ گیا تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ تم فرار کا منصوبہ بنا رہی ہو وہ تم کو بھی غدار قرار دیں گے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو" شردھا نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"پھر کیا کروں؟"

"تم کو خانقاہ میں چلنے پھرنے کی تو آزادی ہے؟"

"ہاں یہ گنجے پجاری ہر لمحے چھپ کر میری نگرانی کرتے ہیں" شردھا نے کہا "لیکن وہ یہاں نہیں آتے کیونکہ اس جگہ سے باہر جانے کا صرف ایک ہی زینہ ہے۔ جس پر ہر وقت ایک مسلح پہرے دار موجود رہتا ہے۔"

"اور وہ ایسے بے خبر سوتا ہے کہ میں یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا" کامران نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن اگر اسے شبہ ہو گیا کہ تم فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہی ہو تو وہ تم کو کسی کوٹھری میں قید بھی کر سکتے ہیں"

"ہاں کامران میں کیا کروں؟" اس نے التجا کی۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا" ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا میرے ساتھ تقریباً سو جنگجو قبائل ہیں جنہیں میں گھاٹی میں ایک خفیہ جگہ چھوڑ آیا ہوں۔ لیکن فی الحال ان سے کوئی مدد نہیں مل سکتی اور ان کا دیر تک چھپا رہنا ممکن نہیں۔ میں یہاں ایلیوس اور ہارڈی نامی اشخاص کو ڈھونڈنے آیا تھا لیکن یہ کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ پہلے تم کو یہاں سے نکالنا ضروری ہے۔ لیکن جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ گروشر اور وہ دونوں اشخاص ہارڈی اور ایلیوس کہاں ہیں میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ شہر میں کوئی ایسا آدمی ہے۔ جس پر تم بھروسا کر سکو؟"

"یہاں کا ہر شخص میرے لئے جان دے سکتا ہے لیکن وہ مجھے یہاں سے کسی قیمت پر جانے نہیں دے گا۔"

"تم نے کہا تھا کہ نیچے جانے کا واحد راستہ اس زینے سے ہے۔"

"ہاں یہ خانقاہ پہاڑ سے متصل بنائی گئی ہے اور ساری غلام گردشیں اور دالان پہاڑ کاٹ کر بنائے گئے ہیں یہ خانقاہ سب سے بڑی منزل ہے اور صرف میرے لئے مخصوص ہے۔ میرے لئے محل سے گزر کر باہر

جانے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے جہاں ہر وقت سینکڑوں پجاری موجود رہتے ہیں۔ میری صرف ایک وا ملازمہ ہے۔ جو قریب والی کوٹھری میں سو رہی ہے اس نے آج بھی بھنگ پی رکھی ہوگی اور صبح تک مدہوش پڑی رہے گی۔"

"یہ اور بھی بہتر ہے تم اس پستول کو اپنے پاس رکھو اور میرے جانے کے بعد دروازہ اندر سے بند کرلینا جب تک میں نہ آؤں دروازہ کسی کے لئے نہ کھولنا۔"

"لیکن تم کہاں جارہے ہو؟" شردھا نے خوف زدہ لہجے میں سوال کیا۔

"جاسوسی کرنے۔" کامران نے جواب دیا۔ "یہ جاننا ضروری ہے کہ گروشر اور اس کے ساتھی کیا کررہے ہیں۔ اگر میں تم کو ابھی لے کر چلوں تو ممکن ہے ان سے مڈبھیڑ ہوجائے اس طرح سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ اگر میرا خیال درست ہے تو وہ آج ہی رات تم کو اغوا کرکے لے جانے کی کوشش کریں گے اور اگر ایسا ہوا تو ہم ان کو نہیں روکیں گے۔ جب وہ تمہیں لے کر شہر سے باہر نکلیں گے تو ہم قبائلیوں کو ساتھ لے کر تمہیں آزاد کرالیں گے لیکن مجھے یہ منصوبہ پسند نہیں ہے۔ فائرنگ کے تبادلے میں تم کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ میں کوئی اور صورت نکالوں گا اب دروازہ بند کرلو اور میری دستک کا انتظار کرنا۔"

پہرے دار ہنوز خراٹے لے رہا تھا۔ کامران دبے پاؤں ان کے پاس سے گزر گیا۔ وہ نچلی منزل پر پہنچا تو ہر سمت تاریکی چھائی ہوئی تھی اسے معلوم تھا کہ ساری کوٹھریاں خالی ہوں گی کیونکہ تمام پجاری نیچے سوتے تھے وہ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی وہ جلدی سے ایک کوٹھری میں داخل ہوگیا اور انتظار کرنے لگا۔ ذرا دیر بعد ایک پجاری سامنے سے گزرا کامران نے آہستہ سے اسے 'ہشت' کرکے اپنی طرف متوجہ کیا۔

پجاری نے اس کے قریب آکر تاریکی میں جھانکا "کون ہو تم؟"

"گروشر کا غلام ہوں" کامران نے سرگوشی میں کہا۔

"یہاں نگرانی پر مامور ہوں۔ کیا وہ دو اشخاص آگئے جنہیں گروشر نے بلایا تھا۔"

"ہاں گروشر انہیں خفیہ راستے سے لے آئے ہیں تاکہ کسی کو پتا نہ چل سکے۔ لیکن اگر گروشر نے تم کو پہرے پر لگایا ہے تو تم کو معلوم ہوگا کہ چکر کیا ہے۔"

"تم کو کیا معلوم ہے؟"

"گروشر بہت چالاک ہے جب اس تاجر نے گروشر کو شردھا دیوی کا خفیہ خط دکھایا تھا تو گروشر نے اسے خط لے جانے دیا تھا اس سے کہا تھا کہ شردھا دیوی نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کرے ان کا ارادہ تھا کہ جب وہ آدمی جسے شردھا دیوی نے بلایا تھا انہیں لینے آئے گا تو دونوں کو ایک ساتھ ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ تاکہ لوگوں کو یہ بتلایا جاسکے کہ اس نے دیوی کو ہلاک کردیا۔"

"واقعی گروشر بہت چالاک ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے شردھا دیوی اب ان کے لئے خطرہ بن چکی ہے" پجاری نے کہا۔

"پھر یہ دو افراد کیوں آئے ہیں۔"

"تم کو یہ بھی نہیں معلوم؟ شردھا دیوی کا خط لے جانے والے لالچی تاجر نے وہ خط ان دونوں کے ہاتھ بھیج دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ یہاں آکر گروشر سے ملاقات کرلیں وہ لوگ دیوی کو کسی راج کمار کے پاس لے جا کر انعام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

"لیکن اس سے گروشر کو کیا فائدہ حاصل ہوگا؟"

"ان کو دیوی سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو اب جاؤ کسی کو یہ نہ بتلانا کہ میں یہاں پر پہرہ دے رہا ہوں۔"

کامران کا اندیشہ درست نکلا تھا گروشر ایک تیر سے دو شکار کررہا تھا۔ اب شردھا کو ایلوس اور ہارڈی کے ساتھ جانے دینا درست نہیں تھا اگر وہ کسی خفیہ راستے سے نکل گئے تو تلاش ممکن نہ ہوگی اسے فوری طور پر کچھ کرنا ہوگا پجاری ابھی اس کے پاس کھڑا باتیں کررہا تھا کہ کامران نے ایک مدھم سی روشنی کو اس طرف بڑھتے دیکھا اس کے ساتھ ساتھ تیز قدموں کی چاپ بھی سنائی دی وہ کوٹھری کے اور اندر ہوگیا ذرا دیر بعد ایک دوسرا پجاری قریب آیا اس نے سرپوش سے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا پہلے پجاری کو اس نے دیکھ کر کہا۔

"تم یہاں کھڑے کیا کررہے ہو؟ گروشر ان سفید فاموں کو لے کر شردھا دیوی کے کمرے میں گئے ہیں دیوی کی ملازمہ نے ابھی آکر خبر دی ہے کہ کامران شہر میں داخل ہوچکا ہے اور کچھ دیر پہلے دیوی کے کمرے میں تھا اس کے جاتے ہی وہ یہ خبر دینے آئی تھی گروشر بہت خوف زدہ تھے وہ کہہ رہے تھے یہ کامران بہت خطرناک ہے ہم سب اس کو تلاش کررہے ہیں تم میرے ساتھ آؤ اور تم بھی۔"

اچانک اس نے لیمپ بلند کیا جس کی روشنی کامران کے چہرے پر پڑی جو کوٹھری کے اندر تھا پجاری نے اس کا پجاریوں کے بجائے چرواہے کا لباس دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ منہ کھولتا' کامران کا بھرپور مکا اس کے جبڑے پر پڑا وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح نیچے گرا لیمپ گرنے کی آواز کے ساتھ ہی کامران نے دوسرے پجاری پر جست لگائی۔ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرائے تاریکی میں صرف ایک مرتبہ ہلکی سی آواز ابھری لیکن پھر حلق میں گھٹ کر رہ گئی دوسرا پجاری طاقت ور تھا کئی مرتبہ وہ کامران کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔

لیکن آخر کار کامران نے اس کا سر اتنی زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا کہ وہ بے حس ہوگیا دوسرے ہی لمحے کامران پوری رفتار کے ساتھ سیڑھیوں کی سمت بھاگ رہا تھا اسے معلوم تھا کہ اس دوران کوئی اوپر نہیں گیا ہے شردھا نے کہا تھا کہ اوپر جانے کا یہ واحد راستہ ہے اس کے باوجود اس پجاری نے کہا تھا کہ گروشر ان دو اشخاص کو لے کر دیوی کے کمرے میں گیا ہے اور یہ کہ شردھا کی غدار ملازمہ نے جاسوسی کرکے اس کی موجودگی کا راز فاش کردیا ہے۔

وہ بے تحاشا بھاگتا ہوا سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر پہنچا پہرے دار اب بھی دیوار سے ٹکا ہوا تھا لیکن اب وہ کبھی بے دار نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کی پشت میں ایک خنجر دستے تک گھسا ہوا تھا کامران کو حیرت ہوئی کہ گروشر نے اپنے ہی آدمی کو کیوں ہلاک کردیا لیکن سوچنے کا موقع نہ تھا اسے خدشہ تھا کہ یہاں پہنچنے میں دیر ہوچکی تھی اس نے دروازے کو دھکا دیا دروازہ کھلا ہوا تھا اور شردھا کمرے میں موجود نہ تھی کمرے میں کشن

بکھرے ہوئے تھے کامران دم بہ خود کھڑا رہا۔ روشنی میں اس کی تیز دھار تلوار چمک رہی تھی غصے میں اس کی آنکھیں قہر بار ہو رہی تھیں وہ کمرے میں ہر سمت کا جائزہ لیتی رہیں پھر دیوار پر پڑے ہوئے پردے پر ایک جگہ مرکوز ہو گئیں اگلے ہی لمحے وہ باہر جانے کے لئے دروازے کی سمت مڑا لیکن دو قدم چل کر بجلی کی سی پھرتی سے مڑا اس کی تلوار اچانک پردے پر جا پڑی وہ اتنی پھرتی کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا کہ پردے کے پیچھے کھڑے ہوئے شخص کو بچنے کا موقع نہ مل سکا کامران کی خون آلود تلوار کے ہٹتے ہی وہ پردے کے ساتھ فرش پر گرا اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر تھا لیکن اب اسے استعمال کرنے کی سکت اس میں باقی نہ رہی تھی۔

''شردھا کہاں ہے؟'' کامران اپنی تلوار کی نوک زخمی پجاری کے سینے پر رکھتا ہوا دھاڑا'' جلدی بتاؤ ورنہ سر اڑا دوں گا۔''

فرش پر گرے ہوئے گنجے پجاری نے جواب نہیں دیا۔ اس کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں اسی عالم میں وہ مر گیا وہ گونگا تھا۔ کامران دیوار کی سمت لپکا اور پردوں کو کھینچ کر ہٹانے لگا اسے یقین تھا کہ ان کے پیچھے دیوار میں کوئی خفیہ راستہ ضرور موجود تھا لیکن دیواریں بالکل سپاٹ نظر آ رہی تھیں کسی خفیہ دروازے کا سراغ نہ مل سکا اور خفیہ راستے معلوم کئے بغیر وہ شردھا کو اغوا کرنے والوں کا تعاقب نہ کر سکتا تھا غصے اور پریشانی کے عالم میں اس کا جسم پسینے سے تر ہو گیا اچانک اسے اپنے لباس کا خیال آیا۔ اس لباس میں وہ فوراً پہچان لیا جائے گا بے ہوش پڑے پجاری کا لباس کارآمد ثابت ہو سکتا تھا وہ پھرتی سے شردھا کے کمرے سے باہر نکلا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے پہنچا لیکن اچانک اس کے قدم رک گئے وہاں ہر سمت روشنیاں حرکت کرتی نظر آ رہی تھیں ان گنت پجاری لیمپ ہاتھ میں لئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے اور سیڑھیوں کے نیچے ہال میں مشعلیں لئے پجاریوں کا ایک ہجوم کھڑا ہوا تھا۔

ان کے ہاتھ میں رائفلیں اور ننگی تلواریں تھیں اسے دیکھتے ہی بیک وقت کئی پجاری چلائے اسی لمحے اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی جو دیوار سے لگی کھڑی تھی اس نے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی کے ساتھ ایک رسی پکڑ رکھی تھی جو دیوار پر لٹک رہی تھی۔ کامران نے جیسے ہی قدم بڑھایا لڑکی نے زور سے رسی کو جھٹکا دیا کامران کو زمین پیروں کے نیچے سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بیک وقت کئی فائر ہوئے پجاریوں نے ایک فاتحانہ نعرہ بلند کیا۔

♥ ...... ♥ ...... ♥

کامران کے جانے کے بعد شردھا نے دروازے کو مضبوطی سے بند کیا اور پھر دیوان پر دراز ہو کر سوچنے لگی کامران کا دیا ہوا پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ ماضی کے ان رنگین لمحات کے تصور میں کھوئی ہوئی تھی جن میں اس کی ملاقات کامران سے پہلے ہوئی تھی۔ وہ ایک راج کماری تھی ایک راجہ کی بیوی تھی۔ ان گنت لوگوں نے اس کی بارگاہ حسن میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کامران وہ پہلا شخص تھا جس نے اس پر فتح پائی تھی۔ جس کے بے باک اور کرخت رویے سے وہ متاثر ہوئی تھی اس نے پستول ایک سمت ڈال دیا اور تکیے کے سہارے لیٹ کر سوچنے لگی کیسا بہادر اور جی دار تھا یہ شخص کسی خطرے سے نہ ڈرتا تھا وہ اسے

رہا۔ وہ اس وقت چونکی جب دیوار پر ٹنگا ہوا ریشمی پردہ اچانک ہٹا اب تک وہ یہی سمجھتی تھی کہ کمرے کی دیواریں ٹھوس ہیں اور کمرے میں داخل ہونے کے لئے دروازے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ لیکن ایک لمحے کو وہ دم بہ خود رہ گئی۔

پردہ ہٹا کر سامنے آنے والا شخص کسی دیو کی طرح مضبوط تھا۔ گنجا سر اور لانبے کان منگولوں کی طرح ترچھی آنکھیں اور چہرے سے نفرت اور بربریت ٹپک رہی تھی وہ اتنا بھیانک تھا کہ شردھا خوف سے بالکل بے حس ہو کر رہ گئی دیوار کا ایک حصہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا اور اس خفیہ دروازے سے نمودار ہونے والا شخص دونوں ہاتھ پھیلائے اس کی جانب بڑھ رہا تھا اس کے پیچھے دو سفید فام شخص کھڑے للچائی نظروں سے اسے گھور رہے تھے شردھا اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اچانک وہ بستر پر پڑے ہوئے پستول کی طرف جھپٹی۔ لیکن یہ دیو قامت بلا کا پھرتیلا تھا بجلی کی طرح جست لگا کر اس نے شردھا کو اپنی گرفت میں لے لیا شردھا نے خود کو آزاد کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس کی فولادی گرفت میں تڑپ کر رہ گئی اس نے چیخنے کے لئے منہ کھولا لیکن اس وحشی نے اس کا منہ دبا دیا اور اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

''جلدی کرو اس کے ہاتھ پیر باندھ کر منہ بند کرو'' ایک سفید فام نے آہستہ سے کہا ذرا دیر میں شردھا بے بسی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ باہر اس کا گونگا پہرے دار ہوگا اسے بھی ٹھکانے لگا دو۔''

سفید فام نے کہا۔

گنجے منگول نے گردن ہلائی اور کمرے سے تیز دھار خنجر نکال کر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا ذرا دیر بعد وہ مسکراتا ہوا واپس آیا اور شردھا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''احمق لڑکی'' دیو قامت گروشر نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''تو خود کو چالاک سمجھتی تھی تجھے تو نہ اس خفیہ دروازے کا پتا تھا نہ اس بات کا کہ تیری ملازمہ مجھے ایک ایک لمحے کے حالات سے باخبر رکھتی تھی تو نے کامران کو یہاں بلا کر سمجھا تھا کہ میرے چنگل سے نکل جائے گی اب دیکھا کیا ہوا! تیری مدد کرنے والا وہ احمق کامران اب تک جہنم رسید ہو چکا ہوگا۔'' اس نے شردھا پر جھکتے ہوئے کہا اور ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔

ہم اس کی لاش لوگوں کو دکھا کر یہ کہیں گے کہ اس غدار نے تجھ کو فرار کرا دیا اور یہ دونوں صاحب لوگ تجھے تیرے پتی کے پاس پہنچا دیں گے کیسا رہے گا میری دیوی؟''

''گروشر وقت برباد نہ کرو'' ایلوس نے کہا۔

''تم کو یقین ہے کہ پہاڑیوں کے درمیان پہنچنے کے بعد کوئی خطرہ نہ رہے گا؟''

''گروشر اس لڑکی کی طرح بے وقوف نہیں ہے'' گروشر نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

''اس خفیہ راستے کا علم کسی کو نہیں ہے۔''

''تو پھر چلو جب تک کامران کے مرنے کی تصدیق نہ ہو جائے یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔''

گروشر نے شردھا کو اپنے کاندھے پر ڈالا اور وہ خفیہ دروازے میں داخل ہوگئے ان کے جاتے ہی دروازہ بند ہوگیا دیوار کے دونوں حصے برابر ہوگئے وہ ایک تنگ ڈھلوان رستے پر چلنے لگے جو نیچے کی سمت جاتا تھا کچھ دیر بعد وہ ایک زینے پر پہنچ گئے جو پہاڑ کی چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا تھا زینے کے خاتمے پر وہ ایک تنگ سرنگ میں داخل ہوئے اور آخر کار ایک ایسی جگہ آ کر رک گئے جہاں سامنے دیوار تھی گروشر نے اپنا بوجھ ایلوس کے کاندھوں پر منتقل کیا اور دیوار کو دھکا دیا۔ چٹان گھوم کر ہٹی تو ایک اور خفیہ دروازہ نمودار ہوگیا جس کے گرد جنگلی بیلوں کی گھنی باڑھ تھی۔

گروشر نے لیمپ بجھا دیا اور وہ ایک غار میں داخل ہوئے اس سے گزر کر وہ کھلے آسمان کے نیچے پہنچ گئے شردھا نے دیکھا کہ غار کے سامنے بہنے والے چشمے کے کنارے گھنی جھاڑیاں تھیں جنھوں نے غار کے دہانے کو چھپا رکھا تھا۔ چشمہ پار کر کے وہ درختوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے تو داہنی جانب کچھ فاصلے پر شردھا کو روشنیوں کی جھلک نظر آئی اور شہر کی آبادی سے دور بائیں طرف بلند پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔

آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کی روشنی میں گروشر اور اس کے ساتھی آگے بڑھنے لگے ان کا رخ مغرب کی سمت والی چوٹی کی سمت تھا جو کچھ فاصلے پر نظر آرہی تھی یہ فاصلہ انہوں نے بڑی خاموشی سے طے کیا گروشر کی طرح دونوں سفید فام بھی بڑی احتیاط سے چل رہے تھے اور گھبرائے ہوئے لگتے تھے ان کو خوف تھا کہ اگر شہر کے باشندوں کو خبر ہوگئی کہ ان کی دیوی کو اغوا کر کے لے جایا جارہا ہے تو وہ انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ گروشر سب سے زیادہ خائف نظر آرہا تھا۔ اس نے ایلوس اور ہارڈی کی آمد کی خبر لانے والے چرواہے کو قتل کر دیا تھا شہر کے باشندوں نے دیوی کی حفاظت کے لئے جس گونگے پہرے دار کو مقرر کیا تھا اسے بھی ٹھکانے لگا دیا گیا تھا اور امید تھی کہ اس کے آلہ کار پجاریوں نے اس کا کام بھی تمام کر دیا ہے لیکن اگر کامران کسی طرح بچ گیا تو پھر ان کی خیر نہ تھی۔

''اور تیز چلو......اور تیز چلو......'' اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''کامران کا تو کام تمام ہو چکا ہوگا نا''

''ہاں...... ہاں۔'' گروشر نے کہا ''لیکن تم لوگ جتنی جلدی یہاں سے نکل جاؤ بہتر ہے'' وہ خاموشی کے ساتھ خاموش راستے پر چلتے رہے اور پھر ڈھلوان سے اتر کر ایک اور پگڈنڈی پر چلنے لگے وہ تینوں بری طرح ہانپ رہے تھے۔

لو ہم غار کے پاس پہنچ گئے'' ایلوس نے کہا ''ادھر دائیں سمت چلو یہ رہا اس کا دہانہ وہ تینوں غار کے دہانے کی سمت بڑھے۔ دہانے پر لٹکی ہوئی بیلوں کو ہٹا کر ایلوس نے آواز دی لیکن کوئی جواب نہ ملا اس نے گروشر کی طرف دیکھا۔

''اسے یہیں پر ڈال دو'' اس نے شردھا کی سمت اشارہ کیا۔

''میں اندر جا کر ملازموں کو بلاتا ہوں انہوں نے سامان لاد کر گھوڑے تیار کر رکھے ہوں گے ہم فوراً ہی اس منحوس جگہ سے فرار ہو جائیں گے'' اس نے پھر آواز دی لیکن کوئی جواب نہ ملا تو وہ تیزی کے ساتھ غار میں داخل ہوا۔

''کہاں مر گئے تم سب'' وہ غصے میں چلایا دوسرے ہی لمحے اس نے خوف زدہ لہجے میں چیخ کر آواز دی۔

''ہارڈی جلدی آؤ غضب ہوگیا۔''

♥ ...... ♥ ...... ♥

کامران کو ایسا لگا جیسے وہ جہنم کی تاریکیوں میں گرتا چلا جارہا ہے اس نے ہر سمت ہاتھ پیر مارے لیکن کوئی سہارا نہ مل سکا اور پھر اچانک وہ ٹھوس پتھریلے فرش پر جا گرا اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہڈیاں سلامت نہ رہتیں لیکن وہ کوئی اور نہیں کامران تھا۔ اس کے باوجود اتنی اوپر سے گرنے کی بناء پر اس کا جسم جھنجھنا اٹھا تھا ایک لمحے تک وہ ساکت پڑا رہا اس کو کچھ اندازہ نہ تھا کہ وہ کہاں پھنس گیا اسے اپنی حماقت پر سخت غصہ آرہا تھا حواس بحال ہوئے تو وہ آہستہ سے اٹھا خوش قسمتی سے اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی وہ آہستہ سے اٹھا اس نے ٹٹول کر اپنی تلوار تلاش کی جو ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی تھی اور جس خفیہ راستے سے وہ گرا تھا وہ بند ہو چکا تھا اسے کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں تھا۔ ذرا دیر کی کوشش کے بعد اسے تلوار مل گئی۔ ہر سمت گہری تاریکی تھی اور اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا اسے یقین تھا کہ وہ کسی گہرے تہ خانے یا غار میں گرا تھا اور اس کے دشمنوں کو اس کی موت کا یقین ہو چکا تھا وہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ ایک چوکور تہ خانہ تھا اس میں صرف ایک دروازہ تھا جو باہر سے بند تھا۔

وہ ابھی دروازے کو ٹٹول ہی رہا تھا کہ آہٹ سنائی دی وہ ساکت کھڑا ہوگیا کوئی باہر سے دروازے کو ٹٹول رہا تھا کامران جلدی سے ایک سمت ہٹ گیا شاید وہ اس کی لاش دیکھنے اندر آرہے تھے ان کو یقین ہوگا کہ کامران مر چکا ہے۔ اس کا دل زور زور سے اچھلنے لگا تلوار کے قبضے پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا۔ اچانک ہی روشنی سے کامران کی آنکھیں چکا چوند ہوگئیں ایک شخص لیمپ ہاتھ میں لے اندر داخل ہوا کامران نے پھرتی کے ساتھ وار کیا۔ اور لپک کر لیمپ تھام لیا۔ اس کے قدموں میں ایک گنجے پجاری کی لاش پڑی تھی۔

دروازے کے باہر ایک طویل راستہ نظر آرہا تھا وہ پھرتی کے ساتھ باہر نکلا۔ پتلا سا سرنگ نما راستہ نیچے چلا گیا تھا وہ ڈھلوان راستے پر چلتا ہوا آگے بڑھا۔ بلندی پر جانے سے خدشہ یہ تھا کہ وہ پھر دشمنوں کے نرغے میں نہ پہنچ جائے وہ بڑی احتیاط کے ساتھ ڈھلوان راستے پر نیچے جارہا تھا ذرا سی آہٹ دشمنوں کو خبردار کر سکتی تھی اس کے دشمنوں کو شاید یقین آچکا تھا کہ اس کا جسم زخموں سے چھلنی ہو کر اس تہ خانے میں پڑا ہوا ہوگا اور یہ واحد پجاری شاید اس بات کی تصدیق کرنے آیا تھا اس کو ذرا بھی شبہ ہوتا کہ وہ زندہ بچ گیا تھا تو یہ پجاری تنہا نہ آتا۔ ڈھلوان راستہ اچانک داہنی جانب مڑ گیا یہاں دیوار کے ساتھ جلتی ہوئی مشعلیں لگی ہوئی تھیں۔ کامران نے لیمپ بجھا کر زمین پر رکھا اور ایک مشعل نکال کر ہاتھ میں لے لی یہاں سے ڈھلوان اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ قدم جمانا مشکل تھا احتیاط کے باوجود تقریباً لڑکھڑاتا ہوا نیچے اترنے لگا یہاں تک کہ ہموار فرش پر پہنچ گیا لیکن آگے راستہ بند تھا اور ایک ٹھوس دیوار درمیان میں حائل تھی کامران کو یقین ہوگیا کہ وہ

پہاڑ کے اس زمین دوز حصے میں کھڑا تھا جس پر خانقاہ کی عمارت واقع تھی پھر اچانک اسے خیال آیا کہ اور تہہ خانوں کا علم راہبوں کے علاوہ کسی اور کو نہ ہوگا اور شردھا ان کے وجود سے لاعلم تھی شردھا کی یاد آتے ہی اس کے دل میں کسک سی ہوئی۔ جانے غریب کس حال میں ہوگی۔ کامران اس کو یہاں نکال کر لے جانے کا وعدہ کر کے آیا تھا اور خود پھنس کر رہ گیا تھا غصے میں اس نے پتھر کی دیوار پر لات ماری اور دم بخود رہ گیا۔

دیوار میں اچانک ہی راستہ نمودار ہوگیا تھا ایک حصہ بغیر کسی آواز کے گھوم کر دروازے کی سمت کھل گیا تھا۔ تازہ ہوا کا سرد جھونکا چہرے سے ٹکرایا روشنی میں اس کو ایک کشادہ غار نظر آیا خوشی سے اس کا دل اچھل پڑا۔ غار کے اندر داخل ہو کر جیسے ہی وہ آگے بڑھا اسے دہانہ نظر آ گیا اس نے جلدی سے مشعل بجھا دی اور کچھ دیر کھڑا رہا تاکہ آنکھیں تاریکی کی عادی ہو جائیں ذرا دیر بعد وہ آگے بڑھا اور غار سے باہر نکل آیا۔

آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں نے آزادی کا احساس دلایا وہ بے پایاں مسرت کے ساتھ آگے بڑھا لیکن ایک دم رک گیا پانی میں چلنے والوں کے قدموں کی چھپاک چھپاک کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی کامران پھرتی کے ساتھ جھاڑیوں کی آڑ میں ہوگیا اگلے ہی لمحے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز قریب آئی اور پھر ہانپتا ہوا ایک بدشکل پجاری آگے بڑھا یہ گروشر تھا دوسرے ہی لمحے کامران نے جست لگائی اور گروشر کو ساتھ لئے زمین پر گرا اس نے پھرتی کے ساتھ تلوار اس کی گردن میں رکھی اور سینے پر سوار ہوگیا۔

''تت......تت......تت' تم......'' گروشر کے حلق سے دہشت زدہ آواز نکلی۔

''تم زندہ ہو؟''

''نہیں' یہ میرا بھوت تم پر سوار ہے'' کامران نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''جلدی بتاؤ کہ شردھا کہاں ہے ورنہ گردن جسم سے الگ کردوں گا۔''

'' تم کامران ہو؟'' گروشر نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''شیطان کے بچے بتاتا ہے یا......''

''بتاتا ہوں......ابھی بتاتا ہوں'' گروشر نے کانپ کر کہا۔

''وہ ان لوگوں کے قبضے میں ہے یعنی ایلوس اور ہارڈی کے۔''

''کہاں ہیں وہ دونوں؟''

''مم......مم مجھے نہیں معلوم وہ اسے لے کر چلے گئے ہیں'' کامران نے تلوار پر زور ڈالا۔

''تو تجھے بھی وہیں بھیجے دیتا ہوں۔''

''ٹھہرو ٹھہرو......مجھے نہ مارو۔ بتاتا ہوں۔'' گروشر چیخ اٹھا۔

''ہم اسے لے کر اس غار تک گئے تھے جہاں وہ دونوں چھپے ہوئے تھے لیکن ان کے ملازم گھوڑے لے کر فرار ہو چکے تھے انہوں نے مجھ پر غداری کا الزام لگایا ان کا خیال تھا کہ میں نے ان کے ملازموں کو قتل کروا دیا اور اب ان کو بھی ٹھکانے لگانے کی سازش کر رہا ہوں وہ جھوٹ بول رہے تھے یہ الزام غلط ہے مجھے پتا نہیں ان کے ملازم کہاں گئے انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا میرا ایک پجاری درمیان میں آ گیا اور میں وہاں سے فرار ہوگیا۔''

کامران نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا وہ تھر تھر کانپ رہا تھا کامران نے کمر سے رسی نکالی اور اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی کے ساتھ پشت پر باندھ دیئے اس نے خونخوار لہجے میں کہا۔

''ہم وہیں واپس چل رہے ہیں تو نے ذرا بھی آواز نکالی تو گردن اڑا دوں گا مجھے سیدھے اس غار کی سمت لے کر چل۔''

''نہیں گروشر نے التجا کی وہ مجھے مار ڈالیں گے۔''

''تو نے ایک لمحے بھی دیر کی تو میں تجھے قتل کردوں گا۔''

کامران نے گرج کر کہا اور اسے آگے دھکا دیا۔

گروشر دیو قامت ہونے کے باوجود بڑا بزدل تھا۔ کانپتے ہوئے قدموں سے وہ آگے آگے چلنے لگا ڈھلوان سے اتر کر وہ جیسے ہی ہموار جگہ پہنچے کامران نے کہا۔

''میں یہ جگہ پہچانتا ہوں اور مجھے اب معلوم ہے کہ غار کہاں ہے اس لئے گڑبڑ نہ کرنا۔''

گروشر بے بسی کے عالم میں آگے آگے چلتا رہا ننگی تلوار کی چمک سے اس کا دل لرز رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ غار کے سامنے پہنچ گئے لیکن وہاں پر ہر سمت خاموشی طاری تھی۔

''وہ چلے گئے'' گروشر نے کانپتی آواز میں کہا۔

''مجھے پہلے ہی امید تھی لیکن میں صرف تصدیق کرنا چاہتا تھا۔''

''سنو'' گروشر نے خوف زدہ لہجے میں کہا کسی کے کراہنے کی آواز تھی اور بلاشبہ غار کے اندر سے آئی تھی کامران نے پھرتی کے ساتھ تلوار کی نوک گروشر کے سینے پر رکھ دی۔

''خبردار جو آواز نکالی'' اس نے کہا اور پھر ایک تسمے سے اس کے پیروں کو بھی باندھ دیا تاکہ فرار نہ ہو سکے۔

گروشر کو چھوڑ کر وہ دبے پاؤں غار میں داخل ہوا تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کراہ پھر سنائی دی وہ جو بھی تھا شدید اذیت میں تھا احتیاط سے قدم رکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا اچانک اس کا پیر کسی نرم چیز سے ٹکرایا اور کوئی زور سے کراہا۔ کامران نے ٹٹول کر دیکھا کسی انسان کا جسم تھا اس نے اپنے ہاتھ پر نمی سی محسوس کی اور جیب سے ماچس نکال کر جلائی حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں اس کے ہاتھ خون میں تر تھے اور ہارڈی زمین پر پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔

''ہارڈی'' کامران نے آہستہ سے کہا۔

لب مرگ ہارڈی نے اپنا نام سن کر آنکھیں کھول دیں اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو منہ سے خون آ گیا۔

''ایلو......ایلوس'' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

''تم واپس آ گئے' وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔

''میں ایلوس نہیں کامران ہوں ہارڈی شردھا کہاں ہے''

پھاٹک سے لوگ نکل کر باہر آرہے تھے۔

وہ شاید پتا لگانے آرہے تھے کہ فائرنگ کہاں ہو رہی تھی اچانک فائر کی آواز آئی کہ گروشر چیخ کر لیٹ گیا گولی سے اس کے سر کی ٹوپی اڑ گئی تھی اور وہ بال بال بچا تھا۔ کامران پھرتی کے ساتھ ایک چٹان کی آڑ میں ہو گیا۔ اس کی تیز نگاہیں حملہ آور کو تلاش کرنے لگیں۔ کچھ دیر کے بعد ایک بلند چٹان کے پیچھے سے ایک سر نمودار ہوا پھر رائفل کی نال نکلتی دکھائی دی فائر اور گولی کامران کے پاس والی چٹان سے ٹکرائی لیکن کامران نے ایلوس کو پہچان لیا تھا۔

ایلوس واقعی ہر سمت سے مصیبت میں گھر گیا تھا اور یہ دیکھ کر کہ کامران بھی تعاقب کرتا ہوا سر پر آ پہنچا ہے اس نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس نے بلندی سے چیخ کر کامران کو گالیاں دینی شروع کر دیں پھر دھمکیوں پر اتر آیا گروشر اتنا دہشت زدہ ہو گیا تھا کہ چٹان کی آڑ میں دبک گیا کامران چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا دشمن کی سمت بڑھنے لگا ایلوس کو نہیں معلوم تھا کہ اس کے پاس رائفل نہیں ہے وہ اس خاموشی کو بھی کوئی چال سمجھ رہا تھا سورج ابھی بلند نہیں ہوا تھا اس لئے چٹانوں اور جھاڑیوں کے سائے میں کامران کی نقل و حرکت ایلوس کو نظر نہ آسکی۔ لیکن جلد ہی یہ صورتحال بدل گئی۔ ایلوس بہت چالاک تھا اب اس نے کامران کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے مسلسل فائرنگ شروع کر دی جب بھی کامران ایک چٹان سے دوسری چٹان پر چھلانگ لگاتا' گولی اس کا تعاقب کرتی لیکن وہ برابر بڑھتا ہی رہا۔

گولیوں کی بوچھاڑ کے باوجود وہ برابر بڑھتا ہی رہا گولیوں کی بوچھاڑ کے باوجود وہ ہر لحہ ایلوس سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا اور اس بات نے آخر کار ایلوس کو بدحواس کر دیا کامران کو شردھا نظر نہیں آرہی تھی لیکن اچانک اسے گنجا پجاری نظر آگیا جس وقت ایلوس رائفل لوڈ کر رہا تھا۔ پجاری نے موقع سے فائدہ اٹھایا پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کے باوجود وہ جست لگا کر وہاں سے اچھلا اور خرگوش کی طرح چھلانگیں لگاتا بھاگنے لگا۔ ایلوس نے طیش میں آکر کمر سے لگے ہوئے پستول کو نکال کر فائر کیا گولی پجاری کے شانے پر لگی اور وہ چیخ مار کر لڑکھڑاتا ہوا دوجا گرا۔

سورج اچانک نکلا اس کی تیز روشنی بہ راہ راست ایلوس کی آنکھوں پر پڑی آنکھیں چکاچوند ہوئیں تو اس نے غصے میں ہاتھ کا سایہ کیا لیکن اتنی دیر میں کامران چھلانگیں مارتا کافی دور نکل آیا تھا ایلوس نے چیخ کر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی لیکن کامران اسی لمحے کا منتظر تھا وہ مسلسل آگے بڑھتا رہا چٹانوں کی آڑ لیتا وہ ہر جست میں ایلوس سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا گولیاں اس کے پاس آکر چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں پتھر کے ٹکڑے اڑ کر اسے لگ رہے تھے لیکن وہ یہ موقع ضائع کرنے کو تیار نہ تھا اس کا ہر قدم بلندی کو طے کر کے دشمن کی سمت بڑھ رہا تھا ایلوس اتنا بدحواس ہو گیا تھا کہ نشانہ لئے بغیر مسلسل فائر کرتا رہا یہاں تک کہ گولیاں ختم ہو گئیں رائفل کا گھوڑا چٹ چٹ کر کے رہ گیا کامران اس دوران میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا رائفل دوبارہ لوڈ کرنے کا موقع باقی نہ رہا تھا وہ غصے اور جنون میں دھاڑ کر چیخا۔

''درندے! تو اب بھی مجھے نہ پکڑ سکے گا''

اس نے کامران کی گرفت سے بچنے کے لئے اچانک دوسری جانب چھلانگ لگائی لیکن گھبراہٹ

''ایلوس ذلیل کمینہ......''

''میں نے اسے بچانے کی کوشش کی تھی گروشر پجاری نے مجھے زخمی کر دیا ہم یہاں پہنچے تو ملازم فرار ہو چکے تھے گروشر نے ہم سے غداری کی ایلوس اس کو ختم کر دیتا لیکن اس کے ساتھی پجاری نے حملہ کر دیا گروشر بھاگ گیا اور ایلوس...... کمینہ ایلوس مجھے مرتا چھوڑ کر اس لڑکی کے ساتھ فرار ہو گیا اس نے رہنمائی کے لئے اس پجاری کو پکڑ لیا وہ پیدل اس پہاڑی کو پار کرنا چاہتا تھا۔ مم...... مم میں اس کو......'' اچانک اس کی گردن ڈھلک گئی کامران نے باہر آکر گروشر کو یہ سب بتایا اور اس کے پیر کھول دیئے گروشر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''وہ کبھی اس پہاڑ کو پار نہ کر سکیں گے راستے ہی میں مر جائیں گے'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں ہم ان کا تعاقب کریں گے اور تم میری رہنمائی کرو گے'' کامران بولا۔

''انہیں مر جانے دو'' گروشر نے غصے میں کہا۔

کامران نے تلوار کی نوک اس کے حلق پر رکھ دی۔

''کتے! اگر وہ مر گئے تو میں تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا کیا تو چاہتا ہے کہ میں تجھے گھسیٹ کر لے چلوں اور شہر کے لوگوں کو تیری غداری کی داستان سناؤں؟ ان کو بتلا دوں کہ تو نے ان کی دیوی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ وہ تیری ایک ایک بوٹی کر ڈالیں گے۔''

''نہیں۔'' گروشر خوف زدہ آواز میں چیخا ''نہیں...... نہیں...... میں تمہاری ہر بات ماننے کے لئے تیار ہوں۔''

''تو پھر اٹھو ان کو روانہ ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی اگر سورج نکلنے سے پہلے وہ مجھے نہ ملے تو میں سمجھ جاؤں گا کہ تو نے دھوکا دیا ہے اور پھر۔''

گروشر گھبرا کر پیچھے ہٹا ''میں میں تم کو دھوکا نہیں دوں گا چلو''

صبح ہونے میں ابھی دیر تھی کامران اس وقت ایک خطرناک پہاڑی راستے سے اوپر چڑھ رہا تھا...... اس نے قبائلیوں کو جس گھاٹی پر چھوڑا تھا وہ اس جگہ سے نصف فاصلے پر مغرب میں رہ گئی تھی تاریکی میں ذرا سی لغزش اسے موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی پھر بھی وہ بار بار گروشر کو تیز چلنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''شردھا ہر قدم پر مزاحمت کر رہی ہوگی اس لئے وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔''

لیکن صبح کا اجالا پھیلنے تک ایلوس کو تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے وہ اس وقت ایک خطرناک گگر پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور ایک ایک قدم دشوار گزار تھا اچانک بائیں جانب سے گولیاں چلنے کی آواز فضا میں گونج اٹھی۔ کامران چونک کر مڑا، وہ اس وقت اتنی بلندی پر تھے کہ فاصلے کے باوجود پوری وادی کا منظر ان کے سامنے تھا۔ دور شہر کی آبادی نظر آرہی تھی۔ کامران نے اس گھائی کی سمت دیکھا جہاں قبائلی چھپے ہوئے تھے چٹانوں کی آڑ میں اسے دھبے حرکت کرتے نظر آرہے تھے۔ رہ رہ کر دھواں اٹھتا ہوا نظر آرہا تھا قبائلی آڑ سے فائرنگ کر رہے تھے اس نے پھرتی سے دوربین آنکھوں سے لگائی اس کو اندازہ ہو گیا کہ خانہ

میں پیر ایک پتھر سے ٹکرایا ایک دل خراش چیخ بلند ہوئی اور وہ اس پتلی سی دراڑ کے اندر غائب ہوگیا جس کو پھلانگ کر وہ دوسری طرف جانا چاہتا تھا۔ گہرائی اتنی تھی کہ خوف آتا تھا کامران نے جھانک کر دیکھا لیکن کچھ نظر نہ آسکا اس کا دوسرا دشمن بھی انتقام لینے سے پہلے جہنم رسید ہو چکا تھا مایوس ہوکر وہ پلٹا اور تب اس کی نظر شردھا پر پڑی جس چٹان کے پیچھے سے ایلوس فائر کر رہا تھا اس کی آڑ میں وہ بندھی ہوئی تھی منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا پاؤں ننگے تھے چہرے پر جگہ جگہ خراشیں پڑی ہوئی تھیں لیکن اس کی آنکھوں سے خوف کے بجائے مسرت جھلک رہی تھی کامران نے جلدی سے اسے آزاد کیا۔

''یہ لوگ کہہ رہے تھے کہ تم مر چکے ہو'' اس نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''لیکن میرا دل کہتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔''

''انہوں نے تو اپنی دانست میں مجھے مار ڈالا تھا'' کامران نے کہا۔

''تمہیں کوئی نہیں مار سکتا کامران تم میری محبت کی طرح امر ہو۔''

''کیا؟'' کامران نے چونک کر پوچھا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ہاں'' کامران لیکن اب یہاں سے نکل چلو یہ خانہ بدوش اور قبائلی جب تک ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں ہم بہ آسانی دور پہنچ سکتے ہیں۔''

''نہیں شردھا ان قبائلیوں کو میں یہاں لے کر آیا تھا انہیں مصیبت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

''میں جانتی تھی تم یہی کہو گے'' شردھا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ایلوس کی رائفل قریب ہی پڑی تھی کامران نے اسے اور کارتوسوں کا تھیلا اٹھایا اور شردھا کا ہاتھ پکڑ کر اس جگہ واپس پہنچ گیا جہاں گروشر خوف سے چھپا ہوا تھا۔

''کیا یہاں سے گھاٹی تک پہنچنے کا کوئی محفوظ راستہ ہے؟''

کامران نے اس سے پوچھا۔

''اپنی سلامتی چاہتے ہو تو سچ بولنا۔''

''ہاں ایک خفیہ راستہ ہے'' گروشر نے کہا ''لیکن بہت خطرناک ہے میں بندھے ہوئے ہاتھوں سے اس پر نہیں چل سکتا۔''

کامران نے اس کے ہاتھ کھول دیئے لیکن اس کی کمر سے رسی باندھی اور اس کا ایک سرا ہاتھ میں پکڑ لیا ''اب چلو'' اس نے حکم دیا۔

گروشر ان کو لے کر اسی راستے پر چل پڑا لیکن نصف کے قریب فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ انہیں لے کر ایک تنگ راستے میں داخل ہوگیا یہ قدرتی نالے کی طرح کا تنگ درہ تھا راستہ پتھروں کے درمیان چلا گیا تھا دونوں سمت خوفناک گہرائی تھی اس راستے پر احتیاط سے چلتے ہوئے آخر کار وہ ایک غار کے دہانے تک جا پہنچے۔ غار ڈھلوان تھا اور اس میں داخل ہوکر تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ ایک جگہ بڑا سا شگاف نظر آیا اس میں سے گزر کر وہ ایک دوسری پہاڑی کے کنارے نکل آئے۔

یہاں چٹانوں اور گھنے درختوں کی وجہ سے وہ دشمن کی نظر میں نہیں آسکتے تھے لیکن فائرنگ کی آواز

قریب سے سن رہے تھے جلد ہی وہ اس آڑ سے باہر نکلے تو قبائلیوں کی گھاٹی میں تھے اس نے چٹانوں کی آڑ سے گولیاں برساتے قبائلیوں کو دیکھ کر آواز دی بیک وقت کئی رائفلوں کا رخ اس کی سمت ہوگیا لیکن فوراً ہی انہوں نے اسے پہچان لیا اور حیرت زدہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھنے لگے۔ شردھا کے خوبصورت لباس اور حسن نے ان کو مبہوت کر دیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر دشمن سے نبرد آزما ہوگئے ایک قبائلی بھاگتا ہوا ان کی سمت آیا۔

''تاریکی میں وہ بالکل ہمارے سروں پر آپہنچے ہیں'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''انہوں نے گھاٹی کے دہانے کو ہر سمت سے گھیر لیا ہے' لیکن ہمارے سنتریوں نے انہیں بروقت دیکھ لیا اگلی چوٹی پر ہمارے سنتری کو انہوں نے بے خبری میں ہلاک کر دیا تھا ورنہ اتنے قریب نہیں آسکتے تھے اب ہم کیا کریں کامران؟''

کامران نے ایک قبائلی سے کمبل لے کر شردھا کے شانوں پر ڈال دیا۔

''گروشر کی نگرانی کرنا'' اس نے کہا۔

''اگر یہ فرار ہونے کی کوشش کرے تو بے تامل ہلاک کر دینا۔''

''تم فکر مت کرو کامران اس کو ہلاک کرنے کا تو میں صرف بہانہ چاہتی ہوں'' شردھا نے نفرت اور حقارت سے گروشر کو دیکھا۔

کامران نے تین قبائلیوں کو ساتھ لیا اور گھاٹی کے دہانے کی سمت بڑھ گیا خانہ بدوشوں نے آہستہ آہستہ ڈھلوانوں سے نیچے آنے کی کوشش شروع کر دی تا کہ قریب سے قبائلیوں کو نشانہ بنا سکیں ان کا بہت جانی نقصان ہو رہا تھا لیکن وہ ہر قیمت پر آگے بڑھنا چاہتے تھے ادھر شہر کے پھاٹک سے نکل کر لوگ درختوں کی آڑ میں آگے بڑھ رہے تھے۔

''اس سے پہلے کہ شہر کے پجاری بھی خانہ بدوشوں کے ساتھ شامل ہوں ہمیں اس جال سے نکل جانا چاہیے۔'' کامران نے کہا کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ شہر کے لوگ شور مچاتے آہستہ آہستہ پہاڑی کی سمت بڑھ رہے تھے اس نے جلدی سے چند سواروں کو اشارہ کیا اور گروشر اور شردھا کو دو خالی گھوڑوں پر سوار کرا کے حکم دیا کہ وہ تیز رفتاری کے ساتھ غار کے ذریعے انہیں واپس لے جائے۔ قبائلیوں کو اس نے ہدایت کی کہ وہ شردھا کے ہر حکم کی تعمیل کریں اگر کسی نے خلاف ورزی کی تو وہ ان کی سلامتی کا ذمے دار نہ ہوگا باقی لوگوں کو اس نے فائرنگ روک کر آڑ میں چلے جانے کا حکم دیا۔

ان سب کو روانہ کرنے کے بعد وہ صرف تین قبائلیوں کے ہمراہ گھاٹی میں ٹھہر گیا وہ گھاٹی کے دہانے پر رک کر خانہ بدوشوں کی پیش قدمی کو روکنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ فوراً ہی انہوں نے دشمن پر فائرنگ شروع کر دی لیکن خانہ بدوشوں نے محسوس کر لیا کہ دشمن پسپا ہو رہے ہیں اس لئے وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل کر تیزی سے آگے بڑھے کامران نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور گولیوں کی باڑھ پہ باڑھ نے بہت سے دشمنوں کو ڈھیر کر دیا۔ دشمن اس اچانک حملے سے گھبرا کر بدحواسی کے عالم میں بھاگنے لگا لیکن اب ہر طرف سے ان پر گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔

جب خانہ بدوش نظروں سے اوجھل ہوگئے تو کامران نے فائرنگ روکنے کا اشارہ کیا اور پھر سب کو جمع کر کے سرنگ کے خفیہ راستے کی سمت بھاگنے لگا خانہ بدوشوں نے اچانک فائرنگ رکنے کو چال سمجھا اور آڑ میں چھپے رہے۔ اس دوران میں کامران اور اس کے ساتھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے خفیہ راستے سے دور نکل گئے اس کے باقی ساتھی گھاٹی کے دوسری جانب پہنچ کر انتظار کر رہے تھے۔ کامران نے انہیں آگے جانے کا حکم دیا باقی لوگ گھاٹی کی دوسری جانب اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اس گہری گھاٹی کے اوپر پہاڑی گگر کے پاس پہنچ چکے تھے کامران نے انہیں تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے کی ہدایت کی اسے غصہ آرہا تھا کہ وہ بیک وقت دو جگہ کیسے موجود رہے۔ قبائلیوں کے آگے گروشر کو دھکیلتے رہنا بھی ضروری تھا اور تعاقب میں آنے والے دشمن کو روکنا بھی۔ شردھا نے خنجر گروشر کی گردن پر رکھا ہوا تھا اور اسے آگے آگے لئے چل رہی تھی پہاڑی کی خطرناک ڈھلان کی گگر کے اوپر تنگ راستہ بہت خطرناک تھا تقریباً نصف میل تک یہ قدرتی پگڈنڈی تھی جو تقریباً ایک ہزار فٹ کی تاریک گہرائی تک چلی گئی تھی۔ کامران پہاڑی کی گگر کے کنارے کھڑا اپنے ساتھیوں کو اس خوف ناک راستے سے گزرتے دیکھتا رہا۔

ذرا دیر بعد اسے خانہ بدوشوں کا پہلا سوار بڑی تیز رفتاری سے گگر کی سمت جاتا نظر آیا۔ کامران نے ایک بڑی چٹان کی آڑ میں اپنے گھوڑے کو کھڑا کیا اور نشانہ لے کر فائر کیا لیکن فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ گولی سوار کے بجائے گھوڑے کو لگی زخمی گھوڑا بھڑک کر پیروں پر کھڑا ہو گیا غار کے دہانے کے پاس گگر بہت پتلی تھی تکلیف سے ہنہناتا ہوا گھوڑا توازن قائم نہ رکھ سکا اور سوار سمیت موت کی گہرائیوں میں گرتا چلا گیا اس حادثے نے پیچھے آنے والے تین اور سواروں کو بدحواس کر دیا انہوں نے اچانک اپنے گھوڑے کی باگ کھینچی ان کے پیچھے والے سوار ان سے آ کر ٹکرائے۔ اس افراتفری میں کئی ایک سوار اور کام آگئے باقی غار کے اندر واپس جا گھسے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے پھر باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن ایک ہی برسٹ نے ان کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

کامران نے گھوم کر دیکھا اس کے ساتھی پہاڑی کے دوسرے سرے پر پہنچ چکے تھے آخری چند سوار گھوڑوں سے اتر کر پیدل اس پگڈنڈی کو پار کر رہے تھے جیسے ہی وہ اس پل صراط کے پار پہنچے کامران نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ راستہ پگڈنڈی کی طرح تنگ تھا دونوں جانب گہری کھائی تھی گھوڑے کا ایک بھی قدم غلط پڑتا تو وہ کامران سمیت منہ کے بل جا گرتا۔ لیکن ان پہاڑی راستوں پر چلنے کا وہ عادی تھا۔

بے خوابی کے باعث کامران کا سر چکرا رہا تھا پھر بھی وہ رکا نہیں۔ اس خطرناک راستے کو پار کر کے جب وہ اس چٹان کے پاس رکا جہاں شردھا کھڑی ہوئی تھی تو اس نے گھوم کر دیکھا۔ دشمن نے اب تک تعاقب نہیں کیا تھا شردھا کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اس نے کامران کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑا۔ ”جتنی جلد ممکن ہو یہاں سے نکل چلو“ شردھا نے خوابیدہ لہجے میں کہا نیند اور تھکان سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔

وہ لوگ وہاں سے فوراً روانہ ہوگئے ان کے پاس اب گھوڑے کم رہ گئے تھے بلندی کی وجہ سے بہت سے قبائلیوں کو چکر آرہے تھے خود کامران کے لئے آنکھیں کھلی رکھنا دشوار ہو رہا تھا وہ سب گروشر کے بتائے ہوئے راستہ پر آگے بڑھ رہے تھے راستہ اتنا تنگ اور خطرناک تھا کہ تیز رفتاری سے چلنا ممکن نہ تھا

گہری کھائیوں اور تنگ دروں سے گزرتے ہوئے وہ مسلسل بڑھتے رہے۔ رہ رہ کر ان کو عقب سے خانہ بدوشوں کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ دشمن تعاقب میں مسلسل چلا آرہا تھا۔ پہاڑ کی برف پوش چوٹی نمایاں ہوتی جارہی تھی گروشر نے قسم کھا کر یقین دلایا کہ وہ انہیں اس محفوظ راستے سے لے جارہا ہے جو پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ خوف سے اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا کہ وہ راستہ اختیار کرے جس سے اس کی جان بچ جائے۔ وہ اس طرح چل رہے تھے جیسے پیروں میں جان نہ رہ گئی ہو۔ تھکان سے سب بری طرح نڈھال ہو رہے تھے۔ گھوڑے بھی آہستہ قدم ہو چکے تھے سرد ہوا کے تیز جھونکے تیر کی طرح چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ تاریکی بڑھتی جارہی تھی آخر کار وہ پہاڑ کے ڈھلوان پر واقع پہاڑی سلسلے میں داخل ہوگئے۔

کوہ ارزک ایک فلک بوس عفریت کی طرح ان کے سامنے تھا اس کی برف پوش چوٹی دھند میں چھپی ہوئی تھی۔ دامن میں پہاڑیوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا چوٹیاں بلند و بالا کلس کی طرح کھڑی تھیں سپاٹ ڈھلانیں، تنگ گگر اور خطرناک گہرائیوں کے کنارے سے ہو کر وہ بڑھتے رہے اور آخر کار ایک گھاٹی کے اوپر سے گزر کر بلند و بالا چوٹی کے قریب پلیٹ فارم نما چوڑی چٹان کے اوپر پہنچے۔ پہاڑی کا یہ حصہ بہت کشادہ تھا اور سامنے پہاڑی کے اندر کانسی کا بہت بڑا اور مضبوط پھاٹک تھا۔ جس پر نامعلوم زبان میں کچھ کندہ تھا۔ کامران ان الفاظ کو نہیں پڑھ سکا۔ پھاٹک پہاڑ کی چٹانوں کو کاٹ کر لگایا گیا تھا اور اتنا مضبوط تھا کہ توپ کا گولہ بھی اسے نہیں ہلا سکتا تھا۔

”یہ ارزک کا مقدس دروازہ ہے“ گروشر نے کہا۔ ”اس کو دھکا دو...... نہیں...... ڈرو نہیں میں قسم کھاتا ہوں اس میں کوئی چال نہیں ہے۔“

”اگر کوئی چال ہوئی تو تم بھی زندہ نہیں بچو گے۔“

کامران نے کہا اور پوری قوت سے دھکا دیا دروازے کے ساتھ ہی وہ بھی اندر گرتا چلا گیا۔

وزنی پھاٹک کا پٹ اس طرح کھلتا چلا گیا جیسے اس کا کوئی وزن ہی نہ ہو۔ اس کے پرانے قبضوں میں حال ہی میں تیل لگایا گیا تھا دیوار میں لگی ہوئی مشعل جلاتے ہی انہیں پہاڑ کاٹ کر بنائی گئی ایک کشادہ سرنگ کا دہانہ نظر آیا کچھ دور جا کر بوتل کی گردن کی طرح یہ دہانہ اتنا پھیل گیا تھا کہ اس کی بلندی اور چوڑائی کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

”یہ سرنگ پہاڑ کے دوسرے سرے پر جا کر نکلتی ہے“ گروشر نے بتایا۔

”صبح تک ہم ان لوگوں سے بہت دور پہنچ چکے ہوں گے جو ہمارا تعاقب کر رہے ہیں کیونکہ اگر انہوں نے پہاڑ پر چڑھ کر دوسری سمت پہنچنے کی کوشش کی بھی تو پوری رات اور دوسرا دن ختم ہونے سے پہلے وہ اس پہاڑ کو عبور نہیں کر سکیں گے اگر وہ پہاڑ کے گرد سے سفر کرتے ہیں اور دروں میں گھاٹیوں کو پار کر کے دوسری جانب پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ وقت لگے گا اور ظاہر ہے کہ ہماری طرح وہ اور ان کے گھوڑے بھی اتنے تھک چکے ہیں کہ تیز رفتاری سے آگے بڑھنا ممکن نہیں۔

”اس خفیہ راستے کا علم تم کو پہلے سے تھا تو ان سفید فاموں کو کیوں نہیں بتایا؟“ کامران نے سوال کیا۔

”میں ان کو اسی راستے سے لے جاتا‘ پہاڑوں کے اوپر سے نہیں“ گروشر نے جواب دیا۔

”اس سرنگ میں کھانے پینے کا سامان بھی ہے اور آرام کرنے کے لئے کمرے بھی۔ سردیوں کے موسم میں خانقاہ کے پجاری یہاں کام کرتے ہیں۔“

کامران کے لئے گروشر کی بات پر یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ خانہ بدوشوں کے پہنچنے سے پہلے وہ اپنے ساتھیوں کو سرنگ کے اندر لا کر اس کے مضبوط پھاٹک کو بند کر دینا چاہتا تھا اس لئے اس نے وہاں رکھے ہوئے چربی سے جلنے والے لیمپ روشن کرنے کا حکم دیا جب سارے قبائلی اندر آ گئے تو پھاٹک کو اندر سے بند کر دیا گیا وزنی اور مضبوط کانسی کی سلاخیں آدمی کی ٹانگوں کی طرح موٹی تھیں اور ایک سلاخ چھ سات آدمیوں سے کم کے لئے اٹھانا ممکن نہ تھا کامران کو اطمینان تھا کہ اس پھاٹک کو توڑنا دشمن کے لئے ممکن نہ تھا سرنگ میں آگے بڑھتے ہوئے اس نے گروشر کے گھوڑے کو ہر سمت سے نرغے میں رکھا تھا لیمپ کی روشنی میں وہ آگے بڑھتے رہے بے پناہ قوت اور حوصلے کے باوجود کامران تھکان سے نڈھال ہو رہا تھا۔ لیکن سرنگ میں رکھے ہوئے سامان کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں کون تصور کر سکتا تھا کہ پہاڑ کو کاٹ کر ایک سرے سے دوسرے سرے تک کتنی کشادہ سرنگ بنائی جا سکتی ہے۔

سرنگ اتنی چوڑی تھی کہ تیس سوار اس میں ایک ساتھ چل سکتے تھے چھت اتنی بلند تھی کہ روشنی میں بھی مشکل سے نظر آتی تھی فرش اور دیواریں بالکل ہموار تھیں جگہ جگہ کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں کئی جگہ سے کدالوں سے کھدائی کے نشان نظر آئے پھر اسے جگہ جگہ دھندلی زردی جھلکتی دکھائی دی کچھ دیر بعد اچانک اس پر حقیقت کا انکشاف ہوا کہ کوہ ارزک کی داستانیں حقیقت تھیں سرنگ کی دیوار میں جھلکتی زردی سونے کی تھی اس زیر زمین سرنگ میں سونے کی وافر مقدار موجود تھی یہ حقیقت قبائلیوں سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکی۔

اس کے برابر چلتے ہوئے سوار نے سرگوشی کی ”یہ پجاری اسی جگہ سے سونا حاصل کرتے ہیں یہ سرنگ سونے کی بہت بڑی کان ہے“ اس کی آنکھیں روشنی میں چمک رہی تھی۔

”آپ اجازت دیں تو میں اس گنجے سے اقبال کرا لوں کہ یہ سونے کا ذخیرہ کہاں پوشیدہ ہے۔“

”لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی گروشر نے بلا تامل ایک وسیع اور کشادہ کمرے میں رکھے ہوئے بڑے بڑے ڈھیلوں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ خام سونے کے ڈلے ہیں ایک دوسرے کمرے میں ان کو صاف کرنے کے لئے اور خالص سونا نکالنے کے لئے بھٹی اور سامان تھا۔ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”تم کو جتنا سونا چاہیے لے جاؤ۔ یہاں اتنا ذخیرہ ہے کہ ہزار گھوڑے بھی اسے لادنے کے لئے ناکافی ہوں گے اور ابھی ہم نے کان کو پوری طرح ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔“

قبائلیوں کی نگاہوں میں حرص و ہوس کی چمک کامران کے لئے پریشانی کا باعث ہونے لگی تھی۔

”جتنے گھوڑے فاضل ہیں ان پر لا دلو“ کامران نے کہا۔

”یہی بہت کافی ہونگے۔“

اجازت ملتے ہی سب بھوکے گدھ کی طرح ٹوٹ پڑے ان کا بس چلتا تو سارا سونا لاد لیتے وہ

دیوانوں کی طرح اپنے تھیلوں کو بھر رہے تھے کامران نے ان سے خزانے تک لانے کا وعدہ کیا تھا اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اب جو کچھ پیش آیا وہ کامران کے منصوبے کا حصہ تھا خوشی سے بے تاب ہو کر وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے ”اب دوبارہ آئیں گے تو اپنے ساتھ اتنے گھوڑے لائیں گے کہ یہ سب اٹھا کر لے چلیں گے۔“

”بس ختم کرو“ کامران دھاڑا۔

”تم نے اتنا سونا جمع کر لیا ہے کہ تمہاری سات پشتوں کے لئے کافی ہوگا۔“

لیکن قبائلیوں پر کوئی اثر نہ ہوا وہ اپنے تھیلے بھر بھر کے لادتے رہے کامران نے تلوار کھینچی اور گرجتا ہوا ان کی سمت لپکا ”کم بختو‘ اگر خانہ بدوشوں نے تم سے پہلے پہاڑ پار کر لیا تو کیا یہ سونا قبر میں لے جاؤ گے۔“

بڑی مشکل سے وہ روانہ ہوئے سرنگ میں اناج کا وافر ذخیرہ تھا کامران کی ہدایت پر انہوں نے راستے کے لئے ضرورت کے مطابق اسے بھی لادا نیند سے کامران کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں شردھا بھی گھوڑے کی پشت پر اونگھ رہی تھی لیکن وہ مسلسل بڑھتے رہے اور آخر کار سرنگ کے دوسرے پھاٹک تک پہنچ گئے جو مقفل نہیں تھا گروشر نے بتایا کہ خاص پجاریوں کے علاوہ اس سرنگ کا راز کسی کو نہیں معلوم انہوں نے بھاری دروازے کے پٹ کھولے صبح کے اجالے سے ان کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔

سامنے ایک چوڑی سی تکونی چٹان چبوترے کی طرح پھیلی ہوئی تھی اس کے آگے ایک تنگ سا راستہ پہاڑ کے کنارے کنارے چلا گیا تھا پیچ و خم کھائے ہوئے اس راستے کے ایک سمت بلند پہاڑ کی دیوار تھی اور دوسری جانب ہزاروں فٹ گہری ڈھلوان جس کے نیچے بہنے والی ندی کا پانی چاندی کی لکیر کی طرح چمک رہا تھا بائیں جانب کا منظر چوٹیوں نے چھپا رکھا تھا۔ لیکن دائیں سمت کوہ ارزک سے ملے ہوئے پہاڑوں کا سلسلہ حد نظر تک پھیلا ہوا تھا۔

”جان بچانے کا یہی واحد راستہ ہے“ گروشر نے درے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں سے تین میل کے فاصلے پر یہ راستہ تم کو اس وادی میں پہنچا دے گا اور وہاں پانی اور شکار دونوں موجود ہیں تمہارے گھوڑوں کو چارہ بھی مل جائے گا جنوب میں واقع درے سے گزر کر تم تین دن کے سفر کے بعد اپنے جانے پہچانے علاقے میں پہنچ جاؤ گے اس سے پہلے کہ خانہ بدوش پہاڑ کو پار کر کے یہاں پہنچیں‘ تمہارا نکل جانا بہتر ہے اب مجھے واپس جانے دو۔“

”ابھی نہیں“ کامران نے کہا۔

”میں تم کو درے کے پاس پہنچ کر آزاد کر دوں گا وہاں سے تم بہ آسانی واپس آ سکتے ہو“۔

گروشر نے غصے میں اسے گھورا کامران کی آنکھیں مسلسل جاگنے سے خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں گروشر سہم کر خاموش ہو گیا قبائلی اپنے سونے کا ذخیرہ لے کر نکل جانے کے لئے اتنے بے تاب ہو رہے تھے کہ چھ سات سوار دروازے سے نکل کر روانہ ہو گئے کامران نے ان کو جاتے دیکھا تو ایک سوار کو حکم دیا کہ گروشر کو ساتھ لے کر آئے اور اپنا گھوڑا آگے بڑھا دیا تاکہ حسب معمول وہ سب سے آگے پہنچ کر رہنمائی کرے ایک قبائلی سب سے آگے نکل گیا تھا اور اب نہ وہ واپس آ سکتا تھا نہ کامران کو آگے نکل جانے کا راستہ دے سکتا تھا کامران نے اسے آواز دے کر پیچھے چلنے کی ہدایت کی اور اپنے گھوڑے کو آگے بڑھا دیا۔

کامران کا گھوڑا ابھی اس تنگ راستے پر پہنچا ہی تھا کہ اوپر سے چھوٹے بڑے پتھروں کا ریلا زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ آ کر راستے پر گرا۔ آگے جانے والا قبائلی بدقسمت بہ راہ راست اس کی زد میں آ گیا اور وہ اس کو گھوڑے سمیت اس طرح بہا کر لے گیا جیسے جھاڑو جالے کو صاف کر کے لے جاتی ہے ایک بڑا سا پتھر کامران کے گھوڑے کی ٹانگ پر پڑا اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور وہ درد سے چیخ کر گرا اور گہری کھائی میں لڑھکتا ہوا محفوظ جگہ پر پہنچ گیا۔ شردھا کی دہشت ناک چیخ اور قبائلیوں کی چیخ و پکار سے فضا گونج اٹھی بلندی پر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن پھر بھی کئی قبائلیوں نے گولیاں برسانا شروع کر دیں جواب میں چوٹی کے اوپر سے فلک شگاف قہقہے سنائی دیئے باوجود یہ کہ کامران اس ہولناک حادثے سے دہل گیا تھا پھر بھی اس نے فوراً ہی حواس پر قابو پا کر اپنے ساتھیوں کو سرنگ کے اندر دھکیل دیا وہ بری طرح جال میں پھنس گئے تھے ان میں سے کئی تلوار سونت کر گروشر کی سمت لپکے۔

"اس کی گردن اڑا دو اس غدار نے ہمیں دھوکے سے جال میں پھنسایا ہے" کئی بیک زبان بولے۔

گروشر کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا تھا اس سے پہلے کہ قبائلی اسے ہلاک کرتے کامران چلایا۔

"ٹھہرو خبردار اسے نہیں مارنا۔"

"میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے غداری نہیں کی۔ خانہ بدوش اتنی جلدی پہاڑ پار نہیں کر سکتے" گروشر نے چیخ کر کہا۔

"کیا سرنگ میں پجاری موجود تھے؟" کامران نے پوچھا "ممکن ہے ہماری آمد کے وقت وہ اس پھاٹک سے فرار ہو کر اوپر پہنچ گئے ہوں۔"

"نہیں میں ارزک کی قسم کھاتا ہوں کہ سرنگ میں کوئی نہیں تھا ہم سال میں صرف تین بار سونا نکالتے ہیں مجھے نہیں معلوم کہ اوپر کون ہے۔"

کامران دوبارہ باہر نکل کر چند قدم آگے بڑھا دوسرے ہی لمحے پھر پتھروں کا ریلہ آ کر راستے پر گرا اور وہ بال بال بچ کر پیچھے ہٹا اور ایک زوردار قہقہہ بلندی سے گونجا۔

"مکار کتے! بھاگتا کیوں ہے؟ اب دیکھوں گا کہ تو بچ کر کیسے جائے گا تو سمجھتا تھا کہ میں اس دراڑ میں گر کر مر گیا؟

لیکن میں ابھی زندہ ہوں میں ایک درخت میں پھنس کر بچ گیا ہوں اور تو مجھے مردہ سمجھ کر واپس چلا گیا تیرے جانے کے بعد بہ آسانی اوپر چڑھ کر محفوظ جگہ پہنچ گیا تھا۔"

"ایلوس!" کامران نے دانت پیستے ہوئے کہا

"تو سمجھتا تھا کہ میں نے اس پجاری کو یونہی چھوڑ دیا تھا اس نے مجھے سرنگ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا جب میں نے تم لوگوں کو گروشر کے ساتھ اس طرف کا رخ کرتے ہوئے دیکھا تو تم سے پہلے یہاں پہنچ گیا میرا بس چلتا تو پھاٹک کو اندر سے بند کر دیتا اور خانہ بدوش تم کو کتوں کی طرح ہلاک کر دیتے لیکن سلاخیں اتنی بھاری تھیں کہ میں تنہا ان کو اٹھا نہ سکا۔ اس لئے میں یہاں پہنچ گیا۔ اب تم میں سے ایک بھی زندہ واپس نہیں نکل سکے گا۔ میں یہاں سے تم کو دیکھ رہا ہوں اور تم اتنی بلندی پر میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔

کچھ دیر میں خانہ بدوش یہاں پہنچ جائیں گے اور تم اسی سرنگ میں لڑ کر مر جاؤ گے میں شہر کے لوگوں کو بتا دوں گا کہ بوڑھا گروشر شردھا کو اغوا کر کے تمہارے حوالے کر رہا ہے وہ اس کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے"

گروشر خوف سے کانپ رہا تھا کامران بھی پریشان ہو گیا تھا تھکان اور بے خوابی سے وہ پہلے ہی نڈھال تھا۔

"کیا اوپر جانے کا کوئی راستہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کوئی ایسا راستہ نہیں ہے جس سے آدمی یا گھوڑا اوپر جا سکیں" گروشر نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن"

"لیکن کیا؟"

گروشر لیمپ اٹھا کر سرنگ کی دیوار کے ایک حصے کی سمت بڑھا جو دروازے کے قریب تھا اس نے لیمپ اوپر اٹھایا تو روشنی دیوار پر پڑی۔ پتھر کی دیوار میں دھات کی موٹی کیلوں کے قبضوں کی قطار اوپر چلی گئی تھی "پہلے یہاں ایک سیڑھی لگی ہوئی تھی" گروشر نے بتایا۔

"اس کے ذریعے سرنگ کی چھت تک پہنچا جا سکتا تھا جہاں ایک شگاف ہے وہاں پر بیٹھ کر جنوبی حصے والے درے پر نگاہ رکھی جا سکتی تھی تاکہ اگر کوئی حملہ آور ادھر سے داخل ہو تو بروقت دیکھا جا سکے لیکن مدت سے ان قبضوں کو استعمال نہیں کیا گیا اور یہ زنگ لگ کر کمزور ہو چکے ہیں اس شگاف سے باہر نکلی ہوئی ایک چٹان پر پہنچا جا سکتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہاں سے اوپر چڑھنا ممکن نہیں کیونکہ پہاڑی بالکل سپاٹ ہے"

"ممکن ہے کہ ایلوس تک پہنچنے کا کوئی راستہ تلاش کر لوں۔"

کامران نے کہا۔ حالانکہ اس کا سر چکرا رہا تھا۔

قبائلی خوف کے مارے زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔

شردھا تشویش بھری نگاہوں سے کامران کو دیکھ رہی تھی وہ دیوار کی سمت بڑھا تو شردھا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا کامران نے تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"فکر نہ کرو شردھا میں یہ بازی بھی جیت کر دکھاؤں گا"

اس نے آہستہ سے کہا۔

سر کو جھٹک کر اس نے نیند بھگائی دیوار کے پاس پہنچا اور پھر قبضے کو پکڑ کر آزمایا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایک ایک قبضے پر قدم رکھ کر اوپر چڑھ رہا تھا رائفل اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔ پچاس فٹ کے بعد لیمپ کی روشنی بالکل غائب ہو گئی زنگ آلود قبضوں پر پاؤں جماتے ہوئے ہر لمحہ خوف لاحق ہوتا تھا کہ اگر وہ ٹوٹ گیا تو موت یقینی تھی۔ کئی جگہ درمیانی قبضے غائب تھے لیکن اس کے درمیان فاصلہ زیادہ نہ تھا اس لئے کامران کو زیادہ دشواری نہ ہوئی۔ نیچے جلنے والے لیمپ جگنو کی طرح چمک رہے تھے آخر کار اسے اوپر روشنی کی جھلک نظر آنے لگی اور کچھ ہی دیر بعد وہ شگاف سے نکل کر چٹان پر پہنچ گیا جو قدرتی چھجے کی طرح باہر کی سمت نکلی ہوئی تھی یہ صرف چند گز چوڑی تھی کامران نے اس کے پاس بیٹھ کر چند لمحے آرام کیا تیز ہوا کے جھونکوں

کے سبب کھڑے رہ کر توازن قائم رکھنا مشکل تھا لیکن کامران نے پروا نہیں کی وہ پتھروں کے سہارے چٹان کے کنارے تک پہنچا اور جھانک کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔

وہ پہاڑ کے بلند ترین حصے پر تھا وہاں سے سرنگ کا دہانہ تو نظر نہ آتا تھا۔ لیکن کوئی پندرہ بیس فٹ نیچے چٹان کی آڑ میں چھپا ہوا ایلوس اسے صاف نظر آ رہا تھا فاصلہ اتنا تھا کہ کامران اس کو بہ آسانی نشانہ بنا سکتا تھا لیکن تیز ہوا اور مسلسل جاگنے سے آنکھوں سے اتنا پانی بہ رہا تھا کہ نشانہ لینا ممکن نہ تھا وہ رینگتا ہوا کچھ اور نیچے اتر کر ایک چٹان کی آڑ میں پہنچا آنکھیں صاف کر کے اس نے رائفل کندھے سے لگائی دھندلائی نظروں سے نشانہ لیا اور لبلبی دبادی فائر کی تیز آواز پہاڑوں میں گونج اٹھی لیکن گولی ایلوس کے سر سے ایک فٹ کے فاصلے پر واقع چٹان سے ٹکرائی دھندلائی آنکھوں سے اس نے ایلوس کو اچھل کر چٹان کی آڑ میں چھپتے دیکھا اسے معلوم تھا کہ ایلوس کے پاس اب آتشیں اسلحہ نہیں تھا۔

اس نے تیزی سے اترنا شروع کیا وہ ایلوس کو فرار ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اچانک اس نے ایلوس کو آڑ سے نکلتے دیکھا اس کے ہاتھ میں تلوار تھی جو شاید اسے سرنگ میں سے کہیں سے مل گئی تھی جلدی میں کامران کا پیر پھسلا اور توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی وہ کوشش کے باوجود پھسلتا ہوا ڈھلوان سطح سے ہوتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔ قدم ٹھوس پتھر سے ٹکرائے اتنی زور سے جھٹکا لگا کہ ساری ہڈیاں جھنجھنا اٹھیں لیکن وہ موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچا وہ پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو ایلوس صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا اس کی آنکھوں سے جنون جھلک رہا تھا کامران نے پھرتی کے ساتھ تلوار کھینچی۔

''آؤ کامران ہماری تلوار اب قسمت کا فیصلہ کر دے گی۔''

اس نے کہا۔

ایلوس نے اچانک جست لگا کر بھرپور وار کیا کامران نے جھکائی دے کر خود کو بچا لیا ایلوس اپنی جھونک میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ پلٹا تو کامران نے وار کیا تلواریں جھنا کے کے ساتھ ٹکرائیں۔ دونوں میں زبردست مقابلہ شروع ہو گیا۔ کچھ دیر تک کامران مسلسل پیچھے ہٹتا رہا۔ ایلوس فاتحانہ انداز میں بڑھ چڑھ کر وار کر رہا تھا پہاڑی کے بالکل کنارے پر جا کر کامران نے اچانک جھکائی دے کر ایک اور وار کیا اور بچنے کی کوشش میں ایلوس گرتے گرتے بچا۔

''مکار کتے!'' ایلوس نے دانت پیستے ہوئے جوابی وار کیا۔ لیکن کامران پھرتی کے ساتھ ایک سمت ہٹ گیا۔ اور وار خالی گیا۔

''یہ اس بے گناہ شخص کی طرف سے ہے جس کو مار کر تم جھاڑیوں میں پھینک آئے تھے'' کامران نے بجلی کی سی سرعت سے وار کیا۔

وار سر پر پڑا خون کا فوارہ نکلا۔ ایلوس لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا۔

''اور یہ میری طرف سے'' کامران نے دوسرا وار کیا۔

وار ہلکا تھا لیکن ایلوس کا چہرہ خون سے تر ہو گیا وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور ڈھلوان پر لڑھکتا چلا گیا ایک

دلخراش چیخ فضا میں بلند ہو کر دور ہوتی چلی گئی ایلوس نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کامران بے دم ہو کر بیٹھ گیا اب اس میں کھڑے رہنے کی سکت نہ تھی۔ نیچے سے قبائلیوں نے فاتحانہ نعرے بلند کئے تو شور سن کر وہ چونک اٹھا۔ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کس طرح نیچے اترا اس کی آنکھیں تقریباً بند تھیں۔ اچانک کسی کے نرم اور گداز بازوؤں نے اسے سہارا دیا خشک ہونٹوں پر تری محسوس ہوئی اس نے ایسی مٹھاس پہلے کبھی نہیں چکھی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو گھوڑے پر تھا وہ درے سے باہر وادی میں سفر کر رہے تھے۔ شردھا نے پانی کا چھوٹا مشکیزہ اس کے لبوں سے لگا رکھا تھا۔

شہری آبادی میں شریف زادوں کی طرح زندگی گزارنے والا کامران جو اپنی زندگی کے بدترین نقصانات سے دوچار ہو چکا تھا اور جس نے اپنی فطرت میں اس قدر تبدیلیاں پیدا کی تھیں کہ پرانے جاننے والے اسے دیکھتے تو اس پر یقین نہ کر پاتے۔ پھر پہاڑوں کی اس زندگی سے روشناس ہوا۔ شرافت ہی اسے یہاں تک لائی تھی کرنل گل نواز کی خواہش تھی کہ وہ یہ سفر کریں کامران کی خوبیوں نے کرنل جیسے فوجی کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ یہاں لانے کے بجائے اس نے کامران پر بھروسا کیا تھا۔ یہ معمولی بات نہیں تھی اور پھر حالات و واقعات نے خواہ مخواہ کامران کو ایک پراسرار شکل دے دی تھی۔

سیتا اور گرشک دو انوکھے کردار جن سے پہلا تعارف کامران کا کرنل گل نواز کی کوٹھی پر ہی ہوا تھا اور پھر پراسرار افراد کا وہ گروہ جس سے نہ جانے کتنے واقعات وابستہ ہو گئے تھے' لیکن بہرحال انسان کی فطرت کا ایک خاص حصہ ہوتا ہے جس سے ہٹنا اس کے بس کی بات نہیں۔ کامران صحیح معنوں میں کسی طرح کے خزانوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ وہ تو بس کرنل گل نواز کے ساتھ آیا تھا اور پھر گرشک اور سیتا نے اسے ایک نئی شکل دے دی۔

پاتال پرمتی' پران پربھو اور نہ جانے کیا کیا نام دیئے گئے اسے۔ جب کہ بدھ مت سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا اس نے اس کے بارے میں پڑھا تک نہیں تھا' لیکن اب اس پر جو انکشاف ہوئے تھے وہ بڑے حیران کن تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جو بھی ملتا ایسا ہی ملتا سوائے ایک کردار کے جس نے اسے یہ باور کرایا تھا کہ ہوسکتا ہے وہ اس پراسرار کردار کا ہم شکل ہو جس سے اسے منسوب کیا جا رہا ہے۔

بہرحال یہ ساری گزر چکی تھی اور اب وہ بے کسی کے ساتھ ایک گھوڑے کی پشت پر پڑا ہوا تھا اور ایک عورت اسے سنبھالے ہوئے تھی۔ شردھا نے اسے پانی پلایا۔ کامران کے ہوش و حواس آہستہ آہستہ جاگتے جا رہے تھے۔ گزرے ہوئے لمحات کا اسے پورا پورا احساس تھا پھر دوبارہ اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور اس کے بعد جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک پہاڑی چٹان پر سیدھا لیٹا ہوا تھا سر پر کھلا آسمان تھا اور قرب و جوار میں ایک عجیب و غریب خاموشی پھیلی ہوئی تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے آس پاس کوئی موجود ہو۔

نہ جانے کتنی دیر وہ اسی طرح پڑا رہا پھر اچانک ہی اسے شردھا یاد آئی جو اسے گھوڑے پر لئے ہوئے سفر کر رہی تھی شردھا کہاں ہے؟ اس کو اپنے کانوں میں ہواؤں کا شور محسوس ہو رہا تھا اور وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا لیکن وہ شور ہواؤں کا شور نہیں تھا بلکہ اس میں انسانی آواز بھی شامل تھی۔ ان آوازوں میں بچوں کی آواز بھی تھی اور پھر تھوڑی دیر بعد مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ گہری رات زمین پر اتر آئی تھی وہ اپنی جگہ

سے اٹھا اور ادھر ادھر کا جائزہ لینے لگا۔ پھر تھوڑے ہی فاصلے پر اسے جھونپڑیاں سی نظر آئیں وہ یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ وہ انسانی آبادی کے قریب ہے بڑی عجیب وغریب کیفیت محسوس کرنے لگا۔

شردھا کا آس پاس کہیں کوئی پتا نہیں تھا اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ شردھا کو آواز دے اور وہ پھر اپنی جگہ سے اٹھا سامنے جھونپڑی نظر آئی وہ اس کی جانب بڑھا ہر طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔ کبھی کبھی جنگلی جانوروں اور جھینگروں کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ اس نے جھونپڑی کے دروازے سے کان لگا کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہاں کون ہے لیکن کچھ پتا نہیں چل سکا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل چکا تھا اور اس اندھیرے میں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ جھونپڑی کا دروازہ کھسکایا۔ اب وہ جسمانی طور پر اپنے آپ کو بالکل فٹ محسوس کر رہا تھا۔ باہر اب بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی ذرا سا دروازہ کھول کر اس نے تاریکی میں نگاہیں دوڑائیں تو دو افراد کو زمین پر دراز پایا نہ جانے کون لوگ تھے وہ جھک کر انہیں دیکھنے لگا وہ گہری نیند سو رہے تھے ان کے لباس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ انہی علاقوں کے لوگ ہیں تھوڑی دیر تک وہ اس جھونپڑی کا جائزہ لیتا رہا اور پھر وہ باہر نکل آیا مگر جیسے ہی اس نے باہر قدم رکھا۔ اچانک ایک شخص نے اس پر جھپٹنے کی کوشش کی لیکن کامران کی طاقت ور لات اس کے سینے پر پڑی اور اس کے بعد کامران اس کی گردن پر سوار ہو گیا۔ اس کی انتہائی کوشش تھی کہ اس کی آواز نہ نکل سکے اس نے اپنا دایاں ہاتھ زور سے اس کی گردن پر جمایا اور بایاں ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر اوپر سے دبا دیا۔ مدمقابل شدید جدوجہد کر رہا تھا' لیکن کامران نے اس کا بدن گھٹنوں میں دبا لیا تھا اور اس نے اسے چیخنے کا موقع نہیں دیا پھر اس نے پوری قوت سے ایک ضرب اس کے سینے پر لگائی اس بار اس کے ہاتھ کا ایک حصہ اس کے نرخرے پر پڑا اور نہ جانے کیا ہوا کہ اس کے حلق سے ایک مرتے ہوئے بکرے جیسی آواز نکلی۔

کامران نے اسے زمین پر لٹا دیا نہ جانے کیوں اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ شدید خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ قبائلیوں کا کوئی پتا نہیں تھا گزرے ہوئے لمحات اس قدر بے تکے اور سنسنیخیز تھے کہ خود اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ہوا کیا ہے بہرحال کامران نے ایک لمحے تک کچھ سوچا اور اس کے بعد اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ بس جو کچھ ہوا تھا ہیجان کے عالم میں ہی ہوا تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ اسے ہوش نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر تک دوڑتا رہا ہے۔ ایک بار بھی اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ وہ اپنے دوڑنے کی وجہ بھی نہیں جانتا تھا۔

بہرحال تھوڑے فاصلے کے بعد جنگل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں کامران چند لمحوں کے لئے رکا۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح پھول کر پچک رہا تھا اور آنکھیں پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں تاحد نگاہ اونچے نیچے درخت پھیلے ہوئے تھے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ کون سا علاقہ ہے بہرحال اس کی چھٹی حس اسے مسلسل خطرے کا احساس دلا رہی تھی اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے بہت سے دشمن ہوں جو روشنی ہوتے ہی اس کی جانب دوڑ پڑیں گے۔

نہ جانے کتنی دیر تک وہ مزید دوڑتا رہا اس کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ اتنی دور جا نکلے کہ سورج نکلنے

کے بعد کوئی اس تک نہ پہنچ سکے وہ گھنے جنگلوں میں دوڑتا رہا اور اس وقت روشنی پھوٹ رہی تھی۔ جب اس نے اپنے آپ کو جنگلوں سے نکل کر ایک چٹانی میدان میں پایا ایک عجیب سی آواز فضا میں بکھر رہی تھی جس کے بارے میں اسے اندازہ ہوا کہ غالباً اس کے اطراف میں کہیں پانی یا کوئی جھرنا موجود ہے وہ رکے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ چٹانوں میں چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے اور ان پتھروں پر دوڑتے ہوئے بار بار ٹھوکریں لگتی تھیں' لیکن وہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا

اب اسے کسی ایسی بستی کی تلاش تھی جو اس کی خواہش کی تکمیل کر دے۔ اس نے ہزار بار لعنت بھیجی تھی اس مہم جوئی پر یہ مہم جوئی اس کی ذاتی مہم جوئی نہیں تھی بلکہ یہ کرنل گل نواز کی کوشش تھی اور جب کرنل گل نواز ہی ان علاقوں میں نہیں ہے تو پھر بھاڑ میں جائیں گرشک' سیتا اور وہ تمام جو اسے نہ جانے کیا سے کیا بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور وہ تھکن سے بری طرح چور ہو رہا تھا۔ اب اس کے پیروں میں دوڑنے کی سکت نہیں رہی تھی' جس رفتار سے وہ اب تک دوڑتا رہا تھا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے طویل ترین سفر طے کیا ہے پھر اس وقت سورج پوری طرح فضاؤں میں بلند بھی نہیں ہوا تھا کہ عجیب وغریب آوازیں سنائی دیں وہ ٹھٹک کر رک گیا اور ان کی آوازوں کو سننے کی کوشش کرنے لگا تھوڑی سی دیر کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ لکڑی کے تنے بجائے جا رہے ہیں جن کی آوازوں میں اتنی گونج تھی کہ وہ تیروں کی طرح کانوں میں لگ رہی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے یہ آوازیں چاروں طرف سے ابھر رہی ہوں ایک طرف ایک مخصوص انداز میں یہ آوازیں سنائی دیتیں پھر خاموشی طاری ہو جاتی' پھر دوسری طرف سے اس کا جواب ملتا۔ اتنا ناواقف بھی نہیں رہا تھا وہ ان علاقوں سے کہ اس کی وجہ نہ سمجھ سکتا۔

اطراف کے علاقوں میں کسی کے فرار کی اطلاع دی جا رہی تھی اور اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے فرار کا علم ان لوگوں کو ہو چکا ہے۔ یقیناً یہ وہی قبائلی ہو سکتے ہیں جو یہاں جگہ جگہ آباد تھے اور اب وہ اپنے قیدی کے فرار کی اطلاع چاروں طرف دے رہے ہیں جنگل میں رہنے والوں کا طریقہ کار اس نے کتنی بار پڑھا اور سنا بھی تھا اب اس بات میں کوئی شک وشبہ بے کار تھا کہ وہ لوگ اس کی تلاش میں نکل پڑے ہوں گے وہ جس علاقے میں موجود تھا وہ سرسبز و شاداب تھا اور یقیناً وہ اس کے درمیان پناہ لے سکتا تھا وہ تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا اور اس کے بعد آگے بڑھنے لگا چٹانوں کے درمیان طرح طرح کے حشرات الارض نظر آ جاتے تھے۔ لمبی لمبی گھاس بکھری ہوئی تھی کہیں کہیں چھدرے درخت بھی تھے کوئی بھی چٹان سبزے سے خالی نہیں تھی۔ ابھی وہ ایک بلند چٹان سے نیچے اترتا ہوا آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ دفعتاً اس کے کانوں میں انسانی آوازیں گونجنے لگیں۔

وہ چیخ پکار رہے تھے وہ سمجھ گیا کہ وہ اس کے نزدیک آ گئے ہیں اور یقیناً یہ قبائلی ہی تھے اس کی تلاش میں سرگرداں۔ ان لوگوں کو اس تک پہنچنے میں اب یقیناً کوئی دقت نہیں ہو گی۔ کامران نے سوچا لیکن اب وہ زندگی کی قیمت پر بھی ان لوگوں کے قبضے میں نہیں جانا چاہتا تھا اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں پتا نہیں شردھا نے اسے وہاں کیوں چھوڑ دیا یہ تو ایک عجیب وغریب بات تھی۔

بہرحال اب ان تمام باتوں کو سوچنے کا وقت نہیں تھا اس نے ایک سمت کا رخ کیا بس ایک۔ ہی

ترکیب تھی کہ جس وقت تک آگے بڑھ سکتا ہے بڑھتا رہے۔ چنانچہ وہ جھاڑ جھنکار کو روندتا ہوا کسی ایسی جگہ کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا جہاں چھپا جا سکے پھر شاید قدرت ہی کو اس پر رحم آ گیا درختوں کے درمیان گھرا ہوا ایک چٹانی سرا اسے نظر آیا جس کے دامن میں ایک بڑا سا سوراخ موجود تھا۔ جگہ بہت ہی خوب صورت تھی' لیکن اس جگہ لطف لینے کا وقت نہیں تھا بس اسے ان کی نگاہوں سے روپوش ہونا تھا یہ اندازہ لگائے بغیر کہ اس غار میں کیا ہو سکتا ہے۔ وہ اس میں داخل ہو گیا۔ غار کی سطح ہموار تھی لیکن یہ بالکل تاریک تھا اس میں آگے بڑھنے میں البتہ اسے کوئی دقت نہیں ہوئی پہلے تو اس نے یہی سوچا تھا کہ یہ ایک چھوٹا سا غار ہے لیکن اندر داخل ہو کر پتا چلا کہ یہ کوئی غار نہیں بلکہ کوئی سرنگ تھی ممکن ہے یہ درندوں کی پناہ گاہ ہو لیکن اگر درندے یہاں ملے بھی تو باہر اس سے زیادہ وحشی درندے موجود تھے ان کے دوڑنے کی آوازیں کامران کو اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھیں۔

ایک دفعہ تو اسے یوں محسوس ہوا کہ ان میں سے کچھ غار کے بالکل قریب پہنچ گئے ہوں لیکن وہ رکے بغیر آگے بڑھتا رہا اب اسے سرنگ کے اس آخری حصے کی تلاش تھی اس کا سینہ اب بھی دھونکنی بنا ہوا تھا کچھ لمحوں تک ایک دیوار سے ٹک کر کھڑے رہنے کے بعد وہ پھر آگے بڑھنے لگا اور یہ اندازہ لگانے لگا کہ کوئی غار میں داخل ہوا ہے یا نہیں سرنگ میں چلتے چلتے آنکھیں تاریکی سے شناسا ہو گئی تھیں اس کے دائیں جانب اور بائیں جانب سیاہ ناہموار پہاڑی دیواریں تھیں جن میں بعض جگہوں پر ایسے پتھر بھی ابھرے ہوئے تھے کہ اگر وہ ان سے ٹکرا جاتا تو شدید زخمی ہو سکتا تھا پھر اس نے رفتار تیز کر دی وہ نہیں جانتا تھا کہ سرنگ کتنی طویل ہے لیکن کچھ دور چل کر اسے احساس ہوا کہ جیسے وہاں پر حبس نہیں ہے جب کہ غار کے سوراخ میں اتنی دور تک نکل آنے کا مقصد یہ ہو سکتا تھا کہ وہاں ہوا کا گزر نہ ہو اور سانس گھٹ جائے لیکن ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے آپ کو ایک قدرتی ہال میں پایا۔ چاروں طرف خوف ناک دیواریں اسے گھور رہی تھیں گہرا اندھیرا تھا لیکن اب آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں غار بالکل صاف ستھرا تھا اور اپنی سانسوں کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ یہاں آ کر وہ رک گیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے یہ غار فی الحال تو بہترین پناہ گاہ تھا اس نے ایک جگہ منتخب کر لی۔ وہ تقریباً پانچ فٹ کی بلندی پر ابھری ہوئی ایک چٹانی مچان تھی جس پر چڑھنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی اس نے سوچا کہ اگر غار کے دہانے سے اندر داخل ہونے والے اسے تلاش کریں گے تو ممکن ہے ان کی توجہ اس طرف نہ جائے وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ جائیں گے۔ چنانچہ وہ اس پر لیٹ گیا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ ہر لمحے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی دبے قدموں چلا آ رہا ہو اور اچانک ہی حملے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اس چھوٹی سی چٹان پر لیٹے ہوئے اسے تقریباً دس پندرہ منٹ گزر گئے اور جب ذہن نے سنبھالا لیا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے تمام آوازیں معدوم ہو گئی ہوں وہ ایک بار پھر اٹھ کر چٹان پر بیٹھ گیا اور پاؤں نیچے لٹکا لئے دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ عجیب کیفیت ہو رہی تھی دل و دماغ کی۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لوگ اس کی تلاش میں ناکام ہو کر واپس چلے گئے ہوں لیکن ابھی اس غار سے باہر نکلنا مناسب نہیں تھا ایک بار پھر اس نے غار کا جائزہ لینا شروع کر دیا بہ ظاہر یہ سب قدرتی ہی لگ

رہا تھا دیواروں کی تراش میں انسانی ہاتھوں کے کارنامے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے اس کی نگاہ ایک سیاہ دھبے پر پڑی جو غار کے آخری حصے میں ایک دوسری ابھری ہوئی چٹان کے نیچے نظر آ رہا تھا۔ دیر تک وہ اس دھبے کو دیکھتا رہا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی چیز رکھی ہوئی ہو پھر وہ چٹان سے نیچے کودا اور داخلی دروازے سے دور تک دیکھنے لگا اب یہاں پرسکون اور پرہول سناٹا پھیلا ہوا تھا اور ہر سمت سے جو آوازیں ابھر رہی تھیں اب ان کا وجود نہیں تھا وہ مایوس ہو کر چلے گئے تھے۔

پھر اس نے سوچا کہ اس چیز کو دیکھوں کو یہ کیا ہے جو اسے ایک دھبے کی شکل میں نظر آ رہی ہے مزید نزدیک پہنچا تو اس پر ایک اور انکشاف ہوا۔ ایک بڑا سا ٹکڑا ابھرا ہوا تھا اور اس کے نیچے ایک سوراخ تھا۔ اس سوراخ کا قطر تین یا ساڑھے تین فٹ ہو گا لیکن دوسری طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اس سوراخ میں کیا ہے اس نے سوچا بیرونی راستے کی طرف تو قدم بڑھاتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا کہ کہیں جنگلیوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے یا کہیں قبائلیوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔

بہرحال وہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا تھا چنانچہ سارے خطروں سے بے نیاز وہ اس چٹان کے نیچے رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا تقریباً چار یا ساڑھے چار فٹ تک اسے سیدھا ہی گھسٹنا پڑا اور پھر اچانک ہی ایک ایسی ڈھلوان آ گئی جہاں وہ اپنے آپ کو کنٹرول نہیں رکھ سکا اور اوندھے منہ نیچے گر پڑا یہ بھی ایک خوش بختی تھی کہ نیچے جو جگہ تھی اس کی گہرائی چار پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھی تاہم پتھریلے فرش پر گرنے سے اچھی خاصی چوٹ لگی۔ ایک لمحے کے لئے وہ گھبرا گیا تھا وہ اپنے آپ کو سنبھال کر اٹھا تو اسے لگا کہ گرنے کے بعد وہ جس جگہ پہنچا ہے وہ تنگ نہیں ہے اور وہ یہاں با آسانی کھڑا ہو سکتا تھا۔

یہ بھی ایک سرنگ تھی جو تقریباً ساڑھے بیس فٹ تک گئی تھی۔ وہ اس میں آگے بڑھنے لگا اور جب اس کے آخری سرے پر پہنچا تو اسے لگا کہ یہاں انسانی ہاتھوں کی تراش خراش موجود ہے یہ سیڑھیاں تھیں جو نیچے گہرائی تک اترتی چلی گئی تھیں۔ پتا نہیں کیا قصہ ہے۔ اگر عام حالات ہوتے تو اس خوف ناک جگہ پر قدم رکھنے کو جی بھی نہیں چاہتا۔ خوف اور دہشت کے مارے بدن میں لہو منجمد ہو سکتا تھا لیکن اب زندگی جن حالات سے گزر رہی تھی اس میں خوف بے حقیقت چیز ہو کر رہ گیا تھا۔

چنانچہ وہ سیڑھیاں طے کرتا ہوا پھر ایک چوڑے اور بڑے ہال میں داخل ہو گیا عجیب و غریب جگہ تھی تاریکی چھائی ہوئی تھی لیکن دیواروں میں نصب مشعلیں صاف نظر آ رہی تھیں جو بجھی ہوئی تھیں۔ وہ متحیرانہ انداز میں دیواروں کو ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ روشنی اب اتنی بھی نہیں تھی کہ اسے ہر چیز نظر آ جاتی۔ مشعلوں کا اندازہ بھی بس اتفاق سے ہی ہو گیا تھا ایک مشعل کے نزدیک پہنچ کر وہ رکا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ نیچے کیا ہے۔ نیچے ابھرے ہوئے پتھر پر اسے ایک ایسی چیز نظر آئی جسے دیکھ کر وہ چونک پڑا۔

یہ ایک الیکٹرونک لائٹر تھا اس لائٹر کی موجودگی اس کے لئے جتنی تعجب خیز ہو سکتی تھی' اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسے ہاتھ میں اٹھا کر اس نے اس کا بٹن دبایا تو چھوٹا سا شعلہ اس میں سے بلند ہو گیا اس نے اس شعلے کو مشعل سے لگایا تو مشعل فوراً روشن ہو گئی مشعل کی ملگجی اور دھندلی روشنی میں غار کا ماحول نمایاں ہو گیا تھا دیواروں پر سائے رینگ رہے تھے پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ اس نے مشعل اس کی جگہ سے اٹھائی اور

اسے لئے ہوئے دوسری مشعلیں روشن کرنے لگا۔ طلسمی غار روشن ہوگیا تھا اس نے متحیرانہ انداز میں اس کی سپاٹ دیواروں کو دیکھا۔ غار کے ایک اور حصہ میں ایک چوکور دروازہ نظر آیا تھا چنانچہ اب جب وہ یہاں پہنچ ہی گیا ہے تو اس کے اطراف جاننے کی خواہش کیوں نہ پوری کی جائے اس نے سوچا۔

تب وہ ایک مشعل ہاتھ میں لے کر دروازے کی جانب بڑھ گیا دروازے کا کوئی پٹ نہیں تھا بلکہ یہ بھی اس دیوار میں تراش دیا گیا تھا آگے چل کر وہ بائیں سمت گھوم گیا تھا اور یہاں پھر سیڑھیاں نظر آرہی تھیں اور تقریباً پندرہ سیڑھیاں طے کرکے جب وہ نیچے پہنچا تو اسے احساس ہوا کہ یہ دنیا کی سب سے حیرت ناک جگہ ہے۔ یہاں مخصوص قسم کے چوبی صندوق رکھے ہوئے تھے جن میں تالے پڑے ہوئے تھے اچانک اس کے بدن میں ایک تصور ابھرا اور اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے دماغ تھوڑی دیر کے لئے چکرا کر رہ گیا چوبی صندوقوں کا یہ انداز عجیب وغریب تھا اور اس میں پڑے ہوئے تالے کسی خاص بات کی غمازی کررہے تھے وہ اپنے تجسس کو نہ روک سکا اور ایک چوبی صندوق کے پاس پہنچ گیا۔ لکڑی کے ان صندوقوں کی تعداد تقریباً بیس اکیس تھی۔ یہ کافی بڑے تھے اور اتنے وزنی تھی کہ ان میں سے ایک صندوق کو بھی تین چار آدمی مل کر نہیں اٹھا سکتے تھے صندوقوں کے اردگرد کوئی ایسی چیز موجود نہیں تھی جن سے یہ تالے توڑے جاسکتے لیکن نہ جانے کیوں کامران کو یقین ہوگیا کہ وہ پراسرار خزانہ انہی صندوقوں میں موجود ہے جس کے لئے دنیا سرگرداں ہے اور جس کے لئے نہ جانے کتنے لوگوں کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے ہیں آہ! سب کچھ مجھے ہی مل جائے گا؟

جو لوگ اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہ اس کے لئے بھٹکتے ہی پھریں گے اگر زندگی میں یہاں سے واپسی ممکن ہوئی تو کیا مجھے ان خزانوں کی نشاندہی کسی کو کرنی چاہیے۔ کیا فائدہ اور بھی بہت سے لوگ موت کے گھاٹ اتر جائیں لیکن کیا یہ دنیا کا سب سے حیرت ناک واقعہ نہیں ہے جسے خزانے کی ضرورت نہیں ہے اس کے سامنے تو خزانہ آگیا اور جو اس کے لئے مارے مارے پھر رہے ہیں وہ شاید کبھی اس تک نہ پہنچ سکیں بہرحال وہ کافی دیر تک کھڑا اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا تھا اس کے ذہن میں بہت سے خیالات آرہے تھے عام طور سے اس طرح کے واقعات جتنے بھی پڑھے تھے ان میں ایسا ہی ہوتا تھا کہ کوئی مہم جو یا خزانوں کا رسیا خزانوں تک پہنچا تو اس حالت میں کہ وہ ان کے حصول کے قابل نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت کامران بھی ایسی ہی کہانیوں کا ایک کردار تھا' لیکن اس احساس کو وہ دل میں نہ دبا سکا کہ وہ خزانہ دیکھے تو سہی وہ مشعل ہاتھ میں لئے ہوئے ادھر ادھر پھرتا رہا پھر اس نے ایک ایسا پتھر دیکھ لیا جسے توڑنے کی اگر کوشش کی جاتی تو وہ اس کی جگہ سے اکھاڑا جاسکتا تھا مشعل رکھنے کے لئے اس نے ایک جگہ منتخب کی اور اسے سیدھا کھڑا کرکے اس پتھر پر زور آزمائی کرنے لگا۔

پتھر کو مختلف سمتوں میں ہلا جلا کر اس نے باہر نکال لیا پھر مشعل لے کر صندوقوں کے پاس پہنچا اس کے بعد اس نے ایک صندوق کے تالے پر پتھر آزمانا شروع کردیا دس بارہ ضربیں لگانے کے بعد تالا کھل گیا اس نے اسے صندوق کے کنڈے سے نکالا اور صندوق کا ڈھکنا کھول دیا۔ غار میں ایک دم دھندلی دھندلی پراسرار روشنی پھیل گئی صندوق میں اعلیٰ تراش کے بے شمار ہیرے جگمگا رہے تھے اس کے ساتھ ہی سونے کے بے شمار زیورات بھی اس میں موجود تھے جن کی ساخت بتاتی تھی کہ وہ انتہائی قدیم نوادرات ہیں یہ عظیم الشان

خزانہ جس کے لئے کرنل گل نواز' رانا چندر سنگھ' علی سفیان اور قزل ثنائی وغیرہ سرگرداں تھے اور دوسرے ساتھی الگ پراسرار کہانیوں کے حامل لیکن ان میں سے کوئی بھی خزانوں تک نہیں پہنچ سکا تھا اور کامران...... اسے بے ہنسی آئی دل کو ایک فخر کا احساس بھی ہوا۔ وہ خزانہ جس کے لئے نہ جانے کتنے مہم جو اور جرائم پیشہ افراد سرگرداں ہیں اس وقت اس کی تحویل میں ہے اس کے قدموں میں ہے ذہن پر ایک عجیب سا جنون طاری ہوگیا اس نے چند ہیرے اٹھا کر انہیں قریب سے دیکھا سونے کے زیورات کو مٹھیوں میں پکڑ پکڑ کر اٹھایا اور انہیں نیچے گرانے لگا یہ جنونی کیفیت کافی دیر تک طاری رہی' پھر اس کے ذہن میں سناٹے سے گونج اٹھے اسے یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہورہا ہو اس نے آنکھیں بند کیں اور زمین پر پاؤں پھیلا کر صندوق سے ٹک کر بیٹھ گیا جو مشعل وہ اپنے ساتھ لایا تھا وہ اب بھی روشن تھی اور اس کی دھندلی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جگمگاتے ہیروں کی روشنی بھی شامل تھی۔

اس نے اپنے چکراتے ہوئے ذہن کو قابو میں کرنے کی کوشش کی بہت سے حقائق اس کی آنکھوں کے سامنے گزر گئے خزانہ بے شک اس کے قدموں کے تلووُں کے پاس ہے وہ یہ تمام صندوق کھول سکتا ہے۔ تمام خزانے کو اپنے قبضے میں کرسکتا ہے' لیکن کس لئے؟ کیا اسے یہاں سے لے جانا ممکن ہوسکے گا کیا اس خزانے کو حاصل کرکے وہ دنیا کا امیر ترین شخص بن سکتا ہے؟ لیکن اس دنیا میں پہنچنے کے ذرائع کیا ہوں گے جن راستوں سے وہ یہاں تک پہنچا ہے ان راستوں سے کیا خزانے کے ان وزنی صندوقوں کو گزارنا ممکن ہوگا۔ خزانے کسی کے لئے نہیں ہوتے یہ تو صرف ایک تصویر کی مانند ہیں کہ دیکھو اور بھول جاؤ میں صرف انہیں دیکھ سکتا ہوں ان سب کو اٹھا اٹھا کر اپنے سینے پر سجا سکتا ہوں لیکن ان تمام چیزوں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکتا۔ بے بسی کے یہ لمحات جس کیفیت کے حامل ہوسکتے ہیں وہ الفاظ میں بیان نہیں کئے جاسکتے۔

کتنی دیر تک وہ اس عظیم الشان خزانے کو گھورتا رہا اور پھر ایک پتھر لے کر ایک اور صندوق پر پل پڑا اس کی کیفیت بھی مختلف نہیں تھی اندر لاتعداد سونے کے سکے بھرے ہوئے تھے نہ جانے کس دور کے تھے یہ سکے صندوق لبالب بھرا ہوا تھا اور اس صندوق کا وزن اتنا تھا کہ اسے دس آدمی بھی مل کر اپنی جگہ سے جنبش نہیں دے سکتے تھے سینکڑوں من سونا۔ یہ سارے صندوق یقیناً ایسی ہی چیزوں سے بھرے ہوئے ہوں گے۔ خزانہ اتنا وسیع ہے کہ اس سے تو ایک نئی دنیا آباد کی جاسکتی ہے نہ جانے کتنی دیر تک کامران پاگلوں کی طرح کھڑا ان کھلے صندوقوں کو دیکھتا رہا پھر گہری سانس لے کر اس نے صندوق بند کردیئے۔

اگر دل ودماغ کو قابو میں نہ رکھا گیا تو وہ جانتا تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا صرف اور صرف یہ کہ وہ ان دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہوجائے۔ موت اور صرف موت' اس لئے خزانے کا تصور بے مقصد ہے بے کار حماقت نہ جانے کتنی دیر تک وہ اسی انداز میں سوچتا رہا اور آہستہ آہستہ اس نے خود پر قابو پالیا۔

کسی خیال کے تحت اس نے وہ صندوق دوبارہ کھولا جس میں سونے کے سکے بھرے ہوئے تھے اور پھر اس میں سے چند سونے کے سکے نکال کر اپنے لباس میں چھپا لئے اس کام سے فارغ ہوکر وہ واپس پلٹ پڑا اور واپسی کے راستوں پر چل پڑا اس غار میں پہنچا، جہاں مشعلیں جل رہی تھیں۔ بدن پر شدید تھکاوٹ سوار ہورہی تھی اس نے فیصلہ کیا کہ تھوڑی دیر آرام کرلیا جائے اس خیال کے تحت اس نے زمین پر

لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں جلتی ہوئی مشعل اسی جگہ لگادی گئی تھی جہاں سے اسے نکالا تھا اس کے ذہن پر عجیب سا عالم طاری تھا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے در و دیوار ہل رہے ہوں زور سے آنکھیں بھینچ کر اس نے دماغ کو پرسکون کرنے کی کوشش کی اور دیر تک اسی طرح پڑا رہا۔

تب اچانک پیٹ میں ایک ٹیس سی اٹھی اور اسے احساس ہوا کہ وہ بھوکا ہے اس کے ساتھ ہی ہونٹوں پر شدید تپش محسوس ہوئی تھی پیاس بھی تھی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے غار میں تمام چیزیں موجود تھیں لیکن پیٹ کا دوزخ بھرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا سارے خزانے تھوڑی سی خوراک کے آگے ہیچ ہوجاتے ہیں، پانی کے چند قطرے اور غذا کا تھوڑا سا حصہ اس خزانے سے کہیں زیادہ قیمتی ہوسکتا ہے۔ یہ تمام تجربات اسے ذاتی طور پر ہو رہے تھے۔

تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح سوچتا رہا پھر اس نے فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ممکن ہوسکے وہ ان غاروں سے نکل جائے ورنہ یہیں پر بھوک اور پیاس کی شدت سے دم توڑنا پڑے گا اس روح فرسا تصور نے اسے مستعد کردیا۔ بدن میں نہ جانے کہاں سے ایک انوکھی قوت پیدا ہوگئی اور اس نے واپسی کے راستے بڑی مہارت اور ذمے داری کے ساتھ طے کئے۔ آخر کار غار کے حصے میں پہنچ گیا جہاں سے باہر نکلنے کے بعد کھلی فضا میں سانس لی جاسکتی تھی۔ یہاں پہنچ کر اس نے آہٹیں لیں اور اس کے بعد غار کے دہانے سے باہر نکل آیا۔ دل میں یہی خیال تھا کہ پیٹ بھرنے کے لئے غذا تلاش کرے۔ فی الحال یہ جگہ اس کے لئے محفوظ تھی کیونکہ اس جگہ سے وہ لوگ اس کی تلاش کرکے واپس جا چکے تھے لیکن تاحد نگاہ کوئی ایسی چیز نہیں دکھائی دی جسے خوراک کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ گھاس تھی یا پھر درخت جن پر پتوں کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں تھی اس وقت کچھ بھی کھایا جاسکتا تھا بشرطے کہ وہ غذا کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ کوئی پھل والا درخت چاہے اس کی نوعیت کچھ بھی ہو وہ ایسے کسی درخت کی تلاش میں غار سے کافی دور نکل آیا بھوک اور پیاس اب انتہائی شدت اختیار کرچکے تھے نہ جانے اس نے کب سے کھانا نہیں کھایا تھا اور نہ پانی پیا تھا دماغ ساتھ چھوڑتا جارہا تھا بہ مشکل تمام جو قوتیں جمع کی تھیں وہ اب بحال نہیں رہی تھیں۔ پاؤں لڑکھڑا رہے تھے زبان خشک ہوگئی تھی اور ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں وہ دیوانوں کی طرح آگے بڑھتا رہا اس کی آنکھیں مسلسل غذا کی تلاش میں تھیں۔ لیکن یہاں تو کوئی جانور تک نہیں تھا اسی تگ و دو میں کافی دیر گزر گئی اب آنکھوں کے سامنے ترمرے ناچنے لگے تھے اور پیاس کی شدت ناقابل برداشت ہوگئی تھی اس کے حلق سے کراہیں نکلنے لگیں اور پھر جب پیروں میں آگے بڑھنے کی سکت نہ رہی تو وہیں بیٹھ گیا۔ بینائی ساتھ چھوڑتی جارہی تھی، آس پاس چیزیں دھندلا نظر آرہی تھیں۔ اوپر سورج چمک رہا تھا اور دھوپ کی شدت بھی ایسی تھی کہ بدن میں آگ لگی جارہی تھی' لیکن اب کچھ کیا نہیں جاسکتا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں آہستہ آہستہ مفلوج ہونے لگیں اور وہ زمین پر لیٹ گیا۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ حواس ساتھ چھوڑ گئے۔ نہ جانے کتنی دیر اس عالم میں گزری تھی پھر ہوش آگیا وہی کیفیت' کوئی فرق نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ سوچنے سمجھنے کی قوتیں بحال ہوئیں تو ایک بار پھر اس نے اطراف کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر بری طرح اچھل پڑا کہ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں وہ زمین پر بیٹھا تھا اس بار پھر وہ کسی غار ہی میں موجود تھا۔

بدن کے نیچے پتھریلی زمین تھی آس پاس دیواریں نظر آرہی تھیں وہ متحیرانہ انداز میں چاروں طرف دیکھتا رہا پھر زمین پر ہاتھ ٹکا کر اٹھنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوگیا غار سنسنان تھا۔ اس میں نیم تاریکی کی سی کیفیت تھی اور اس کے بارے میں اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ تھی۔ اس نے اپنی جسمانی قوتیں بحال کرکے ایک زوردار آواز منہ سے نکالی۔ اس آواز میں کوئی لفظ نہیں تھا بس ایک چیخ تھی جو غار میں چکرا کر رہ گئی لیکن اس کے جواب میں فوراً تحریک ہوئی کوئی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا فوراً اس کے نزدیک پہنچ گیا اس نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا ایک خوب صورت سی لڑکی تھی جسم پر شاید چیتے کی کھال کا لباس تھا گھنے بال بکھرے ہوئے تھے اور خدوخال انتہائی دلکش تھے۔ وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس پہنچی تھی اور اس کو ہوش و حواس میں دیکھ کر اس کے ہونٹوں سے ہنسی پھوٹنے لگی۔

کامران نے بے بسی کی نگاہوں سے اسے دیکھا ایک بار پھر اس کے منہ سے آواز نکلی۔ اس نے اسے پانی کا لفظ کہا صرف ایک یہی الفاظ منہ سے ادا ہوا تھا وہ تعجب بھرے انداز میں اسے دیکھتی رہی پھر شاید اس کی بات اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ وہاں سے واپس پلٹ گئی پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک برتن میں پانی لے کر آگئی۔ مٹی کا برتن تھا اس وقت یہ پانی اس کے لئے گویا آب حیات تھا کامران نے اس کے ہاتھوں سے پیالہ جھپٹ کر ہونٹوں سے لگالیا۔ تھوڑا سا پانی اس کے سینے پر بھی چھلک کر گرا تھا۔ وہ اسے ایک ہی سانس میں خالی کرگیا پھر اس نے پیالہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اور...... اور...... اور دو'' وہ پیالہ لے کر واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے دوبارہ بھر کر پھر اس کے پاس لے آئی۔ پانی کا دوسرا پیالہ پینے کے بعد کامران نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ لڑکی تھوڑی دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی، اس وقت سوچنے سمجھنے کی قوتیں ساتھ نہیں دے رہی تھیں اور کامران کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ ذہن پر زور دیتا تو ایسا لگتا جیسے دماغ ایک پھوڑا ایک پکا ہوا پھوڑا ہے جو ذرا بھی توجہ دینے سے دکھنے لگتا ہے لڑکی تھوڑی دیر اسے دیکھتی رہی اور پھر واپس پلٹ پڑی۔ اس مرتبہ جب وہ واپس آئی تو اس کے پاس جنگلی پھلوں کی اچھی خاصی مقدار موجود تھی کامران نے یہ سیب نما پھل اسی انداز میں جھپٹے جیسے پہلے پانی کا پیالہ جھپٹا تھا۔ پانی پینے سے جو نقاہت بڑھ گئی تھی وہ پھل کھانے سے رفتہ رفتہ دور ہوگئی۔ پیٹ میں غذا پہنچی تو آنکھیں بھاری ہونے لگیں عجیب سی مدہوشی طاری ہوگئی تھی۔ اس میں نیند کا کوئی تصور موجود نہیں تھا پورا بدن ایک عجیب سی سنسناہٹ کا شکار تھا۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں کچھ اور بہتر ہوتی جارہی تھیں بس آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں۔ پہلی بار یہ خیال اس کے ذہن میں آیا کہ وہ اس غار میں کیسے پہنچ گیا ظاہر ہے اپنے قدموں سے چل کر نہیں آیا تھا۔ کیا یہ لڑکی اسے یہاں تک اٹھا کر لائی ہے۔ کیا یہ غار کسی آبادی میں ہے بہت سے سوالات اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے لڑکی کے بارے میں ایک نگاہ دیکھ کر ہی یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ مقامی ہے اور یقیناً کسی قبیلے کی باشندہ ہے۔ اس کا لباس' اس کا اندازہ یہی بتاتا تھا یہی ممکن ہوسکتا تھا کہ وہ بے ہوشی کے عالم میں اسے یہاں لے آئی، وہ سوچتا رہا۔

یہ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ لڑکی یہاں قریب ہی ہے یا یہاں سے چلی گئی۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ دوسرے لوگوں کو اس نے کامران کے بارے میں بتادیا یا صرف ابھی خود ہی اس کی موجودگی سے واقف

ہے کچھ دیر کے بعد کامران نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔لڑکی اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ کامران نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ زمین پر ہاتھ ٹکائے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔اسے اٹھتے دیکھ کر لڑکی بھی اٹھ کر اس کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''کیا تم میری بات سمجھتی ہو؟'' کامران نے سوال کیا' لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔بس بیٹھی بیٹھی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

کامران کو اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ وہ صرف اشاروں کی زبان سمجھ سکتی ہے۔خود کامران کی زبان نہیں بول سکتی۔کامران کو اس بات سے مایوسی ہوئی تھی۔کاش یہ اس کی زبان سمجھ سکتی تو اس جگہ کے ماحول کے بارے میں سمجھنے میں آسانی ہوتی۔پتا تو چلتا کہ وہ کہاں ہے اور یہاں سے اسے اپنے مقصد کے حصول کے لئے کیا کچھ کرنا پڑے گا۔لڑکی سے گفتگو کرنے کی بہت کوشش کی۔اس لڑکی کی آنکھوں میں ایک شرارت کی چمک تھی' لیکن بس افسوس وہ زبان نہیں سمجھ پاتی تھی وہ پتھر کے بت کی مانند بیٹھی مسکراتی اسے دیکھتی رہی۔کافی دیر اس طرح سے گزر گئی۔تب کامران نے کہا۔

''کچھ کھانے کو اور دو' میری بھوک سیراب نہیں ہوئی'' وہ اس انداز میں کامران کو دیکھتی رہی' جیسے اس کے الفاظ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔اس کے بعد وہ اٹھ کر باہر نکل گئی تو کامران نے کہا۔

''خدا کرے تمہاری سمجھ میں کچھ آ ہی جائے'' اور تقریباً دس منٹ کے بعد جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بھنا ہوا پرندہ موجود تھا خاصا بڑا پرندہ تھا پتا نہیں کون سا تھا لیکن کامران کے لئے بہت پرکشش تھا اس نے یہ پرندہ کامران کی طرف بڑھا دیا اور کامران بھوکوں کی طرح اس پر پل پڑا۔حالانکہ ٹھنڈا تھا اور پتا نہیں کب سے بھنا ہوا رکھا تھا' لیکن یہی کیا کم تھا کہ لڑکی اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔جب اس نے پرندہ چٹ کر لیا تو لڑکی نے دوبارہ اسی مٹی کے پیالے میں پانی پیش کیا۔لڑکی کے بارے میں کامران کے ذہن میں شدید تجسس تھا پتا نہیں وہ کس طرح اسے اٹھا کر یہاں تک لائی ہے۔پھر کامران اپنی جگہ سے اٹھا اور غار کے دروازے کی طرف بڑھا۔لڑکی نے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔لیکن جب وہ غار کے دروازے سے باہر نکلنے لگا تو وہ جلدی سے آگے بڑھی اور اس نے کامران کا بازو پکڑ لیا اور گردن نفی میں ہلانے لگی یہ اشارہ تھا کہ وہ اسے باہر نہیں نکلنے دینا چاہتی لیکن اس کے انداز میں سختی نہ تھی بلکہ نرمی اور التجا تھی کامران اسے غور سے دیکھتا رہا۔پھر اس نے اس کا بازو آہستہ سے دبایا اور صرف غار سے باہر جھانکنے پر اکتفا کی۔کچھ نظر نہیں آیا تھا سوائے اس کے کہ باہر روشنی پھیلی ہوئی تھی غالباً شام جھک آئی تھی کیونکہ اس روشنی میں دھوپ کی تیزی نہیں تھی کامران ایک گہرا سانس لے کر غار میں واپس پلٹا تو لڑکی کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے۔

''میری اجنبی ہمدرد! سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کس طرح مخاطب کروں تم سے ان حالات کے بارے میں کیسے معلوم کروں بہرطور میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے کسی بھی جذبے کے تحت سہی اس وقت میری مدد کی ہے۔جب میں بے بس ہو چکا تھا'' کامران نے یہ الفاظ کہہ کر لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔اس کے انداز میں ایسی کوئی بے چینی یا اظہار نہیں تھا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ وہ یہاں سے چلی جانا چاہتی ہے۔پتا نہیں کس طرح اسے اتنی فرصت مل گئی تھی۔کامران کو خیال گزرا کہ کہیں یہ لڑکی کی ہمدردی اس

کے لئے مصیبت نہ بن جائے۔یقیناً قبائلی آس پاس ہوں گے جو اس کی طویل گمشدگی سے پریشان ہو کر اسے تلاش کرنے نکل پڑیں گے اور کہیں اس طرح کامران کی نشاندہی نہ ہو جائے۔اس نے اشاروں کی زبان میں لڑکی کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی۔اردو اور انگریزی زبان میں بھی بہت کچھ کہا لیکن وہ صرف مسکرانا جانتی تھی یا پھر ایک آدھ بات سمجھ میں آتی تو صرف اشاروں میں جواب دے دیتی۔اس نے یہاں سے جانے کے لئے آمادگی نہیں ظاہر کی۔یہاں تک کہ رات ہوگئی اور تاریکی پھیل گئی۔

کامران بے چینی سے کئی بار غار کے دروازے تک جا چکا تھا۔لیکن ان اطراف میں انسانوں کی آمدورفت نہیں معلوم ہوتی تھی اور یہ تو سوچنا ہی غلط تھا کہ وہ انسانوں سے دور کی کوئی جگہ ہوگی آس پاس نہ سہی کچھ فاصلے پر یہاں کوئی نہ کوئی بستی ضرور ہوگی۔بہرطور تقدیر پر شاکر رہنا تھا حالات کا اندازہ لگائے بغیر یہاں سے نکلنے کی کوشش حماقت ہو سکتی تھی۔چنانچہ وہ رات گہری ہونے کا انتظار کرنے لگا اور جب اسے اندازہ ہوگیا کہ رات کافی گہری ہوگئی ہے تو وہ لڑکی کا بازو پکڑ کر باہر آ گیا۔اس بار لڑکی نے کوئی تعرض نہیں کیا تھا بلکہ اس نے غار سے نکلنے کے بعد کامران کا بازو پکڑا اور ایک سمت چلنے لگی۔کامران خاموشی سے اس کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔چاند آہستہ آہستہ پہاڑوں کی اوٹ سے نمودار ہو رہا تھا اور ماحول پر سنہری چادر پھیلتی جا رہی تھی۔

وہ کامران کو ایک ٹیلے کی جانب لے گئی اور اس پر چڑھنے کا اشارہ کیا۔کامران نے اس کی ہدایت پر عمل کیا' جب ٹیلے پر چڑھ کر اس نے دوسری سمت دیکھا تو اس کے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ایک باقاعدہ آبادی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔یقیناً یہ مقامی آبادی تھی اور لڑکی اسی بستی سے تعلق رکھتی تھی۔کامران نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آبادی کی طرف اشارہ کیا اور اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔جس سے اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ وہ اسی آبادی کی رہنے والی ہے۔

تب کامران نے مختلف طریقوں سے لڑکی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ واپس چلی جائے۔کہیں اس کے گھر والے اس کی تلاش میں یہاں نہ پہنچ جائیں۔اس بات کے جواب میں لڑکی نے نفی میں گردن ہلائی اور وہیں اس چٹان پر بیٹھ گئی۔چاندنی میں وہ پہلے سے زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔کامران نے غور سے اسے دیکھا اسے ایک دم یہ احساس ہوا کہ لڑکی کے نقوش میں مقامی لوگوں کی جھلک نہیں ہے بلکہ وہ ان سے مختلف قسم کے نقوش ہیں۔بہت ہی خوبصورت' سادہ' اس کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک تھی اور وہ چمکیلی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔پتلے پتلے گلابی ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔کامران نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولا۔

''بدنصیبی ہے میری کہ تمہاری اس عنایت کا جواب تمہارے حسب منشا نہیں دے سکتا'' لڑکی پھر مسکرا دی۔

چاند اب صاف نکل آیا تھا اور چاندنی اور تیز ہوگئی تھی اس چاندنی میں بستی صاف نظر آ رہی تھی' لیکن اب اس کے درمیان چہل پہل ختم ہوگئی تھی تقریباً آدھی رات اسی طرح گزر گئی۔اشاروں ہی اشاروں میں باتیں ہوتی رہیں۔وہ اگر اشارہ سمجھ لیتی تو جواب دے دیتی ورنہ خاموش رہتی۔پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک چٹان پر لیٹ گئی۔کامران نے آسمان کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں سے بڑبڑاہٹ نکلی۔

''ظالم آسمان! تو نے مجھے صحیح معنوں میں پراسرار کہانیوں کا ایک کردار بنا دیا ایسے کردار ناول نگاری میں تو نظر آجاتے ہیں۔ حقیقی زندگی سے ان کا کیا تعلق ہوتا ہے؟ آج اس پر یقین آیا ہے۔ یہ رات'' حسین لڑکی' چاندنی' ویسے کئی لڑکیاں اس دوران کامران کی زندگی میں آئی تھیں۔ کچھ نے اس کے دل میں دروازے چھوئے بھی تھے لیکن بس وقت نے اس سے آگے کچھ موقع ہی نہیں دیا تھا۔ خاص طور سے سیتا جو ایک پرسکون ندی کی مانند تھی۔ اس کے ہونٹوں سے بھی گنگناہٹ ابھرتی تھی' لیکن ایک پرسکون گنگناہٹ، آج اس نے کبھی کسی ہلکے پن کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور اب یہ خاتون اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لڑکی بہت خوبصورت تھی اور کوئی بھی نوجوان مرد اس کی قربت کی خواہش کر سکتا تھا۔ اس کے اندر خود سپردگی کی کیفیت بھی تھی۔ بہرحال اسے نظر انداز کرنا پڑا۔ لڑکی غار میں اس کے قریب موجود تھی۔ اس نے پھر کہا۔

''کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ اب تم بھی سو جاؤ یا پھر اپنی بستی میں واپس لوٹ جاؤ کہیں تمہاری یہ دلچسپی میرے لئے عذاب نہ بن جائے'' لڑکی بہ دستور احمقوں کی طرح اس کی صورت دیکھتی رہی تو کامران خود ہی فرش پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ لڑکی اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

کامران دیر تک کروٹیں بدلتا رہا آخر کار نیند اس کی آنکھوں میں آگئی۔ پھر وہ اس وقت بیدار ہوا جب گوشت بھننے کی خوشبو ناک کے نتھنوں سے ٹکرائی اس نے تعجب سے ادھر ادھر دیکھا وہی غار تھا جہاں وہ سویا تھا۔ خوشبو باہر سے آرہی تھی، وہ اٹھ کر باہر گیا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی لکڑیاں جلائے ایک بڑے سے پرندے کو بھون رہی ہے اس کے قدموں کی آہٹ پر اس نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر آہستہ سے ہنس پڑی۔ پھر اس نے انگلی سے پرندے کی طرف اشارہ کیا اور پھر کامران کی طرف انگلی اٹھائی۔

''بہت بہت شکریہ۔ آپ جو کچھ کر رہی ہیں میں اس کا کوئی صلہ ادا نہیں کر سکوں گا آپ کو'' وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور مٹی کے ایک بڑے سے برتن کے پاس پہنچ گئی جس میں پانی بھرا ہوا تھا اس نے پیالے میں پانی بھر کر کامران کو دیکھا اور دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرنے لگی مقصد یہ تھا کہ منہ ہاتھ دھو لو۔ کامران نے پھر اس کا شکریہ ادا کیا، منہ ہاتھ دھونے کے بعد کامران نے پیالہ واپس رکھ دیا اور اس سے سوال کیا۔

''یہ پرندہ آپ کہاں سے لے آئیں محترمہ!'' لڑکی خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''کچھ تو بولو۔ کم از کم اپنی زبان کے کچھ الفاظ ہی مجھے سکھا دو مجھے تو لگتا ہے تم گونگی ہو۔ کامران نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اپنے سینے پر انگلی رکھ کر بولا۔

''کامران!...... کامران!'' لڑکی نے غور سے اسے دیکھا مگر جواب کوئی نہیں دیا تب کامران نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ کتراتی ہوئی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی کامران پر جھلاہٹ سوار ہوگئی، اس نے کہا۔

''یار! تم تو اشاروں کی زبان کا بھی جواب نہیں دے سکتیں۔

چلو نہ دو' کھلا پلا رہی ہو یہی کافی ہے'' بھنا ہوا پرندہ اس نے کامران کی جانب کر دیا تب کامران نے اس کی طرف اشارہ کیا اور اس نے پرندے کی ایک ٹانگ توڑ کر اپنے ہاتھ میں لے لی۔

''بہت بہت شکریہ ویسے آپ کی ان نوازشات سے مجھے خطرہ ہی خطرہ محسوس ہو رہا ہے'' کامران

پرندے کو ادھیڑنے لگا پانی پیا یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ یہ پرندہ کہاں سے لے آئی پھر اس نے میری طرف دیکھا اور یوں لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔

''ہاں ہاں بولو' وہ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے باہر کی طرف اشارہ کیا اور کامران کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ اس کے انداز میں گہری سنجیدگی اتر آئی تھی جیسے وہ اسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ غالباً یہی کہ یہاں سے باہر نکلنے کی کوشش خطرناک ہو سکتی ہے کامران نے سوالیہ انداز میں اس سے پوچھا کہ وہ کب واپس آئے گی تو اس نے آسمان کی طرف رخ کر کے انگلی اٹھائی اور پھر چاند کی شکل بنانے لگی کامران اس کے اشارے کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

''میں انتظار کروں گا'' یوں لگا جیسے اس نے کامران کی بات سمجھ لی ہو۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی اور پھر واپس چلی گئی۔ کامران کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ لڑکی اسے یہاں رکنے کا اشارہ کر گئی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہاں اس کا رکنا مناسب ہوگا بھی یا نہیں' اگر نہیں تو پھر کیا کرنا چاہیے۔ ممکن ہے یہاں کچھ وقت گزارنے کے بعد کوئی بہتر بات سمجھ میں آسکے۔ لڑکی چلی گئی اور کامران غار میں واپس آکر اپنے لباس کو دیکھنے لگا لباس گندہ اور بوسیدہ ہو چکا تھا اسے دھونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ پانی کا تو یہاں کوئی انتظام نہیں تھا' لیکن تھوڑی دیر کے لئے اتارا جا سکتا تھا چنانچہ اس نے اپنے اوپری جسم کو لباس سے آزاد کر دیا۔ پھر اچانک ہی اسے سونے کے ان سکوں کا خیال آیا جو اس نے غار سے نکلتے ہوئے جیب میں رکھ لئے تھے جیبیں ٹٹولی تو پتا چلا کہ سونے کا ایک بھی سکہ اس کی جیب میں نہیں ہے کامران کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یہ سکے کون نکال سکتا ہے اس لڑکی کے علاوہ اور کچھ سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ سکے جیب سے کہیں گر گئے ہوں۔ لڑکی نے اگر یہ سکے نکالے ہیں تو...... تو...... اس سے آگے کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

بہرحال کامران غار سے باہر نہیں نکلا تھا یہاں تک کہ رات ہوگئی۔ وہ بے چینی سے لڑکی کا انتظار کرنے لگا اور جب اس نے محسوس کیا کہ قرب و جوار کی تمام آوازیں معدوم ہوگئی ہیں تو وہ غار کے دہانے پر نکل آیا پھر چاند پچھلی رات کی مانند پہاڑیوں کی اوٹ سے نکلا تو اس نے لڑکی کا ہیولا اپنی طرف آتے دیکھا وہ آرہی تھی۔ نہ جانے کیوں کامران کو خوشی کا سا احساس ہوا وہ مسکراتی ہوئی کامران کے پاس آگئی۔ اس نے اپنے دونوں بازو کامران کے کندھے پر رکھے اور چہرہ کامران کے چہرے کے قریب لا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس کے انداز میں عجیب سی جذباتی کیفیت تھی اور کامران کو اس کے بدن سے اٹھنے والی خوشبو مسحور کئے دے رہی تھی۔

پھر لڑکی اس کے ساتھ غار میں داخل ہوگئی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ سامان بھی لائی تھی جو کسی بڑے سے درخت کے پتے میں لپٹا ہوا تھا اس میں جنگلی سیب' بھنے ہوئے پرندے اور دودھ سے بنی ہوئی پنیر نما کوئی چیز تھی۔ اس نے یہ تمام سامان کامران کے سامنے رکھا اور مسکرانے لگی۔ کامران نے اسے کھانے کی دعوت دی لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے اشارے کرنے لگی کہ وہ کھا چکی ہے۔ کافی سامان تھا اس نے پھل وغیرہ کھائے گوشت چٹ کر گیا اور تھوڑے سے پھل ایک طرف سرکا دیئے اس کے ذہن میں بہت سے سوالات تھے۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا یہ غار محفوظ ہے' لیکن بہرحال جواب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر لڑکی نے خود ہی

کامران سے باہر چلنے کی فرمائش کی اور دونوں غار سے نکل کر ایک سمت بڑھ گئے آج لڑکی نے ایک دوسرا رُخ اختیار کیا تھا ایک چھوٹا سا درہ تھا جو دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا اس کا اختتام ایک بہت حسین جگہ ہوتا تھا جہاں چاندنی کا آبشار بہہ رہا تھا۔ چھوٹی سی بلندی سے جہاں سے پانی گر رہا تھا غالباً اوپر کوئی چشمہ تھا۔ یہ گرتا ہوا پانی بہتا ہوا بہت دور تک چلا جاتا تھا۔ یہ جگہ بہت حسین معلوم ہوتی تھی۔ جس جگہ پانی گر رہا تھا وہاں تقریباً بارہ تیرہ گز کی چوڑائی میں تالاب سا بن گیا تھا یہ تالاب دیکھ کر کامران کی طبیعت مچل اٹھی اس نے فوراً ہی اپنا اوپری لباس اتارا اور نچلے لباس سمیت پانی میں داخل ہو گیا۔

لڑکی تالاب کے کنارے بیٹھ گئی اور مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ٹھنڈے پانی کے اس تالاب نے گویا بدن میں نئی زندگی دوڑا دی۔ تمام گرد مٹی صاف ہو گئی تھی۔ پھر کامران نے اوپری لباس کو بھی رگڑ رگڑ کر دھویا لڑکی خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھی رہی تھی۔ کئی بار اس کی کھنکتی ہوئی ہنسی بھی گونجی تھی۔ وہ ہنستی تو اس کے ہونٹوں کا زاویہ بے حد دل کش ہو جاتا اور ایسے موقعوں پر کامران کو نگاہیں چرا لینا پڑتیں۔ پھر جب وہ خوب اچھی طرح نہا کر پانی سے باہر نکلا تو وہ کامران کے نزدیک پہنچ گئی اس نے دونوں نرم و نازک ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیئے اور عجیب سے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

کامران نے ایک دم اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر اس کا بازو پکڑ کر وہ اسے ساتھ لئے چٹان پر آ بیٹھا۔ لڑکی کچھ عجیب سے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً ایک بار پھر درختوں کے تنے بج اٹھے اور دونوں چونک پڑے۔ لڑکی چوکنے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگی اور پھر دہشت سے کھڑی ہو گئی اس نے کامران کا بازو پکڑا اور غار کی طرف دوڑنے لگی۔ دوڑتے دوڑتے کامران نے اپنا اوپری لباس جسے اس نے خشک ہونے کے لئے چٹان پر ڈالا تھا اٹھا لیا درختوں کے تنے بجنے کی آواز وہ پہلے بھی سن چکا تھا۔ یہ یقینی طور پر ایک دوسرے کو خبر کرنے کے لئے بجائے جاتے تھے۔

اس کا دل دھک سے ہو گیا گویا ان لوگوں کو اس کے یہاں موجود ہونے کی اطلاع مل گئی ہے۔ وہ دوڑتے ہوئے غار میں واپس آ گئے۔ لڑکی نے اسے غار کے اندرونی حصے میں پوشیدہ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر خود برق رفتاری سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد کامران غار کے دروازے تک آ گیا اور ان آوازوں کو سننے لگا جو چند لمحات تک تو فضا میں گونجتی رہیں اور اس کے بعد ایک ہیبت ناک سکوت چھا گیا اب اسے انتظار تھا کہ اس کی تلاش کے لئے کیا کارروائی ہوتی ہے۔ پتا نہیں یہ نشان دہی اس کے لئے کی گئی ہے یا پھر کوئی اور بات تھی۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے لیکن اب کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد لڑکی واپس آ گئی اس کی آنکھوں سے سکون کا اظہار ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو سب ٹھیک ہے کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ جانے پر آمادہ تھی اس نے کامران کی طرف ہاتھ ہلایا اور اشارے سے اسے بتایا کہ پھر آئے گی وہ انتظار کرے۔ پھر وہ چلی گئی۔ لیکن کامران اب سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا سارا کھیل بگڑ گیا تھا۔ حالات ایک عجیب شکل اختیار کر گئے تھے۔ آہ!...... کیا زندگی کا اختتام اسی جگہ

ہو جاتا ہے واہ بھئی واہ !...... کہاں سے آغاز ہوا تھا اور کہاں انجام ہوگا لیکن اسی کو تقدیر کہتے ہیں کوئی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ شہری آبادی میں رہنے والا ایک سادہ لوح انسان جو محنت مزدوری کر کے نوکری کر کے زندگی گزار رہا تھا۔ ایک ایسی جگہ پہنچے گا جہاں سے اسے اس مہم جوئی کا موقع ملے گا اور اس کے بعد اس کے ساتھ جو کچھ ہوگا۔ وہ یہ ہوگا یہ سوچیں بڑی عجیب تھیں۔

اب کامران کے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی جس طرح بھی بن پڑے وہ یہاں سے چلا جائے، حالانکہ اس انوکھی زندگی نے اسے جو عجیب و غریب صلاحیتیں بخشی تھیں۔ جو جسمانی قوتیں وہ اپنے اندر محسوس کر رہا تھا وہ ناقابل یقین سی تھیں اور وہ شدت سے اپنے بارے میں سوچ کر حیران ہو جاتا تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ کرنل گل نواز، رانا چندر سنگھ، علی سفیان اور اس کے ساتھ دوسرے تمام لوگ خاص طور سے وہ انوکھا کردار جس کے بارے میں سوچ کر بس حیرانی ہی ہوتی تھی حالانکہ یہ سب کچھ بہت عجیب و غریب تھا کم از کم مذہبی طور پر بھی وہ امینہ سلفا کے بارے میں یہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ صدیوں سے زندہ رہنے والی ایک عورت ہے۔ اور اس کی کہانی صدیوں پر محیط ہے ایسا قصے کہانیوں میں تو ملتا تھا حقیقتیں کیا ہیں یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر گرشک اور سیتا جو اسے پاتال پرمتی کا باسی کہتے تھے پتا نہیں یہ سب کچھ کیا ہے۔ کیا ہوگا پتا نہیں یہاں سے نکلنا نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔ کیا اس کی تقدیر میں یہی ہے کہ جنگلوں میں بھٹکتا ہوا مر جائے۔ آخر ان وحشیوں کے درمیان کب تک چھپا رہ سکتا ہے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ کچھ اس طرح کی کیفیت ہوئی کہ غار کے اندر اسے الجھن سی ہونے لگی او وہ غار سے باہر نکل آیا۔ پھر ایک کھلی جگہ آ کر لیٹ گیا۔ دل الٹ رہا تھا کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا اپنی زندگی کے بارے میں۔ بلاوجہ تمام خدشات ذہن پر لاد رکھے ہیں جو ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ اگر موت آنی ہے تو آ جائے مجبوری ہے۔

نہ جانے کب آنکھ لگ گئی اور نہ جانے پھر کب صبح ہو گئی آنکھ کھول کر دیکھا تو وہی بلا اس کے نزدیک موجود تھی وہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھی تشویش زدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی صبح اٹھنے کے بعد اس کا چہرہ سامنے آیا تھا۔ دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا لیکن نہ جانے کیوں کامران کو غصہ سا آنے لگا خواہ مخواہ وہ عذاب اس پر نازل ہو گیا ہے کامران کو جاگتے دیکھ کر وہ اٹھی اور اس کے قریب آ گئی اس نے آگے بڑھ کر کامران کے سینے پر ہاتھ رکھا اور کامران ایک تھکی تھکی سانس لے کر اٹھ بیٹھا تب اس نے پیار سے اس کا بازو پکڑا اور غار کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

''اور میں جانتا ہوں کہ تم نے میرے لئے کھانے کا بندوبست کیا ہوگا بس کیا کہوں کاش! میں اس سے آگے بھی تمہارے بارے میں کچھ سوچ سکتا لیکن وقت اس کی اجازت نہیں دیتا'' وہ ویسے ہی ایک بڑے پتے میں کھانے پینے کی چیزیں لے کر آئی تھی۔ اس نے اس کے ساتھ ہی ایک اور پوٹلی سی اٹھائی جو ایک گوشے میں رکھی ہوئی تھی اور اسے کامران کے سامنے کر کے کھول دیا اس میں کسی خوب صورت درندے کی کھال تھی۔ غالباً گل دار کی۔ اس نے وہ کھال اٹھائی اور اپنے بدن کے نچلے حصے پر اس طرح پہنی جیسے کامران کو اس کے استعمال کا طریقہ سمجھا رہی ہو۔ کامران حیرت سے اسے دیکھنے لگا لڑکی جو کچھ بتا رہی تھی۔ وہ حیران کن بات تھی وہ کامران سے کہہ رہی تھی کہ یہ کھال وہ اپنے بدن پر لپیٹ لے۔

''کیوں......؟'' کامران نے بے اختیار سوال کیا اور وہ خاموشی سے کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنے ساتھ لائے ہوئے بنڈل میں سے دوسرا سامان نکالا جو عجیب سے چمڑے کی بوتلوں میں بند تھا کامران انہیں دیکھنے لگا بڑے بڑے جانوروں کی آنتیں۔ کسی طرح پھلا کر انہیں بوتل کی شکل دے دی گئی تھی ان بوتلوں میں مختلف قسم کے سیال بھرے ہوئے تھے کامران کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گیا تھا چند لمحات وہ سوچتا رہا پھر اس نے اس سے تعاون کیا۔ اس سے رخ بدل لینے کی درخواست کر کے کامران نے اپنا نچلا لباس اتارا اور وہ مضحکہ خیز کھال پہن لی' لیکن خود اسے اپنے آپ پر ہنسی آ رہی تھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ اس وقت وہ ٹارزن کی نسل کا آخری فرد معلوم ہو رہا ہے' لیکن لڑکی تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی اس نے بوتلوں سے سیال نکال کر لکڑی کے ایک برتن میں ڈالا اور پھر اسے ملانا شروع کر دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ سیال میں لتھڑ گئے۔ پھر اس نے وہ سیال کامران کے بدن پر ملنا شروع کر دیا۔

کامران سمجھ گیا کہ وہ اسے مقامی آدمیوں کا روپ دینے کی کوشش کر رہی ہے بہرحال غریب مہذب علاقے میں جنگل کی ایک لڑکی کامران کا حلیہ بدل رہی تھی اور کامران کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے آپ پر خوب ہنسے' لیکن اندر سے اس کا دل یہ بھی کہہ رہا تھا کہ یہ بات کام کی ثابت ہوگی۔

اس کے بعد لڑکی نے اسے غور سے دیکھا اور اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ باہر اب دھوپ پھیل چکی تھی۔ اس دھوپ میں اس کے بدن پر اور چہرے پر ملا ہوا سیال خشک ہونے لگا اس نے اپنی کلائیوں کو دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دھوپ لگنے کے بعد وہ بالکل ان لوگوں کے رنگ کی ہو گئی تھیں یہی کیفیت بقیہ بدن کی بھی تھی۔

کامران سوچنے لگا کہ یہ تصور لڑکی کے ذہن میں کیسے آیا اور یہ اشیاء اس نے کہاں سے حاصل کیں۔ بہرحال وہ لڑکی کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ لڑکی نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تھا، تاحد نگاہ چٹانیں' درخت اور جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ آبادی کا یہ دوسرا حصہ دن کی روشنی میں کامران نے پہلی بار دیکھا تھا لیکن اسے دیکھنے کے بعد کوئی صحیح فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ البتہ اس سفر کے ساتھ یہ خیال اس کے ذہن میں ضرور ابھرا کہ ان لوگوں میں گھل مل کر فرار کا کوئی راستہ تلاش کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ چھپ کر یہ ممکن نہیں تھا کتنا بہترین منصوبہ بنایا ہے اس نے۔ تعجب کی بات ہے کامران نے دل میں سوچا' لیکن لڑکی نہ جانے اسے کہاں لے جا رہی تھی۔

نہ جانے کامران نے کیا سوچا کہ وہ ایک دم رک گیا لڑکی نے اسے آگے چلنے کا اشارہ کیا اور کامران ایک گہری سانس لے کر پھر آگے بڑھ گیا۔ اب وہ ایک پتلے درے سے گزر رہے تھے جس کے دونوں سمت پہاڑوں کی بلندیاں تھیں درے سے داہنی سمت گھوم کر وہ ایک چٹانی سمت پہنچ گئے۔ یہاں چٹانوں میں متعدد غار بکھرے ہوئے تھے' انہی غاروں میں سے ایک کی طرف اس نے رخ کیا اور کامران گھبرا گیا۔

''کیا غاروں کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں ہے؟'' لڑکی مسکرا دی اور ایک غار میں داخل ہو گئی۔

''بی بی! تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ زندگی مجھے بھٹکا کر یہاں تک لے آئی ہے۔ اب آپ نے مجھے جوکر بنا دیا ہے تو اس کے بعد مزید کیا سلوک کریں گی آہ! کاش آپ مجھے ان

علاقوں سے باہر جانے کا راستہ بتا دیتیں تو آپ کا یہ احسان سارے احسانوں پر بھاری ہوتا۔''

''میں تمہیں زندگی کی طرف ہی لے جا رہی ہوں چلتے رہو۔''

اچانک ایک آواز سنائی دی اور کامران حیرت سے اچھل پڑا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ انگریزی زبان تھی آس پاس کوئی اور نہیں تھا اور یہ آواز اسی لڑکی کے ہونٹوں سے نکلی تھی' لیکن دماغ پھٹ جائے گا اگر یہ الفاظ اس لڑکی کے ہوئے۔ کیا یہ دیوانگی کا دور شروع ہو چکا ہے۔ لڑکی نے ایک بار پھر مسکراتی نگاہوں سے کامران کو دیکھا۔ کامران نے پھولی سانس کے ساتھ کہا۔

''تم نے......تم نے کچھ کہا......؟''

''ہاں اب مجبوری ہے اب تمہاری بات کا جواب دینا ہی پڑے گا'' اس بار کامران نے لڑکی کے ہونٹ بھی ہلتے ہوئے دیکھے تھے۔ آواز بھی اسی کے ہونٹوں سے نکلی تھی دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ممکن تھا کہ چکرا کر نیچے گر پڑتا بہ مشکل تمام غار کی نزدیکی دیوار کا سہارا لیا تھا۔ کامران کی پھٹی پھٹی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ شرارت آمیز نگاہوں سے کامران کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ لمحے کامران آنکھیں پھاڑے اسے گھورتا رہا اور پھر اس کے قریب پہنچ گیا۔

''خدا کی قسم کیا یہ تم ہی بولی تھیں؟ کیا یہ تمہاری ہی زبان تھی؟''

''تم اندر تو چلو باہر کی دنیا ابھی تمہارے لئے اتنی محفوظ نہیں ہے'' اس بار لڑکی نے سنجیدگی سے کہا اور کامران نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

''خدا کی پناہ!......خدا کی پناہ!......میں پاگل ہو گیا ہوں یا پھر؟''

''بات سنو! اگر پاگل بھی ہو گئے ہو تو کم از کم اندر چلو'' لڑکی نے کہا اور اس بار اس نے مضبوطی سے کامران کا بازو تھام لیا تھا لیکن کامران کی جو کیفیت تھی اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ یہ تو ناقابل یقین بات ہوئی تھی کیسے یقین کر لیتا۔ ذہن کا وقفہ اتنا طویل نہیں ہوتا یہ اس کی سماعت کا دھوکا نہیں تھا۔ لڑکی اب اس کے ہر سوال کا جواب صاف ستھری انگریزی میں دے رہی تھی دفعتاً کامران نے اسے عقب سے پکڑ لیا۔

''سنو لڑکی سنو! انسان کی قوت برداشت کے بارے میں جانتی ہو کچھ......؟''

''زیادہ نہیں جانتی'' اس کی آواز میں اس بار شوخی تھی۔

''جتنا بھی جانتی ہو اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ ممکن ہے دیوانگی کے عالم میں تمہارے یہ خوب صورت بال نوچ ڈالوں یا تمہیں کھسوٹنے لگوں۔ مجھے بتاؤ کہ اچانک یہ تمہارا گونگا پن ختم کیسے ہو گیا اور ایک دم تم نے انگریزی کیسے بولنا شروع کر دی؟''

''سنو! تم نے اپنا نام کامران بتایا تھا نا۔ تم ایک مہذب انسان ہو میں جانتی ہوں، نہ تم میرے بال نوچو گے اور نہ تم مجھے کھاؤ گے۔ آ جاؤ چند لمحات اور انتظار کر لو سب کچھ پتا چل جائے گا'' بس کیا بتایا جا سکتا تھا اس وقت کامران کی جو کیفیت تھی۔ شاید اس کے لئے الفاظ نہیں تراشے جا سکتے تھے۔ یہ غار بھی سرنگ نما تھا، اس کا اختتام ایک بڑے سے ہال میں ہوا۔ جس کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی ہال میں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور یہ روشنی بیٹری سے چلنے والے لیمپ کی تھی۔ روشنی کے قریب ہی ایک شخص تھا۔ جسے دیکھ کر کامران نے

متحیرانہ انداز میں پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ سڈول بدن کا مالک ایک آدمی تھا۔ جو بارہ سنگھے کی کھال پر بیٹھا ہوا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ ہر بات انوکھی' ہر چیز انوکھی اس نے اس شخص کو غور سے دیکھا وہ اس طرح کے ہی رنگوں میں رنگا ہوا تھا جیسے یہاں کے قبائلی ہوتے ہیں لیکن یہ کتاب جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ قدموں کی آہٹ پر چونک کر اس نے کامران کو دیکھا اور پھر کتاب کو درمیان سے کھلا چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''سیلینا مجھے تمہارے بارے میں بتا چکی ہے۔ تمہارا نام کامران ہے۔ ہیلو!'' اس نے دایاں ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھا دیا۔ کامران چکراتے ہوئے ذہن کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔ اس کا پھیلا ہوا ہاتھ نہ جانے کس طرح کامران کے ہاتھ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ یہ صرف ایک اعصابی عمل تھا اس شخص نے لڑکی کی طرف رخ کر کے کہا۔

''سیلینا باہر کا ماحول تو پرسکون ہے؟''

''ہاں پاپا بالکل'' لڑکی نے جواب دیا اور ایک ابھرے ہوئے پتھر پر بیٹھ گئی اس کے ہونٹوں سے ہنسی پھوٹی پڑ رہی تھی اور اس کی شریر آنکھیں کچھ اور خوب صورت ہو گئی تھیں۔

''دیکھو عالمِ حیرت میں حرکت قلب بھی بند ہو سکتی ہے۔''

''نہیں بالکل نہیں آدمی صرف بے ہوش ہو سکتا ہے۔''

''کیا تم یہ پسند کرو گے کہ میں ہمیشہ کے لئے بے ہوش ہو جاؤں۔''

''بالکل نہیں'' وہ مسکرا کر بولا۔

''تو مجھے سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے بدن پر کھال کا یہ لباس اور تمہارا یہ میلا رنگ اور اس پر بہترین انگریزی اور یہ کتاب۔''

''میرا ایک جملہ تمہاری تمام حیرتیں ختم کر سکتا ہے وہ یہ کہ تم مجھے ہوسٹ مین کے نام سے پکار سکتے ہو۔ میرا نام ہوسٹ مین ہے اور یہ میری بیٹی سیلینا'' کامران پتھرائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا تو وہ مسکرا کر بولا۔

''بیٹھو پلیز! بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے اور سیلینا تم ذرا غار کے دہانے پر نگاہ رکھو احتیاط بہت اچھی چیز ہے''

''پاپا! آپ بالکل فکر نہ کرو میں نے دور دور تک کا جائزہ لے لیا ہے۔''

''گویا تم ہمارے سر پر مسلط رہنا چاہتی ہو؟''

''ہاں پاپا! بالکل کیونکہ مسٹر کامران میری دریافت ہیں''۔

''ٹھیک ہے لیکن زندگی کی حفاظت بھی کرو جاؤ ایک نگاہ اور باہر دیکھ آؤ'' لڑکی اکتائے ہوئے انداز میں باہر نکل گئی۔ کامران پر اب بھی حیرتوں کے حملے ہو رہے تھے، لڑکی نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ کیا ہی شان دار اداکاری کی تھی اس نے۔ کئی دن تک کامران کے ہر سوال کے جواب میں اس کی آنکھیں صرف سادگی سے مسکراتی رہتی تھیں۔ ایک بار بھی اس کے چہرے سے یہ اظہار نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کی بات سمجھ چکی ہے۔ بہ ظاہر وہ ایک سادہ دیوار کی مانند تھی لیکن درحقیقت! اوہ میرے خدا!...... میرے

خدا!...... اچانک ہی اس نے ایک بے تکا سوال کیا۔

''مسٹر ہوسٹ مین! آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟''

''سیلینا نے بتایا'' اسی وقت لڑکی واپس آ گئی۔

''سب ٹھیک ہے پاپا میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں نے باہر کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے اور اس کے بعد مسٹر کامران کو یہاں تک لائی ہوں، میں بھلا کوئی رسک لے سکتی تھی''

''یقیناً تم واقعی بہت ذہین ہو''

''نہ صرف ذہین بلکہ فطین بھی۔'' کامران نے بے اختیار مسکرا کر کہا اور دونوں ہنسنے لگے۔ پھر کامران نے کہا۔

''اگر آپ چاہتے ہیں مسٹر ہوسٹ مین کہ میری دماغی کیفیت متاثر نہ ہو جائے تو براہِ کرم مجھے اپنے بارے میں تفصیل بتائیے''

''ہاں کیوں نہیں مختصر الفاظ میں تمہیں یہ بتایا جاسکتا ہے کہ میں یہاں خزانوں کی تلاش میں آیا تھا'' ہوسٹ مین نے کہا اور کامران اس کی صورت دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''اور آپ کی بیٹی' بس یہ دو افراد یہاں آئے تھے'' کامران کے سوال پر ہوسٹ مین کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے الجھن کے آثار نمایاں ہو گئے پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں۔ میں اکیلا نہیں تھا لیکن اس جواب کے ساتھ ہی میں اب تمہارے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں؟''

''میرا نام کامران ہے اور آپ یہ سمجھ لیجئے کہ میں بھی یہاں خزانوں کی تلاش میں آیا تھا''

''وہی سوال تم سے بھی کرتا ہوں تنہا......؟''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بھلا ایسے علاقوں کا سفر تنہا کیا جاسکتا ہے؟''

''اس کا مطلب ہے تمہارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں؟''

''ہیں نہیں تھے ہم بہت سے افراد تھے جن میں ایک لڑکی تھی اور تین میرے دوسرے ساتھی دو پراسرار طور پر غائب ہو گئے دو ابھی یہاں موجود قبائلیوں کی قید میں ہیں میں بھی انہی کا قیدی تھا لیکن وہاں سے نکل بھاگا ہوں''

''میں جانتا ہوں'' ہوسٹ مین نے جواب دیا۔

''اس طرح آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہاں میری آمد کا مقصد کیا ہے؟''

''ہاں لیکن میرے دوست تمہاری پہنچ مجھ سے کہیں آگے ہے۔ معاف کرنا میں بہت زیادہ گھماؤ پھراؤ کا آدمی نہیں ہوں، صاف گفتگو کرتا ہوں اور یہ کہتے ہوئے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا کہ تم میرے لئے ایک اہم شخصیت بن گئے ہو، جانتے ہو کیوں؟''

''نہیں جانتا' لیکن جاننا چاہتا ہوں۔''

تمہارے لباس سے سونے کے چند سکے برآمد ہوئے ہیں جن کا تعلق اسی خزانے سے ہے، جس

نے بے شمار افراد کو پاگل بنا رکھا ہے'' کامران چونک پڑا اسے وہ سکے یاد آ گئے جو اس نے اس عظیم الشان خزانے سے حاصل کئے تھے اور جو بعد میں ہوش آنے کے بعد اسے نہیں ملے۔ سکوں کی گمشدگی کا راز اب معلوم ہو گیا تھا۔ کامران کا ذہن برق رفتاری سے کچھ فیصلے کرنے لگا ہوسٹ مین اور سیلینا کی اپنے آپ میں دلچسپی کو اب وہ اچھی طرح محسوس کر چکا تھا اور اب اسے اس کی روشنی میں ان لوگوں سے گفتگو کرنی تھی۔ میں نے کہا۔

''ہاں وہ سکے میرے پاس موجود تھے اور بے ہوشی کے دوران غائب ہو گئے۔''

''غائب نہیں ہوئے میرے پاس وہ تمہاری امانت کے طور پر موجود ہیں۔''

''ٹھیک ہے ان ویرانوں میں اس امانت کا کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟ مسٹر ہوسٹ مین بے کاری چیز ہے وہ خزانہ اب ہمارے لئے''

''نہیں دوست ایسی بات نہیں۔ میں ابھی تمہیں ساری تفصیلات نہیں بتاؤں گا لیکن آہستہ آہستہ تمہیں چند باتیں بتا دی جائیں گی، میری طرف سے ایک پیش کش قبول کرو۔''

''پیش کش......؟''

''ہاں۔''

''وہ کیا......''؟

''وہ یہ کہ میں تمہیں یہاں مکمل طور پر پناہ دے سکتا ہوں۔ تمہارے ساتھیوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا' لیکن ان کی بازیابی میں بھی کامیاب ہو سکوں گا یا نہیں اگر ان سے تمہارا کوئی ذہنی لگاؤ نہیں ہے تو یوں سمجھو کہ تقدیر نے تمہیں تنہا یہ موقع دیا ہے ہمارے اور تمہارے درمیان سودے بازی ہو سکتی ہے۔ بشرطے کہ تم اسے پسند کرو اور اس سلسلے میں اپنی شرائط پیش کرو۔''

''سودے بازی......؟''

''ہاں''

''وہ کس قسم کی......؟''

''مجھے جواب دو کہ سونے کے وہ سکے تمہارے پاس کہاں سے آئے؟'' ہوسٹ نے کامران کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''فرض کرو ہوسٹ مین! میں اس خزانے کا راز معلوم کر چکا ہوں ایسی حالت میں کیا ہوگا؟'' ہوسٹ مین کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو گئی۔ کامران کو یہ شخص بہت ذہین اور زیرک محسوس ہو رہا تھا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ تم کسی طرح اس خزانے تک پہنچ چکے ہو۔ میرا دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ فوراً ہی تم سے اس کے بارے میں تفصیلات معلوم کر لوں لیکن ظاہر ہے تم نہیں بتاؤ گے کیونکہ اس پر تمہاری زندگی کا بھی انحصار ہے۔ بتاؤ کہ کیا میں نے غلط کہا ہے؟''

''نہیں بالکل ٹھیک'' کامران نے جواب دیا۔

''تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم خزانے کے اس راز میں مجھے بھی شامل کر لو۔ میں قبائیلیوں سے تمہارا

تحفظ کروں گا تمہیں ہر طرح کی آسانیاں فراہم کروں گا اور اس کے بعد ہم خزانہ حاصل کریں گے اور یہاں سے نکل چلیں گے کیا تم اس پر تیار ہو؟''

''کیا یہاں سے نکلنا اتنا آسان ہوگا؟''

''تم آسانی کی بات کرتے ہو، میں کہتا ہوں یہ ہماری زندگی کا سب سے مشکل کام ہوگا' لیکن خزانے مشکل ہی سے حاصل ہوتے ہیں، البتہ میں تمہیں اس کا یقین دلاتا ہوں کہ میں انتہائی حد تک خزانے کو یہاں سے نکالنے کے لئے آسانیاں فراہم کر سکتا ہوں میرے پاس اس کے ذرائع موجود ہیں کامران پر خیال نگاہوں سے ہوسٹ مین کو دیکھنے لگا اس شخص کی قربت کامران کے لئے نہایت بہتر ثابت ہو سکتی تھی اس نے سوچا اور بعد کے معاملات تو خیر بعد میں ہی دیکھے جاتے وقتی طور پر کوئی موثر سہارا ضروری تھا چنانچہ کامران نے مدھم لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے مسٹر ہوسٹ مین! میں آپ کے ساتھ تعاون کر سکتا ہوں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب انسان کسی چیز سے مکمل طور پر مایوس ہو جائے تو اس میں دوسروں کی شمولیت اسے گوارا کر لینی چاہیے۔ عام حالات میں شاید کسی بھی قیمت پر تعاون کی پیش کش نہ کرتا، لیکن میں خزانہ یہاں سے لے جانے میں بالکل بے بس ہوں بہر طور میں آپ کی خواہش پوری کرنے کو تیار ہوں''

ہوسٹ مین مستعدانہ انداز میں کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے پر جوش انداز میں کامران سے مصافحہ کیا۔

''اور تم مجھے ایک بہترین ساتھی پاؤ گے یعنی ایک قابل اعتماد انسان!''

''میری کیا کوششیں ہوں گی پاپا'' سیلینا نے کہا، ہوسٹ مین نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی پھر ہوسٹ مین نے کہا۔

''یہ غار تمہارے لئے بالکل محفوظ ہے فی الحال تم بڑے آرام سے یہاں رہ سکتے ہو، اس کے بعد تمہیں ان لوگوں میں رہنا ہوگا ہمارا کام آسان نہیں ہے جو پروگرام ہم لوگ بنائیں گے وہ طویل وقت لے گا اور میں تمہیں زیادہ دیر قید نہیں رکھنا چاہتا''

''کیا ان لوگوں کے درمیان میرے لئے رہنا ممکن ہوگا؟''

''میں اس ناممکن کو ممکن بناؤں گا'' ہوسٹ مین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس غار کو آپ کیسے بہتر تصور کرتے ہیں؟''

''کیونکہ یہ میرے لئے مخصوص ہے ہمارے درمیان یہ معاہدہ ہو چکا ہے تم اس پر کار بند رہو، رفتہ رفتہ ہم ایک دوسرے پر اعتماد کریں گے اور بہت سی باتیں علم میں آئیں گی۔''

''میرے پاس صرف ایک راز تھا جو میں نے آپ کو بتا دیا لیکن آپ اپنے آپ کو چھپانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں، مسٹر ہوسٹ مین آپ کو کھولنے کا کیا طریقہ ہوگا؟''

''میں خود بہ خود کھل جاؤں گا اس کی فکر مت کرو۔''

''ٹھیک ہے'' کامران نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ہوسٹ مین پھر کسی خیال میں کھو گیا تھا پھر اس نے کہا۔

''سیلینا اس غار میں تمہارے ساتھ رہ سکتی ہے، تمہیں ضرورت کی ساری چیزیں مہیا ہوجائیں گی کچھ وقت اطمینان سے گزارنا اس کے بعد.....''

''ٹھیک ہے آپ بالکل بے فکر رہیں۔''

''اب مجھے ایک بات کا جواب دو گے؟''

''جی۔''

''تم اس خزانے تک کس طرح پہنچ گئے؟''

''ظاہر ہے میں اس کی تلاش میں ہی آیا تھا۔''

''نہیں میرا مطلب ہے کہ تمہیں اس تک رسائی کس طرح ہوگئی؟''

''محنت اور کاوش سے۔''

'' تمہارے پاس اس کے لئے معلومات تھیں؟''

''ہاں''

''وہ کہاں ہے؟ میرا مطلب ہے اسی علاقے میں ہے؟''

''مسٹر ہوسٹ مین! اس بارے میں تمہیں صرف اس وقت بتاؤں گا جب ہمیں ایک دوسرے پر مکمل اعتماد ہوجائے گا، بلکہ اس وقت جب اسے یہاں سے لے جانے کی ساری تیاریاں مکمل ہوجائیں گی، میرے پاس اس راز کے علاوہ اور کیا چیز ہے؟''

''یہ پریشانی کی بات ہے؟''

''اصولاً یہی مناسب ہے؟'' کامران نے جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن خزانے کو مطلوبہ جگہ منتقل کرنے کے لئے بھی پلاننگ کرنی ہوگی یہ کوشش کرنی ہوگی کہ کم سے کم لوگ اس میں شریک ہوں تاکہ خزانے کے زیادہ حصے دار نہ بنیں۔''

''میں معذرت چاہتا ہوں۔ ممکن ہے کہ وقت سے پہلے میں آپ کو اس بارے میں بتادوں' لیکن یہ آپ کے اور ہمارے تعلقات کی نوعیت پر منحصر ہے'' ہوسٹ مین پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا پھر بولا۔

''ٹھیک ہے میں بھی جلد بازی نہیں کرنا چاہتا اوکے ڈیئر! میں بھی چلتا ہوں، سیلینا تمہیں اس جگہ کے بارے میں سب کچھ بتادے گی'' سیلینا ہوسٹ مین کو غار کے دہانے تک چھوڑنے گئی تھی۔ کامران ہزاروں خیالات کے ہجوم میں گھر گیا یہ بالکل نئی صورت حال تھی، انوکھی اور اجنبی بہت کچھ سوچنا تھا اس بارے میں ہوسٹ مین کیا ہے' اس بات پر تو یقین کیا جاسکتا تھا کہ وہ بھی خزانے کی تلاش میں آنے والوں میں سے ایک ہے، لیکن باقی معاملات کیا ہیں۔ اس نے خود اپنے دوسرے ساتھیوں کا اقرار کیا تھا۔ بہ قول اس کے وہ یہاں سے نکلنے کے ذرائع رکھتا تھا لیکن اتنی کامیابی سے، وہ ان وحشیوں کے درمیان محفوظ کیسے ہے۔

دوسرا کردار اس لڑکی سیلینا کا تھا، سیلینا کی مکار فطرت کا مجھے اندازہ ہوچکا تھا وہ کسی قدر معصوم صورت ہونے کے باوجود کتنی گہری لڑکی تھی۔ بہترین اداکارہ تھی کامران کے خیال میں وہ ہوسٹ مین سے زیادہ خطرناک تھی۔ بہرحال دونوں باپ بیٹی کے بارے میں زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا سیلینا مسکراتی ہوئی

واپس آگئی۔

''ہاں'' اس نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔

''ہیلو جنگلی لڑکی!''

''جنگلی لڑکی.....اور تم جنگلی مرد بلکہ بالکل جنگلی!'' وہ بے تکلفی سے بولی۔

''بالکل جنگلی!''

''ہاں' جو کسی کے جذبات کو نہ سمجھ سکے، اسے اور کیا کہا جاسکتا ہے؟''

''اوہ شاید'' کامران نے آہستہ سے کہا۔

''کہاں کے باشندے ہو؟''

''اسی زمین کا رہنے والا ہوں؟''

''پہاڑوں میں بھٹکنے کیوں نکل پڑے؟''

''تمہیں یہ سوال نہیں کرنا چاہیے۔''

''کیوں......؟''

''کیوں کہ یہی سوال میں تم سے بھی کرسکتا ہوں؟''

''میں تو پاپا کے ساتھ چلی آئی ورنہ مجھے ویرانوں میں زندگی گزارنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟''

''ہم لوگ ہالینڈ سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن میں نے لندن میں زندگی گزاری ہے۔''

''ڈچ ہو......؟''

''ہاں''

''ٹھیک، ممی کہاں ہیں تمہاری؟''

''مرچکی ہیں میں نے تو ان کی شکل بھی نہیں دیکھی، اس لئے ان کے سلسلے میں میرے ساتھ کوئی اظہار افسوس بے معنی ہوگا۔''

''مسٹر ہوسٹ مین ہالینڈ میں کیا کرتے ہیں؟''

''پتا نہیں وہ بہترین ڈاکٹر بھی ہیں۔ بہترین تاریخ داں ہیں' آثار قدیمہ کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ نوادرات کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ اعلیٰ پائے کے سیاح ہیں اور سیاحت پر بہت سی کتابیں لکھ چکے ہیں' جن کے ترجمے دنیا کی بہت سی زبانوں میں ہوچکے ہیں۔ بے شمار زبانیں جانتے ہیں خاص طور سے مشرق کی قدیم زبانیں''

''یہاں کی زبان بھی جانتے ہوں گے؟''

''ظاہر ہے وہ ان پوشیدہ قبائل کی زبانیں بھی جانتے ہیں۔''

''اور تم......؟''

''میں جرمنی' فرنچ اور انگریزی کی ماہر ہوں۔''

"اور مقامی زبان......؟"

"اچھی طرح سیکھ چکی ہوں ورنہ ان کے درمیان کیسے بسر کر سکتی۔"

"گویا ان قبائلی باشندوں سے تمہارا براہ راست رابطہ ہے؟"

"ہاں بالکل۔"

"شبہ نہیں ہوا ان کو کبھی تم پر......؟"

"کبھی نہیں۔"

"کتنا عرصہ گزار چکے ہو تم لوگ!" کامران نے سوال کیا اور سیلینا کسی سوچ میں ڈوب گئی پھر بولی۔

"میرا خیال ہے اس سوال کا جواب پاپا کی پالیسی کے خلاف ہے؟"

"اوہ!" کامران نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ سیلینا کی معلومات کی پول پہلے ہی کھل چکی تھی۔ اچھا تھا کہ اس نے اس وقت خود کو نمایاں کر دیا۔

"تم اپنی سناؤ تم نے ابھی پاپا کو بتایا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی عورت تھی کیا وہ تمہاری محبوبہ تھی؟"

"نہیں"

"تو پھر......؟" وہ بولی۔

"بس پھر کے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ویسے میں ایک بات کہوں، تم لوگ عورت کے معاملے میں بڑے تنگ دل اور سنگ دل ہوتے ہو، کیا یہ سچ ہے تم لوگ نہ کسی سے کھل کر عشق کرتے ہو اور نہ کسی سے اپنائیت کا اظہار کرتے ہو؟"

"تمہاری یہاں موجودگی میرے لئے حیرت کا باعث ہے سیلینا! کتنے اعتماد سے تم لوگ ان کے درمیان آ بسے ہو، اگر کبھی انہیں تمہارے بارے میں شبہ ہو گیا تو......؟" کامران نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"ہاں ہو سکتا ہے لیکن پاپا خزانوں کے عاشق ہیں یہ خطرہ تو مول لینا ہی تھا، ویسے اب یہ مشکل حل ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اچھا ایک بات بتاؤ کہ کیا اس خزانے میں قیمتی زیورات اور ہیرے بھی ہیں؟" وہ پر اشتیاق لہجے میں بولی۔

"اتنی دولت وہاں جمع ہے کہ عالم تصور میں نہیں آئی۔ قدیم طرز کے لاکھوں زیورات اور جواہرات جو انسانی ذہن کو ماؤف کر دیتے ہیں۔"

"تم نے اس میں سے چند سکے ہی کیوں اٹھائے تھے؟"

"یہ سکے میں نے یادگار کے طور پر اٹھائے تھے، خزانے کے طور پر نہیں"

"کوئی زیور ہی اٹھا لاتے مجھے بھی نوادرات سے بہت دلچسپی ہے"

"شاید اس کا بہت بڑا حصہ اب تمہارے قبضے میں آ جائے"

"مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو؟"

"مطلب......؟"

"مجھے اس خزانے کی ایک جھلک دکھا دو"

کامران طنزیہ انداز میں ہنسا پھر بولا "یہ میری پالیسی کے خلاف ہے" کامران کو ایک دم اس پر غصہ آ گیا تھا، کم بخت ناز و ادا کا جال بچھا کر فریب کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک کامران کو دیکھتی رہی پھر پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"بدلہ لے رہے ہو نا مجھ سے، چلو کوئی بات نہیں میں نے برا نہیں مانا" کامران خاموش ہو گیا تھا پھر وہ کامران کو اس غار میں اس کی ضرورتوں کی چیزیں دکھانے لگی۔ ایک آرام دہ جگہ تھی جہاں ایسے دہشت ناک علاقے میں زندگی بسر کرنے کی مختصر ضرورتیں مہیا کر دی گئیں تھیں، وہ بولی۔

"اپنا حلیہ تبدیل مت کرنا ویسے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ اطمینان رکھو اچھا اب میں بھی چلتی ہوں رات کو آؤں گی۔"

کامران نے گردن ہلا دی پھر وہ اسے غار کے دہانے تک چھوڑنے آیا اس کے نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد وہ واپس آ کر غار میں لیٹ گیا دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ ہوسٹ مین بے حد پراسرار شخصیت کا مالک تھا اور سیلینا بے حد ذہین اور چالاک لڑکی تھی۔ یہ دونوں صرف اس لئے کامران کی طرف متوجہ ہوئے تھے کہ اس کے پاس سے سکے برآمد ہوئے تھے۔ شام کو ہوسٹ مین غار میں داخل ہوا اور اس نے آتے ہی سوال کیا۔

"ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں میں تم سے۔"

"ضرور...... مسٹر ہوسٹ!"

"کیا تم اپنے بارے میں یہ نہیں بتاؤ گے کہ تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟"

"کمال کرتے ہو مسٹر ہوسٹ مین!"

"نہیں' کمال نہیں کرتا اچھا ایک بات بتاؤ کیا تم گرشک نامی کسی شخص سے واقف ہو؟" اس کا یہ سوال کسی دھاکے سے کم نہیں تھا۔ لیکن کامران نے اپنے چہرے کو سنبھالے رکھا۔

"بولو...... جواب دو"

"نہیں یہ نام میرے لئے اجنبی ہے۔"

"کیا واقعی تم نے پاتال پرمتی یا پرم پربھو کے بارے میں کچھ نہیں سنا؟"

"یار نہ جانے کیا باتیں کر رہے ہو؟" کامران نے اب اپنے آپ کو فوراً سنبھال لیا تھا۔

"اوہ!...... مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ تم وہ نہیں ہو۔"

"اور اب ایک بات سنو، تم بہت زیادہ پراسرار بن چکے ہو، میں کسی ایسے آدمی سے تعاون نہیں کر سکتا جو مجھ پر اتنا بھی اعتبار نہ کرتا ہو، جب کہ بات ایک ایسے خزانے کی ہے جو نہ جانے کتنے افراد کے لئے باعث دلچسپی اور دل کش ہے میں چونکہ تنہا رہ گیا ہوں اس لئے میں بھرپور طریقے سے کام نہیں کر سکتا لیکن یہ بات تم ذہن میں رکھو کہ واحد میری شخصیت ہے جو کسی کو بھی اس خزانے تک پہنچا سکتی ہے۔"

"ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے خیر میں نے جو دو تین نام استعمال کئے وہ میں تمہیں بتا دوں۔ تم جانتے ہو کہ یہاں جتنے افراد موجود ہیں چاہے وہ قبائلیوں کی شکل میں ہوں، چاہے وہ کچھ بھی ہوں' ان کا اپنا

ایک مذہب ہے ان کے اندر بھی بہت سے فرقے ہیں اور ان کے مختلف عقائد ہیں۔ ان میں سے ایک فرقہ بھوت کہلاتا ہے یہ بھوت جو ہوتے ہیں ان کا ایک نظریہ ہے۔ زمین کی گہرائیوں میں سمجھ لو پاتال میں ایک پورا قبیلہ موت کی نیند سو رہا ہے۔ ستی پرمتی اس قبیلے کی حکمران تھی۔ جس نے کسی سے محبت کی اور جس سے محبت کی وہ اس علاقے کا باشندہ نہیں تھا بلکہ وہ باہر کی دنیا کا انسان تھا۔ ستی پرمتی نے اس کے پیار میں اپنے آپ کو جنجال میں پھنسا لیا اور اس کے ساتھ اس کا پورا شہر گہری نیند سو گیا۔

وہ پاتال کی گہرائیوں میں اب بھی گہری نیند سو رہے ہیں اور ان کا ایمان اور اعتقاد ہے کہ پاتال پرمتی آئے گا اور ستی ساوتری جاگ اٹھے گی۔ انہوں نے پاتال پرمتی کے مجسمے تراش رکھے ہیں، لیکن ایک دوسرا قبیلہ ہے۔ جو اس سوتے ہوئے شہر کو جاگتے دیکھنا نہیں چاہتا' چنانچہ اس نے اپنی ذمے داری لگالی ہے کہ وہ اسے وہاں تک نہیں پہنچنے دے گا۔ ہر جگہ کی کچھ لوک داستانیں ہوتی ہیں، عجیب وغریب عقائد ہوتے ہیں اس عقیدے کے مطابق گرشک اور سیتا یہ دو نام ہیں، جو پاتال پرمتی کو سوتے ہوئے شہر تک لے جانے کا باعث بنیں گے۔ بس داستانوں کے لئے۔

بہر حال میں نے ایسے ہی تم سے سوال کر دیا تھا'' خیر اس طرح کی کہانیاں تو عام ہوتی ہیں'' کامران نے بہ مشکل تمام کہا۔ پھر بولا۔

''اب یہ بتاؤ کہ آگے کیا کرنا ہے؟'' خزانے کو لے جانے کا کام تم کس طرح سرانجام دو گے؟''

''اصل میں سچ بات کہوں کہ ابھی میں تم سے صحیح طور پر واقف نہیں ہو سکا ہوں' پھر بھی ہمیں جلد بازی نہیں کرنی ہے۔ صبر اور ہمت سے کام لینا ہو گا اور یہی چیز ہمیں کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ ورنہ خزانوں کی تاریخ کے مطابق ہم بھی اس کے حصول کی کوشش میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔''

''نہیں مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ تاہم افسوس اس بات کا ہے کہ ابھی ہمارے درمیان اعتماد کے وہ رشتے قائم نہیں ہوئے جو ہونے چاہئیں۔''

''کیا مطلب؟'' ہوسٹ مین نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

''بہت سی باتیں جو تمہارے ذہن میں محفوظ ہیں اور تم مجھ سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہو۔ خیر کوئی ایسی بات نہیں ہے ہم اپنے درمیان یہ طے کر لیتے ہیں کہ جو بات نہ بتانے کی ہو، اسے بتانے پر مجبور نہ کیا جائے'' ہوسٹ مین گردن خم کر کے کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''لیکن بہت جلد وہ وقت آجائے گا کامران کہ جب ہم ایک دوسرے کو اپنی زندگی کے تمام راز بتا دیں گے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں اپنے ساتھیوں کی طرف سے مطمئن ہو جاؤ۔''

'' ٹھیک ہے، اچھا ایک بات بتاؤ۔ یہ جو حلیہ میرا سیلینا نے بنایا ہے اس کے بعد بھی مجھ پر پابندیاں لازمی ہیں۔ مجھے یہاں آزادی سے گھومنے پھرنے میں کیا دقت آسکتی ہے؟''

'' بہت سی باتیں ایسی ہیں۔ ان کے بہت سے معاملات تم نہیں جانتے ہو گے اس کی وجہ سے کسی جگہ کوئی بھی حادثہ پیش آسکتا ہے۔''

'' تب پھر ایسا کیوں نہیں کرتے کہ مجھے یہاں زندگی گزارنے کے راز بتاؤ؟''

''ٹھیک ہے میں تمہیں دوسری ملاقات پر جواب دوں گا۔''

وہ چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد کامران کا ذہن خیالات کے سمندر میں تیرنے لگا۔ اس عجیب وغریب کہانی نے ایک بار پھر اس کے ذہن میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ یہ کہانی شروع ہی سے اس سے لپٹ گئی تھی اور عجیب وغریب انداز میں سامنے آتی رہتی تھی۔ گرشک اور سیتا نے مجھے پاتال پرمتی کہا تھا۔ حالات کی کڑیاں ملتی جا رہی تھیں۔ بہر حال یہ مقامی طور پر لوک کہانی تھی۔ دماغ کی چولیں ہل کر رہ گئی تھیں۔ اس سے زیادہ گہرائیوں میں جھانک لینا دماغ کو خراب کر دینے کے مترادف تھا۔ کامران کی زندگی میں بھلا اس طرح کے الجھاوے کہاں آئے تھے لیکن ماضی کی لکیروں کو پیٹنا بے معنی تھا اور اپنے حال پر افسوس کرنا جہالت' کیونکہ جس چیز سے کچھ حاصل نہ ہوا سے ذہن پر مسلط کرنے کا مطلب یہی ہے کہ دماغ کو خراب کیا جائے اور صلاحیتیں ختم کر لی جائیں۔ البتہ ایک بات بالکل سچ تھی کہ کامران کو یہاں آکر جو کچھ ملا تھا وہ اس کی جسمانی صحت اور ہیئت کی شکل میں تھا۔ کیا عجیب وغریب بات تھی، کیسے کیسے لوگ ملے تھے۔

بہر حال اب دیکھو کہ اپنا اصل مقصد کب حاصل ہو سکتا ہے اور اس وقت کامران کا اصل مقصد یہی تھا کہ وہ کسی ایسی بستی پہنچ جائے جہاں سے اپنی دنیا کا سفر کیا جائے خزانہ اس نے دیکھا تھا اور اس خزانے کو دیکھنے کے بعد حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر کے خزانے ہیچ تھے۔ بے شمار ملکوں میں اتنی دولت سونے اور جواہرات کی شکل میں نہ ہو گی۔ جتنی وہاں اس غار میں محفوظ تھی۔ کامران اگر چاہتا تو وہاں اس غار تک آسانی سے جا سکتا تھا لیکن وہ چند سکے بھی کامران کی تحویل سے نکل کر ہوسٹ مین کی تحویل میں چلے گئے تھے۔

دوسرے دن سیلینا اس کے پاس آگئی۔ وہ کامران کے لئے کچھ تحائف لائی تھی نہ جانے کیوں اس کی قربت بری نہیں لگتی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کامران سے اس کی خیریت پوچھی تو کامران نے کہا۔

''اب تو میں تم لوگوں کا قیدی ہوں۔ بھلا ایک قیدی سے اس کی خیریت پوچھنے کی ضرورت کیا ہوتی ہے۔؟''

''ارے! کیوں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''ہے''

''نہیں اب تمہارے ساتھ میں بھی قید رہ سکتی ہوں۔''

''کیا مطلب......؟''

''ہاں۔ ڈیڈی نے ایک ذمے داری میرے سپرد کی ہے اور وہ ذمے داری یہ ہے کہ تمہیں مقامی طور طریقے اور زبان سے روشناس کراؤں۔''

یہ خاصا دلچسپ کام تھا، جس کا آغاز سیلینا نے اسی دن سے کر دیا۔ یہ بے باک لڑکی بڑی مشکل چیز تھی اور کامران اس کی چالاکی کا تجربہ کر چکا تھا۔ چنانچہ وہ اس سے محتاط بھی تھا، اس نے محسوس کیا کہ سیلینا اسے کھولنا چاہتی ہے، پہلے بھی وہ خزانے کے بارے میں اس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر چکی تھی لیکن ظاہر ہے کامران بے وقوف نہیں تھا۔ ہوسٹ مین جن لوگوں کے خلاف کارروائی کر کے خزانہ لے جانا چاہتا تھا وہ اس کے اپنے آدمی تھے اس قسم کا آدمی کسی کے ساتھ بھی دھوکا کر سکتا ہے۔ کامران جانتا تھا کہ وہ صرف اس وقت

تک ہوسٹ مین کے لئے دلچسپی کا باعث ہے جب تک خزانے کا راستہ اسے پتا نہ چل جائے۔

سیلینا کی تمام کاوشوں کو اس نے بڑی چالاکی سے ناکام بنا دیا اور اس سے اپنا کام نکالتا رہا۔ مقامی زبان پر عبور حاصل کرنا اور یہاں کے طور طریقے پوری ذہانت سے اس نے سیکھ لئے تھے۔ حالانکہ پہلے بھی گرشک اور سیتا نے اسے اس بارے میں ہوشیار کیا تھا اور سمجھایا تھا۔ لیکن اب جو کچھ ہوا تھا وہ بہت کارآمد رہا تھا۔ سات دن اسی طرح گزر گئے تھے، ان سات دنوں میں ہوسٹ مین یہاں نہیں آیا تھا۔ البتہ سیلینا کے ساتھ گزرنے والے بعض لمحات بے حد پریشان کن ہوتے تھے اور کامران کو کافی ذہنی کوفت اٹھانی پڑتی تھی۔ وہ اسے اپنی عورت نہیں بنا سکتا تھا اور سیلینا چاہتی تھی کہ وہ اس کی تمام تر قربتیں حاصل کرلے۔ وہ جھنجلاتی' ناراض ہوجاتی اور سنجیدگی سے صرف اپنا کام کرنے لگتی' لیکن کامران اس وقت کو بھی برداشت کر لیتا تھا۔

وہ اس پر طنزیہ فقرے کستی۔ سات آٹھ دن میں اس نے کافی حد تک مقامی زبان سیکھ لی تھی اور اس کو اس لہجے میں بولنے کی مشق بھی کرنے لگا تھا۔ آٹھویں دن ہوسٹ مین نے اس سے ملاقات کی۔ آتے ہی اس نے کامران سے مقامی زبان میں ہی اس کی خیریت پوچھی اور جب کامران نے اسی زبان میں جواب دیا تو وہ حیرت سے ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا۔

''واہ!......شاگرد کو اتنا ہی ذہین ہونا چاہیے کہ استاد کو لطف آجائے ویسے تم کہاں تک یہ زبان بول سکتے ہو؟''

''جہاں تک سیلینا نے سکھائی ہے؟'' کامران نے جواب دیا۔

''مجھے تو یہ لگتا ہے کہ تم سالہا سال سے اس سلسلے میں کوشش کر رہے ہو اور تم نے ہم پر اس بات کا اظہار نہیں کیا۔''

''میں اسے اپنی کامیابی کی دلیل سمجھتا ہوں'' کامران نے کہا' حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مقامی زبان کی خاصی تربیت اسے اس دوران مل گئی تھی۔ جب کہ اسے جسمانی تربیت دی جا رہی تھی۔ بہرحال سیلینا کی وجہ سے وہ مقامی زبان پر عبور حاصل کرتا جا رہا تھا۔ پھر مزید کچھ وقت گزر گیا اب اکثر ہوسٹ مین اس کے پاس آجاتا تھا ہر بار وہ ایک ہی بات کہتا تھا۔

''میں ہر اس مکان کا جائزہ لے لیا ہے کامران! جس کے ذریعے ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ لیکن افسوس اگر ایک مشکل نہ ہوتی تو میں تمہیں کامیابی کی خبر دے دیتا۔''

''وہ کیا مشکل ہے؟''

''جگہ کا تعین اگر ہو جائے۔ اس علاقے کے بارے میں ہی اگر مجھے بتا دو تو میں یہ منصوبہ بنا سکتا ہوں کہ ہم وہاں سے خزانہ کس طرح منتقل کر سکتے ہیں؟''

''سوری! یہ کام میں اس وقت تک نہیں کروں گا جب تک مجھے تمہاری ساری کارروائیوں کے بارے میں علم نہ ہو جائے''۔

''ہاں۔ میں جانتا ہوں' تمہاری جگہ اگر میں ہوتا تو مجھے بھی یہی کرنا تھا۔ لیکن ایک بات اور سن لو' خزانے کو یہاں سے لے جانا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ہم کوئی مضبوط قدم نہ اٹھائیں۔ یہاں

کے لوگ بھی بے وقوف نہیں ہیں اور ہزار آنکھیں رکھتے ہیں۔''

''ظاہری بات ہے میں اس سے انکار نہیں کرتا'' کامران نے کہا پھر مزید کچھ دن کے بعد ہوسٹ مین نے کہا۔

''اور اب وہ وقت آگیا ہے کامران کہ اب ہم اپنا کام سرانجام دے سکیں۔ سنو! یہ قبیلہ جو اس آبادی میں موجود ہے، ہر سال ایک مقدس رسم مناتا ہے اور اس رسم کے ذریعے ایک خاص رات میں ان کا ایک رہنما نمودار ہوتا ہے اور یہ رہنما ان کے لئے برکتوں کا مظہر ہوتا ہے۔ سات دن تک وہ انہیں ہدایات دیتا رہتا ہے اور وہ آنکھیں بند کر کے اس کی ہدایت پر عمل کرتے رہتے ہیں اس بار جو رہنما نمودار ہوگا میں اس کے بارے میں جانتا ہوں۔ میں یہ کام کر ڈالوں گا کہ وہ رہنما وہ نہ ہو بلکہ تم ہو اور سات دن تک جو کام تم ان کے ساتھ انجام دو گے وہ اس خزانے کی منتقلی کا کام ہوگا بس اس کے علاوہ کوئی اور ترکیب میری سمجھ میں نہیں آتی'' کامران حیرت سے ہوسٹ مین کو دیکھنے لگا پھر اس نے کہا۔

''کیا یہ ممکن ہو سکے گا؟''

''ہاں' اگر یہ ممکن نہ ہوتا تو میں یہ کام سرانجام نہ دیتا۔''

''تو اب تمہارا مقصد یہ ہے کہ مجھے اس رہنما کی حیثیت سے نمودار ہونا ہوگا اور پھر میں انہیں خزانہ منتقل کرنے کی ہدایت دوں گا۔''

''ہاں''

''ٹھیک ہے اگر آپ یہ سمجھتے ہیں مسٹر ہوسٹ مین تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے؟''

''ٹھیک ہے اب میں تمہیں ایک نئے راستے سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔ یہ راستہ بہت پرخطر ہے لیکن اس میں کامیابی ہی اس جگہ تک پہنچا سکتی ہے۔ میں تمہیں کچھ لوگ مہیا کر دوں گا جو تمہیں وہ جگہ دکھائیں گے جہاں تمہیں مقدس رہنما کی حیثیت سے نمودار ہونا ہوگا''

''ٹھیک ہے اور اس کے بعد ہوسٹ مین نے یہ انتظام کر دیا۔ کامران کو بتایا گیا کہ چند لوگ اس کے ساتھ جا رہے ہیں، ان سے تعاون کرنا ضروری ہے اسے پہاڑوں کے درمیان یہ سفر پہلے ہی طے کرنا ہوگا''

جو لوگ اس کے حوالے کئے گئے تھے وہ انتہائی محتاط انداز میں پتلے پتلے دروں میں سفر کر رہے تھے بعض جگہ یہ سفر کافی مشکل ہو جاتا تھا ایک درہ اتنا پتلا تھا کہ اسے دو چٹانوں کے درمیان ایک دراڑ کہا جا سکتا تھا وہاں سے یہ لوگ اس طرح گزرے کہ بدن پر ہلکی ہلکی خراشیں بھی پڑ گئیں۔

لیکن بہرطور یہ اپنی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے انتہائی بلندی پر نہایت عجیب و غریب ساخت کی چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں اس سے کہیں زیادہ بلندی پر ایک آبشار گر رہا تھا، جو پہاڑوں کے حصے کو سیراب کرتا ہوا اسی دراڑ میں آجاتا تھا جو نالے کی شکل میں نیچے کی جانب چلا جاتا تھا۔ وہاں پر یہ یہ لوگ رک گئے اور پھر ان میں سے ایک شخص نے انہیں آگے کے سفر کے بارے میں بتایا ان میں سے ایک صورتحال بتاتے ہوئے کہا۔

''یہ رسی یہاں باندھ دی جائے گی اس میں جگہ جگہ یہ لٹو لگے ہوئے ہیں جو ہاتھوں کو گرفت دینے

میں مدد دیں گے ہم میں سے چار آدمی تمہارے ساتھ اس سرنگ کے دوسری جانب جائیں گے یہ خوف ناک آواز سن رہے ہونا، یہ وہی جگہ ہے جہاں سے ہمیں اس پہاڑی میں داخل ہونا پڑے گا۔ وہ اس طرف دیکھئے آبشار کا پانی جھاگ اڑاتا ہوا جس سوراخ میں داخل ہورہا ہے وہی سوراخ ہمارا راستہ ہے'' کامران نے وحشت زدہ نگاہوں سے اس ہول ناک منظر کو دیکھا آبشار کا پانی خوف ناک آوازیں نکالتا ہوا ایک چوڑے سے سوراخ میں داخل ہورہا تھا۔ یہ تصور بھی پاگل پن ہی تھا کہ سوراخ میں داخل ہوکر اس ہول ناک پانی میں سفر کیا جائے لیکن یہ کرنا تھا۔''

''ہم میں سے ایک آدمی اس پانی میں سفر کا عملی طریقہ بتائے گا تمہاری اجازت کی ضرورت ہے''
کامران کی اجازت سے لوہے کی ایک موٹی سی سلاخ چٹان کے ایک رخنے میں گاڑ دی گئی اور رسی کا ایک سرا اس سے مضبوطی سے باندھ دیا گیا اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی گھنٹی لٹکا دی گئی جس کے بارے میں بتایا گیا کہ جب یہ شخص اپنی منزل پر پہنچ جائے گا تو یہ رسی ہلاک کر گھنٹی بجائے گا جس سے یہ اندازہ ہوجائے گا کہ وہ بغیر کسی دقت کے اپنی منزل پر پہنچ گیا ہے اور اس کے بعد اس ہول ناک سفر کا عملی مظاہرہ شروع ہوگیا۔

وہ شخص رسی پکڑ کر ہول ناک گہرائیوں میں نیچے اترنے لگا۔ وہ بڑی مہارت سے پاؤں ٹکاتا ہوا نیچے کی طرف جارہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ سوراخ کے قریب پہنچ گیا چونکہ آبشار کا پانی اس سوراخ سے دوسری طرف جارہا تھا اس لئے پانی کے بہاؤ کے ساتھ اسے داخل ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ہاں اگر یہ پانی دوسری سمت سے آرہا ہوتا تو پانی کی اس سرنگ میں سفر ناممکن تھا دیکھتے ہی دیکھتے اس سرنگ نے اس شخص کو نگل لیا کامران دھڑکتے دل کے ساتھ اس ہول ناک سفر کے بارے میں سوچ رہا تھا، کوئی تین منٹ گزرے ہوں گے گھنٹی کی زور زور سے بجنے کی آواز سنائی دی اور وہ سب خوشی سے چیخنے لگے۔

پھر ان میں سے دوسرا آدمی اسی انداز میں سفر کر کے سرنگ کی دوسری طرف پہنچ گیا اس کے بعد کامران کا نمبر تھا۔ چند لمحات تو وہ الجھن کا شکار رہا، لیکن اس کے بعد وہ رسی پکڑ کر نیچے کا سفر کرنے لگا، سوراخ کے قریب پانی کی خوف ناک چنگھاڑیں گونج رہی تھیں ہزاروں ٹن پانی اس سوراخ میں سے دھڑا دھڑا تا دوسری طرف جارہا تھا کامران نے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑا اور رسی پکڑے پکڑے سوراخ میں داخل ہوگیا۔ سامنے سے بھی سوراخ بہت زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ لیکن اندر پہنچ کر اس کا قطر بڑھ گیا ہول ناک پانی گونج پیدا کرتا ہوا کانوں کے پردے پھاڑتا ہوا برق کی سی صورت کے ساتھ دوسری طرف جارہا تھا اور کامران کے ہوش وحواس رخصت ہوئے جارہے تھے۔ اس وقت زندگی کی ضمانت صرف یہ رسی تھی، جس کے ذریعے اس نے اپنی رفتار پر قابو پا رکھا تھا اگر یہ رسی نہ ہوتی اور اسے مضبوطی سے گرفت میں نہ رکھا جاتا تو ہیبت ناک پانی اسے اس غار کی دیواروں پر دے مارتا اور اس کا جسم پاش پاش ہوجاتا۔ یہ انوکھا سفر درحقیقت دو ڈھائی منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا رسی کے سہارے وہ دوسری طرف پہنچ گیا اور پھر اسے تقریباً چار فٹ نیچے اترنا پڑا اس کے بعد پانی کی شدت ایک دم کم ہوگئی۔ کیونکہ آگے چل کر وہ ایک ندی کی شکل میں پھیل گیا تھا اور ندی بھی اتنی کہ گھٹنے گھٹنے وہاں پانی موجود تھا۔ بات صرف اور صرف دھار کے نیچے سے نکلنے کی تھی جو غار کے سوراخ سے گر رہی تھی۔ دھار کی زد سے نکل جائے تو اس کے بعد کچھ نہیں رہ سکتا تھا وہ دونوں افراد وہاں موجود تھے کامران کو

دیکھ کر وہ مسکرائے اور پھر ان میں سے ایک نے کہا۔
''رسی کھینچ کر ادھر اطلاع دے دیجئے'' کامران نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اس کے بعد رسی دوسری طرف سے کھینچ لی گئی تھوڑی دیر کے بعد بقیہ افراد بھی یہاں پہنچ گئے۔
''آیئے ہمیں چلنا ہے''
''اور وہ پانچواں آدمی......؟''
''وہ سامان لے کر واپس چلا جائے گا'' کامران اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اب اس نے راستے میں بتایا کہ آگے قبائلی قبیلے موجود ہیں یہ لوگ چٹانوں کی آڑ میں سفر کرتے رہے۔ اس طرف کا منظر کافی خوب صورت تھا۔ کامران کو پتا تھا کہ اس وقت ہمالیہ کی چوٹیوں کے درمیان کسی وادی میں ہیں اور صحیح معنوں میں وہ ہمالیہ کے قیدی ہیں۔ کامران نے دیکھا کہ یہاں سبزیوں اور ترکاریوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ اناج بھی اگایا جارہا تھا۔ پھلوں کے باغات بھی تھے اس کا مطلب ہے کہ یہاں کے رہنے والے ضروریات زندگی سے مالا مال ہیں اور انہیں ان علاقوں میں زندگی گزارنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ یہ مناظر دیکھتے ہوئے وہ آخر کار ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے۔ جہاں دور ہی سے ایک عظیم الشان چٹان نظر آتی تھی۔ یہ وہی چٹان تھی جہاں رہنما نمودار ہوتا تھا۔ اس جگہ ان کی پوجا کا مرکز تھا۔
''کیا یہ لوگ بدھ مذہب سے تعلق نہیں رکھتے؟''
''یہاں مختلف عقیدوں کے لوگ ہیں لیکن ہیں سب بدھ مست۔ آپ دھند میں لپٹی ہوئی ان پہاڑیوں کو دیکھ رہے ہوں گے۔ جو یہاں سے سرمئی بادلوں کی مانند نظر آرہی ہیں اسی جگہ یہ قبائل آباد ہیں۔''
''ہاں'' کچھ دیر بعد وہ اس پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے غار نظر آرہے تھے۔ جو جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے اس میں سے ایک غار ان لوگوں کا مسکن تھا۔ یہاں باقاعدہ بندوست تھا کامران کو ساتھ لانے والے تفصیل بتانے لگے۔ بہت وسیع اور کشادہ غار تھا جہاں جگہ جگہ چیزوں کے انبار پڑے ہوئے تھے کھانے پینے کی اشیا' بستر' درندوں کی کھالیں' یہ تمام چیزیں یہاں موجود تھیں اور یہیں وہ لاشیں موجود تھیں۔ جن میں سے ایک اس شخص کی لاش تھی جو رہنما کی شکل میں اس پہاڑ کی چوٹی سے نمودار ہونے والا تھا۔

''یہ......یہ''
''ہاں' آپ کو اس کی جگہ لینی ہوگی۔''
''ٹھیک ہے اب اس کے بعد کیا کرنا ہے؟''
''بس ہم لوگ جارہے ہیں ہم دوسرے راستوں سے گزر کر اپنا کام جاری رکھیں گے اور جب ضرورت ہوئی تو یہاں واپس آئیں گے۔ آپ کو اسی غار میں رہنا ہوگا'' کامران نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ بہرحال ابھی کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر پایا تھا، وہ سوچ رہا تھا کہ دیکھیں کہ آگے وقت کیا کہتا ہے۔ وہ خزانہ اس کے ذہن میں تھا اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اگر کوشش کر کے اس خزانے کا کچھ حصہ ساتھ لے بھی جایا جائے تو کیا اسے واقعی نکالنا آسان ہوگا۔ یہاں اسے دو دن گزر گئے وہ تیسرا دن تھا جب اس نے غار سے کچھ فاصلے پر پہلی بار

کسی شخص کو دیکھا یہ شخص سبزی کا ٹوکرہ کندھے پر رکھے جا رہا تھا اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس کا پاؤں پھسلا اور اس کی ساری سبزی گر گئی۔

کامران اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا، بس یہ بے اختیاری ہی تھی کہ وہ اس کی جانب دوڑ پڑا اور اس نے سبزی اٹھانے میں اس شخص کی مدد کی۔ قریب پہنچ کر اس نے اس شخص کا چہرہ دیکھا اور اچانک ہی کامران کے پورے بدن میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئیں یہ چہرہ...... یہ چہرہ...... وہ پاگلوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔

سبزی اٹھاتے اٹھاتے اس شخص نے بھی کامران کو دیکھا اور دفعتاً ہی اس کے حلق سے ایک عجیب و غریب آواز نکل گئی۔ یہ آواز چیخ نما تھی۔ کامران دوڑ کر آگے بڑھا اور اس نے اس شخص کے شانے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''حسن شاہ...... حسن شاہ کیا واقعی یہ تمہی ہو حسن شاہ۔'' اردو زبان استعمال کی تھی اس نے۔ اس شخص کے چہرے پر خون جمع ہو گیا۔ اس کی آنکھیں شیشے کی گولیوں کی طرح چمکنے لگیں...... پھر اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور آگے بڑھ کر کامران سے لپٹ گیا۔ اس کے منہ سے نکلا۔

''کامران، یہی ہے نا تمہارا نام۔''

''تم حسن شاہ ہو۔''

''ہاں، میں حسن شاہ ہی ہوں۔''

''اوہ! میرے خدا میرا خدا۔ حسن شاہ تم زندہ ہو۔''

''ہاں۔''

''یہاں کون کون ہے تمہارے ساتھ۔ حسن شاہ یہاں کون کون ہے خدا کی قسم تمہیں دیکھ کر بس میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اپنی کیفیت بیان کر سکوں۔ حسن شاہ تم ٹھیک تو ہو نا، میں تو پتا نہیں کب سے تمہاری موت کا یقین کیے ہوئے تھے۔ آہ! قدرت، بھی کیسے کیسے عجیب و غریب مناظر دکھاتی ہے حسن شاہ! کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ تم مجھے کبھی زندہ مل جاؤ گے۔''

''مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو اور کون کون ہے تمہارے ساتھ۔''

''اس وقت کوئی بھی نہیں ہے، بس تنہا ہوں۔''

''تنہا بھوت بستی میں۔''

''بھوت بستی۔''

''ہاں، آگے بھوت قبائل آباد ہیں۔''

''مجھے علم ہے ان کے بارے میں۔ ابھی تک میں ان کے درمیان نہیں گیا ہوں۔''

''لیکن میں انہی کے درمیان رہتا ہوں۔ ایک بھوت سردار کا ملازم ہوں میں۔''

''بھوت سردار کا ملازم۔''

''ہاں۔ حسن شاہ تم...... تم اس وقت سے یہیں ہو۔''

''ہاں۔''

''اوہ! میرے دوست یہ سبزی کس کی ہے کہاں لے جا رہے ہو۔''

''میرے مالک کی ہی ہے۔''

''تو پھر اب کیا کرو گے۔''

''کچھ بھی نہیں۔ حسن شاہ اب بھی وہی ہے میں تمہیں تفصیل سے اپنے بارے میں بتاؤں گا اگر تمہارے پاس وقت ہو۔ کیا تم بھی اس طرح کی کسی مشکل کا شکار ہو۔''

''نہیں یار میری مشکل کوئی اور ہے۔''

''آؤ پھر ہم لوگ ساتھ بیٹھیں۔ یہ سبزی اکٹھا کر لیں۔ ہمارے کام آئے گی۔''

''گویا واپس نہیں جاؤ گے۔''

''کون کمینہ مردود جانا چاہتا ہے۔ ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں اس بھوت سردار پر یہ تو صرف وقت گزاری تھی اور میں یہاں سے نکلنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔''

''بات اس وقت تک میری سمجھ میں نہیں آئے گی جب تک مجھے تفصیل نہیں بتاؤ گے۔''

''تو یہیں بیٹھ کر تفصیل سنو گے۔ ہمیں دیکھا جا سکتا ہے اکثر کبھی کبھی اکا دکا لوگ یہاں سے گزر جاتے ہیں۔ یہاں ایک غار میں میرا ٹھکانا ہے لیکن یہ میں خطرہ مول نہیں لوں گا۔ یہاں بے شمار غار پھیلے ہوئے ہیں اور پہلے میں تمہیں اپنا غار دکھاؤں سبزی اکٹھی کر کے ٹوکرے میں رکھی گئی اور کامران حسن شاہ کو لے کر اپنے اس غار میں آ گیا۔

''مائی گاڈ! یہ سب'' حسن شاہ بولا۔

''ہاں میں نے کہا نا ہم دونوں کی کہانیاں خاصی طویل ہوں گی۔ مگر اس غار کے بجائے ہمیں کسی اور غار کا انتخاب کرنا ہوگا۔ کیونکہ کچھ لوگوں کا مجھ سے رابطہ ہے کسی بھی وقت وہ یہاں آ سکتے ہیں۔ تمہیں دیکھ کر انہیں حیرانی ہوگی۔''

''نہیں ہمیں یہ رسک نہیں لینا، آؤ'' حسن شاہ نے کہا اور اس کے بعد کامران اسے لے کر کسی اور غار کی تلاش میں چل پڑا۔ حسن شاہ کے مل جانے کی جس قدر خوشی کامران کو تھی الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان بھیانک حالات میں جبکہ ذہن نجانے کیسے کیسے وسوسوں کا شکار تھا۔ وہ تنہا ہونے کی وجہ سے براہ راست کوئی قدم بھی نہیں اٹھانا چاہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہوسٹ مین نے اسے قربانی کا بکرا بنایا ہے۔ جن حالات میں وہ اسے پیش کرنا چاہتا تھا اس کے بعد کیا کہا جا سکتا ہے کہ صورت حال کیا ہوتی۔ قبائلی بے وقوف تو نہیں ہوتے اس بات کے بھرپور امکانات تھے کہ اگر انہیں صورت حال کا علم ہو جاتا تو وہ کامران کے خلاف بھرپور انتقامی کارروائی کرتے۔ کیونکہ ان کے راہنما کو قتل کر دیا گیا تھا اور پھر ہوسٹ مین نے جن ذرائع سے بھی یہ کام کیا ہو۔ یہ قتل کوئی جرائم پیشہ شخص ہی کر سکتا تھا۔

دولت کے حصول کے لیے اس نے ممکن ہے اس سے پہلے بھی انسانی خون بہایا ہو۔ یہ خزانے اسی طرح انسان کو انسانیت سے دور کر دیتے ہیں۔ ممکن ہے خزانے کے حصول کے بعد وہ قاتل کچھ اور قتل کرنے کی کوشش کرتا۔ جن میں کامران کا قتل بھی شامل ہوتا۔ یہ ساری باتیں کامران نے پہلے بھی سوچی تھیں۔ لیکن

اب حسن شاہ کے مل جانے کے بعد وہ ان کا تدارک کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس لحاظ سے اسے مزید خوشی تھی آخرکار ایک غار انہیں نظر آیا یہاں غاروں کے طویل سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ یہ غار بھی اچھا خاصا کشادہ تھا۔ دونوں اس میں آ بیٹھے۔ حسن شاہ نے کہا۔

"خدا کی قسم کبھی تصور بھی نہیں تھا کہ زندگی میں دوبارہ تم سے ملاقات ہو سکے گی کامران۔"

"حسن شاہ تم دوبارہ ملاقات کی بات کر رہے ہو میں تو بڑے دکھ کے ساتھ تمہیں خدا کے سپرد کر چکا تھا۔ کیونکہ تمہاری زندگی کے امکانات بالکل نہیں تھے۔"

"ہاں، جو صورت حال پیش آئی تھی۔ وہ تو ایسی ہی تھی۔ اچھا خیر تم سناؤ، یہاں تک کیسے بھٹک رہے ہو اور تنہا کیسے ہو۔"

"لمبی داستان ہے۔"

"تو ہم اسی لیے تو یہاں آ کر بیٹھے ہیں۔"

"حسن شاہ کرنل گل نواز اور ان کی پوری ٹیم مختلف صعوبتوں سے گزرتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی۔"

کامران نے اپنی یادداشت کے سہارے اپنی پوری تفصیل بتائی اور حسن شاہ حیرت اور دلچسپی سے منہ کھولے یہ کہانی سنتا رہا۔ کامران نے گرشک اور سیتا والی بات ابھی حسن شاہ کو نہیں بتائی تھی اور یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے ایک پراسرار کردار بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور وہ اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکا ہے البتہ موجودہ صورت حال سے اس نے حسن شاہ کو آگاہ کر دیا تھا کہ کس طرح اسے یہاں ایک خاص مقصد کے تحت لایا گیا ہے اور ہوسٹ مین اور اس کی بیٹی اس سے کیا چاہتے ہیں۔ اس نے حسن شاہ کو بتایا تھا کہ وہ خزانے تک پہنچ چکا ہے اور ہوسٹ مین نے اس کی جیب سے وہ سکے نکال لیے ہیں۔ جو وہاں سے لایا تھا۔ یہ الفاظ کہتے ہوئے اسے ذرا سی ہچکچاہٹ بھی ہوئی تھی۔ کیونکہ خزانہ ہر شخص کی کمزوری ہوتا ہے۔

وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں حسن شاہ دوبارہ اسے خزانے تک چلنے کے لیے نہ کہے۔ حسن شاہ نے پوری کہانی سنی اور اس کے بعد وہ پھیکے انداز میں مسکرانے لگا پھر بولا۔

"بہت خوب لیکن میرے دوست تم نے مجھے تو بتا دیا ہے کہ تم اس خزانے کی جگہ سے واقف ہو چکے ہو میری خواہش ہے کہ اب کسی اور کو یہ بات نہ بتانا اور جہاں تک بات رہی ہوسٹ مین کی کہ تم یہ سمجھ لو کہ یہ غیر ملکی سفید چمڑی والے کبھی کسی کے نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف تمہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے اور اس کی بیٹی اپنے سارے وجود کو تمہارے سپرد کر کے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔"

"حسن شاہ میں جانتا ہوں لیکن کچھ اس طرح بے بس ہو چکا ہوں میں یہاں آ کر کہ میرے پاس کوئی اور ذریعہ ہی نہیں رہا۔ تم میرا یہ حلیہ دیکھ رہے ہو تا یہ اسی نے بنایا ہے تا کہ میں یہاں رہ سکوں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم میرا حلیہ دیکھو میں کون سے رنگوں میں رنگا ہوا ہوں۔ یہ سب تمہیں بے وقوف بنانے کی کوشش ہے خیر چھوڑو ان باتوں کو میرا ماننا یہ ہے کہ میں جب اس حادثے کا شکار ہوا تو اس کے بعد عقل و خرد سے عاری ہو گیا۔ میں نہیں جانتا کہ میری یادداشت کا کتنا عرصہ گم رہا ہے میں نہیں جانتا کہ زندہ کس طرح بچا تھا اور یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کے بعد کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا ہوں۔ اور تمہیں

ہنسی آئے گی کہ یہ بات اب سے صرف سولہ دن پہلے کی ہے میں ایک ایک دن گن رہا ہوں۔ میں یہیں انہیں قبائلیوں کے درمیان زندگی گزار رہا تھا اور ایک بھوت سردار کا ملازم تھا۔ بھوت سردار مجھ پر مکمل اعتبار کرتا ہے وہ؟ مجھ سے اسی طرح کام لیتا ہے کہ اچانک ایک رات میری یادداشت واپس آ گئی۔
میں سوتے سوتے جاگ پڑا میں ایک خواب دیکھ رہا تھا اور اس خواب میں میں نے اپنا ماضی دیکھا اور اس کے بعد جب میں جاگا تو میرا ماضی میرے ذہن سے محو نہیں ہوا ہوش میں آنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو یاد کیا۔ مجھے اپنا نام بھی یاد آیا اور وہ ساری گزری ہوئی داستان بھی جس کا تعلق مجھ سے اور تم سے تھا اور پھر باقی سب افراد سے جیسے رانا چندر سنگھ، یہ ساری کہانی مجھے یاد آئی اور اس کے بعد میں نے عقل و خرد کے ساتھ اپنے ماحول کو دیکھا۔ میرے دل میں یہی خیال تھا کہ جس طرح بھی بن پڑے موقع پاتے ہی میں یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں اور میرے دوست بس یوں سمجھ لو کہ دو تین دن کے اندر میں یہاں سے نکل بھاگنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ ان سولہ دنوں میں، میں نے صرف راستے تلاش کیے ہیں اور یہ کوششیں کی ہیں کہ مجھے صحیح راستے مل جائیں۔

"گویا تم کھوئی ہوئی یادداشت کے ساتھ زندگی گزارتے رہے ہو۔" کامران نے شدید حیرت کے عالم میں پوچھا۔

"ہاں۔"

"تو اب کیا ارادہ ہے۔"

"سب سے پہلے میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔"

"ہاں، دو۔"

"دیکھو یہ خزانے جو ہوتے ہیں نا، میں نہیں جانتا کہ تم نے جو کچھ دیکھا ہے وہ کیا ہے۔ لیکن ان کا ایک اپنا طلسم ہوتا ہے ہم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان خزانوں پر کیسی کیسی روحوں کا قبضہ ہوتا ہے اور یہ روحیں بالکل نہیں چاہتیں کہ یہ خزانے مہذب دنیا میں جا کر اس طرح بٹ جائیں۔ چنانچہ انہیں کبھی نہیں لے جانے دیتیں۔ اگر ہم نے ان کا لالچ کیا اور یہ سوچا کہ اپنی دنیا میں جانے سے پہلے ہم ان کا کچھ حصہ اپنے ساتھ لے جائیں تو تم یقین کرو کہ ہم اپنی دنیا میں واپس نہیں جا سکیں گے۔ اس پر ہزار بار تھوکو اور صرف یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کرو ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے اور اب جبکہ تم بتا رہے ہو کہ کرنل گل نواز بھی وطن واپس پہنچ گئے ہیں...... لازمی امر ہے کہ رانا چندر سنگھ بھی ان کے ساتھ گئے ہوں گے۔"

"ہاں یہی سنا تھا میں نے کہ کرنل گل نواز کچھ بیمار ہوئے تو رانا چندر سنگھ انہیں لے کر چلے گئے۔"

"میرے دوست ہماری واپسی ضروری ہے۔ تمہاری منت کرتا ہوں کہ ہر خیال کو ذہن سے نکال کر واپسی کے سفر کی تیاری کرو۔"

"حسن شاہ یقین کرو تمہارے یہ الفاظ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور تم یہ بالکل ٹھیک کہتے ہو کہ ان خزانوں پر پراسرار روحوں کا سایہ ہوتا ہے۔ میں خود بھی ایک ایسے ہی طلسم میں پھنس چکا ہوں اس کے بارے میں کبھی موقع ملا تو تمہیں بتاؤں گا۔ ابھی فی الحال میرا ذہن [illegible] کچھ تفصیل سے بتاؤں گا تمہیں۔"

"تو پھر تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو۔"

"ہاں بالکل۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے، تین دن کا انتظار کیوں کیا جائے میں آج رات ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا اور ہم یہ علاقہ چھوڑ دیں گے۔ فی الحال میں چلتا ہوں میں نے سفر کے لیے تیاریاں کی ہیں۔ میرا سامان وہیں بھوت سردار کے پاس موجود ہے ویسے ایک بات بتاؤں وہ لوگ مجھے دھوما کے نام سے جانتے ہیں۔ اور کچھ دن پہلے میں سو فی صدی دھوما تھا۔" حسن شاہ سے بہت دیر باتیں ہوتی رہیں اور اس کے بعد اس نے کہا اب مجھے چلنا چاہیے رات کے کسی بھی پہر میں اسی غار میں آ جاؤں گا۔ تم ہوشیار رہنا۔"

"کامران نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اسے تیار ملے گا۔ پھر وہ حسن شاہ کو چھوڑنے کے لیے باہر تک آیا۔ سبزیوں کا ٹوکرہ حسن شاہ نے اپنے سر پر رکھا اور اس کے بعد کامران اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گیا اس کے رگ و پے میں ایک عجیب سی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ بہت ہی خوف ناک راستہ طے کر کے یہاں تک پہنچا تھا اور اس کے بعد اسے جو کچھ کرنا تھا۔ وہ بھی انتہائی خوف ناک تھا۔ جس کے لیے وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو تیار کر پا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب کچھ آسان نہیں ہوگا۔ وہ لوگ جو اس کے معاون تھے۔ نجانے کہاں غائب ہو گئے تھے اور اسے یہاں اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن خوش نصیبی تھی کہ وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ اصل فیصلے تقدیر کرتی ہے اور تقدیر اس طرح اسے حسن شاہ تک پہنچانا چاہتی تھی۔ لیکن بڑی عجیب بات تھی۔ مایوسیوں کے اندھیروں میں جب روشنی چمکتی ہے تو کیسا عجیب لگتا ہے لیکن بات وہی تقدیر کی آ جاتی ہے۔

بہر حال وہ شدید سنسنی محسوس کرتا رہا اسے صرف یہ خوف تھا کہ کوئی اس تک پہنچ نہ جائے اور اس خوف کا شکار وہ اس وقت تک رہا جب تک کہ رات گہری نہ ہو گئی۔ وہ غار میں نہیں گیا تھا۔ بلکہ باہر ہی اس راستے پر حسن شاہ کا انتظار کرتا رہا تھا۔ جس راستے پر حسن شاہ واپس گیا تھا۔ پھر رات کی دھندلاہٹوں میں اس نے کچھ دھبے متحرک دیکھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگا۔ تاریکی میں وہ دھبے آہستہ آہستہ نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے بعد کامران کو محسوس ہوا کہ وہ دو جانور ہیں۔ جنہیں کوئی لگام سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لا رہا ہے۔ حسن شاہ نے اپنے انتظامات کے بارے میں بتایا تھا۔ یقیناً آنے والا حسن شاہ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ آخر کار آنے والا نمایاں ہوتا چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد حسن شاہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے بھی غالباً کامران کو کھڑے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

"تم تیار ہو۔"

"ہاں۔" کامران نے جواب دیا۔ وہ ان جانوروں کو دیکھ رہا تھ جو ان علاقوں کے مخصوص جانور تھے۔ یہ یاک کہلاتے ہیں...... دونوں یاکوں پر تھوڑا تھوڑا سامان لدا ہوا تھا۔ حسن شاہ نے کہا۔

"یہ صرف کھانے پینے کی چیزیں ہیں اور ان جانوروں کی خوراک بھی ایک مخصوص جگہ تک ہمیں انہی کے ذریعے پہنچنا ہوگا اور اس کے بعد ہم ایک بار پھر ایک سنسنی خیز سفر کریں گے۔"

"سنسنی خیز کیوں۔" کامران نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ ان علاقوں کو عبور کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی کاغذات تو ہیں نہیں۔"

"اوہ۔" کامران نے پر خیال انداز میں گردن ہلائی۔ یاکوں کا یہ سفر بھی زندگی کا ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ حالانکہ یہاں بے شمار افراد یہ ذریعہ سفر اختیار کرتے تھے۔ لیکن کامران کو کبھی ایسے کسی سفر کی نوبت نہیں آئی تھی۔ حسن شاہ نے اسے ان جانوروں پر بیٹھ کر سفر کرنا سکھایا اور اس کے بعد یاک مخصوص راستوں پر دوڑنے لگے۔" حسن شاہ نے کہا کہ یہ سفر ساری رات کرنا ہوگا اور صبح کسی ایسی جگہ گزاری جائے گی جہاں انسانوں کی نگاہوں سے چھپنے کا بندوبست ہو سکے۔

بہر حال یاک دوڑتے رہے راستے میں کوئی خاص بات نہیں کی گئی تھی۔ ویسے بھی ان پر خطر راستوں کو عبور کرنا ایک مشکل کام تھا۔ پھر ساری رات کا سفر گزر گیا اور صبح کی روشنی نمودار ہو گئی۔ کافی فاصلے پر گہرائیوں میں ایک بستی نظر آ رہی تھی۔ حسن شاہ نے اس بستی کو دیکھ کر کہا۔

"ہمیں اس سے بچ کر نکلنا ہوگا۔ ایسی چھوٹی چھوٹی بستیاں ہمیں راستے میں ملیں گی اور اس وقت تک ہمیں احتیاط کرنا ہوگی جب تک کہ ہم کسی باقاعدہ شہر تک نہ پہنچ جائیں۔ جو کچھ بھی کرنا ہے کرتے رہو یار زندگی اس طرح بے وقعت ہو کر میری نگاہوں کے سامنے آئی ہے کہ اب مجھے کسی چیز کی کوئی خاص پرواہ نہیں رہی ہے۔ میں تمہیں بتاؤں حسن شاہ کہ موت اس طرح میرے ساتھ ساتھ سفر کرتی رہی ہے کہ عام حالات میں کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا۔ لیکن اس بات پر پورا یقین ہے کہ جب تک آسمان سے فیصلے نہ ہو جائیں کچھ ہوتا نہیں ہے چاہے حالات کتنے ہی مشکل کیوں نہ ہو جائیں۔"

"شیور یہ تو ہمارا ایمان ہے اور اس ایمان سے بھلا کون منکر ہو سکتا ہے۔"

"کیا خیال ہے؟ رات بھر کے سفر نے تھکا تو نہیں دیا۔"

"نہیں، اگر تم...... چلتے رہنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، کامران نے جواب دیا۔ وہ دو یاک لے کر آیا تھا۔ ان پر خاص ساز و سامان لدا ہوا تھا۔ حسن شاہ نے کہا کہ سفر کا آغاز ابھی سے کر دینا چاہیے میں ضرورت کی تمام چیزیں لے آیا ہوں۔ بہر حال کامران نے حسن شاہ کی بات پر فوراً عمل کیا اور آخر کار یہ لوگ وہاں سے چل پڑے نجانے کب تک یہ سفر جاری رہا۔ وہ اس وقت تک چلتے رہے جب تک کہ انہیں ایک ریلوے لائن نظر نہیں آئی۔ ریلوے لائن اس وقت زندگی کا پیغام محسوس ہوئی تھی۔

"اس ریلوے لائن کی موجودگی یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ ہم مہذب آبادیوں کے قریب پہنچ گئے ہیں۔"

"ہاں، یقینی طور پر ہمیں کسی ایسی منزل تک لے جائے گی جہاں سے ہم آگے کے سفر کا آغاز کر دیں گے۔" اور ایسا ہی ہوا، صبح ہو گئی تھی۔ سورج چڑھ چکا تھا جب انہیں ایک ریلوے اسٹیشن نظر آیا۔ یاک ریلوے اسٹیشن سے کافی دور چھوڑ دیے گئے تھے اور زندگی کے ایک نئے مرحلے کا آغاز ہو گیا تھا۔ دیار غیر میں کاغذات وغیرہ کی عدم موجودگی میں انہیں اپنی منزل کا سفر کرنا تھا اور اس سفر میں انہیں کیا کیا مشکلات پیش آئیں۔ یہ ایک طویل اور اکتا دینے والی داستان تھی۔ لیکن اس بات کا اظہار کے انسان اگر جدوجہد کرے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ وہ اسمگل بھی ہوئے اور اسمگلروں کے ساتھ انہیں سرحد عبور کرتے ہوئے شدید گولیوں کی بوچھاڑ کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن تقدیر انہیں ان کی منزل تک پہنچانا چاہتی تھی۔ حالانکہ کامران بے شمار

رکاوٹیں اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ نجانے کون کون اس کا ضرورت مند تھا۔ نجانے کیا کہانیاں اسے سنائی گئی تھیں کہیں اسے پاتال پرمتی کہا جاتا تھا اور کہیں کہا جاتا تھا کہ ستی سردھانی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن یہ ستی سردھانی کون تھی اور کامران سے اس کا کیا واسطہ تھا یہ بات کم از کم کامران کے لیے ناقابل فہم تھی۔

زندگی کا یہ رخ کسی بھی طرح اس کے لیے نہیں تھا۔ صرف ایک شخص نے کہا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی بہت بڑی غلط فہمی کام کر رہی ہو اور وہ اس کا شکار ہو۔ بہرحال وہ اپنے ملک کی سرحدوں میں داخل ہوگئے۔ یہاں پہنچ کر حسن شاہ نے سجدہ شکر ادا کیا اور بولا۔

''دراصل کسی بھی مسئلے میں بہت زیادہ تشویش اور حفاظتی کوششیں فائدہ دینے کے بجائے نقصان دیتی ہیں۔ مجھے معاف کرنا کامران یہ میرا نظریہ فکر ہے کہ جب اپنی کوششیں ناکام ہوجائیں اور کوئی ایسا مرحلہ سامنے آجائے جس کا کوئی حل تمہارے پاس نہ ہو تو خود کو تقدیر کے دھارے پر چھوڑ دو اور آسمانوں کے فیصلے کا انتظار کرو۔ کامران نے اس بات سے اتفاق کیا تھا۔ راستے میں کئی بار حسن شاہ نے کامران کی شخصیت پر بھی تبصرہ کیا تھا۔

''یار معاف کرنا جب میں اور تم یہاں سے باہر نکلے تھے تو تمہاری شخصیت بالکل مختلف تھی۔ لیکن کامران میرا تجربہ ہے زندگی کے بارے میں اچھا خاصا۔ تم بہت تبدیل ہوچکے ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے تمہارے اندر بے پناہ پراسرار قوتیں بیدار ہوگئی ہوں۔'' کامران نے ہنس کر بات ٹال دی تھی۔ لیکن بہرحال سوچوں میں ضرور ڈوبا ہوا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی شخصیت کی یہ تبدیلیاں آگے کیا رنگ لائیں گی۔

بہرحال حسن شاہ کو ساتھ لے کر ہی وہاں پہنچا تھا۔ جہاں کرنل گل نواز کا ٹھکانا تھا یہاں آنے کے بعد حسن شاہ نے کہا تھا کہ عارضی طور پر انہیں کسی ہوٹل میں قیام کر کے اپنا حلیہ وغیرہ درست کرلینا چاہیے اور یہ بات کامران بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ جو تبدیلیاں ان لوگوں میں رونما ہوچکی ہیں اور جو حلیہ ان کا بن چکا ہے کرنل گل نواز کی کوٹھی میں وہ حیرانی کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ اس نے حسن شاہ سے اتفاق کیا تھا۔ پھر حسن شاہ نے ہی پیسوں وغیرہ کا انتظام کیا تھا۔ نئے لباس خریدے گئے تھے اور حلیہ سنوارا گیا تھا۔

بہرحال بالکل مہذب لوگوں کے انداز میں وہ لوگ کرنل گل نواز کی کوٹھی میں پہنچے تھے اور یہاں پہنچتے ہی ہنگامہ ہوگیا تھا۔ شاہنواز، ثانیہ، فرخندہ، گھر کے تقریباً تمام ہی افراد ان کے گرد جمع ہوگئے تھے اور کامران نے بالکل بے خیالی کے انداز میں پوچھا تھا۔

''وہ کرنل صاحب کی طبیعت کیسی ہے۔''

''کیا۔'' شاہنواز کا منہ حیرت سے کھل گیا اور کامران کے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ شاہنواز کے سوالیہ انداز نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ تاہم اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''میں کرنل صاحب کی بات کر رہا ہوں کہ کرنل گل نواز۔''

''کہاں ہیں ڈیڈی۔'' شاہنواز نے سوال کیا۔

''اوہو، شاید وہ ابھی تک یہاں نہیں پہنچے۔ ہم جلدی آگئے مجھے خود احساس تھا۔ یہ'' حسن شاہ کے الفاظ تھے۔''

''مگر ہوا کیا؟ سب لوگ واپس آگئے؟'' شاہنواز نے سوال کیا یہ بات فوراً ہی سمجھ میں آگئی تھی کہ کرنل گل نواز اور ان کا گروپ ابھی تک یہاں نہیں پہنچا ہے۔ ان لوگوں کو تشویش میں ڈالنے کے بجائے حسن شاہ نے فوراً ہی بات کو سنبھال لیا تھا۔ وہ سب اس سے طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔

''ہاں ہم لوگ جس مہم پر گئے تھے۔ اس میں درمیان میں کچھ ایسی مشکلات پیش آگئیں کہ کرنل صاحب نے واپسی کا فیصلہ کرلیا۔ کچھ دوست وہیں رہ گئے۔ لیکن کرنل صاحب رانا چندر سنگھ وغیرہ واپس آگئے وہ ہم سے پہلے چل پڑے تھے۔ کیونکہ ہم کو وہاں پر بہت انتظام کرنے تھے۔ لیکن انہیں راستے میں کئی جگہ رکنا بھی تھا۔ جبکہ ہم ان کے بعد میں چلنے کے باوجود تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے واپس پہنچ گئے۔''

''کوئی تشویش کی بات تو نہیں ہے۔'' شاہنواز نے سوال کیا۔

''نہیں بالکل نہیں، آپ لوگ مطمئن رہیں وہ آنے والے ہی ہوں گے۔ ہوسکتا ہے ایک دو ہفتے لگ جائیں۔'' حسن شاہ نے کہا۔ کامران نے اس دوران مکمل خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''میں تھوڑا سا آرام کرلوں۔'' حسن شاہ کے ساتھ تنہائی ملتے ہی کامران نے کہا۔

''یار بڑی گڑبڑ ہوگئی اب صرف ایک ہی گنجائش رہ جاتی ہے وہ یہ کہ رانا چندر سنگھ کا محل بھی دیکھ لیا جائے ہوسکتا کہ کرنل گل نواز زیادہ بیمار ہوگئے ہوں۔ اور ان لوگوں کو پریشان نہ کرنے کی وجہ سے رانا چندر سنگھ کرنل گل نواز کو اپنے محل لے گئے ہوں۔''

''تو پھر میرا خیال ہے کہ وہیں چلنا چاہیے۔''

''ہاں ان لوگوں کو تھوڑا سا اطمینان دلا دیا جائے۔'' کامران نے ہی شاہنواز سے بات کی تھی۔

''میں کرنل صاحب ہی کے دیے ہوئے ایک کام سے جا رہا ہوں شاہنواز۔ اس دوران اگر کرنل صاحب آجائیں تو آپ صرف ان سے اتنا کہہ دیں کہ میں آپ ہی کے کام گیا ہوا ہوں۔ واپس آجاؤں گا۔''

''یار مگر مجھے تو تم سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ ابھی ایک دو دن آرام تو کرلو۔''

''کرنل صاحب کے حکم کی تعمیل تو میں نے ہر کام سے پہلے کی ہے۔ شاہنواز اور اب بھی میں یہی چاہتا ہوں کہ انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔''

''واپسی کب تک ہوجائے گی۔''

''جلد سے جلد تم بے فکر رہو۔'' کامران ان لوگوں کو جھوٹی تسلیاں دے کر وہاں سے حسن شاہ کے ساتھ چل پڑا اور اس کے بعد ان کی دوسری منزل رانا چندر سنگھ کا محل تھا لیکن یہاں بھی ان کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ رانا چندر سنگھ بھی واپس نہیں پہنچا تھا۔ حالانکہ یہ لوگ کافی دن پہلے چل پڑے تھے۔ تمام صورت حال کامران ہی کے ذریعے حسن شاہ کو معلوم ہوئی تھی۔ یہاں آکر حسن شاہ نے رائے دی۔

''میرا خیال ہے وہ کسی بہت بڑے حادثے کا شکار ہوچکے ہیں۔'' کامران بھی افسوس میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

''یہ تو بڑا مسئلہ ہوگیا اب کیا کیا جائے۔''

''نہیں۔ میں ان لوگوں کا سامنا نہیں کرسکتا۔ بھلا میں انہیں کیا جواب دوں گا وہاں تو وہ سب مجھ

پر اس طرح اعتبار کرتے ہیں کہ میرا کہا ہوا ان کے لیے حرف آخر ہوتا ہے۔ مگر میں کرنل گل نواز کا پتا بھی نہیں لگا سکتا کیا کہوں گا ان سے، حسن شاہ سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ پھر اس کہا۔

''تب پھر ایک ترکیب ہو سکتی ہے ہم لوگ یہیں رہ کر ان کا انتظار کریں ظاہر ہے اب ہمارے پاس وہ ذرائع تو نہیں ہو سکتے کہ ہم فوراً ہی ان علاقوں میں واپس چلے جائیں۔ ناممکن ہے یہ، میں یہاں رکوں اور تم وہاں چلے جاؤ رانا چندر سنگھ پہلے آئے تو میں تمہیں اس بارے میں اطلاع دوں گا اور اگر کرنل صاحب آ جائیں تو تم مجھے بتاؤ گے قیام کسی ہوٹل وغیرہ میں بھی کر سکتے ہو۔''

''وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''ایک بات بتاؤ کامران۔''

''سمجھ رہا ہوں تم کیا پوچھو گے، پیسوں کے بارے میں پوچھ رہے ہو نا۔ لاکھوں روپے میرے بینکوں میں پڑے ہوئے ہیں جو کرنل صاحب نے مجھے تنخواہ کے طور پر ادا کیے تھے۔ کوئی مصرف ہی نہیں تھا ان کا میرے پاس۔ پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''میں یہیں محل میں رہوں گا۔ تم جب چاہو یہاں آ سکتے ہو اور جب چاہو مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہو۔ مجھے وہاں جا کر اپنے ہوٹل کے بارے میں بھی بتا دینا۔'' کامران واپس آ گیا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے کرنل گل نواز کی کوٹھی کی طرف جاتا تو بے شمار سوالیہ نگاہیں اس کا استقبال کرتیں اور اس سے ہزاروں سوالات کیے جاتے۔ پھر نجانے ان کا ردعمل کیا ہوتا۔ وہ وہاں جانے سے بچ رہا تھا۔ حالانکہ دل اندر سے کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کو بھی تسلی دینا اور حقیقت حال سے آگاہ کرنا ضروری ہے تاکہ وہ ذہنی طور پر کسی بھی واقعے کے لیے تیار رہیں۔ بات وہی تھی کامران کی فطرت میں وفاشعاری تھی اور اندر سے وہ ایک انتہائی نیک نفس انسان تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ لوگ دکھی ہوں۔ بلکہ اب تو اسے یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ بغیر معلومات کیے اسے کرنل گل نواز کی کوٹھی میں نہیں جانا چاہیے تھا۔

کم از کم وہ لوگ اس احساس کا شکار رہتے کہ کرنل باہر ہے اور اپنی مہم جوئی میں مصروف ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کرنل آخر گیا کہاں۔ اس بارے میں کس سے معلومات حاصل کرے۔ اپنے آپ کو پوشیدہ بھی رکھنا تھا لیکن ہوٹل میں دل بھی نہیں لگ رہا تھا۔ بہرحال یہ اس کا اپنا شہر تھا۔ کافی واقفیت حاصل ہو چکی تھی اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ شاہنواز وغیرہ کے پاس جا کر ان سے باتیں کرے۔ اس دن گھومنے پھرنے نکل گیا اور بس یونہی آوارہ گردی کرتا ہوا میوزیم کے سامنے جا پہنچا یہ میوزیم بے مثال تھا اس سے پہلے کامران یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔

لیکن ایک بار ثانیہ اور فرخندہ اس میوزیم کی تعریفیں کر رہی تھیں۔ بس یونہی وقت گزاری کے لیے وہ ٹکٹ خرید کر میوزیم کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ وہ مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا ایک ایسے حصے میں پہنچ گیا جہاں ہمالیائی مذاہب کے بارے میں دستاویزات تصویریں، مجسمے اور آثار قدیمہ سے ملنے والے بہت سے نوادرات موجود تھے۔ نجانے کیوں بدھ مذہب سے متعلق چیزیں دیکھتے ہوئے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ غالباً یہ پچھلے گزرے ہوئے وقت کی بات تھی کیونکہ وہ ان دنوں وہیں زیادہ وقت گزارتا رہا تھا۔

چنانچہ اسے اس سے دلچسپی ہوئی اور وہ کافی دلچسپی سے ان تمام چیزوں کو دیکھنے لگا۔ دفعتاً اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے عقب میں کوئی کھڑا ہوا ہے۔ وہ بے اختیار چونک کر پلٹا اور حیران رہ گیا۔ سنہرے بالوں والی وہ حسین لڑکی ایک عجیب و غریب شخصیت رکھتی تھی۔ اس کا رنگ گندمی اور بے حد ملاحت لیے ہوئے تھا۔ لیکن سر کے بال سنہرے تھے۔

''ہیلو۔'' وہ مسکرائی۔

''ہیلو۔'' کامران نے بھی بے اختیار کہا۔

''بہت دیر سے آپ کو دیکھ رہی ہوں سر! براہ کرم محسوس نہ کریں میرا نام نیرینہ ہے۔ نیرینہ علی ویسے تو میں برٹش ہوں لیکن میرے فادر مصری تھے۔ اس طرح سے ہم مذہباً مسلمان ہیں۔ مجھے بدھ مت سے بڑی دلچسپی ہے اور میں اس سلسلے میں تحقیق کرتی پھر رہی ہوں۔ جہاں جہاں میرے وسائل مجھے لے جا سکتے تھے، میں جا چکی ہوں۔ ہر جگہ سے مجھے جو تھوڑی بہت معلومات حاصل ہو جاتی ہیں انہیں میں اپنے پاس ریکارڈ کے طور پر رکھ لیتی ہوں۔ اس میوزیم میں واقعی بڑا عظیم خزانہ بدھ مذہب سے متعلق موجود ہے۔ آپ اتنی دلچسپی سے ان چیزوں کو دیکھ رہے تھے تو مجھے احساس ہوا کہ آپ بھی بدھ مذہب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔''

''ہاں ایسی ہی بات ہے، مجھے واقعی بدھ مذہب سے بڑی دلچسپی ہے۔''

''اور ایک چیز ہوتی ہے کباب اور دوسری ہوتی ہے ہڈی، کباب میں اگر ہڈی داخل ہو جائے تو کباب کا مزہ بری طرح خراب ہو جاتا ہے۔ مجھ سے ملیے میں ہڈی ہوں۔'' ایک اور نسوانی آواز سنائی دی۔ اور میں اور نیرینہ دونوں پلٹ پڑے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ مشرق بعید کے کسی علاقے کی ہے۔ اس نے کہا۔

''جی ہاں، میرا تعلق تھائی لینڈ سے ہے اور آپ مجھے ریتھا کہہ سکتے ہیں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ مجھے ریتھا کیوں نہیں کہیں گے۔ تو میں آپ سے عرض کر چکی ہوں کہ ہڈی بھی ایک چیز ہوتی ہے آپ لوگوں کی گفتگو آپ یقین کیجیے جان بوجھ کر نہیں سنی میں نے بلکہ میں اس ریک کے دوسری طرف تھی اور جھک کر ان مجسموں کو دیکھ رہی تھی جو ریک کے نچلے حصے میں ہیں کہ آپ کی باتیں میرے کانوں میں پڑیں دو ایسے لوگ جو میرے ہم ذوق ہوں میری توجہ کا باعث بن ہی سکتے تھے۔ البتہ آپ ذرا لہجہ خشک بنا کر کہہ سکتے ہیں کہ مس ریتھا براہ کرم آپ ہمیں ذرا تنہا چھوڑ دیجیے۔ کامران تو کچھ نہ بولا لیکن نیرینہ ہنس پڑی پھر اس نے کہا۔

''ہم ذوق لوگ نظر انداز تو نہیں کیے جا سکتے۔ اچھا اب یہ بتائیے مسٹر آپ نے تو اپنا نام تک نہیں بتایا۔''

''میرا نام کامران ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''بہت بہت شکریہ مجھے اس لفظ کے معنی معلوم ہیں۔ یعنی کامیاب اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ زندگی کے ہر مشن میں کامیاب ہوں گے۔ ریتھا نے کہا۔ نیرینہ کہنے لگی۔

''اب ہم اس طرح مل گئے ہیں تو کیوں نہ کہیں ایک ساتھ بیٹھ کر کافی پی جائے۔ میں آپ دونوں کو دعوت دیتی ہوں۔''

''ارے...... ارے...... ارے میں ہڈی نہیں بنوں گی کیا۔''

''نہیں مس ریتھا آپ کا خیال غلط ہے۔ آپ کسی بھی شکل میں ہڈی تو نہیں ہیں۔''

"تب پھر شکریہ میں...... مس نیرینہ کی کافی کی دعوت قبول کرتی ہوں۔" کامران ان دونوں لڑکیوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ ایک کیفے میں جا بیٹھے۔ نیرینہ نے کافی کا آرڈر دے دیا تھا۔

"بعض اوقات اس طرح دوستیاں ہو جاتی ہیں اور ایسے ہو جاتی ہیں کہ زندگی بھر چلتی ہیں۔"

"ویسے آپ لوگ کیا کرتے ہیں اپنا اپنا تعارف تو کرائیے۔"

"بس میرے ڈیڈی کاروبار کرتے ہیں اور میں سیر و سیاحت۔" نیرینہ نے کہا۔

"اور میں کچھ نہیں کرتی۔ کچھ نہیں کرتی۔ میرے اہلِ خانہ تھائی لینڈ میں ہیں اور میں یہاں تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔" کامران نے چونک کر نیرینہ کو دیکھا تھا۔ نیرینہ نے کامران سے کچھ اور کہا تھا لیکن جب کامران نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے لگا جیسے نیرینہ اسے اس مسئلے میں خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی ہو۔ کامران نے بہر حال اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ البتہ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیفیت ذرا اجنبی اجنبی ہی ہے اسے بہت زیادہ لڑکیوں کی قربت حاصل نہیں رہی تھی۔ حالانکہ اس مہم کے دوران کچھ ایسے کردار اس کے قریب آئے تھے جنہوں نے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کی تھی لیکن فطری طور پر کامران ذرا مختلف قسم کا نوجوان تھا۔ وہ اس جال میں نہیں پھنسا تھا۔ ہاں اگر کوئی کردار اس کے ذہن کے پردے کو چھوتا تھا تو وہ صرف سیتا تھی۔ گرشک اور سیتا کے لیے اس کے دل میں اب بھی بڑی جگہ تھی اور وہ اکثر اس کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔

نجانے وہ دونوں کہاں غائب ہو گئے اور نجانے اس طرح واپس آ جانے سے ان کے اپنے معاملات پر کیا اثر پڑا لیکن یہ کوئی بات نہیں تھی وہ ان کے لیے مجبور تو نہیں تھا۔ جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ بالکل غیر فطری بات تھی۔ بہر حال کافی دیر تک یہ لوگ باتیں کرتے رہے اور اس کے بعد کامران ہی نے ان سے اجازت مانگی۔

"بڑی اچھی کمپنی رہی آپ لوگوں سے، ہو سکتا ہے کبھی دوبارہ ملاقات بھی ہو جائے۔" نیرینہ تو کچھ نہ کہا لیکن ریتھا اسے غور سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"ہو سکتا ہے کیا؟ ہونا چاہیے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ کبھی کبھی ملنے میں کوئی حرج نہیں ہے آپ کا قیام کہاں ہے مسٹر کامران۔"

"ایک ہوٹل میں رہتا ہوں۔" کامران نے اپنے ہوٹل کا نام بتاتے ہوئے کہا۔

"گڈ، وجہ گھر نہیں ہے آپ کا۔"

"ہاں گھر نہیں ہے۔" کامران نے جواب دیا۔

"اوہ، سوری میں کچھ زیادہ ہی کرید میں پڑ گئی سوری...... سوری" نیرینہ کو شاید خود اپنی حماقت کا احساس ہو گیا تھا۔ جاتے ہوئے ریتھا نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔

"آپ سے ضرور ملاقات ہوگی مسٹر کامران۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" کامران نے جواب دیا اور اس کے بعد وہ وہاں سے واپس آ گیا۔ لڑکیوں کی موجودگی سے اسے تھوڑی سی بہتر کیفیت کا احساس ضرور ہوا تھا۔ لڑکیاں خاصی دلچسپ تھیں۔ بس ان کے

درمیان رابطہ اسی شکل میں تھا کہ وہ بدھ مذہب سے دلچسپی رکھتی تھیں۔ باقی اور کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔

لیکن دوسرے دن شام کو ساڑھے پانچ بجے کے قریب جب وہ لباس وغیرہ تبدیل کر کے باہر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور وہ اس طرف دیکھنے لگا۔

"کون ہے آ جاؤ دروازہ کھلا ہوا ہے۔" ویٹر کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔ یہاں اس کے ملاقاتی وغیرہ نہیں آتے تھے۔ لیکن دروازہ کھول کر جو شخصیت اندر داخل ہوئی اسے دیکھ کر کامران بری طرح چونک پڑا۔

"سوری...... میں نے کہا تھا ناں کہ ہماری یہ ملاقات آخری ملاقات نہیں ہوگی۔" ریتھا نے کہا اور کامران کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہیلو! مس ریتھا آپ کو یہاں کا پتا کیسے مل گیا۔"

"ارے آپ نے ہی تو بتایا تھا۔"

"اوہ، ہاں واقعی۔"

"اب جہاں بھی جانے کا ارادہ آپ کر رہے ہیں میں جانتی ہوں کہ وہ کوئی سوچی سمجھی جگہ نہیں ہے آئیے چلتے ہیں۔"

"کہاں۔" کامران نے سوال کیا اور ریتھا نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا پھر بولی۔

"پوچھنا ضروری ہے۔" کامران نے گہری نگاہوں سے ریتھا کو دیکھا پھر بولا۔

"آئیے۔" اسے یہ اندازہ ہونے لگا تھا کہ ریتھا کسی غلط فہمی کا شکار ہے لیکن بہر حال چونکہ خود بھی اس کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ بس ایک عجیب سا وقت گزار رہا تھا۔ کرنل گل نواز کا انتظار تھا اسے بہت عرصہ ہو گیا تھا اسے ان علاقوں سے چلے۔ اگر وہ لوگ خیریت سے ہیں تو انہیں اب تک پہنچ جانا چاہیے یا پھر کرنل ان لوگوں کو چکر دے کر کہیں اور آگے بڑھ گیا ہے۔ ایسی صورت میں تھوڑی سی غلطی ہوگئی۔ حسن شاہ کا ملنا تو بہت ہی اچھی بات تھی۔ حسن شاہ ایک شاندار شخصیت تھی اور صحیح معنوں میں کامران کا دل اس سے ملتا تھا۔ اگر وہ وہاں سے آگے بڑھ جاتے اور اپنے معاملات میں مصروف رہتے تو حسن شاہ کی موجودگی بہت سی کامیابیوں کی ضامن ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ خیال بھی درست نہیں تھا کیونکہ کرنل گل نواز کے بارے میں یہ پتا چلا تھا کہ وہ بیمار ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں وہ کرنل گل نواز سے دور بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

جہاں تک خزانوں کا معاملہ تھا۔ تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ واحد شخصیت ہے جس نے دنیا کے عظیم الشان خزانے کا نظارہ کیا ہے جس کے بارے میں سوچ کر ہی انسان اپنا ذہنی توازن کھو سکتا ہے۔ بہر حال یہ راز اس نے حسن شاہ کو بھی نہیں بتایا تھا۔ ایسی باتیں بتانے کے لیے نہیں ہوتیں۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اگر کرنل گل نواز اسے مل جاتا تو وہ کرنل ہی کو اس خزانے کے بارے میں تفصیل بتا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کرنل دوبارہ اس مہم جوئی پر آمادہ ہو۔ لیکن کرنل ہی موجود نہیں تھا۔ اس کا انتظار کر لیا جائے ورنہ اس کے بعد زندگی کے دوسرے رخ تلاش کیے جائیں۔ جہاں خزانے کا تعلق تھا۔ نجانے کیوں کامران کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں محسوس ہو رہی تھی۔

محنت اور جدوجہد تو زندگی کی ضامن ہے۔ دولت کے انبار جمع کر لو لیکن صحت اور خوشی نہ ہو تو اس دولت کا کیا کیا جائے اور ویسے بھی اسے کوئی تجربہ نہیں تھا اس سلسلے میں لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر دولت ہو تو باقی

کسی شے کی حاجت نہیں رہتی۔ بہرحال یہ سب بعد کے معاملات تھے۔ ریتھا کے ساتھ وہ باہر نکل آیا اور بولا۔

''ہاں آپ نے بڑی جرات سے کام لیا ہے مس ریتھا اب بتایئے کہاں چلیں۔''

''اپنے آپ کو مجھ پر چھوڑ دو میں تمہیں لیگون کلب لے جاؤں گی۔''

''یہ لیگون کلب کیا ہے۔''

''بس ہے آؤ۔'' اس نے ریتھا سے تعاون کیا۔ ریتھا اسے جس کلب میں لے گئی وہ واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ شہر سے کافی دور، حالانکہ کامران نے شہر میں بہت وقت گزارا تھا۔ لیکن اس طرف وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ کلب ایک نواحی علاقے میں ایک دریا کے کنارے واقع تھا۔ اتنی پرفضا اور اتنا حسین مقام کہ دیکھنے والی آنکھ دیکھے تو وہاں کی گرویدہ ہو جائے۔ کلب کی وسیع و عریض عمارت میں طرح طرح کی دلچسپیاں پیدا کی گئی تھیں۔

ریتھا نے ایک میز سنبھال لی۔ کامران وہاں کا ماحول دیکھنے لگا۔ ریتھا بولی۔

''پہلے آئے ہیں مسٹر کامران! یہاں۔''

''کبھی نہیں۔''

''مجھے اندازہ تھا۔''

''آپ کو کون سی چیز کا اندازہ ہے ریتھا۔'' کامران نے پرمزاح انداز میں سوال کیا۔ ریتھا مسکرا کر رہ گئی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر وہ بولی۔

''میں چاہتی ہوں مسٹر کامران کہ آپ مجھے اپنی زندگی کے کچھ دن دے دیں۔''

''کچھ دن۔''

''ہاں۔''

''وجہ۔''

''بس آپ مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔''

''اچھے لگنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے......''

''نہیں کوئی ایسی بات نہ کریں جو دل شکنی کا باعث ہو۔ تھوڑا سا ملتے رہیں مجھ سے۔ آیئے میں آپ کو اپنا گھر دکھاتی ہوں۔'' میرا مطلب ہے یہاں سے اٹھنے کے بعد...... اوہو یہ ڈفر کہاں سے آ گیا'' ریتھا نے کہا۔ آنے والا غالباً کسی افریقی ملک کا باشندہ تھا۔ سیاہ فام بھدے نقوش کا مالک لیکن بڑا اچھا تن و توش۔ بڑا کسرتی ورزشی جسم نظر آ رہا تھا۔

''ہیلو ریتھا، ہیلو مسٹر میرا نام رینڈی ہے، ریتھا یہ کون ہیں۔''

''ایک منٹ...... ایک منٹ...... ٹھہرو کیا تم نے یہاں بیٹھنے کی اجازت لی ہے۔'' ریتھا نے رینڈی کو کرسی گھسیٹتے ہوئے دیکھ کر کہا اور وہ چونک پڑا اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نظر آئے تھے پھر وہ بولا۔

''سوری...... کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں مس ریتھا؟''

''نہیں ہم لوگ پرائیویٹ گفتگو کر رہے ہیں اور میں آپ کو اپنی گفتگو میں مداخلت کی اجازت نہیں

دے سکتی مسٹر رینڈی۔'' رینڈی نے چونک کر اسے دیکھا پھر شانے اچکائے اور آہستہ سے بولا۔

''اگر تم ناراض ہو تو تمہاری ناراضگی کی کوئی وجہ میرے علم میں نہیں ہے اگر اس نئے دوست کی پذیرائی کر رہی ہو تو تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتا۔ او کے۔'' اس نے کہا اس کے بعد واپسی کے لیے پلٹ گیا۔

''اگر وہ بیٹھ جاتا تو کیا حرج تھا۔'' کامران نے کہا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے بہرحال یہ جگہ تمہیں کیسی لگی۔''

''جگہ واقعی بہت اچھی ہے بڑی پرفضا۔''

''اس کے بعد میں تمہیں اپنا گھر دکھاؤں گی۔ اچھا تم مجھے یہ بتاؤ سچ بتانا کہ تمہارے مشاغل کیا ہیں۔''

''میں نے کہا نا، ریتھا کچھ بھی نہیں کرتا۔''

''تو پھر تمہارے ذرائع آمدنی۔''

''بس کچھ رقم ہے میرے پاس اسے خرچ کر رہا ہوں۔''

''والدین وغیرہ۔''

''میں نے کہا نا کچھ بھی نہیں ہے اور پلیز! یہ گھریلو قسم کی باتیں مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔'' کامران کے انداز میں کسی قدر اکتاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ واپسی میں ریتھا اسے اپنے گھر لے کر آئی۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر جس کا تالا ریتھا نے خود کھولا تھا۔ کامران کو یہ لڑکی بہت ہی پراسرار محسوس ہوئی تھی۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ کسی اور مشکل میں نہ پڑ جائے۔ لیکن اب تک جتنے حالات سے وہ گزرا تھا اس کے بعد کوئی مشکل اس کے لیے مشکل نہیں رہی تھی۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا ویسے بھی اگر تھوڑی سی دلچسپی کا سامان پیدا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ تنہا اور بے مقصد زندگی سے فائدہ بھی کیا۔'' وہ ریتھا کے مکان کو دیکھتا ہوا ایک وسیع و عریض کمرے میں آ گیا۔

''تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تمہارے آ جانے سے میں کس قدر خوش ہوں۔''

''شکریہ کے علاوہ اور میں کیا کہہ سکتا ہوں مس ریتھا۔''

''آؤ میں تمہیں موسیقی سناؤں۔'' اس نے کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کامران پرسکون تھا۔ کوئی ایسی بات نہیں تھی جو باعث حیرت ہو۔ بہرحال وہ اتنی واقفیت ضرور رکھتا تھا ماحول سے کہ ریتھا کی دلچسپی کو محسوس کر سکے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس دلچسپی کی وجہ کیا تھی۔ کیا بدھ مذہب سے اس کی دلچسپی یا کچھ اور۔ غرض یہ کہ وہ ریتھا کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ دفعتاً ہی فضا میں ایک عجیب سی موسیقی نشر ہونے لگی۔ موسیقی کی آوازیں بہت قریب سے آ رہی تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ جو ساز بجائے جا رہے تھے جو کیسٹ بج رہا تھا اس کی دھنیں بڑی پراسرار تھیں۔ اچانک ایک چھم کی آواز کے ساتھ ایک بالکل نئے دروازے سے ریتھا نمودار ہوئی۔ لیکن اس نے بہت ہی خاص قسم کا لباس پہن رکھا تھا۔ بدھ مذہب کی ایسی رقاصائیں جو مخصوص اور انتہائی پرکشش لباس پہنتی ہیں اور ریتھا بھی اس وقت بہت ہی پرکشش نظر آ رہی تھی۔ اس نے بازوؤں پر بازوبند باندھ رکھے تھے۔ اس کا چمکدار ریشمی جسم اس لباس میں اس قدر حسین نظر آ رہا تھا کہ دیکھنے والی نگاہیں

مسحور ہو جائیں۔ اس کے چہرے پر ایک گہری سنجیدگی طاری تھی۔ اور پھر اس نے ایک انوکھے رقص کا آغاز کر دیا۔

وہ رقص اس موسیقی سے مکمل طور پر ہم آہنگ معلوم ہوتا تھا۔ جو نشر ہو رہی تھی نجانے کیوں کامران پر ایک عجیب سی بے خودی طاری ہونے لگی۔ اس کا ذہن ایک پراسرار دھن میں لپٹنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ایک مدھم سی آواز ابھری۔ جیسے کوئی عورت گا رہی ہو۔ گانے کے بول بھی کچھ کچھ سمجھ میں آ رہے تھے۔ جو کچھ یوں تھے۔

''خوابوں کی دنیا میں سو جانے والے۔

تو مجھ سے کتنی ہی دور چلا جائے لیکن تو ہمیشہ میرے قریب رہے گا۔ زمین کی گہرائیوں میں میں تیرا انتظار کروں گی۔ اس وقت تک جب تک کہ تو واپس نہ آ جائے۔ میں تیرا انتظار کروں گی۔'' ریتھا رقص کرنے لگی پھر اچانک ہی وہ سیدھی ہوئی۔ اور اس کے منہ سے آواز نکلی۔

''اور تو میرے راستوں کا راہی ہے کوئی اور مجھے اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا۔'' وہ سیدھی ہوئی تو کامران کی آنکھیں شدت حیرت سے پھیل گئیں۔ اب وہ ریتھا نہیں نیرینہ تھی کامران گردن جھٹکنے لگا۔ اور دفعتاً ہی اس نے قوت ارادی سے کام لیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بند کرو یہ رقص۔ بند کرو یہ آوازیں۔'' کامران کی دھاڑ ابھری اور ایک دم موسیقی رک گئی، اس کے ساتھ ہی ریتھا بھی رک گئی۔ اس نے حیرت زدہ نگاہوں سے کامران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا؟''

''کیا ہو رہا ہے یہ سب کچھ، کیا کر رہی ہو یہ تم ریتھا۔ میری مرضی کے خلاف مجھے تو ان تمام چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''ایں۔'' ریتھا حیران لہجے میں بولی۔

''ہاں۔''

''اوہ معافی چاہتی ہوں'' ریتھا کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت پھیل گئی۔ پھر وہ آہستہ سے گردن جھکا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ کامران بھی پریشان نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ یہ کیسا انوکھا اور سحر انگیز ماحول تھا اور یہ ہو کیا رہا ہے۔ سب کچھ کوئی الجھا ہوا ناٹک کوئی سمجھ میں نہ آنے والی کہانی۔ ریتھا لباس تبدیل کر کے آ گئی۔ اس نے جھینپی جھینپی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''میرا خیال تھا کہ تم اس انوکھے ماحول میں دلچسپی لو گے، یہ خیال مجھے اس وقت پیدا ہوا جب تم میوزیم میں بدھ مذہب کا مطالعہ کر رہے تھے۔''

''ریتھا مجھے ذاتی طور پر بدھ مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں مسلمان ہوں اور خدا کے فضل سے اپنے عقیدے پر پختہ اور اس سے مطمئن ہوں۔ بس ایک تجسس والی بات تھی جو کچھ وجوہات کی بناء پر میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔''

''ٹھیک۔''

''ٹھیک ہے اب تم مجھے اجازت دو گی۔''

''کہاں جاؤ گے۔ ذرا دیکھو رات کتنی گزر چکی ہے۔'' اس نے گھڑی کی طرف اشارہ کیا اور کامران ایک بار پھر ششدر رہ گیا۔ رات کا وقت تھا اور گھڑی میں دو بج رہے تھے۔ اتنی دیر کامران کو تو وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہو سکا تھا۔ اسے ایک دم یوں لگا جیسے وہ کسی پراسرار طلسمی چکر میں پھنس گیا ہو۔ اس نے کہا۔

''جانا تو ہے نا ریتھا ظاہر ہے میں یہاں نہیں رک سکتا۔''

''تمہاری مرضی ہے۔'' ریتھا اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ جب وہ باہر نکلا تو موسم بہت خوبصورت تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور کہیں کہیں چاند اور بادل کے درمیان آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔ کامران سیٹی بجاتا ہوا سنسان سڑک پر چلتا رہا۔ نجانے کیوں اس وقت اس کے اندر ایک عجیب سی کیفیت ابھر رہی تھی۔ بس کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ریتھا کا التفات بھی اچھا لگ رہا تھا۔ نیرینہ کی یاس انگیز خاموشی...... اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دھیرے دھیرے اس کے پیچھے چل رہا ہو۔ اس نے گھوم کر دائیں طرف دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ چلنے کے بعد رکنے کے بعد وہ آگے بڑھا تو قدموں کی چاپ اسے اپنا تعاقب کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سڑک ویران تھی لیکن یہ قدموں کی چاپ کوئی وہم نہیں تھی۔ کوئی ہے، آخر کوئی ہے تو آخر نظر کیوں نہیں آ رہا۔ کامران نے سوچا کہ جن حالات سے گزر کر آ رہا ہوں وہ اس کے ذہن کو بھٹکانے کے لیے کافی تھے۔ ریتھا نے ایک پراسرار ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ جتنا وقت یہاں گزرا تھا وہ حیران کن تھا۔ نجانے اتنا وقت کیسے گزر گیا۔

پھر وہ تھوڑا سا آگے بڑھا تھا کہ اچانک ایک پولیس مین اس کے سامنے آ گیا۔ کامران سمجھ گیا کہ اتنی رات گئے سڑک پر ایک آدمی کو تنہا چلتے دیکھ کر پولیس مین اس کے قریب پہنچا ہے کامران نے خود ہی کہا۔

''ہیلو آفیسر!''

''ہیلو کہاں گھوم رہے ہو اس وقت۔''

''بس ایک دوست کے پاس بیٹھا ہوا تھا وقت زیادہ ہو گیا اب گھر جا رہا ہوں۔''

''بتاؤ گے تمہارا گھر کہاں ہے۔''

''ایک ہوٹل کے کمرے میں۔''

''ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو۔''

''لیکن یہ وقت گھومنے کے لیے مناسب نہیں ہے، ہم لوگوں کو رات بھر ڈیوٹی کرنا ہوتی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے علاقوں میں امن و امان رہے۔''

''شکریہ آفیسر۔'' یہ کہہ کر کامران آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے ہوٹل کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ لیکن ایک بار پھر اسے احساس ہوا کہ ایک جھونکا اس کے قریب سے گزرا ہے بالکل اس طرح جیسے کہ چھپاکے سے قریب سے نکل جائے۔ نہ کوئی چاپ تھی اور نہ کوئی دوسری آواز، لیکن کامران کو پورا پورا یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی ضرور ساتھ ہے کون ہے یہ؟ یہ کیا احمقانہ احساس ہے۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔

لیکن کوئی فیصلہ کرنا مشکل تھا۔

بہرحال اس نے لباس تبدیل کیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ ذہن میں ابھی تک ننھے ننھے سے دائرے ابھر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال وہ بہت دیر تک سوچتا رہا اس کے بعد اس نے چھوٹے فریج سے پانی بھرا اور اسے غٹاغٹ پی گیا۔ اس کا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا اور وہ ریتھا کے تصور میں ڈوبا ہوا تھا۔ کبھی کبھی اسے نیرینہ کا پراسرار چہرہ بھی نظر آ جاتا تھا۔ بمشکل تمام اس نے بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کی اور نیند نے اسے ان الجھنوں سے آزاد کر دیا۔

لیکن دوسرے دن عجیب مجہول سا دن تھا۔ طبیعت پر ایک گرانی صاف محسوس ہوتی تھی۔ دن کے کوئی ساڑھے دس بجے تھے اس نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا تھا کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی اور اس کے بعد ریتھا اندر آ گئی۔ وہ ریتھا کو دیکھ کر چونک پڑا۔ ریتھا کے چہرے پر شرمندگی کے آثار تھے۔ اس نے گردن جھکائے جھکائے کہا۔

''سوری...... سوری...... مجھے خود بھی احساس ہے کہ جو کچھ میں کر رہی ہوں وہ کسی بھی طور درست نہیں ہے کسی شخص کو اس کی مرضی کے بغیر اس طرح پریشان کرنا ایک گھٹیا عمل ہے لیکن اس امید پر یہ عمل کر رہی ہوں کہ تم مجھے معاف کر دو گے۔''

''بیٹھو ریتھا کیا بات ہے؟ خاصی الجھی الجھی نظر آ رہی ہو۔''

''ہاں، کچھ ایسی ہی کیفیت ہے میرے ساتھ جسے میں خود نہیں سمجھ پا رہی میری بات پر یقین کرو یا نہ کرو لیکن میں تمہیں سچ بتاؤں کہ میرے قدم خود بخود تمہاری طرف اٹھ جاتے ہیں۔ مجھے معاف کر دینا کامران مجھے معاف کر دینا۔''

''بیٹھو ریتھا...... بیٹھو کیا ناشتہ کیا ہے تم نے یا نہیں۔'' ریتھا نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر روئی روئی سی کیفیت تھی۔ کامران نے نجانے کیوں اس کے لیے دل میں بڑی ہمدردی محسوس کی اور آگے بڑھ کر کہا۔

''ریتھا تم خود اس بات کو اتنی زیادہ گہرائی میں محسوس کر رہی ہو۔ کوئی بات نہیں ہے انسان اسی طرح کبھی کبھی ایک دوسرے سے متاثر ہو جاتا ہے، مجھے تمہارا آنا برا تو نہیں لگا۔'' کامران کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ان الفاظ پر ریتھا کا چہرہ کھل اٹھا ہو۔ اس نے شرمساری نگاہوں سے کامران کو دیکھا اور بولی۔

''یہ تمہاری اچھائی ہے کامران اس میں میری کوئی خوبی نہیں ہے۔ میں خود یقین کرو اپنی اس کیفیت سے شرمندہ ہوں۔ میں سوچتی ہوں کہ تم کیا سوچتے ہو گے میرے بارے میں۔''

''میں تمہارے بارے میں بالکل برے انداز سے نہیں سوچتا بس۔ کیوں بلاوجہ مجھے شرمندہ کر رہی ہو۔'' کامران نے کہا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ الفاظ جانے بوجھے نہیں ہیں۔ جیسے یہ الفاظ خود بخود اس کے منہ سے نکل رہے ہیں۔ کسی غیر مرئی قوت کے تحت۔ لیکن بات واقعی حیران کن تھی۔ کیوں ہو رہا ہے ایسا۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ یہ لڑکی اچانک ہی اسے ملی ہے اور اس کے بعد یہ اس کے دل و دماغ پر چھاتی جا رہی ہے۔ سیتا کے اثرات زائل ہو رہے ہیں۔ کیوں اس وقت اس کی یہ کیفیت اسے متاثر کر رہی ہے اس نے سوچا۔ لیکن اس وقت وہ ان زیادہ الجھنوں میں نہیں پڑ سکتا تھا اور پھر اس کے بعد ریتھا اس طرح اس کے دل و دماغ پر چھانے لگی کہ وہ خود بھی اس کا کوئی مفہوم تلاش نہیں کر سکا۔ بس وہ ریتھا کے جال میں گرفتار ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس میں اس کی قوت فیصلہ کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اب ہر روز ریتھا اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ حسن شاہ سے بھی رابطہ قائم نہیں تھا اور نہ ہی کامران کو کوئی فکر رہ گئی تھی۔ ریتھا نے ایک دن اس سے کہا۔

''ہمارا اس طرح ملنا تو مناسب نہیں ہے تم ہوٹل میں رہتے ہو اور میں جس گھر میں رہتی ہوں وہ اس قابل نہیں ہے جس میں تمہیں مستقل وہاں رکھوں میرا خیال ہے ہم ایک مکان کا بندوبست کیے لیتے ہیں۔''

''مکان۔''

''ہاں مکان۔''

''مگر ریتھا......''

''نہیں یہ ذمے داری تم پر مجھ پر چھوڑ دو بلکہ میں تو یہ کہتی ہوں کہ اپنی ہر ذمے داری مجھ پر چھوڑ دو۔'' ریتھا نے کہا اور کامران ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ ''ایسا ہوتا تو نہیں ہے ریتھا۔ ذمے داریاں تو مردوں ہی کو نبھانی پڑتی ہیں۔''

''بعض ذمے داریوں میں عورتوں کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔'' اس دوران نہ تو کامران کرنل گل نواز کے گھر گیا تھا۔ حالانکہ ایک ہی شہر تھا ایک ہی جگہ تھی۔ اور اب اس کے دل میں گل نواز کے لیے اس کے دل میں اتنی زیادہ الجھنیں رہ گئی تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے ریتھا اس کی زندگی کا ایک حصہ ہو۔ بس اب وہ ریتھا ہی کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ مکان بھی لے لیا گیا۔ ریتھا نے اس کے لیے پورا مکان سجایا اور پھر بولی۔

''بس اب ہماری تمام تر ملاقاتیں یہیں ہوا کریں گی اور اگر تم میرے ساتھ رہو تو۔''

''نہیں۔ کیا مطلب ہے تمہارا میں تمہارے ساتھ رہوں۔''

''ہاں۔'' ریتھا کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آ گیا۔ وہ کہنے لگی لیکن کس حیثیت سے۔''

''دوست کی حیثیت سے ریتھا۔ الجھنے یا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔''

''نہیں بالکل نہیں نہ میں الجھ رہی ہوں نہ پریشان ہو رہی ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کامران ابھی یہ مطالبہ رہنے دو ہمیں وقت آنے کا انتظار کرنا ہو گا۔''

بہرحال ریتھا نے اس وقت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن کامران کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی طلسم کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہو۔ اب اسے ریتھا کے علاوہ اور کچھ یاد نہیں رہ گیا تھا۔ اور وہ ہر وقت اس کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ ریتھا روزانہ اس کے پاس آتی تھی اور پورا دن اس کے ساتھ ہی رہا کرتی تھی۔ وہ بہت خوب صورت لباس بھی تبدیل کرتی رہتی تھی لیکن کامران نے محسوس کیا تھا کہ اس کے اندر محبت سے زیادہ عقیدت ہوتی ہے وہ کامران کو مخاطب بھی اسی انداز میں کرتی تھی۔ لیکن اس نے وہ الفاظ کبھی نہیں کہے تھے۔ یعنی پاتال پرستی اور کوئی ایسی بات۔ اس کے علاوہ نیرینہ علی کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ زندگی میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا اور بڑی قربتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا جس میں پریشانی ہوتی۔

بہر حال ایک شام کامران اور ریتھا گھر سے نکلے۔ اس روز موسم بہت اچھا تھا۔ آسمان پر بادل برائے نام بھی نہیں تھے۔ خنکی بہت کم تھی اور ہوا بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ کامران ریتھا کے ساتھ ایک پرفضا مقام پر چہل قدمی کرنے لگا یہ ایک پارٹ نما جگہ تھی۔

جو شہر سے کافی فاصلے پر تھی۔ موسم کی مناسبت سے لوگ یہاں سیر و سیاحت کے لیے آجایا کرتے تھے یہاں چھوٹے چھوٹے ہوٹل بھی بنے ہوئے تھے۔ کافی دیر کے بعد ریتھا نے کہا۔

''سنہری گھر۔''

''عجیب سا نام ہے۔'' کامران نے کہا اور ریتھا پراسرار انداز میں مسکرا دی۔ بہر حال وہ دونوں اس سنہری گھر میں داخل ہو گئے۔ کامران کو یوں لگا جیسے یہاں کا ماحول بھی عجیب عجیب سا ہے وہ آگے بڑھے تو بہت سی نگاہوں نے ان کا طواف کیا۔ سنہری گھر، لکڑی کے کیبنوں سے بنا ہوا تھا اور وہاں ہر طرف موی مجسمے رکھے گئے تھے یہ مجسمے زمانہ قدیم کے بہت سے کرداروں کی شکل میں بنائے گئے تھے۔ کامران حیرت سے بولا۔

''مجھے تو یوں لگ رہا ہے ریتھا جیسے تمہارے ساتھ میں اس شہر کو دیکھ رہا ہوں۔''

''تو پھر تو تم میرے ساتھ ہی تھے نا۔'' ریتھا نے مسکرا کر کہا۔

''میرا یہ مطلب نہیں ہے مطلب یہ کہ یہاں میں نے بڑا وقت گزارہ ہے لیکن جن جگہوں پر میں تمہارے ساتھ جا رہا ہوں وہ میرے لیے اس قدر اجنبی ہیں۔ جیسے کسی دوسرے ملک میں آ گیا ہوں تعجب کی بات ہے یہاں میں بالکل پہلی بار آیا ہوں۔''

''سنہری گھر ایک حسین ترین جگہ ہے یہاں قدیم بدھ ماحول کو نمایاں کیا گیا ہے آؤ چونکہ تمہیں خود بھی بدھ ماحول سے دلچسپی ہے اس لیے میں تمہیں یہاں کی سیر کراؤں۔ ایک زمین دوز راستے سے گزر کر ہم بہت بڑے ہال میں آ گئے یہاں واقعی لاتعداد مجسمے تھے۔ دونوں طرف سووینٹر وز بنی ہوئی تھیں۔ جن میں طرح طرح کے مجسمے نظر آ رہے تھے۔ وہ قریب آ کر بولی۔

''آؤ اس مجسمے کو دیکھو۔ یہ سائتہ موہنہ ہے۔''

''سائتہ موہنہ بڑا خوبصورت نام ہے۔ کون تھی یہ؟''

''ایک عظیم راہبہ جس نے اپنا ایک نظریہ حیات تشکیل دیا اور اس کے بعد اپنے آپ کو آگ میں جلا کر راکھ کر لیا۔''

''بدھ مت میں ہارا کاری ایک بہترین موت ہوتی ہے۔''

''ہاں، خودکشی یا خود کو مارنا عام دل گردے کا کام نہیں ہے۔''

''نظریہ کیا ہے اس سلسلے میں۔'' کامران نے سوال کیا۔

''دوسروں کو اذیتیں دینا تو بہت آسان ہوتا ہے انسان باآسانی دوسرے انسان کی جان لے لیتا ہے۔ لیکن جان دینا ایک بڑا کام ہے۔ اپنے آپ کو نقصان پہنچانا آسان کام نہیں ہوتا اور اس میں بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے کسی پر غصہ آئے، کسی سے بدلہ لینے کا خیال دل میں آئے تو اسے نقصان پہنچانے کے بجائے اپنے آپ کو اذیتیں دے کر نقصان پہنچانا بڑائی کی دلیل ہوتی ہے اور یہی ہماری تعلیمات ہیں۔''

''کچھ عجیب سی ہیں۔''

''نہیں عجیب نہیں ہیں۔ آؤ میں تمہیں دوسرے مجسمے دکھاؤں۔'' ریتھا نے اچانک ہی سلسلہ گفتگو تبدیل کر دیا اور سنہری گھر کے اس زمین دوز تہ خانے کے دوسری جانب چل پڑی اور پھر وہ تہ خانے کے ایک حصے میں جا کو رک گئی۔ آس پاس کچھ اور افراد بھی موجود تھے۔ جو شیشوں کے شوکیسوں میں لگے ہوئے موی مجسموں کو دیکھ رہے تھے۔ کامران کو شدید حیرت اس بات پر ہوئی کہ کافی عرصے تک اس کا ساتھ شاہ نواز اور کرنل گل نواز کی بیٹیوں سے رہا تھا۔ یہ خوش ذوق لوگ تھے۔ سیر و سیاحت کے رسیا۔ لیکن کبھی انہوں نے سنہرے گھر کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ جبکہ یہ جگہ تو ایک تاریخی حیثیت رکھتی تھی۔ کرنل گل نواز نے بھی کبھی اس جگہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔

اس کی وجہ نامعلوم تھی۔ بہر حال موی مجسموں کے اس چھوٹے سے شہر کے اس گوشے میں ریتھا رک گئی۔ اس کی نگاہوں کا مرکز ایک خوب صورت لڑکی کا مجسمہ تھا۔ جو مخصوص بدھ راہبہ کا لباس پہنے ہوئی تھی۔ لیکن حسن و جمال میں یکتا۔

''یہ ستان پر بھانہ ہے۔'' ریتھا نے کہا۔

''یہ کیا ہوتا ہے۔'' کامران نے پر مزاح انداز میں کہا تو ریتھا جلدی سے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''نہیں، مقدس دیویوں اور دیوتاؤں کو اس انداز میں نہیں مخاطب کرتے۔ ستان پر بھانہ ایک عظیم دیوی ہے۔ بدھ مت کی ایک قابل قدر ہستی۔''

''اچھا، بہر حال یہ کیا حیثیت رکھتی ہے یہ میں نہیں جانتا۔'' ریتھا نے ایسی عجیب سی نگاہوں سے کامران کو دیکھا کہ کامران حیران رہ گیا۔ اس وقت ریتھا کی آنکھیں اسے ریتھا کی آنکھیں نہیں معلوم ہوئی تھیں۔ بلکہ نجانے کیوں ان آنکھوں میں اسے ایک عجیب سی شناسا شکل نظر آئی۔ کامران سوچتا رہ گیا ریتھا نے اس سے کہا۔

''کامران آؤ آگے آؤ۔ میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ جو کچھ بھی دیکھو اس کا تاثر تمہارے دل پر کچھ ہو یا نہ ہو۔ لیکن ان کے بارے میں کوئی برا لفظ کبھی نہ کہنا۔'' کامران نے فوراً ہی کہا۔

''مجھے افسوس ہے ریتھا میں نے تمہارے جذبات کی توہین کی۔ اسی وقت ایک دراز قامت عورت ان لوگوں کی جانب متوجہ ہو گئی۔ وہ بھاری جسامت کے باوجود حیرت انگیز طور پر بہت خوب صورت تھی۔ اس کا قد تقریباً چھ فٹ رہا ہوگا۔ شانے اور کولہے بڑے چوڑے تھے۔ ٹانگیں لمبی اور سڈول تھیں۔ چہرے سے بڑی بھولی بھالی سی لگ رہی تھی۔ کامران اسے دیکھنے لگا۔ عورت لڑکھڑاتی ہوئی سی آواز میں بولی۔

''ہیلو! تم لوگ شاید بدھ مت پر تحقیق کر رہے ہو۔ ایشی ادھر آؤ دیکھو میں تمہیں کچھ لوگوں سے ملواتی ہوں۔ اس نے ان لوگوں کی طرف سے کوئی جواب ملے بغیر اس انداز میں کہا جیسے اسے ان لوگوں پر اقتدار حاصل ہو دوسری لڑکی چھوٹے سے قد کی بھرے بھرے جسم والی تھی۔ رنگ بے حد سفید تھا۔ چہرہ گول اور بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ اس نے اپنے سنہری بالوں کی پونی باندھ رکھی تھی۔ جسم پر بلاؤز کے ساتھ ایک منی

اسکرٹ تھا۔ وہ واقعی کوئی حسین گڑیا نظر آ رہی تھی خاص طور سے اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی۔ جسے ایک دو نظر دیکھنے کے بعد دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ اسے دوبارہ بھی دیکھا جائے۔

''ہیلو سر!''

''ہیلو۔'' جواب میں ریتھا نے ہی کہا۔ کامران نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

''آپ لوگ آئیے ہیزل تم بھی آؤ۔ ایک اور لڑکی بھی پہنچ گئی اس دعوت کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ لیکن بے اختیار قدم اس کی جانب اٹھ گئے۔ تیسری لڑکی کسی قدر سانولے رنگ اور کسے ہوئے ورزشی جسم کی مالک نظر آتی تھی۔ پھر دو اور لڑکیاں ملی اور اس طرح ان کی تعداد پانچ ہو گئی۔

وہ انہیں تہ خانے سے ملحق ایک بڑے سے کمرے میں لے گئی۔ جہاں نشستیں پڑی ہوئی تھیں۔ پھر انہوں نے انہیں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور وہ سب بیٹھ گئے۔ ریتھا مطمئن نظر آ رہی تھی۔ جیسے وہ کامران کو ان لوگوں سے ملانے کے لیے لائی ہو وہ خود بھی پرسکون بیٹھی ہوئی تھی۔

''آپ لوگ یہاں آئے ہیں میں چاہتی ہوں کہ آپ کی خاطر مدارات کی جائے۔''

''تکلف کی ضرورت نہیں ہے میڈم ہم لوگ......''

''نہیں...... نہیں تکلف کی بات نہیں ہے۔ یہ میرا فرض ہے۔ آپ کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔'' دراز قامت عورت نے جو سب سے پہلے ملی تھی۔ کامران کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

''میرا نام کامران ہے کیا آپ ریتھا سے پہلے سے واقف ہیں۔'' جواب میں وہ عورت عجیب سے انداز میں مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ کا مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ یہ ایک انتہائی پراسرار سا ماحول بن گیا تھا۔ کامران کی سمجھ میں تو کوئی بات نہیں آ رہی۔ لیکن ریتھا اس طرح مطمئن تھی۔ جیسے میں سب کچھ کرانے کے لیے لایا گیا ہوں۔ پھر دو اور ملازمائیں کھانے پینے کی اشیاء لیے ہوئے قریب آ گئیں۔ انہوں نے گھٹنوں تک جھک کر ان لوگوں کو تعظیم دی اور وہ اپنی حیرانی کو چھپا بھی نہیں سکا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان لوگوں کا یہ التفات اور یہ خاطر مدارات کیا معنی رکھتی ہے۔ ظاہر ہے یہاں سنہری گھر میں تو بہت سے لوگ آتے ہوں گے۔

اس میوزیم کی کیفیت ہی عجیب تھی۔ بہرحال تقریباً ایک گھنٹہ یہ لوگ میوزیم میں رہے جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو دراز قامت عورت نے جس نے بعد میں اپنا نام شجیرہ بتایا تھا۔ کہا:

''آپ لوگ کسی دن میری رہائش گاہ پر تشریف لائیے۔ یہ لڑکیاں بہت اچھی رقاصائیں ہیں آپ کے لیے ستانیکی رقص پیش کریں گی۔'' کامران نے ستانیکی رقص کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ البتہ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

''کیا آپ لوگ ساتھ ہی رہتی ہیں۔''

''ہاں۔''

''بہتر ہے، میں کسی دن ضرور آؤں گا۔'' کامران نے کہا اور اچانک ہی اس کی نگاہ ان تمام عورتوں

کے گلوں میں پڑے ہوئے لاکٹوں پر پڑی حیرت کی بات یہ تھی۔ تمام کے ڈیزائن اور بناوٹ ایک جیسی تھی اور جو سبھی کی گردنوں میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ بالکل مچھلی کی شکل میں تھے اور مچھلی کے درمیانی حصے میں بدھا کی تصویر تھی۔ کچھ عجیب و غریب کیفیت تھی۔ اس کی بہرحال سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان لوگوں نے کامران کو اتنی عزت اتنی حیثیت کیوں دی ہے اور اس کے بعد یہ دعوت۔

بہرحال کامران ریتھا کے ساتھ باہر نکل آیا اور وہ لوگ سڑک پر پیدل چل پڑے۔ سڑکوں پر خاصی چہل پہل تھی۔ حالانکہ شام کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ دکانوں کے نیون سائن جل گئے تھے۔ ریتھا نے کہا۔

''کیسا لگا یہاں آ کر۔''

''کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔'' کامران نے جواب دیا۔

''کوئی الجھی ہوئی کہانی تو یاد نہیں آ رہی۔ کوئی ایسا گزرا ہوا واقعہ جو تمہاری زندگی سے تعلق رکھتا ہو۔'' ریتھا نے کہا اور کامران چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''مطلب۔''

''نہیں...... نہیں کوئی مطلب نہیں ہے...... مطلب صرف اتنا سا ہے کہ بعض اوقات ہم لوگ ایسے حالات کا شکار ہو جاتے ہیں کہ باقی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ہم سوچنا چاہتے ہیں لیکن ہماری سوچیں بھی ہمارا ساتھ نہیں دیتیں۔ خیر اب ہم کسی دن شجیرہ کے گھر چلیں گے۔ کیا تم وہاں جانا پسند کرو گے۔''

''ہاں یہ لوگ بڑی بے لوث شخصیت کے مالک ہیں، میں ضرور چلوں گا۔ مگر میری سمجھ میں کچھ آیا نہیں ہے۔''

''انتظار کرنا ہوگا۔ صدیوں سے سوئی ہوئی داستانیں ایک دم سے تو زندہ نہیں ہو جاتیں۔ وقت آہستہ آہستہ انہیں ذہنوں میں منتقل کرتا ہے۔'' ریتھا نے کہا اور پھر اس طرح چونک پڑی جیسے سوتے ہوئے جاگ پڑی ہو۔ یا یہ الفاظ جو اس نے کہے کسی اور مقصد کے تحت کہے گئے ہوں۔ لیکن کامران کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ان باتوں کا مطلب کیا ہے۔

بہرحال وہ آگے بڑھتے رہے اور پھر خود بخود ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ سامنے ایک عمارت نظر آ رہی تھی عمارت کے سامنے ان کے قدم رک گئے۔ لیکن کامران کو خود یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ یہاں کیوں رکا ہے پرانے شہر کی کوئی لمبی گلی تھی۔ پختہ اینٹوں کا فرش بنا ہوا تھا۔ پتھریلی اینٹوں سے بنی ہوئی سڑک پر جگہ جگہ کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بکھرا ہوا تھا۔ مکانات کی حالت اتنی خستہ تھی کہ اصولی طور پر انہیں رہائش کے لیے ناقابل قرار دے دینا چاہیے تھا۔ جس جگہ ان کے قدم رکے تھے۔ وہ ایک بڑا سا چوبی دروازہ تھا اور اس پر ایک خوبصورت بورڈ لگا ہوا تھا جو اس علاقے کا شاید سب سے خوبصورت نقطہ تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔

''آپ کے لیے ایک قیمتی آرام گاہ'' اور اس کے ساتھ ہی اندر آنے کی دعوت بھی دی گئی تھی۔

''آؤ۔'' ریتھا نے کہا۔ کامران کا منہ ایک لمحہ کے لیے حیرت سے کھلا جیسے وہ پوچھنا چاہتا ہو کہ اندر داخل ہونے کی کیا ضرورت ہے لیکن اس کے منہ سے آواز نہ نکلی۔ البتہ قدم ریتھا کا اس طرح ساتھ دے رہے تھے۔ جیسے وہ اس کے جسم سے بندھا ہوا ہو۔ دروازے کے دوسری طرف پتلی سی نیم روشن راہداری تھی

جو زیادہ لمبی نہیں تھی پھر ایک کاؤنٹر نظر آیا جہاں ایک دبلے پتلے جسم کا جھینگر نما آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ریتھا کامران کو لے کر وہاں پہنچ گئی اور پھر اس نے کہا۔

"یہ ایک عمدہ جگہ ہے آؤ۔ میں تمہیں زندگی کی نئی جہت سے روشنا کراؤں۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے انہیں دو چمکدار سکے دیے جو غالباً اندر جانے کے ٹوکن تھے۔ ریتھا نے اس طرح یہ سکے لے کر اپنے لباس میں رکھ لیے جیسے وہ یہاں کے تمام اصولوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ پھر دروازہ کھول کر جس جگہ داخل ہوئے۔ وہ ایک عجیب سی پر گھٹن جگہ تھی۔ اندر قدم رکھتے ہی جو چیز کامران کے نتھنوں سے ٹکرائی وہ چرس کی بو تھی۔ یہ کوئی ڈرگز ہاؤس تھا۔

قرب و جوار میں بیٹھے ہوئے لوگ مختلف طرح کی منشیات سے شغل کر رہے تھے۔ ہال کی سجاوٹ بھی اسی ڈھنگ پر کی گئی تھی۔ ہال بہت کشادہ تھا۔ میزیں اور کرسیاں دیوار کے ساتھ رکھی گئی تھیں۔ درمیان میں ڈانس کے لیے جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ جہاں تین چار جوڑے لڑکھڑاتے قدموں سے ڈول رہے تھے۔ بڑی حیرت ہو رہی تھی کامران کو۔ یہ کون سی دنیا ہے اور اگر یہ جگہ اس شہر میں موجود ہے تو پھر وہ ساری باتیں کیا حیثیت رکھتی ہیں جن میں لمحے لمحے کہا جاتا ہے کہ یہ تمام چیزیں جائز نہیں ہیں۔ ریتھا کامران کے ساتھ آگے بڑھ گئی اور پھر اس نے ایک میز سنبھال لی۔ ابھی وہ میز پر بیٹھی ہی تھی کہ دو افراد وہاں پہنچ گئے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ یہ بھی کچھ عجیب سے نقوش کے مالک تھے۔ اچانک ہی عورت نے کامران کو دیکھا اور بولی۔

"ہیلو تم آ گئے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"نہیں ہم اپنے معزز مہمانوں کو ہمیشہ خوش آمدید کہتے ہیں۔"

"شکریہ۔"

"لیڈی کیا آپ میرے ساتھ آنا پسند کریں گی۔" مرد نے جھک کر ریتھا سے کہا اور ریتھا کامران کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"سوری ڈیئر...... بس چند لمحوں کے لیے۔"

"ہاں...... ٹھیک ہے۔" کامران نے جواب دیا اور ریتھا اٹھ کر اس کے ساتھ چلی گئی جبکہ آنے والی عورت اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔

"یہاں کوئی نام نہیں ہوتے اس لیے نہ میں تم سے تمہارا نام پوچھوں گی اور نہ تمہیں اپنا بتاؤں گی ویسے میں تمہاری ہر خدمت کے لیے تیار ہوں بتاؤ مجھے تمہارے لیے کیا کرنا ہے۔" کامران اسے دیکھتا رہا پھر اچانک ہی ریتھا واپس آ گئی اور اس کے منہ سے آواز نکلی۔

"ہیلو شیری ہیلو۔" ایسا لگتا تھا جیسے ریتھا اس لڑکی کو اچھی طرح جانتی ہو۔ لڑکی نے چونک کر ریتھا کی طرف چہرہ گھمایا۔ پھر پھیکی آواز میں کہا۔

"ہاں کیسی ہو ریتھا۔"

"ٹھیک ہوں تم بہت دن کے بعد مجھے نظر آئیں۔"

"ہاں بس مصروف رہتی ہوں۔" شیری نے جواب دیا۔ دونوں کامران کے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ شیری بدستور کامران کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور وہ انہیں ہر بار زبان سے تر کر رہی تھی۔ کامران کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن شاید اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے یا ہمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی۔ کامران کے منہ سے نکلا۔

"مس شیری! چلیے آپ کا نام آپ کے منہ سے نہ ہی سہی ریتھا کے منہ سے مجھے معلوم ہو گیا۔ آپ کیا پئیں گی۔"

"کچھ نہیں۔" لڑکی نے جواب دیا۔ عین اسی وقت ایک آدمی اٹھ کر اس کے قریب آ گیا اور بڑی بدتمیزی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تو یہاں کیا کر رہی ہے۔ مجھے انتظار کے لیے کہہ کر آئی اور یہاں آ کر بیٹھ گئی۔ کتنی دیر ہوئی تجھے اندازہ ہے۔"

"نہیں میں یہیں بیٹھنا چاہتی ہوں۔ فیلر!" شیری نے جواب دیا۔

"میں کہتا ہوں اٹھو یا پھر میں تمہارے بال پکڑ کر تمہیں اٹھاؤں۔"

"کیا میں تمہارے باپ کی ملازم ہوں۔" شیری نے غصیلے لہجے میں کہا۔ فیلر کے چہرے پر شدید غصے کے آثار نظر آئے اور پھر وہ غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"جانتی ہو اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔ میں یہاں بیٹھی ہوں اس جگہ سے کوئی مجھے نہیں اٹھا سکتا۔" اس دوران ریتھا بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ ہر طرح کے تاثرات سے بالکل عاری تھا۔ دفعتاً فیلر کامران کی جانب متوجہ ہو گیا اور غصیلے لہجے میں بولا۔

"اس کے بعد اگر تم یہاں داخل ہوئے تو میں تمہاری دونوں ٹانگیں توڑ دوں گا۔ یہ میری ساتھی لڑکی ہے۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔" شیری کے چہرے پر شدید بے چینی نظر آنے لگی اور وہ آگے بڑھی اور اس نے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ کامران کے بازو میں ڈال دیا۔ فیلر آگے بڑھا اور بولا۔

"سمجھ رہے ہو نا تم۔"

"اور میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تم بہت زیادہ بدتمیزی کر رہے ہو اس کے بعد اگر تم نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا...... تو......" اس کا جملہ ابھی پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ فیلر کا بھرپور گھونسا اس کے جبڑے پر پڑا اور کامران کو کافی چوٹ لگی شیری اور ریتھا دونوں چیخ پڑی تھیں۔ کامران کے ہونٹوں سے خون بھی نکل آیا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ریتھا نے جلدی سے اس کا بازو پکڑا اور بولی۔

"سوری...... سوری...... سوری کامران...... سوری۔ آہ تمہارے تو خون نکل آیا ہے۔" کامران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح اٹھا جیسے فیلر کے گھونسے نے اس کا دماغ درست کر دیا ہو لیکن پھر دوسرے ہی لمحے فیلر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کامران کا اٹھا ہاتھ اس کے منہ پر زور سے پڑا۔ اس کے بعد دوسرا گھونسا اس کی ٹھوڑی کے نیچے، فیلر نے اس طرح قلابازی کھائی تھی جیسے اسے کہیں بلندی سے نیچے

پھینک دیا گیا ہو۔ ہال میں کئی چیخیں گونجیں، لوگ سمٹ سمٹ کر دیواروں کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور زور زور سے چلانے لگے۔ لیکن فیلر نے اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ غصے کی وجہ سے اُس کے چہرے کے نقوش بگڑ کر بھیانک ہو گئے تھے۔ آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو گئی تھیں اور زبان سے گالیوں کی برسات شروع ہو گئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک گھونسا کامران کے پہلو میں مارا۔

وہ بہت پھرتیلا اور طاقت ور تھا۔ لیکن کامران پہلے والا کامران نہیں تھا۔ وہ جن مراحل سے گزر چکا تھا اور جس طرح بدھ راہبوں نے اسے نجانے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ چنانچہ غصے اور نفرت کی وجہ سے اس کے رگ وپے میں آگ لگ گئی۔ فیلر سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ چنانچہ کامران نے اسے گھونسوں پر رکھ لیا اور چند ہی لمحوں کے بعد اس کی ناک اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ کنپٹی کے نزدیک ایک زخم بھی لگا اور اس کے کپڑوں پر خون کے دھبے پھیل گئے۔

کامران اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت کر رہا تھا اور پھر ایک ایسا گھونسہ فیلر کے سینے پر پڑا کہ اس کے حلق سے ایک انتہائی دلخراش چیخ نکل گئی۔ وہ فرش پر گر گیا اور گرنے سے اس کا سر پھٹ گیا۔ اس کے چہرے پر خون ہی خون تھا۔ لیکن کامران پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر اس نے اس پر اپنے وار جاری رکھے کہ اچانک ہی ریتھا نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا۔

"پلیز...... کامران پلیز...... پلیز میری بات تو سنو؟" وہ کامران کے بازو میں ہاتھ ڈال کر اسے پیچھے گھسیٹنے لگی۔ کامران پر دیوانگی سوار تھی۔ اگر تھوڑی دیر اور گزر جاتی تو شاید فیلر کو زندگی سے ہی ہاتھ دھونا پڑتے۔ اسے احساس نہیں رہا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے بڑی مشکل سے ریتھا نے اسے پیچھے کھینچا۔ روشنیاں اور لوگوں کے چہرے ہر شے دھندلا سی گئی تھیں۔ ریتھا اسے کھینچتی ہوئی دروازے تک لائی اور پھر اسے دروازے سے باہر نکال لیا۔

"وہ اس لڑکی پر ظلم کرے گا۔" کامران نے کہا۔

"نہیں وہ باہر چلی گئی ہے۔ اب وہ وہاں نہیں ہے۔" ریتھا اسے لیے ہوئے تیزی سے باہر نکلی۔ شاید وہ جانتی تھی کہ اس کے بعد انتظامیہ کا کیا ردعمل ہوگا اور پولیس کس طرح ان کے پیچھے لگے گی چنانچہ وہ کامران کو گھسیٹتی ہوئی گلی میں دور تک لے گئی۔ ابھی تک وہاں سے کوئی باہر نہیں نکلا تھا۔ اگر کوئی پولیس کو فون بھی کر دیتا تو یقیناً اب تک پولیس بھی پہنچ گئی ہوتی۔ اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ یعنی جہاں منشیات کا اڈہ تھا۔ اپنے معاملات میں پولیس کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔

بہر حال ہم کافی دور نکل آئے۔ میں جھلا کر بولا۔

"تم مر کیوں رہی ہو۔ کیا بگاڑ لیں گے یہ لوگ ہمارا۔"

"اوہ، مائی ڈیئر تم نہیں جانتے فیلر بہت خطرناک آدمی ہے وہ تو اتفاق کی بات ہے کہ اس کے دوسرے ساتھی اس وقت اس کے پاس موجود نہیں ہیں۔"

"مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔"

"آؤ ذرا...... پلیز ادھر آؤ۔ اگر وہ لوگ آ گئے تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔"

"ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے یہ کہہ کر ریتھا نے پرس سے اپنا بڑا سا رومال نکالا اور کامران کی ٹھوڑی پر بہہ جانے والا خون صاف کرنے لگی۔ کامران خاموش کھڑا رہا۔ ریتھا بولی۔

"تم یہیں ٹھہرو میں ٹیکسی کا بندوبست کرتی ہوں۔"

"او کے...... او کے تم بہت زیادہ خوف زدہ ہو جبکہ میں اتنا خوف زدہ نہیں ہوں۔" کامران نے جواب دیا۔ اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ عام حالات میں وہ اپنے آپ کو اس قدر کھویا کھویا محسوس نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ خاص طور سے آج کا دن تو بڑا ہی عجیب گزرا تھا۔ لڑکیاں ہی لڑکیاں اور اس طرح اس کی ذات پر مسلط جیسے وہ ان سب کا جانا پہچانا کردار ہو۔ سنہرا گھر اور اس کے بعد یہ کلب اور سب سے حیران کن شخصیت ریتھا۔ ریتھا جس طرح اس پر مسلط ہو گئی تھی۔ وہ کچھ غیر مناسب سی بات تھی۔ لیکن اس دوران کامران کو کوئی احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا ذہن کسی طلسم میں جکڑا ہوا ہے اور یہ طلسم پوری طرح اس کی ذات پر حاوی ہوا جا رہا ہے۔

اب اس وقت کامران جن حالات کا شکار تھا۔ وہ نا قابل فہم تھے۔ تبت اور اس کے نواحی علاقوں سے واپسی کے بعد اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اس طرح در بدر ہو جائے گا کرنل گل نواز کا گھر موجود تھا اور وہ گھر اس کے لیے ہر طرح سے گوشہ عافیت تھا۔ کامران جس خزانے کو دیکھ کر آیا تھا۔ اس کے بعد ہر طرح کے خزانے اس کی نگاہوں میں ہیچ ہو گئے تھے۔ اتنی دولت اگر انسان دیوانگی ہی کا شکار ہو تو اس زمین دوز غار سے نکلنے کی کوشش ہی نہ کرے۔ اپنے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرے اور ساری زندگی ان خزانوں سے کھیلتا رہے۔

آخر خزانے ہوتے کس لیے ہیں اپنی ذات کی بہتری کے لیے نا۔ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے لیے لیکن ان کے حصول کے لیے اگر زندگی ہی جاتی رہے تو پھر ایسے خزانوں کا کیا فائدہ۔ کامران کو کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ دوبارہ ان خزانوں تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ وہ دنیا کے کسی بھی انسان کو یہاں تک کہ حسن شاہ جیسے آدمی کو جو اس کی پسندیدہ شخصیت تھی۔ اس خزانے کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا اور نہ ہی اس نے ایسا کوئی تذکرہ حسن شاہ سے کیا تھا۔ کیونکہ اس کے امکانات بھی تھے کہ وہ اگر وہیں تبت کے علاقے میں حسن شاہ سے ان خزانوں کا تذکرہ کر دیتا تو حسن شاہ وہاں سے واپسی ہی کی نہ سوچتا بلکہ خزانے کے حصول کے چکر میں لگ جاتا۔

کمبخت نشہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد کسی اور شے کی طرف عقل راغب ہی نہیں ہوتی۔ لیکن کامران کو ایک اور احساس بھی تھا وہ یہ کہ اس کے نام کے ساتھ جو پر اسرار رشتے قائم کر لیے گئے ہیں وہ بڑے عجیب ہیں۔ ویسے کامران کو یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ گرشک اور سیتا جو مسلسل اس کے پیچھے لگے رہے تھے۔ راہ کو بیٹھے ہیں اور وہ یقینی طور پر وہیں ان پہاڑی علاقوں میں بھٹک رہے ہوں گے۔ بہر حال کچھ دیر کے بعد ریتھا ایک ٹیکسی لے آئی۔ اور اس نے پچھلا دروازہ کھول کر کامران کو پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر کے بعد ریتھا ایک اور نئی جگہ پہنچ گئی۔ اس نے ڈرائیور کو جو پتا بتایا تھا وہ کامران کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن یہ ایک چھوٹا سا خوش نما مکان تھا۔ جب ٹیکسی سے اتر کر ریتھا نے بل ادا کیا اور کامران وغیرہ مکان کی طرف بڑھے تو کامران نے کہا۔

"آج تم کیا کر رہی ہو ریتھا۔ تمہاری ساری باتیں میری سمجھ نہ آنے والی ہیں۔ ریتھا نے اسے ایسی عجیب سی آنکھوں سے دیکھا کہ کامران حیران رہ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ریتھا میں ایک دم تبدیلی رونما ہوگئی ہو۔ پھر کامران خاموشی کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ ایک ڈرائنگ روم میں پہنچنے کے بعد ریتھا نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس کے بعد اندر چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک فرسٹ ایڈ بکس لے کر آئی اور اس نے کہا۔

"لو یہ ٹبلیٹ لے لو۔ یہ گولی کھا لو اس لڑائی سے اگر تمہارے جسم میں کہیں تکلیف ہو رہی ہے تو درست ہو جائے گی۔" کامران ہنسنے لگا پھر بولا۔

"ریتھا کیا تم نے مجھے کوئی نازک اندام مرد سمجھ رکھا ہے میں نے زندگی کے اتنے اونچ نیچ دن دیکھے ہیں کہ ایسی چیزیں میرے لیے بے مقصد ہیں۔"

"اچھا اچھا چلو یہ گولی کھا لو۔" ریتھا پر اعتبار تو کرنا ہی پڑا تھا۔ کامران نے گولی کھا لی اور اس کے بعد ریتھا اس کے لیے سونے کا ایک لباس لے آئی۔

"مجھے صرف یہ بات بتاؤ یہ جگہ کون سی ہے اور اس سے تمہارا کیا تعلق ہے۔"

"تم بہت پراسرار لڑکی ہو ریتھا۔ میں نہیں سمجھ پایا کہ تم آخر ہو کیا۔"

"اور میں نے تم سے ایک بات کہی تھی۔ وہ یہ کہ وقت آنے پر، سب کچھ تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔ میں تمہاری ایک بہت اچھی دوست ہوں۔ تمہارے مشکل وقت کی ساتھی۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس وقت تم بالکل تنہا ہو۔ تمہارے قرب و جوار میں کچھ نہیں ہے اگر تم کچھ وقت کے لیے مجھ پر اعتبار کر لو تو یقین کرو تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔"

"نہیں ریتھا تم ایک بہت اچھی لڑکی ہو۔ میں تمہاری عزت بھی کرتا ہوں اور تمہاری قدر کرتا ہوں لیکن تمہاری شخصیت میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔"

"پلیز...... کامران پلیز میں ہاتھ جوڑ کر تم سے درخواست کرتی ہوں۔ تم مجھے تھوڑے دن کی مہلت دے دو پھر تم سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔"

"او کے...... او کے۔"

"لیکن یہ جو کچھ ہوا ہے اچھا نہیں ہوا۔ تم نے ایک برے آدمی کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔"

"بچا لیا تم نے اسے میرے ہاتھوں سے ورنہ ختم کر دیتا اسے۔"

"کیا یہ بے وقوفی کی بات نہیں ہے کامران تم جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ ایک طرف تو پولیس تمہارے پیچھے پڑ جاتی اور دوسری طرف اس کا گروہ تمہیں سکون نہیں لینے دیتا۔"

"اس کا کوئی گروہ ہے۔"

"یوں سمجھ لو گروہ ہی ہے اور یہ لوگ بڑے زبردست قسم کے جرائم پیشہ لوگ ہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن آخر اسے مجھ سے الجھنے کی کیا ضرورت تھی۔ حالانکہ میرا اس سے براہ راست تو کوئی واسطہ نہیں تھا۔

"وہ لڑکی شیری جسے مجھے لگتا ہے تم پسند کرنے لگے تھے۔"

"ارے نہیں...... آج کا دن تو ویسے ہی بڑا عجیب گزر رہا ہے اتنی لڑکیوں سے ملایا ہے تم نے مجھے کہ میری عقل سے باہر ہے۔"

"ابھی تو تمہیں بہت کچھ کرنا ہے ویسے ایک آدھ دن تمہیں یہیں گزارنا پڑے گا۔ میں فیلر کے بارے میں معلومات حاصل کروں گی کہ اس پر کیا گزری۔ تم نے اسے بہت بری طرح مارا تھا۔ مجھے خدشہ ہے کہ وہ مر ہی نہ جائے۔"

"بھاڑ میں جائے۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ میری آنکھیں کیوں جھک رہی ہیں کیا تم نے جو گولی مجھے کھلائی ہے اس میں نیند لانے والی کوئی دوا تھی۔"

"ہاں۔ تم رات کو پرسکون نیند سوؤ گے۔"

"ویسے یہ غلط ہے ریتھا۔ کسی پر اتنا حاوی نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے اس کی مرضی بھی نہ پوچھی جائے۔" کامران کی آواز میں مدھم سی لڑکھڑاہٹ پیدا ہوگئی۔ اور پھر اس کی پلکیں ایک دوسرے کی طرف جھکنے لگیں۔" ریتھا نے پیار بھرے انداز میں اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے سہارا دے کر بستر تک لے گئی۔ بستر پر گر کر کامران کو ہوش نہیں رہا تھا۔

♥......♥......♥

پھر دوسرے دن وہ واپس اپنے ہوٹل آ گیا تھا۔ ریتھا اس مکان میں رہ گئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ وہ بہت جلد کامران سے آ کر ملے گی۔ بہرحال یہ گزرے ہوئے واقعات کامران کے لئے بڑے عجیب و غریب حیثیت کے حامل تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان واقعات کے پس منظر میں کیا ہے۔ بڑی بدنصیبی کی بات یہ تھی کہ ان واقعات کا راز دار کوئی نہیں تھا اور نہ ہی کوئی ایسی شخصیت بہ ظاہر نظر آئی تھی۔ جس سے وہ اس بارے میں تفصیلات معلوم کرے وہ مکان جس میں اس نے ریتھا کے ساتھ قیام کیا تھا۔ وہ بھی اس کے لیے اجنبی تھا۔ یہ واقعات اچانک ہی ایک عجیب و غریب شکل اختیار کر گئے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ کرنل گل نواز کے گھر جائے۔ شاہ نواز کو ان تمام واقعات کے بارے میں بتائے۔ لیکن یہ بھی ایک عجیب و غریب بات تھی کہ چاہنے کے باوجود وہ وہاں ان کے گھر نہیں جا سکا۔ ہوٹل میں ہی اس نے کافی وقت گزارا۔ ریتھا دوسرے دن بھی نہیں آئی تھی۔ تیسرے دن بھی وہ نہیں آئی تو کامران کو حیرت ہوئی۔ لیکن اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ اسے خواہ مخواہ ان پراسرار چکروں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ پھر چوتھے دن اچانک اسے حسن شاہ کی طرف سے فون موصول ہوا اس نے وعدے کے مطابق حسن شاہ کو اپنے ہوٹل اور اس کے فون نمبر کے بارے میں بتا دیا تھا۔ حسن شاہ کی آواز سنائی دی۔

"کامران بڑے عجیب و غریب حالات پیش آئے ہیں مجھے، مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی غیر مرئی قوت ہمارے راستوں میں آ گئی ہے ویسے تو مجھے زندگی میں بہت سے پراسرار واقعات سے بھی واسطہ پڑا ہے۔ لیکن اس وقت جو ہوا ہے۔ وہ بہت عجیب و غریب ہے اس کے بارے میں تو میں بعد میں بتاؤں گا۔ تم نے کہا تھا کہ تمہارے پاس اچھی خاصی رقم موجود ہے اگر اس میں کوئی کمی ہے تو میں تمہیں ایک پتا دیتا ہوں اس

پتے پر چلے جانا یہاں تمہیں عیسٰی نامی ایک شخص ملے گا۔ عیسٰی خان پٹھان ہے اس سے تم جتنی رقم مانگو گے وہ تمہیں دے دے گا۔ میں نے اسے ہدایت کردی ہے تمہیں ہر قیمت پر اسپین پہنچنا ہے۔ انتہائی بارسوخ ذرائع سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس وقت رانا چندر سنگھ اور کرنل گل نواز اسپین میں موجود ہیں انہیں قیدی بنا کر لے جایا گیا ہے مجھے خاصی تفصیلات معلوم ہوئی ہیں۔ تمہیں بذریعہ ہوائی جہاز پہلے میڈرڈ اور اس کے بعد وسکایہ پہنچنا ہے جو اسپین کے انتہائی جدید اور بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ وسکایہ میں ہوٹل کیرول میں تمہیں قیام کرنا ہے۔

میں تمہیں کیرول میں ہی مل جاؤں گا۔ میں تو فوراً جا رہا ہوں۔ جس شخص نے مجھے اس بارے میں اطلاع دی ہے۔ اسے فوراً اسپین واپس ہونا ہے اس لیے معذرت خواہ ہوں کہ تمہیں ساتھ نہ لے سکا لیکن بہرحال اگر تم مناسب سمجھو اور کرنل گل نواز کو مشکلات سے نکالنا چاہو تو فوراً اسپین آ جاؤ۔ وہاں ہم دونوں مل کر کرنل گل نواز اور رانا چندر سنگھ کی رہائی کی کوشش کریں گے اور مجھے معاف کرنا بات بڑی کر رہا ہوں لیکن حقیقتیں غلط نہیں ہوتیں۔ اگر تم کرنل گل نواز سے اتنی دلچسپی نہ رکھتے تو پھر تم تکلیف مت کرنا۔ میرا رانا چندر سنگھ سے بہت قریبی ساتھ ہے تم یہ سمجھ لو کہ میں یہ معلومات حاصل ہونے کے بعد خود کو نہیں روک سکوں گا۔ کیا سمجھ رہے ہو۔

''ٹھیک ہے میں فیصلہ کرلوں گا اور اگر مجھے اسپین آنا ہوا تو میں تمہیں جا کر ہوٹل کیرول میں ملاقات کر کے اطلاع دوں گا۔''

''اوکے خدا حافظ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے ورنہ تم سے مزید تفصیلی باتیں کرتا۔'' دوسری طرف سے فون بند ہوگیا۔ لیکن کامران چکرا کر رہ گیا تھا یہ عجیب و غریب اطلاع اسے اچانک ملی تھی اور وہ گہری سوچوں میں ڈوب گیا تھا۔ کیا اسے اسپین جانا چاہیے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہاں جو حالات پیش آ رہے تھے۔ وہ بڑے الجھے ہوئے تھے۔ اگر کرنل گل نواز مل جائے تو اس بار اسے اپنے رازوں میں شریک کر ہی نے لے گا۔ اسے بتائے گا کہ کس طرح وہ الجھنوں میں گرفتار ہے۔ یہ بھی بتائے گا کہ گرشک اور سیتا کا اس مہم جوئی کے دوران کیا رویہ رہا۔ اسے یہ بھی بتائے گا کہ یہ لوگ اور وہی نہیں بلکہ وہاں پر بہت سے لوگ اسے ایک انوکھے کردار کے نام سے یاد کرتے رہے ہیں۔ پاتال پرمتی۔ پرم پربھو، اسے کہانیاں سناتے رہے ہیں کہ کوئی ستی ساوتری اس کے لیے زمین کی گہرائیوں میں سو رہی ہے۔ اسے یہ بھی بتایا جاتا رہا ہے کہ ایک پورا شہر اس کا منتظر ہے اور پاتال کی گہرائیوں میں کوئی اس کا انتظار کر رہا ہے۔

یہ عجیب و غریب کہانی صرف کہانی کی شکل میں رہتی اگر اسے یہ انتہائی پراسرار واقعات نہ پیش آئے ہوتے۔ یہ ساری کی ساری بڑی عجیب و غریب کہانیاں تھیں دھرم وستو نیاں، ستی پرکتہ، دھردنی، بدھ مذہب کے کسی ایک کردار کی حیثیت سے وہ کس طرح کس کس کی توجہ کا نشان بن گیا ہے۔ اس مشکل سے نکلنے کا کیا ذریعہ ہوسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حسن شاہ بہت ہی شاندار شخصیت تھی۔ لیکن وہ حسن شاہ کو بھی اس بارے میں کوئی تفصیل نہیں بتانا چاہتا تھا۔

یہ تفصیل ایک طرح سے کسی کی امانت تھی۔ جس کے لیے اس سے کہا گیا تھا کہ اس امانت کی حفاظت کی جائے۔ لیکن تعجب کی بات تھی۔ اچانک ہی یہ انوکھی کہانیاں اس کی زندگی میں کیسے شامل ہوگئیں۔

جبکہ وہ تو ایک سیدھا سچا نوجوان تھا۔ جو نیکیوں کے راستے زیادہ پسند کرتا تھا۔ اپنے مذہب پر بھی وہ پوری طرح کاربند تھا اور اس کو ان فضولیات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن یہ فضولیات تھیں جو اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔ گھن چکر بن کر رہ گیا تھا۔ وہ چاہتا تو وہ ایک پرسکون نیند سو سکتا تھا۔ لیکن حالات اسے مہلت ہی نہیں دیتے تھے۔ اب کیا کروں کیا نہ کروں وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ ریتھا بھی اس کی ایسی ہمدرد اور غمگسار نہیں تھی اور پھر وہ اتنے دن سے مسلسل غائب تھی اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے کام سے لگ گئی ہے اس کا احساس بھی تھا اسے کہ کہیں وہ فیلر کے ہاتھ نہ لگ گئی ہو اور فیلر نے اسے کوئی نقصان نہ پہنچا دیا ہو۔ کیا ریتھا کو تلاش کیا جائے؟ دل نے کہا۔

فضولیات میں جتنے اترتے چلے جاؤ گے، اترتے رہو گے۔ آج ریتھا کی کہانی سامنے آئی ہے اس کے علاوہ بہت سی کہانیاں تھیں جیسے نیرینہ علی جو اس کے بعد اسے پھر کبھی نہیں ملی تھی۔ وہ ایک انوکھا اور پراسرار کردار تھی۔ اچانک ہی اس کے ذہن نے ایک فیصلہ کیا کہ اسے اسپین جانا چاہیے۔ وسائل ہیں راستے ہیں تو کیوں نہ کوشش کر لی جائے اور اس کے بعد اس نے سب سے پہلا فیصلہ یہ کیا کہ یہ ہوٹل چھوڑ دیا جائے۔ ہوسکتا ہے اسپین جانے کے لیے اسے کچھ وقت درکار ہو اور اس دوران ریتھا وہاں پہنچ جائے ایک بار پھر وہ الجھنوں میں پھنس جائے گا۔ ہوٹل کا پورا بل ادا کر کے وہ اپنے مختصر سامان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ہوٹل کی بھلا کیا کمی تھی۔ کرنل گل نواز کی طرف جانے کو جی نہیں چاہا تھا۔ شاہنواز سوائے پریشان ہونے کے اور کیا کر سکے گا وہ عام قسم کا نوجوان تھا اور کامران یہ بات جانتا تھا کہ اگر وہ اس گھر میں کرنل گل نواز کی گمشدگی کی اس طرح اطلاع دے گا تو وہاں بھی الجھنوں کے سوا اسے کچھ نہیں ملے گا۔

بہرحال ایک اور ہوٹل میں اس نے ایک کمرا حاصل کیا اور پھر اس پتے پر جا پہنچا جس پتے پر عیسٰی خان سے ملاقات کرنی تھی۔ تقریباً ساڑھے چھ فٹ قد و قامت کے اس خوبصورت پٹھان نے بڑی خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔''

''میرا نام کامران ہے۔''

''جی کامران خان میں سمجھتا ہے آپ کو حسن شاہ نے بھیجا، میرے کو بولو پہلے یہ بتاؤ کہ آپ کو اسپین جانا ہے۔''

''آپ کو اس نے خاصی تفصیل بتادی ہے خان صاحب! ہاں میں اسپین جانا چاہتا ہوں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے میرے کو کل کا دن دو تمہارا پاسپورٹ اور ٹکٹ آ جائے گا۔''

''ایک دن میں سب کچھ ہو جائے گا۔''

''بابا ایک دن میں تو دنیا بدل جاتا ہے۔ حکومتیں بدل جاتا ہے۔ ملک ختم ہو جاتا ہے سونامی آ جاتا ہے لاکھوں لوگ ختم ہو جاتا ہے۔ ابھی تم بولتا ہے اسپین جانے کا بندوبست ایک دن میں ہو جائے گا یا نہیں۔'' عیسٰی خان نے کہا اور کامران ہنسنے لگا۔

''آپ کے وسائل ہیں خان صاحب ورنہ یہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔''

''ابی یار تمہارے کو کیا بولے عام آدمی کا بات کرتے ہو ناں۔ عام آدمی کو تو پیٹ بھر کر روٹی بھی

نہیں ملتا ہے بے چارے کو۔ ٹھیک ہے میرے کو یہ بتاؤ، تمہارا قیام کدر ہے اگر اور ٹھہرنا چاہو تو یہ جگہ موجود ہے تمہارے لیے۔"

"نہیں میں ایک ہوٹل میں رہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے کل رات کو ساڑھے آٹھ بجے تمہارے کو فون کروں گا اس وقت میں بتا دے گا کہ سارا پروگرام کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے خان صاحب۔"

"ابی روپے پیسے کا فکر مت کرنا۔ حسن شاہ سے میرا حساب چلتا ہے۔"

"ہاں میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ پیسے میرے اکاؤنٹ میں بھی کافی پڑے ہوئے ہیں مجھے بتا دیجیے کہ کتنے پیسے وہاں سے نکلوا لوں۔"

"ابی ٹھیک ہے میں تمہارے کو کل بتاؤں گا۔ کل انتظام ہو جائے گا پرسوں باقی سارا کام کرے گا بیٹو کھانا منگواتا ہے تمہارے لیے۔"

"آپ کا بے حد شکریہ عیسیٰ خان صاحب میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

"ابی چائے مائے تو پیو۔" عیسیٰ خان نے کہا۔ وہ اپنے روائتی انداز میں میری خاطر مدارات کرنے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں سے چل پڑا۔ ہوٹل میں اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد میرے پورے بدن میں ہلکی ہلکی اینٹھن سی ہونے لگی۔ ایک انتہائی طویل اور خطرناک مہم ختم ہوئی تھی اور اس کے بعد اسپین جس کا میں نے صرف تذکرہ ہی سنا تھا کبھی اس کا نظارہ نہیں کیا تھا۔ میرے ذہن میں اس قدیم ملک کے بارے میں بہت سی داستانیں ابھرنے لگی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی قدامت اس سے مذہبی تعلقات اور بہت سے ایسے واقعات منسلک تھے کہ میں یہاں جاتے ہوئے ایک اعصابی کشیدگی محسوس کر رہا تھا۔

لیکن میرا دل اندر سے کہہ رہا تھا کہ مجھے وہاں جانا چاہیے دیکھوں وہاں کون کون سے واقعات میرے منتظر ہیں۔

♥ ...... ♥ ...... ♥

کامران کو بار بار اپنے ماضی پر غور کرنا پڑتا تھا۔ جب بھی بچپن پر نگاہ ڈالتا۔ انتہائی عجیب وغریب کیفیات کا احساس ہونے لگتا تھا۔ ماں باپ کے ساتھ بچپن کا آغاز ہوا۔ تعلیمی مشاغل مکمل ہوئے۔ ایک بہن تھی زندگی میں جس پر ساری محبتیں نچھاور تھیں۔ ماں باپ کا پیار حاصل تھا پھر یوں لگا جیسے زہریلی ہواؤں نے اس کے گھر کا رخ کیا ہو۔ ماں باپ چل بسے۔ بہن کی ذمے داری سر پر آ پڑی اور اس نے ایک نہایت ذمے دار بھائی کی طرح بہن کو اس کے گھر روانہ کر دیا، لیکن بدنصیبی نے بہن بھی اس سے چھین لی اور پھر انتقام کی آگ میں سلگتا ہوا وہ بہن کے قاتل سے انتقام لینے نکلا تو نیکیوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ بس وہیں اس کی پراسرار زندگی کا آغاز ہوا تھا۔

کرنل گل نواز کا گھر اس کے لیے ایک طلسم کدہ ثابت ہوا اور وہاں جو واقعات اسے پیش آئے انہوں نے اس کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ کرنل کی محبت اور اس کی اپنی فطرت کی وفاداری نے اسے کرنل

سے اس طرح منسلک کر دیا کہ باقی تمام معاملات ذہن سے محو ہی ہو گئے۔ پھر اس کے بعد اسے ایک پراسرار کردار ملا۔ وہ خود اس کیسٹ میں موجود تھا جس کا تعلق ہمالیائی علاقوں میں چھپے ہوئے ایک خزانے سے اور بدھ مذہب سے تھا۔ اس مذہب کے بارے میں تو اسے مکمل تفصیلی معلومات تک نہیں حاصل تھیں، پھر نہ جانے کس طرح وہ سب اس کی زندگی سے منسلک ہو گیا۔

اس کے بعد حالات پراسرار سے پراسرار تر ہوتے چلے گئے۔ گرشک اور سیتا اور اس کے بعد کرنل گل نواز کے پراسرار مہمان جنہوں نے اس کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا لیکن اس نے کسی خزانے کے حصول کے لیے یہ زندگی نہیں اپنائی تھی۔ بلکہ صرف کرنل گل نواز کی محبت تھی۔ اس کے احسانات تھے جنہوں نے اس حد تک مجبور کر دیا تھا۔ یہ سب بڑی عجیب وغریب کہانی تھی۔ اس کے بعد جو حالات پیش آئے وہ اس قدر پراسرار تھے کہ خود اس کا دماغ چکرا کر رہ جاتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک سحر کے جال میں گرفتار ہو اور یہ سحر اس کا پیچھا نہ چھوڑنا چاہتا ہو۔ اب اس کے بعد حسن شاہ نے نشان دہی کی تھی کہ کرنل گل نواز اسپین میں ہے۔ دو ہی باتیں تھیں یا تو وہ ہر کردار پر لعنت بھیج کر اپنی زندگی کے لیے کوئی صحیح راستہ تلاش کرتا یا وہی سب کچھ جواب تک پیش آتا رہا تھا، لیکن ایک اور خیال بھی اس کے دل میں تھا۔ اگر وہ ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر کہیں گوشہ نشین ہو جائے، اپنا نام تک بدل لے تو کیا یہ سحرِ عظیم اس کا پیچھا چھوڑ سکے گا۔

بعض اوقات اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ بہت سے کردار زندگی میں آئے تھے اور چلے گئے تھے۔ عروسہ کی موت اسے یاد تھی۔ پتا نہیں بے چاری کس طرح اس کے جال میں پھنس گئی، اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ بہرحال اس کے بعد بہت سے ایسے کردار، سیتا نے اسے متاثر کیا تھا لیکن وہ ایسا ناقابل یقین کردار تھا جس کے بارے میں سوچ کر بھی ایک عجیب سی وحشت دل میں سما جاتی تھی۔ وہ لوگ اس سے نہ جانے کیا چاہتے تھے۔ انہوں نے اسے ماضی قدیم کا ایک ایسا کردار قرار دیا تھا جو کسی کی محبت کا مرکز تھا اور وہ جس کی محبت کا مرکز تھا، وہ پاتال کی گہرائیوں میں سو رہی تھی۔ لاحول ولاقوۃ، کیا یہ ایک عقل میں آنے والی بات ہے، لیکن کیا کرتا، وہ سحر تو اسکی جان ہی نہیں چھوڑتا تھا۔

ریتھا اس وقت کے بعد سے اس طرح غائب ہوئی تھی کہ اس کا کوئی نام ونشان نہیں تھا، حالانکہ اگر وہ چاہتا تو وہ جگہ جہاں ریتھا اسے لے گئی تھی اسے یاد تھی اور وہ وہاں جا کر اسے تلاش کر سکتا تھا، لیکن ان دنوں اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا ہر قدم کسی پراسرار قوت کے تابع ہے۔ وہ خود اپنے طور پر کوئی عمل نہیں کر رہا تھا۔ اب اس وقت بھی وہ ڈانواڈول تھا۔ عیسیٰ خان اس کی روانگی کا بندوبست کر رہا تھا اور ایک آدھ دن میں اسے اسپین کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔ حسن شاہ نے اس سے یہی توقع ظاہر کی تھی کہ وہاں پہنچ کر وہ اسے مل جائے گا اور دونوں کرنل گل نواز کو تلاش کریں گے اور اس کی مدد کریں گے۔

حسن شاہ، رانا چندر سنگھ کا اتنا ہی وفادار تھا جتنا کامران کرنل گل نواز کا۔ آخری فیصلہ اس نے یہی کیا کہ اب زندگی میں کوئی اور دل کشی تو باقی نہیں رہی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اسپین ہی چلا جائے چنانچہ اس نے آخری فیصلہ کیا۔ عیسیٰ خان سے معمول کے مطابق ملاقات ہوئی تو اس نے کہا کہ آج رات کی فلائٹ سے اسے اسپین روانہ ہو جانا ہے۔ ایک عجیب وغریب تاثر ہے وہ جہاز میں سوار تھا اور اسپین جیسے روایتی ملک کے

سفر کا آغاز ہوگیا تھا۔

نہ جانے کیا کیا خیالات اس کے دل میں آ رہے تھے۔ ان ہی خیالات میں سفر کٹا اور آخرکار وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ ضروری امور سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ایک ہوٹل کے نمائندے نے اس کی توجہ حاصل کرلی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں منتقل ہوگیا۔ معقول رقم اس کے پاس موجود تھی اور اسے یہاں ایک اچھی زندگی گزارنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں تھا البتہ اسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ حسن شاہ کس طرح اس سے ملاقات کرے گا۔

لیکن بہرحال اگر حسن شاہ نے اسے یہاں تک پہنچایا ہے تو لازمی بات ہے کہ وہی اس سے رابطہ بھی قائم کرے گا۔ چنانچہ وہ سکون سے میڈرڈ کے اس شان دار ہوٹل میں قیام پذیر تھا۔ اپنے قیام کے بعد وہ پہلی بار نیچے اترا اور عالی شان ہوٹل کے ہال میں داخل ہوگیا۔ کمرے کے لحاظ سے اس کی میز ریزرو تھی۔ وہ اپنی میز پر جا کر بیٹھ گیا حالانکہ بہت کم دنیاداری اسے آتی تھی، لیکن وقت اور ماحول سب سے بڑا استاد ہوتا ہے۔ ایک اجنبی ملک میں جہاں کی زبان کی اسے ذرا شدبد بھی نہیں تھی اجنبی لوگوں کے درمیان اس اجنبی جگہ بھی بڑے اعتماد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اس کی طائرانہ نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں لیکن اس کے بعد اس کی نگاہوں کا جو مرکز بنا اس نے حقیقی طور پر اس سے اس کے حواس چھین لیے۔ سامنے دو لڑکیاں ایک میز پر بیٹھی ہوئی تھیں اور وہ ان دونوں کو پہچانتا تھا۔ دو مختلف کردار جن میں ایک ریتھا اور دوسری وہ چھوٹی سی گڑیا ریشی تھی جسے ایک نگاہ دیکھ کر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا بلکہ ذہن کے خانوں میں اس کی تصویر باقی رہ جاتی تھی۔

یہ لڑکی شجیرہ نامی ایک خطرناک عورت کے ساتھ نظر آئی تھی، لیکن اس وقت وہ ریتھا کے ساتھ تھی۔ ریتھا جو اس کی زندگی میں ایک خاصا دخل حاصل کرچکی تھی۔ یہاں میڈرڈ میں بڑے تعجب کی بات تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کہ یہاں سے اٹھ جائے لیکن نہ جانے کیوں وہ ایسا نہ کرسکا اور ریتھا کے بارے میں وہ اپنے تجسس کو ختم نہیں کرسکتا تھا پھر ریتھا نے بھی اسے دیکھ لیا اور کامران کو محسوس ہوا جیسے ریتھا کو اسے دیکھ کر حیرت نہ ہوئی ہو۔ البتہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ ضرور گئی تھی۔ اس نے ریشی کو بھی اپنے ساتھ آنے کو کہا تھا۔

وہ دونوں کامران کی میز کے پاس پہنچیں۔ ریتھا نے آہستہ سے کہا۔

”ہیلو۔“

”ہیلو۔“ کامران نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ریتھا نے اپنے لیے کرسی گھسیٹ لی اور ریشی کی طرف اشارہ کرکے بولی۔

”بیٹھو۔“ کامران خاموشی سے ان دونوں کی صورت دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً ریتھا مسکرا پڑی۔

”تمہاری خاموشی چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ تم مجھ سے سخت ناراض ہو۔“

”میرا خیال ہے تمہیں یہ چیخیں کہیں اور سے سنائی دے رہی ہوں گی۔ میرے بارے میں غلط فہمی کا شکار مت ہو۔“ کامران نے جواب دیا اور ریتھا ہنس پڑی پھر بولی۔

”یہ جلے کٹے جملے بھی اسی بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ تم سخت ناراض ہو۔“

”یار کمال ہے میرا کیا تعلق ہے تم سے ریتھا، صرف معمولی سی شناسائی کو اس قدر اہمیت دے رہی ہو،

زندگی میں بے شمار لوگ ملتے ہیں۔ جدا ہوتے ہیں۔ اب یہ تو نہیں ہے کہ کسی کی ذات پر تسلط ہی قائم کرلیا جائے۔“

”تم یقین کرو۔ میں تمہارا پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک آئی ہوں۔ تم سے خصوصی طور پر دور رہنے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ میں نے تمہیں فیلر کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ انتہائی خطرناک آدمی ہے البتہ یہ نہیں بتایا تھا میں نے تمہیں کہ وہ اسپین کا باشندہ ہے۔“ ایک ہلکا سا چھناکا میرے ذہن میں ہوا تھا۔

”فیلر اسپینش ہے؟“

”یہاں اس کا پورا خاندان موجود ہے۔ تمہارے ہاتھوں شدید زخمی ہوا ہے۔ وہ زندگی اور موت کی کش مکش کا شکار ہوا تو اس کے دو بھائی وہاں پہنچے اور اسے یہاں لے آئے۔ اب وہ میڈرڈ کے ایک اسپتال میں ہے۔ اس نے اپنے بھائیوں کو ساری کہانی سنادی ہے۔“

”مگر تم اس کے پیچھے یہاں تک کیوں چلی آئیں؟“

”یہ ایک الگ داستان ہے اور میرے لیے قابل توجہ اس لیے ہوگئی جب مجھے پتلا چلا کہ تم اسپین آ رہے ہو؟“

”تمہیں یہ کہاں سے پتا چلا۔“

”پولیس میں ہوتے تو بہت کامیاب رہتے۔ کس قدر جرح کرتے ہو۔ جہاں سے تمہارا پاسپورٹ اور کاغذات تیار کرائے جا رہے تھے۔ میرا مطلب ہے عیسیٰ خان نامی شخص تمہاری تصویر کے ساتھ جو پاسپورٹ بنوا رہا تھا وہیں پر میڈم شجیرہ اپنا پاسپورٹ بنوانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے یہ بات بتائی اور میں نے ارجنٹ اپنے یہاں آنے کی تیاریاں کرلیں۔“

”تو کیا میڈم شجیرہ بھی یہاں موجود ہیں۔“

”اتفاق سے وہ بھی اسپینش ہیں۔ اصل میں اسپین میں رہنے والوں کے نقوش مشرق سے اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ کبھی کبھی انہیں نہیں پہچانا جاسکتا۔“ کامران کا سر چکرانے لگا۔ دو متضاد باتیں تھیں۔ حسن شاہ نے بتایا تھا کہ کرنل گل نواز اسپین میں ہے اور اس کی مدد کے لیے ہمیں اسپین جانا ہے۔ یہاں دوسری کہانی بھی اسپین ہی سے متعلق نکلیں۔ ریتھا نے اور بھی باتیں بتائیں اور کامران کا ذہن صاف ہوگیا۔ ریتھا نے اس سے کہا۔

”تم یقین کرو۔ فیلر بے حد خطرناک آدمی ہے۔ اس کے بھائی بھی جرائم پیشہ ہیں اور اسپین کے انڈر ورلڈ سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا اور ایک اور انوکھی بات بتاؤں تمہیں۔ میڈم شجیرہ نے بتایا ہے کہ فیلر کے بھائیوں کو بھی تمہاری یہاں آمد کا پتا چل گیا ہے۔“

”میں...... میں نہ ہوا کسی ملک کا صدر ہوگیا۔“ کامران نے ہنستے ہوئے کہا پھر بولا۔

”مگر تم لوگ یہاں کیوں چلے آئے؟“

”میں نے بتایا نا کہ میڈم شجیرہ کے ساتھ میں یہاں چلی آئی۔“

”کب تک قیام ہے؟“

”کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ویسے تم اگر پسند کرو تو میں تمہیں اسپین کی سیر کراسکتی ہوں کیونکہ میں اور

ریشی اسپین سے اچھی طرح واقف ہیں۔"

"میں اگر جنوبی امریکا جاؤں گا تب بھی تم میرا پیچھا کرو گی اور بعد میں یہی بتاؤ گی کہ تم تو یہاں کے باشندوں کی طرح سے ہو۔"

"شاید ایسا ہو۔" ریتھا نے ہنس کر کہا۔ اس دوران خوب صورت لڑکی ریشی خاموش رہی تھی۔ اس پر جب بھی نگاہ ڈالی جاتی بالکل ایسا ہی لگتا جیسے کوئی گڑیا ہو۔ بہت پیاری تھی وہ۔ بہرحال یہ ایک دلچسپ ملاقات تھی۔ ریتھا نے جو کچھ بتایا تھا وہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ کامران نے اسے تسلیم کرلیا تھا لیکن یہ کہ فیلر بھی یہاں موجود ہے اور اس کے بھائیوں کو اس کے بارے میں پتا چل چکا ہے اسے شدید حیرت ہو رہی تھی۔ یہ سب کچھ غیر فطری تھا، ناقابل فہم۔

لیکن بہرحال تھا تو سہی۔ ریتھا نے کہا۔ "کیا خیال ہے میرا ساتھ تمہیں پسند ہوگا کہ نہیں۔"

"بس کیا کہا جاسکتا ہے؟"

"میں تمہارے کمرے کے بارے میں جانتی ہوں۔ میرا قیام میڈم شجیرہ کے ساتھ ہے۔ کل ہم اسپین کی سیر کریں گے۔" کامران نے ریتھا کو یہ تک نہیں بتایا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے اور نہ ہی ریتھا نے پوچھا۔ یہ سب کچھ، باتیں اسے مسلسل الجھا رہی تھیں۔ ریتھا کا کردار انتہائی پراسرار تھا بہرحال وہ چلی گئی اور کامران نہ جانے کب تک اس کے بارے میں سوچتا رہا پھر اسے حسن شاہ کا خیال آیا۔ حسن شاہ کے پاس کوئی جادوئی چھڑی تو ہے نہیں کہ وہ اسے میڈرڈ میں تلاش کرے گا۔ اس سے ملاقات کا کیا ذریعہ ہوسکتا ہے اور ایسا کیسے ہوگا؟ کامران کے ذہن میں ایک بار پھر جھنجلاہٹ سی آگئی۔ یہ ساری الجھنیں خود بہ خود دور ہوگئیں۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ اپنے آپ کو عذاب میں گرفتار کروں۔ اس بار پھر اس خیال سے وہ مطمئن ہوگیا دوسرے دن ریتھا آگئی۔ اس نے ٹیلیفون کرکے کہا تھا کہ وہ دو بجے کے بعد یہاں پہنچے گی اور اس وقت تقریباً پونے تین بج رہے تھے۔ جب وہ ایک خوب صورت کار میں بیٹھ کر باہر نکل آئے۔ اسپین کے آسمان پر بس کہیں کہیں بادلوں کا کوئی ٹکڑا تھا ورنہ ہر طرف دور تک نیلا آسمان پھیلا ہوا تھا اور سنہری دھوپ شہر کے گلی کوچوں پر دھوم دھام سے برس رہی تھی۔

قرب و جوار کے مناظر بہت دل کش تھے۔ اس وقت ریتھا کامران کے برابر بیٹھی ہوئی تھی جب کہ ریشی گاڑی چلا رہی تھی۔ کامران نے ریتھا سے یہ سوال نہیں کیا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ ویسے اسپین کا اس وقت یہ موسم جس میں دھوپ بھی تھی اور ٹھنڈک بھی تھی۔ کامران کو خاصا اچھا لگ رہا تھا اور وہ خوش تھا۔ ریتھا اسے اس طرح میڈرڈ کے تفریحی مقامات دکھا رہی تھی جیسے یہ اس کا خود اپنا شہر ہو۔ گاڑی چلتی رہی۔ کامران ریتھا سے مختلف موضوعات پر باتیں کرنے لگا۔ دوران گفتگو ایک بار پھر فیلر کا ذکر نکل آیا۔

"میڈم شجیرہ نے فیلر کے سلسلے میں بڑی ذمہ داریوں کے ساتھ معلومات حاصل کر رکھی ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ فیلر کو تمہاری یہاں آمد کے بارے میں علم ہے اور وہ لوگ تمہیں جگہ جگہ تلاش کر رہے ہیں۔" کامران نے ریتھا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"فیلر جانتا تھا کہ تم میری ساتھی ہو۔ کیا وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا؟"

"میڈم شجیرہ نے بھی یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ تمہارا پتا معلوم کرنے کے لیے وہ مجھے پکڑ سکتے ہیں، لیکن فکر کی بات نہیں۔ میں اپنی حفاظت کرسکتی ہوں۔ تمہیں بالکل فکر نہیں کرنا چاہیے۔" کامران نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"میں کبھی اپنی فکر نہیں کرتا۔" ریشی اس تمام گفتگو سے بے نیاز ڈرائیونگ کر رہی تھی اور اس کی پشت اور گھنگھریالے بال بے حد خوب صورت نظر آ رہے تھے۔ یہ لڑکی انتہائی پرکشش تھی اور جب بھی اس پر نگاہ ڈالی جاتی دل و دماغ میں عورت بیدار ہوجاتی تھی۔ اس وقت اس نے چوڑی آستینوں والا ایک لمبا مخصوص طرز کا لباس پہنا ہوا تھا جس پر متعدد کلر کی پھول پتیاں اور بیلیں چھپی ہوئی تھیں۔ گلے میں سیاہ سرخ اور سبز موتیوں والی تین لڑیوں کی مالا پڑی ہوئی تھی۔ کلائیوں میں نقشین کنگن تھے۔ اس نے ہلکے سبز رنگ کا دھوپ کا چشمہ بھی لگا رکھا تھا جو اس کے چہرے پر بہت بھلا لگ رہا تھا۔ کمر میں کرتے کے اوپر اس نے ایک سنہری زنجیر باندھ رکھی تھی جس نے اس کی کمر کا دل آویز خم نمایاں کردیا تھا۔ اس لباس اور انداز نے اس کی شخصیت میں ایک ایسا حسن پیدا کردیا تھا کہ اسے دیکھ کر ذہن و احساس میں امنگوں کے طوفان اٹھنے لگتے تھے۔

کامران جس طرح کا ٹھوس کردار کا نوجوان تھا وہ بھی اس وقت اسے دیکھ کر اپنے ذہن میں عجیب سے مدوجزر محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت کار ایک ایسے علاقے سے گزر رہی تھی جہاں بڑے بڑے شان دار بنگلے اور کاٹیج تھے۔ وکٹورین طرز کی پرانی اور پتھریلی عمارتیں جو چھوٹے موٹے محل یا قلعے کی طرح نظر آتی تھیں۔ آبادی خال خال تھی لیکن بہت خوب صورت جگہ تھی۔ ریشی نے ایک عمارت کے سامنے گاڑی روکی۔ یہ عمارت بھی وکٹورین اسٹائل کی تھی۔ فاؤنڈیشن سے لے کر اوپر تک پوری عمارت میں پتھر ہی پتھر استعمال ہوا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کی لکڑی کا رنگ کالا تھا۔ عمارت کی ظاہری حالت کافی بوسیدہ دکھائی دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت عرصے سے اس پر رنگ و روغن نہ کیا ہو۔ گیٹ پر ایک چھوٹی سی تختی لگی ہوئی تھی جس پر ڈی گاریکا لکھا ہوا تھا۔ کامران نے ایک لمحے کے لیے ریتھا کو دیکھا تو ریتھا نے مسکرا کر آنکھیں بند کرلیں اور مطمئن رہنے کے لیے اشارہ کیا۔

بہرحال یہ لوگ عمارت کے صدر دروازے تک جا پہنچے۔ ریتھا نے کال بیل بجائی اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک پستہ قد عورت نے دروازہ کھولا۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں بڑی کرختگی تھی، لیکن تھوڑی دیر بعد یہ کرختگی نرمی میں تبدیل ہوگئی۔ اس نے کامران کو بہت غور سے دیکھا اور تعظیمی انداز میں جھک گئی۔

"آیئے۔ آیئے۔ اندر آجایئے۔" کامران کو یہ بھی بہت عجیب لگا تھا بہرحال وہ اندر داخل ہوگیا۔ عمارت باہر سے اتنی وسیع نظر نہیں آتی تھی جتنی درحقیقت تھی۔ وہ لوگ ایک طویل راہداری میں چل رہے تھے۔ راہداری میں سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ دونوں طرف دیواروں پر وال پیپر لگا ہوا تھا اور یہ وال پیپر بھی سرخ رنگ کا تھا۔ اس پر سنہرے رنگ سے بہت سی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ دونوں طرف تین تین دروازے تھے۔ ایک سب سے بڑی حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان تصویروں میں بدھ اسٹائل کے پگوڈے خانقاہیں اور بدھ بھکشو آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ کامران ایک بار پھر دھک سے رہ گیا۔

"یہ کیا قصہ ہے؟ یہ سارے معاملات ایک ہی طرف کیوں اشارہ کرتے ہیں۔ بدھ مت...... بدھ

مت اور صرف بدھ مت۔ یہ بدھ مت اس کی زندگی سے کیوں چپک گیا ہے۔ ویسے تو سب کچھ غیر فطری ہی سا لگتا تھا۔ ریتھا، ریشی، فیلر اور وہ شجیرہ میوزیم سارے کا سارا عجیب۔ کامران کو یاد آیا کہ ریتھا اسے اس میوزیم میں ملی تھی جہاں وہ بدھ مت کے نوادرات کا جائزہ لے رہا تھا اور بدھ مت کے حوالے ہی سے ریتھا نے اس سے گفتگو بھی کی تھی اور اس کے قریب آئی تھی۔ دفعتاً ہی کامران کو یوں لگا جیسے کوئی نئی بات نہ ہوئی ہو۔ سارا معاملہ اسی پیچیدہ چکر سے تعلق رکھتا ہو، جس میں پھنس کر وہ ایک طویل عرصہ تبت، سنکیانگ اور ہمالیہ کی ترائیوں کے دوسرے علاقوں میں گزر چکا تھا اور جہاں کرنل گل نواز گم ہوگیا تھا۔ آہ...... کیا ہے یہ سب کچھ۔ کیا میں واقعی زمانہ قدیم کا کوئی بدھ ہوں؟ لیکن کامران کا مذہب اس بات کی نفی کرتا تھا۔ اس وقت ایک عجیب و غریب کیفیت اس پر طاری تھی۔ وہ ریتھا کے ساتھ قدم آگے بڑھا رہا تھا، لیکن اس کا ذہن اسی طرح عجیب و غریب خیالات میں پھنسا ہوا تھا۔

جب وہ راہداری کے اختتام پر پہنچا تو یکایک ساکت ہوگیا۔ وہ ہونقوں کی طرح گردن اٹھائے اس تصویر کو گھور رہا تھا جو راہداری کے آخر میں لگی ہوئی تھی۔ یہ تصویر تقریباً تین فٹ چوڑی اور پانچ فٹ لمبی تھی۔ یہ سب سے حیرانی کی بات تھی کہ یہ سیتا اور گرشک کی تصویر تھی۔ کامران کو سرد سی لہر اپنے جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس راہداری میں بے شمار تصاویر بدھ مذہب سے متعلق تھیں اور ان تصویروں میں سیتا اور گرشک کی تصویر وہ اس روغنی تصویر کو دیکھتا رہا۔ مصور جو کوئی بھی تھا بلا کا فن کار تھا جس نے یہ شاہ کار تخلیق کیا تھا۔

دونوں جیتے جاگتے کردار محسوس ہوتے تھے۔ خاص طور سے سیتا جو اس تصویر میں اپنی اصل سے زیادہ حسین نظر آتی تھی، اس کے اندر دل و دماغ کو جو تسخیر کر لینے والی صلاحیت تھی اور آنکھوں میں جو طلسماتی چمک تھی وہ یوں نظر آ رہی تھی جیسے سیتا اس تصویر میں منجمد ہوگئی ہو۔ رنگوں کا امتزاج انتہائی دل کش تھا۔ اس وقت اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سیتا اس سے اپنی آنکھوں سے کچھ کہنے والی ہو اور ابھی چند لمحوں کے بعد وہ بول پڑے گی۔ کتنی ہی دیر تک کسی سحر انگیز کیفیت میں وہ وہاں کھڑا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ تصویر یہاں کیوں ہے۔ اس نے گھوم کر ریتھا اور ریشی کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ اس دوسرے دروازے تک پہنچ چکی تھیں جہاں کسی نے دروازہ کھول دیا تھا۔ اچانک ریتھا کی آواز ابھری۔

"مسٹر کامران پلیز......!" اور کامران ایک دم چونک پڑا۔ پھر وہ اپنے آپ کو سنبھال کر ان کے پیچھے کمرے میں داخل ہوگیا جس کمرے میں داخل ہوا وہ کافی کشادہ تھا۔ فرش پر ایک دبیز سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ درمیان میں ایک میز بھی تھی جس کی سطح ہلکے نیلے شیشے کی تھی۔ ہال کی مشرقی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی میز صوفہ سیٹ اور کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر سنہری پینٹ کیا گیا تھا۔ سامنے کچھ شوکیس رکھے ہوئے تھے جن میں عجیب و غریب قسم کی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ ان اشیا میں مہاتما بدھ کا مجسمہ بھی تھا۔ کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا سنہرے رنگ کا مجسمہ شوکیس کے پاس سنگ مرمر سے بنی ہوئی ایک خوب صورت ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ وہ مجسمہ یا تو خالص سونے کا تھا یا پھر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا۔ پھر میری نگاہیں اس شخص کی جانب اٹھ گئیں جس نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا مجہول سا آدمی تھا۔ گال پچکے ہوئے اور آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ اسے دیکھ کر ایک عجیب سا احساس ہوتا تھا، بالکل یوں لگتا تھا جیسے کوئی مردہ قبر سے اٹھ کر آ گیا ہو۔ چہرے پر اتنی

زردی تھی کہ لگتا تھا کہ اس کے جسم میں خون نام کی کوئی چیز نہیں ہے بالکل پھیکا اور بے نور چہرہ تھا۔ اس نے گیروے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ اس کی آنکھوں کا اس کے پورے وجود سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان آنکھوں میں گہری پراسرار چمک تھی اور اس کی پتلیوں کا رنگ اس قدر نیلا تھا کہ اسے دیکھ کر ایک عجیب سا احساس دل میں پیدا ہوتا تھا۔

دفعتاً ہی ریتھا نے کہا۔

"ہیلو! پردھان پرسو! یہ وہی مشہور عالم شخصیت کامران ہیں جن کا تذکرہ آپ کے کانوں تک بھی پہنچ چکا ہوگا۔" اس شخص نے دو قدم پیچھے ہٹ کر دونوں ہاتھ سیدھے کیے اور رکوع کے انداز میں جھک گیا۔ ریتھا نے کہا۔

"یہ طریقہ تعظیم ہے۔"

"بڑا انتظار تھا آپ کا...... پاتال پرمتی!" پردھان پرسو نے کہا اور کامران اچھل پڑا۔ پاتال پرمتی...... پاتال پرمتی...... پاتال پرمتی۔ دفعتاً ہی اس کے ذہن میں جھلاہٹ بیدار ہوگئی۔ اس نے کہا۔

"آپ نے مجھے کسی اور نام سے مخاطب کیا۔ پردھان پرسو! میرا نام کامران ہے۔"

"اوہ...... ہاں، واقعی واقعی۔ آپ کی شخصیت بہت متاثر کن ہے آپ کی بڑی مہربانی ہے کہ آپ نے یہاں تک آنے کی زحمت گوارہ کی۔"

"میں تو ایک معمولی سا آدمی ہوں۔ پردھان پرسو۔" کامران نے کہا۔ پردھان پرسو نے بہت غور سے کامران کو دیکھا اور بہت دھیرے سے مسکرایا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"یہ تو وقت بتائے گا کہ آپ کیا ہیں اور وہ وقت جلد ہی آنے والا ہے۔"

"اچھا۔ گویا میں جو کچھ ہوں وہ میں خود اپنے بارے میں نہیں جانتا۔" کامران نے کہا اور مردہ بوڑھا مسکرایا اور اس کے ساتھ ہی ریتھا اور ریشی بھی ہولے سے ہنسیں اور کامران کے ذہن میں پھر ایک الجھن سی بیدار ہوگئی۔ بہرحال اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اسی وقت پردھان کی آواز ابھری۔

"آیئے۔ آپ یہاں آئے ہیں، ہماری خوش بختی ہے۔ بیٹھیے تاکہ ہماری عزت میں اضافہ ہو۔" اس نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور سب لوگ بیٹھ گئے۔ کامران ایک کرسی پر بیٹھنے لگا تو پردھان پرسو نے جلدی سے کہا۔

"نہیں یہ نہیں۔ آپ کے بیٹھنے کی جگہ یہ ہے۔" اس نے ایک اونچی سی کرسی سامنے کی جس کا انداز اور بناوٹ شاہانہ قسم کا تھا۔ کامران جھنجھلایا ہوا سا تو تھا لیکن بہرحال اس جھنجھلاہٹ کا وہ کوئی اظہار نہ کر سکا چونکہ اس کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ جس جگہ وہ بیٹھا ہوا تھا یہاں سے سونے کا وہ مجسمہ صاف نظر آتا تھا جو مہاتما بدھ کا تھا۔ پردھان پرسو نے کہا۔

"ریشی جاؤ۔ کسی مشروب کا انتظام کرو۔" اس نے اس انداز میں ریشی کو حکم دیا تھا جیسے ریشی اس کے لیے ایک الگ ہی درجہ رکھتی ہو۔ ریشی اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ یہ گیشاؤں کا لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کا چہرہ سفید پینٹ سے رنگا

ہوا تھا۔اس نے اندر داخل ہو کر گردن جھکائی تو پردھان پرسو نے کہا۔

''ایک مہان آتما نے ہمارے گھر کو رونق بخشی ہے۔ جاؤ ان کے لیے کوئی اچھا مشروب لے کر آؤ'' اور لڑکی باہر نکل گئی۔ کامران کی نگاہیں اطراف میں بھٹک رہی تھیں۔ پھر اسے گرشک اور سیتا کی وہ تصویر یاد آئی جو تصویر سے زیادہ یوں لگتا تھا جیسے دو انسانوں کو فریم میں چپکا دیا گیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے کامران کے دل میں خیال آیا کہ تصویر کے بارے میں پوچھے لیکن نہ جانے کس مصلحت کے تحت اس کی زبان بند ہی رہی اس وقت پردھان پرسو کی آواز ابھری۔

''آپ کو یہاں آئے ہوئے کتنا وقت گزر گیا۔مہان منی۔''

''زیادہ نہیں۔''

''اچھا، اچھا۔ ریتھا نے مجھے بتایا تھا کہ آپ اسپین آئے ہیں۔ میں نہیں جانتا مہا منی کہ اسپین میں آپ کسی اور مقصد کے تحت آئے ہیں، لیکن ریتھا سے مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ فیلر سے آپ کا جھگڑا ہوا تھا۔ یہ بتا دینا آپ کو بہت ضروری ہے کہ آپ اس ملک میں اجنبی ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے لیے کوئی پریشانی پیدا ہو جائے۔ میں فیلر کو جانتا ہوں وہ سنگ دل، ظالم اور خود غرض ہے۔ شرافت اس کے قریب سے بھی نہیں گزری۔ یہاں اس کے بھائی زیر زمین دنیا کے لوگ ہیں اور مجرمانہ کارروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ مہان منی آپ کو احتیاط کرنا ہوگی۔ ویسے تو آپ کے خادم آپ کے اردگرد بکھرے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی میری خواہش ہے کہ آپ ہوشیار رہیں۔''

''میں زیادہ ڈرتا نہیں ہوں کسی سے۔ فیلر اگر کوئی بہت بڑی چیز ہے تو مجھے بھی کمزور نہیں پائے گا۔''

''بالکل ٹھیک ہے ہم بھی آپ کے خادم ہیں۔ آپ کے پاس بھی دوستوں کی کمی نہیں ہے۔ سارے دوست آپ کے دوست ہیں۔'' ابھی یہیں تک بات پہنچی تھی کہ وہی لڑکی اندر داخل ہوئی اور اپنے خوب صورت وجود کی نمائش کرتی ہوئی، چاندی کی ایک چھوٹی سی ٹرے سنبھالے ہوئے کامران کے پاس آ گئی۔ ٹرے میں چاندی کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے سب کو ایک ایک گلاس پیش کیا اور واپس چلی گئی۔ گلاس میں ایک خوب صورت مشروب اوپر تک بھرا ہوا تھا لیکن وہ اس قدر گاڑھا تھا اور اس میں کچھ عجیب قسم کی مہک تھی۔ یہ ایک انتہائی دل کش مہک تھی۔ وہ مشروب کامران کے لیے اجنبی تھا تاہم اس نے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا اور اس کا ذائقہ بھی اسے بے حد عجیب لگا۔ بڑا تیز تلخ اور کسیلا ذائقہ تھا۔

کامران کو اپنی بہترین خوشبو کے باوجود وہ مشروب پسند نہیں آیا لیکن اس کا پہلا گھونٹ حلق سے اترا تو زبان پر فوراً ہی لطیف اور مہک انگیز مٹھاس محسوس ہوئی۔ تعجب کی بات تھی لیکن تعجب کی بات نہیں بھی تھی کیونکہ کامران کی زندگی کا اب ہر قدم پراسرار گتھیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ بہر حال وہ اب اس مشروب کو بڑے شوق سے ایک ایک گھونٹ کر کے پینے لگا۔ سب لوگ اپنے مشروب سے شغل کر رہے تھے۔ جب گلاس خالی ہو گئے تو سب سے پہلے ریتھا اپنی جگہ سے اٹھی اور ریشی کو اشارہ کر کے بولی۔

''آؤ ریشی۔ ذرا اوپری منزل پر چلتے ہیں۔'' کامران! پردھان پرسو تمہارے لیے بہت اچھے ساتھی ثابت ہوں گے۔ ان سے باتیں کرو۔ کامران نے اس بات کو بھی حیرت زدہ انداز میں دیکھا تھا بہر حال ان

کے جانے کے بعد پردھان پرسو اس کے سامنے رہ گیا۔ اس وقت کامران پر ایک ایسی کیفیت طاری تھی جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل تھا۔ ذہن پر بڑی نشاط انگیز اور روح پرور کیفیت طاری تھی اور جسم بے حد ہلکا پھلکا لگ رہا تھا پھر اچانک ہی کامران کی نگاہ پردھان پرسو کی کلائی پر پڑی۔ اس کلائی میں ایک زنجیر نظر آ رہی تھی۔ یہ بالکل ویسی ہی زنجیر تھی جیسی اس نے ایک بار ان سب کے گلے میں دیکھی تھی اور حیران ہوا تھا۔ پردھان پرسو اس زنجیر کو آہستہ آہستہ سہلا رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔

''پاتال پرمتی! آپ نے مجھے اپنے اصل نام سے محروم کر دیا ہے لیکن نام کچھ بھی ہو، اصل چیز انسان کی شخصیت ہوتی ہے۔ آپ مجھے بہت پسند آئے۔ آپ میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو پاتال پرمتی کی شخصیت کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ آپ اس کائنات کے صفحے پر ایک ایسی نہ مٹنے والی تحریر ہیں جو صدیوں سے قائم ہے اور صدیوں تک قائم رہے گی کیوں کہ آپ پر ایک عہد ساز ذمے داری آ پڑی ہوئی ہے۔ ویسے پاتال پرمتی کیا آپ مجھے اپنے بارے میں بتانا پسند کریں گے۔ میرا مطلب ہے اپنے ماضی کے بارے میں۔''

کامران نے اسے غور سے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کہ اس شخص سے باقی تمام باتیں پوچھے۔ یہ ایک اچھا موقع بھی تھا۔ اس نے کہا۔

''پردھان پرسو میرے بارے میں کیا جاننے چاہتے ہو؟''

''آپ کا ماضی پاتال پرمتی!''

''تم جس فضول نام سے مجھے مخاطب کر رہے ہو۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب تم نے مجھ سے اس طرح کا سوال کیا ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں پوری تفصیل بتا دوں۔''

''میری اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کچھ نہیں ہوگی پاتال پرمتی!''

''حالانکہ یہ نام مجھے بالکل پسند نہیں ہے، لیکن پھر بھی تم کہہ رہے ہو تو میں اسے صبر سے برداشت کیے لیتا ہوں۔ دیکھو۔ پہلی بات تو یہ کہ میں بدھشٹ نہیں ہوں۔'' کامران کے ان الفاظ پر پردھان پرسو نے غور سے اسے دیکھا پھر آہستہ سے بولا۔

''ٹھیک ہے آپ کا اپنا دھرم کیا ہے؟''

''اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں مسلمان ہوں۔ ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا۔ مسلمانوں کی طرح پروان چڑھا۔ میرے والدین درمیانے درجے کے لوگ تھے۔ ایک بہن تھی میری، جو ایک حادثے کا شکار ہو گئی۔ اس حادثے کے بعد دنیا مجھے بہت بری لگنے لگی۔ میں بہن کے قاتلوں سے انتقام لینے نکلا تو میری رہنمائی ہوئی۔ مجھے انتقام سے روک دیا گیا۔ اس کے بعد میں ایک گھر میں ملازمت کرنے لگا اور وہاں مجھے ایسے نیک دل اور اچھے لوگ ملے جنہوں نے میرا دل جیت لیا۔ ان کے ساتھ میں تبت اور سنکیانگ کے علاقے میں گیا۔ اس دوران مجھے دو کردار ملے جن میں سے ایک کا نام گرشک اور دوسرے کا نام سیتا تھا۔'' کامران نے کہا اور اچانک ہی پردھان پرسو اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے پھر جھکا اور اس کے بعد سجدہ ریز ہو گیا۔ کامران نے حیرانی سے اپنی کرسی پیچھے ہٹا لی تھی۔ پردھان پرسو کچھ دیر تک سجدے میں پڑا رہا پھر اٹھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

''آپ نے دو ایسے نام لیے جو ہمارے لیے مقدس دیوتاؤں کا درجہ رکھتے ہیں۔''

''ہوگا...... ہوگا...... ہوگا۔'' کامران نے بہ دستور جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر بولا۔

''اس کے بعد میری زندگی عجیب و غریب ہنگاموں سے دوچار ہوگئی اور ابھی تم نے مجھے پاتال پرمتی اور نہ جانے کیا کہا۔ احمقانہ نام دیے جب کہ تم سمجھتے ہو اور تمہیں علم ہو چکا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور ہم لوگوں کے ہاں اس طرح کی کسی بات کی گنجائش یا لچک نہیں ہوتی۔'' پردھان پرسو کامران کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جب وہ دم لینے کے لیے رکا تو اس نے کہا۔

''ایک سوال کرنا چاہتا ہوں مہامنی!''

''پھر وہی مہامنی!''

''یہ تو محبت کے الفاظ ہیں۔ بڑائی کی بات ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ آپ کے دل میں کبھی کسی کی محبت جاگی؟'' کامران نے حیرانی سے دیکھا۔ وہ پلک جھپکائے بغیر کامران کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں وہ زنجیر بہ دستور گردش کر رہی تھی۔ زنجیر میں لگا ہوا خوب صورت لاکٹ اس کی انگلیوں میں گردش کر رہا تھا اور دائیں بائیں ڈول رہا تھا۔ اچانک ہی کامران کو اپنے ذہن میں ایک ہلکی ہلکی سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ حواس پر ایک ناقابل یقین غنودگی چھانے لگی اور آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہونے لگے پھر وہ بولا۔

''پتا نہیں میں نے کسی سے محبت کی ہے یا نہیں۔ بس بہت سے چہرے میری نگاہوں کے سامنے آئے ہیں۔ ہاں اگر تم سوچو کہ کسی چہرے نے میرے دل میں کوئی جگہ بنائی ہے یا نہیں تو وہ سیتا ہی تھی۔ کوئی ایسا کردار ہے اس کے اندر جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔'' کامران کہتا رہا اور پردھان پرسو سنتا رہا۔ دھیرے دھیرے بالکل دھیرے دھیرے جیسے کوئی گونج پہاڑیوں سے معدوم ہوتی ہے۔ کامران کی آواز خود اس کے کانوں سے دور ہوتی چلی گئی اور پھر پردھان پرسو کا ہیولا بھی تحلیل ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ ہر چیز اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی اور اس کے گرد اندھیرا چھا گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اندھیرے میں چلا جا رہا ہے۔ ایک روشنی ایک پراسرار روشنی اس کے سامنے پرواز کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے اور وہ اسی کے پیچھے چلتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ جنگل سے باہر نکلتا ہے تو ایک ناقابل یقین حد تک خوب صورت دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ یہ عجیب اور انوکھی دنیا ہے، چاروں طرف اوپر نیچے دائیں بائیں بے شمار رنگوں کی لہریں چکراتی پھر رہی ہیں ان کے مختلف رنگ ہیں، رنگ ہی رنگ۔ ان گنت جیسے رنگوں کا طوفان آیا ہوا ہے۔

قدموں کے نیچے سبز گھاس بچھی ہوئی ہے۔ ایسی نرم ایسی پیاری اور اس طرح ترشی ہوئی کہ بس انسان دیکھے اور دیکھتا ہی رہ جائے۔ گرد و پیش میں درخت ہی درخت ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گول ان کے رنگ بھی عجیب ہیں۔ سنہرے، سرخ اور پیارے۔ ان پر پھول کھلے ہوئے ہیں اور اتنے زیادہ ہیں کہ جدھر نظر جاتی ہے پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ شاداب اور معطر ان کی خوشبو سے پورا علاقہ معطر ہو رہا ہے۔ یہ رنگ کامران کے گرد منڈلا رہے ہیں اور وہ خود ایک لہر کی طرح سبک ہو کر گویا بہتا چلا جا رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچتا ہے جہاں فرش پر اتنے پھول کھلے ہوئے ہیں کہ گھاس نظر نہیں آتی۔ وہ پھولوں پر چلتا ہوا

آگے بڑھتا ہے تو سامنے سے ایک خوب صورت لڑکی آتی ہوئی نظر آتی ہے اس کے جسم پر کیسری لبادہ ہے اور چہرہ ڈھکا ہوا ہے۔ ایک عجیب و غریب انداز کا لباس ہے اور اس کا جسم شاخ گل کی طرح اچک رہا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ کامران کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ دور وہ گھٹنے ٹیک کر اور سر جھکا کر اسے تعظیم دیتی ہے۔ کامران کے اندر بھی ایک عجیب سی ادا پیدا ہو جاتی ہے جیسے وہ سکندر اعظم ہو اور دنیا اس کے آگے جھکی ہوئی ہو، پھر وہ حسینہ اسے پھول پیش کرتی ہے اور کامران اس پھول کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ پھول کی خوشبو اس قدر معطر ہے کہ وہ سر سے پیر تک سرشار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ پھر وہاں سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ پرندوں کی آواز سے ساری وادی گونج رہی ہے لیکن یہ پرندے بھی اجنبی ہیں۔ اس نے ایسے پرندے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ بے حد خوش رنگ، خوش نما پرندے عالم مستی میں چہچہا رہے ہیں۔ ان کی آوازیں موسیقی کی نشاط انگیز گونج اور نغمہ رنگین ہے۔ کامران اس سارے ماحول سے اس طرح متاثر ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے وجود کا احساس نہیں رہتا پھر کچھ اور آگے چلتا ہے تو اسے ایک شخص نظر آتا ہے یہ بھی بدھ مت کے لباس میں ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے قریب آ کر ٹھہر جاتا ہے۔ اس کے پیچھے ایک لڑکی بالکل چھوٹی سی دبلی پتلی، اس نے بھی پہلے والی لڑکی کی طرح لباس پہن رکھا ہے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد پہلے والی لڑکی کے انداز میں وہ دونوں بھی اسے تعظیم دیتے ہیں۔

پھر آنے والا شخص اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور پیچھے ہاتھ کرتا ہے۔ لڑکی نے ہاتھ میں ایک تھالی اٹھا رکھی ہے۔ کیسری لبادے میں ملبوس شخص تھالی میں مخمل پر رکھی ہوئی ایک انگوٹھی اٹھاتا ہے اور اسے کامران کے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی میں پہنا دیتا ہے۔ کامران اسے غور سے دیکھ رہا ہے وہ ایک دبلا پتلا طویل القامت آدمی ہے۔ اس کی شکل خاص قسم کے تھائی باشندوں جیسی ہے۔ انگوٹھی پہنا کر وہ تھالی سے ایک زنجیر اٹھاتا ہے جس میں ایک خاص قسم کا لاکٹ لٹکا ہوا ہے۔ زنجیر وہ شخص کامران کے گلے میں ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ دونوں پھر اسے تعظیم دیتے ہیں اور اپنا کام سرانجام دے کر واپس پھولوں کے جھنڈ میں غائب ہو جاتے ہیں۔ کامران چند لمحے وہاں کھڑا رہتا ہے اس کے بعد اس کے قدم پھر آگے بڑھ جاتے ہیں اور اب وہ جس مقام سے گزر رہا ہے یہاں چاروں طرف پتلی پتلی پختہ نہریں ہیں، جن میں چاندی کی طرح جھلملاتا پانی بہ رہا ہے۔ آگے ایک بارہ دری نظر آتی ہے۔ خوشبو یہاں بھی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور پرندے ادھر سے ادھر اڑتے پھر رہے ہیں۔ پھولوں کے تختے چاروں طرف بچھے ہوئے ہیں۔ وہ نہروں کے پاس سے گزرتا ہوا اچانک ایک عمارت کے پاس پہنچ گیا۔ یہ قدیم طرز کی عمارت ہے۔ سامنے چھ ستون ہیں اور سامنے ایک خوب صورت دالان ہے۔

کامران اکیس سیڑھیاں چڑھ کر ان ستونوں کے درمیان سے گزر کر صحن میں پہنچتا ہے اور اچانک اسی وقت ایک آدمی نہر کے محرابی دروازے سے نکل کر اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ دفعتاً ہی کامران کے ذہن کو ایک جھٹکا لگتا ہے۔ اس کے سامنے اس کا ہم شکل کھڑا ہوتا ہے۔ اسے لگتا ہے جیسے آئینہ اس کے سامنے ہو، لیکن اس کے جسم لباس اور سامنے آنے والے آدمی کے لباس میں بہت فرق ہے۔ اس نے جو لباس پہن رکھا ہے اس پر چاندی اور موتیوں کا انتہائی باریک اور نفیس کام ہے۔ سر پر ایک خاص قسم کا تاج رکھا ہوا ہے اور اس

کی گردن میں سونے کا ایک سانپ لپٹا ہوا ہے۔ وہ کامران کو دیکھ کر مسکراتا ہے اور کامران کے ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں پھیل جاتے ہیں۔ وہ نرم اور دوستانہ لہجے میں کہتا ہے۔

''تم کون ہو؟'' کامران سوچ میں ڈوب جاتا ہے اس وقت اسے اپنا نام یاد نہیں آتا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' وہ پھر پوچھتا ہے۔ کامران اپنے ذہن پر زور دیتا ہے لیکن تعجب ہے اسے اپنا نام یاد نہیں آتا۔ وہ مسکراتا ہے پھر ہمدردی سے کہتا ہے۔

''کیا تمہاری کوئی پہچان ہے؟''

''نہیں۔''

''کیوں......؟''

''کیونکہ تم اور میں ایک ہی ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا سایہ ہیں اور سائے کی کوئی پہچان نہیں ہوتی۔''

''ہاں شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ تمہیں یاد ہے کہ تم کہاں سے آئے ہو لیکن اس وقت کامران کو کچھ یاد نہیں آتا۔ وہ گردن ہلا کر کہتا ہے۔

''نہیں۔ میں نہیں جانتا میں کون ہوں۔ میرا نام کیا ہے اور میں کہاں سے آیا ہوں۔ کچھ بھی نہیں جانتا میں گویا میں کچھ بھی نہیں ہوں۔''

''لیکن میں ہوں، اگر تم نہیں ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ہوں۔''

''یقیناً ایسا ہی ہے، مگر تم کون ہو؟'' کامران نے اس سے پوچھا اور اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ کامران نے دیکھا کہ اس کی چاروں انگلیوں میں زمرد، یاقوت اور فیروزے کی انگوٹھیاں تھیں اور کلائی میں سونے کا ایک سانپ مکڑے کی شکل میں پڑا ہوا تھا جس کی آنکھوں میں لعل جڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ کو چاروں طرف گھمایا پھر اس نے کہا۔

''میں اس علاقے کا حکمران ہوں۔ یہ پرندے میرے لیے بولتے ہیں۔ یہ ہوائیں میرا دل بہلاتی ہیں۔ وادی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک میں ہی ہوں۔ صرف میں ہی ہوں اور ستی ساوتری پاتال پردھانی میری محبوبہ ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم...... میں پاتال پرمتی ہوں اور تم میری نقل سمجھے۔ تم صرف میری نقل ہو۔''

''مگر میں خود کون ہوں، مجھے کیوں یاد نہیں آتا؟''

''اس لیے کہ تم صرف سایہ ہو...... میرا سایہ۔''

''تو پھر میں یہاں کیوں آیا ہوں؟''

''اس لیے کہ ابھی وقت کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری جگہ کو سنبھالے رہو اور وہ سب کچھ جس کا فیصلہ ہو گیا ہے جو صدہا سال سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے، تکمیل کو پہنچے۔ تم میری جگہ آ جاؤ اور پھر انتظار کرو۔ جب تم بادشاہوں کی وادی میں جاؤ اور سونے والے جاگ اٹھیں، اس وقت فضاؤں کی مہک ناقابل یقین ہوگی۔ داسیاں رقص کریں گی اور آسمان پر پورا چاند طلوع ہوگا اور پھر وہ جاگ اٹھے گی جو میری منتظر ہے جسے وقت نے سلا رکھا ہے اور آگے بہت کچھ ہوگا۔ سمجھ رہے ہو نا۔ اب تمہیں اس وقت تک میری شکل اختیار کرنا ہوگی جب تک میں خود اپنی شکل میں نہ آ جاؤں۔ سمجھ رہے ہو۔ اب میرا دور

تمہارے وجود کو مل چکا ہے۔

مجھے اجازت دو۔'' یہ کہہ کر وہ واپس مڑا اور دھیرے دھیرے فضا میں تحلیل ہو گیا۔ اس سے زیادہ وضاحت اور کیا ہو سکتی تھی، اس سے زیادہ تفصیل اور کیا بتائی جا سکتی تھی۔ کامران کو پوری طرح اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ درحقیقت وہ زمانہ قدیم کے ایک انوکھے کردار کا ہم شکل ہونے کی وجہ سے ان سارے معاملات کا شکار ہوا ہے۔ کیسٹ میں جو تصویر نمایاں تھی وہ کامران کی نہیں بلکہ اس پراسرار شخص کی تھی اور کامران صرف اس کی ہم شکلی کا شکار ہوا تھا۔ پتا نہیں وہ خوف ناک عورت جس کا نام امینہ سلفا تھا اور جس کے بارے میں یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ زمانہ قدیم کی ایک ایسی عورت ہے جو صدیوں سے جیتی چلی آئی ہے۔ علی سفیان اس کا نیا شکار ہے۔ اس عورت کو بھی خزانوں کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کہانی میں اس کا کردار بھی بڑا پراسرار تھا۔

وہ کوئی اور ہی وجود رکھتی تھی۔ باقی قزل ثنائی اس کی بیوی شعورہ، والش اور دوسرے بہت سے کردار کرنل گل نواز، رانا چندر سنگھ اور نہ جانے کون کون یہ سب ایسی ڈور میں بندھے ہوئے تھے۔ کامران کو اب اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ خود اس کا اپنا مقام کیا ہے۔ پرکھنہ کی وادیوں میں سونے والی اس کی محبوبہ نہیں تھی بلکہ اس شخص کی تھی جو کامران کا ہم شکل تھا۔ ایک شخص نے صرف ایک شخص نے اس بات کا خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ممکن ہے کہ کامران اس شخص کا ہم شکل ہو۔ کامران نے سوچا کہ اب ان سارے معاملات سے گلوخلاصی تو ممکن نہیں ہے چنانچہ کیوں نہ خود اس کہانی میں کھو جایا جائے۔ حسن شاہ نے اسے یہاں صرف اس لیے بلایا تھا کہ اسپین میں اسے کرنل گل نواز کی موجودگی کی کوئی خبر ملی تھی۔ وہ نہ جانے اس وقت کہاں ہے۔ کامران نے کسی پراسرار طلسم کے زیر اثر سوچا کہ اسے اب اس کہانی میں ایک کردار بن جانا چاہیے جو اس کے چاروں طرف لپٹ گئی ہے۔ وہ کتنی ہی کوشش کر لے اس کہانی سے فرار حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔

بہرحال اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے پردھان پرسو کو دیکھا جو اس کے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا مگر اب اس کے ہاتھوں میں زنجیر نہیں تھی۔ دونوں لڑکیاں ابھی تک واپس نہیں آئی تھیں۔ کامران تھوڑی دیر تک عجیب سے انداز میں کھویا کھویا سا رہا پھر اس نے پشیمان لہجے میں پردھان پرسو کو دیکھا اور بولا۔

''شاید میں سو گیا تھا۔''

''کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔'' بہرحال کامران حیران تھا کہ اگر وہ سو گیا تھا تو کیوں اور کیسے۔ کیا یہ اس مشروب کا اثر تھا مگر وہ مشروب تو باقی لوگوں نے بھی پیا تھا مگر ان پر کوئی اثر کیوں نہیں ہوا۔ وہ الجھے ہوئے انداز میں آہستہ آہستہ کنپٹی پر انگلی پھیرتا رہا۔ اس کے ذہن میں اب دھند ہی دھند تھی۔ ان گنت خیالات یوں الجھ گئے تھے جیسے بہت بڑی ڈور الجھ گئی ہو۔ سر میں ہلکی ہلکی دھمک بھی ہو رہی تھی۔ کوئی چیز واضح نہیں تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اس نے کوئی خواب دیکھا ہے مگر کیسا خواب تھا وہ، ذہن کے پردے پر کچھ تصویریں تو تھیں مگر اتنی مبہم اور دھندلی کہ کوئی شکل واضح نہیں بن رہی تھی۔ اسی وقت پردھان پرسو کی آواز سنائی دی۔

''کیا بات ہے کیا تمہاری طبیعت کچھ خراب ہے کامران!''

''ہاں سر میں درد ہے۔''

''کوئی بات نہیں ابھی کھلی ہوا میں جاؤ گے تو ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

''وہ دونوں ابھی تک نہیں آئیں۔'' کامران نے ریشی اور ریتھا کے بارے میں سوال کیا، لیکن ابھی پردھان پرسو نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ دونوں لڑکیاں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔ ان دونوں نے اپنے ہاتھوں میں کتابیں تھام رکھی تھیں۔ پردھان نے خوش مزاجی سے کہا۔

''شاید تمہیں اپنے مطلب کی کتابیں مل گئیں۔'' ریتھا نے گردن ہلائی اور بولی۔

''ہاں۔ ایک کتاب میں کامران کے لیے بھی لائی ہوں۔ یہ ان کی پسند کی کتاب ہوگی۔''

''واہ۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔''

''ویسے آپ لوگوں کی اس دوران کیسی گفتگو رہی۔''

''بس میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ تو بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں اور انہیں اتنا ہی ذہین اور اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہونا بھی چاہیے۔ میں تم دونوں کا شکر گزار ہوں کہ تمہاری بہ دولت مجھے اتنے عظیم انسان سے ملنے کا موقع ملا۔ اب مجھے امید ہے کہ مجھے دوبارہ بھی شرف ملاقات بخشا جائے گا۔''

''کیوں نہیں، ہم انہیں دوبارہ یہاں ضرور لائیں گے۔''

''ویسے ایک خیال میرے ذہن میں اور ہے۔''

''ہاں بولیے۔''

''کیوں نہ ہم انہیں اپنی سوسائٹی میں شامل کر لیں۔ ہمارے گروپ کو ان کی ضرورت ہے۔''

''بلاشبہ یہ بہت اچھی بات ہوگی۔'' اس بار ریشی نے بھی اس گفتگو میں مداخلت کی۔

''کیوں جناب! آپ کیا کہتے ہیں۔ اصل میں ہم نے ایک سوسائٹی بنائی ہے۔ ہمارے ممبروں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس میں ہر ذوق کے لوگ موجود ہیں۔ خواتین حضرات بھی۔ ہماری خوش قسمتی ہوگی کہ آپ بھی ہماری سوسائٹی کی اعزازی رکنیت قبول فرمالیں۔''

''کیا یہ دونوں بھی سوسائٹی کی ممبر ہیں؟''

''ہاں دونوں۔ بلکہ یہی دونوں نہیں اور بھی کئی ہیں جنہیں آپ پسند کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں غور کروں گا۔'' کامران نے جواب دیا، پھر وہاں سے واپسی کی ٹھہری۔ پردھان پرسو انہیں چھوڑنے دروازے تک آیا۔ جب یہ لوگ دروازے کے قریب پہنچے کامران نے اس شخص کو دیکھا۔ وہ قریبی کمرے سے اچانک برآمد ہوا تھا۔ ایک لمبے چوڑے جسم کا آدمی تھا اور اس کا چہرہ انتہائی درجے کا سرخ۔ سر کے بال چھوٹے چھوٹے اور دونوں کان ٹوٹے ہوئے۔ وہ کوئی پہلوان نظر آ رہا تھا۔ اس نے خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا اور بولا۔

''ہیلو۔'' اس نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ پردھان پرسو نے آگے آ کر کہا۔

''تم جاؤ۔'' اور وہ شخص اس طرح واپس چلا گیا جیسے ان الفاظ کے ساتھ بندھا ہوا ہو۔ رات ہو چکی تھی اور روشنیاں جگ مگاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ موسم بہت اچھا تھا۔ آسمان ستاروں سے سجا ہوا تھا اور چاند

نیلے سمندر میں محوِ سفر تھا، لیکن نہ جانے کیوں اس وقت یہ سب پھیکا پھیکا سا لگ رہا تھا۔ نہ چاند، نہ ستاروں اور نہ ان روشنیوں میں کوئی دل کشی محسوس ہو رہی تھی۔ گاڑی انہیں لے کر چل پڑی۔ ریتھا کامران کے ساتھ چپک کر بیٹھی ہوئی تھی، لیکن کامران کے ذہن پر ایک دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ بہر حال تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ ایک ریستوران کے سامنے رک گئے۔

''یہاں کیوں؟'' کامران نے سوال کیا۔

''آؤ تمہیں ایک عمدہ چیز پلاتی ہوں جو خالص اسپینش ہے۔ یہ ایک ہلکے کلر کی قہوہ نما کافی تھی، لیکن کمال کی چیز تھی، بالکل جادوئی اثر۔ کامران ایک دم زندگی سے بھرپور ہو گیا اور اسے ہر چیز دل کش نظر آنے لگی۔ بہر حال یہاں سے اٹھے اور ان دونوں لڑکیوں نے اسے اس کی رہائش گاہ پر چھوڑا۔ کامران نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ جانا چاہتی ہو تو جاؤ۔ میں یہاں کچھ وقت رکوں گا۔'' وہ فٹ پاتھ پر رک گیا۔ لڑکیاں چلی گئی تھیں۔ بڑی خوشگوار سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر تک وہ وہاں کھڑا رہا اور پھر اپنی آرام گاہ کی طرف چل پڑا۔ ابھی اسے اندر گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک اطلاعی گھنٹی۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا تو ایک لمبے اور دبلے پتلے بدن کا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ اس کے گھنگھریالے بال، تانبے جیسی رنگت اور دل کش آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مقامی آدمی ہے۔ وہ کامران کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ کامران نے کہا۔

''جی کہیے۔''

''آپ مسٹر کامران ہیں؟''

''ہاں۔''

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟''

''آیئے۔'' کامران نے کہا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان اور گھبرایا گھبرایا سا ہے۔ بار بار وہ ادھر ادھر دیکھنے لگتا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر کامران نے اس سے پوچھا۔

''جی فرمایئے۔ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''آپ میرے لیے کچھ نہ کیجیے بلکہ میں آپ کے لیے کچھ کرنے آیا ہوں۔ اگرچہ میں نہیں جانتا کہ مجھے یہاں آنا چاہیے تھا یا نہیں، مگر میں شاید ذہنی خلجان کا شکار ہوں، پھر یہ بھی امکان ہے کہ آپ میری باتیں سن کر مجھے پاگل سمجھیں۔ اس کے باوجود میں خود کو یہاں آنے سے روک نہیں سکا۔ میں آپ کا ہمدرد ہوں۔ میں دو دن سے آپ کا تعاقب کر رہا ہوں۔''

''کیوں......؟'' کامران نے چونک کر پوچھا۔

''میں نے کہا نا کہ میں کوئی عقلی جواز پیش نہیں کر سکتا۔ شاید یہ کوئی اندرونی جذبہ ہے کہ میں آپ کے پیچھے رہوں اور دیکھوں کہ آپ کہاں جاتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔''

''تمہاری باتیں بہت عجیب لگ رہی ہیں مجھے، مگر میرا پیچھا کرنے کی کوئی وجہ تو ہوگی؟''

''ہاں ہے۔''

''کیا وجہ ہے؟''

"میں...... میں......" وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کہا کہ کیا آپ مجھے سگریٹ پینے کی اجازت دیں گے۔"

"ہاں۔ پی لیں۔" کامران نے کہا۔ اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ اس نے سگریٹ نکالی، جلائی اور اس کے کئی کش لیے، پھر منہ سے خارج ہوتے ہوئے دھوئیں کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے اپنے حواس جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہو، پھر اس نے کہا۔

"یہ سب کچھ بڑا عجیب ہے۔ آپ شاید یقین نہیں کریں گے مگر مناسب یہی ہے کہ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں۔ کم از کم میرے ذہن کا بوجھ تو کچھ ہلکا ہو جائے گا۔ کل جب آپ ریتھا کے ساتھ روانہ ہوئے تو آپ کے پیچھے تھا۔ میں جانتا تھا کہ فیلر سے آپ کا جھگڑا ہوا ہے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ اس وقت فیلر کہاں ہے اور اس کے ساتھیوں کے آپ کے بارے میں کیا جذبات ہیں۔ آج بھی میں نے آپ کا تعاقب کیا۔ آپ ایک مخصوص جگہ گئے اور وہاں کافی وقت گزارا آپ نے اور اس کے بعد وہ لڑکیاں آپ کو یہاں چھوڑ کر چلی گئیں۔"

"بابا! یہ سب ٹھیک ہے مگر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ مطلب کیا ہے تمہارا۔" کامران نے مضطرب ہو کر کہا۔

"کیا آپ میرے چند سوالوں کے جواب دیں گے؟" کامران اسے دیکھنے لگا۔ یہ عجیب و غریب شخص ہے۔ ابھی تک اس نے کام کی ایک بات بھی نہیں کی اور بے سر و پا باتیں کیے جا رہا ہے۔ بہر حال کامران نے تجسس میں ڈوب کر کہا۔

"ہاں۔ بولو۔"

"آپ ریتھا کے دوست ہیں؟"

"ہاں۔"

"ریشی کے بارے میں تو میں جانتا ہوں لیکن ایک اور نام ہے۔ آپ مجھے اس کے بارے میں بتائیے وہ ہے نیرینہ۔" اس نے کہا اور کامران چونک پڑا۔

"ہاں۔"

"کیا آپ ان کے بھی دوست ہیں؟"

"یہی سمجھ لو۔ کیا نیرینہ تمہاری کوئی رشتے دار ہے؟"

"نیرینہ نہیں بلکہ ریتھا۔ میں ریتھا کا بھائی ہوں۔"

"اوہ۔ بڑی عجیب بات ہے۔ کئی بار یہ خیال میرے ذہن سے گزرا کہ تمہاری شکل میں مجھے کوئی نظر آتا ہے۔ اب اندازہ ہوا کہ تمہاری شکل ریتھا سے بہت ملتی ہے۔"

"ہاں۔ میرا نام رونیک ہے۔ لوگ مجھے رونی کہہ کر پکارتے ہیں۔"

"ٹھیک۔" کامران نے کہا۔

"آپ کو ناگوار تو گزرے گا، اگر میں آپ سے یہ پوچھوں کہ آپ کے گلے میں جو یہ زنجیر اور انگلی میں جو انگوٹھی ہے وہ آپ کو کہاں سے ملی؟" کامران نے اپنے گلے میں پڑی ہوئی زنجیر کو دیکھا پھر انگوٹھی کو۔

انگوٹھی سونے کی تھی اور اس میں جو نگ لگا ہوا تھا وہ شاید یاقوت تھا۔ زنجیر بالکل ویسی ہی تھی جیسی کامران نے ان لڑکیوں کے گلے میں دیکھی تھی۔ کامران کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ دونوں چیزیں کب اور کس طرح اس کے گلے میں پہنچیں اور کس نے پہنائیں۔ وہ لمحات اس کے ذہن سے نکل گئے تھے۔ اس کا مطلب ہے جب وہ سو گیا تھا تب پردھان پرسو نے اس کی انگلی اور گردن میں پہنا دی تھیں۔ اس نے کہا۔

"کیا آپ پردھان پرسو سے ملے تھے؟"

"ہاں۔"

"اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"وہ نیک آدمی لگتا ہے۔"

"کیا اس نے آپ کو اپنی سوسائٹی میں شامل ہونے کی دعوت دی ہے؟"

"ہاں۔"

"آہ...... یہی ہونا تھا...... یہی ہونا تھا...... میں جانتا تھا...... میں جانتا تھا۔" رونی نے کہا۔ وہ بہت مضطرب اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ چہرے کے تاثرات سے کوئی صحیح اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ آخر کار اس نے کہا۔

"آپ میرا مشورہ مانیں تو ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیں۔"

"کیا مطلب؟"

"میں اپنا مطلب خود نہیں جانتا۔ میں ٹھیک سے وضاحت بھی نہیں کر سکتا، لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ آپ کی بھلائی اسی میں ہے آپ دوبارہ ان لوگوں میں سے کسی سے نہ ملیں۔ نہ پردھان پرسو سے، نہ ریتھا سے، نہ نیرینہ نہ ریشی سے۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو واقعی؟"

"آپ یقین کریں اسی میں آپ کی بھلائی ہے۔"

"میری بھلائی کس میں ہے یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم میری فکر نہ کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ میرے پاس اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، لیکن آپ یقین کیجیے کہ یہ دونوں چیزیں آپ کی بربادی کا آغاز ہوں گی۔"

"تمہاری بکواس میں بہت دیر سے سن رہا ہوں۔ اب اور کچھ کہنا ہے یا نہیں۔"

"آپ مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیں مگر میں اپنی بات کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ نہیں جانتے کہ وہ لوگ کیسے ہیں؟ وہ بڑے سنگ دل اور ظالم لوگ ہیں۔ مکار اور خود غرض اور شیطان کے شاگرد۔ وہ ہر طرح کے کام کر سکتے ہیں۔ وہ کسی پر رحم نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کیا کرتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اس مقصد کے لیے انہیں نوجوان مردوں اور عورتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کو بھی انہوں نے کسی خاص مقصد کے لیے پھانسا ہے۔"

"اور وہ مقصد کیا ہے؟"

"یہی تو میں نہیں جانتا۔"

"اس کے باوجود میں تمہاری ان باتوں پر یقین کرلوں۔" کامران نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ تمہیں میری باتوں پر یقین کرلینا چاہیے۔ آپ نہیں جانتے کہ آپ کتنے خطرناک جال میں پھنس گئے ہیں۔ وہ دیوانے لوگ ہیں۔ ان کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ یقینی طور پر وہ شیطان کے پجاری ہیں۔ آہ...... آپ کا کردار کیا ہے یہ میں نہیں جانتا، لیکن وہ آپ کو اپنے کسی خاص مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو بتاؤں کہ شاید آپ ریتھا سے محبت کرتے ہیں، لیکن وہ آپ سے محبت نہیں کرتی۔ ان لوگوں کے پاس نوجوان لوگوں کو پھنسانے کے لیے ان گنت خوب صورت اور جوان لڑکیاں ہیں جو اپنا اس سوسائٹی کے لیے سب کچھ کرتی ہیں۔ صرف ریتھا ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سی لڑکیاں۔ آپ کے قرب و جوار میں مکھیوں کی طرح بھنبھنائیں گی۔ آپ ایسا کیجیے ان میں سے کسی بھی عورت کو بہ حیثیت عورت استعمال کرنے کی دعوت دیجیے آپ دیکھ لیجیے کہ کوئی بھی انکار نہیں کرے گی۔"

"آخر تمہیں ان باتوں کا شبہ کیسے ہوا؟"

"میں آپ کو بتاچکا ہوں کہ ریتھا میری بہن ہے وہ ان کے گروہ میں شامل ہے۔ دنیا کی ہر چیز کا نشہ کرتی ہے وہ۔ اس کا کردار بے حد پراسرار ہے۔ ایک دو دفعہ مجھے بھی اس گروہ میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر میں نہیں پھنسا۔ ابھی مجھے ان کے گروہ کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوسکی ہے اور اسی بنا پر انہوں نے مجھے زندہ چھوڑ رکھا ہے ورنہ وہ کسی ایسے شخص کو زندہ نہیں چھوڑتے جو معلومات حاصل ہونے کے بعد ان کی سوسائٹی میں شامل نہ ہو۔ ریتھا کو بھی میں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ گردن تک دلدل میں پھنس چکی ہے۔ اب میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ مجھے اپنا بھائی بھی نہیں کہتی۔"

"میں سمجھ گیا تھا کہ آپ کو پھانسا گیا ہے اور اس کے بعد آپ کا جھگڑا فیلر سے ہوا۔ وہ آپ کے گرد صرف ایک جال پھیلا رہے ہیں اور اس کا آخری ثبوت یہ زنجیر اور انگوٹھی ہے۔"

"فیلر کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟"

"فیلر بہت بڑا اسمگلر ہے۔ اس کا پردھان پرسو سے جھگڑا چلتا رہتا ہے۔ جھگڑے کی نوعیت کا مجھے علم نہیں ہے، لیکن فیلر سوسائٹی کی لڑکیوں کو اسمگلنگ کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے بہرطور آپ دو خطرناک گروہوں کے درمیان پھنسے ہوئے ہیں اور کہیں نہ کہیں سے نقصان اٹھا جائیں گے۔"

"مجھے تمہاری کسی بات کا اعتبار نہیں ہے، مگر فرض کرلو ایسا ہے تو اس صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"اگر جینا چاہتے ہو تو یہاں سے نکل بھاگیے۔ اسپین کو چھوڑ دیجیے اور کہیں دور چلے جایئے۔ ریتھا یا ریشی آپ کی منزل نہیں، وہ تو آپ کو سینکڑوں حسین لڑکیاں فراہم کرسکتے ہیں۔"

"اب تم بکواس زیادہ نہیں کررہے؟" کامران نے کہا۔

"آپ کی مرضی۔ یہ میرا فرض تھا۔ اب باقی آپ جانیں اور آپ کا کام، مگر میری باتوں پر غور ضرور کرلیجیے۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ۔ تم نے شجیرہ نامی کسی عورت کو دیکھا ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا تم گرشک اور سیتا کو جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"ٹھیک۔ میں تمہاری باتوں پر غور ضرور کروں گا۔"

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔ میں نے انسانی ہمدردی کی بنا پر آپ کو ان تمام حالات سے آگاہ کردیا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ اس نے کہا۔ کامران دروازہ بند کرکے صوفے پر آ بیٹھا۔ ایک عجیب سی بے چینی اس کے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔ جو کچھ رونی نے کہا تھا اس کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ لوگ بڑے ظالم، مکار اور سنگ دل ہیں اور ہر کام کر گزرتے ہیں، لیکن ابھی تک تو ایسا کوئی مسئلہ میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ ویسے میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ لڑکیوں کا بہت بڑا گروہ یکجا ہوگیا ہے، جن میں سے ایک سے ایک حسین لڑکی موجود ہے۔ صرف یہ بات ذرا سوچنے والی تھی۔ ریتھا بھی بے حد پیاری لڑکی تھی اور باقی دوسری لڑکیاں بھی بے ضرر ہی لگتی تھیں۔ اب رہ گیا پردھان پرسو تو بے شک وہ ایک بدشکل اور بدنما انسان تھا، مگر اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ وہ بہت قابل تھا۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات محسوس نہیں ہوئی تھی۔

اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ کامران کو کسی خاص مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی ایک احمقانہ بات تھی اور وہ خواب جو کامران نے عالم مدہوشی میں دیکھا تھا اور جس کے دھندلے دھندلے سے خاکے اس کے ذہن میں تھے لیکن کوئی مربوط خاکہ نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ خواب کیوں نظر آیا تھا۔ بہرحال ہوسکتا ہے کہ یہ رونی فیلر کا آدمی ہو اور فیلر کسی طرح کامران کا اس سوسائٹی میں شامل ہونا پسند نہ کرتا ہو۔ ہوسکتا ہے...... ہوسکتا ہے یقینی طور پر وہ شخص اپنی باتوں میں فیئر نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ان لوگوں کے پاس بہت سی خوب صورت اور جوان لڑکیاں ہیں جو بلاتکلف اپنے آپ کو پیش کردیتی ہیں۔

بہرحال یہ بات بھی غور کرنے والی تھی اور اگر پتا چلایا جائے تو پتا چل جائے گا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ جب وہ لوگ اس مکان سے واپس آرہے تھے تو ریشی گاڑی چلا رہی تھی اور ریتھا ضرورت سے زیادہ چپکی ہوئی تھی مگر دونوں بالکل مطمئن تھے۔ کامران نے آخری فیصلہ کیا کہ رونی کے الفاظ کو بالکل ہی غلط نہ سمجھ لیا جائے بلکہ اس سلسلے میں ذرا سی معلومات حاصل کرلینا ضروری ہے۔

ادھر اس نے فیلر کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ غرض یہ کہ وہ دیر تک سوچتا رہا اور پھر اچانک اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے اپنے لباس کو ٹٹول کر دیکھا۔ اس لباس میں اسے کاغذ کا ایک ٹکڑا ملا وہ کسی رائٹنگ پیڈ کا آدھا حصہ تھا اور اس پر ایک عبارت درج تھی۔ عبارت میں لکھا ہوا تھا۔

"مسٹر کامران جس طرح بھی ممکن ہو آپ کل رات نو بجے مجھ سے ضرور آ کر ملیں۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں کیونکہ میں ہر طرف سے خطروں میں گھری ہوئی ہوں۔ آپ مجھے ان مصائب سے نجات دلاسکتے ہیں۔ براہ کرم مجھ سے ضرور ملیے۔ یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ پلیز! مسٹر کامران آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس کے بعد ایک مختصر سا پتا لکھا ہوا تھا۔ کامران شدید الجھن میں گرفتار ہوگیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ پرچہ کہاں سے اس کی جیب میں آگیا۔ اس میں جو تاریخ درج تھی وہ گزرے ہوئے دن کی تھی۔ ابھی نو بجنے میں بہت دیر باقی تھی۔ گویا اس ملاقات کی خواہش

آج ہی تحریر کی گئی ہے۔ کامران نے فوری طور پر لباس تبدیل کیا۔ باہر نکل آیا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو وہ پتا بتا دیا جو پرچے پر تحریر تھا۔ ڈرائیور نے گردن ہلائی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ ایک ناقابل فہم ایسی بے چینی کامران پر مسلط ہوگئی تھی۔ خدا خدا کر کے وہ اپنی منزل پر پہنچا اور ٹیکسی چھوڑ کر پیدل چل پڑا جو پتا اس کو بتایا گیا تھا۔ اسے تلاش کرنے میں اس کو کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ یہاں فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ نیچے دکانیں اور اوپر کی منزل میں رہائش۔ اسٹریٹ سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ مطلوبہ جگہ تلاش کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور پھر اس نے وہ عمارت تلاش کرلی جس کا پتا دیا گیا تھا۔ یہ ایک پرانی دو منزلہ عمارت تھی۔ نیچے دکانیں تھیں اوپر فلیٹ۔ کامران نے ادھر ادھر دیکھا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچ کر اس نے آخر کار بائیں طرف کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کال بیل نظر نہیں آ رہی تھی۔ تین چار منٹ تک وہ دروازہ کھٹکھٹاتا رہا، لیکن شاید اندر کوئی نہیں۔ کامران کو کچھ عجیب سا احساس ہونے لگا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے جو خطرے میں ہے اور اس نے کامران سے مدد مانگی ہے۔ ایک بار پھر اس کا ہاتھ دروازے پر جا پڑا اور اس نے محسوس کیا کہ دروازہ بند نہیں ہے۔ اس نے دروازے پر دباؤ ڈالا، وہ کھلا ہوا تھا۔ کامران اندر داخل ہوگیا۔ دیوار کو ٹٹول کر سوئچ بورڈ تلاش کیا اور بتی جلا دی۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا البتہ افراتفری کے آثار تھے۔ چیزیں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ وہ حیرت سے دوسری چیزوں کو دیکھتا ہوا پیچھے کمرے میں داخل ہوا اور بتی جلا دی۔ کمرے میں روشنی پھیلتے ہی اسے وہ لاش نظر آئی جو کمرے کے درمیان میں پڑی تھی۔ یہ ایک خوب صورت لڑکی کی لاش تھی اور کامران کو ایک لمحے میں اندازہ ہوگیا کہ انہی پانچوں لڑکیوں میں سے ایک تھی، جن کی ملاقات اس سے ہوچکی تھی۔ لڑکی کا گلا ایک کان سے لے کر دوسرے کان تک کٹا ہوا تھا۔ کامران سکتے میں کھڑا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں۔ وہ خود کو ایک پتھر کے بے جان بت کی طرح محسوس کر رہا تھا پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کمرے کا جائزہ لیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے لڑکی نے مرنے سے پہلے شدید جدوجہد کی ہو۔ ایک بار پھر کامران کی نگاہیں اس کی لاش پر جم گئیں۔ لڑکی کے بدن پر ایک مختصر سا لباس تھا۔ اچانک کامران کا دھیان ایک ایسی جگہ گیا کہ دہشت سے اس کا سارا بدن کانپ گیا۔ لڑکی کا گلا ایک کان سے دوسرے کان تک کٹا ہوا تھا لہٰذا اس کے جسم کا سارا خون فرش پر ہونا چاہیے تھا۔ مگر فرش پر خون کے صرف چھوٹے چھوٹے دھبے تھے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس سے زیادہ حیرت ناک بات اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔ آخر اس کے بدن کا سارا خون کہاں گیا۔ یہ منظر اس قدر دہشت ناک تھا کہ کامران اعصابی طور پر کچھ دیر کے لیے مفلوج ہوگیا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے ایک کرسی پڑی ہوئی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں لڑکی کے کٹے ہوئے گلے کو دیکھ رہی تھیں۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔

پھر سب سے پہلا خیال جو اس کے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ کہیں کوئی اس وقت اندر آ نہ جائے۔ اس نے کتنی ہی بار جانور ذبح ہوتے ہوئے دیکھے تھے جب ان کا گلا کٹتا تھا تو خون کا فوارہ ابل پڑتا تھا۔ لڑکی کا گلا بھی بالکل اسی طرح کٹا ہوا تھا لیکن قالین پر صرف چند چھوٹے بڑے دھبے تھے، حالانکہ لاش کے ہر حصے سے پتا چلتا تھا کہ اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔

پھر آخر یہ سب کیا تھا؟ دفعتاً ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اگر وہ تھوڑا سا پہلے پہنچ جاتا تو شاید

لڑکی زندہ ہوتی۔ پتا نہیں اس نے نو بجے کا وقت ہی کیوں مقرر کیا تھا۔ کیا اسے یہ معلوم تھا کہ نو بجے کے بعد اسے ہلاک کردیا جائے گا۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ اسے کس نے قتل کیا۔ ایک ہی خیال ذہن میں آتا تھا۔ فیلر اور فیلر۔"

لیکن فیلر تو اسپتال میں ہے۔ یہ کام اس کے کسی ساتھی نے ہی انجام دیا ہوگا، لیکن آخر اس نے یہ قدم کیوں اٹھایا۔ اچانک کامران کو رونی کا خیال آیا۔ رونی نے کہا تھا کہ فیلر ایک اسمگلر ہے اور اس مقصد کے لیے وہ لڑکیوں کو استعمال کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ کامران کے ذہن میں اجالا پھیلنے لگا۔ یہ لڑکی کسی مجبوری کی کے تحت ہی فیلر کے گروہ میں شامل ہوئی ہوگی۔ شاید وہ فیلر کے گروہ کو چھوڑنا چاہتی ہو۔ اس نے اسی بنا پر کامران کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی اور فیلر کو اس کا علم ہوگیا ہو۔ اس کے سوا اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اچانک ہی کامران کے اندر ایک آواز جاگی۔

"نہیں...... اس کے خون کا حساب ضرور لیا جائے گا۔ فیلر کو اس کے خون کا حساب دینا ہوگا۔"

اب اس کے بعد اسے ایک دم یہ احساس ہونے لگا کہ یہاں سے نکل جانا بہت ضروری ہے۔ اگر پولیس پہنچ گئی تو پھر کچھ بھی کہا جائے پولیس اس بات پر یقین نہیں کرے گی کہ اس کا قاتل میں نہیں ہوں۔ وہ تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔ گلی پار کی، حسب معمول یہ سڑک یا گلی سنسان پڑی تھی اور اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ کسی نے کامران کو وہاں جاتے یا واپس آتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ وہاں سے واپس چل پڑا۔ اس منظر نے اسے اعصابی طور پر سخت پریشان کردیا تھا۔ وہ وہاں سے آگے بڑھا اور تنہائی اور سکون کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ ان کشیدہ اعصاب کو سہارا دینے کے لیے کوئی کام ہونا چاہیے تھا۔

ایک جگہ سے ایک بیوٹی سیلون کا بورڈ نظر آیا اور اس نے اس کا رخ کیا۔ اندر داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ بھی ایک شناسا لڑکی تھی اور اس کا نام لیرا تھا۔ اس دوران جن لڑکیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی تعداد اچھی خاصی تھی اور کامران کی ان سے شناسائیاں بھی ہوگئی تھیں۔ لیرا نے بھی اسے پہچان لیا۔

"ارے تم!...... ٹھہرو ایک منٹ میں آتی ہوں۔" پھر ایک منٹ سے کم وقفے میں سیلون کے برابر والے کمرے میں روشنی ہوئی۔ دروازہ کھلا اور لیرا کی آواز سنائی دی۔

"آؤ اندر آؤ۔" لیرا نے ایک مختصر نائٹی پہن رکھی تھی جو بہ مشکل نصف کولہوں تک پہنچ رہی تھی۔ ٹانگیں بے لباس تھیں اور بدن کے اوپری حصے میں اس نے نائٹی کے نیچے کچھ نہیں پہن رکھا تھا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر کے لاک کردیا اور بولی۔

"آؤ۔" آخر میں اس کمرے میں پہنچ گیا جو اس کا بیڈ روم معلوم ہوتا تھا۔

بہت سلیقے سے آراستہ کمرا تھا قالین، صوفہ سیٹ، کامران بے جان سا ہو کر ایک صوفے پر گر پڑا۔ لیرا سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اب تو نہ اسے کچھ بتانے کی ضرورت ہے اور نہ اسے مجھ سے کچھ پوچھنے کی۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر اس کے بعد اس نے خود ہی کہا۔

"اب بتاؤ۔ کیا بات ہے۔ تم بہت پریشان دکھائی دیتے ہو۔"

"ہاں۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"کیوں؟"

"کیا تم اس لڑکی کو جانتی ہو جو تمہارے ساتھ تھی۔ بوٹے سے بدن کی درمیانہ بدن والی لڑکی۔"

"شگی کے بارے میں تو نہیں کہہ رہے تم؟"

"ہوسکتا ہے اس کا نام شگی ہو۔ وہ آج کل فیلر کے ساتھ دکھائی دیتی تھی۔"

"ارے ہاں۔ وہ شگی ہی ہے۔"

"تم اس کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں، سوائے اس کے کہ وہ ہمارے گروپ کی ممبر ہے۔ تھوڑے عرصے پیشتر کہیں اور سے آئی تھی۔ اس کی ملاقات فیلر سے ہوئی اور وہ فیلر کی دوست بن گئی۔ ریتھا کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد فیلر ویسے بھی اکیلا رہ گیا تھا۔"

"تمہیں فیلر کے بارے میں اور کچھ معلوم ہے۔ وہ کیا کرتا ہے؟"

"مگر تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اگر مناسب سمجھو تو بتا دو۔"

"میں خود بھی اچھی طرح نہیں جانتی، لیکن عام خیال یہی ہے کہ وہ اسمگلر ہے اور لڑکیوں سے دوستی اس لیے کرتا ہے کہ ان سے اسمگلنگ کا کام لینا چاہتا ہے۔ ریتھا بھی اس کے لیے یہی کام کرتی تھی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اس کے چنگل سے نکل بھاگی۔ ہوسکتا ہے وہ لڑکی شگی بھی اسی کام کے لیے استعمال ہوتی ہو۔" ایک لمحے تک کامران سوچتا رہا کہ اسے شگی کی موت کے بارے میں بتائے یا نہیں۔ پھر اس نے کہا۔

"شگی کو قتل کردیا گیا۔"

"کب......؟" اس نے چونک کر کہا۔

"یہ نہیں پتا، لیکن وہ اپنے فلیٹ میں مردہ پڑی ہوئی ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ!...... وہ تو بہت اچھی لڑکی تھی۔"

"ہاں۔ کسی نے بے دردی سے اس کا گلا کاٹ ڈالا۔"

"مگر تمہیں اس بارے میں کیسے معلوم؟"

"میں اس کے فلیٹ پر گیا تھا۔ اسے اپنی جان کا خطرہ تھا اور اس نے مجھے بلایا تھا کہ شاید میں اس کی جان بچا سکوں، لیکن شاید مجھے دیر ہوگئی۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ مرچکی تھی اور اس کا گلا ایک کان سے دوسرے کان تک کٹا ہوا تھا۔"

"ریتھا نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا فیلر سے جھگڑا ہوا اور جھگڑے کا سبب شاید وہ لڑکی شگی تھی۔"

"ہاں۔ یقینی طور پر۔"

"مگر اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ تم نے اپنی طرف سے کوتاہی نہیں کی۔ تم تو اس کی مدد کرنا چاہتے تھے مگر وہ خوف زدہ کیوں تھی؟"

"اور کس سے تھی؟" کامران نے کہا۔

"ان دنوں وہ فیلر کے ساتھ دیکھی جاتی تھی۔ وہ بڑا ظالم اور کمینہ آدمی ہے۔ ممکن ہے کسی بات پر شگی

سے ناراض ہوگیا ہوگا۔ کامران نے گردن گھما کر لیرا کو دیکھا۔ اس کا چہرہ تپ رہا تھا پھر وہ بولی۔

"یقیناً وہ فیلر سے ہی خوف زدہ تھی۔"

"اور ممکن ہے وہ فیلر کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہو۔" کامران نے کہا۔

"بالکل اور فیلر کو اس پر شبہ ہوگیا اور اس نے اسے خاموش کردیا۔"

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"کیا......؟"

"وہ بات بڑی عجیب اور دہشت ناک ہے۔ شگی کی لاش کے پاس خون کی مقدار بہت کم تھی حالانکہ وہاں خون کا سمندر ہونا چاہیے تھا۔"

"ہوسکتا ہے وہ خون کی کمی کی مریضہ ہو۔"

"مگر اس کی صحت تو بڑی اچھی تھی۔"

"تمہارے اعصاب بہت بری طرح کشیدہ ہوگئے ہیں۔ تم بہت پریشان لگ رہے ہو۔ میرے قریب آؤ۔ میں تمہیں سکون دوں گی۔" اس نے کہا اور آگے بڑھ کر کامران کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ اس کے چہرے پر ایک دل فریب مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ کامران تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اور اس کے بعد وہ لیرا کے بستر پر جا لیٹا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ ویسے یہ بیڈروم بہت شان دار تھا۔ فرش پر دبیز قالین، سنگھار میز اور بہت ہی خوب صورت قسم کا بیڈ۔ ہر طرح سے یہ خوب صورت مجسمہ تھا۔ اس کے علاوہ یہاں ایک شاندار شوکیس رکھا ہوا تھا اور شوکیس میں ایک چیز رکھی تھی۔ ایک غیر یقینی چیز جو بار بار کامران کے سامنے آرہی تھی۔ بدھ کا خوب صورت سنہرا مجسمہ ویسا ہی مجسمہ جیسا اسے پردھان پرسو کے گھر میں نظر آیا تھا۔ لیرا تھوڑی دیر کے بعد آگئی اور اس نے کہا۔

"کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔"

"کتنی ضرورتیں پوری کروگی تم؟"

"جتنی تمہاری ضرورت ہوگی۔ ہم سب تمہاری ضرورتیں پوری کریں گے۔" اچانک ہی کامران کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس نے ایک آواز سنی تھی۔ صاف اور واضح۔ وہم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس آواز کے کہے ہوئے الفاظ سو فی صدی لیرا کے نہیں تھے۔ اس نے کہا تھا۔

"ہم سب تمہاری ضرورتیں پوری کریں گے۔" کہتے ہوئے ہونٹ تو بے شک لیرا کے ہی ہلے تھے مگر آواز کسی اور کی تھی۔ یہ کیسی آواز ہے......؟ کیسی آواز ہے یہ......؟ کامران کو احساس ہوا کہ یہ شجیرہ کی آواز ہے۔ ہاں یہ شجیرہ کی آواز ہی تھی۔ ایک بار پھر کامران کے ذہن پر ایک دھندسی چھا گئی۔ جس طلسمی جال میں وہ پھنسا تھا اس سے پہلے کے حالات ایسے نہیں تھے۔ اب تو یوں لگتا تھا جیسے کسی خوف ناک طلسم نے اسے جکڑ لیا ہو۔ حسن شاہ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے۔ یہاں تو کھیل ہی نیا شروع ہوگیا تھا۔ جن حالات میں وہ جکڑا گیا تھا اس کے بعد تو اسے اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ اب تو اس کا اسپین سے نکلنا بھی ایک کام ہی ہے۔ آہ...... کاش میں یہاں سے نکل سکوں۔ اس نے سوچا۔ ابھی وہ انہی سوچوں میں گم تھا

کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ وہ سمجھا کہ لیرا آ گئی ہوگی، لیکن وہ لیرا نہیں ریشی تھی۔ ریشی ریتھا کی ساتھی۔ گڑیا جیسی حسین عورت اور ان عورتوں کے بارے میں رونی نے بڑی تفصیل بتائی تھی۔

''ہیلو۔'' ریشی کی آواز ابھری۔

''ہیلو۔'' کامران نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا پھر چونک کر بولا۔

''تم......تم یہاں......ریتھا کہاں ہے؟''

''جہاں بھی ہے پُرسکون ہے۔ مجھے لیرا نے بلایا تھا کہ تمہاری دیکھ بھال کروں۔ وہ اپنے بیوٹی سیلون میں ہے۔''

''تم سب ایک دوسرے سے واقف ہو۔''

''ہاں کیوں نہیں۔ ایک گروپ ہے ہمارا۔ بہرحال سناؤ رات کیسی گزری۔ لیرا کا کہنا ہے کہ تم ایک پُرکشش نوجوان ہو۔''

''کیا مطلب؟'' کامران نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا اور ریشی عجیب سے انداز میں مسکرادی۔ کامران کو یاد آ گیا کہ رات کو اسے آخری ہوش اس وقت کا تھا جب اسے شجیرہ کی آواز سنائی دی تھی اور اس کے بعد خاموشی۔ ریشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''خیر اچھا اب تم یہ بتاؤ۔ تمہارے لیے ناشتہ تیار کروں۔ ویسے تم نے اخبارات دیکھ لیے۔''

''اخبارات......نہیں، کیوں؟''

''کامران تم بہت بری طرح مصیبت میں پھنس گئے ہو؟''

''ہوا کیا......؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔'' کامران نے کہا اور ریشی نے چند اخبارات کامران کے سامنے کر دیے۔ ان اخبارات میں شگی کے قتل کی خبر شائع ہوئی تھی، لیکن تفصیلات زیادہ نہیں تھیں۔ اخبارات کے مطابق شگی کی لاش تقریباً پونے بارہ بجے دریافت ہوئی تھی اور یہ بھی پولیس کو ایک پُراسرار فون کال کے ذریعے بتایا گیا تھا کہ خون ہو گیا ہے اور پھر پتا چلا کہ فون بند کر دیا گیا تھا۔ پولیس موقع واردات پر پہنچ گئی اور پھر اسے شگی کی لاش ملی۔ پولیس کے بیان کے مطابق شگی کوئی آٹھ بجے اپنے فلیٹ میں واپس آئی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ پولیس کو چھوٹے چھوٹے کچھ سراغ ضرور ملے۔ انگلیوں کے نشانات وغیرہ بھی تھے۔

بہرحال کئی جگہ اس قسم کے نشانات تھے جس سے صرف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ اشارہ کامران کی جانب ہے۔ کسی اخبار نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا شگی کے جسم سے بہت کم مقدار میں خون نکلا ہے۔ واقعی ریشی کا کہنا بالکل درست تھا۔ اس وقت کامران بری طرح مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب تم کیا کرو گے؟''

''میں نہیں جانتا، البتہ یہ بات طے ہے کہ یہ سازش فیلر کی ہے۔''

''محتاط رہنا ہوگا۔ فی الحال لیرا کا یہ فلیٹ تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔ ابھی آئی میں ناشتہ لے آؤں۔ تھوڑی دیر بعد وہ ناشتہ لے آئی۔ پھر اس کے بعد سارا دن کامران نے لیرا کے بیڈروم میں ہی گزارا۔ شام کے اخبارات آئے تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی تھی۔ شگی کی موت ہی صفحہ اول کی زینت بنی ہوئی تھی

اور اس بار پولیس نے کامران کے بارے میں خاصی نشان دہی ظاہر کر دی تھی یعنی ایک ایسے نوجوان کو پُراسرار طریقے سے مختلف جگہوں پر دیکھا جا رہا تھا پھر ایک اور سنسنی خیز اطلاع ملی، جس نوجوان پر شبہ تھا اس کی رہائش گاہ پر چھاپا مارا گیا تو وہاں کاغذ کا ایک ٹکڑا ملا، جس پر شگی نے اسے اپنی مدد کے لیے بلایا تھا۔ قاتل کا نام کامران اور ایک ایشیائی نوجوان بتایا گیا تھا۔ پولیس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ کامران شگی کے فلیٹ پر پہنچا اور اسی دوران دونوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا جس پر مشتعل ہو کر کامران نے شگی کو مار ڈالا۔

بہرحال شام کو ریتھا وغیرہ یہاں آ گئی۔ ریشی اور دوسری دو لڑکیاں بھی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ پولیس کامران کی تلاش میں اسپین کے گلی کوچوں میں ماری ماری پھر رہی ہے، اس لیے کامران کو باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ اس کے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اس لیے یہ جگہ بھی اس کے لیے خطرناک ہوگئی ہے۔

''تو آخر میں کہاں جاؤں؟'' کامران نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ریتھا نے دوسری لڑکی کی طرف دیکھا اور دوسری سے تیسری کی طرف پھر لیرا ہمدردی سے بولی۔

''ہم تمہیں شہر سے باہر ایک ایسی جگہ لے جائیں گے جہاں تمہیں تلاش نہیں کیا جا سکے گا۔''

''تو کیا اب مجھے قیدی کی حیثیت سے زندگی گزارنا ہوگی۔''

''تو پھر......؟''

''میں فیلر کو تلاش کرنا چاہتا ہوں۔'' کامران نے جواب دیا۔ وہ سب ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگیں۔ پھر لیرا نے کہا۔

''خیر!......فی الحال تو تم یہاں رکو۔ یہاں کی پولیس بہت تیز ہے۔ وہ ہر جگہ تمہاری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔ ہر قیمت پر تمہیں یہاں سے منتقل ہونا پڑے گا۔'' تھوڑی دیر تک وہ یہاں موجود رہیں اور اس کے بعد چلی گئیں۔ کامران سخت ہیجانی کیفیت کا شکار تھا۔ ایک بار پھر وہ اخبار اٹھا کر شگی کی موت کی خبریں پڑھنے لگا۔ اخبارات نے بہت سی سرخیاں لگائی تھیں۔ قاتل کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کی گئی تھیں۔ اخبارات پر نگاہ ڈالتے ہوئے دفعتاً ہی کامران کی نگاہ ایک چھوٹے سے اشتہار پر پڑی اور دفعتاً ہی اس کے پورے جسم میں شدید سنسنی دوڑ گئی۔ اس نے اس چھوٹے سے اشتہار کو آنکھیں پھاڑ کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

تنہائیوں کا ساتھی!

میرا عزیز ترین دوست، میرا محسن، میرا پیارا

جسے نہ جانے کب سے تلاش کر رہا ہوں میں، اگر وہ اس اشتہار کو پڑھ لے تو مجھے اس ٹیلیفون نمبر پر فون کرے۔

حسن شاہ

کامران کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ یہ حسن شاہ کا ہی دیا ہوا اشتہار تھا۔ اسے ایک دم اپنے اندر سے خوشی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ حسن شاہ بہت سی مشکلوں کا حل میری لاتعداد الجھنوں کا ساتھی آہ۔ موت کے بھیانک گڑھوں میں جاتے ہوئے اچانک ہی کامران کو زندگی کا احساس ہوا تھا اگر حسن شاہ مل جائے تو بہت

سے جھگڑوں سے نجات مل سکتی ہے۔ کامران نے لرزتے ہوئے بدن کے ساتھ چاروں طرف دیکھا۔ ایک طرف ٹیلیفون رکھا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے ٹیلیفون کی جانب بڑھ گیا، لیکن پھر اس نے کسی خیال کے تحت کمرے سے باہر نکل کر دیکھا۔ اب یہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے وہ ٹیلی فون تک آیا اور اس کے بعد اس نے اخبار میں دیے گئے نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیے۔ یوں لگتا تھا جیسے حسن شاہ فون کے قریب بیٹھا ہوا ہو۔ جیسے ہی آخری نمبر ڈائل ہوا فون کی بیل ہوئی اور پھر فوراً ہی دوسری طرف سے فون اٹھالیا گیا۔

''ہیلو......کون بول رہا ہے؟''

''وہ جسے نہ جانے کب سے تمہاری آواز کا انتظار تھا۔ کہاں ہو۔ کیا کر رہے ہو؟''

''حسن شاہ جس اخبار میں تم نے اشتہار دیا ہے اسے پڑھا۔''

''ہاں اور اس شبہے کا شکار ہوں کہ تمہارا حوالہ دیا گیا ہے۔''

''بالکل ٹھیک۔ اب بتاؤ میں کیا کروں؟''

''کچھ نہیں۔ مجھے بتاؤ، اس وقت کس جگہ ہو؟''

''کیا فون ٹریس نہیں کیا جا رہا ہوگا؟''

''اگر کیا بھی جا رہا ہے تو فکر مت کرو۔ میں تمہیں وہاں سے نکال لاؤں گا۔''

''تو پھر پتا نوٹ کرو۔'' میں نے کہا اور لیرا کے فلیٹ کا پتا بیوٹی سیلون کے پتے کے ساتھ بتا دیا۔ اب یہ رسک تو لینا ہی تھا۔ پولیس جن بھوت نہیں ہوتی کہ لمحوں کے اندر پہنچ جائے۔ اس سے پہلے میں اپنی حفاظت کا بندوبست کرلوں گا۔ اگر پولیس فون کو ٹریس بھی کر لیتی ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ حسن شاہ نے کہا۔

''میں نیلے رنگ کی ڈاج میں آ رہا ہوں جو بیوٹی سیلون کی سامنے والی سڑک پر تمہارا انتظار کرے گی۔ بے فکر رہو تمہارے لیے میں قتل عام کر دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں پہنچتا ہوں۔ تم جتنی جلدی ممکن ہو سکے آ جاؤ۔''

''خدا حافظ۔'' حسن شاہ نے کہا۔

''کامران کے بدن میں بجلیاں بھر گئی تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اچانک ہی وہ ہر طرح کے طلسم سے آزاد ہو گیا ہو۔ اس وقت لیرا وغیرہ کو بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس نے پھرتی سے جوتے وغیرہ پہنے، اپنا حلیہ سنوارا اور پھرتی سے لیرا کے فلیٹ کے بغلی حصے سے باہر آ گیا۔ فلیٹ میں ایک راستہ پچھلی سمت بھی نکلتا تھا۔ گو ادھر سے گلی بہت لمبی تھی، لیکن وہ تیزی سے اس گلی کو عبور کر کے اس کے سرے پر پہنچ گیا۔ پھر ایک لمبا چکر لگا کر بیوٹی سیلون کے سامنے والے حصے میں عام اور کشادہ سڑک تھی۔ کامران اپنے لیے کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں وہ چھپ کر حسن شاہ کا انتظار کر سکے اور اس کے لیے اسے تھوڑا سا آگے جانا پڑا۔ یہاں ایک دکان بنی ہوئی تھی جس کی شاید مرمت ہو رہی تھی۔ خاصا کاٹھ کباڑ دکان کے سامنے پڑا ہوا تھا۔ وہ اس کی آڑ میں جا کھڑا ہوا۔ پھر اسے کھڑے ہوئے تین منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے کہ ایک لمبی چوڑی بغیر چھت والی ڈاج آتی ہوئی نظر آئی۔ حسن شاہ ڈاج میں بیٹھا ہوا تھا۔ کامران اپنی جگہ سے آگے نکل آیا اور اس نے حسن شاہ کی طرف ہاتھ ہلایا۔

حسن شاہ بھی پوری چالاکی کے ساتھ ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ بیوٹی سیلون اس نے دیکھ لیا تھا۔ حالانکہ کامران کا وہاں سے خاصا فاصلہ تھا لیکن حسن شاہ جانتا تھا کہ کامران بیوٹی سیلون کے آس پاس ہی ہوگا۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی کامران کو دیکھ لیا تھا۔ ڈاج اس کے پاس آ کر رکی اور کامران نے اوپر ہی سے اندر چھلانگ لگا دی۔ حسن شاہ نے برق رفتاری سے ڈاج آگے بڑھا دی تھی۔ پولیس کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

کامران کو بڑی ڈھارس ہوئی تھی، جس طرح وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا تھا وہ بہت ہی پریشان کن کیفیت تھی، لیکن اب حسن شاہ کے مل جانے کے بعد اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت پرسکون ہو۔ ڈاج شہری آبادی سے باہر نکل آئی اور پھر ایک انتہائی نواحی قصبے میں حسن شاہ نے اسے ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے روک دیا۔ کامران نے مکان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بڑی پرفضا جگہ ہے۔ تمہیں کہاں سے حاصل ہوئی؟''

''یہ بھی پروفیسر جوگندر کی ملکیت ہے۔ انہوں نے دیہی رہائش گاہ کے طور پر اسے اپنے لیے بنا رکھا ہے۔ جب بھی شہر کی ہنگامہ آرائیوں سے تھک جاتے ہیں۔ یہاں آ جاتے ہیں۔''

''پروفیسر جوگندر......؟''

''ہاں۔ ایک ماڈرن سادھو جنہیں دنیا کی ستائیس زبانوں پر اسی طرح عبور حاصل ہے جس طرح وہ اپنی مادری زبان بولتے ہیں۔ میں ان سے تمہارا تفصیلی تعارف کراؤں گا۔ ان دنوں وہ ڈسکا پاہی میں ہیں۔
حسن شاہ کامران کو اندر لے گیا۔ ایک چھوٹے سے خوش نما اور خوش ذوق شخصیت کے مالک کا شخص جس طرح کا ہو سکتا تھا اس طرح پروفیسر جوگندر کا یہ مکان تھا جو مکمل طور پر حسن شاہ کی تحویل میں ہی تھا۔''

''مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم خاصے پریشان رہے ہو۔ تمہارے چہرے پر تھکن منجمد ہے، چنانچہ مناسب سے پہلے یہ کہوں گا کہ غسل خانے میں جاؤ۔ غسل کرو۔ کچھ کھانا چاہو تو میں انتظام کروں۔ کچن میں دنیا جہان کی چیزیں موجود ہیں۔ پھر سو جاؤ اور اس وقت تک سوتے رہو جب تک کہ تمہارے جسم کے روئیں روئیں سے تھکن نہ نکل جائے۔ ہماری باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ اخبار میں جو کچھ پڑھا ہے میں نے، اس کی طرف سے بھی بے فکر ہو جاؤ۔ یہاں تمہیں کسی قسم کی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

''کچھ کھانا چاہتا ہوں۔''

''میں بندوبست کرتا ہوں۔ چلو جاؤ، غسل خانے میں جاؤ۔ میں تمہارے لیے لباس دیتا ہوں۔''

''اوہو......کیا لباس یہاں موجود ہے؟'' کامران نے سوال کیا۔

''میں نے کہا نا بڑے اچھے انتظامات کر رکھے ہیں میں نے یہاں۔'' حسن شاہ پہلے بھی حیرت انگیز ہی ثابت ہوا تھا۔ رانا چندر سنگھ کی ناک کا بال تھا اور رانا چندر سنگھ بھی کسی معمولی شخصیت کا مالک نہیں تھا۔
کامران کو اس بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ جدید طرز کا غسل خانہ جہاں جدید ترین غسل کے لوازمات کی تمام گنجائش موجود تھی۔ حسن شاہ کا دیا ہوا سلک کا کرتا پاجامہ جو کامران کی بہترین پسند تھا اور خوش قسمتی سے اس کے بدن پر بھی اس طرح آ گیا تھا جیسے اسی کے لیے بنایا گیا ہو۔ ویسے بھی اس کی اور حسن شاہ کی جسامت ایک جیسی ہی تھی، پھر اس کے بعد حسن شاہ کی پہلی خاطر مدارات اعلیٰ درجے کے سینڈوچز کچھ دوسرے

لوازمات اور انتہائی نفیس برازیل کی کافی۔"

"یار اس جنت کا کیا نام ہے؟"

"قورانی۔" حسن شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنی کافی کے سپ لینے لگا پھر بولا۔

"بعد میں تفصیلی گفتگو ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مکمل طور پر آرام کرو۔ کسی بھی موضوع پر کوئی بھی بات نہیں کرنی ہے ابھی۔ میں نے دل ہی دل میں حسن شاہ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ واقعی شدید ترین ذہنی اور جسمانی تھکن کے بعد یہ لمحات میسر آ جانا میرے لیے ایک طرح سے نئی زندگی کا باعث تھا۔ حسن شاہ نے مجھے میرا بیڈ روم دکھا دیا۔ پردے کھینچے اور اس کے بعد دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ میں بستر پر لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ گزرے ہوئے واقعات انوکھی داستانیں، کیا ہے یار!...... یہ سب کچھ کیسے میری زندگی سے لپٹ گیا ہے۔

میں تو ایک سیدھا سادا شہری تھا پھر کامران نے ایک اور فیصلہ کیا۔ دنیا میں کسی نہ کسی پر تو بھروسا کرنا ہی ہوتا ہے۔ گرشک اور سیتا سے کہانی کا آغاز ہوا تھا۔ یعنی ان پراسرار واقعات کا پھر کرنل گل نواز نے اسے ان واقعات میں الجھا لیا تھا۔ حسن شاہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، لیکن اس قدر قابل اعتماد دوست دوسرا کوئی نہیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ حسن شاہ کو اپنا مکمل رازدار بنا لے گا۔ چاہے ان پراسرار قوتوں کو کوئی اعتراض ہی کیوں نہ ہو۔ کون سا ان سے میرا رشتہ ہے۔ اندازہ تو یہی ہوتا ہے کہ میں صرف زمانہ قدیم کے کسی پراسرار کردار کی ہم شکلی کی بنا پر ان مصیبتوں کا شکار ہو گیا ہوں۔ کامران نے آخری فیصلہ بھی کیا اور اس کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ نیند بھی ایسی مزے دار آئی کہ واقعی عضو عضو سے تھکاوٹ نکل گئی یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حسن شاہ نے ہی کوئی کارروائی کی ہو، اس گہری نیند کے لیے۔ جاگا تو روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ ہر طرف ایک مدھم مدھم سی خاموشی طاری تھی جیسے کوئی بولتے بولتے چپ ہو گیا ہو پھر دروازہ ذرا سا کھلا۔ حسن شاہ نے جھانک کر دیکھا تو کامران نے آواز دی۔

"جاگ گیا ہوں بھائی!"

"یہ پروفیسر جوگندر ہیں کون؟"

"ان کے نام سے ایک کہانی منسلک ہے۔ بڑی پراسرار قوتوں کا مالک ہے یہ شخص۔ رانا چندر سنگھ کا استاد سمجھ لو۔ اس نے خود ہی رابطہ کر کے وہاں سے پوچھا تھا کہ کیا رانا چندر سنگھ اسپین آیا ہوا ہے کیونکہ اس نے اسے وسکایہ میں دیکھا ہے لیکن کچھ لوگوں کے ساتھ پروفیسر جوگندر خود بھی وسکایہ میں ہی رہتا ہے۔ بہر حال میں تمہاری آمد کا منتظر تھا۔ میں نے اس سے رابطہ قائم کر لیا۔ اس نے کہا۔ جب بھی تم پہنچو میں تمہیں لے کر اس کے پاس آ جاؤں۔

"حسن شاہ! میں تو بڑی مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہوں۔" کامران نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"مجھے بتاؤ آخر قصہ کیا ہے؟"

"قصہ تو کرنل گل نواز کی کوٹھی سے ہی شروع ہو گیا تھا اور اس کے بعد جو کچھ ہم پر گزری ہے اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"اور یہ میں تم سے کہنے کا بالکل حق نہیں رکھتا کہ تم مجھے اپنی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں

بتاؤ، لیکن اگر مجھے بتا دو تو مجھ پر اعتماد ہوگا اور مجھے خوشی بھی ہوگی۔"

"ہاں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں تمہیں ساری تفصیل بتاؤں۔ کامران نے پہلے اپنے ماضی کے بارے میں اسے تھوڑا سا بتایا اور اس کے بعد اصل کہانی وہاں سے شروع کی جب اس نے گرشک اور سیتا کو کرنل گل نواز کی کوٹھی میں دیکھا تھا اور کرنل گل نواز نے گرشک اور سیتا سے ملاقات کا واقعہ بتایا تھا۔ حسن شاہ شدت حیرت سے منہ کھولے یہ کہانی سن رہا تھا اور اس کے بعد اس نے مکمل کہانی جوشیگی کے قتل تک آتی تھی، حسن شاہ کو سنائی۔ حسن شاہ جیسے تصویر حیرت بن گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کامران کو دیکھ رہا تھا، پھر اس نے کہا۔

"اور تم اس قدر گہرے انسان ہو۔ میں نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا لیکن میرے دوست اصل میں وقت اپنے فیصلے خود ہی خود کرتا ہے اور وقت کے فیصلے ہی درست ہوتے ہیں۔ اب تو انتہائی اشد ضرورت ہے کہ تم پروفیسر جوگندر سے ملو۔"

"پروفیسر جوگندر کا نام تم اس طرح سے لے رہے ہو حسن کہ میرے دل میں ان سے ملاقات کے لیے نہ جانے کتنا تجسس پیدا ہو چکا ہے۔ کون ہے یہ پروفیسر جوگندر!"

"مختصر الفاظ میں تمہیں اس کی تفصیل بتاتا ہوں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ میرا بچپن بلکہ میرے خاندان کا بچپن بھی رانا چندر سنگھ کے ساتھ ہی گزرا ہے۔ ہمارے ان کے ایک طرح کے خاندانی تعلقات تھے۔ میں نے بچپن سے رانا چندر سنگھ کو دیکھا ہے۔ بے شک اتنا بڑا آدمی ہے وہ کہ ہم اسے دوست تو نہیں کہہ سکتے، لیکن پھر بھی وہ ہمارے لیے دوستوں ہی کی طرح تھا۔ میری اور اس کی عمر میں بہت فرق ہے اور میں اس کی عزت کرتا ہوں۔"

"گڈ۔"

"تو میں اندر آیا جاتا ہوں۔" حسن شاہ اندر آ گیا۔ وہ کامران کو غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

"ہاں۔ اب ہوئی نا بات۔ چلو اب فٹافٹ منہ دھو لو اور یہ بتاؤ۔ ساڑھے سات بجے ہیں۔ چائے یا کافی پیو گے یا کھانا کھاؤ گے؟"

"اپنے آپ کو اس وقت اسی شکل میں فٹ رکھا جاتا ہے جب کوئی بوجھل کھانا نہ کھایا جائے اور کسی ہلکی چیز پر گزارہ کیا جائے۔"

"میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ بہت عمدہ قسم کا سوپ بنایا ہے تمہارے لیے اور پائن ایپل پائیز، مزہ آ جائے گا۔ ویسے میں تمہیں ایک بات بتا دوں کہ میں ایک بہترین کک ہوں۔ بے شمار کھانے پکانے جانتا ہوں، لیکن افسوس بتاتا نہیں ہوں کسی کو، کیونکہ پھر فرمائشیں میری شخصیت ہی بدل دیتی ہیں۔ سوائے رانا چندر سنگھ کے، جو خفیہ طور پر گوشت کی ڈشیں مجھ سے بنوایا کرتے تھے، کیونکہ خود وہ گوشت خور خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔" حسن شاہ نے کہا اور ہنس پڑا۔

کامران نے بھی اس ہنسی میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ نیند بھرپور طریقے سے پوری ہوئی تھی، اس لیے عضو عضو میں سرشاری تھی۔ حسن شاہ نے کہا۔

"اب یہ بتاؤ باہر سفر کرنا پسند کرو گے یا پھر......؟"

"نہیں۔ حسن شاہ کوئی ایسی خاص ضرورت محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ یہاں کا بھی موسم خوشگوار ہے۔"

"آؤ۔ اوپر چل کر بیٹھتے ہیں۔" حسن شاہ نے کہا۔

"مکان کی خوب صورت چھت پر سے دور دور تک کا نظارہ ہوتا تھا۔ گو اس وقت ماحول تاریکی میں ڈوب چکا تھا، لیکن پھر بھی دور دور تک کا منظر نظر آ رہا تھا۔ پہاڑیوں پر کہر اُتری ہوئی تھی اور ان کے دھندلے دھندلے خاکے نمایاں تھے۔ آبادی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس کا اندازہ روشنیوں سے ہو جاتا تھا۔ حسن شاہ نے کہا۔

"ہاں اب بتاؤ، یہ سارا چکر کیا چل گیا؟ میں تو اس بات کا منتظر تھا کہ تم میڈرڈ پہنچ جاؤ تو ہم دونوں یہاں سے وسکایا کا سفر کریں۔"

"وسکایا کیوں......؟"

"پروفیسر جوگندر کا خیال تھا کہ رانا چندر سنگھ اور کرنل گل نواز کو وسکایا ہی لایا گیا ہے۔"

"پروفیسر جوگندر سنگھ کا یہ خیال تھا۔"

"ہاں۔"

"میرے بھائی کے بارے میں شاید کبھی تم سے تذکرہ نہیں آیا۔ اس کا نام رحیم شاہ ہے۔ رحیم شاہ مجھ سے سوا سال چھوٹا ہے اور ان دنوں بھی چندا پور کے ایک چھوٹے سے خوب صورت علاقے میں رہتے تھے۔ ملی جلی ہندو مسلمان آبادی تھی۔ ہمارے گھر کے برابر ایک ہندو خاندان آباد تھا۔ رحیم شاہ کی دوستی اس ہندو خاندان کے نوجوان ست پرکاش سے تھی۔ ست پرکاش ایک متوسط درجے کے راجپوت گھرانے کا لڑکا تھا۔ باپ مر چکا تھا۔ بڑی بہن جسے ہم سب لوگ بڑی عزت اور مقام دیتے تھے۔ اس کا نام ریتو تھا۔ ریتو کے علاوہ اس گھر میں ان کی بوڑھی ماں تھی۔ باپ کی چھوڑی ہوئی زمین سے گھر کے اخراجات کے لیے آمدنی ہو جاتی تھی۔

پرانے طرز کا بہت بڑا مکان تھا جس کی ڈیوڑھی میں اکثر ہم سب ساتھ بیٹھ جایا کرتے تھے۔ رحیم شاہ کی زیادہ دوستی ست پرکاش کے ساتھ ساتھ موہنی سے بھی تھی۔ موہنی ست پرکاش کی چھوٹی بہن تھی اور ہم سب لوگ آپس میں گھلے ملے تھے۔ ہمارا اٹھنا بیٹھنا دو الگ مذہب کے فرد ہونے کے باوجود بہت ساتھ ساتھ تھا۔

پھر رحیم شاہ اور موہنی ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ تمام تہوار ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ عید ہوتی تو ست پرکاش کے گھر میں بھی عید ا ہوا کرتی تھی۔ ہمارا خاندان انہیں اپنے آپ میں پوری طرح شامل رکھتا تھا۔ ہولی یا دیوالی ہوتی تو ہم سارے کے سارے ساتھ ساتھ ہوا کرتے تھے۔ بہر حال موہنی رحیم شاہ سے محبت کرنے لگی تھی اور ان دونوں کا پیار دنیا کے جھگڑوں سے آزاد آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی محبت میں ڈوبتے چلے جا رہے تھے۔ ان لوگوں سے ملاقات تقریباً روزانہ ہی ہوتی تھی۔ میری سب سے بڑی بھابی کو ریتو سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے الگ رہا ہی نہیں کرتی تھیں اور اس طرح موہنی کو بھی آنے جانے کا موقع مل جاتا تھا۔ گھروں سے بھی خوب لین دین ہوا کرتا تھا۔ اُدھر سے بھی پکوان آتے اور اِدھر سے بھی ایسی چیزیں جو ہندو گھرانوں میں کھائی جا سکتی تھیں، بھجوائی جاتیں۔ سب ایک دوسرے کو دیکھتے، مسکراتے، چھیڑتے اور شرارتیں کرتے۔ اکثر میں نے رحیم شاہ اور موہنی کو ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھا تھا پھر اچانک موہنی کی ماں کا انتقال ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد حسن شاہ نے کہا۔

"رحیم شاہ نے گجن کماری کے بارے میں جو تفصیل بتائی وہ ناقابل فراموش تھی۔" اس نے بہت سی لفظوں میں مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

ست پرکاس کی ماں اور گجن کماری کا خاندان ایک تھا۔ وہ رشتے میں گجن کماری کی خالہ تھی لیکن چونکہ گجن کماری تمام رشتے داروں اور دوسرے لوگوں سے الگ تھلگ حویلی میں رہتی تھی اور کسی کا آنا جانا نہیں تھا اس لیے ست پرکاش کے گھر والوں نے بھی گجن کماری کو دوسری بار دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ وہ ست پرکاش کے باپ کی موت کے وقت آئی تھی اور دوسری بار اس کی ماں کی ارتھی پر۔ وہ دراز قد بلاشبہ راج کماریوں کی طرح حسین تھی۔

عمر خاصی تھی، کسی طرح چوبیس پچیس سے کم نہ ہوگی۔ قد نکلتا ہوا، چہرہ بیضوی اور رنگ سورج کی کرنوں کی طرح سنہرا۔ پتلے پتلے ہونٹ اتنے سرخ کہ لگتا تھا کہ لپ اسٹک لگی ہوئی ہے۔ بال سیاہ اور لانبے شانوں پر دو حصوں میں بکھرے ہوئے اور آنکھیں...... سحر زدہ ان میں جھانکو تو لگتا تھا کہ جانے کتنی گہرائیوں میں ڈوب جاؤ گے۔ میں نے ایک دو بار اسے دیکھا لیکن ایک مرتبہ نظریں ملیں تو ایسا لگا جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ دوبارہ نظریں نہ ملا سکا۔ جانے کیوں وہ اس وحشت پر ہلکے سے مسکرا دی۔

موہنی نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا اور کسی کے سمجھانے سے بھی اس کی ہچکیاں بند نہیں ہو رہی تھیں، لیکن جب گجن کماری نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا تو موہنی نے چونک کر اسے پہلی بار دیکھا اور پھر اسے ایسے سحر زدہ انداز میں دیکھتی رہی جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔ گجن کماری نے جھک کر اسے پیار کیا لیکن جانے کیوں یہ دیکھ کر مجھے تسلی ہوئی کہ اس نے موہنی کے گالوں کو نہیں گردن کو چوما تھا اور پھر اس نے اسے پیار سے لپٹا لیا تھا۔ مجھے گجن کماری کی اس حرکت پر بھی حسد ہوا تھا جیسے وہ میرا حق چھین رہی ہو اور پھر دوسرے دن دیدی نے مجھے بتایا کہ گجن کماری اپنے ساتھ موہنی کو چندر پور لے گئی ہے۔

"موہنی کبھی ماتا جی سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہیں ہوئی تھی۔" دیدی نے روتے ہوئے بتایا۔

"اس نے رو رو کر جی ہلکان کر لیا تھا۔ گجن کماری بہ ضد ہو کر لے گئی ہیں اور اچھا ہی ہوا شاید اس کا دل وہاں بہل جائے۔"

"لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے موہنی ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہو۔ یہ دیوانہ پن نہیں تھا تو اور کیا تھا لیکن میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔

"گجن کماری تمہاری رشتے دار ہیں دیدی؟!" میں نے پوچھا۔

"ہاں بھیا!...... وہ ہماری ننھیالی رشتے دار ہے۔ ماتا جی رشتے میں اس کی خالہ ہوتی تھیں۔"

"پھر یہ لوگ کبھی آتے کیوں نہیں تھے؟"

"وہ بڑے لوگ ہیں۔" دیدی جن کا نام ریتو تھا، انہوں نے مجھے بتایا۔ "ماتا جی کہتی تھی ہمارے پرانا بڑے تانے بانے والے راجا ہوا کرتے تھے اور ان کی رشتے داری شہنشاہ اکبر سے تھی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "شہنشاہ اکبر تو مسلمان تھا۔"

"ہاں کہتے تو یہی ہیں، پر ماتا جی بتاتی تھیں کہ اکبر مسلمان بھی تھا اور ہندو بھی۔ اسے ہندوست سے بڑا پیار تھا۔ وہ ہمارے دیوتاؤں کو بھی مانتا تھا۔ اس نے بہت سی ہندو لڑکیوں سے شادی رچائی تھی۔ گجن کماری کا خاندان بھی اسی طرح راجپوت تھا اور گجن کماری کے دادا جس کے پیٹ سے تھے۔ وہ شہنشاہ اکبر کی رانی رہ چکی تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ شہنشاہ اس پر بری طرح مرمٹا تھا اور شادی کر کے اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا، لیکن اکبر کی موت کے بعد وہ واپس آ گئی تھی اور پھر ہمیشہ یہیں رہی۔"

"لیکن یہ لوگ اس ویران علاقے میں کیوں رہتے ہیں؟"

"کہتے ہیں، ان کی ماں کی وصیت تھی اور مہارانی نے بھی یہی وصیت کی تھی کہ ان کی اولاد نے حویلی کی رہائش ترک کی تو وہ تباہ ہو جائے گی۔ ان کے پاس دھن دولت بہت کچھ ہے، لیکن گجن کماری بے چاری وہ بھی میری طرح ودھوا ہے۔ اس کا شوہر ایک حادثے میں مر گیا تھا۔

گجن کماری کے بارے میں یہ باتیں میں نے پہلی بار سنی تھیں لیکن مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مجھے صرف موہنی کی جدائی کا غم تھا۔ ایک ایک لمحہ کاٹنا دوبھر ہو رہا تھا اور میں اپنی تڑپ کا کسی سے اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا، لیکن قدرت نے خود راستہ نکال دیا۔

موہنی کے جانے کے چھ دن بعد اچانک ست پرکاش بیمار پڑ گیا۔ اسے جاڑا بخار شروع ہو گیا تھا جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ رتو دیدی بہت پریشان تھیں۔ میں ہر لمحہ ست پرکاش کی خدمت کرتا۔ ڈاکٹر کو لانا، دوا لانا اور وقت پر ست پرکاش کو دوا دینا۔ یہ سب میری ذمے داری تھی۔ ایک دن ست پرکاش نے رتو سے کہا کہ موہنی کو دیکھنے کو بڑا جی چاہتا ہے۔ رتو بے چاری کیا جواب دیتی۔ کہنے لگی۔ کوئی ہے بھی نہیں جس کو بھیج کر موہنی کو بلوائیں۔ میں نے فوری موقع سے فائدہ اٹھایا۔

"رتو تم کہو تو میں جا کر لے آؤں۔"

"ہاں لیکن بھیا کہیں وہ لوگ برا نہ مانیں۔" رتو نے کہا

"وہ کیوں برا مانیں گے؟" ست پرکاش نے کہا۔

"آج تک تو کبھی رشتے داری یاد نہیں آئی تھی۔ اب آئی تو بہن کو لے کر چل دی، ویسے بھی مجھے یہ گجن کماری ایک آنکھ نہیں بھاتی۔"

"ایسا نہ کہو ست پرکاش!" رتو نے فوراً ٹوکا۔ "آخر وہ بھی تمہاری بہن ہوتی ہے۔"

"لیکن ست پرکاش اتنا بہ ضد ہوا کہ بالآخر رتو نے مجھے چندر پور جانے کو کہہ دیا۔ میں نے ست پرکاش کے لیے تین دن کی دوا لا کر رکھ دی اور پھر دوسرے ہی دن گھوڑا لے کر چندر پور روانہ ہو گیا۔ زندگی میں دوسری بار میں چندر پور جا رہا تھا۔ ایک بار ست پرکاش کے ساتھ میلے کے زمانے میں گیا تھا اور اب تنہا جا رہا تھا۔ آبادی سے باہر نکلتے ہی میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور جلد از جلد موہنی کے پاس پہنچنے کے لیے پوری رفتار سے روانہ ہو گیا۔

فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن مسلسل چڑھائی تھی اس لیے حویلی تک پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب گھنے درخت تھے۔ گھوڑا بری طرح ہانپ رہا تھا لیکن بلندی پر حویلی کی

عمارت درختوں کی اوٹ سے جھانک رہی تھی، اس لیے میں نے بار بار ایڑ لگا کر گھوڑے کی رفتار تیز کی۔ کچھ دیر بعد درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ حویلی قلعے کے اندر واقع تھی۔ قلعے کی شکستہ فصیل اب بھی اتنی بلند تھی کہ اس کو پار کرنا مشکل نہیں تھا اور اندر جانے کا واحد راستہ بڑے پھاٹک سے تھا جو کھلا ہوا تھا۔ ہر سمت عجیب سی ویرانی برس رہی تھی اور دور دور تک کسی آبادی یا متنفس کا پتا نہیں تھا۔

میں پھاٹک سے گزر کر جیسے ہی اندر داخل ہوا تو بارہ دری نظر آئی، جس کے سامنے وہی بگھی کھڑی تھی جس پر سوار ہو کر گجن کماری آئی تھی۔ سوائے حویلی کی عمارت کے ہر طرف کھنڈر نظر آ رہے تھے۔ بائیں جانب اصطبل تھا جس میں بندھے ہوئے مشکی گھوڑے باہر نظر آ رہے تھے لیکن کسی آدم زاد کا کوئی پتا نہ تھا۔ میں نے اصطبل کا رخ کیا اور اپنا گھوڑا ایک خالی تھان پر باندھ ہی رہا تھا کہ کسی نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا موہنی کے گھر سے آئے ہو......؟" میں چونک کر پیچھے مڑا۔ بوڑھے سائیس کو داخل ہوتے میں نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ اتنا بوڑھا تھا کہ اس کی بھنویں تک سفید ہو چکی تھیں۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے وہ مجھے عجیب انداز سے گھور رہا تھا۔

"ہاں تم گجن کماری کو خبر کر دو۔" میں نے اسے جواب دیا۔

"گجن کماری!......اس وقت......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں۔ میں موہنی کو لینے آیا ہوں، اس لیے تم اسے فوراً خبر کر دو۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" بوڑھے نے کہا۔ "گجن کماری اس وقت کسی سے نہیں ملتی ہیں۔"

"لیکن میں اتنی دور سے آیا ہوں اور پھر موہنی کو لے کر واپس بھی جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ ان کے آرام کا وقت ہے۔" بوڑھے نے غصے میں جواب دیا۔ "میں انہیں نہیں جگا سکتا۔"

"اچھا تو پھر موہنی کو اطلاع دو۔" بوڑھا زیر لب بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اتنی بڑی حویلی میں کوئی نوکر چاکر نہیں نظر آتا۔ جانے کیوں اس جگہ پر ایک ان جانا سا خوف طاری ہو رہا تھا۔ اتنے میں موہنی آتی ہوئی نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ خوشی سے مسکرا دی۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی میرے قریب آئی۔

"ارے تم......! تم یہاں کیسے آ گئے؟" اس نے مجھے والہانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کو میری آمد پر کوئی اعتراض ہے تو واپس چلا جاؤں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔"

"ارے نہیں، تم تو برا ملن گئے۔" موہنی جلدی سے بولی۔

"یہاں کیوں کھڑے ہو، اندر آ جاؤ۔"

وہ مجھے لیے ہوئے مختلف راہ داریوں سے گزر کر ایک ہال نما کمرے میں پہنچی۔ حویلی کیا تھی، سچ مچ شاہی محل تھا۔ بڑے بڑے جھاڑ اور قندیلیں کمرے میں لگی ہوئی تھیں، لیکن جدید دور کی سجاوٹ کی طرح کمرے میں فرنیچر کا نام و نشان نہیں تھا۔ قیمتی ایرانی قالین فرش پر بچھے ہوئے تھے۔ مخملی غلاف والے گاؤ تکیے قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ چاندی کے اُگال دان رکھے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک گاؤ تکیے کے سامنے بڑی خوب صورت سی نقشین صراحی اور گلاس رکھے تھے۔ دیواروں پر قدیم دور کے ہتھیار سجے ہوئے تھے اور سامنے کی دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کے درمیان میں شہنشاہ اکبر کی تصویر تھی۔ سونے کے حسین فریم

میں لگی ہوئی اس تصویر کے برابر جو تصویر تھی وہ ہو بہو گجن کماری کی تھی۔

''گجن کماری بڑی حسین نظر آ رہی تھی۔'' میں نے تصویر کو گھورتے ہوئے کہا۔

''یہ گجن کماری نہیں۔ ان کی پردادی ہیں جو ایک بہت بڑے شہنشاہ کی مہارانی تھیں۔'' موہنی نے بتایا۔

''ناممکن۔'' میں نے کہا۔ ''اتنی مشابہت ممکن نہیں۔''

لیکن موہنی نے جو کچھ کہا تھا وہ صحیح تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر اندر گئی۔ میں نے دانستہ اسے ست پرکاش کی بیماری کے بارے میں نہیں بتایا تھا، ورنہ تو پریشان ہو جاتی۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گجن کماری کی اجازت کے بغیر موہنی کیسے جائے گی اور اگر کماری دیر سے سو کر اٹھی تو واپس جانا ممکن نہیں ہوگا کیونکہ سہ پہر ہو رہی تھی اور راستہ ویران جنگل سے گزرتا تھا۔ موہنی ایک خوب صورت سی سینی میں کھانا لے کر آ گئی۔ میں بھوک سے بے حال ہو رہا تھا اس لیے بلا تامل کھانے بیٹھ گیا۔

''گھر میں کوئی ملازم نہیں ہے؟'' میں نے کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔

''ہے کیوں نہیں درجنوں ہیں۔'' موہنی نے جواب دیا۔

''پھر تم کیوں کھانا لینے گئی تھیں؟''

''اوہ۔ دراصل سب اس وقت سو رہے ہیں۔''

''سو رہے ہیں؟'' میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''ہاں دراصل گجن کماری رات کو دیر تک جاگتی ہیں۔ صبح ہونے تک روزانہ راگ رنگ کی محفل جمتی ہے، اس لیے دن کو سب آرام کرتے ہیں۔''

''عجیب بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس ویرانے میں راگ رنگ کی محفل کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

''مجھے خود تعجب ہوا تھا۔'' موہنی نے کہا۔ ''لیکن یہ روزانہ کا معمول ہے، اس لیے میں بھی عادی ہو گئی ہوں۔''

''موہنی! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔'' میں نے بالآخر اسے بتایا۔ ''ریتو نے تمہیں بلایا ہے۔''

''لیکن...... موہنی کسی سوچ میں پڑ گئی۔ ''گجن کماری تو ابھی سو رہی ہے۔ میں ان سے پوچھے بغیر کیسے جا سکتی ہوں۔''

''میں خود بھی سوچ رہا تھا۔ وقت کم ہے اس لیے تم ان کو جگا کر اجازت لے لو۔''

''نہیں اس کوئی نہیں جگا سکتا۔''

''کیا مطلب......؟''

''یہ ان کا حکم ہے۔'' موہنی نے جواب دیا۔ ''وہ خود ہی بیدار ہوتی ہیں۔ دن میں کسی کو ان کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

''کیا روزانہ ہی ایسا ہوتا ہے؟''

''ہاں۔''

''تب پھر کیا ہوگا۔ شام سے پہلے میرا جانا ضروری ہے۔'' موہنی بھی سوچ میں پڑ گئی۔

''صرف ایک صورت ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم آج رات یہیں ٹھہر جاؤ۔ ہم کل صبح چلیں گے۔''

اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ہم دونوں حویلی سے نکل کر باہر آ گئے۔ گھومتے ہوئے ہم ایک برگد کے بڑے درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے موہنی سے تنہائی میں ملنے کا موقع نصیب ہوا تھا۔ میرا دل اس طرح اچھل رہا تھا جیسے سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ موہنی بھی مجھے جن لجائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے دل کی کیفیت کی چغلی کھا رہی تھی۔

''تم نہیں تھیں تو ایک لمحہ بھی میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن پھر یہ سوچ کر صبر کر لیتا تھا کہ شاید تمہارا یہاں دل بہل جائے۔''

''تمام دن میں پریشان رہتی تھی۔'' موہنی نے کہا۔ ''ہر لمحہ دل چاہتا تھا کہ میں واپس پہنچ جاؤں۔''

''کیوں......؟ یہاں تو تم بڑے آرام سے تھیں۔'' موہنی نے ملامت آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔

''جب آپ پاس نہ ہوں تو آرام کیسا؟'' اس نے کہا۔

''ہاں۔ ریتو یاد آتی ہوگی۔ وہ بھی ہر وقت تمہارے لیے بے چین رہتی تھیں؟''

''ریتو دیدی کے علاوہ بھی کوئی یاد آتا تھا۔'' اس نے پلکیں جھکائے ہوئے کہا۔ خوشی سے بے تاب ہو کر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''سچ......؟ اوہ موہنی...... موہنی...... تم نے آج مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ بھینچتے ہوئے کہا۔

''تم تو سدا کے دیوانے ہو۔'' اس نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ہاں سدا سے تم نے دیوانہ بنا رکھا ہے۔'' میں نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے بغیر ایسا لگتا تھا جیسے زندگی ویران ہو گئی ہو۔''

''سب منہ دیکھے کی باتیں ہیں۔ بس رہنے دو۔''

''نہیں موہنی! میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔'' موہنی ہنس پڑی۔

''کسی فلم سے یہ باتیں سیکھ لی ہیں شاید۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں موہنی! میری محبت کا یوں مذاق نہ اڑاؤ۔'' اس نے پیار سے میرا ہاتھ دبایا۔

''برا مان گئے؟ میں تو مذاق کر رہی تھی۔''

''مجھے معلوم ہے، لیکن موہنی! میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔'' موہنی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''میرا خود بھی حال ہے...... الیاس!'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''لیکن......؟''

''لیکن کیا......؟''

''جب یہ سوچتی ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔''

''ایسا کیوں نہیں ہو سکے گا؟''

''میں ہندو ہوں......اور......اور......''

''اور میں مسلمان...... یہی بات ہے نا......لیکن مذہب ہماری محبت میں دیوار نہیں بن سکتا۔ ہم اس دیوار کو گرا دیں گے۔''

''سوچنا اور بات ہے، لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس نے افسردہ ہو کر کہا۔

''ہم کہیں دور چلے جائیں گے۔ دور...... اتنی دور جہاں ذات پات کے یہ بندھن ہماری محبت میں حائل نہ ہو سکیں۔''

''میں جانتی ہوں کہ ایسا ممکن ہے لیکن رتو دیدی رو رو کر مر جائیں گی اور پھر ست پرکاش کسی کو کیا منہ دکھائے گا۔''

''میرا بنایا ہوا خیالی محل مسمار ہو گیا۔ بے شک یہ کیسے ممکن تھا۔ میں اپنے دوست اور رتو کو دنیا کے سامنے یوں رسوا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، لیکن میں موہنی کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ خدایا میں کیا کروں؟ موہنی نے شاید میری پریشانی بھانپ لی تھی۔

''پر محبت کرنا پاپ نہیں ہے الیاس!'' اس نے تسلی دی۔

''ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے رہیں گے۔''

''نہیں موہنی!...... محبت کرنا پاپ نہیں ہے، لیکن اگر دنیا کو پتا لگ گیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں تو وہ اسے پاپ بنا دیں گے۔''

''دنیا کو پتا ہی کیوں لگے گا؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''تمہاری نگاہوں میں تمہیں دوسروں کے سامنے دیکھتے ہوئے بھی ڈرتا تھا کہ کہیں کسی کو شبہ نہ ہو جائے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''بڑے جھوٹے ہو۔ ہمیشہ تو ندیدوں کی طرح گھورتے رہتے تھے۔'' اس نے ہنسی روکتے ہوئے کہا اور میں تھوڑی دیر کے لیے سب کچھ بھول گیا۔ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا اور میں نے حویلی کی طرف نگاہ کی تو وہاں مجھے بہت سے لوگ چلتے پھرتے نظر آئے۔

''شاید گجن کماری بیدار ہو گئی ہیں۔'' میں نے کہا۔ موہنی چونک کر اٹھ بیٹھی۔

''ہائے تم نے باتوں میں ایسا لگایا کہ بالکل دھیان نہ رہا۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔'' موہنی نے گھبرا کر کہا۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ حویلی میں داخل ہوئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ ویران اور سنسان عمارت میں نوکروں اور داسیوں کی فوج اس طرح مصروف نظر آ رہی تھی جیسے ابھی شہنشاہ اکبر تشریف لانے والے ہوں۔ ان کے جسم پر قدیم طرز کے لیکن صاف ستھرے لباس تھے۔ وہ بڑا کمرا جہاں میں موہنی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ عود اور عطر کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ کسی نے ہماری سمت توجہ نہ کی۔ کمرے میں ایک طرف بچھی ہوئی اجلی چاندنی پر مختلف ساز قرینے سے بکھیر رہے تھے۔ میں محوِ حیرت بنا کھڑا تھا کہ اچانک تمام کے تمام ملازم اور داسیاں صف بستہ کھڑے ہو کر تعظیمی جھک گئے اور بے ساختہ میری نظریں زینے کی سمت

اٹھ گئیں۔

گجن کماری آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی۔ اس کے جسم پر باریک لباس تھا جس سے اس صاف و شفاف حسن چاند کی طرح جھلک رہا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک راج کماری نظر آ رہی تھی۔ اس کا کافرادا حسن بھی بڑا پر وقار لگ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مجھے دیکھ کر ایک خفیف سی مسکراہٹ ابھری۔ میں اس کو دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ جب تک وہ قریب نہ آ گئی۔ میری نظر اس کے ساتھ ساتھ چلنے والے عمر رسیدہ شخص پر نہ پڑی اور جب پہلی بار میں نے اس بڈھے کو دیکھا تو ایک شدید قسم کی کراہیت کا احساس ہوا۔ باوجود یہ کہ اس نے شاہانہ لباس پہنا ہوا تھا، پھر بھی جھریاں پڑے سانولے چہرے پر ایک عجیب قسم کی خباثت جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی اور نگاہ ملتے ہی مجھے یوں لگا جیسے جسم میں برقی رو دوڑ گئی ہو۔ میں نے جلدی سے نگاہیں جھکا لیں۔

''یہ گجن کماری کے پتا جی ہیں۔'' موہنی نے سرگوشی میں کہا۔ ''رانا ہرمیندر سنگھ، سنا ہے ان کی عمر سو سال ہے بلکہ شاید اس سے بھی اوپر۔ یہ صرف رات کو گجن کماری کے ساتھ نیچے آتے ہیں اور کھانے کے بعد کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلے جاتے ہیں۔

میں نے تعجب سے رانا ہرمیندر سنگھ کی سمت دیکھا جو اب زینے سے اتر کر ہماری سمت بڑھ رہا تھا۔ اتنی عمر کے باوجود اس کے جسم میں جوانوں کی سی چستی تھی اور جب اس نے مجھے ایک بار پھر گھورا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی گدھ کسی لاش کو گھور رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں گدھ جیسی حرص اور بھوک نظر آ رہی تھی۔ ایک بار پھر مجھے شدید نفرت کا احساس ہوا اور ایسا لگا جیسے ہر سمت کسی سڑی ہوئی لاش کی بو پھیل گئی ہو۔ میں اپنی اس نفرت پر خود حیران تھا۔

''آداب......!'' میں نے رانا اور گجن کماری کی طرف دیکھ کر کہا۔ بڈھے نے مجھے نفرت زدہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر آگے بڑھ گیا لیکن گجن کماری میرے پاس رک گئی۔ اس نے بڑی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا۔

''کب آئے تم الیاس!'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''بہت دیر ہوئی انہیں آئے ہوئے۔'' موہنی نے جلدی سے کہا۔ ''آپ سو رہی تھیں اس لیے میں نے اطلاع نہیں دی۔''

''میں موہنی کو لینے آیا ہوں۔'' میں نے وضاحت کی۔

گجن کماری کی بڑی بڑی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔

''آؤ۔ پہلے کھانا کھا لیں پھر باتیں ہوں گی۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

کھانے پر رانا ہرمیندر سنگھ، گجن کماری اور موہنی کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ ان گنت ملازمین انواع و اقسام کے کھانے لا کر دسترخوان پر لگا رہے تھے اور تعجب کی بات یہ تھی کہ کھانے میں گوشت کی بھی مختلف ڈشیں موجود تھیں۔ موہنی نے گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا اور جیسے ہی میں نے اس ڈش کی سمت ہاتھ بڑھایا اس نے اس طرح مجھے گھورا کہ میں نے فوراً ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ کھانے کے بعد داسیاں ہاتھ دھلانے کے لیے طشت لے کر آئیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں مغل اعظم کے دسترخوان پر بیٹھا ہوں۔

کھانا ختم ہوتے ہی اچانک فضا میں موسیقی کی آواز ابھری۔ میں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ جانے کب سازندے آ کر بیٹھ گئے تھے اور ان کے سامنے دو بے حد خوب صورت رقاصائیں پیروں میں گھنگھرو باندھ رہی تھیں۔ میں نے ایک دو بار گجن کماری سے موہنی کی بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ ٹال گئی۔ رانا ہرمیندر سنگھ اس دوران بالکل خاموش رہے تھے۔ انہوں نے آہستہ سے گجن کماری کے کان میں کچھ کہا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر مجھے نفرت انگیز انداز میں گھورا اور پھر سیڑھیاں طے کر کے اوپر چلے گئے۔

میں نے محسوس کیا کہ باپ کے جاتے ہی گجن کماری میں اچانک ہی تبدیلی آئی تھی۔ اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا اور چہرے پر شگفتگی آ گئی تھی۔ شاید وہ اپنے باپ سے بہت ڈرتی تھی۔ سازندے اپنے ساز و سامان کو سنبھال کر تیار ہو گئے تھے۔ رقاصائیں لہراتی ہوئی کھڑی ہو گئی تھیں۔

''گجن کماری!'' میں نے پھر مخاطب کیا۔ ''میں صبح سویرے ہی واپس جانا چاہتا ہوں۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے الیاس!'' گجن کماری نے بڑے پیار سے جواب دیا۔ ''اور پھر صبح ہونے میں ابھی بڑی دیر باقی ہے۔''

''جی دراصل مجھے آج ہی واپس پہنچنا تھا۔ موہنی کا انتظار ہو رہا ہوگا۔''

''ست پرکاش اب ٹھیک ہے۔ بخار اتر گیا ہے۔''

''جی۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ میں نے اسے پرکاش کی بیماری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

''اطمینان سے بیٹھو۔ مجھے معلوم ہے اور پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔''

''کیا بھیا بیمار ہیں؟'' موہنی نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔'' گجن کماری کا لہجہ اچانک درشت ہو گیا تھا۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔''

''لیکن آپ کو کیسے معلوم؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ گجن کماری نے مجھے ملامت آمیز نظروں سے گھورا۔

''باتیں پھر کر لیں گے ابھی تو راگ و رنگ سے مزہ لے لو۔'' اس نے اچانک مسکرا کر کہا۔

''تم موہنی کے لیے جتنے بے تاب ہو اس کا مجھے احساس ہے، لیکن تم جانتے ہو کہ یہ محبت تمہیں کتنی مہنگی پڑے گی؟''

میرا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ موہنی خوف زدہ نگاہوں سے اسے گھورنے لگی۔

''لیکن گجن کماری میں......''

''اب چپ بھی رہو الیاس!'' گجن کماری نے مجھے بڑی لگاوٹ سے اپنے قریب گھسیٹ لیا۔ محبت کبھی چھپتی نہیں۔ یہ کم بخت آنکھوں سے بولتی ہے۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''لیکن دل پر کسے اختیار ہے۔''

رقاصاؤں کے گھنگھرو بجے، طبلے پر تھاپ پڑی اور رقص شروع ہو گیا اور پھر فضا میں ایک ایسا مدھر اور سحر انگیز نغمہ ابھرا کہ روح کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ میں نے سکتے کے عالم میں دونوں خوبرو رقاصاؤں

کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہ ہمارے قریب آ کر رقص کرنے لگیں۔ مجھے نغمے کے بول یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ان میں شہد کی مٹھاس اور جادو کی سی سحر انگیزی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ساری کائنات گنگنا رہی ہو۔ جیسے ہر چیز رقصاں ہو۔ جیسے ہوش و حواس پر خمار سا چھا گیا ہو۔ گجن کماری مجھ سے اور قریب آ گئی تھی۔ اس نے چاندی کا ایک جام میرے لبوں سے لگایا۔

اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ان کی گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔ دونوں حسین رقاصائیں اچانک رقص کرتے کرتے میرے قریب آ کر بیٹھ گئیں اور پھر انہوں نے پیر پھیلا کر اپنے جسموں کو کمان کی طرح خم کیا اور میری سمت دیکھ کر ایک نغمہ شروع کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہر سمت محبت کی شمعیں روشن ہو گئی ہوں۔ نرم نرم شبنم کی طرح ٹھنڈی روشنی فضا میں بکھر گئی تھی۔ رقاصاؤں نے اپنے ہاتھ فضا میں لہرائے اور پھر ان کے ہاتھ بلوریں جام لیے ہوئے آہستہ آہستہ میرے لبوں کی طرف بڑھنے لگے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا اپنا وجود اس سحر زدہ ماحول میں تحلیل ہو کر رہ گیا ہو، جیسے میں عمر خیام کی کسی رباعی کا ایک کردار ہوں۔ نغمہ کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ حسن میرے قدموں میں رقصاں تھا اور شباب میرے پہلو میں جھوم رہا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک نرم و گداز بستر پر دراز تھا۔ چھت پر لٹکا ہوا خوش نما جھاڑ تاریکی میں چمک رہا تھا۔ نہ وہ بزم موسیقی تھی نہ وہ روح پرور نغمہ اور نہ رقص و سرور۔ میں ایک تاریک کمرے میں تنہا لیٹا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے سب کچھ یاد آ گیا اور میں پھر چونک کر اٹھ بیٹھا۔ ہلکی سی سرسراہٹ دریچے کی جانب سے سنائی دی تھی۔ میں نے گھور کر دیکھا تو تاریکی میں ایک ہیولا سا نظر آیا۔ کوئی دریچے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا باریک ریشمی لباس ہوا کے ساتھ اڑ رہا تھا اور اس کے سیاہ ریشمی بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

''موہنی!'' میں نے بے ساختہ پکارا۔ وہ تیزی سے پلٹی اور جھپٹ کر میرے بستر کے قریب آئی۔

''موہنی کو تم کبھی نہ حاصل کر سکو گے مورکھ!'' اس نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھیں غصے سے شعلے کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ موہنی نہیں گجن کماری تھی۔

''کماری!......تم۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''وہ چند لمحے مجھے اسی عالم میں گھورتی رہی پھر آنکھوں میں دہکتی ہوئی آگ ماند پڑ گئی۔ ایک دل نواز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔

''صرف گجن کہو مجھے!'' اس نے توبہ شکن انداز میں سرگوشی کی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاید یہ بھی کوئی خواب تھا۔ شاید میں نشے میں تھا لیکن پھر گجن کماری کا کافر ادا جسم اپنی جیتی جاگتی رعنائیوں کے ساتھ میرے قریب آ گیا۔ اس کے جسم کا گداز اور اس کی مرمریں بانہوں کا لمس میرے ہوش و حواس پر چھانے لگا اور شاید میں تمام تر بندشیں توڑ کر اس خواب کی تعبیر حاصل کر لیتا، لیکن وہ اچانک اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

''یہ...... یہ تمہارے بازو پر کیا ہے؟'' اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے اپنے بازو کو دیکھا پھر یاد آیا کہ اس پر امی کا باندھا ہوا تعویذ موجود تھا جس پر چاندی کا

چڑھا ہوا تھا۔

"کچھ نہیں تعویذ ہے۔" میں نے کہا۔ "شاید تعویذ اس کے نرم نازک بازو پر گڑ گیا تھا۔" "تم بلاوجہ ڈر گئیں۔"

"اسے اتار دو۔" گجن کماری نے حکم دیا۔

"کیوں......؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ ہمارے درمیان حائل ہے۔" گجن کماری پھنکاری۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ ہندو ہے، شاید اس لیے یہ کہہ رہی ہے۔ میں مسکرایا۔ میرا ہاتھ تعویذ کھولنے کے لیے بڑھا۔ پھر خود بہ خود رک گیا۔ کوئی انجانی قوت مجھے روک رہی تھی۔

"نہیں گجن! یہ میری ماں نے باندھا تھا، اسے میں نہیں اتار سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا میرے کہنے سے بھی نہیں؟" اس نے ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر پوچھا۔

ایک لمحے کے لیے میرا عزم ڈگمگایا۔ لیکن پھر مجھے موہنی کا خیال آیا۔ میں اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتا تھا۔

"تم موہنی کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے۔" گجن کماری نے غصے میں کہا۔ اس نے میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔

"میں صبح اسے یہاں سے لے جاؤں گا گجن کماری!" میں نے بھی غصے میں جواب دیا۔

"اور......اور اگر اسے حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوا تو میں اپنا مذہب بھی تبدیل کر لوں گا۔" گجن کماری نے ایک زہریلا قہقہہ لگایا۔

"تم اسے پھر بھی حاصل نہ کر سکو گے۔ موہنی میری ہے۔ وہ میری اجازت کے بغیر یہاں سے کبھی نہیں جائے گی۔"

"بے شک وہ میری کوئی نہیں ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے رتو دیدی نے آتے لینے کے لیے بھیجا ہے۔ میں ابھی واپس جا رہا ہوں اور اب ان کو لے کر آؤں گا۔"

"وہ پھر بھی نہ جا سکے گی۔" اس نے درشت لہجے میں کہا۔ تم نے میری توہین کی ہے الیاس! تم کو اس کی سزا ملے گی۔"

مجھے اس کے لہجے پر سخت غصہ آیا۔ میں اس کا نوکر تو نہیں تھا۔ وہ کماری ہوگی تو اپنے گھر میں، لیکن میرے ساتھ اسے اس انداز میں گفتگو کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ میں نے سرہانے رکھا ہوا لباس اٹھایا اور اسے پہن کر جانے کے لیے مڑا۔

گجن کماری کا طنزیہ قہقہہ بلند ہوا۔ میں نے غصے میں پلٹ کر دیکھا لیکن کمرا خالی تھا۔ گجن کماری وہاں نہیں تھی۔ میں چند لمحے حیران کھڑا رہا۔ پھر دروازے کی سمت بڑھا۔ دروازہ مقفل تھا۔ میں نے بار بار زور لگایا لیکن دروازہ نہ کھل سکا۔ کیا وہ زبردستی مجھے یہاں قید رکھے گی۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے پھر دروازے کا ہینڈل گھمایا لیکن دروازہ نہ کھل سکا۔

"دروازہ کھول دو گجن کماری!" میں نے غصے میں چلا کر کہا۔

"لیکن کوئی جواب نہ مل سکا۔ مجبوراً میں واپس آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ صورتِ حال پریشان کن تھی۔ میں یہاں بالکل تنہا تھا۔ گجن کماری کے پاس ملازموں کی فوج تھی اور پھر مجھے یاد آیا کہ ان میں بعض خوف ناک شکل کے حبشی بھی تھے۔ یہاں کوئی مدد بھی نہیں مل سکتی تھی۔ دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ اچانک میری نظر دریچے پر پڑی۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچا۔ میں نے باہر جھانکا اور سہم گیا۔ یہ کمرا زمین سے اتنی بلندی پر واقع تھا کہ اس راستے سے نیچے اترنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شاید یہ حویلی کے بلند مینار پر واقع کوئی کمرا تھا۔ پھر کیا کروں؟ میں اسی عالم میں کھڑا باہر جھانک رہا تھا۔ صبح ہونے والی تھی۔ صبح کی پہلی کرن پہاڑ کے دامن سے ابھری تو مجھ میں ایک نئی ہمت پیدا ہوئی۔ میں دروازے کے قریب آیا اور زور زور سے اسے پیٹنے لگا لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ غصے میں ایک بار پھر میں نے پوری قوت سے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور دروازہ بلا کسی دشواری کے کھل گیا۔ چند لمحے مجھے یقین نہ آیا۔ میں کھلے ہوئے دروازے میں کھڑا رہا۔

ممکن ہے یہ بھی گجن کماری کی کوئی چال ہو۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ میں زینہ اترنے لگا۔ میرا خیال صحیح تھا۔ یہ کمرا حویلی کے قدیم مینار پر واقع تھا۔ میں نیچے پہنچا تو ہر سمت سناٹا طاری تھا۔ نہ کوئی ملازم نظر آ رہا تھا اور نہ گجن کماری اور نہ ہی موہنی۔ ایک لمحے کو میں نے سوچا کہ موہنی کو تلاش کر کے خاموشی سے ساتھ لے چلوں لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہوگی اور اگر گجن کماری نے مجھے پھر روک لیا تو مشکل ہو سکتی ہے۔

میں دبے پاؤں چلتا ہوا اصطبل پہنچا۔ گھوڑے پر جلدی جلدی زین کسی اور حویلی کی چہار دیواری سے باہر نکل آیا۔ کسی نے میرا راستہ نہیں روکا۔ سڑک پر پہنچتے ہی میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ ابھی سورج پوری طرح نہیں نکلا تھا اور گھنے جنگل میں اب تک تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ سڑک بہت تنگ اور ناہموار تھی۔ ایک جانب گہری کھائی تھی اور ذرا سی بے پروائی مجھے سینکڑوں فٹ کی گہرائی میں پھینک سکتی تھی، اس لیے میں نے رفتار سست کر دی۔ مطلوبہ سڑک پر پہنچنے کے لیے مجھے اب چند منٹ درکار تھے۔

اور عین اسی وقت جھاڑیوں میں سے کسی چیز نے گھوڑے پر چھلانگ لگا دی۔ میں اپنے خیالات میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ کچھ نہ دیکھ سکا۔ میرا گھوڑا خوف سے ہنہنا کر اچھلا اور پھر اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا گھوڑے کی پشت سے لڑھک کر گہری کھائی کی طرف گرنے لگا۔ میں نے خلا میں ہاتھ مارے لیکن ہاتھ کچھ نہ آیا۔ خوف سے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں گہرائیوں میں گرتا چلا گیا اور مجھے کچھ یاد نہ رہا۔

وہ موہنی تھی...... غم زدہ، پریشان اور پرنم آنکھیں بھی موہنی کی تھیں اور وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ میں ایک بار پھر آرام دہ بستر پر دراز تھا۔ جلتی ہوئی شمعوں سے ظاہر تھا کہ رات ہو چکی ہے۔ شاید موہنی کی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں نے مجھے بے دار کر دیا تھا۔

"موہنی!" میں نے آہستہ سے کہا۔ موہنی نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر خوشی سے مسکرا دی۔ ہاں یہ خواب نہ تھا۔ وہ موہنی ہی تھی۔

"بھگوان! تو نے میری پرارتھنا سن لی۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ درد کی ٹیسوں سے سارا بدن دکھ اٹھا۔ موہنی نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر مجھے لٹا دیا۔

"نہیں۔ نہیں، تم اٹھنے کی کوشش نہ کرو۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"زندگی تھی جو بچ گئے۔ ورنہ جس طرح راموکاکا تم کو لے کر آئے تھے، میں تو سمجھی تھی کہ تم...... تم......" وہ سسکیاں لینے لگی۔

مجھے یاد آ گیا۔ میرا گھوڑا اچانک بدک گیا تھا اور میں اس کی پشت سے کھائی کی سمت گر گیا تھا۔ حیرت تھی کہ بچ کیسے گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر موہنی کے چہرے سے آنسو پونچھے۔

"ابھی تو میں زندہ ہوں پگلی! رو کیوں رہی ہے؟" میں نے آہستہ سے کہا۔ موہنی نے پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔

"تم مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے تھے؟" اس نے پوچھا۔ ایک لمحے کو دل چاہا کہ اسے گجن کماری کی ساری باتیں بتا دوں پھر سوچا یہ مناسب نہیں ہوگا۔

"تجھے چھوڑ کر کہاں جاؤں گا موہنی! بس دل گھبرا رہا تھا۔ یونہی ٹہلنے نکل گیا تھا۔ اچانک گھوڑا بدک گیا۔"

"میں نے منع کیا تھا کہ یہ جگہ اچھی نہیں لیکن تم نہیں مانے۔"

"اسی کی تو سزا ملی ہے۔" وہ مسکرادی۔

"اس حالت میں بھی شرارت سے باز نہیں آتے۔"

"کیا بہت چوٹ لگی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں، لیکن بھگوان کی کرپا سے تم بچ گئے۔ راموکاکا کہہ رہا تھا کہ ایک درخت میں پھنس کر تم نیچے گرنے سے بچ گئے ورنہ......"

"ورنہ اب تک سورگ باش ہوگئے ہوتے۔" میں نے کہا۔ موہنی نے جلدی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیسی بدشگونی کرتے ہو۔" اس نے غصے میں مجھے گھورا۔ "اگر...... اگر تم کو کچھ ہو جاتا تو......"

"تو کیا ہوا......؟"

"میں بھی جان دے دیتی۔" اس نے نظریں جھکا کر بڑے عزم سے کہا۔

میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور اس کے چہرے کو گھورنے لگا۔ وہ واقعی موہنی تھی۔ اس کے چہرے پر بکھرا ہوا حسن چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ میں نے بے ساختہ اس کا ہاتھ چوم لیا۔ موہنی نے شرما کر ایک دم اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"یہ راموکاکا کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ایک غریب لکڑہارا ہے۔ جنگل میں سے لکڑیاں کاٹ کر حویلی میں دیتا ہے۔ اس نے تم کو گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اٹھا کر یہاں لایا تھا۔" موہنی نے بتایا۔ "راموکاکا نے بتایا تھا کہ تم کو صرف معمولی چوٹیں آئی ہیں۔ وہ دوا لگا کر کہتا تھا کہ صبح تک ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"گجن کماری کہاں ہے؟"

"وہ کچھ دیر پہلے تم کو دیکھ کر گئی ہیں۔"

"تمہاری واپسی کے بارے میں اس نے کیا کہا؟"

"کہہ رہی تھیں کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو پھر وہ اپنی فٹن میں ہم دونوں کو گھر بھیج دیں گی۔" موہنی نے بتایا۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ کیا واقعی گجن کماری نے اپنا فیصلہ بدل دیا تھا یا محض موہنی کو تسلی دینے کے لیے ایسا کہہ دیا تھا۔

"فکر نہ کرو۔ گجن کماری نے آدمی گھر بھیج کر کہلوا دیا ہے کہ ہم دو تین دن بعد آئیں گے۔" موہنی نے مجھے فکرمند دیکھ کر کہا۔

"موہنی...... کبھی تم نے ایک بات سوچی؟"

"کون سی بات......؟"

"گجن کماری، اس کا باپ، اس کے تمام نوکر دن میں کہاں غائب ہو جاتے ہیں؟"

"اس میں بھلا سوچنے کی کیا بات ہے؟" چندرا نے کہا۔

"جب رات بھر جاگیں گے تو دن کو سوئیں گے ہی۔"

"کیا اس رات میں بے ہوش ہوگیا تھا۔"

"بے ہوش...... تم کب کی بات کر رہے ہو؟"

"کل رات کی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں اس کمرے میں کیسے پہنچا تھا؟"

"موہنی بے ساختہ ہنس پڑی، پھر اس نے پریشان کن نظروں سے مجھے دیکھا جیسے میری حالت پر شک کر رہی ہو۔"

"تم گجن کماری کے ساتھ خود ہی چل کر گئے تھے۔" اس نے کہا۔

"مجھے یاد نہیں پڑتا شاید چوٹ کی وجہ سے...... نہیں موہنی میرا دماغ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے گجن کماری، یہ حویلی اور یہاں کا سب کچھ حقیقت نہیں ایک خواب ہے۔"

موہنی اب واقعی پریشان ہوگئی تھی۔

"الیاس! اب تم سو جاؤ۔ لاؤ میں تمہارا سر دبا دوں۔" وہ سر دباتی رہی۔ میں سوچتا رہا۔ گجن کماری نے دھمکی دی تھی کہ موہنی اب کبھی واپس نہیں جاسکے گی، لیکن کیا وہ زبردستی موہنی کو روک سکتی تھی۔ وہ موہنی کے رشتے دار تھی۔ اگر اس نے ست پرکاش اور ریتو سے موہنی کو مزید روکنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ یقیناً انکار نہ کرسکیں گے، اس لیے میرا ضد کرنا بے کار تھا جیسے ہی طبیعت ٹھیک ہوگی میں واپس چلا جاؤں گا۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ گجن کماری آ گئی۔ موہنی کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے شاید اسے گوارا ہوا تھا کہ وہ میرا سر دبا رہی تھی۔ موہنی نے سہم کر ہاتھ روک لیے لیکن گجن کماری دوسرے ہی لمحے مسکرا کر بولی۔

"کیسی طبیعت ہے الیاس!" اس نے قریب آ کر پوچھا۔

"سارا بدن دکھ رہا ہے" میں نے جواب دیا۔

"موہنی! تم ذرا جا کر دیکھو کھانا لگ جائے تو ہمیں بلا لینا۔" اس نے بڑے پیار سے کہا۔

"اچھا جی!" موہنی فوراً ہی چلی گئی۔ گجن کماری میرے بستر کے سرہانے آ کر بیٹھ گئی۔

"تم نے مجھے ناراض نہ کیا ہوتا تو یہ سزا کیوں ملتی؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ!...... تو یہ سزا اس وجہ سے ملی ہے؟" میں بھی ہنس پڑا۔ مجھ پر تمہارا قابو نہ چل سکا شاید میرے گھوڑے پر چل گیا۔"

"الیاس! تم بڑے نادان ہو۔" اس نے مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج تک کسی نے میری محبت کو نہیں ٹھکرایا۔"

میں چونک پڑا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ مجھ پر کیوں مہربان ہے۔

"لیکن تم شادی شدہ ہو گجن کماری!"

"تھی...... اس بے وقوف نے بھی ایسی ہی غلطی کی تھی۔"

"تو کیا تم نے اپنے شوہر کو......"

"نہیں۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ کیلاش ناتھ کی موت واقعی ایک حادثہ تھی۔ ہماری آپس میں تکرار ہوگئی تھی اور وہ غصے میں یہ دھمکی دے کر گیا تھا کہ واپس نہیں آئے گا۔ پتاجی اسی بات پر ناراض ہو گئے تھے۔ راستے میں اسے حادثہ پیش آ گیا اور وہ مر گیا۔"

"پھر بھی تم بیوہ ہو۔ ہندو مذہب میں بیوہ......"

"جہنم میں ڈالو مذہب کو۔" وہ جھنجھلا کر بولی۔ "میں صرف گجن کماری ہوں۔ اپنی مرضی کی مالک!" اس نے فرعونی انداز میں کہا۔ میں ہنس دیا۔

"بڑی ضدی اور ظالم بھی ہو تم!" وہ مسکرا دی۔

"مجھے جو چیز پسند آ جائے اسے حاصل کر کے چھوڑتی ہوں۔"

"اس وقت تو میں ہل بھی نہیں سکتا تھا۔" میں نے بہانہ کیا۔ "اس مسئلہ پر پھر بات کریں گے۔"

اس نے مجھے ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔ "مجھ سے جھوٹ بولنا بے کار ہے الیاس!" اس نے کہا۔

"موہنی کا خیال چھوڑ دو۔ وہ تمہاری کبھی نہیں ہو سکتی۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ کوئی ہندو اپنی لڑکی تم سے بیاہ دے گا؟"

"تم بھی تو ہندو ہو گجن کماری!"

"میں نے کہا نا...... میں صرف گجن ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری ہر خواہش پوری کروں گی۔ تم جانتے ہو مجھے کسی چیز کی کمی نہیں۔"

"تم چاہتی ہو کہ میں موہنی کا دل توڑ دوں؟" میں نے غصے میں کہا۔

"اس نے مجھے ملامت آمیز نگاہوں سے گھورا اور پھر کھڑی ہو گئی۔

"تم ضدی ہی نہیں بدقسمت بھی ہو۔" اس نے جواب دیا۔ "تمہارے لیے فٹن تیار ہے، بہتر ہے کہ اسی وقت چلے جاؤ۔" اس نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس وقت، اس حالت میں میں کیسے جاؤں؟"

"یہ تم جانو، لیکن میں پھر کہتی ہوں کہ بہتر ہے ابھی چلے جاؤ ورنہ......"

"اور موہنی......!"

وہ غضب ناک انداز میں مڑی۔ "موہنی میری بہن ہے۔ میں تم جیسے آوارہ آدمی کے ساتھ اسے نہیں جانے دوں گی۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، وہ جا چکی تھی۔ میرے لیے توہین ناقابل برداشت تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسی وقت روانہ ہو جاؤں گا۔ کوشش کر کے میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ہاتھ پیر سلامت تھے، لیکن خراشوں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پھر بھی میں اسی حالت میں ہال کے اندر پہنچا۔ گجن کماری اور موہنی کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔

"موہنی......!" میں نے پکارا۔

"گجن کماری نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر ایک ملازم کو اشارہ کیا۔

"اسے باہر فٹن تک پہنچا دو۔" اس نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

میں نے موہنی کی سمت دیکھا۔ وہ بے بسی کے عالم میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ ملازم حکم کی تعمیل کے لیے میری سمت بڑھا۔ میں غصے میں پیچ و تاب کھاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ گجن کماری کی فٹن تیار کھڑی تھی۔ کوچوان نے دروازہ کھولا، لیکن میں اس مغرور لڑکی کا احسان لینے کو اس حالت میں بھی تیار نہ تھا۔ اس لیے سیدھا اصطبل کی سمت بڑھا۔ میں نے اپنے گھوڑے پر زین کسی اور تکلیف کے باوجود اس پر سوار ہو کر چل دیا۔

رات کا وقت تھا۔ راستہ خطرناک تھا لیکن غصے کے عالم میں تکلیف اور خطرے، کسی چیز کا احساس نہ رہا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے کس طرح سفر طے کیا۔ رات کے پچھلے پہر میں گھر پہنچ گیا۔

موہنی کی موت کی خبر مجھے شنوانی میں ملی تھی۔ میں زخمی حالت میں چندر پور سے گھر پہنچا تو تایا کی بیماری اور فوراً پہنچنے کا تار گھر پہنچ چکا تھا۔ ارشد بھائی اور بھابی بے چینی کے ساتھ میرے منتظر تھے، لیکن میری حالت دیکھ کر وہ بدحواس ہو گئے۔ انہوں نے صبح کی گاڑی سے شنوانی جانے کا فیصلہ کیا، لیکن بھائی یہ ضد ہو گئے کہ مجھے اس حالت میں سفر نہیں کرنا چاہیے اور وہ تنہا جائیں گے۔ بڑی مشکل سے میں انہیں یقین دلا سکا کہ معمولی چوٹیں ہیں اور میں ان کے ساتھ ہی جاؤں گا۔

گاڑی صبح پانچ بجے روانہ ہوتی تھی، اس لیے ست پرکاش اور ریتو سے بھی نہ مل سکا۔ خیال تھا کہ چند روز بعد ہی واپس آ جاؤں گا، لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تایا ہمارے پہنچنے کے چند روز بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شنوانی ان دنوں جنگی قیدیوں کا بہت بڑا کیمپ تھا اور ابا اور تایا نے مل کر یہاں کھانا سپلائی کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ لاکھوں کا بزنس تھا اور اس لیے ابا نے مجھے وہیں روک لیا اور ارشد بھائی چند روز بعد بھابی کو لے کر واپس آ گئے۔

موہنی کی اچانک موت کی خبر مجھے بھابی کی چٹھی میں ملی تھی۔ انہوں نے صرف اتنا لکھا تھا کہ

چندر پور میں ایک اتفاقی حادثے میں موہنی ہلاک ہوگئی۔ اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ مجھے اس خبر سے شدید صدمہ پہنچا۔ چند روز تک میں بالکل سکتے کے عالم میں رہا۔ دل کہتا تھا کہ یہ جھوٹ ہے۔ اسے سانپ نے نہیں ایک حسین ناگن نے ڈس لیا تھا، جس کا نام گجن کماری تھا۔

لیکن کام کی مصروفیات میں، میں آہستہ آہستہ یہ غم بھی بھول گیا۔ پھر خبر ملی کہ موہنی کا گھر اجڑ گیا۔ اس کے بعد ریتو بھی چند ماہ کے وقفے کے بعد چل بسی۔ اس کے بعد اس طرف جانے کا خیال بھی اذیت کا باعث ہوتا تھا۔ دن گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ جنگ ختم ہوگئی۔ شنوانی کا کیمپ بھی کچھ دنوں کے بعد ختم ہوگیا۔ اس کیمپ سے ہزاروں افراد کے روزگار کا سلسلہ تھا۔ یہ لوگ جنگ کے بعد سے بے روزگاری کا شکار ہوگئے، لیکن ہم نے اتنا کما لیا تھا کہ فوری طور پر کوئی اثر نہ پڑا اور ہم نے جنگلات کے ٹھیکے کا کام شروع کر دیا۔

یہ 1949ء کا زمانہ تھا جب ایک کام سے مجھے چرن پور جانے کا اتفاق ہوا۔ میرا اسکول کا دوست سرفراز وہاں ریلوے میں ملازم تھا اور اس کی شادی میں شرکت کا میں وعدہ کر چکا تھا۔ چرن پور پہنچ کر ہم بچپن سے لے کر جوانی کے ان ایام کو یاد کرتے رہے جو ہم نے ایک ساتھ گزارے تھے۔ سرفراز نے مجھے بتایا کہ فرید ان دنوں اپنے ہی علاقے کے اسپتال میں سرجن کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ وہ لندن سے ایف آر سی ایس کر کے آیا تھا۔ بچپن کے ساتھیوں میں فرید اور ست پرکاش میرے عزیز ترین دوست تھے، اس لیے سرفراز کی شادی کے بعد میں فرید سے ملنے کے لیے روانہ ہوگیا۔

اسٹیشن سے اترا تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ چھوٹی سی آبادی اب ایک بڑا شہر بن چکی تھی۔ اسپتال اسٹیشن سے قریب ہی تھا اس لیے مجھے فرید کا پتا لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں دوپہر کو پہنچا تھا۔ فرید کو میری آمد کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اسپتال پہنچا تو معلوم ہوا کہ فرید آپریشن تھیٹر میں ہے۔ میں اس کے کمرے میں انتظار کرنے لگا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس کا منتظر ہوں، اس لیے جب وہ آپریشن تھیٹر سے واپس آیا تو مجھے پہچان نہ سکا۔ اس نے سمجھا کہ شاید میں کوئی مریض ہوں، اس لیے قدرے ناگواری سے مجھے دیکھا اور واش بیسن میں ہاتھ دھونے لگا۔

''بہت مصروف ہیں ڈاکٹر صاحب!'' میں نے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی آج کئی آپریشن تھے۔ آپ لوگ اگر باہر انتظار کر لیا کریں تو کوئی حرج تو نہیں۔'' وہ ترش لہجے میں بولا۔

''میرا خیال ہے آپ اپنی آنکھوں کا آپریشن کرالیں تو مناسب ہوگا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' وہ غصے میں میری طرف مڑا اور پھر حیرت اور مسرت سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

''ابے تو یہاں...... کب آیا؟'' وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ صابن بھرے ہاتھ تو دھو لے، کپڑوں کا ناس کر دیا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''خدا کی قسم تجھے دیکھ کر سب کچھ بھول گیا۔ تو ہے بڑا ظالم، کبھی بھول کر خط تک نہ بھیجا۔''

''اور تو نے بڑے خط بھیجے تھے۔''

''میری جان مجھے تیرا پتا نہیں معلوم تھا۔ لندن سے آیا تو ارشد بھائی کا تبادلہ ہو چکا تھا اور یہاں ایسا پھنسا کہ کہیں آنے جانے کے قابل بھی نہ رہ گیا۔''

وہ مجھے اپنے بنگلے میں لے گئے جو قریب ہی واقع تھا۔ کھانے کے بعد ہم دیر تک باتیں کرتے رہے اور ماضی کو یاد کر کے دل خوش کرتے رہے۔ اسے شام کو پھر اسپتال جانا تھا اس لیے میں آرام کرنے لیٹ گیا۔ فرید بنگلے میں تنہا رہتا تھا۔ والدین اب بھی گاؤں ہی میں مقیم تھے۔ جہاں ان کی بڑی زمین داری تھی۔ میں سو کر اٹھا تو شام ہو رہی تھی۔ فرید اپنی کار چھوڑ گیا تھا۔ میں سیدھا موہنی کے گھر کی سمت پہنچا، لیکن وہاں اب کئی منزلہ عمارت کھڑی ہوئی تھی۔

بہت دیر تک میں گاڑی میں بیٹھا حسرت بھری نظروں سے اس عمارت کو دیکھتا رہا۔ ست پرکاش، موہنی، ریتو...... سب کی مورتیں آنکھوں میں رقص کر رہی تھیں۔ مجھے یہ تک احساس نہ تھا کہ رخسار آنسوؤں سے تر ہو چکے تھے، لیکن اب وہاں کچھ بھی نہ تھا صرف یادیں تھیں۔ ان کا درد تھا اور صرف ایک خلش تھی۔

رات کو میں نے فرید سے ست پرکاش کے بارے میں پوچھا لیکن اسے بھی زیادہ علم نہیں تھا، کیوں کہ ان دنوں وہ اپنی تعلیم کے لیے باہر گیا ہوا تھا۔ ہم دیر تک ست پرکاش کو یاد کرتے رہے۔ میرا ارادہ تھا کہ دوسرے دن واپس چلا جاؤں گا، لیکن فرید بہ ضد ہوگیا کہ چند روز رکنا ہوگا۔ میں یہ سوچ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا کہ دوسرے دن اسے راضی کر لوں گا۔ ہر لمحہ اذیت دے رہا تھا۔ موہنی کے بغیر یہاں رکنا میرے لیے برداشت سے باہر تھا، لیکن فرید کو میرے دل کی کیفیت کا علم نہ تھا۔

آنکھ لگتے ہی گجن کماری کی حویلی میں تھا۔ وہی کمرا تھا۔ وہی راگ و رنگ کی محفل تھی اور وہی رقاصائیں اور پھر میں حیرت سے اچھل پڑا کیونکہ میرے قریب نیم دراز رقاصہ نے جب چہرہ اٹھایا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ موہنی تھی۔ اس کے چہرے پر غم و یاس کے بادل چھائے ہوئے تھے اور وہ اس طرح مجھے دیکھ رہی تھی جیسے وہ شدید بے بسی کے عالم میں ہو۔ میں نے گجن کماری کی طرف دیکھا اس کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

''موہنی!'' میں نے غصے میں کہا۔ ''یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

لیکن موہنی خاموش رہی۔ جام لیے ہوئے ہاتھ میری سمت ہنوز بڑھا ہوا تھا۔

''کیا تم کو موہنی کا یہ روپ پسند نہیں ہے؟'' گجن کماری نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

''گجن!...... تم اس طرح موہنی کو بے عزت نہیں کر سکتیں۔'' میں نے غصے میں چیخ کر کہا۔ ''وہ میری...... میری......''

''موہنی میری داسی ہے۔ وہ اب میرے حکم کی پابند ہے۔'' گجن کماری نے جواب دیا۔

''نہیں۔ نہیں تم موہنی پر یہ ظلم نہیں کر سکتیں۔'' میں نے لپک کر موہنی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''موہنی ہم یہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتے۔''

میں نے اسے اپنی سمت گھسیٹا۔ لیکن موہنی نے ایک جھٹکے میں اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھا اور پھر اٹھ کر رقص کرنے لگی۔ اس نے کوئی نغمہ شروع کر دیا تھا۔ بڑا

المیہ نغمہ تھا۔ اس کی آواز رس گھول رہی تھی۔ کانوں میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں اور گجن کماری...... وہ فاتحانہ انداز میں قہقہہ لگا رہی تھی۔

"موہنی......!" میں غصے میں دھاڑ کر اس کی سمت بڑھا۔

اور اسی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ تمام جسم پسینے سے تر تھا۔ دل زور زور سے اچھل رہا تھا لیکن میں چندر پور میں نہیں اپنے بستر پر پڑا ہوا تھا۔ کمرا بالکل تاریک تھا۔

میں نے اٹھ کر لائٹ جلائی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ حلق بالکل خشک ہو رہا تھا، اس لیے میں نے تھرماس میں سے پانی انڈیلا اور پورا گلاس خالی کر دیا۔

موہنی کی صورت میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ عالمِ خواب میں بھی وہ ایک لفظ نہیں بولی تھی، لیکن اس کی نگاہیں بہت کچھ کہہ گئی تھیں۔ ان میں اتھاہ غم تھا۔ بے پناہ شکوہ تھا اور بے انتہا بے بسی اور کرب تھا۔ میرا دل تڑپ کر رہ گیا۔ بار بار خیال آتا کہ موہنی زندہ ہے وہ میری منتظر ہے۔ گجن کماری نے اسے قید کر رکھا ہے۔ اپنا غلام بنا لیا ہے اور اسے مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں نے اسے بھلا دیا۔ اس کرب اور اذیت سے نجات دلانے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی انجانی قوت مجھے چندر پور بلا رہی تھی۔

میں نے کپڑے بدلے اور باہر نکل آیا۔ فرید کی گاڑی گیراج میں موجود تھی، لیکن چابی گاڑی میں نہ تھی۔ شاید فرید کے پاس ہو۔ میں اس کے کمرے کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ دروازہ کھلا۔ فرید شب خوابی کے لباس میں کھڑا تھا۔ مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"خیریت تو ہے؟" اس نے سوال کیا۔ "میں آہٹ سن کر اٹھ بیٹھا، لیکن تم اتنی رات گئے کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ ذرا طبیعت گھبرا رہی تھی۔ شاید باہر گھومنے سے تسکین ہو۔" میں نے بہانہ کیا۔ "گاڑی کی چابی دے دو۔"

"لیکن تم اتنی رات گئے کہاں جاؤ گے؟" اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس ذرا یوں ہی تفریح کروں گا۔"

"الیاس! تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو اور تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے فکر مند لہجے میں کہا۔ "اندر آ جاؤ۔ میں تمہیں کوئی مسکن دوا دیتا ہوں۔"

"دوا......؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "تم پاگل ہو۔ مجھے دوا کی ضرورت نہیں، کھلی ہوا میں گھومنے کی خواہش ہے۔"

"اتنی رات کو؟" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں یار! آج کل یہاں اتنی رات گئے گھومنا مناسب نہیں۔"

"کیوں......؟"

"قتل اور ڈکیتی کی وارداتیں بہت عام ہو گئی ہیں اور پولیس ان پراسرار وارداتوں کا پتا چلانے سے قاصر ہے۔"

"لیکن میرے پاس ہے کیا جو کوئی ڈاکا ڈالے گا۔"

"تمہاری زندگی، جو مجھے بہت پیاری ہے۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

"ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ فرید نے مجھے ایک دوا پلائی جس سے اعصاب کو بڑا سکون ملا۔ پھر اس وعدے کے ساتھ کہ وہ صبح کو کار میرے پاس چھوڑ کر جائے گا میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ جب میں بستر پر لیٹا تو صبح کی سپیدی افق پر پھیلنے لگی تھی۔

میں دیر تک سوتا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو گیارہ بج رہے تھے۔ غسل کر کے میں نے لباس تبدیل کیا۔ خانساماں نے ناشتہ لگا دیا۔ بھوک لگ رہی تھی اس لیے پیٹ بھر کر ناشتہ کیا اور جب باہر نکلا تو بارہ بجنے والے تھے۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے میں نے چندر پور کے راستے پر چھوڑ دی۔ ایک ان جانی سی مسرت کا احساس ذہن پر چھاتا جا رہا تھا۔ جیسے میں واقعی موہنی کے پاس جا رہا ہوں، لیکن موہنی تو مر چکی ہے۔

چندر پور جانے والی سڑک اب کچھ چوڑی ہو گئی تھی اور ہموار بھی کر دی گئی تھی۔ اب چونکہ اس پر بس چلنے لگی تھی اس لیے گھوڑے اور یکے کا استعمال کم ہو گیا تھا۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے درخت بھی کم نظر آ رہے تھے اور جھاڑیاں صاف کر دی گئی تھیں، لیکن ڈھلوان پر گھنا جنگل اب بھی موجود تھا۔ راستے میں مجھے صرف ایک بس ملی ورنہ زیادہ تر یاتری پیدل یا گھوڑے پر سوار ملے۔ بدھ کا دن تھا اور شدید گرمی تھی۔ ہوا بند تھی اور ایسا لگتا تھا کہ شام تک بارش ہو جائے گی۔

رام چندر جی کا مندر نظر آنے لگا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بن باس کے زمانے میں انہوں نے قیام کیا تھا۔ راج محل کی عیش و عشرت میں پلنے والا یہ راج کمار کتنی تکالیف برداشت کر کے یہاں پہنچا تھا۔ ان دنوں آمد و رفت کا راستہ بھی نہ رہا ہوگا۔ یہاں نہ کوئی مندر تھا نہ کوئی آبادی، لیکن اس ویران جنگل میں بھی سیتا نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا تھا اور اپنے جیون ساتھی کے دکھ درد میں یہاں بھی برابر کی شریک رہی تھیں۔ میں سوچنے لگا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے کتنی محبت تھی۔ یہ مندر یہ پہاڑی اور یہ ہرے بھرے پرانے درخت سب رام اور سیتا کی محبت کے گواہ ہیں۔ وہ سیتا کی جاں نثاری اور شوہر پرستی کے شاہد تھے۔ یہ جگہ ان کی محبت کی یادگار تھی۔ جس طرح یونانی دیو مالا میں اپالو نے کوہِ اولمپس کو اپنا ٹھکانا بنایا تھا اسی طرح ہندو دیو مالا میں چندر پور کو رام چندر جی کے مسکن کی حیثیت سے متبرک حیثیت حاصل تھی۔

میں انہی خیالات میں گم تھا کہ گجن کماری کی حویلی جانے والی سڑک کا موڑ آ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ سڑک پہلے سے بھی خراب حالت میں تھی۔ جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ جھاڑیاں سڑک کے درمیان میں بھی اگ آئی تھیں، جیسے برسوں سے اس پر سفر نہ کیا گیا ہو۔ میری کار بہت آہستہ رفتار سے ہچکولے کھاتی آگے بڑھ رہی تھی اور مجھے وہ دن یاد آ رہے تھے جب میں موہنی کو لینے یہاں آیا تھا لیکن اب موہنی بہت دور جا چکی تھی۔ میں اسے کبھی نہیں اپنا سکوں گا البتہ اس کی یاد ہمیشہ میرے ذہن میں تازہ رہے گی۔ اس کی محبت سے میری یادوں کا چمن ہمیشہ مہکتا رہے گا۔ گجن کماری...... مجھے یاد آیا کہ اس نے کہا تھا کہ تم موہنی کو کبھی حاصل نہیں کر سکو گے پھر میں یہاں کیوں آیا تھا گجن کماری کے پاس کیوں جا رہا تھا۔

قلعے کا پھاٹک آ چکا تھا۔ اندر داخل ہوا تو ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی جیسے یہاں اب کوئی نہ ہو۔

شاید گجن کماری بھی یہاں سے چلی گئی ہو۔ میں نے اس کے بارے میں کسی سے پوچھا بھی نہیں تھا۔ کار سے اتر کر میں آگے بڑھا۔ اصطبل بھی ویران تھا۔ حویلی میں بھی کسی کی رہائش کے امکان نہ تھے۔ میرا یہاں آنا حماقت تھی۔ میں نے سوچا اور پھر اسی پیڑ کے نیچے جا کر بیٹھ گیا، جہاں ہم نے اپنی محبت کا پہلا اقرار کیا تھا۔ موہنی نہیں تھی، لیکن اس کے کنوارے بدن کی خوشبو فضا میں رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور مجھے بیٹھے بیٹھے ایسی نیند آئی کہ کچھ ہوش نہ رہا۔

آنکھ کھلی تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ حویلی میں روشنی ہو رہی تھی۔ نوکر اور داسیاں بھاگ بھاگ کر کام کر رہے تھے۔ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ نہیں یہ خواب نہ تھا۔ حویلی میں زندگی کے آثار پہلے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ اور پھر گھنگھروؤں کی ہلکی سی چھنک سے میں اچھل پڑا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ درخت کی جس موٹی جڑ کے سہارے میں سو گیا تھا وہاں کوئی بیٹھا ہوا تھا۔

''بڑی گہری نیند سوئے تھے۔'' فضا میں سرگوشی ابھری۔

''خدایا...... اگر میں خواب نہیں دیکھ رہا تو یہ کیا تھا۔ آواز موہنی کی تھی۔

''موہنی تم......!''

''ہاں الیاس! میں تمہاری موہنی ہوں۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''کتنے کٹھور ہو تم۔ کبھی ہمیں یاد بھی نہ کیا۔''

''لیکن...... لیکن میں نے تو سنا تھا کہ تم مر گئیں۔'' وہ غم زدہ انداز میں ہنسی۔

''تمہارے لیے میں کبھی نہیں مروں گی۔ الیاس میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔''

خدایا تو کیا ان لوگوں نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے موہنی کی موت کی اطلاع اس لیے دی گئی تھی کہ میں ادھر کا رخ نہ کروں۔ کتنے ظالم ہیں یہ لوگ۔ میں بے ساختہ موہنی کی سمت مڑا۔

''اوہ...... موہنی...... موہنی...... مجھے معاف کر دو۔ لوگوں نے مجھے دھوکا دیا تھا۔''

دوسرے ہی لمحے وہ میرے بازوؤں میں تھی۔ اس کے جسم سے تیز خوشبوؤں کے بھبکے اٹھ رہے تھے اور وہ رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غم کے بادل اسی طرح لہرا رہے تھے جیسے میں نے خواب میں دیکھا تھا۔

''موہنی......!'' میں نے اس کا بھیگا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔ ''مجھے ست پرکاش اور رتو کی موت کا بڑا دکھ ہے۔'' وہ سسکیاں لینے لگی۔

''اب دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے سوائے تمہارے!'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں روزانہ اس درخت کے نیچے بیٹھ کر تمہیں یاد کرتی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔''

''لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ تم زندہ ہو'' میں نے کہا۔ ''میں یہاں دوپہر سے بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں کوئی نہیں ہے۔ تم مجھے کیوں نظر نہیں آئیں۔''

''مجھے دن میں باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کیا مطلب......؟''

''دن میں اپنے کمرے میں بند رہتی ہوں۔''

''لیکن کیوں......؟ گجن کماری کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تمہیں اس طرح قید رکھے۔''

''آہ الیاس! تم کو کچھ نہیں معلوم۔'' اس نے ایک سرد آہ بھری۔ ''گجن کماری!''

لیکن وہ جملہ مکمل نہ کر سکی۔ تاریکی میں گجن کماری اتنی اچانک نمودار ہوئی تھی کہ ہمیں پتا نہ چل سکا۔ موہنی سہم کر مجھ سے دور ہٹ گئی لیکن گجن مسکرا رہی تھی۔

''ابھی جی نہیں بھرا باتوں سے تم دونوں کا۔'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''کیا تم کو معلوم تھا کہ میں آیا ہوں۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''مجھے سب کچھ پتا رہتا ہے الیاس!'' گجن نے پراسرار انداز میں مسکرا کر کہا۔ ''آؤ کھانا لگ چکا ہے۔''

ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ موہنی نے میرا ہاتھ دبا کر التجا آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ کچھ اشارہ کر رہی تھی لیکن میں نہیں سمجھ سکا۔ ایک بار پھر وہی کمرا تھا۔ وہی ساحرانہ ماحول، وہی نوکر اور داسیاں اور وہی ساز و نغمے کی محفل۔ فرق صرف اتنا تھا کہ گجن کا باپ نہیں تھا اور رقاصہ بھی صرف ایک تھی۔

کھانے کے بعد میں نے گجن سے اس کے باپ کے متعلق پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ موہنی اٹھ کر چلی گئی تھی۔ اچانک طبلے پر تھاپ پڑی اور گھنگھروؤں کی جھنکار گونجی۔ میں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ دو رقاصائیں سامنے تھیں اور ان میں ایک موہنی تھی۔

''گجن......!'' میں نے غصے سے کہا۔

لیکن موہنی نے مجھے نظروں سے منع کیا۔ میں چپ ہو گیا اور پھر رقص شروع ہو گیا۔ فضا میں موہنی کی جادو بھری آواز رس گھولنے لگی۔ وہ دونوں رقص کرتی، پیچ و خم کھاتی میرے سامنے بیٹھ گئیں اور مجھ پر خمار سا چھانے لگا۔ خواب کا سارا منظر حقیقت بن کر میرے سامنے آ گیا تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں بھرے ہوئے جام میرے لبوں تک آ رہے تھے۔ وہ میرے سامنے دراز تھیں اور گجن کسی راج کماری کی طرح شان سے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ میں سب کچھ بھول چکا تھا صرف موہنی کی شکل میرے سامنے تھی۔ فضا میں ساز و آواز کا سحر رچا ہوا تھا۔ ذہن پر ایک نشہ طاری ہوتا جا رہا تھا۔ ایک وارفتگی کا عالم تھا جس میں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

اور پھر جب آنکھ کھلی تو پھر اسی مینار والے کمرے میں تھا۔ ہر سمت تاریکی تھی۔ سکوت تھا۔ ایک عجب بھینی بھینی خمار آلود خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی اور پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ گداز جسم کا لمس، گرم گرم سانسیں۔ میں اچھل کر بیٹھ گیا۔

میں تنہا نہیں تھا۔ گجن میرے ساتھ تھی۔ میں نے غصے میں اسے گھور کر دیکھا۔

''گجن کماری! تم اس طرح مجھ سے کچھ حاصل نہ کر سکو گی۔ میں نے کہا۔ تم جانتی ہو میں موہنی سے محبت کرتا ہوں۔''

''اگر تم اس سے محبت کرتے ہوتے تو اتنے ضدی نہ ہوتے۔''

''کیا...... کیا مطلب؟''

''تم اسے میری مرضی کے بغیر کبھی حاصل نہ کر سکو گے پگلے!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

"اور تمہاری مرضی کیا ہے؟"

"اب تم اتنے نادان بھی نہیں ہو۔" اس نے کافرانہ ادا کے ساتھ کہا۔

"میں سوچنے لگا۔ موہنی کو حاصل کرنے کی یہ قیمت زیادہ نہیں تھی لیکن میرے ضمیر نے موہنی کی محبت کو اتنے پست داموں خریدنا گوارا نہ کیا۔

"نہیں گجن! میں موہنی سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔ میری محبت یہ سودا کرنے پر تیار نہ ہو گی۔" اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تاریکی میں بھی اس کا قیامت خیز حسن دمک رہا تھا اور کسی کو بھی دیوانہ بنا سکتا تھا۔

"سنو الیاس! تم بہت بے وقوف ہو۔ تم نہیں جانتے کہ میں نے کس طرح موہنی کو اب تک بچا رکھا ہے۔ اگر میں نہ چاہتی تو پتا جی کی مرضی کب کی پوری ہو جاتی۔"

"پتا جی کی مرضی؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "وہ کیا ہے؟"

"وہ چھوڑو۔ لیکن میں تم سے آخری بار کہہ رہی ہوں۔ صرف اس لیے کہ میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ موہنی کو دکھ پہنچاؤں۔ آج تک کسی کو مجھے ٹھکرانے کی ہمت نہیں ہوئی، لیکن میں موہنی سے سگی بہن کی طرح پیار کرتی ہوں۔ صرف اس لیے تم کو موقع دے رہی ہوں۔"

"یہ اچھا پیار ہے کہ اس کے پیار پر ڈاکا ڈالنا چاہ رہی ہو۔" میں نے طنزیہ کہا۔

"نہیں۔ میں صرف اپنے پیار کی تسکین چاہتی ہوں، پھر موہنی آزاد ہو گی۔"

"مجھے افسوس ہے گجن میں......"

"مورکھ! کیا تو سمجھتا ہے کہ میں مجبور ہوں۔" اس نے غصے سے پھنکار کر کہا۔ اس وقت تو میرے اختیار میں ہے۔ تیرا تعویذ بھی میری راہ میں حائل نہیں ہے۔"

میرا ہاتھ بے ساختہ اپنے بازو پر گیا۔ تعویذ غائب تھا۔ "تعویذ کہاں گیا گجن!" میں نے گرج کر پوچھا۔

"یہ اپنی موہنی سے پوچھنا۔" اس نے زہریلی ہنسی سے جواب دیا۔ "میں تمہیں ایک موقع اور دیتی ہوں پھر تمہاری قسمت جانے۔"

"تم مجھے کبھی مجبور نہ کر سکو گی۔ گجن میں......"

"لیکن گجن وہاں نہیں تھی۔ میں نے اندھیرے میں ہر سمت گھورا لیکن کمرا خالی تھا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ سرہانے رکھے ہوئے شمع دان کو جلانے کے لیے ماچس بھی نہ تھی لیکن تاریکی سے آنکھیں عادی ہو گئی تھیں اور میں نے ہر سمت دیکھا۔ گجن کا کہیں پتا نہ تھا۔ کسی ان جانے خوف سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں دروازے کی سمت بڑھا لیکن اسی لمحے دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوئی۔" موہنی تھی۔

"موہنی!" میں نے بے ساختہ آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ "گجن تمہاری دشمن ہے؟ موہنی! وہ تمہاری محبت کو چھین لینا چاہتی ہے۔ وہ...... وہ......"

"اس کی بات مان لو الیاس ورنہ......"

"یہ تم کہہ رہی ہو موہنی!"

"ہاں الیاس! اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے، ورنہ تم کو ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھین لے گی۔"

"نہیں موہنی! میں صرف تمہارا ہوں۔ یہ میری محبت، میری زندگی، سب کچھ صرف تمہارے لیے ہے۔ گجن کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔"

"الیاس......!" موہنی نے غصے میں کہا۔ "تم آخر سمجھتے کیوں نہیں؟"

"میں کیا نہیں سمجھتا......؟"

"موہنی نے بے بسی کے عالم میں سسکی لی۔

"گجن اور راجا جی دونوں......"

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے دروازہ زور سے کھلا۔ گجن سامنے کھڑی تھی۔

"تم جاؤ موہنی! اس مورکھ کو بھول جاؤ۔ پتا جی کا یہی حکم ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"نہیں نہیں۔" موہنی مجھ سے لپٹ گئی۔ اتنی ظالم نہ بنو گجن۔ تم نے مجھے وچن دیا تھا۔"

"وقت گزر گیا موہنی! اب میں مجبور ہوں۔ جاؤ پتا جی تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" اس کا لہجہ اتنا تحکمانہ تھا کہ موہنی میرے پاس سے ہٹ گئی، لیکن اس نے کوئی چیز میری مٹھی میں دبا دی تھی۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا وہ تعویذ تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ موہنی کرب آمیز اور بے بس نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"جاؤ۔" گجن گرجی۔

موہنی دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں چونک پڑا۔

"ٹھہرو موہنی......!" میں نے غصے سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "گجن کماری تم کو مجبور نہیں کر سکتی۔"

"یہ تم کو ابھی اندازہ ہو جائے گا۔" گجن کماری نے درمیان میں آتے ہوئے کہا۔

اس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے تھے اور آنکھیں...... وہ انگارے کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف بڑھ رہی تھی۔ "اب تم صرف اور صرف میرے ہو اور ہمیشہ ہمیشہ میرے ہی رہو گے۔"

میں نے خوف زدہ ہو کر اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میرا ہاتھ جیسے ہی اس کے بازو سے ٹکرایا۔ وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹی۔ آنکھوں کی آگ اچانک بجھ گئی اور وہ وحشت زدہ نظروں سے میرے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اس میں میرا تعویذ تھا جو موہنی مجھے واپس کر کے گئی تھی۔ گجن کماری اس تعویذ سے خوف زدہ تھی، لیکن کیوں......؟ اچانک ایک بھیانک شبہ میرے ذہن میں جنم لینے لگا اور عین اسی لمحے کوئی چیز پھڑ پھڑاتی ہوئی میرے سر سے گزری۔ میں خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹا۔ خوف سے میرا دل زور زور سے اچھل رہا تھا۔ فضا میں سیٹی کی سی آواز گونجی اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ صرف ایک چمگادڑ تھی۔

اس نے اچانک مجھ پر ایک اور جھپٹا مارا، جیسے حملہ کر رہی ہو۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹا اور اسی لمحے وہ پھڑ پھڑاتی ہوئی دریچے سے باہر نکل گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو گجن کماری بھی غائب تھی۔

چند لمحے بعد جب حواس قابو میں آئے تو میں بستر پر بیٹھ گیا۔ تعویذ میں نے اپنے بازو پر باندھا

اور فوری طور پر فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو۔ موہنی کو لے کر ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں اس عزم کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا اور زینہ اتر کر پہلی منزل پر پہنچا۔ گجن کماری اور اس کے پتا جی یہیں رہتے تھے اور مجھے یقین تھا کہ موہنی بھی یہیں پر ہوگی۔ اس نے کہا تھا کہ دن میں اسے کمرے سے نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یقیناً ان لوگوں نے اسے یہیں قید کر رکھا ہوگا۔ میرا دل موہنی کے ساتھ اس ظالمانہ سلوک کے تصور سے غم و غصے سے بھر گیا۔ سامنے ایک لمبی راہ داری تھی جس کے دونوں جانب کمرے تھے اور ہر سمت تاریکی مسلط تھی۔ سناٹا ایسا تھا جیسے میں قبرستان میں پہنچ گیا ہوں۔ جانے موہنی کس کمرے میں ہوگی۔ میں کچھ ہی دور گیا تھا۔ ایک دروازے سے بولنے کی آواز سن کر رک گیا۔ آواز گجن کماری کے پتا کی تھی اور وہ شدید غصے کے عالم میں بول رہے تھے۔

"اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔" وہ گرج کر بولے۔ "تمہاری وجہ سے یہ پہلے بھی بچ کر نکل گیا اور آج بھی تمہاری حماقت......"

لیکن وہ تعویذ اسے یقیناً موہنی نے واپس کیا ہوگا۔ گجن کماری نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"موہنی......موہنی......تم نے اسے بلاوجہ سر پر چڑھا رکھا ہے، کسی دن میں اس کا خون پی جاؤں گا۔"

"نہیں پتا جی! آپ اس کو ہاتھ نہیں لگائیں گے" گجن کماری نے غصے میں کہا۔

"پاگل لڑکی اگر تو سمجھتی ہے کہ تو اسے بچالے گی تو یہ تیری بھول ہے۔ آج صرف میرا حکم چلے گا۔"

"مجھے خطرے کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ یہ لوگ موہنی سے انتقام لینے پر آمادہ تھے اور مجھے اس سے پہلے موہنی کو یہاں سے نکال کر لے جانا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے ہر کمرے کا دروازہ کھول کر جھانکنا شروع کر دیا، لیکن تمام کمرے سنسان پڑے تھے۔ ان سے آنے والی سیلن کی بو سے ظاہر تھا کہ یہاں کوئی نہیں رہتا، لیکن اگلے کمرے میں جھانک کر جب میں واپس ہونے والا تھا اچانک میری نظر مسہری پر پڑی اور میں رک گیا۔ کوئی اوندھے منہ مسہری پر پڑا تھا۔ میں لپک کر مسہری کے قریب پہنچا۔ تاریکی میں بھی موہنی کو پہچاننا میرے لیے دشوار نہ تھا۔

"موہنی......!" میں نے آہستہ سے کہا، لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے جلدی سے اس کے شانے ہلائے۔ "موہنی خدا کے لیے جلدی اٹھو۔ وقت کم ہے لیکن وہ پھر بھی پڑی رہی۔ خوف سے میرا دل کانپ اٹھا۔ کہیں ان ظالموں نے اسے ختم تو نہیں کر دیا۔ میں نے جھک کر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور پھرتی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا۔ نیچے پہنچتے ہی میں نے اسے کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال کر شیشے چڑھائے اور دروازوں کو اندر سے لاک کر کے اسٹیئرنگ سنبھالا۔ کار بغیر کسی دشواری کے اسٹارٹ ہوگئی۔ میں نے لائٹ نہیں جلائی تا کہ ان لوگوں کو ہمارے فرار کا پتا نہ لگ جائے اور کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔

قلعہ سے باہر نکل کر میں نے چند ہی فرلانگ کا فاصلہ طے کیا تھا کوئی سیاہ سی شے سامنے شیشے سے ٹکرائی۔ میرے پیر بے ساختہ بریک پر چلے گئے۔ دوسرے ہی لمحے میری نظریں دو بہت بڑی سیاہ چمگادڑوں پر پڑیں جو کار کے سامنے چکرا رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں تاریکی میں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے اپنی کھڑکی کا شیشہ بھی چڑھا لیا اور کار پھر آگے بڑھنے لگی۔

دونوں چمگادڑیں غیظ وغضب کے عالم میں حملہ کر رہی تھیں اور پھر میں نے محسوس کیا کہ ان حملوں کا مرکز پچھلی سیٹ تھی۔ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ وہ موہنی سے انتقام کی باتیں کر رہے تھے۔ موہنی کی زندگی خطرے میں تھی۔ میں نے پھرتی سے وہ تعویذ اپنے بازو سے کھولا اور موہنی کے بازو پر باندھ دیا۔

ایک بھیانک سیٹی فضا میں گونجی۔ آواز اتنی تیز اور بھیانک تھی کہ میں دہشت سے کانپ گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، کار کے سامنے والے شیشے پر ایک چمگادڑ کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔ میں نے کار تیزی سے آگے کی طرف بڑھا دی۔ خوف و دہشت کے باعث میری ہمت نہ ہوئی کہ میں دروازہ کھول کر باہر اتروں اور اسے بھگا سکوں۔ ایک ان جانے اور شدید خطرے کا احساس حواس پر چھایا ہوا تھا۔ میں آگے بڑھا اور پھر اچانک میری نظریں چمگادڑ کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ ایسا لگا جیسے بجلی نے زوردار جھٹکا مارا ہو۔ انگاروں کی طرح دہکتی آنکھوں پر میری نگاہ جم کر رہ گئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے چمگادڑ کا جسم پھیلتا جا رہا ہو۔ یہاں تک کہ مجھے سامنے سوائے سیاہی کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تمام جسم میں ایک عجیب سی سنسناہٹ ہو رہی تھی اور میں تاریکی میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے جسم میں آگ بھر دی ہو۔ سر پر ہتھوڑے سے چل رہے تھے۔ دم گھٹتا جا رہا تھا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ سورج کی تیز روشنی سے کار آگ ہو رہی تھی۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں، اس لیے شاید حبس سے دم گھٹتا جا رہا تھا۔ کوئی کھڑکی پر دستک دے رہا تھا۔ سورج کی وجہ سے آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں اس لیے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ تمام جسم پسینے سے تر تھا۔ پچھلی سیٹ پر موہنی آرام سے سو رہی تھی۔ اس کے لبوں پر بڑی معصوم سی مسکراہٹ تھی۔ سنہرے بالوں اور ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ کسی نے پھر زور زور سے شیشے پر تھپکی دی۔ میں نے چونک کر دیکھا اور پھر شیشہ نیچے گرا دیا۔ تازہ ہوا کا جھونکا اندر آیا تو جیسے جان آ گئی۔ میں نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔

"دو باوردی پولیس والے اندر جھانک رہے تھے اور کار چندر پور جانے والی سڑک کے ایک خطرناک ڈھلوان پر بیچ میں کھڑی تھی۔ مجھے یاد نہ تھا کہ میں یہاں کیسے پہنچا اور کار کیسے رکی۔ ذرا سی غفلت مجھے موت کے منہ میں لے جا سکتی تھی، کیونکہ سامنے سینکڑوں فٹ گہری کھائی تھی۔

"ذرا باہر تشریف لے آیئے۔" ایک نوجوان پولیس افسر نے مجھ سے کہا۔ میں بلا تامل کار سے باہر اتر آیا۔ کچھ فاصلے پر پولیس کی ایک اور جیپ کھڑی ہوئی تھی، جس میں چند پولیس والے بھی بیٹھے نظر آ رہے تھے۔

"جی فرمایئے۔"

"یہ کار پارک کرنے کی جگہ ہے۔"

"نہیں اور مجھے خود علم نہیں کہ میں کب یہاں پہنچا اور کیسے کار یہاں رکی۔"

"کیا آپ نشے میں تھے؟"

"نہیں۔ لیکن......" میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اسے کیا بتاؤں۔

"آپ کا نام الیاس ہے؟"

"جی ہاں، لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"ڈاکٹر فرید آپ کے لیے پریشان ہیں۔ ہم آپ کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور آپ یہاں دا عیش دے رہے ہیں، بیچ سڑک پر۔" اس نے پچھلی سیٹ پر موہنی کو گھورتے ہوئے کہا۔

میرا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ موہنی کے متعلق ایسی رکیک بات کیسے سن سکتا تھا۔

"تمیز سے بات کرو سب انسپکٹر!" میں نے غصے میں کہا۔ "یہ کوئی آوارہ لڑکی نہیں ہے۔"

"اسی لیے رات سے تمہارے ساتھ یہاں سنسان اور ویران جگہ سو رہی ہے۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔"

"مسٹر الیاس! اگر ڈاکٹر فرید آپ کے دوست نہ ہوتے تو میں تم کو اچھی طرح سمجھتا۔ ادھر آئیے ادھر آئیے۔" وہ مجھے لے کر کار کے پیچھے آیا۔ "ڈگی کھولو۔" اس نے کانسٹیبل سے کہا۔ کانسٹیبل نے ڈگی کا ڈھکن اوپر اٹھایا۔

میں دم بخود رہ گیا۔ خوف سے میرا جسم لرز گیا۔ اندر ایک لڑکی سکڑی ہوئی پڑی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور لباس سے کسی دیہات میں رہنے والی معلوم ہوتی تھی، لیکن وہ مردہ تھی۔ اتنے فاصلے سے بھی اس کی خوف سے کھلی ہوئی آنکھیں موت کا پتا دے رہی تھیں۔

"اب آپ مجھے سمجھا سکیں گے کہ یہ کیا ہے؟"

"مم...... میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے بہ مشکل کہا۔ "نہ مجھے یہ پتا ہے کہ اسے یہاں کس نے بند کیا اور یہ کیسے مری؟"

"اور وہ لڑکی کون ہے؟" اس نے موہنی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ موہنی ہے۔"

"یہ آپ کی کار میں کیا کر رہی ہے؟"

"میں اسے لے کر اس کے گھر جا رہا ہوں۔ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔"

"آپ اسے کہاں سے لا رہے ہیں؟"

"گجن کماری کی حویلی سے۔"

اس نے مجھے غور سے گھورا۔ "یہ وہاں کیا کر رہی تھی؟"

"گجن کماری نے اسے زبردستی قید کر رکھا تھا۔" اس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"بہت اچھا۔ آپ نے گجن کماری کو دیکھا تھا؟"

"جی ہاں۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ موہنی سے انتقام لے گی، اس لیے میں اسے حویلی سے لے جا رہا تھا۔" اب وہ عجیب انداز میں مسکرا دیا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہا ہو۔

"آپ اس طرح کیوں ہنس رہے ہیں؟ میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ کیوں نہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے مجبور ہوں، اس لیے آپ ایسا کیجیے کہ فی الحال اس لڑکی کے گھر چلیے۔

ہم پہلے تھانے میں آپ کا بیان لیں گے، اس کے بعد سوچیں گے کہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کریں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب بھی تھانے چل کر پوچھ لیجیے گا۔" اس نے کہا۔ "کیا اتنا کافی نہیں کہ آپ کی کار کی ڈگی سے ایک لاش برآمد ہوئی ہے۔"

"لیکن میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"یہی حال ہمارا اپنا بھی ہے مسٹر الیاس! لیکن چند ماہ سے اس علاقے میں ہر روز کسی نہ کسی نوجوان لڑکی یا لڑکے کی لاش برآمد ہو رہی ہے اور ان کی موت کا سبب ہم اب تک نہیں معلوم کر سکے۔ نہ ہی قاتل کے بارے میں کچھ پتا چل سکا۔ پہلی بار ہمیں کوئی مشتبہ شخص ملا ہے، لیکن خیر یہ گفتگو تھانے پہنچ کر ہوگی۔"

مجھے اپنی حالت کا احساس پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ صورت حال بڑی نازک تھی۔ میں لاش کے بارے میں کوئی وضاحت کرنے سے قاصر تھا، لیکن وہ میری کار سے مشتبہ حالت میں برآمد ہوئی تھی اس لیے پریشانی قدرتی تھی لیکن سب انسپکٹر کے حکم کی تعمیل کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

تھانے پہنچنے کے ذرا دیر بعد ہی فرید وہاں آ گیا۔ نامعلوم لڑکی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی۔ فرید بھی صورتِ حال سے بڑا پریشان تھا۔ میری واحد گواہ موہنی تھی جو میری صفائی میں کچھ کہہ سکتی تھی، لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود اسے بیدار نہ کیا جا سکا۔ اس پر پراسرار بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی، اس لیے اسے اسپتال بھیج دیا گیا۔ میں نے فرید سے کہا کہ میں پولیس کو بیان دینے سے پہلے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ فرید کے لیے اس کا انتظام کرنا مشکل نہیں تھا۔ چند منٹ کے بعد ہم ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھ گئے۔

"سب سے پہلے تو میں یہ بتاؤں کہ میں بے قصور ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ لڑکی کی لاش ڈگی میں کس نے رکھی اور اسے کس نے ہلاک کیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے الیاس!" فرید نے جواب دیا۔ "پولیس بھی تم کو مجرم نہیں سمجھتی لیکن جن حالات میں لاش ملی ہے وہ تم کو مشتبہ ضرور بنا دیتے ہیں۔"

"بے شک، لیکن اب تک یہ معما حل نہیں ہو سکا۔"

"چند ماہ سے چندر پور کے گرد و نواح میں ہر روز ایک لاش ضرور ملتی ہے۔" فرید نے بتایا۔ "اس لیے پولیس وہاں تعینات ہے، لیکن تمام تر نگرانی کے باوجود یہ سلسلہ جاری ہے اور کوئی سراغ نہیں مل سکا۔" اس نے کہا۔

"عام طور پر پوجا کرنے والے یاتری شکار ہوتے ہیں۔ میں نے خود کوئی پانچ چھ لاشوں کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ ہر ایک کی موت خون کی کمی سے واقع ہوئی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی نے جسم کا خون کا قطرہ قطرہ چوس لیا ہے۔ جسم پر کسی قسم کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ سوائے گردن کے جہاں دو متورم باریک سوراخ ملتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کسی پراسرار درندے کا شکار ہوتے ہیں۔"

میں سوچتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں گجن کماری کے پتاجی کے الفاظ گونجے۔ "میں اس کا خون پی کر دم لوں گا۔" اور میں اچھل پڑا۔

"سنو فرید!...... مجھے نہیں معلوم کہ میرا شبہ کس حد تک صحیح ہے۔ لیکن پہلے تم میری داستان کی تفصیل سن لو۔"

اور پھر میں نے موہنی، ست پرکاش اور ریتو سے اپنے تعلقات سے لے کر گجن کماری سے پہلی ملاقات سے اب تک کے تمام واقعات اسے تفصیل سے سنا دیے۔ وہ دم بہ خود سنتا رہا۔ ایک مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پوچھنا چاہتا ہے، لیکن پھر چپ ہو گیا اور جب میں تفصیل بتا چکا تو اس نے پوچھا۔

"تم کہتے ہو کہ گزشتہ رات گجن کماری اور اس کے پتا جی سے ملاقات ہوئی تھی۔" اس نے کہا۔

"تم کو یقین ہے...... کہیں یہ بھی کوئی خواب تو نہیں؟"

"نہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ میں نے بیداری کے عالم میں یہ دیکھا ہے۔"

"سب انسپکٹر نے مجھے تمہاری گفتگو کے بارے میں بتایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"لیکن میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟"

"الیاس! تمہاری اس بات پر کوئی کیسے یقین کر سکتا ہے؟ کیا تم کو یہ علم نہیں کہ گجن کماری اور اس کے باپ کو مرے ہوئے مدت گزر چکی ہے۔"

"کیا......؟" میں حیرت سے اچھل پڑا۔ "یہ ناممکن ہے۔"

"یہ حقیقت ہے۔ تمام لوگ اس کے گواہ ہیں۔" اس نے یقین دلایا۔

"تو پھر میرے خدا!...... تو کیا میرا یہ شبہ ٹھیک ہے کہ......" میں نے شدید کش مکش کے عالم میں کہا۔

"بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔" فرید نے جواب دیا۔ "لیکن آج کل کے دور میں کون ویمپائر کے وجود پر یقین کرے گا۔ بلاشبہ بعض اوقات قدیم کتابوں میں ان کے وجود کا اعتراف کیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسے مردے رات کو انسانوں کی طرح زندہ ہو جاتے ہیں اور ان میں اور عام انسانوں میں تمیز کرنا ناممکن ہوتا ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ وہ انسانوں اور جانوروں کے خون سے سیراب ہو کر زندہ رہتے ہوں اور اپنے شکار کو سحر زدہ کر کے قابو میں کر لیتے ہیں، لیکن اگر یہ کہانی پولیس کو سنائیں گے تو کون یقین کرے گا؟"

"مجھے احساس ہے فرید!...... لیکن یہ حقیقت ہے۔"

"پھر انہوں نے تم کو کیسے چھوڑ دیا؟"

"شاید گجن کماری نے سچ کہا ہو شاید اسے واقعی مجھ سے محبت ہو گئی ہو اور شاید......"

"لیکن پیارے عدالت اس شاید پر یقین نہیں کرے گی۔ ہمیں اس دور کے قانون سے واسطہ ہے جو ویمپائر کو نہیں مانتا۔"

"صرف ایک صورت ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا......؟"

میں نے اسے اپنی تجویز بتائی۔ "اس صورت میں پولیس خود چشم دید گواہ بن جائے گی۔"

"ہاں تجویز معقول ہے۔" فرید نے کہا۔ "میں ابھی ایس پی سے بات کرتا ہوں۔"

"اس سے پہلے میں موہنی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ شاید اسے ہوش آ گیا ہو۔ اس کا بیان تمہاری بات میں وزن پیدا کر سکتا ہے۔" اس نے کہا۔ "آؤ۔ پہلے اسپتال چلتے ہیں۔"

فرید، انسپکٹر گورکھن میرے ساتھ تھے۔ ہم اسپتال پہنچے تو موہنی بے ہوش تھی۔ وہ اس طرح بے خبر پڑی تھی جیسے گہری نیند سو رہی ہو۔ میں نے سرہانے پہنچ کر اس کا شانہ ہلایا، لیکن کوئی اثر نہیں ہوا۔ اچانک میری نظر اس کے سرہانے رکھے ہوئے تعویذ پر پڑی اور میں چونک گیا۔ شاید نرس نے اسے انجکشن وغیرہ دیتے ہوئے اسے کھول کر رکھ دیا ہوگا۔ میں نے تعویذ فوراً اس کے بازو پر باندھا۔

"کیا کر رہے ہو الیاس!" فرید نے پوچھا۔

"تم اس بات کی سختی سے ہدایت کر دو کہ یہ تعویذ ایک لمحے کے لیے بھی اس کے بازو سے نہ کھولا جائے۔" میں نے کہا۔

"کیوں......؟" فرید نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"اس کی زندگی بچانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں نے تم بتایا نہیں تھا کہ گجن کماری اس تعویذ سے دور بھاگتی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم دونوں یہیں ٹھہرو میں ابھی آیا۔" اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"الیاس صاحب!" انسپکٹر گورکھن نے کہا۔ "شاید میری جگہ کوئی اور ہوتا تو آپ کو مکار یا دیوانہ تصور کرتا، لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کا شبہ صحیح ہے۔"

"واقعی انسپکٹر......!" میں خوش ہو کر بولا۔ "تم کو میری بات پر یقین ہے۔"

"ہاں، کیوں کہ میں چھٹیوں میں گھر گیا تھا تو ایک دن میں نے ان پراسرار وارداتوں کا ذکر اپنے پتا جی سے کیا تھا۔ انہوں نے بھی یہی شبہ ظاہر کیا تھا اور مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں مولانا اکبر سے اس سلسلے میں ملاقات کروں، لیکن میں نے ان کی بات پر توجہ نہ دی تھی۔"

"یہ اکبر علی کون ہیں؟"

"ہمارے گاؤں کے ایک بزرگ ہیں۔ کہتے ہیں بڑے عالم ہیں اور ایسے معاملات میں بڑا عبور رکھتے ہیں۔"

"تو پھر ہم کیوں نہ آزمائش کر لیں۔ ہو سکتا ہے اس سے بہت سے بے گناہوں کی زندگی بچ جائے۔"

"ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔" انسپکٹر نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن معلوم نہیں مولانا اکبر علی یہاں آنے کو تیار بھی ہوں گے یا نہیں؟"

"کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟"

"ٹھیک ہے، لیکن میرا گاؤں بہت دور ہے۔ وہ آج تو یہاں نہیں پہنچ سکیں گے، پھر بھی میں آدمی بھیج دیتا ہوں۔"

اسی وقت فرید اپنے ساتھ ایک عمر رسیدہ ڈاکٹر کو لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ میٹرن اور دو نرسیں

بھی ان کے ساتھ تھیں۔ فرید نے ہم سے ان کا تعارف کرایا۔

''الیاس! یہ ڈاکٹر سہاش ہیں۔ ہمارے اسپتال کے سینئر فزیشن۔'' اس نے کہا۔ ''موہنی ان کے زیرِ علاج ہے۔''

میں نے بڑے ادب سے ڈاکٹر سہاش سے ہاتھ ملایا۔ ''ڈاکٹر! اس کے ہوش میں آنے کی کب تک امید ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں خود حیران ہوں۔'' ڈاکٹر سہاش نے کہا۔ ''اس کی بے ہوشی کا کوئی مسئلہ نظر نہیں آیا۔ کم از کم فزیکلی وجہ نہیں ہے۔ میں نے اچھی طرح معائنہ کرلیا ہے اور ہوش میں لانے کی تمام تر تدابیر کر چکا ہوں۔ صرف یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس بے ہوشی کا کوئی نفسیاتی سبب ہو۔ کوئی صدمہ پہنچا ہو یا پھر......''

''یا پھر......ڈاکٹر!'' انسپکٹر نے فوراً پوچھا۔

ڈاکٹر سہاش نے ہماری طرف دیکھا۔ ''فرید نے مجھے تمام تفصیلات بتادی ہیں۔'' انہوں نے کہا۔ ''اور اگر ان پر اعتبار کرلیا جائے تو پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ لڑکی ان ہی غیر مرئی اثرات کے زیرِ اثر ہو۔''

''کیا یہ ممکن ہے ڈاکٹر!'' میں نے پوچھا۔

''دنیا میں بہت سے اسباب ایسے ہیں جس پر سائنس کے نقطہ نظر سے اعتبار نہیں کرسکتے، پھر بھی ہمیں ان سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اور ہم ان کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ بہرحال وقت اس حقیقت کو ثابت کردے گا۔''

موہنی کے لیے ایک علیحدہ کمرا اور دو نرسوں کا بندوبست کردیا گیا۔ جب ہم باہر نکل رہے تھے تو فرید نے کہا۔

''میں نے تعویذ کے بارے میں سختی سے ہدایت کردی ہے، تم فکر مت کرو۔''

ہم پولیس اسٹیشن پہنچے۔ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آگئی تھی۔ نامعلوم لڑکی کے جسم میں خون کی کمی کی وجہ سے موت واقع ہوئی تھی۔ اس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔

میں بے حد تھکا ہوا تھا۔ فرید کی ضمانت پر مجھے اس کے بنگلے میں جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ نہا دھوکر میں نے لباس تبدیل کیا اور سہ پہر کو کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ہم جب چائے پی رہے تھے تو ڈاکٹر سہاش بھی آگئے۔

''اگر تم برا نہ مانو تو ایک تجویز پیش کروں فرید!''

''جی فرمایئے۔''

''الیاس کو میرے حوالے کردو۔ میں ان کو اپنے نفسیاتی وارڈ میں رکھنا چاہتا ہوں۔''

فرید نے میری سمت دیکھا۔

''ڈاکٹر ویسے میں پاگل نہیں ہوں، لیکن مجھے منظور ہے۔ اس طرح میری بھی تسلی ہوجائے گی۔''

ڈاکٹر سہاش مسکرادیے۔ ''مجھے تمہاری ذہنی حالت پر شبہ نہیں ہے الیاس!'' انہوں نے کہا۔ ''لیکن میں تمہاری ذہنی کیفیت کا بہ خوبی معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں حاضر ہوں ڈاکٹر!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نفسیاتی وارڈ کی دو منزلہ عمارت کسی قید خانے سے کم نہ تھی۔ بلند چہار دیواری پر خاردار تاروں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ داخلے کا صرف ایک گیٹ تھا جس پر مسلح پہرے دار ہر وقت موجود رہتا تھا۔ احاطے کے اندر بہت بڑی بڑی سرچ لائٹیں لگی ہوئی تھیں۔ مضبوط جسم والے بہت سے وارڈ بوائے عمارت کے مختلف حصوں میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر سہاش ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک میرا معائنہ کرتے رہے۔ ایکسرے، خون اور پیشاب اور تمام کیمیکل ٹیسٹ کے بعد انہوں نے مجھے صحیح الدماغ قرار دیا تھا اور پھر مجھ سے دوبارہ تمام تفصیلات سنتے رہے۔ انہوں نے مجھ سے اتنے سوالات کیے کہ میں تھک گیا اور بالآخر وہ مجھے اس کمرے تک چھوڑنے آئے، جو پہلی منزل پر واقع تھا۔

کمرے میں ایک آرام دہ بستر، دو کرسیاں اور ایک میز موجود تھی۔ میز پر تازہ پھل، ایک گلاس میں دودھ اور ایک میں جوس رکھا ہوا تھا۔ کھانے کے لیے پلیٹ میں صرف دو سینڈوچز تھے لیکن ہر چیز پلاسٹک کی تھی۔ شیشے یا لوہے کی کوئی چیز نہ تھی۔ کمرے کی واحد کھڑکی مین گیٹ کی طرف کھلتی تھی، لیکن اس پر لوہے کی موٹی سلاخیں مضبوطی سے لگی ہوئی تھیں۔ روشن دان بلندی پر تھا غرض یہ کہ ذہنی مریضوں کو رکھنے کے لیے تمام احتیاطی تدابیر کی گئی تھیں۔ میرا ذہن موہنی میں لگا ہوا تھا، لیکن ڈاکٹر نے فون کرنے کے بعد بتایا تھا کہ وہ اب تک بے ہوش ہے۔

مجھے ابھی بھوک نہیں تھی اس لیے میں بستر پر آرام سے لیٹ گیا۔ ذہن یہ بات قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ جس جگن کماری سے میں اتنی بار مل چکا ہوں، جس کے گداز جسم کا لمس محسوس کر چکا ہوں، جس سے اتنی بار بات چیت کر چکا ہوں وہ انسان نہ تھی......ویمپائر تھی۔ ایک ایسی لاش تھی جو نہ زندوں میں تھی نہ مردوں میں، جس کی غذا خون تھی۔ انسان کا تازہ لہو پی کر جس کے جسم میں زندگی کی توانائیاں بھر آتی تھیں اور جو رات کو زندہ ہوجاتی تھی۔ تاریکی میں اس کے لیے حیات اور اجالا اس کی موت کا پیامبر تھا۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔

وہ مجھ سے محبت کرتی تھی اور موہنی سے پیار کرتی تھی اور اس لیے اس نے ہم دونوں کا لہو نہیں پیا۔ اپنے باپ کو ہم سے دور رکھا۔ وہ بہرحال ایک عورت تھی۔ شاید اسے زندگی میں پیار نہیں ملا تھا اس لیے وہ پیار کی بھوکی تھی۔ مجھے اس کی التجا آمیز آنکھیں یاد آگئیں اور اس سے نفرت کے بجائے ایک نامعلوم سی ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

تاریکی پھیلتے ہی کمرے کی بجلی روشن ہوگئی اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ بجلی کا سوئچ بھی کمرے میں نہیں تھا۔ اسی لمحے ڈاکٹر سہاش کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ہمراہ ایک شخص بھی تھا۔ اس نے کمرے میں ایک خودکار کیمرہ نصب کیا جس کا رخ دریچے اور روشن دان کی طرف تھا۔ اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر سہاش میرے بستر کے قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

''تم نے جو تجویز فرید کو پیش کی تھی۔ اس میں تھوڑی سی ترمیم میں نے کردی ہے۔'' انہوں نے کہا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی ''شاید کافی آگئی۔ کم ان۔'' انہوں نے کہا۔ ایک باوردی سفید پوش بیرا

کافی کے دومگ ٹرے میں لیے اندر داخل ہوا۔

''لو کافی پی لو۔''

''شکریہ۔'' میں نے کپ لیتے ہوئے کہا۔

''مسٹر الیاس!'' ڈاکٹر سبھاش نے کہا۔ جب میں لندن میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو مجھے روحانیت پر تحقیق کا شوق ہوا اور میں سائمک سوسائٹی کا ممبر بن گیا۔ انہوں نے ایک کافی کا مگ لے کر میری سمت دیکھا۔ یہ ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جو روحانیت پر تحقیق کا سب سے پرانا مرکز ہے اور اس میں دنیا کے تقریباً تمام ممبر شامل ہیں۔ ہندوستان سے اس کی نمائندگی کا شرف مجھے حاصل ہے۔ ہم روح کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔ دنیا میں ہونے والے تمام روحانی واقعات کا ریکارڈ اس سوسائٹی میں موجود ہے اور یہیں پر مجھے ویمپائر کے وجود کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔

''تو میرا شبہ غلط نہیں تھا۔'' میں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''نہیں، لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ شک کیوں ہوا؟''

''کجن کماری میرے تعویذ کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی تھی اور گزشتہ رات جب وہ میری سمت بڑھی تو تعویذ اس کے بازو پر مس ہو گیا۔ وہ چیخ کر خوف زدہ انداز میں پیچھے ہٹی اور اس کے بعد ایک چمگادڑ نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ تب میرے ذہن میں اس شبے نے جنم لیا۔ میں نے ویمپائر پر ایک ناول پڑھی تھی اور جو کچھ پڑھا تھا وہ میرے حالات سے بڑی مشابہت رکھتا تھا۔

''تم بہت خوش قسمت ہو الیاس!'' ڈاکٹر سبھاش نے کہا۔ ''ورنہ کجن کماری اب تک تم کو اپنی برادری میں شامل کر چکی ہوگی۔''

''لیکن ڈاکٹر رات کو حویلی میں نوکر چاکر، وہ رقص و سرور...... کیا وہ سب بھی خواب تھا؟''

''نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ سب کجن کماری یا اس کے باپ کے شکار ہوں اور ان کی طرح تاریکی میں زندہ ہو جاتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کو تنویمی کیفیت میں نظر آتے ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''ویمپائر ایک تیز اور زود اثر تنویمی قوت کی مالک ہوتی ہیں۔ وہ عموماً اپنے شکار کو ہپناٹائز کر کے بے بس کر دیتی ہیں تاکہ وہ مزاحمت نہ کر سکے۔''

مجھے اچانک کجن کماری کے باپ کی آنکھیں یاد آئیں اور پھر دو چمگادڑ جس نے کار کے سامنے بیٹھ کر مجھے بے حس کر دیا تھا۔ اس کی انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتے ہی میں سحر زدہ سا ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر! اگر یہ سچ تسلیم کر لیا جائے کہ میرا واسطہ ویمپائر کے ایک خاندان سے تھا تو یہ سب زندہ کیسے تھے۔ ان کو غذا کے لیے اتنا خون کہاں سے مل جاتا تھا؟''

''ڈاکٹر سبھاش مسکرا دیے۔''

''بڑا اچھا سوال ہے۔ میں نے بھی اس بارے میں سوچا تھا۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''ویمپائر جانوروں اور انسانوں کے خون پر زندہ رہتی ہے۔ میں نے انسپکٹر گورکچن سے معلومات کی ہیں۔ بہت مدت سے چندر پور کے علاقے میں جانوروں کی لاشیں ملتی تھیں، جن کے جسم پر کوئی نشان نہ ہوتا تھا۔ جب ابتداء میں یہ سلسلہ شروع ہوا تو لوگوں نے سمجھا کہ سانپ کے کاٹنے سے یہ مرے ہیں، بعد میں لوگوں نے اس کو جانوروں کی پراسرار بیماری سے تعبیر کیا، لیکن انسانی لاشیں ملنے لگیں تو پولیس میدان میں آئی۔''

خوف سے میرے جسم میں جھرجھری آ گئی۔ ''یہ سوچ کر ہی خوف آتا ہے کہ میں اور موہنی دونوں اتنے عرصے تک زندہ لاشوں کے درمیان پھنسے رہے۔''

''بے شک! لیکن شاید تم دونوں ہی ان کا موت کا ذریعہ بھی بن جاؤ، ورنہ جانے کتنے انجان لوگ اس کا شکار ہوتے رہیں گے۔''

''کیا ان کو ختم کرنے کی کوئی صورت ہے ڈاکٹر!''

''ہم کوشش کریں گے۔'' انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اب تم آرام کرو اور سنو! میں نے تمہارے دروازے پر ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ ضرورت ہو تو اسے آواز دے لینا اور دروازہ کھلا رہے گا یہاں کے دروازوں میں تالے نہیں ہیں، اسے بند نہ کرنا کیونکہ میں دوبارہ آؤں گا۔''

میں بستر پر لیٹا دیر تک سوچتا رہا۔ ٹھیک نو بجے روشنی بجھ گئی۔ یہ مریضوں کے سونے کا وقت تھا۔ تاریکی ہوتے ہی اَن جانے وسوسوں نے ذہن میں گھر کرنا شروع کر دیا اور پھر جانے کب آنکھ لگ گئی۔

آنکھ کھلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی پکار رہا ہے۔ ہر سمت تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے بے ساختہ کھلے دروازے کی سمت دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسی لمحے پھر کسی نے پکارا۔

''الیاس! میں یہاں ہوں۔''

میں نے گھوم کر دریچے کی طرف نظر کی تو ایک چہرہ نظر آیا۔ کوئی دریچے سے جھانک رہا تھا، لیکن تاریکی اور دریچے میں لگی ہوئی سلاخوں اور جالی کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بستر سے اٹھ کر تیزی سے دریچے کی سمت پہنچا۔

''موہنی تم......!'' میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ دریچے سے باہر موہنی کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔

''ہاں الیاس! تم فوراً باہر آ جاؤ۔ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''نیند کا خمار آہستہ آہستہ دور ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ موہنی کھڑکی کے باہر کیسے پہنچی۔ باہر کوئی بالکونی نہ تھی اور میرا کمرا دوسری منزل پر تھا۔

''تم اندر کیوں نہیں آ گئیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''بحث مت کرو۔ وقت نہیں ہے۔ تم فوراً باہر لان میں آؤ۔''

میں سمجھ چکا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں نہیں آ سکتا مجھے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

''باہر کوئی نہیں ہے، تم اطمینان سے آ سکتے ہو۔'' موہنی نے التجا کی۔

''نہیں کجن کماری! تم مجھے اس طرح بے وقوف نہیں بنا سکتی ہو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور دوسرے ہی لمحے موہنی کے روپ میں جھانکتی ہوئی کجن کماری کا چہرہ غصے سے بھیانک ہو گیا اور اچانک اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمکنے لگیں۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے میں تاریک گہرائیوں میں

ڈوبتا ہوا جا رہا ہوں۔

کچھ دیر کے لیے تو ذہنی طور پر بالکل معطل ہو گیا تھا۔ گجن کماری کی خوف ناک آنکھوں کا سامنا کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں دیر تک اسی وحشت کا شکار رہا۔ پھر اچانک مجھے دور سے موہنی کی آواز سنائی دی۔

''الیاس۔ کیا تم اپنی موہنی کی بات نہیں مانو گے۔''

''موہنی......'' میرے منہ سے نکلا۔

''ہاں۔ موہنی۔''

''تمہارے لیے تو میں جان بھی دے سکتا ہوں موہنی۔''

''تو پھر انتظار کس بات کا ہے۔''

''کیا کروں؟''

''باہر آ جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔''

میرے قدم بے اختیار دروازے کی طرف اٹھ گئے۔ لیکن اسی وقت کچھ ہوا۔ تیز روشنی کی چمک ہوئی اور کوئی میرے سامنے آ گیا۔

''ہٹ جاؤ......کون ہو تم۔'' میں نے ڈپٹ کر کہا۔

''چھوڑ دیجیے۔'' میں نے کہا۔

''مکار......فریبی......'' دریچے سے آواز آئی۔ مجھے دھوکا دیتا ہے۔ میں تجھے ایسا سبق دوں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔

کوئی مجھے جھنجھوڑ رہا تھا اور بالآخر اچانک مجھے ہوش آ گیا۔ ڈاکٹر سہاش اور ان کا اسسٹنٹ مجھے بازوؤں میں دبوچے ہوئے تھے میں نے انہیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔

''آپ......؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''ہاں الیاس......اور یہ اچھا ہوا کہ ہم یہاں موجود تھے ورنہ تم اس کے جال میں پھنس جاتے۔'' ڈاکٹر سہاش نے کہا۔

''خدایا......میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔'' مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر؟''

''تم اس کی نظروں سے سحر زدہ ہو گئے تھے اور اس عالم میں تم اس کی ہر ہدایت پر عمل کر گزرتے۔'' ڈاکٹر اپنے ساتھیوں کی سمت مڑا فلم ابھی ڈیویلپ کرو۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی تصویر نہیں آئی ہوگی۔ لیکن پھر بھی تصدیق ضروری ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور جاتے ہوئے دو کپ کافی بھجوا دینا۔''

''ڈاکٹر سہاش کا خیال صحیح تھا۔ فلم پر کوئی تصویر نہیں آئی تھی۔ سوائے دریچے کے کافی پیتے ہوئے مجھے اچانک موہنی کا خیال آیا۔ میں اچھل پڑا۔

ڈاکٹر موہنی اکیلی ہے۔ وہ شدید خطرے میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ گجن کماری......''

''آؤ۔ ڈاکٹر سہاش میرا جملہ پورا ہونے سے قبل کھڑے ہو گئے تھے۔ مجھے بالکل خیال نہ رہا تھا۔

زنانہ وارڈ ہماری بلڈنگ کے سامنے واقع تھا۔ ہم تقریباً بھاگتے ہوئے وہاں پہنچے تھے۔ موہنی کا کمرا تاریک تھا اور اس کے دروازے پر تعینات وارڈ بوائے کا کہیں کوئی پتا نہیں تھا۔ ہم ایک لمحے کے لیے دروازے پر رکے ڈاکٹر نے مجھے اشارے سے خاموش رہنے کی ہدایت کی اور ہم آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے جیب سے ٹارچ نکال کر بستر پر روشنی پھینکی موہنی کا بستر خالی تھا۔ اس کے برابر بستر سے ٹکی ہوئی نرس بے خبر سو رہی تھی۔

غضب ہو گیا وہ موہنی کو لے گئی۔ میں بدحواسی کے عالم میں چیخا۔ ڈاکٹر نے ٹارچ کی روشنی میں پورا غسل خانہ اور کمرا دیکھا اور پھر ہم دونوں باہر نکل گئے۔ گیٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار نے ڈاکٹر کو حیرت سے دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

''تم نے اس لڑکی کو باہر کیوں جانے دیا۔'' ڈاکٹر نے گرج کر کہا۔

''ج۔ جی......میں سمجھا شاید وہ لان میں ٹہلنے جا رہی ہیں۔''

''لان پر؟ کتنی دیر ہوئی اسے گئے ہوئے؟''

''جی بس ابھی گئی ہیں۔ آپ کے آنے سے دو منٹ پہلے۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ہم تینوں بھاگتے ہوئے سامنے پھیلے ہوئے وسیع لان میں پہنچے ڈاکٹر نے ٹارچ کی روشنی میں ہر سمت دیکھا۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ لان کے کنارے کنارے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ ڈاکٹر سہاش نے جھاڑیوں پر روشنی ڈالی اور آگے بڑھنا شروع کیا۔ میرا دل انجانے اندیشے سے بیٹھا جا رہا تھا۔ جانے موہنی زندہ بھی ہوگی یا نہیں ہم ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ جھاڑیوں سے ایک تیز چیخ ابھری اور دوسرے ہی لمحے ایک بڑی چمگادڑ پھڑ پھڑاتے ہوئے فضا میں اڑی۔ ہم لپک کر جھاڑیوں کے درمیان پہنچے موہنی کا ساکت جسم جھاڑیوں کی آڑ میں پڑا ہوا تھا۔

''موہنی۔'' میں چیخ مار کر آگے بڑھا ''موہنی......او موہنی میں اپنی سسکی نہ روک سکا۔

''اسے اٹھا کر کمرے میں لے چلو الیاس۔ وقت ضائع نہ کرو۔'' ڈاکٹر نے مجھے ڈانٹا۔

''ڈاکٹر سہاش کے حکم پر سہاش کے کمرے کی لائٹ جلا دی گئی تھی۔ موہنی زندہ تھی۔ بستر پر ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ موہنی کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے لیکن ہم بروقت پہنچے تھے۔ اس کے بازو سے بندھا ہوا تعویذ تقریباً کھل چکا تھا۔ اس کے بازو پر جگہ جگہ خراشیں تھیں جیسے کسی نے تعویذ نوچنے کی شدید جدوجہد کی ہو۔''

ڈاکٹر! آپ یہ خراشیں دیکھ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ گجن کماری تعویذ کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ پھر یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟''

''موہنی کی۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''گجن کماری کے تنویمی عمل کے زیر اثر اس نے خود تعویذ اتارنے کی کوشش کی تھی۔ اگر ہم ذرا دیر ہو جاتی تو وہ بدروح اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی۔''

''خدایا۔ ہم کس عذاب میں گرفتار ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا اس بلا سے نجات نہیں ملے گی۔

''ہمت سے کام لو۔ الیاس۔''

''لیکن ڈاکٹر! جب وہ ہمیں اس طرح بے بس کرسکتی ہے تو کسی دن کامیاب بھی ہوجائے گی۔''

''ہم اسے موقع نہیں دیں گے۔ کل ہم اسے ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔''

''لیکن کیسے؟''

''وقت آنے پر دیکھ لینا۔ فی الحال اپنے حواس پر قابو رکھو۔'' نرس کو ہوش آ گیا تھا۔ وہ یہ بتلانے سے قاصر تھی کہ اسے کیسے نیند آ گئی۔ اسے کچھ یاد نہ تھا دروازے پر متعین وارڈ بوائے کا یہ کہنا تھا کہ اسے نرس نے کافی لانے کے لیے بھیجا تھا اور موہنی پر ہنوز بے ہوشی طاری تھی۔ اس سے کچھ معلوم کرنا ممکن نہ تھا۔ تمام رات کمرے میں روشنی جلتی رہی اور ہم کرسیوں پر بیٹھے انتظار کرتے رہے لیکن کجن کماری دوبارہ نہ آئی۔

دوسرے دن ہم سہ پہر کو کجن کماری کی حویلی پہنچ گئے۔ ہمارے ہمراہ پولیس کی جیپ بھی تھی اور انسپکٹر گورتپن مولانا اکبر علی کو لے آیا تھا۔ ڈاکٹر سبھاش بھی اپنے کہنے کے مطابق پوری تیاری سے آئے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ کجن کماری رات سے قبل بیدار نہ ہوگی۔ اس لیے ہمیں دن کی روشنی میں اس کے مسکن کا پتا چلا لینا چاہیے ہم نے تمام حویلی چھان ماری تمام کمرے خالی تھے۔ ہر چیز پر گرد و غبار کی تہ چڑھی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے۔ نہ وہ رات والی رونق تھی۔ نہ محفل رقص و سرور کے آثار نہ وہ آسائش و زیبائش۔ مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ میں اس حویلی کو اپنی آنکھوں سے آباد دیکھ چکا تھا۔ میں یہاں قیام کر چکا تھا۔ رقص و نغمے کی بزم سے لطف اندوز ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر سبھاش اور دوسرے تمام لوگ کئی گھنٹے کی تلاش کے بعد تھک گئے ہم نے حویلی کے گرد و پیش قلعہ کے کھنڈرات بھی چھان لیے لیکن لاحاصل۔ نہ کہیں کوئی خفیہ مسکن ملا نہ کوئی قبر جس میں زندہ لاشوں کا سراغ ملتا۔ ''اب کیا کرنا چاہیے۔'' انسپکٹر گورتپن نے پوچھا۔

''رات کا انتظار۔'' ڈاکٹر سبھاش نے جواب دیا۔ ''مجھے یقین ہے کہ رات کو کجن کماری اور اس کے ساتھیوں سے ضرور ملاقات ہوگی۔''

''بے شک۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔ مولانا اکبر علی مسلسل دعائیں پڑھنے میں مصروف تھے۔ ساتھ میں آئے ہوئے سپاہیوں نے چائے بنائی اور ہم ناشتہ کرکے چائے پینے لگے۔ گفتگو کا موضوع کجن کماری تھی۔ میرا ذہن موہنی کے لیے فکرمند تھا۔ ڈاکٹر سبھاش نے اس کی حفاظت کے لیے تمام انتظامات کردیے تھے۔ سب انسپکٹر موہنی کی نگرانی کے لیے مقرر کردیا گیا تھا۔ لیکن میں پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی کئی ایک پیٹرومکس جلا لیے گئے۔ ہم اپنے ہمراہ ٹارچیں بھی لے کر آئے تھے۔ میرے پاس بھی ٹارچ موجود تھی ہم حویلی کے سامنے بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ ہر سمت موت کا سناٹا طاری تھا۔ یہاں تک کہ مکمل تاریکی چھا گئی۔ میری نگاہیں حویلی کی سمت لگی ہوئی تھیں۔ لیکن وہاں مکمل سکوت طاری تھا۔ ''تعجب ہے'' میری زبان سے نکلا۔

''کیا ہوا؟ کس بات پر تعجب ہے۔'' انسپکٹر نے مزید پوچھا۔

''اندھیرا ہوتے ہی حویلی میں چہل پہل ہوجاتی تھی۔ لیکن آج سناٹا ہے۔''

''انہیں ہماری موجودگی کا علم ہوگیا ہے۔'' ڈاکٹر سبھاش نے کہا۔

''وہ دیکھیے انسپکٹر گورتپن نے اچانک کہا۔ ''اس مینار کے اوپر والے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔'' سب کی نظریں بے ساختہ اوپر اٹھیں۔ بلاشبہ کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ جس میں، میں کئی بار قیام کر چکا تھا انسپکٹر اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''آیئے وہاں ضرور کوئی موجود ہے۔'' اس نے پولیس والے کو اشارہ کیا۔

''ٹھہرو انسپکٹر۔'' ڈاکٹر سبھاش نے کہا۔ ''ہمارا واسطہ کسی خطرناک مجرم سے نہیں جسے تم گرفتار کرلو...... بدروحوں سے ہے۔''

''پھر کیا کریں؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''صبر و تحمل سے کام لو۔'' مولانا صاحب نے کہا۔ اور ہمارے پیچھے آؤ۔ بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

''کوئی آدمی تنہا نہ رہے۔ ڈاکٹر سبھاش نے ہدایت کی۔ ''پیٹرومیکس یہیں رہنے دو، ٹارچیں ساتھ لے لو۔''

ہم ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے حویلی کی سمت بڑھے ڈاکٹر سبھاش سب سے آگے تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔ دوسرے میں ٹارچ ان کے پیچھے مولانا صاحب جن کی سفید داڑھی تاریکی میں چمک رہی تھی۔ ان کے پیچھے میں، انسپکٹر گورتپن اور فرید ہر ایک کا دل آنے والے لمحات کے خطرے سے اچھل رہا تھا۔ ہم ابھی سیڑھیاں چڑھ کر حویلی کے پھاٹک پر پہنچے ہی تھے کہ فرید چلایا۔

''ڈاکٹر سبھاش۔ ہوشیار۔'' ڈاکٹر اچھل کر آگے بڑھا اور اسی لمحے ایک بہت بڑا سا پتھر حویلی کی چھت سے ایک دھماکے کے ساتھ ٹکرا کر چکنا چور ہوگیا۔ اگر ایک لمحہ بھی دیر ہوجاتی۔ تو ڈاکٹر سبھاش کے جسم کا بھرتہ ہوجاتا۔ بہ یک وقت کئی ٹارچیں اوپر کی سمت بلند ہوئیں۔ حویلی کی چھت پر بنی ہوئی پتھر کی منڈیر ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ ممکن ہے یہ اتفاقیہ حادثہ رہا ہو۔ لیکن دل قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ چند لمحے انتظار کرکے ہم اندر داخل ہوگئے۔ بڑا ہال بالکل خالی تھا۔ فرش پر بچھے ہوئے قالین پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں ہر سمت جائزہ لیا گیا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

''اوپر جانے کا زینہ سامنے ہے۔'' میں نے بتلایا۔

ہم سب زینے کی سمت بڑھے اچانک ایک دھماکا ہوا اور کوئی زور سے چیخا۔ سب گھبرا کر پلٹے۔ ٹارچ کی روشنی فرش پر پڑی۔ چھت پر لگا ہوا بڑا جھاڑ ٹوٹ کر گر پڑا تھا اور پیچھے آنے والا کانسٹیبل پیر پکڑ کر کراہ رہا تھا۔ لیکن وہ بال بال بچ گیا تھا۔ صرف اس کا پیر زخمی ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ زخم معمولی تھا۔ لیکن اب اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا تھا ہم کجن کے حملوں کی زد میں تھے۔

''تم دونوں جیپ کے پاس جا کر بیٹھو، پیٹرومیکس روشن رکھنا۔'' ڈاکٹر سبھاش نے کانسٹیبلوں سے کہا۔ جو خوف سے سہمے ہوئے تھے۔

ہم زینہ طے کرکے اوپر والے کمرے میں پہنچ گئے لیکن وہ خالی تھا۔ ہال مکمل تاریک تھا۔ کچھ دیر پہلے نظر آنے والی روشنی کا نام و نشان نہیں تھا۔ ہم ایک بار پھر زینہ اتر کر پہلی منزل تک آئے جہاں ان گنت کمرے بنے ہوئے تھے۔ دن میں ہم ان کمروں کی تلاشی لے چکے تھے۔ لیکن اب ایک بار پھر دیکھ لینے میں

کوئی حرج نہ تھا۔ راہ داری سے گزرتے ہوئے میں ایک دروازے کے سامنے رک گیا۔ میرے پیچھے آتے ہوئے فرید اور انسپکٹر بھی رک گئے۔

''کیا بات ہے الیاس۔'' فرید نے پوچھا۔

''ڈاکٹر سجاش اور مولانا بھی مڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔

''یہ مقفل دروازہ۔'' میں نے کہا۔ ''دن میں ہم نے اس کے اندر نہیں دیکھا تھا۔''

''ہاں لیکن شاید اس شکستہ حصے کی سمت کھلتا ہے جو ہم باہر سے دیکھ چکے ہیں۔''

''ڈاکٹر سجاش نے کہا۔ ضرورت ہوئی تو کل دن میں اسے توڑ لیں گے۔''

''دروازہ اتنا مضبوط تھا کہ ہم اسے کھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ پھر ہم آگے بڑھے اور اسی لمحے راہ داری کے اگلے حصے سے ایک بھیانک قہقہہ بلند ہوا قہقہہ اتنا بھیانک تھا کہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر سجاش نے پھرتی سے ٹارچ کی روشنی ادھر پھینکی لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔ اچانک پھڑ پھڑ کی آواز ہوئی اور ایک چمگادڑ چھت سے اڑ کر ڈاکٹر سجاش کی سمت جھپٹی ڈاکٹر کی پستول سے فائر ہوا گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی ایک انسانی چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ سب تیزی سے آگے بڑھے میں نے جیسے ہی قدم آگے بڑھانا چاہا کسی کے نرم و نازک ہاتھوں نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں گھبرا کر پلٹا۔

بجن کماری میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اپنی تمام تر قیامت خیز رعنائیوں کے ساتھ۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور اس دروازے کی سمت گھسیٹا جو کھلا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ وہی دروازہ ہے جسے کھولنے میں ہم کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ بجن کماری کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں اور ان میں جلتی ہوئی آگ کی چمک نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ خدایا...... وہ کتنی حسین تھی۔ آج تک میں نے اسے جی بھر کے نہیں دیکھا تھا۔ میں بلا تامل اس کے ساتھ اس دروازے میں داخل ہو گیا۔ دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

دروازہ بند ہونے کی آواز کے ساتھ سب چونک کر ادھر پلٹے بہ یک وقت کئی ٹارچوں کی روشنیاں ادھر پڑیں اور پھر فرید نے چیخ کر کہا۔

''الیاس کہاں ہے؟''

''وہ بھاگتے ہوئے دروازے کے قریب آئے۔ لیکن دروازہ مضبوطی سے بند تھا۔ ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود دروازہ نہ کھل سکا۔ انہوں نے ہر سمت مجھے تلاش کیا۔ تمام کمرے چھان مارے لیکن میرا کہیں پتا نہیں تھا۔

''بلاشبہ وہ اسی میں گیا ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''وہ پہلے بھی اس کے سامنے رکا تھا۔ مجھے اس شخص کی حرکتوں سے پہلے ہی شبہ ہو رہا تھا۔''

''بے وقوف آدمی وہ خود نہیں گیا، اسے لے جایا گیا ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا۔

''لیکن کیسے؟''

''انسپکٹر...... یہ بحث کا وقت نہیں۔ الیاس کی زندگی خطرے میں ہے۔'' ڈاکٹر سجاش نے غم

میں کہا۔ ''اس دروازے کو ہر قیمت پر توڑنا پڑے گا۔''

''میں چند کدالیں ساتھ لایا تھا، وہ جیپ میں ہیں۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''میں ابھی لے کر آیا۔'' فرید بدحواسی کے عالم میں آگے بڑھا۔

''ٹھہرو۔ ہم ساتھ چلیں گے۔'' ڈاکٹر سجاش نے کہا۔ ''کوئی شخص ایک لمحے کے لیے بھی تنہا نہ رہے۔''

وہ سب ایک ساتھ نیچے اترے۔ زخمی کانسٹیبل اور اس کا ساتھی خوفزدہ اور سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ جیپ میں چار کدالیں موجود تھیں۔ وہ ان کو لے کر واپس ہوئے لیکن ابھی حویلی میں پہنچے بھی نہ تھے کہ ایک فلک شگاف دھماکے سے فضا گونج اٹھی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ دم بہ خود کھڑے رہ گئے۔ پھر ڈاکٹر سجاش نے بھاگ کر جیپ کے پاس سے پیٹرومیکس اٹھایا اور وہ تیزی سے اندر داخل ہوئے۔

ہال میں ہر سمت گرد و غبار بھرا ہوا تھا۔ جس میں کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ دھول ان کی آنکھوں اور حلق میں گھس گئی۔ سب کھانسنے لگے اور سب کی نگاہیں اوپر جانے والے زینے پر تھیں۔ جو ملبے سے اٹا پڑا تھا۔ اوپر کی چھت اس طرح گری تھی کہ زینہ بھی اس کے ساتھ ہی ٹوٹ گیا تھا اور اب اوپر جانے کا راستہ مسدود ہو چکا تھا۔

''میرے خدا۔ اب کیا ہوگا۔'' فرید نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر سجاش بھی بدحواسی کے عالم میں سامنے دیکھ رہا تھا اور اسی لمحے فضا ایک بار پھر بھیانک قہقہوں سے گونج اٹھی۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''اب کیا ہوگا ڈاکٹر۔'' فرید بے بسی کے عالم میں چیخا۔

''خدا پر بھروسا رکھو بیٹے! مولانا اکبر علی نے کہا۔ ''تم کسی بھی طرح اس دروازے پر پہنچ کر اندر جانے کا بندوبست کرو۔ میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو الیاس کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔''

وہ سب حویلی سے باہر آ گئے۔ مولوی صاحب ایک صاف سی جگہ مصلیٰ بچھا کر عبادت کے لیے بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر سجاش اور اس کے ساتھی صورت حال پر غور کرنے لگے۔

''اگر ہم کسی طرح اوپر کی منزل تک پہنچ جائیں تو دروازہ توڑ سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر سجاش نے کہا۔ ''کیونکہ چھت صرف زینے کی گری ہے۔''

''لیکن اتنی بلندی پر سیڑھی کے بغیر کیسے پہنچ سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر فرید نے کہا۔

''ٹھہرو...... سیڑھی کا بندوبست ہو سکتا ہے۔'' انسپکٹر نے فوراً کہا۔ ''سامنے بانس رکھے ہوئے ہیں۔''

کلہاڑی جیپ میں رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے بڑی پھرتی کے ساتھ اصطبل کے پاس رکھے ہوئے بانسوں سے سیڑھی تیار کرنا شروع کی لیکن تمام تر عجلت کے باوجود کافی دیر لگ گئی اور جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوئے تو بارہ بجنے والے تھے وہ سیڑھی لے کر اس کھڑکی کے نیچے آئے جو پہلی منزل پر کھلتی تھی۔ ڈاکٹر سجاش اپنی کار تک گئے اور وہاں سے کلام پاک کا ایک چھوٹا سا نسخہ نکال کر انہوں نے اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اس کے بعد ان کے پاس پہنچے۔

''پہلے میں اوپر جاؤں گا۔'' انہوں نے کہا۔

"لیکن سر یہ مناسب نہیں ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"میں مناسب سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

اور پھر وہ اطمینان سے عارضی بنی ہوئی سیڑھی پر اوپر چڑھنے لگے اب تک کے واقعات نے ان سب کو بہت دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اس لیے سب خوف زدہ نگاہوں سے اوپر دیکھ رہے تھے۔ جیسے کسی بھی لمحہ کوئی نیا حادثہ رونما ہونے والا ہو۔

♥ ...... ♥ ...... ♥

ادھر الیاس ایک نئی مصیبت میں گرفتار تھا۔

گجن اور اس کے باپ میں شدید بحث جاری تھی۔ گجن کا باپ پیاسی نگاہوں سے الیاس کو دیکھ رہا تھا۔

"ضد نہ کرو لڑکی پیاس سے میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ آج ہم باہر بھی نہیں جا سکے ہیں۔ مجھے اپنا حلق تر کر لینے دو۔"

"نہیں پتا جی۔ آپ وعدہ کر چکے ہیں۔ اب اس کا خون آپ کا ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد۔"

"تو بڑی ضدی ہے گجن!" اس کے باپ نے بالآخر ہار مان لی۔ "ٹھیک ہے تو اپنی خواہش پوری کر لے لیکن جلدی کر۔ میں جب تک ان مورکھوں کی خبر لیتا ہوں۔"

گجن نے الیاس کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر زینہ اترنے لگی یہ زینہ اسی دروازے سے نیچے جاتا تھا جسے وہ نہ کھول سکے تھے۔ وہ زینہ اترتے ہوئے حویلی کے تہ خانے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہاں بھی اوپر کی طرح بہت سے کمرے بنے ہوئے تھے۔ گجن نے درواہ مضبوطی سے بند کیا اور الیاس کو لے کر ایک کمرے کی سمت بڑھی۔ وہ بھی گجن کو پیاسی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن پر خمار سا طاری تھا اور دل میں صرف ایک خواہش مچل رہی تھی کسی بھی طرح گجن کو حاصل کرے۔

"الیاس...... میرے الیاس...... بالآخر میں تم کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔" گجن نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"ہاں گجن اور میں بھی کتنا بدقسمت تھا۔ جو آج تک تم سے دور رہا۔"

"نہیں پیارے۔ اب تم کبھی مجھ سے جدا نہ ہو گے۔ ہم اپنے محل میں ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ ہمیشہ ہمیشہ۔"

وہ کمرے میں بچھی ہوئی مسہری کی سمت بڑھ رہے تھے۔ کمرا شاہانہ انداز میں سجا ہوا تھا۔ مدھم مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور ایک تیز خوشبو ہر سمت فضا میں رچی ہوئی تھی۔ الیاس سحر زدہ انداز میں گجن کو گھور رہا تھا۔ جیسے اس کی پرستش کر رہا ہو۔"

گجن کے ریشمی جسم کا لمس اسے دیوانہ بنا رہا تھا اس نے وارفتگی کے عالم میں گجن کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ گجن کے لب حریصانہ انداز میں اس کی سمت بڑھے اور عین اسی لمحے کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی جیسے سورج نکل آیا ہو۔ گجن چیخ کر پیچھے گری۔ اس کی پھٹی پھٹی دہشت زدہ نگاہیں خلا میں گھور رہی تھیں اور الیاس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے حیرت زدہ نظروں سے ہر سمت دیکھنا شروع کیا لیکن اس کی سمجھ میں

نہ آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور پھر اس کی نظر گجن کے بے حس و حرکت بدن پر پڑی اور وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

♥ ...... ♥ ...... ♥

دروازہ توڑنے میں ان کو بڑی دشواری ہوئی اتنا مضبوط دروازہ تھا کہ ان کے ہاتھوں سے خون نکل آیا۔ لیکن بالآخر دروازہ کھل گیا۔ ڈاکٹر سہاش خوشی سے اچھل پڑے۔ ان کے سامنے ایک زینہ تھا جو نیچے چلا گیا تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ زینہ اترتے ہوئے آگے بڑھے اور تہ خانے کے دروازے پر جا کر رک گئے۔ یہ دروازہ بھی مقفل تھا۔ ڈاکٹر کراہ اٹھا۔

"مسلسل دیر ہو رہی ہے۔ اب اسے توڑنے میں بھی دیر لگے گی۔" اس نے مایوس ہو کر کہا۔

اور ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کیا جائے کہ دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا تاریکی میں ان کو ایک خوف ناک شکل سامنے گھورتی ہوئی نظر آئی اور ڈاکٹر سہاش کے پستول سے اچانک فائر ہوا۔ فضا میں ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟" فرید عقب سے چیخا۔ "شاید الیاس ہو۔"

"نہیں فرید...... یہ الیاس نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے ٹارچ کی روشنی سامنے پھینکی۔

فرش پر گجن کے پتا جی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ اتنا مکروہ اور بھیانک تھا کہ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے تھے اور اس کی پھیلی ہوئی آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں۔

"اب یہ ہمیشہ کے لیے مر گیا۔" ڈاکٹر سہاش نے کہا۔

"کیا مطلب...... یہ کون ہے؟" انسپکٹر گوبچن نے کہا۔ وہ اس بڈھے کے سینے کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں ڈاکٹر کی گولی نے چھید کر دیا تھا۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس سے خون نہیں نکل رہا تھا۔

"ویمپائر...... زندہ لاش...... اور یہ بلاشبہ گجن کا باپ رانا ہرمندر سنگھ ہے۔" ڈاکٹر سہاش نے کہا۔ "انسپکٹر تم پریشان نہ ہو۔ میں نے قتل نہیں کیا ہے صرف ایک زندہ لاش کو ابدی نیند سلا دیا ہے۔"

"لیکن الیاس کہاں ہے۔" فرید نے پھر پوچھا۔

اور وہ سب ایک بار پھر آگے بڑھے۔ اب ان کا رخ کمروں کی طرف تھا۔ انہوں نے باری باری ہر کمرے کا دروازہ کھولنا شروع کیا اور انہیں یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ کمروں میں دن کی طرح روشنی ہو رہی ہے اور ہر کمرے میں ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔

♥ ...... ♥ ...... ♥

میں حیرت اور پریشانی کے عالم میں کھڑا ہوا گجن کی لاش کو گھور رہا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر سہاش سامنے کھڑے نظر آئے۔ ہم ایک دوسرے کو سکتے کے عالم میں گھورتے رہے پھر اچانک فرید میری سمت لپکا۔

"الیاس۔ اوہ۔ خدا کا شکر ہے کہ تم سلامت ہو۔"

"کیا مطلب ہے۔" میں نے پوچھا۔ "اور میں یہاں کیسے پہنچ گیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔"

اسی لمحے ایک فائر کا دھماکا ہوا۔ ہم دونوں اچھل پڑے۔ میں نے گجن کی سمت دیکھا۔ اس کے سینے میں سوراخ ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر سہاش کے پستول کی نال سے دھواں نکل رہا تھا۔

''سہاش...... یہ تم نے کیا کیا۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''تمہیں اس بلا سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دی۔'' ڈاکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''آخر مجھے اپنا کام مکمل کرنا ہے۔''

اور پھر ڈاکٹر نے ہر کمرے میں جا کر پڑی ہوئی لاش کا سینہ چھلنی کر دیا۔ میں نے ان سب کو پہچان لیا۔ وہ گجن کے ملازم۔ داسیاں اور رقاصاؤں کی لاشیں تھیں۔ ہم سب حیرت کے ساتھ ڈاکٹر کو دیکھ رہے تھے اور پھر جب ہم نے تمام کمروں کو دیکھ لیا اور کوئی مزید لاش نہ ملی۔ تو ہم راہ داری میں آ گئے۔ اسی لمحے حیرت انگیز طور پر تمام کمرے اچانک تاریک ہوگئے۔''

ہم ایک ایک کر کے نیچے اترے۔ پیٹرومیکس جل رہا تھا۔ رات کے چار بج چکے تھے مولانا اکبر علی اب تک عبادت میں مصروف تھے انسپکٹر گوربچن نے اپنے آدمیوں کو چائے بنانے کا حکم دیا۔ سب پر بری طرح تھکن طاری تھی۔

''ڈاکٹر یہ آپ نے ان لاشوں پر گولی کیوں چلائی۔'' انسپکٹر نے پوچھا۔

ڈاکٹر مسکرا دیے۔

''یہ گولیاں چاندی کی تھیں...... اور ویمپائر زندہ لاشوں کو صرف انہیں سے ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ چاندی متبرک دھات ہے اور......''

وہ ہمیں تفصیل سے اپنی تحقیق کے بارے میں بتانے لگے۔

''لیکن وہ کمروں میں تیز روشنی کیسے ہو رہی تھی۔'' فرید نے پوچھا۔

''یہ روشنی میری دعاؤں کا نور تھا بیٹے۔''

ہم نے چونک کر دیکھا۔ مولوی صاحب سلام پھیر کر مصلے سے اٹھ رہے تھے۔ ان بدروحوں کی موت روشنی ہے۔ روشنی جو اللہ کے کلام سے پیدا ہوتی ہے۔ اس ذات باری کا نور تمام ظلمتوں کی موت ہے۔''

''بے شک...... بے شک۔'' ڈاکٹر سہاش نے کہا۔

اسی لمحے ایک جیپ ہمارے قریب آ کر رکی۔ سب انسپکٹر سنوامی اور بہت سے کانسٹیبل اتر کر ہماری طرف بڑھے اور موہنی ان سب سے آگے تھی۔

''موہنی۔'' میں خوشی سے چلایا۔

وہ بھاگتی ہوئی آئی اور میرے بازوؤں میں سما گئی۔ سب مسکرا دیے۔

''ان کو ہوش آ گیا تھا اور یہ بہ ضد ہوگئیں کہ ہم فوراً یہاں چلیں۔ آپ سب کی زندگی خطرے میں ہے۔'' سنوامی نے وضاحت کی۔

عجیب داستان تھی، لیکن اب کوئی داستان عجیب نہیں لگتی تھی۔ زندگی جیسے عجیب و غریب واقعات کا مجموعہ بن گئی تھی۔ کامران نے حسن شاہ سے کہا۔

''ایک سوال کروں حسن شاہ۔''

''ہاں کرو......''

''کیا یہ زندگی ہماری پسند کی ہے؟''

حسن شاہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

''میں تمہیں اپنے بارے میں تفصیل بتا چکا ہوں۔ ایک نرم و نازک فطرت کا مالک انسان تھا میں، میری زندگی ہر طرح کے ہنگاموں سے پاک تھی کہ تقدیر نے میرے راستے بدل دیے اور پھر...... کیا تھا، کیا ہوگیا۔ لیکن حسن شاہ۔ اخلاق مروت انسان سے بعض اوقات اس کی قیمتی زندگی تک چھین لیتا ہے۔ کرنل گل نواز کے لیے ہم جو کچھ کر رہے ہیں۔ کیا اس میں ہماری اپنی کوئی غرض ہے۔ مگر ہماری زندگی کا کوئی لمحہ ہمارا اپنا نہیں ہے۔ میں تو کچھ اور سوچ رہا ہوں حسن شاہ۔

''یہی کہ وطن واپس چلا جاؤں۔'' سب کچھ چھوڑ دوں۔''

''اتنا کچھ کرنے کے باوجود۔''

''ہاں۔ کوئی سرا نہیں مل رہا مجھے۔ کہاں تک جانا ہے۔ کیا کرنا ہے۔ کوئی تقدیر ہو، کوئی منزل تو ہو۔''

''منزل موت کو کہتے ہیں۔''

''کتابی بات ہے۔''

''کتابی ہی سہی، سچ تو ہے۔'' حسن شاہ نے کہا۔

''جوگندر سنگھ سے نہیں ملو گے؟''

''سوچنا پڑے گا۔ اچانک مجھ پر یہ خیال سوار ہوا ہے کہ میں...... کامران نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ خود بھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ اچانک اس کے ذہن پر اب یہ احساس بری طرح مسلط ہوگیا تھا۔ ایک شدید اکتاہٹ اس کے وجود پر سوار تھی۔ وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ گرشک، سیتا، علی سفیان، بہت سے کرداروں کی مالک امینہ سلفا...... پھر کرنل گل نواز اس کا سارا خاندان...... بہت وفا کی ہے میں نے اس خاندان سے بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن خود میری زندگی۔'' کامران نے سوچا۔

پھر اس نے کچھ فیصلے کیے، حسن شاہ کو بھی اس نے ان فیصلوں میں شامل نہیں کیا تھا۔ وطن واپسی بے کار ہے۔ کسی نہ کسی طرح وہ پھر انہیں الجھنوں میں پھنس جائے گا۔ دنیا بے حد وسیع ہے کوئی یاد تو نہیں کر رہا اسے وطن میں، اس کا اپنا کون ہے کون سی ذمہ داری ہے اس کے اوپر...... ہاں۔ بس اب ہر طرح کی غلامی سے آزادی ضروری ہے۔

حسن شاہ نے پھر اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی یہاں تک کہ ایک دن کامران نے حسن شاہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ اسی دوران بہت سے عمل کرتا رہا تھا۔ اس نے ایسی جگہوں کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں جہاں ہر طرح کے ناجائز کام ہوتے تھے۔ انہیں میں انسانوں کی اسمگلنگ بھی تھی۔ ایسے میں ایک ایجنٹ کے ساتھ وہ ایک سمندری جہاز پر پہنچا تھا۔ ایجنٹ نے اس سے رقم لی تھی اور پھر اسے جہاز کے کپتان کے سامنے پیش کر دیا تھا۔

''تم خلاصی کی حیثیت سے کام کرنا چاہتے ہو۔'' کپتان نے پوچھا۔

''ہاں......'' کامران نے جواب دیا۔

''مگر تم ایسے لگتے تو نہیں ہو۔''

''کیسے؟''

''میرا مطلب ہے محنت کرنے والے۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔''

''پڑھے لکھے ہو۔''

''معمولی سا......'' کامران نے جواب دیا۔

''ایک بات کا جواب دو۔''

''پوچھو......'' کامران نے بے زاری سے کہا۔

''دیکھو۔ جواب دینا ضروری ہے۔''

''ہاں بھائی پوچھو۔''

''کوئی قتل وغیرہ کیا ہے؟''

''نہیں؟''

''کوئی اور جرم......''

''ہاں......!'' کامران کو اب غصہ آ گیا تھا۔''

''کیا؟''

بیس سال پہلے امرود کے ایک درخت سے بہت سے امرود توڑے تھے۔''

''اچھا...... پھر؟''

''کھائے......'' کامران سوکھے سے منہ سے بولا۔ اور کپتان سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

پھر صورت حال اس کی سمجھ میں آئی تو اس نے ناراض ہونے کے بجائے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔

''ایسے لوگ میری پسند ہیں۔ اوکے...... اوکے۔ مگر تمہیں تھوڑی سی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔''

''اٹھاؤں گا۔'' کامران نے جواب دیا۔

اس کے بعد ایک ہفتے تک اسے جہاز میں چھپے رہنا پڑا تھا۔ واپس جا سکتا تھا۔ لیکن!...... وہ صرف ان حالات سے نکلنا چاہتا تھا۔ حسن شاہ اسے تلاش کر رہا ہوگا...... اس سے بچنا بھی ضروری تھا اور ویسے بھی اسمگل ہو کر جا رہا تھا۔ دوسرے بہت سے معاملات بھی ضروری تھے۔ پھر ایک ہفتے کے بعد جہاز نے بندرگاہ چھوڑ دی اور کامران خلاصیوں کی وردی میں آ گیا۔

وہ خوش تھا اس کا دل چاہتا تھا کہ ماضی کا ایک بھی نقش اس کے ذہن پر نہ رہے۔ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا وہ۔ آخری نشانی ایک بہن تھی وہ بھی نہ رہی۔ وہ ایک نئی دنیا کا نیا انسان بننا چاہتا تھا۔ پھر ڈائز بھی اچھا آدمی تھا اس سے مہربانی سے پیش آتا تھا۔ شان دار زندگی گزارنے کے بعد یہ مشقت کی زندگی اپنا

ایک الگ مزہ رکھتی تھی، فرش دھونا، فرنیچر کی صفائی کرنا، مشینوں میں تیل ڈالنا یہ اس کے کام تھے۔ زندگی میں تبدیلی ویسے بھی بڑی دل کش ہوتی ہے۔ ان کاموں میں اسے بہت لطف آ رہا تھا۔ پھر اس کی ملاقات جہاز کے فورمین سے ہوئی۔ یہ ایک عمر رسیدہ آدمی تھا اور اس کا نام ڈیوسن تھا۔ ڈیوسن ایک پر محبت شخصیت کا مالک تھا اور خود بہ خود کامران کی جانب راغب ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

کہ کامران اس کے ایک ایسے بھائی کا ہم شکل ہے۔ جواب اس دنیا میں نہیں ہے بہرحال وہ کامران سے بہت زیادہ متاثر ہو گیا تھا اور کامران کا زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزرتا تھا۔ بہرحال نہ جانے کیا بات تھی کہ جہاز کے دوسرے خلاصی بھی کامران سے کچھ دبے دبے سے رہتے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے وہ اسے اپنے آپ سے برتر سمجھتے ہوں۔ کامران کی فطرت کا تجزیہ کپتان نے بھی کیا تھا۔ دوسرے خلاصی مختلف قسم کے گھٹیا کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ جن میں شراب نوشی بھی تھی لیکن کامران شراب وغیرہ نہیں پیتا تھا۔

بہرحال سمندر کے سفر کا یہ انوکھا تجربہ بھی اس کی زندگی میں ایک نمایاں مقام رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہوا تھا کہ زندگی کی سب سے خوشگوار اور سب سے تکلیف دہ کیفیت ماضی کی یادیں ہیں۔ وہ کردار ہیں۔ جو زندگی سے چمٹے ہوتے ہیں۔

بہرحال وہ ان کرداروں کو بھولنے کی کوشش کرتا تھا۔ البتہ ایک بات ضرور تھی کہ ان میں کوئی دکھ بھری یاد نہیں تھی۔ ہر لحہ اسے یہ بھی خطرہ رہتا تھا کہ وہ پراسرار کردار جو اس کی زندگی کا ایک حصہ بنے ہوئے ہیں کہیں دوبارہ اس سے نہ آ چمٹیں جہاز اپنی پہلی منزل پر پہنچ گیا۔ خلاصی سیر کے لیے جہاز سے چلے جاتے۔ لیکن کامران کو اس شے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتا تھا۔ بلکہ اس نے ڈیوسن سے جہاز کی مشینری کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی تھیں اور اسسٹ کرنے لگا تھا۔

یہاں اس ملک میں جہاں پر سامان لوڈ ہونا تھا۔ بھاری کرینیں مال لوڈ کر رہی تھیں۔ اس شام بارش ہو چکی تھی۔ مطلع اب بھی ابر آلود تھا۔ سامان تیزی سے جہاز میں لوڈ کیا جا رہا تھا۔ کیونکہ یہ خطرہ تھا کہ کارٹن بھیگ نہ جائیں۔ کرینیں کام کر رہی تھیں اور مال بندرگاہ سے جہاز پر آ رہا تھا۔ کپتان ایڈلے اپنی نگرانی میں سامان بھی لوڈ کرا رہا تھا کہ ایک حادثہ ہو گیا۔ کرین کافی وزن لاد کر جہاز کی طرف آ رہی تھی کہ اس کے کنڈے کا تار ٹوٹ گیا۔ بھاری پیٹیاں عین اسی جگہ چھوٹ گئیں۔ جہاں ایڈلے کھڑا ہوا تھا۔

کامران اس کرین پر کام نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ وہاں سے کچھ فاصلے پر کسی اور کام میں مصروف تھا۔ نہ جانے کس طرح اس کی نگاہیں اوپر کی جانب اٹھ گئیں اور پھر باقی جو کچھ ہوا اس میں اس کی سوچ یا اس کی قوت کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر چھلانگ لگائی تھی۔ ٹنوں وزنی پیٹیاں نیچے آ رہی تھیں اور ان کا احاطہ بے حد وسیع تھا ان پانچ سات گز کے دائرے میں ان سے بچنا ناممکن تھا۔ چنانچہ کامران نے کپتان ایڈلے کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے اٹھا کر ایک لمبی چھلانگ لگا دی۔ یہ ایک چھلانگ اسے پیٹیاں گرنے سے تھوڑے فاصلے پر لے گئی اور دوسری چھلانگ زمین پر پاؤں ٹکاتے ہی اس نے لگائی تھی اور وہ کپتان کو لیے ہوئے جہاز کی بلندی سے سمندر میں آ رہا تھا۔ دبی دبی سی چیخیں چاروں طرف سے ابھریں کپتان ایڈلے ایک لمحے کے لیے حواس کھو بیٹھا۔ پیٹیوں کی زد میں آ کر چھ افراد ہلاک اور چھ شدید زخمی

ہو گئے تھے۔

کپتان کے بچنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر کامران اسے پکڑے ہوئے جہاز کے عرشے پر رک بھی جاتا تب بھی گرنے والی پیٹیوں کے دائرہ عمل سے الگ نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن سمندر میں لگائی جانے والی چھلانگ سے خود اسے بھی بچا لیا تھا اور اسے بھی۔ البتہ جہاز کا وہ حصہ بری طرح متاثر ہوا تھا۔ اور زبردست چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ ایڈلے نے اوپر دیکھا اور پھر اپنے کپتانی کے لباس کے باوجود تیرنے لگا۔

بہرحال کسی نہ کسی طرح دونوں بلندی پر آ گئے تھے۔ ایڈلے فوراً ہی متاثرہ حصے کی طرف بھاگا اور دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ اس نے کامران کی طرف رخ بھی نہیں کیا تھا اور کارروائیوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ بہت ہی خوفناک حادثہ تھا۔ مقامی حکام کو بھی اس بارے میں اطلاع دینی پڑی اور وہاں زبردست کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ بڑا دکھ بھرا حادثہ تھا۔ کئی ساتھی جدا ہو گئے تھے۔ جن سے کامران کی یہاں اس دوران اچھی خاصی شناسائی ہو گئی تھی۔ ضروری امور طے پائے۔ ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔ بعض کی نعشیں مقامی حکام کی مدد سے ان کے وطن بھیجی گئیں۔ جہاز پر خاصا سوگ منایا گیا۔

لیکن زندگی بہرحال رواں دواں رہنے کے لیے ہے چنانچہ کچھ عرصے کے بعد جہاز نے وہاں سے بھی لنگر اٹھا دیے اور اپنی دوسری منزل کی جانب چل پڑا۔ یہی زندگی کے معمولات ہیں کوئی بھی حادثہ ہو جائے۔ کوئی بھی بڑے سے بڑا کام ہو جائے۔ زندگی یونہی اپنا سفر کرتی رہتی ہے۔ کامران معمول کے مطابق اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ جہاز کے سفر کو شروع ہوئے دوسرا دن تھا۔ کامران دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے کے لیے اپنی آرام گاہ میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ڈیوسن آ گیا۔

"کامران مسٹر ایڈلے نے تمہیں طلب کیا ہے۔"

"کہاں ہیں وہ؟"

"میرے ساتھ آؤ؟" ڈیوسن نے کہا اور کامران اس کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں اس نے کہا۔

"خیریت تو ہے مسٹر ڈیوسن۔"

"میں نہیں جانتا۔"

"کپتان ایڈلے کہاں ہے؟"

"اپنے کیبن میں۔" ڈیوسن نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ نہ جانے کیوں کامران کو ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ کوئی غلطی تو نہیں ہوئی ہے۔ لیکن بہرحال جو کچھ بھی ہے دیکھنا تو ہے۔ ویسے اب تک ان لوگوں کا رویہ اس کے ساتھ بہت ہی اچھا رہا تھا۔ آخر کار وہ کپتان کے کیبن میں داخل ہو گیا۔ کپتان ایک آرام دہ کرسی پر دراز تھا۔ شراب کے برتن اس کے برابر رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ڈیوسن کو دیکھا اور بولا۔

"تھینک یو مسٹر ڈیوسن آپ جائیے۔" ڈیوسن وہاں سے چل پڑا اور باہر نکل گیا۔ کپتان نے شراب کا ایک اور گلاس بنایا اور بولا۔

"کیا میرا ساتھ دینا پسند کرو گے۔"

"نہیں سر! میں نہیں پیتا۔" کامران نے جواب دیا۔

"ہاں! مجھے اس بات کا علم تو ہے۔ لیکن اگر میں تمہیں پیش کروں۔"

"میں آپ کا دلی شکریہ ادا کروں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ بہت بڑا اعزاز ہے میرے لیے۔ لیکن سر! میرا نام کامران ہے اور میرا تعلق جس مذہب سے ہے اس میں شراب کی ممانعت کی جاتی ہے۔ میں نہیں پیتا اور میں نے کبھی نہیں پی۔"

"تب میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ پلیز بیٹھ جاؤ۔"

"سر.....!"

"بیٹھ..... جاؤ..... یار میں تم سے کہہ رہا ہوں..... بیٹھو....." کپتان نے دوستانہ انداز میں کہا اور کامران بیٹھ گیا۔ کپتان بولا۔

"میں نے تمہارے احسان کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ یہ لفظ اخلاقی حیثیت سے رائج ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ احسان کا بدلہ نہیں بن سکتا۔"

"سر! میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔" کامران بولا۔

"نہیں میری جان! یہ حقیقت پسندی کا دور ہے۔ آج بھی لوگ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر کبھی کبھی کچھ کر بھی دیتے ہیں لیکن کسی کے لیے اپنی زندگی کو ہلاکت میں ڈال دینا ایک الگ عمل ہے اور تم نے ایسا ہی کیا تھا۔ تم اس کرین کی زد میں نہیں تھے۔ لیکن تم نے اس کی زد میں آ کر مجھے سنبھالا اور چھلانگ لگا دی۔ تمہاری دوسری چھلانگ بھی قابل تعریف تھی۔ تمہارے بارے میں مجھے یہ اندازہ تو پہلے ہی ہے کہ تم غیر معمولی شخصیت کے مالک ہو بلکہ جب تم جہاز پر آئے تھے تب بھی میں نے یہی بات کہی تھی کہ کیا تم خلاصیوں میں کام کر سکو گے۔"

"بہرحال تم غیر معمولی انسان ہو۔ انتہائی طاقتور پھرتیلے اور ذہین۔ میں نہیں جانتا کہ تم کن حالات کا شکار ہو کر اس جہاز تک پہنچے ہو اور اس کام پر آمادہ ہوئے ہو۔ یہ بتاؤ اپنا وطن کیوں چھوڑ دیا تم نے۔"

"سر! وطن میں میرا اپنا کوئی نہیں تھا۔ میں ہر جگہ تنہا تھا اور تنہا ہوں۔"

"تعلیم یافتہ ہو۔"

"تھوڑا بہت۔"

"اس کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے۔"

"کچھ نہیں سر! جس وقت تک آپ اس جہاز پر رہنے دیں گے رہتا رہوں گا اور جب آپ کو میری ضرورت نہیں رہے گی کہیں اتر جاؤں گا۔"

"تم نے چونکہ میری زندگی بچائی ہے خیر زندگی کا کوئی معاوضہ تو کبھی نہیں ہوتا نہ کچھ دیا جا سکتا ہے۔ اتنا میں ضرور پیش کش کرتا ہوں کہ تم جس ملک میں بھی اترنا چاہو میں تمہارا وہاں بندوبست کر دوں گا۔ اگر جہاز پر رہنا پسند کرو گے تو جب تک میں اس جہاز پر نوکری کر رہا ہوں اس وقت تک تم میرے ساتھ جہاز پر رہ سکتے ہو۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"آپ نے بہت بڑی بات کہہ دی ہے سر! میں اس کے لیے شکریہ....."

"نہیں...... تم شکریہ نہیں ادا کرو گے میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ کسی اچھی بات کا شکریہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کے اثر کو زائل کر دیا جائے۔ آج سے میں تمہیں، جہاز کے کیبن میں سپروائزری ڈیوٹی دیتا ہوں۔ تم خلاصی کا کام نہیں کرو گے۔ مسافروں کے آرام کا خیال تمہاری ڈیوٹی ہوگی ان کی کیبنوں کی ضرورتوں کی چیزیں فراہم کرو گے۔ دس افراد تمہاری ماتحتی میں کام کریں گے۔"

"میں بہت خوش ہوں سر! اور آپ کے حکم کے مطابق شکریہ نہیں ادا کروں گا۔" کامران نے مسرور لہجے میں کہا اور جہاز پر ایک نئی زندگی کا آغاز شروع ہوگیا۔ کامران کو اپنے فیصلے پر خوشی تھی۔ کرنل گل نواز نے بہت اچھا سلوک کیا تھا اس کے ساتھ بڑی اچھی زندگی دی تھی اسے بڑا باعزت مقام دیا تھا۔ لیکن بعد میں وہ جن طلسمی حالات کا شکار ہوگیا تھا۔ انہوں نے اسے خاصا بدل سا کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑے بڑے مہم جو بڑے بڑے ارب پتی اور کھرب پتی اس کی نگاہوں میں ہیچ ہوگئے تھے۔ کیونکہ جو خزانہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اس کے بعد دولت کی کوئی وقعت نہیں رہی تھی اس کی نگاہوں میں۔

خزانے اس طرح غاروں میں پڑے رہتے ہیں اور ان کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ زندگی میں آزادی کی چند سانسیں ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔ نہ اسے پاتال پرستی کی کوئی فکر تھی۔ بلکہ اب تو وہ اس جنجال سے نکلنا چاہتا تھا۔ سمندری سفر تو بہت ہی زیادہ دل کش تھا۔ کیونکہ ہر طرح کے الجھے ہوئے معاملات سمندر میں ختم ہو جاتے تھے۔ غرض یہ کہ جہاز کا یہ سفر جاری رہا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک اور ملک میں قیام کیا گیا اور جہاز لنگر انداز ہوگیا۔ یہ جہاز کارگو اور مسافر بردار دونوں حیثیتوں کا حامل تھا۔ نئے ملک میں نئے کام شروع ہوگئے اور کامران بھی اپنے فرائض پورے کرنے لگا۔

مسافروں کو معلومات فراہم کرنا اس کی ذمے داری تھی۔ انہی معلومات فراہم کرنے کے دوران اس کی ملاقات سدرہ بیکان سے ہوئی۔ یہ ایک انتہائی ماڈرن اور خوب صورت لڑکی تھی۔ بڑے متناسب اور بے حسین قدوقامت کی مالک اس کا تعلق یمن سے تھا۔ وہ سیاہ نقاب لگائے ہوئے تھی۔ اس کے کاغذات میں کچھ گڑبڑ تھی۔ چنانچہ اس نے کامران سے رجوع کیا۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ میرے کاغذات درست نہیں ہیں۔ وقت بالکل نہیں ہے۔ اگر میں اس جہاز سے روانہ نہ ہو سکی تو میرے لیے بڑی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔"

"آپ کے کاغذات درست ہو جائیں گے مس......"

"سدرہ بیکان......" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے مس بیکان۔"

"آپ کا بے حد شکریہ۔" اس نے کہا اور کامران نے اس کے کاغذات کی درستگی کے احکامات جاری کر دیے اور اس کے بعد وہ اپنے دوسرے معمولات میں مصروف ہوگیا۔ سدرہ بیکان کی آنکھیں تھوڑی دیر تک اس کے ذہن میں رہی تھیں۔ نقاب کے پیچھے سے ان آنکھوں کی بے چینی ایک عجیب سی دلکشی کی حامل تھی۔

بہرحال اس کے بعد وہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ سدرہ بیکان اسے دوبارہ نہیں ملی تھی۔ آخر کار جہاز نے لنگر اٹھا لیے اور کیبن انچارج کی حیثیت سے کامران کیبنوں کی چیکنگ میں مصروف ہوگیا۔

فرسٹ کلاس کے ایک کیبن پر اس نے دستک دی۔ تو اندر سے ایک نغمہ بار آواز سنائی دی۔

"آ ؤ...... کون ہے۔" کامران کیبن کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ تو اس نے ایک انتہائی حسین خاتون کو کسی رسالے کی ورق گردانی میں مصروف دیکھا۔ خاتون نے نگاہیں اٹھا کر کامران کی طرف دیکھا اور کامران کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے خدوخال تو اجنبی تھے لیکن آنکھیں اجنبی نہیں تھیں۔ یہ وہی آنکھیں تھیں جو دیر تک اس کے ذہن پر چھائی رہی تھیں۔ دفعتہً اس کی آواز ابھری۔

"اوہو...... آپ...... آئیے خیریت۔"

"میں کیبن سپروائزر ہوں۔"

"اوہو...... اچھا تو آپ اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے ہوئے ادھر تشریف لائے ہیں۔"

"جی بالکل...... آپ بتائیے آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔"

"آپ بیٹھیے تو سہی...... مجھے کیا کیا تکلیفیں ہیں میں ذرا آپ کو اطمینان سے بتاؤں گی۔" وہ ایک شوخ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"جی فرمائیے۔"

"آپ میری تکلیف کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔"

"جی بے شک اس جہاز پر جب تک آپ کا یہ سفر جاری ہے میرا یہ فرض ہے کہ میں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچنے دوں۔"

"اور جب یہ جہاز کا سفر ختم ہو جائے تب۔" اس نے بہ دستور شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ کامران کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ چند لمحے مسکراتی رہی پھر بولی۔

"اصل میں...... میں تنہائی کی تکلیف کا شکار ہوں۔ بڑی بوریت میں وقت گزر رہا ہے۔ بس یہ چند رسالے ہیں میرے پاس جو میرا ساتھ دے رہے ہیں ورنہ۔"

"آپ انہیں پڑھ لیں تو میں آپ کو کتابیں اور رسالے فراہم کر دوں گا۔ جہاز کی لائبریری میں ہر طرح کا لٹریچر موجود ہے۔"

"کیا وہ بولتے بھی ہیں۔" اس نے کامران کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں بولتے تو نہیں۔"

"تو پھر کیا فائدہ۔ ہاں اگر آپ جیسا ساتھی کچھ وقت کے لیے مجھے مل جائے تو......"

"اوہ...... آپ جب بھی مجھے طلب فرمائیں گی میں حاضر ہو جاؤں گا۔ میری ڈیوٹی تو جہاز کے سب کیبنوں میں ہوتی ہے۔"

"دیکھیں...... انسان کو کب کس چیز کی ضرورت پیش آ سکتی ہے وہ کیا بتائے اب میرا کافی پینے کو دل چاہ رہا ہے۔ لیکن تنہا کافی پینے میں کوئی مزہ نہیں ہوتا۔"

"جہاز میں آپ کے ہم منصب لوگ موجود ہیں۔ شام کو کسی کلب کی تفریحات شروع ہو جاتی ہیں۔ آپ یقیناً ہماری فراہم کردہ تفریحات سے لطف اندوز ہوں گی۔" کامران کے ان الفاظ پر اچانک ہی

اس کے چہرے کے نقوش بدل گئے اور پھر وہ سرد لہجے میں بولی۔

"بہت شکریہ...... سپروائزر صاحب اگر کوئی تکلیف ہوئی تو آپ کو اطلاع دے دی جائے گی۔"

یہ کہہ کر اس نے پھر وہی رسالہ اٹھالیا۔ کامران ایک لمحے کے لیے وہاں رکا اور پھر باہر نکل آیا۔ وہ کچھ لمحات تک اس کے ذہن میں سوچ بنی رہی تھی۔ لیکن اس کے بعد وہ اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا۔ ہر قسم کی الجھنوں سے پاک رہ کر اب وہ اپنا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ پہلے ماضی کے الجھے ہوئے جال ختم ہوجائیں اس کے بعد فیصلہ کرے گا کہ آگے کیا کرنا چاہیے بے شک ایک حسین وجود نے اس کی پذیرائی کی تھی۔

لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ نہ جانے کیسی کیسی نگاہوں کا مرکز رہ چکا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا۔ شام ہوگئی۔ رات کو اس کی ڈیوٹی ختم ہوجاتی تھی اور رات کا سپروائزر اپنی ذمے داریاں سنبھال لیتا تھا۔ ڈیوٹی کے خاتمے کے بعد وہ لباس تبدیل کرکے باہر نکل آیا۔ ڈیوٹی ختم ہوجاتی تھی تو اس کے بعد کسی پر کوئی پابندی نہیں رہ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ کیونکہ کیپٹن اسے بڑی اہمیت دیتا تھا۔

لیکن ابھی تک اس نے کیپٹن کی دی ہوئی مراعات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ جب کہ ایڈلے اس سے پوچھتا رہتا تھا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ اب یہاں کچھ لوگوں سے اس کی شناسائی بھی ہوگئی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ کلب میں داخل ہوگیا۔ یہاں وہ لوگ موجود تھے جن کی اس وقت ڈیوٹی ختم ہوگئی تھی۔ کلب میں رونقیں شباب پر تھیں۔ دفعتہً اسے ایک مترنم آواز سنائی دی۔

"ہیلو......" وہ چونک کر اس سمت پلٹا۔ وہی بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسی نے اسے آواز دی تھی۔ کامران نے اسے دیکھا تو وہ مسکرادی۔ کامران اس کے قریب پہنچ گیا تو وہ بولی۔

"دیکھا ناں غلط تو نہیں کہا تھا میں نے۔ میں اب بھی تنہا ہوں۔"

"میں بیٹھ سکتا ہوں۔"

"بڑی مہربانی کچھ تو رعایت کی تم نے۔" کامران کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"اصل میں مجبوریاں ہوتی ہیں خاتون۔ میں جہاز کا ایک معمولی سا ملازم ہوں اور آپ یقینی طور پر ایک صاحب حیثیت اور صاحب عزت خاتون! مجھے تو آپ سے گفتگو کا سلیقہ بھی نہیں اتا۔"

"گڈ...... چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ اب تمہیں کافی کی پیش کش بھی کرسکتی ہوں۔"

"آپ کی نوازش ہے۔ لیکن میزبانی میری رہے گی۔" وہ ہنس کر خاموش ہوگئی۔ کامران نے ویٹر کو کافی کے لیے کہا اور اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"آپ کیبن سپروائزر ہیں۔"

"جی۔"

"تب تو خاصا ساتھ رہے گا ہمارا اور آپ کا۔ ویسے جہاں تک میرا خیال ہے آپ کا تعلق ایشیا سے ہی ہے۔"

"جی......

"کیا نام ہے آپ کا......"

"کامران۔"

"ویری گڈ...... چہرے سے آپ کامران ہی معلوم ہوتے ہیں اپنا نام تو میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں۔ یعنی سدرہ بیکان۔ تعلق یمن سے ہے اور حالات عجیب وغریب، یہاں میڈرونا میں ایک اہم کام کے لیے آئی تھی اور عجیب وغریب حالات کا شکار ہوگئی۔ اس قدر مشکل وقت گزارا ہے میں نے کہ اگر مضبوط اعصاب کی مالک نہ ہوتی تو پاگل ہوچکی ہوتی۔ کچھ دشمن میری تاک میں ہیں وہ یقیناً میرا ہوائی سفر متوقع کر رہے ہوں گے۔ لیکن میں نے انہیں دھوکا دینے کے لیے بحری سفر کا فیصلہ کیا اور میرے سفر کے کاغذات اسی ہنگامہ خیزی میں درست نہ ہوسکے...... میں بڑی تشویش کا شکار تھی کہ اگر مجھے جہاز میں سوار نہ کرایا گیا تو میرا کیا بنے گا۔ ایسے وقت میں آپ نے میری بھرپور مدد کی ہے۔

"ظاہر ہے میرے لیے تو بہت بڑی بات تھی۔"

"نہیں کوئی ایسی بات نہیں۔" کامران نے جواب دیا۔ اس کی طلب کردہ کافی آ گئی تھی۔ چنانچہ اس نے خود ہی سدرہ بیکان کو کافی دی اور اس نے شکریہ کے ساتھ کافی کا کپ قبول کرلیا۔" پھر بولی۔

"آپ مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔ میں بے تکلفی سے آپ سے مخاطب ہوں آپ نے ذرا بھی محسوس نہیں کیا۔ بس یوں سمجھیں کہ میں شدید ذہنی الجھن میں مبتلا ہوئی تھی۔ حالانکہ حالات میرے خود پیدا کردہ نہیں تھے۔ مجھے پہلے سے کچھ بھی نہیں معلوم تھا اس بارے میں۔ بس یوں سمجھیں کہ کچھ پراسرار لوگ میرے پیچھے لگے ہوئے تھے وہ مجھے کیا نقصان پہنچانا چاہتے تھے اور کیوں۔ اس کا مجھے علم نہیں ہوسکتا۔ ان کی کارروائیاں بڑی عجیب وغریب تھیں۔"

بہرحال اب یہاں تک بات پہنچی ہے دیکھو! اب کیا ہوتا ہے۔" آپ کا یہ سفر کہاں تک ہے؟"

"ہیگل جارہی ہوں۔ وہیں پراتروں گی سرزمین ہیگل پراسرار کہانیوں کی سرزمین ہے۔ آپ تو دنیا گرد ہیں ہیگل گئے ہیں کبھی۔"

"نہیں کیونکہ جہاز پر ملازمت کرتے ہوئے مجھے زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔"

"ویسے ایک بات کہوں آپ سے۔ کہہ سکتی ہوں۔"

"جی...... جی۔" کامران نے کہا۔

"آپ کی شکل وصورت اور کشادہ پیشانی اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ آپ اس معیار اور اس مزاج کے آدمی نہیں ہیں۔ اصل میں آپ کو اتنا بتادوں کہ میں نے نفسیات کی تعلیم حاصل کی ہے۔ چہرہ شناسی سے بہت دلچسپی رکھتی ہوں بہرحال ہوسکتا ہے کہ میرا یہ خیال غلط ہو اور آپ اپنی اس ملازمت سے مطمئن ہوں۔ لیکن بس یہ لگتا ہے کہ آپ کسی خاص وجہ سے یہ ملازمت کررہے ہیں۔" کامران ہنس کر خاموش ہوگیا۔ کافی دیر تک وہ کامران سے بڑی اپنائیت سے باتیں کرتی رہی اور جب بہت دیر گزر گئی تو اس نے کہا۔

"اب میں جانا چاہتی ہوں۔" کامران نے کہا۔

"میں آپ کو آپ کے کیبن تک لے کر چلوں۔"

''نہیں تکلیف نہ کریں۔ شکریہ۔'' وہ چلی گئی اور کامران قرب و جوار میں ہونے والی مختلف تفریحات کا جائزہ لیتا رہا۔ لیکن نہ جانے کیوں سدرہ بیکان نے اس کے ذہن میں ایک خلش سی پیدا کر دی تھی۔ ایک عجیب سا احساس۔ سدرہ بیکان کے نقوش اس کی عمر کسی بھی طرح امینہ سلفا سے میل نہیں کھاتی تھی لیکن جب بھی وہ سدرہ بیکان کو دیکھتا اسے امینہ سلفا یاد آ جاتی۔ امینہ سلفا کا ماضی جو انتہائی پراسرار اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ خطرناک تھا...... اور اس کے بارے میں سوچ کر ایک وحشت کا سا احساس ہوتا تھا۔

بہرحال کامران جن حالات سے گزر چکا تھا۔ اس میں سدرہ بیکان یا امینہ سلفا جیسی کوئی شخصیت اسے متاثر نہیں کر سکی تھی۔ ہاں...... یہ الگ بات ہے کہ اس تنہائی میں اسے ایک ایسی شخصیت مل گئی تھی جو انتہائی پراسرار معلوم ہوتی تھی۔ اس نے کچھ ایسے تذکرے بھی کر دیے تھے جو کامران کے لیے الگ حیثیت کے حامل تھے۔ دوسرے دن لنچ کے بعد سدرہ بیکان اسے تلاش کرتی ہوئی پہنچ گئی۔ وہ اپنے معمولات میں مصروف رہا تھا۔ حالانکہ صبح جاگنے کے بعد سدرہ بیکان اسے یاد آئی تھی۔ لیکن خود سے اس کے پاس جانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ البتہ وہ خود اسے تلاش کرتی ہوئی پہنچ گئی۔

''کمال ہے میں تو سمجھ رہی تھی کہ مجھے ایک اچھا دوست مل گیا۔ جو کم از کم اور کچھ نہیں تو مجھ سے میری خیریت تو معلوم کرتا رہے گا۔''

''واقعی! میری ذمے داری تھی کہ میں آ کر آپ سے آپ کی ضروریات کے بارے میں پوچھوں۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ جب بھی کیبنوں میں مسافر کسی الجھن کا شکار ہوتا ہے تو مجھے طلب کر لیا جاتا ہے۔ باقی خود سے کسی کے پاس جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

''میرے پاس آنے کی بھی نہیں۔''

''نہیں میرا مطلب ہے......'' کامران نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

بہرحال اس کے بعد وہ کافی دیر تک کامران کے ساتھ رہی۔ بڑی اپنائیت کا اظہار کر رہی تھی وہ...... پہلا دن...... دوسرا دن اور پھر تیسرا دن گزر گیا۔ سمندر معتدل تھا اور کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ تیسرے دن وہ ڈیک پر ایک گوشے میں آ بیٹھی اور پھر کہنے لگی۔

''اچھا یہ بتائیے مسٹر کامران کبھی ہیگل کے بارے میں کچھ سنا ہے۔''

''مختصراً...... ہیگل کی قدیم تاریخ دنیا کے بہت سے قدیم مقامات سے زیادہ قدیم ہے اس کے بارے میں اکثر مقالے اور مضامین آتے رہتے ہیں۔''

''آپ نے کبھی ان پر غور کیا ہے۔''

''نہیں...... کیوں وہ میری منزل نہیں تھی۔''

''مسٹر کامران بعض چہرے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ ان پر گہری نگاہوں سے ریسرچ کی جائے تو وہ کچھ سے کچھ نکلتے ہیں خیر...... میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔''

''آپ...... ایک مہربان خاتون ہیں۔ جو مجھ جیسے جہاز کے معمولی ملازم کو اس قدر عزت دے رہی ہیں۔''

''نہیں پلیز...... اپنے آپ کو معمولی ملازم نہ کہو۔'' وہ بے اختیار بولی اور پھر ایک دم خاموش ہو گئی۔ جیسے اسے اپنی اس بے اختیاری پر افسوس ہوا ہو۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''میری زندگی سے کچھ پراسرار واقعات وابستہ ہیں۔ یہ پراسرار واقعات میرے پیدا کردہ نہیں ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ اچانک ہی۔ مجھ پر ان کا انکشاف ہوا کچھ لوگ میرے پیچھے لگ گئے وہ کون ہیں۔ میں آج تک نہیں جان سکی۔ وہ مجھے زندہ نہیں دیکھنا چاہتے اگر میں ان کے ہاتھ لگ جاتی تو یقیناً وہ مجھے قتل کر دیتے۔ موت کا خوف انسان کی فطرت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ مسٹر کامران بہت عرصے سے اپنی زندگی کے لیے بھاگ رہی ہوں۔ لیکن کبھی کبھی یوں لگتا ہے۔ جیسے میں تنہا کچھ نہیں کر سکوں گی۔ مسٹر کامران مجھے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے۔ جو میرا ہمدرد ہو۔ میرے لیے سب کچھ کر سکے۔ نہ جانے کیوں فطرت میری رہنمائی آپ کی طرف سے کر رہی ہے۔ مسٹر کامران...... میں...... میں کیا کہوں آپ سے...... یوں سمجھ لیجیے کہ میری خواہش ہے کہ آپ میری زندگی کا ایک حصہ بن جائیں۔ میں اپنی ساری پریشانیاں آپ کو سونپ کر خود کو ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ دیکھیے میں آپ سے کھل کر بات کر رہی ہوں۔ میرے پاس بے پناہ دولت ہے۔ میں آپ کو کسی پریشانی کا شکار نہیں ہونے دوں گی۔ خدا کی قسم میں نے زندگی میں پہلی بار یہ الفاظ کسی سے کہے ہیں۔ میں کوئی بری عورت نہیں ہوں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ دل آپ کی طرف آمادہ ہو گیا ہے۔ پلیز مجھ پر غور کیجیے گا۔'' وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلی گئی۔ کامران حیرانی سے اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر ہنسی آ رہی تھی۔

دنیا میں لاتعداد انسان تنہا ہی زندگی گزارتے ہیں۔ کبھی ان کی زندگی میں ایسے واقعات پیش آ جاتے ہیں۔ جو ان کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔ لیکن پھر وہ ان سے نکل جاتا ہے اور پھر اس کے بعد ساری زندگی سپاٹ گزر جاتی ہے۔ لیکن کامران کی زندگی سے پراسرار واقعات چمٹے ہوئے تھے۔ کرنل گل نواز کو صرف اس لیے چھوڑا تھا کہ گرشک، سبیتا، امینہ سلفا اور نہ جانے کون کون سے کردار اس کی ذات سے مسلط ہو گئے تھے۔

اب تو خود اس کی ذات اس قدر پراسرار تھی کہ اگر کسی کو اس کی مکمل کہانی معلوم ہو جاتی تو وہ خود کامران کو انتہائی حیرت کی نگاہ سے دیکھتا۔ جس زندگی سے بچنے کی کوشش میں کامران نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے اس کی جانب دوڑی چلی آ رہی تھی۔ جہاز کے اس سفر میں بھی اسے ایک انتہائی پراسرار کردار مل گیا تھا۔ جو کسی بھی طور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سدرہ بیکان نے اسے جو پیش کش کی تھی وہ بڑی عجیب و غریب تھی۔ لیکن بہرحال کامران اس کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ بہت وقت اسی طرح گزر گیا اور اس کے بعد آخر کار جہاز ہیگل کی بندرگاہ سے جا لگا۔

ہیگل پراسرار روایتوں کا مالک تھا اور یہاں کے بارے میں بہت سی قدیم داستانیں سن رکھی تھیں۔ بندرگاہ کا شہر ہیگل۔ بذاتِ خود ہیگل ہی کے نام سے مشہور تھا۔ کامران مشکل کے عالم میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے کیا سدرہ بیکان کی پیش کش قبول کر لینی چاہیے۔ بات وہی تھی۔ جن الجھنوں سے بھاگا تھا۔ کہیں وہی الجھنیں اس پر دوبارہ مسلط نہ ہو جائیں۔ سدرہ بیکان جوں جوں ہیگل قریب آتا جا رہا

تھا اس کی خوشامدوں میں مصروف ہوگئی تھی۔

بہرحال جہاز کے بندرگاہ سے لگنے کے بعد مسافر اترنے لگے۔ کامران اپنی ذمے داریوں میں مصروف تھا۔ سدرہ بیکان جہاز سے اتر کر اس کے قریب پہنچی اور بولی۔

"تم نے اب تک مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ نہیں کیا کامران۔" اس دوران وہ اسے بے تکلفی سے تم کہہ کر مخاطب کرنے لگی تھی۔

"میں واقعی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔"

"میں تمہیں کچھ اور تفصیل بتاؤں گی۔ اپنے بارے میں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ تمہارا یہ جہاز دس دن یہاں رکے گا۔ مجھے تھوڑا سا وقت دو گے۔" "ہاں کیوں نہیں۔"

"تو ٹھیک ہے میں خود تمہیں یہاں آ کر تلاش کرلوں گی۔" وہ چلی گئی تو کامران کو یوں لگا جیسے سر سے کوئی بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ اس دوران بھی اس نے کافی غور کیا تھا۔ سدرہ بیکان پر لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ اس طرح تو زندگی پر ایک بوجھ مسلط ہو جائے گا۔ آزادی کی زندگی حاصل کرنے کے لیے ہی تو وہ اس جہاز پر چڑھا تھا۔ ورنہ حسن شاہ بہت اچھا دوست تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کسی بھی طور اس پر آمادہ نہیں تھا کہ کرنل گل نواز یا رانا چندر سنگھ کو چھوڑ دے۔

بہرحال وہ جہاز پر اپنی مصروفیات میں مصروف رہا۔ ہر شخص ہی اس کا ہمدرد اور دیوانہ بن گیا تھا۔ خود کیپٹن وغیرہ بھی اس سے بہت زیادہ انسیت کا اظہار کرتے تھے۔ ایڈلے نے تو اس سے کہا تھا۔

"میں تمہارا عہدہ مزید بڑھا سکتا ہوں۔ کم از کم اس وقت تک میری ذات سے منسلک رہو۔ جب تک کہ میں خود آن ڈیوٹی ہوں۔ اگر گہرے سمندروں میں دل بھر جائے تو زندگی کا کوئی اور رخ اپنا لینا۔ ویسے میں تمہیں بتاؤں اگر تھوڑے عرصے تم اس جہاز میں رہے تو یہ تمہیں اپنی اولاد کی مانند محسوس ہونے لگے گا۔ تم اس کی حفاظت کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دو گے۔ میں کم از کم یہی محسوس کرتا ہوں۔ کامران ہنس کر خاموش ہوگیا تھا۔

تین دن گزر گئے۔ جہاز کے خلاصی اور عملے کے دوسرے افراد کیپٹن کی اجازت سے ہیگل کی سیر کو چل پڑے تھے۔ پراسرار واقعات کا حامل یہ ملک اور اس کا یہ شہر ایک مخصوص طرز زندگی رکھتا تھا۔ جو کافی دل کش تھی۔

یہاں قدیم معبد، پگوڈے اور مندر پھیلے ہوئے تھے۔ یہ بھی بدھ روایات کا حامل تھا اور یہ بات بھی باعث دلچسپی تھی کہ یمن کی دوشیزہ یہاں اتر گئی تھی اور اب لاپتا تھی چوتھے دن کامران ہیگل کے ایک بازار سے گزر رہا تھا اور یہاں کے طرز زندگی کو دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھتا جا رہا تھا کہ اچانک ہی کسی نے عقب سے اسے آواز دی۔

"مسٹر کامران!" نہ جانے کیوں یہ لہجہ اسے جانا پہچانا محسوس ہوا۔ اور وہ چونک پڑا اس نے پلٹ کر دیکھا۔ تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ شعورہ ثنائی تھی۔ شعورہ قزل ثنائی۔ وہ اس سے چند گز کے فاصلے پر تھی۔ تیزی سے اس کے قریب پہنچی اور اس نے عجیب سی خوشی کے عالم میں کہا۔

"مسٹر کامران کیا واقعی یہ آپ ہی ہیں؟" کامران نے مسکرا کر گردن ہلائی۔

"میڈم آپ......"

"ثنائی...... ثنائی بھی میرے ساتھ ہیں۔ وہ دیکھیں اس دکان پر قدیم نوادارت دیکھ رہے ہیں۔"

کامران اندازہ نہیں لگا سکا کہ انہیں ان لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی ہے یا الجھن۔ کیونکہ بہرحال وہ ان الجھنوں سے نکلنا ہی چاہتا تھا۔ پھر شعورہ نے قزل ثنائی کو آواز دی اور قزل ثنائی بھی ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ کامران کو ملا۔

"کمال ہے بھئی...... یہ کیسے ہوگیا۔" کامران نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔

"کیا باقی لوگ بھی......"

"نہیں ہمارے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ ان لوگوں سے ہمارا ساتھ چھوٹ چکا ہے۔" کامران نے ایک گہری سانس لی۔ پھر بولا۔

"یہاں آپ کب سے ہیں۔"

"تھوڑے دن ہی گزرے ہیں۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ ہیگل اپنے ہی ایک کام سے آئے تھے۔ آؤ کچھ وقت تمہارے ساتھ رہے گا۔ تمہیں یہاں دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک کھلے میدان میں نیچے جہاں پارکنگ لاٹ تھی۔ پارکنگ لاٹ سے انہوں نے اپنی کار نکالی۔ قزل ثنائی نے اسٹیئرنگ سنبھالا۔ کامران اس کے برابر بیٹھ گیا۔ شعورہ ثنائی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی تھی۔ راستے میں قزل ثنائی نے کہا۔

"لیکن تم ہیگل کب پہنچے؟"

"چار پانچ دن ہوگئے۔"

"کس طرح؟"

"ایک سمندری جہاز پر کیبن سپروائزر رہوں۔"

"کیا؟" قزل ثنائی نے حیرت سے کہا۔

"ہاں......"

"کمال ہے بھئی کمال ہے۔ خیر پہنچنا تو تھا تمہیں یہاں۔"

"کیا مطلب؟" کامران نے سوال کیا اور قزل ثنائی مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہوگیا۔

پھر اس نے کار ایک خوب صورت عمارت کے احاطے میں کھڑی کر دی۔ یہ عمارت بھی ہیگل کی طرز تعمیر کا ایک نادر نمونہ تھی۔

"آپ یہاں رہتے ہیں؟"

"ہاں......"

"تنہا۔"

"تنہا ہی سمجھ لو۔"

"یہ عمارت آپ نے کرائے پر حاصل کی ہے۔"

"نہیں کسی نے مجھے قیام کے لیے دی ہے۔"

"کس نے؟"

کہانی سنی تھی وہ بھی بڑی حیران کن تھی۔ اینہ سلفا کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوئی تھیں وہ بھی دماغ چکرا دینے والی تھیں اور بعد میں اینہ سلفا جو کچھ ثابت ہوئی اس نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ قزل ثنائی کا کہنا بالکل سچ تھا۔ یہ شخص واقعی صاحب علم ہے اور اس نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کی کچھ نہ کچھ حیثیت ضرور ہے۔ پھر کیا کروں میں، کرنل گل نواز میرے لیے انتہائی قابل احترام ہستی تھی۔ لیکن میں نے اسے صرف ان واقعات سے نپٹنے کے لے چھوڑ دیا۔ کیا قزل ثنائی اس بارے میں میری رہنمائی کر سکتا ہے۔ پھر کامران نے سونے کی کوشش شروع کر دی۔

دماغی تھکن اس طرح دور ہو سکتی تھی۔ جہاں تک جہاز کا مسئلہ تھا۔ اس نے ایک دم ہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ اب جہاز پر واپس نہیں جائے گا۔ بے شک وہاں اس کے کچھ لوگوں سے بہت اچھے تعلقات ہو گئے تھے۔ خاص طور سے کپتان ایڈلے ڈیوسن اور چند دوسرے افراد اس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آئے تھے اور اسے اپنے درمیان رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن کامران کا دل ایک دم اب اس عمل سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اگر واقعی قزل ثنائی کا کہنا درست ہے تو پھر میں کس طرح ان حالات سے بھاگ سکوں گا۔ مگر واہ...... اسے تقدیر کہاں سے گھیر کر کہاں لائی۔ نہ مسجد میں الیاس احمد ملتے نہ کرنل گل نواز تک رسائی حاصل ہوتی اور نہ یہ اس کے بعد پیچ در پیچ واقعات کا عظیم الشان سلسلہ شروع ہوتا۔

کمال ہے کہانی کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے اور اختتام...... اختتام کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ کہاں ہوگا۔ نہ جانے کب نیند آ گئی جاگا تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ اپنی جگہ سے اٹھا۔ ملحق باتھ روم میں منہ ہاتھ وغیرہ دھویا بال سنوارے باہر نکلا ہی تھا کہ شعورہ نظر آ گئی۔ مسکرا کر گردن ہلائی اور بولی۔

''بس اب میں تمہیں جگانے آ رہی تھی۔ لان پر ثنائی تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ چائے لے کر آ رہی ہوں لان پر چلے جاؤ۔'' پہلی بار کامران نے محسوس کیا کہ اس عمارت میں قزل ثنائی اور شعورہ ثنائی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ شعورہ سارے کام خود ہی اپنے ہاتھوں سے کرتی ہے یہ بڑے تعجب کی بات تھی۔ قزل ثنائی کے بارے میں اسے یہ علم ہو چکا تھا کہ وہ لیبیا کا رہنے والا ہے۔ لیکن یہاں ہنگل میں اس کا یہ انداز بڑا عجیب سا تھا۔ قزل ثنائی نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا تھا۔ اس کے سامنے ایک بہت ہی خوب صورت پیڈ رکھا تھا اور وہ اس کے اوپر لکیریں بنا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے پین بند کیا اور بولا۔

''تمہارے چہرے کی شگفتگی بتا رہی ہے کہ تم نے ایک خوشگوار نیند لی ہے۔''

''ہاں......''

''اور یہ لکیریں مجھے بتا رہی ہیں کہ تم نے بہت سے فیصلے کیے ہیں۔''

''لکیریں؟'' کامران نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ہاں...... کتابی علم سے حاصل ہونے والی معلومات دیکھو! خواہ مخواہ فضول باتیں کرنے لگ جاتا ہوں۔ اچھا ایمان داری سے ایک بات بتا دو کہ کیا تم نے جہاز پر جانے کا ارادہ ترک نہیں کیا۔''

''کر دیا ہے۔''

''یہ لکیریں بتاتی ہیں کاش! میں تمہیں بتا سکتا کہ لکیروں کا علم کیا ہوتا ہے یہ اس کائنات کا پراسرار

ترین علم ہے اور میں تمہیں بتاؤں کہ یونان کے ایک باشندے سورانوس نے یہ علم حاصل کیا تھا۔ اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ دیوی زیوس اور دیوتا اسپادو تک اس کی رسائی ہو چکی تھی اور ان دونوں نے اسے اپنا دوست مان کر اسے اپنا یہ علم دیا تھا۔ اہل یونان اس بات کو ایک روایت کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ لیکن اس شخص کی ایک کتاب کا قلمی نسخہ میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس قلمی نسخے میں وہ لکیروں کے اس علم کے بارے میں دنیا کو بتانا چاہتا تھا۔ لیکن تقدیر نے اسے مہلت نہیں دی اور وہ آخر کار موت کی آغوش میں چلا گیا۔ یہ قلمی نسخہ بڑے پراسرار حالات میں مجھ تک پہنچا اور میں نے اس پر سالہا سال صرف کیے۔

یہ لکیریں بڑا سچ بولتی ہیں ہم اس سچ کو یونانی سچ کہتے ہیں۔ قزل ثنائی کا لہجہ خواب ناک ہو گیا۔ یہ شخص اب کامران کے لیے بہت زیادہ پراسراریت اختیار کرتا جا رہا تھا اس نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کامران میں تمہیں بہت سی حقیقتوں سے آشنا کروں۔ بولو کیا میری کچھ وقت کی قربت قبول کرو گے۔''

''ہاں۔'' کامران نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''شعورہ چائے لا رہی ہے۔ اپنی باتیں اپنے ہی درمیان ہونی اور رہنی چاہئیں وہ بہتر ہوتا ہے۔ کامران واقعی ایک طلسمی جال میں جکڑا گیا تھا۔ اسے مختلف لوگوں نے علم دیا تھا۔ جسمانی طور پر اس وقت وہ ایک طاقت ور ترین انسان تھا اور بہت کچھ کر سکتا تھا۔ جہاز پر اس نے کپتان ایڈلے کو جس طرح گود میں اٹھا کر چھپاٹا مارا تھا۔ وہ ایک انسانی طاقت نہیں تھی۔ بلکہ گرشک اور سیتا کی تربیت کی دی ہوئی طاقت تھی جس نے اسے زمین پر قدم ٹکائے بغیر ایڈلے کو بازو میں دبوچ کر عرشے سے سمندر تک جانے کی قوت بخشی تھی۔

شعورہ ٹرالی گھسیٹتی ہوئی پاس پہنچ گئی۔ ٹرالی پر بہت سا سامان لدا ہوا تھا۔ کامران نے ہنس کر رہا۔

''مسٹر میرا خیال ہے کہ اگر میں ایک ہفتے تک آپ کے پاس ٹھہر گیا تو میرا وزن خوب بڑھ جائے گا۔''

''نہیں...... نہیں، ایسی بات نہیں ہے اس میں ایسی چیزیں زیادہ نہیں ہیں جس میں کولیسٹرول یا فیٹ ہو پلیز! مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ میں ایک مہمان کی مدارات کر رہی ہوں اور مہمان بھی وہ جو انتہائی پراسرار قوتوں کا حامل ہے کھانے پینے کی چیزوں سے فراغت حاصل کی گئی پھر شعورہ نے کہا۔

''قزل کی آنکھوں سے پتا چلتا ہے کہ اب اس کی خواہش ہے کہ میں اندر چلی جاؤں رات کا کھانا پکانا ہے مجھے، اس لیے مجھے اجازت۔''

''ایک درخواست کے ساتھ۔'' کامران نے کہا۔

''ہاں...... کہو...... کہو مسٹر کہہ رہے ہو مجھے اور درخواست کر رہے ہو؟''

''کوئی بہت ہی ہلکی پھلکی چیز رات کے کھانے میں ہو آپ اپنے لیے کچھ بھی کریں۔''

''او کے...... او کے۔'' شعورہ نے کہا اور وہاں سے ٹرالی دھکیلتی ہوئی چلی گئی۔ تو قزل ثنائی نے وہ پیڈ سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں اب اجازت ہے کہ تمہیں پریشان کروں۔''

''میں پریشان ہونا چاہتا ہوں۔'' کامران نے ایک خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''میں بہت خوش ہوں کہ تم ایک شگفتہ مزاجی کے ساتھ ان الجھے ہوئے حالات کو سننا چاہتے ہو جو کسی کے بھی ذہن کو خراب کر سکتے ہیں۔ میرے دوست یہ مزاجی شگفتگی انسان کو لاتعداد مسائل سے نکال لیتی ہے اور وہ خوش گوار حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ خوش مزاجی کے ساتھ وہ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر لیتا ہے۔ دیکھو میں تمہیں پہلے تھوڑی سی تفصیل بتاتا ہوں۔ علی سفیان مصر کا ایک دولت مند انسان ہے۔ اس نے زندگی میں عیش و عشرت کے سوا کچھ نہیں کیا ہے۔ وہ فطرتاً مہم جو ہے اور اسی مہم جو فطرت سے متاثر ہو کر اس نے بہت سے الجھے ہوئے سفر کیے ہیں۔ جن میں اس کی زندگی لاتعداد بار خطروں سے دوچار ہوئی۔ پھر امینہ سلفا جو درحقیقت ایک پراسرار کردار ہے۔ اس کی زندگی میں داخل ہوئی۔ امینہ سلفا کے بارے میں لکیریں کہتی ہیں کہ یہ ایک عجیب و غریب کردار ہے ایسا جسے ماضی کا ایک عفریت کہا جا سکتا ہے۔

یعنی وہ ایک ایسی شخصیت ہو سکتی ہے۔ جو بس میں تمہیں صحیح الفاظ میں نہیں بتا سکتا۔ مجھے لکیروں میں ایک نام ملتا ہے اور یہ نام ہے اناطوسیہ کامران کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ درحقیقت امینہ سلفا۔ اناطوسیہ کی حیثیت ہی سے اس کے سامنے آئی تھی۔ قزل ثنائی نے کچھ لکیروں کو اپنے چہرے کے قریب کر کے کہا۔

''اور امینہ سلفا نے صرف اس لیے علی سفیان سے شادی کی کہ علی سفیان اس کے اس مقصد کی تکمیل کرے جو ابھی تک تاریک پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ میرے دوست میں تمہیں وہ باتیں بتا رہا ہوں۔ جو گزر چکی ہیں مستقبل کا حال کوئی ذی روح نہیں بتا سکتا۔ کسی بھی حوالے سے لے لو مذہب کے حوالے سے لے لو۔ سائنس کے حوالے سے لے لو، جہاں تک قدرت نے انسان کو اجازت دی ہے وہاں تک انسان اپنے قدم آگے بڑھا سکتا ہے اور جہاں یہ اجازت نہیں ملی ہے۔ وہاں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ لکیروں کا یہ کھیل ماضی کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے مستقبل کے نہیں۔ تو میں تم سے کہہ رہا تھا کہ یہ سلسلہ جاری ہوا۔

اب آؤ میں تمہیں تمہارے ماضی کے بارے میں بتاتا ہوں۔ میں نے لکیروں سے تمہارے بارے میں سوال کیا اور لکیروں نے جہاں تک میری رہنمائی کی وہ یہ تھی سادگی سے زندگی گزارنے والے کامران کی زندگی میں کوئی ایک کردار ایسا تھا۔ جسے وہ دل و جان سے چاہتا تھا۔ کوئی حادثہ ہوا، وہ کردار اس سے بچھڑ گیا اور اس کے بعد کامران کو اچانک ہی ایک ایسا کردار ملا جو اس کے لیے اجنبی تھا۔ مجھے معاف کرنا کامران تمہاری عجیب و غریب ذمے داریاں کچھ مخصوص حالات کی بنا پر ہوئیں۔ اب میں تم سے پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ راکان ہونزہ کی تلاش نے تمہیں منتخب کیا تمہارے نقوش ایک ایسے شخص سے ملتے ہیں جو ایک انوکھی دنیا کے لیے ایک انوکھا کردار تھا۔

میرے دوست میں کوئی جادوگر، عامل، نجومی یا کوئی بہت بڑا عالم نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں اپنی حقیقت بتا دی کہ لکیروں کا علم مجھے کہاں سے حاصل ہوا اور میرے تجربات نے مجھے یہ یقین دلا دیا کہ یہ علم جھوٹا نہیں ہے، نامکمل نہیں ہے بلکہ یہ ماضی کی تمام باتیں صحیح بتاتا ہے اور مستقبل کے لیے خاموش ہے۔ ہاں یہ کیا جا سکتا ہے۔ ماضی کی روشنی میں اس عمل کو آگے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ تاریخ کے دو انوکھے کردار جن کا تذکرہ میں نے اس تمام کارروائی کے دوران سنا یعنی گرشک اور سیتا لکیروں کا عمل بتاتا ہے کہ وہ دو کردار تم سے اجنبی نہیں ہیں۔ بلکہ ان نقوش کی بنا پر جو ماضی کے اس انوکھے کردار سے ملتے ہیں تم ان کے شناسا ہو۔ اور وہ تمہارا سہارا حاصل کرنے میں سرگرداں رہے ہیں۔

اور اب بھی ان کی آنکھیں تمہیں نظر انداز نہیں کر سکیں بس! ان کے بہت سے ایسے معاملات ہیں جن کی بناء پر وہ کھل کر تمہارے سامنے نہیں آ سکتے۔ لیکن وہ تمہارے اردگرد منڈلاتے رہے ہیں اور منڈلاتے رہیں گے۔ دوست ایک ایسا انکشاف میں تم پر کر رہا ہوں کہ اگر کسی اور کے سامنے کروں تو تم لاتعداد مشکلوں میں گھر جاؤ۔ مثلاً یہ کہ وہ عظیم الشان خزانہ، جس کے لیے خلقت سرگرداں ہے۔ تمہارے علم میں آ چکا ہے تمہاری آنکھوں میں جو چمک آ بسی ہے تم نے خود بھی کبھی اس کا تجزیہ نہیں کیا ہوگا۔

خزانوں کے عمل بڑے پراسرار ہوتے ہیں۔ اصل میں وہ دیوتاؤں کی شناخت ہوتے ہیں اور دیوتا جس کی آنکھوں میں جا بسیں اس کی آنکھوں میں تبدیلیاں تو رونما ہونی ہی چاہئیں۔ رات کی تنہائیوں میں بارہ اور ایک بجے کے درمیان جب دو دن یعنی پہلے دن کی رات اور دوسرے دن کی صبح کا سنگم ہوتا ہے تو دیوتاؤں کی آنکھیں تمہاری آنکھوں سے باہر جھانکتی ہیں۔ دنیا دیکھتی ہے ایسے وقت میں کبھی رات کی تاریکیوں میں دور تک دیکھنا تمہاری آنکھوں کی روشنی نہ جانے کہاں تک جائے گی اور اس منظر کو نمایاں کر دے گی۔ جو تمہاری آنکھوں کی روشنی کی زد میں ہوگا۔

یہ ان خزانوں کا عکس ہے جنہیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو اور یہ تمہارے دل کی سیرابی ہے۔ یعنی وہ بڑائی جو آسمانی کہلائی جا سکتی ہے۔ میرے عزیز دوست میں تمہیں علی سفیان رانا چندر سنگھ اور کرنل گل نواز کے بارے میں بھی بتا سکتا ہوں۔ یہ لوگ ان خزانوں کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔ کرنل گل نواز بیمار ہو گیا تھا۔ اپنے وطن جانے کے بجائے وہ رانا چندر سنگھ کے ساتھ ایک اور تلاش میں نکل گیا۔ اب وہ ٹھیک ہے اور اپنے وطن جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ وہ دوبارہ اس مہم جوئی کے لیے نئے سرے سے اپنے آپ کو تیار کریں گے جہاں تک امینہ سلفا کا تعلق ہے۔ وہ علی سفیان کے ساتھ لگی ہوئی ہے اور اس وقت کرنل گل نواز کی کوٹھی پہنچ چکی ہے۔ کرنل گل نواز بھی بہت مختصر سے وقت میں جانے والا ہے وہ لوگ تمہارے لیے سرگرداں ہیں۔ کیونکہ تمہاری ذات کے کچھ اور راز ان کے سامنے نمایاں ہو چکے ہیں۔ کامران نے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے تھے۔ قزل ثنائی کہتا تھا کہ وہ جادوگر نہیں ہے لیکن اس نے جو راز کامران کو بتائے تھے۔ جن کے بارے میں کامران کے سوا کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ اب ان حالات میں قزل ثنائی کامران کے لیے کس قدر اہمیت کا حامل ہو گیا تھا۔ اس کا فیصلہ کرنے میں کامران کو کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''آپ بہت کچھ جانتے ہیں اور آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ لفظ بہ لفظ صحیح ہے، خدا کی قسم یہ صرف اللہ تعالیٰ کا بخشا ہوا علم ہے جو اس نے مجھ تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ ماضی کے بارے میں تو بتا سکتا ہوں میں۔ مستقبل کا حال اسی طرح میری نظروں سے پوشیدہ ہے۔ جس طرح دنیا بھر کے تمام انسانوں کی آنکھوں سے۔''

"میں یہاں تک کیوں پہنچا ہوں۔" کامران نے سوال کیا اور قزل ثنائی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم خود نہیں پہنچے بلائے گئے ہو۔"

"کیا مطلب؟" کامران حیرت سے بولا۔

"تم نے یہ فیصلہ کیا تھا کامران کہ تم اپنے طور پر زندگی گزارو گے اور اسی لیے تم نے ایک ناخوشگوار فیصلہ بھی کیا تھا اور وہ یہ کہ ایک عام اور اچھے انسان کی طرح زندگی گزارو گے۔ لیکن کامران تقدیر کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ تم کتنی ہی کوششیں کرلو ان واقعات سے نہیں بھاگ سکو گے۔"

"مجھے اندازہ ہو رہا ہے مگر مسٹر ثنائی! آپ نے یہ انکشاف تو کیا کہ میں کسی خزانے سے واقف ہو چکا ہوں اور اس کی روشنی میری آنکھوں میں آ بسی ہے۔ لیکن آپ نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے وہ خزانہ کب اور کہاں دیکھا۔"

"پوچھنا بھی نہیں چاہتا۔ سمجھے میرے سارے خزانے میری ذات میں پوشیدہ ہیں اور جو خزانے میری ذات میں پوشیدہ ہیں۔ وہ روئے زمین پر نہیں پائے جاتے ہیں اور میری بیوی ان خزانوں سے پوری طرح مطمئن ہے۔ ہاں...... ہر پراسرار عمل کی تفتیش میری زندگی کا ایک حصہ ہے اور ہم دونوں میاں بیوی یہی کرتے ہیں۔ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم سنہرے روپہلے اور رات کی تاریکیوں میں چمکنے والے پتھروں یا دھاتوں کے لیے اپنی زندگی قربان کردیں۔ ہم دونوں زندگی کا ایک بڑا حصہ گزار چکے ہیں اور بڑے مطمئن ہیں ایک دوسرے سے ہمارا محبوب مشغلہ یہی ہے کہ ہم پراسرار واقعات کی کھوج لگائیں اور اس وقت بھی ہم اپنے اس کام میں مشغول ہیں۔"

"میرا خیال ہے آپ سے زیادہ مناسب اور اچھا انسان میرے لیے اور کوئی نہیں ہے۔ کرنل گل نواز مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں ان کے پورے خاندان نے مجھے ایسے وقت میں سہارا دیا ہے۔ مسٹر ثنائی جب میں ذہنی طور پر بیٹھ کر کہیں سے کہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میں حالات کا شکار ہوکر موت کے راستے اپنا لیتا۔ یعنی وہ سب کچھ جو مجھے پھانسی کے پھندے تک لے جاتا۔ لیکن اس کے بعد کرنل گل نواز نے مجھے اپنے شوق میں شامل کرلیا۔ ہاں لکیریں آپ کو بالکل صحیح بتا رہی ہیں۔ گرشک اور سیتا طویل عرصے تک میرے ساتھ رہے ہیں۔ دونوں مجھ پر اعتبار کرتے ہیں اور مسٹر قزل ثنائی بڑی عجیب و غریب کہانیوں میں ملوث کرلیا ہے انہوں نے مجھے۔ میں آپ کو اپنی داستان اس لیے سنا رہا ہوں کہ ممکن ہے آپ آگے کے سلسلے میں میری مدد کرسکیں۔"

اور اس کے بعد کامران نے اس وقت سے جب اس نے کرنل گل نواز کی کوٹھی میں گرشک اور سیتا کو دیکھا تھا اور اس کے بعد سے اس پوری مہم جوئی کے دوران جو واقعات پیش آئے اور پھر اس نے اس خزانے کے بارے میں ساری تفصیل قزل ثنائی کو سنا دی۔ قزل ثنائی پتھر کے بت کی مانند ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ کامران خاموش ہوا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ بڑی عقیدت سے اس نے کامران کے دونوں ہاتھوں کو چوما اور بولا۔

"تم بہت بڑے آدمی ہو...... بہت بڑے آدمی ہو...... بہت بڑے آدمی...... میں تم سے ہاتھ جوڑ کر ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ جو عمل تمہاری تقدیر سے منسلک کر دیا گیا ہے اس سے انحراف نہ کرنا۔ اس پر عمل کرنا۔ تمہاری زندگی کا ایک مقصد ہے۔"

"وہ عمل کیا ہے؟" کامران نے سوال کیا۔

"آہ...... وہ عمل جس کے لیے سدرہ بیکان تمہیں یہاں تک لائی ہے۔"

"لائی ہے۔"

"ہاں...... میں تمہیں بتا چکا ہوں بس کچھ منٹ اور اس کے بعد وہ یہاں پہنچنے والی ہے۔" قزل ثنائی نے کہا اور کامران ایک زبردست سنسنی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

خاصی دیر تک کامران "قزل ثنائی" کے الفاظ کے سحر میں ڈوبا رہا۔ سدرہ بیکان کے بارے میں قزل ثنائی کے الفاظ نے اس کا دماغ جھنجھنا دیا تھا۔ سدرہ بیکان جو اسے بالکل اتفاقیہ طور پر ملی تھیں۔ لیکن قزل ثنائی کچھ اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔

"دفعتہً ہی کامران کے دماغ میں نفرت کی ایک تیز لہر اٹھی۔

"یہ تو زیادتی ہے۔ میں اپنی پسند اور آزادی کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ یہ سب مجھے کیوں گھیرے ہوئے ہیں۔ ان کے باپ کا نوکر تو نہیں ہوں میں...... کہ میں اتنا کمزور اور ناکارہ...... نہیں کھیلوں گا میں ان لوگوں کے ہاتھوں۔ دیکھوں کوئی میرا کیا بگاڑتا ہے۔ ایک کرنل گل نواز تھا جسے میں اپنا سب سے قریبی عزیز قرار دیتا تھا جب میں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو باقی لوگ کیا حیثیت رکھتے ہیں۔"

کامران نے قزل ثنائی سے کہا۔ "آپ مجھے سدرہ بیکان کے بارے میں بتائیے۔"

"کیوں؟"

"آپ اسے جانتے ہیں۔"

"نہیں۔" قزل ثنائی نے بڑے سکون سے کہا۔

"جی......؟" کامران حیرت سے بولا۔

"ہاں۔ میں اسے نہیں جانتا۔"

"آپ نے کہا کہ وہ ابھی یہاں آنے والی ہے۔"

"ہاں...... میں نے کہا ہے۔"

کامران کی آنکھوں میں ناخوش گواری کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ بولا۔ "یہ بڑی عجیب بات ہے۔ میرے مستقبل کی پیش گوئی سب کرنے بیٹھ جاتے ہیں انداز ایسا ہوتا ہے جیسے مجھ سے تعزیت کر رہے ہوں۔ ایسی بات نہیں ہے، سر میں نے زندگی میں شرافت کو اول نام ضرور دیا ہے لیکن خود کو کمزور کبھی نہیں سمجھا۔ آپ بھی بچوں کی طرح مجھ سے کھیل رہے ہیں۔"

"ارے نہیں۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں واقعی سدرہ بیکان کو نہیں جانتا۔ یہ نام بھی مجھے لکیروں میں ہی الجھا ہوا ملا ہے۔"

"اور وہ یہاں آنے والی ہے۔"

"صرف چند منٹ کے اندر اندر......"

"مجھ سے ملنے! میرے لیے......" کامران نے اوپری ہونٹ بھینچ کر کہا۔

"سو فی صدی۔"

"تو پھر معاف کیجیے آپ کی لکیروں کا کھیل میں ہی غلط کر رہا ہوں۔" کامران نے کہا۔

"کیسے......؟" قزل ثنائی نے کہا۔

"ایسے۔" کامران بولا اور اس نے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد وہ وہاں نہیں رکا تھا۔ باہر آ کر بھی وہ پاگلوں کی طرح دوڑتا رہا۔ نہ جانے کتنی دور نکل آیا تھا۔ شدید جھلاہٹ کا شکار تھا۔ "یہ کیا بات ہوئی۔ سب میری تقدیر کے مالک بن گئے ہیں۔ کوئی بھی گرشک، سبیتا، یا دوسرے۔ میں اپنی پسند کی زندگی گزاروں گا۔ دل و دماغ میں ایک جنون تھا۔ دیکھتا ہوں یہ پراسرار قوتیں کس طرح مجھے استعمال کرتی ہیں۔ اپنی شخصیت ہی بدل ڈالوں گا۔ اور اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ شہر چھوڑ ایک دوسرے شہر آیا۔ اور یہاں کاغذات......اور پاسپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے گرفتار کر لیا گیا۔

"کہاں سے آئے ہو......؟" پوچھا گیا اور کامران نے اپنے وطن کا نام بتا دیا۔

"کیسے آئے ہو؟"

"اسمگل ہو کر۔"

"کیوں؟"

"روزگار کی تلاش میں۔"

"اسمگلروں کے نام بتاؤ......" کامران کے لیے کچھ نام دینا کون سا مشکل تھا۔ بہرحال اس پر تھوڑا سا رحم کیا گیا کچھ عرصہ اسے جیل میں رکھا گیا اور پھر اس کے وطن واپس بھجوا دیا گیا۔ کامران جانتا تھا کہ پراسرار قوتیں اس کے پیچھے لگی ہوئی ہیں۔ لیکن اسے بھی ضد ہو گئی تھی۔ وہ اگر چاہتا تو کرنل گل نواز کا حوالہ دے سکتا تھا اس کے اہل خاندان کامران کو بچانے کے لیے سب کچھ کرتے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ البتہ اس کا خیال بالکل ٹھیک نکلا۔ قزل ثنائی نے لکیروں کے حوالے سے اسے بتایا تھا کہ اسے تاریخ کے اس فیصلے کے ساتھ چلنا ہوگا۔ انحراف اس کی تقدیر سیاہ کر دے گا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ اسے صرف چند روز کے لیے جیل بھیجا گیا تھا۔ لیکن عارضی قیدیوں میں سے ایک کا خون ہو گیا اور اس خون کا الزام اس پر لگا۔ نتیجے میں اس کی یہ عارضی سزا عمر قید میں تبدیل ہو گئی۔

جیل کی سخت زندگی بھی کامران نے اپنے طور پر گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بس ایک جنون تھا ایک ضد تھی۔ اگر کرنل گل نواز کا ساتھ نہیں دے سکا تو پھر کچھ بھی نہیں کروں گا۔ گرشک، سبیتا، قزل ثنائی اور شعورہ کیسی ہی کہانیاں کیوں نہ شروع کر دیں۔ پاتال کی گہرائیوں میں سونے والی۔ سوتا ہوا شہر۔ یہ ساری حیران کن داستانیں۔ اس کی ذات سے منسوب کر دی گئی تھیں وہ اکتا گیا تھا ان داستانوں سے۔

جتنا عظیم الشان خزانہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس کے بعد سچی بات یہ ہے کہ دنیا بڑی پھیکی پھیکی نظر آتی تھی۔ اگر کوئی وہ خزانہ لا کر اس کے پاس ڈھیر کر دیتا۔ تو بھلا کون اس سے منہ موڑتا۔ لیکن کسی چیز کے بارے میں یہ اندازہ لگا لینا کہ وہ دسترس سے باہر ہے بہت بڑی بات ہوتی اور پھر اس سے کنارہ کشی اختیار کر لینا۔ اس سے بھی بڑی یہ بات۔ قزل ثنائی نے اس کے ہاتھ بلاوجہ نہیں چومے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ اتنے بڑے خزانے کو ٹھکرا کر صبر سے بیٹھ جانا دنیا کا سب سے مشکل کام ہوتا ہے جو اس نے انجام دیا تھا۔ غرض یہ کہ جیل میں وہ زندگی گزارنے لگا۔ کال کوٹھریوں میں بے بس معصوم انسان جو باہر کی دنیا کے لیے خوف و دہشت کی علامت تھے کامران کے لیے دلچسپی کا باعث تھے۔ وہ معصوم انہیں اس لیے کہتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اندر ایک نئی اور انوکھی داستان چھپائے ہوئے تھا۔

کامران کی بیرک میں بھی اس کے ساتھ چند افراد اور تھے۔ جن میں آپس میں کافی اختلافات تھے۔ جرم تو جرم ہی ہوتا ہے۔ سب نے کوئی نہ کوئی جرم کیا تھا۔ لیکن حالات اور واقعات جدا جدا تھے اور ان ہی لوگوں میں بدر شاہ بھی تھا۔ بدر شاہ کا کہنا تھا کہ وہ بے گناہ ہے اور اسے ناکردہ جرم کی سزا دی گئی ہے۔ مجرموں کے ایک گروہ نے اس سے غیر قانونی کام کروانے کی کوشش کی تھی اور اس کے انکار پر گروہ کے سرغنہ نے اسے ایک قتل کی واردات میں پھنسا دیا تھا۔ پولیس نے اپنی اعلیٰ کارکردگی دکھانے کے لیے چشم دید گواہ عدالت میں پیش کر دیے اور جج نے اسے چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنا دی۔

بدر شاہ کا کہنا تھا کہ اس کے ماں باپ نے اسے اپنی محنت کی کمائی سے پڑھایا لکھایا تھا اور وہ ان کی کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر باہر نکلنے کا موقع ملا تو وہ ان لوگوں کو نہیں بخشے گا۔ جنہوں نے اس کے ساتھ یہ سب کچھ کیا۔ اب اس ماحول میں بہت سا وقت گزارنے کے بعد اس کی زندگی صرف اسی مقصد کے لیے وقف ہے۔ بدر شاہ سے اس کی کہانی سننا اس سے تعلقات کو بڑھانے کے لیے ضروری تھا۔ کیونکہ اس سے بہت کام نکل رہے تھے۔ اس کے ذریعے جیل کے آداب اور قوانین بھی جاننے کا موقع ملا تھا۔

بہرحال اس نے کامران کو وہاں کے اطراف کا نقشہ بتاتے ہوئے کہا۔

"اس جیل کے تین طرف عمودی پہاڑیاں ہیں۔ ایک طرف آبادی اور اس کے سامنے بلندی پر ریلوے اسٹیشن واقع ہے۔ جیل کے حکام کا کہنا ہے کہ کوئی بھی قیدی یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جیل کی تاریخ بھی ان کے اس دعوے کی تصدیق کرتی ہے۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس فصیل کے اندر سزا کاٹنے والے قیدی بڑے شریف النفس اور سیدھے سادے ہیں۔ جو فرار کا خیال بھی ذہن میں نہیں لاتے ہوں گے۔ اس دنیا کا کون شخص آزاد فضاؤں میں سانس نہیں لینا چاہتا تھا۔

اس جیل کے قیدی بھی آزادی کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ یہاں بھی فرار کی کوششیں آئے دن ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن ایسی کوشش کرنے والے یا تو محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ یا دوبارہ پکڑ لیے جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر دوسرے قیدی ہمت ہار بیٹھتے تھے۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد جیل کے کسی نہ کسی گوشے میں فرار کی کوششوں کی منصوبہ بندی ہونے لگتی۔" بدر شاہ کی معلومات سے لگتا تھا کہ اس کے ذہن میں بھی فرار کا منصوبہ پرورش پا رہا ہے اور وہ اس سلسلے میں منصوبہ بندی میں لگا ہوا ہے۔ اس نے کامران کو تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا:

''ہاں اگر کسی قیدی نے جیل کے عملے کے ساتھ تعاون سے وقت گزارا تو اس بات کے امکانات ہو جاتے ہیں کہ اس کے ساتھ رعایت برتی جائے۔ البتہ عدم تعاون اور فرار کی کوشش کی جسارت میں نہ صرف یہ کہ اس سے ذاتی مشقت لی جاتی ہے۔ بلکہ اس کی کوشش میں عین ممکن ہے کہ اسے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں۔'' ان معلومات کے نتیجے میں کامران کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بہرحال رات کا آخری پہر شروع ہونے کے ساتھ ہی دور سے سیکورٹی والوں کی سیٹیوں کی آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔ جو ایک دوسرے کو ہوشیار رہنے کی ہدایت کرتے تھے۔ جیل کے سارے قیدیوں کے ساتھ کامران کو بھی ایک بڑے سے میدان میں جانا پڑتا تھا۔

بدرشاہ کی بتائی ہوئی تفصیلات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے جیل کی عمارت کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔

اونچی اونچی فصیلوں پر مستعد پہرے دار اپنی ذمے داریاں بہ خوبی نباہ رہے تھے۔ سخت گرمی اور چلچلاتی ہوئی دھوپ کے باوجود ان کے جسم کسی درخت کے تنے کی مانند اکڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ کامران نے قیدیوں کے ہجوم میں بدرشاہ کو تلاش کیا۔ جو فاصلے پر ایک تالاب نما جگہ پر منہ ہاتھ دھوتا نظر آ گیا تھا۔

اسے اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر بدرشاہ کے چہرے پر اپنائیت کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔

''آؤ...... کامران منہ ہاتھ دھولو۔'' اس نے کہا اور کامران نے آگے بڑھ کر پانی کے کچھ چھینٹے اپنے منہ پر مارے اور اس کے بعد دوسرے قیدیوں کے ساتھ صبح کی سڑی ہوئی چائے پینے لگا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد تمام قیدی جن کا تعلق انہی کے درجے سے تھا۔ ویگنوں میں سوار کرائے جانے لگے۔ یہ یقیناً اس جگہ تک لے جانے کے لیے کیا جا رہا تھا جہاں ان سے مشقت لی جاتی تھی۔

گاڑیاں جیل کی عمارت سے باہر آ گئیں اور سامنے بدرشاہ کے بیان کے مطابق پھیلی ہوئی عمودی پہاڑیاں جیل کی عمارت کو پراسرار بنانے لگیں۔ گاڑیاں کافی دیر تک سفر کرتی رہی تھیں۔ چند لمحات کے بعد ان کے بریکوں سے چکی کے پاٹوں جیسی آوازیں ابھرنے لگیں۔ شاید یہ رک رہی تھیں۔ کامران نے باہر کی طرف جھانکنے کی کوشش کی۔ جس کے نتیجے میں سامنے بھورے رنگ کی سخت چٹانیں نظر آئیں۔ یقیناً یہی وہ جگہ تھی جہاں پر ان سے کام لیا جانا تھا۔

چند ہی منٹ میں وہ لوگ ان چٹانوں میں گھرے ایک وسیع میدان میں قطاریں بنا کر کھڑے ہو گئے۔ کام شروع ہو گیا تھا۔ بدرشاہ کے ساتھ ہی کامران کی ڈیوٹی بھی لگائی گئی تھی۔ اتنی سختیاں جھیلنے کے بعد بھی اس کے اندر طبیعت کی شگفتگی باقی تھی۔ سب کے حصے میں مختلف کام تھے اور ان کی نگرانی کے لیے چند مقدم متعین کر دیے گئے تھے۔ اونچے قد اور گھنی مونچھوں والے محافظ ہاتھ میں رائفلیں سنبھالے اپنی ڈیوٹی سر انجام دے رہے تھے۔ بدرشاہ تو اب اس زندگی کا عادی ہو چکا تھا اور اطمینان سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ لیکن کامران کو یہ کام ذرا عجیب سا لگ رہا تھا۔

پہاڑ کی گول چٹانوں سے پتھر کاٹنے تھے اور سارے قیدی اس کام میں لگ گئے تھے۔ کامران کو بھی بہرحال دوسروں کی تقلید کرنا پڑی وہ اپنے ہاتھ میں اوزار لیے ایک چٹان پر زور آزمائی کرنے لگا۔ لیکن اس کے اوزار چلانے کا انداز بالکل بے ڈھنگا تھا۔ زندگی میں کبھی اس قسم کی مشقت سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس نے بدرشاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا اس کام سے تمہیں بہت دلچسپی ہے بدرشاہ!''

''کیا کریں بھائی اس جگہ یہی سب کچھ ہے نہ کریں تو...... اور'' ابھی اس کے جملے پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک خوف ناک آدمی اس کے پاس پہنچ گیا۔

''کیا بات ہے کیا پریشانی ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' بدرشاہ نے کہا اور کامران نے اپنا رخ بدل لیا۔ مقررہ وقت پر کام ختم کرنے کے بعد ان کی واپسی شروع ہو گئی۔ آج کی کارکردگی کوئی خاص نہیں تھی ہاں...... البتہ جیل سے نکل کر باہر کے اطراف میں دیکھنے کا جو موقع ملا تھا۔ وہ ذرا دلچسپ تھا۔ کامران کا ذہن بہت تیزی سے اس ماحول کی رنگینیوں میں اپنے مقصد کو تلاش کر رہا تھا اور آہستہ آہستہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بھی یہاں سے فرار کا منصوبہ تھا۔ وہ تنہا یہ کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کچھ ایسے لوگوں کی تلاش تھی۔ جو بھرپور طریقے سے کام سرانجام دے سکیں۔

بہرحال...... دوسرا دن، تیسرا دن اور پھر چوتھا دن اور پھر اس دن بھی چلچلاتی دھوپ میں چٹانیں توڑتے توڑتے بڑی طبیعت اکتا گئی تھی۔ کامران نے کتنی ہی بار اپنے ان ماضی کے کرداروں کے بارے میں سوچا تھا۔ جو سخت سے سخت لمحات میں اس کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ اس دن گرمی کچھ زیادہ تھی اور تمام قیدیوں کی حالت دھوپ کی شدت سے کافی خراب ہو چکی تھی۔ بدرشاہ کامران کے پاس آ بیٹھا۔

''لعنت ہے ایسی زندگی پر۔'' وہ غرا کر بولا۔

''تو چلو نکل چلتے ہیں۔'' کامران نے کہا اور بدرشاہ اسے گھورنے لگا۔ پھر بولا۔

''مذاق اڑا رہے ہو۔''

''نہیں...... بالکل نہیں۔ البتہ تمہیں عقل کے استعمال کی دعوت دے رہا ہوں۔'' کامران نے کہا۔

''مطلب؟''

''جس تکلیف کی وجہ سے تم زندگی پر لعنت بھیج رہے ہو۔ وہ صرف تمہیں تو نہیں ہے۔''

''تم دیکھو! چٹانیں آگ ہو رہی ہیں۔''

''ہاں...... بالکل...... اور ایک دن ہم انہی جھلستی ہوئی چٹانوں میں دم توڑ دیں گے۔''

''تو پھر کیا کریں؟'' وہ بولا۔

''کچھ نہیں بے بسی سے مر جاؤ۔'' بدرشاہ کامران کو گھورنے لگا پھر بولا۔

''تم مجھے سبق پڑھانے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''نہیں بے بسی کی موت سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''اپنی اوقات جانتے ہو۔'' بدرشاہ غصیلے لہجے میں بولا۔

"میں اپنی اوقات بالکل نہیں جانتا۔ لیکن تمہاری اوقات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔"

"ہتھوڑا اٹھا کر تمہارے سر پر ماروں گا اور تمہارے سر کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔"

"مرد کے بچے ہو تو ایسا کر کے دکھاؤ...... ورنہ اپنے ہاتھوں پر تھوکو اور اپنے چہرے پر مل لو۔" کامران کی غراتی ہوئی آواز ابھری۔ اچانک ہی اس کی فطرت میں ایک تبدیلی رونما ہو گئی تھی۔ بدرشاہ اسے گھورتا رہا پھر زچ لہجے میں بولا۔

"تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو۔ میں نے کہا ناں تمہیں مرد بنانا چاہتا ہوں۔ اگر اتنے ہی بڑے مرد ہو تو خود کیوں اس قید میں ہو۔"

"اس لیے کہ اپنی مردانگی کو صحیح طریقے سے استعمال کر سکوں۔"

"تم مجھ سے یہ بکواس کیوں کر رہے ہو۔"

"اس لیے کہ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔"

"میرے خدا......" تمہاری یہ بکواس شاید میری سمجھ میں آ جائے۔ غصہ تو آسانی سے دلا دیتے ہو ابھی تک کام کی بات کوئی نہیں کی ہے۔"

"بدرشاہ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔"

"تم جانتے ہو کہ یہاں سے فرار کی کوششیں کتنے ہی لوگ کر چکے ہیں اور مارے گئے ہیں۔"

"ہاں...... جانتا ہوں۔"

"ابھی تم کیا کہہ رہے تھے۔"

"کب؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

"اپنی زندگی پر لعنت بھیج رہا تھا۔"

"بالکل...... جب ایسی زندگی جو لعنت کے قابل ہو۔ اور دوسرے لوگوں کے چنگل میں ختم ہو جائے تو انسان کے اندر ایک نیا انسان ابھرنا چاہیے۔"

"تو تمہارے اندر کون سا نیا انسان ابھرا ہے۔"

"ابھرا ہے بدرشاہ...... ابھرا ہے اور یہ انسان تمہیں اپنا راز دار بنانا چاہتا ہے۔" کامران نے کہا اور بدرشاہ کامران کو گھورنے لگا۔ پھر اس کی آنکھوں کا رنگ بدل گیا اور اس کے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر بولا۔

"جو کہنا چاہتے ہو صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔"

"دیکھو! ہر کام انسان اکیلے ہی کرتا ہے، لیکن اگر اس کا کوئی ساتھی بھی ہو تو لطف آ جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ انسان تنہا اس دنیا میں آیا ہے اور تنہا ہی اس دنیا سے جائے گا۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن اس دنیا سے جاتے ہوئے اگر میں تنہا رہ جاؤں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ہاں اگر یہاں سے جاتے ہوئے تم میرے ساتھ ہو۔ تو کیسا رہے گا۔"

"واقعی! تمہارے ذہن میں کوئی پروگرام ہے۔"

"اس پہاڑی کو توڑ کر جہاں سے وہ لوگ سڑک نکالنا چاہتے ہیں۔ اس کام کے لیے ابھی کافی وقت لگے گا۔ لیکن آنے والے وقت میں یہ کام ختم ہو جائے گا اور ہمیں ایک بار پھر صرف اور صرف جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں موت کی آمد کا انتظار کرنا پڑے گا۔ یا پھر ان پہاڑیوں میں ہم وقت گزاریں گے۔" بدرشاہ کچھ سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

"ہاں...... بالکل ٹھیک ہے موت ہمارے لیے جیل کی کوٹھریوں میں بھی ہے ان چٹانوں میں بھی ہے یا پھر اس کے بعد جہاں بھی ہماری ڈیوٹی لگائی جائے گی۔ ظاہر ہے۔ قیدی انسان نہیں ہوتے۔"

"میں بھی یہ ہی کہنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر یہ بتاؤ کرنا کیا ہے؟"

"وقت لگے گا ہر کام میں وقت لگے گا۔ ہم دونوں اتنے شریف بن جائیں گے۔ کوئی مقدم یا محافظ ہمارے بارے میں یہ نہ سوچ سکے کہ ہم فرار کی کوشش کر سکتے ہیں۔" بدرشاہ سوچتا رہا۔ پھر ایک بار دوبارہ مسکرا دیا۔

"اور اس کے بعد......؟"

"اور اس کے بعد یہاں سے فرار۔"

"اس علاقے کے بارے میں جانتے ہو۔"

"زیادہ نہیں...... تمہیں معلوم ہے کچھ۔"

"ہاں......"

"کیا جانتے ہو تم اس علاقے کے بارے میں۔"

"یہاں سے دور دور جنگل پھیلے ہوئے ہیں۔ پہاڑی جنگل اور یہاں ان پہاڑی جنگلوں سے زندہ سلامت نکل جانا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔"

"تو ہم زندہ سلامت کب نکلنا چاہتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک......" بدرشاہ نے کہا۔

"تم ان پہاڑی جنگلوں کے بارے میں اور کیا جانتے ہو۔"

"کچھ ایسے لوگوں سے جنہوں نے فرار کی کوشش کی اور گرفتار ہو کر واپس آ گئے ان علاقوں کے بارے میں بہت سی تفصیلات بتائی ہیں۔ آبادیاں بے شک ہیں یہاں لیکن اتنے فاصلے پر کہ صحیح طور پر اس کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ ان فاصلوں کو عبور کر کے ان آبادیوں تک پہنچنا ایک اصل مسئلہ ہے۔ ہاں...... اگر ہم آبادیوں میں پہنچ گئے تو کام بن سکتا ہے۔"

"تو پھر ہمیں سب سے پہلے ان بیڑیوں سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔ جو ہمارے پیروں میں پڑی ہوئی ہیں۔"

"یہی میں بھی کہنے والا تھا۔ ان سے کیسے نجات حاصل کریں گے۔"

’’مقدموں کی محبت اور ہمدردی حاصل کر کے۔‘‘

’’تو پھر تم لیڈر بن جاؤ۔ میں تمہارے پیچھے چلوں گا۔لیکن سوچ لینا آگے کے معاملات۔‘‘

’’یوں کرتے ہیں بدرشاہ کل جب ہمیں دوپہر کا وقفہ ملا تو ہم ان علاقوں کی جغرافیائی کیفیت کے بارے میں بات کریں گے۔‘‘ بدرشاہ نے گردن ہلادی پھر بولا۔

’’ٹھیک ہے تم یہ سمجھ لو کہ تمہارے ساتھ ہوں اور تم نے مجھے مرد کا بچہ ہونے کا طعنہ دیا ہے نا۔تو ٹھیک ہے، میں ثابت کردوں گا کہ میں مرد ہی کا بچہ ہوں۔کیا سمجھے؟‘‘

’’بالکل سمجھ گیا......‘‘ کامران نے مسکرا کر کہا اور بدرشاہ بھی مسکرانے لگا۔کامران نے اس شخص کو پوری طرح شیشے میں اتار لیا تھا۔کسی کام کا آغاز ہونا ہی سب سے بڑی بات ہوتی ہے اور اس کے بعد سارے معاملات تقدیر کے ہاتھ ہوتے ہیں۔بدرشاہ ایک اچھی شخصیت کا مالک تھا اور کامران نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ فرار ہونے کے سلسلے میں پوری طرح سنجیدہ ہے۔ایسے آدمی کو شیشے میں اتارنے کا مقصد بھی ہوتا ہے کہ اس کام کا آغاز ہوجائے۔جس کا کامران اب خواہش مند تھا۔وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا تھا۔اپنی ہی کاوشوں سے کرنا چاہتا تھا۔

حالانکہ وہ ان پراسرار قوتوں کا سہارا لے سکتا تھا۔جو کبھی اسے پاتال پرمتی کبھی پرم پربھو......اور کبھی نہ جانے کیا کیا کہتی تھیں۔لیکن انہی سے پیچھا چھڑانے کے لیے وہ جیل تک پہنچا تھا۔ورنہ اس کی شخصیت ہی بالکل مختلف ہوتی......اور اب وہ کسی بھی طرح ان پراسرار قوتوں کا سہارا نہیں لینا چاہتا تھا۔ہاں یہ الگ بات ہے کہ اسے جس طرح جسمانی طور پر طاقت ور کردیا گیا تھا۔وہ آج بھی اس کے کام آسکتا تھا۔

دوسرے دن منصوبے کے مطابق وہ اور بدرشاہ کھانے کے وقفے میں جلتی ہوئی چٹانوں میں سے ایک ایسی چٹان کا سایہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے۔جس کے نیچے بیٹھ کر وہ گفتگو کرسکتے۔بدرشاہ نے ادھر ادھر دیکھا چند لمحات دیکھتا رہا۔دوپہر کا کھانا انہیں ملا تھا۔وہ انہوں نے بڑی برق رفتاری سے اپنے حلق میں ٹھونسا۔پھر تھوڑا سا وقت حاصل کر کے آگے کا منصوبہ ترتیب دیا جانے لگا۔

بدرشاہ نے پتھر کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اس سے چٹان پر لکیریں ڈال کر ایک نقشہ بنانے لگا۔پھر بولا۔

’’یہ وہ جگہ ہے جہاں ہم اس وقت موجود ہیں۔میں نے آج ادھر چٹانوں کے درمیان اچھی خاصی دیکھ بھال کی ہے اور ایک ایسی جگہ نظر میں آگئی ہے جسے اگر ہم اپنے فرار کے لیے استعمال کریں تو ہمارے لیے سب سے مناسب ہوگی۔ایک دو دن میں، میں تمہیں اس جگہ کا نظارہ بھی کرادوں گا۔اصل میں ہمیں کافی گہرائی میں کودنا پڑے گا اور اس کے بعد ہم اس درے میں داخل ہوجائیں گے۔جو پتھریلا اور نوکیلا درہ ہے۔میری مراد ان دو پہاڑی رخنوں سے ہے۔جو ہمیں یہاں سے دور لے جائیں گے اور ان کی بلندی پر بھاگا نہیں جاسکتا۔‘‘

’’مطلب؟‘‘

’’فرض کرو کہ اگر فوری طور پر انہیں ہمارے فرار کا علم ہوجاتا ہے اور وہ ہمارا پیچھا کرتے ہیں تو انہیں بھی بلندی سے کود کر اس درے میں بھاگنا پڑے گا۔اگر وہ دور ہی سے گولیاں چلاتے ہیں۔تو یہ درہ ہمیں محفوظ پناہ دے گا اور گولیاں چٹانوں سے ٹکرا کر بے اثر ہوجائیں گی۔فرض کروان میں سے کچھ جیالے اگر کود بھی آتے ہیں تو انہیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ہم تو زندگی اور موت کا کھیل کھیلیں گے۔لیکن وہ صرف اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے ایسا کھیل نہیں کھیل سکیں گے۔اس کے بعد وہ اس بلندی سے گھوم کر اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگیں گے اور اس میں انہیں تقریباً پچیس منٹ کا وقف لگ جائے گا۔ہوسکتا ہے کچھ زیادہ لگ جائے۔اس دوران ہمیں کم از کم اس درے سے باہر نکلنے کا موقع مل جائے گا۔ ... تم سمجھ رہے ہونا۔اب اگر خوش بختی یہی ہوئی کہ کوئی ہمیں دیکھنے نہ پائے اور ہم اس درے میں اپنی بیڑیوں کے مسئلے سے نمٹ سکیں۔تو بڑی شان دار بات ہوجائے گی۔‘‘

’’ہاں......سب سے زیادہ فکر کی بات یہ ہی ہے کہ بیڑیوں سمیت ہم اتنی تیز رفتاری سے دوڑ نہیں سکتے۔کیا کیا جاسکتا ہے اس سلسلے میں؟‘‘

’’صبر......اب جب تم میرے دل میں فرار کی روشنیوں کے چراغ جلا چکے ہو تو ان باتوں کو مجھ ہی سوچنے دو۔یقینی طور پر تمہیں اپنی عمر کے مطابق ان تمام چیزوں کا کوئی تجربہ نہیں ہوگا۔‘‘ بدرشاہ کی اس بات پر کامران نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ ادھر ادھر دیکھا۔پھر اس رات کوٹھری میں واپس آنے کے بعد اس نے خاموشی کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگالی۔چند لمحات آنکھیں بند کیے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔پھر آنکھیں کھول کر چاروں اطراف کا بہ خوبی جائزہ لینے لگا۔فی الحال ان بیڑیوں سے نجات اتنی آسانی سے نظر نہیں آتی تھی۔

بہرحال ان کا سب سے مشکل مرحلہ یہ بیڑیاں تھیں۔پھر اس سلسلے میں بھی بدرشاہ ہی نے کام دکھایا۔انہیں پہاڑ کی چٹان تک لے جانے والی گاڑی میں ویسے تو بیٹھنے کے لیے سیٹیں بھی نہیں تھیں۔لیکن کھڑکیوں میں لگی ہوئی جالی کے ساتھ ایک آری نما پتری ویلڈ ہوئی نظر آئی اور بدرشاہ نے غیر محسوس طریقے سے اس کو کھڑکی سے علیحدہ کرنے کی کوشش شروع کردی۔

وہ گاڑی میں لگنے والے جھٹکوں کا بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا اور آخر کار وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوگیا۔جھٹکوں سے الگ ہونے والی پتری کو اس نے وہیں کونے میں اٹکا دیا۔البتہ واپسی پر وہ پتری اس کے لباس میں منتقل ہوگئی اور رات کے پچھلے پہر اس نے کامران کو اپنے کارنامے سے آگاہ کیا۔

’’یہ دیکھو! میں نے آخر کار وہ چیز حاصل کرلی۔‘‘

’’کیا......؟‘‘ کامران نے سوال کیا۔

’’لوہے کو کاٹنے والا بلیڈ۔‘‘ کامران نے چونک کر اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے اس لوہے کے ٹکڑے کو دیکھا تھا۔

’’یہاں کہاں سے آیا؟‘‘

’’اس کو جانے دو......میں نے تم سے کہا تھا نا کہ جو چراغ تم نے جلایا ہے اب اس کی روشنی میں دیکھتے جاؤ۔میں کیا کرتا ہوں۔‘‘

’’لیکن اس سے کس طرح ہم ان مضبوط بیڑیوں کو کاٹ سکیں گے۔‘‘

''اب اس کے لیے تھوڑی عقل کی ضرورت ہے۔ بیڑیوں کا سارا لوہا ایک ہی ہیئت کا نہیں ہے بلکہ اس میں موٹا اور پتلا دونوں قسم کا لوہا موجود ہے۔ اگر ہم کسی طرح اس بیچ والے ڈنڈے کو آدھے سے کچھ زیادہ تک کاٹ سکیں۔ تو ہم با آسانی ان سے آزاد ہو سکتے ہیں اور یہ سب کچھ اس طرح سے ہو کہ بیڑیاں ایک دم ہمارے ہاتھ پیروں سے نہ نکل جائیں۔'' کامران بدرشاہ کی بات کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''واقعی تم نے بڑا زبردست کام کیا ہے۔''

''ہاں...... بس احتیاط شرط ہے۔'' بہرحال ان دونوں نے لوہے کی اس پتری کو دو برابر کے حصوں میں تقسیم کر لیا اور مقدموں کی نظر سے بچا کر ممکنہ فارغ وقت میں لوہے کی بیڑیوں پر زور آزمائی کرتے رہے۔ تیسرے دن انہیں اپنی اس کارروائی میں کامیابی ہو سکتی تھی روزمرہ کے معاملات جاری تھے۔ کامران اور بدرشاہ دل ہی دل میں اپنے پروگرام سے مطمئن تھے۔ بدرشاہ نے کامران کو وہ ڈھلان بھی دکھا دی تھی۔ جس میں انہیں کودنا تھا اور پھر وہاں سے اس درے میں داخل ہونا تھا۔ جو انہیں یہاں سے ایک آزاد دنیا میں لے جانے والا تھا۔ آخر وہ دن آ گیا۔ جس میں انہیں زندگی اور موت کا انتخاب کرنا تھا۔ موسم معمول کے مطابق بہت سخت تھا۔ مقدم بھی تنگ آئے تھے اور چھاؤں تلاش کر کے چٹانوں کے سائے میں دبکے ہوئے تھے۔ کھانے کا وقفہ ہوا اور تمام قیدی کھانا لینے کے لیے لائن میں لگ گئے۔ کامران اور بدرشاہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس وقت تمام لوگوں کی توجہ کھانے کی طرف تھی۔ کسی کو کسی اور چیز کا خیال نہیں تھا۔

انہوں نے کٹی ہوئی بیڑیوں کی طرف دیکھا اور ایک چٹان کی اوٹ میں بیٹھ کر آخری عمل کرنے لگے جس میں انہیں زیادہ وقت نہیں لگا۔ بیڑیوں سے آزاد ہونے کے بعد ساری تھکن دور ہو گئی تھی اور ان کے جسموں میں بجلی سی بھر گئی تھی۔ اب انہیں کسی شے کی فکر نہیں تھی۔ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ جو فیصلہ دل میں کر لیا تھا اس پر عمل درآمد کرنا تھا۔ بیڑیوں سے آزادی حاصل کرتے ہی وہ ان چٹانوں کی طرف دوڑے۔ جہاں سے نیچے کودنا تھا۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ فیصلہ کرنا تھا۔

حالانکہ اگر کوئی اتنی بلندی سے انہیں نیچے کودنے کے لیے کہتا تو وہ مذاق ہی سمجھا جا سکتا تھا۔ لیکن نہ صرف کامران بلکہ بدرشاہ بھی نیچے کود کر اپنی ٹانگوں پر ہی کھڑے رہے تھے اور جب اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ ان کی ٹانگیں دوڑنے کے قابل ہیں تو انہوں نے دوڑ لگانا شروع کر دی۔ وہ اپنی سماعت کو ذہن سے کھرچ پھینکنا چاہتے تھے۔ تاکہ سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں ان کے قریب نہ رہیں۔

اصل میں سوچ ہی راستے روکتی ہے ایسے موقعوں پر۔ چنانچہ انہوں نے اپنے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں ختم کر دی تھیں۔ صرف ایک تصور ان کے ذہن میں تھا کہ انہیں نکلنا ہے۔ پیچھے کیا ہو رہا تھا۔ محافظ بیچ رہے تھے یا نہیں۔ انہیں ان کے فرار کا علم ہو گیا تھا یا نہیں یہ بالکل نہیں سوچ رہے تھے۔ بس دوڑ رہے تھے اور دوڑتے ہوئے وہ آخرکار اس درے میں داخل ہو گئے جہاں چھوٹے نوکیلے پتھر ان کے پیروں کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھے۔ لیکن بات وہی ہوتی ہے مشکلات کے بغیر زندگی میں آسانیوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نوکیلے پتھروں کی چبھن انہوں نے اپنے دل سے نکال دی تھی۔ بس ایک لگن اور ایک

احساس کہ اتنی دور نکل جائیں کہ وہ لوگ انہیں پکڑ نہ سکیں۔

اب جب یہاں تک بات بن چکی تھی اور اس کے بعد ان کے ہاتھ آنے کا مطلب یہ تھا کہ خودکشی...... اور صرف خودکشی اور اگر خودکشی ہی کرنی ہے تو پھر اس طرح کیوں نہ کی جائے۔ انہیں یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ کب تک دور دور پھیلے ہوئے جنگلوں میں دوڑتے رہے کب درخت ان کے سامنے آئے وہ ہر مزاحمت سے ٹکراتے ہوئے دوڑ رہے تھے اور وہ دوڑتے رہے اس وقت تک جب تک سانس سینے میں سمایا رہا اور بدن کی قوت ساتھ دیتی رہی۔ جب یہ محسوس ہوا کہ چند قدم بھی اور دوڑے تو گر پڑیں گے۔ تو انہوں نے اپنے حواس کو واپس آنے کی اجازت دے دی اور ہوش میں آ گئے۔

پہلے بدرشاہ کی رفتار سست ہوئی اور پھر کامران کی۔ پھر انہوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بدرشاہ پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر حیرت سے منہ کھول کر بولا۔

''کامران۔''

''ہاں۔''

''کون سا علاقہ ہے یہ۔'' کامران مسکرا دیا پھر بولا۔

''اگر تمہیں معلوم ہے تو مجھے بتا دو۔''

''کتنا فاصلہ طے کیا ہوگا ہم نے؟''

''کیا تم ہوش میں آ گئے۔''

''شاید؟''

''نہیں ابھی نہیں آئے۔ بھلا ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہم نے کتنا فاصلہ طے کر لیا۔''

''واقعی...... اس وقت تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم نہیں دوڑ رہے تھے۔ بلکہ ہمارے اندر کوئی اور قوت دوڑ رہی تھی۔''

''بے شک وہ ایک [illegible] ہی قوت تھی۔ اب ذرا اتنی بلندی سے کود کر اور ہوش و حواس میں رہ کر دوڑ کر دکھاؤ۔''

بدرشاہ ہنسنے لگا پھر بولا۔ ''نہیں دوڑ سکتے۔ بہرحال چھوڑ اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ میرے خیال میں اب ہمیں چھپ جانا چاہیے۔ محافظ اتنے بے خبر نہیں ہوں گے۔ ہمارے فرار کی اطلاع ہو چکی ہوگی۔ ہم تو اپنے قدموں کے ذریعے یہاں تک پہنچے لیکن ان کے پاس ایسے ذرائع ہوں گے کہ وہ ہمیں تلاش کرتے ہوئے ان جنگلوں میں داخل ہو جائیں گے۔ ہمیں لمبے عرصے تک اپنے آپ کو چھپائے رکھنا ہوگا۔ اس خیال نے ان لوگوں کی تھکن دور کر دی۔ شاہ بلوط کے گھنے درختوں کے جھنڈ میں وہ خرگوشوں کی طرح داخل ہو گئے۔ ابھی دن کا بڑا حصہ باقی تھا۔ طے کیا گیا کہ رات کو سفر کیا جائے گا اور دن میں کہیں چھپ جائیں گے۔

ایک دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد انہوں نے پہلے اپنا حلیہ درست کرنے کی کوشش کی بدرشاہ نے لکڑی کے ٹکڑوں کا انتظام کیا تھا۔ جس سے کام لیا جا سکتا تھا۔ پتا نہیں اس نے یہ چیزیں کہاں سے حاصل کی تھیں۔

بہرحال یہ لوگ خاموشی سے درخت کے ایک جھنڈ میں بیٹھے رہے پھر اس کے بعد بدرشاہ نے کہا۔

"پیاس لگ رہی ہے نا۔"

"ہاں......"

"آہ کاش ہمیں کہیں سے پانی مل جائے۔" کامران مسکرا دیا اور اس نے کہا۔

"خواہشات انسان کا کس طرح پیچھا کرتی ہیں۔ بدرشاہ پہلے ہم زندگی کے خواہش مند تھے اور اب جب زندگی کا تھوڑا بہت انتظام ہو گیا تو اب ہمیں زندگی کے دوسرے لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"اس سے کہاں چھٹکارا پایا جاسکتا ہے۔"

"کیا خیال ہے ہمت ہے کہ پانی تلاش کیا جائے؟"

"کیوں نہیں...... ہمیں تھوڑی ہمت کرنی چاہیے۔ لیکن تھوڑا سا وقت اور گزار لو تاکہ موقع مل جائے۔" سانسیں آہستہ آہستہ اعتدال پر آتی جارہی تھیں اور وہ لوگ بہتر کیفیت میں آ گئے تھے۔ بدرشاہ وہاں سے آگے بڑھا، درختوں کے جھنڈ دور دور تک بکھرے ہوئے تھے اور یہ لوگ کوشش کر رہے تھے کہ کہیں کسی بھی جگہ کسی سے مڈبھیڑ نہ ہونے پائے۔ اس علاقے کے بارے میں معلومات نہیں تھی۔ بدرشاہ نے یہاں کے بارے میں جو نقشے حاصل کیے تھے۔ ان سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ تاحد نظر دور دور تک کوئی بستی نہیں ہے اور انسانوں کا خطرہ نہیں ہے۔ بہرحال یہی ضروری تھا باقی جہاں تک جنگلوں کا معاملہ تھا۔ تو ہوسکتا ہے قدرت نے اپنے وعدے کو پورا کرنے کے لیے یہاں بھی ان کے لیے انتظام کیا ہو یعنی انہیں کوئی چیز مل جائے۔

دن تیزی سے ختم ہوتا جارہا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ساری رات سفر کریں گے اور اس کے بعد آرام کریں گے۔ وہ لوگ آگے بڑھتے رہے اور قدرت ہمیشہ انسان کی مدد کرتی ہے۔ ابھی زیادہ فاصلہ نہیں طے کیا گیا تھا کہ پانی کی شرر شرر کی آواز سنائی دی اور اس آواز کو محسوس کرتے ہی ان لوگوں نے ادھر کا رخ کیا۔ وہ ایک چھوٹا سا برساتی نالہ تھا۔ نہ جانے کہاں سے آ رہا تھا۔ نالے میں بے شک پانی زیادہ نہیں تھا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس کی آواز نشر ہو رہی تھی۔ اس کے بعد وہ اس پانی میں گھس گئے اور اوندھے منہ نہ جانے کتنی دیر تک اس میں پڑے رہے۔ پانی نے ان کی جسمانی تھکن اس طرح نچوڑ دی تھی۔ جیسے انہوں نے کوئی مشقت ہی نہ کی ہو۔

نہ جانے کب تک وہ اس پانی میں بیٹھے رہے اور قدرت کی اس نعمت سے سرفراز ہوتے رہے لیکن ان کے کان اب بھی آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ انہیں اس بات کا پورا پورا یقین تھا کہ جیل کے جو کارندے وہاں بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ اس قدر مشقت نہیں اٹھائیں گے اور جنگل کی ان صعوبتوں کو برداشت نہیں کریں گے۔ بہرحال اس کے بعد پانی پیا گیا اور رات آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔ درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے واپس آنے لگے۔ یہاں زیادہ دیر قیام ممکن نہیں تھا کیونکہ بہرحال وہ لوگ بھی اپنے کچھ نہ کچھ فرائض پورے کریں گے۔ یوں تو انہیں اس وقت ان کے بارے میں معلوم ہو گیا ہوگا۔ اگر تھوڑی بہت دیر لگ بھی گئی ہوگی۔ تو جیل کے حکام کی طرف سے بہرحال انہیں ہدایت ملی ہوگی کہ ہر حال میں انہیں تلاش کریں۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ دستے گاڑیوں کے ذریعے یہاں پہنچنے کی کوشش کریں۔

بہرحال سورج چھپ گیا۔ انہیں یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اطراف میں اور بھی بہت سے جاندار گردش کر رہے ہوں۔ کھانے پینے کے لیے ابھی تک کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی تھی جو ان کا ساتھ دے سکتی۔ لیکن پانی پینے کے بعد کم از کم اتنی زندگی ضرور بڑھ گئی تھی کہ وہ تھوڑی دیر بھوکے رہ سکیں۔

وہ چلتے رہے پتا بھی کھڑکتا تو دل دہل جاتے تھے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے رات کی تاریکی میں وہ آگے بڑھتے رہے اور جنوب کی طرف ایک بلند پہاڑی ٹیلے تک کسی مصیبت کا سامنا کیے بغیر پہنچ گئے۔ یہاں کچھ ایسے آثار نظر آئے جن سے شبہ ہوا کہ شاید انسانی قدم یہاں تک پہنچ چکے ہیں۔ لیکن بہرطور انہوں نے اپنی احتیاط کو برقرار رکھا اور ایک سمت کا تعین کر کے چل پڑے۔

نہ جانے کتنے نشیب و فراز انہوں نے طے کیے تھے۔ نہ جانے کتنے جھاڑ جھنکار کو عبور کیا تھا۔ پھر یہاں سے آگے بڑھ کر ہم ایسے مقام پر جا نکلے۔ جہاں یقیناً برسوں سے کسی انسان نے قدم نہ رکھا ہوگا۔ رات کا ایک حصہ ایک کھائی کے اندر گزارا۔ یہاں سانپوں اور زہریلے کیڑوں مکوڑوں کا خطرہ تھا۔ لیکن یہ خطرہ اس خطرے سے بہرطور بہتر تھا۔ جس میں انہیں نہ جانے کتنا عرصہ گزارنا پڑتا اور اس کے بعد نیند ایک مہربان ماں کی طرح ان پر مہربان ہو گئی۔

وہ ایک شفاف چٹان پر لیٹے اور اس طرح سوئے کہ سورج کی کرنوں نے گدگدی کر کے انہیں جگایا لیکن اب بھوک انہیں دیوانہ کیے دے رہی تھی اور یہ بات بالکل درست تھی کہ خدا نے انسان کو رزق دینے کا وعدہ کیا ہے، یہ رزق پیلے رنگ کے عجیب و غریب پھلوں پر مشتمل تھا۔ جنہیں توڑ کر کھانے سے ان میں مٹھاس کا احساس بھی ہوا ویسے وہ سیب نہیں تھے۔ لیکن سیب نما ضرور تھے۔ جن کا چھلکا موٹا اور سخت تھا اور ان کے اندر سے لیچی کی طرح گودا برآمد ہوتا تھا۔

لیکن ٹھوس، بھرپور اور نمی سے بھرا ہوا۔ یہ پھل اس وقت ان کے لیے وہ نعمت تھے کہ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ قدرت نے انہیں انسانوں سے اتنا دور کیوں رکھا ہے۔ غالباً اس لیے کہ انسان زندہ رہے کیونکہ اسے موت اس کے وقت پر ہی آنی ہوتی ہے۔

بہرحال ابھی تک انہیں کسی خطرے کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا تھا اور ان کی کوشش انہیں زندہ رکھے ہوئے تھیں۔ جیسا کہ انہوں نے طے کیا تھا کہ دن میں وہ آرام کریں گے۔ وہ اس پر عمل کرنا چاہتے تھے لیکن پہلی بات یہ کہ یہاں چھپنے کے لیے کوئی معقول جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ دوسری بات یہ کہ رات کو وہ اپنے پروگرام کے خلاف آرام کر چکے تھے اور اس وقت ساری تھکن دور ہو چکی تھی یہ خصوصاً ان پھلوں نے انہیں ایک طرح سے نئی زندگی بخش دی تھی۔

چنانچہ سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ ان پھلوں کو توڑ کر اپنے لباس میں جس قدر محفوظ کرسکتے تھے کر لیا۔ بلکہ بدرشاہ نے تو اپنی قمیص اتار کر ایک گٹھڑی سی بنائی تھی اور اس میں بے شمار پھل بھر لیے تھے۔ پھر اس نے اپنی آستین کو گلے میں باندھ لیا اور اس کے بعد کامران کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"میرا خیال ہے اتنے ہی کافی ہیں۔ جیسے قدرت نے ہمارے لیے یہاں بندوبست کیا ہے ایسے ہی ہمیں آگے بھی قدرت کی طرف سے آسودگی ملے گی۔" بہرطور اس کے بعد انہوں نے آگے کا سفر شروع

کردیا۔ لیکن ان کی آنکھیں چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ بس انسان کے اندر کا احساس ہوتا ہے۔ بار بار کچھ ایسی آوازیں آتی تھیں۔ جن سے شبہ ہوتا تھا کہ جیل کے سپاہی ان کے تعاقب میں آ رہے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اس پورے دن وہ سفر کرتے رہے اور اس کے بعد شام دھندلا گئی اور پھر شام تاریکیوں میں تبدیل ہوگئی۔ پھل انہیں سہارا دیتے رہے تھے اور راستے میں کئی بار انہیں ان پھلوں سے سیر ہونے کا موقع ملا تھا۔ رات ہوگئی تو اچانک ہی بدرشاہ نے سرگوشی میں آواز دیتے ہوئے کہا۔

''کامران رکو، سنو۔'' کامران رک گیا تو بدرشاہ نے ایک جانب اشارہ کیا۔ کامران نے ادھر دیکھا تو کامران کی بھی روح فنا ہوگئی۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے یہاں کچھ انسان موجود ہوں۔ لیکن چند ہی لمحوں کے بعد انہیں خود اپنے اس خیال کی تردید کرنی پڑی۔ اگر وہ انسان تھے تو کم از کم جنبش تو ضرور کرتے وہ خاص قسم کے سرونما پودے تھے۔ جن کا ایک جنگل سا بکھرا ہوا تھا۔ البتہ اس جنگل کو دیکھ کر انہیں ایک احساس ضرور ہوا تھا اور بدرشاہ نے اس احساس کو اپنی زبان میں ادا کردیا۔

''کامران لگتا ہے کہ قرب وجوار میں کوئی آبادی ضرور ہے۔''

''کس طرح کہہ سکتے ہو یہ بات؟''

''ان درختوں کی ترتیب دیکھو۔''

''ہاں......''

''کیا سمجھتے ہو؟''

''یہی کہ انسانی ہاتھوں کے لگائے ہوئے ہیں۔''

''بالکل میرا بھی یہی خیال ہے۔''

''اگر بستی ہے تو کیا ہمیں اس بستی میں داخل ہونا چاہیے۔''

''کیا مطلب؟''

''ہمارے جسموں پر قیدیوں کے لباس ہیں۔''

''ہاں اگر ہم رات کی تاریکی میں اس بستی میں داخل ہوں تو؟''

''مگر رات کی تاریکی میں بستی کو تلاش کرنا بھی ایک مشکل کام ہے۔''

''تلاش کی جاسکتی ہے۔''

''کیسے؟''

''وہ درخت دیکھو۔''

''کون سا؟''

''وہ جو سامنے ہے۔''

''ہاں......''

''اگر اس کی بلندی پر چڑھ کر ہم بستی کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں تو میرا خیال ہے وہ ہمیں نظر آ سکتی ہے کیونکہ بہرحال دنیا کی کوئی بستی بے چراغ نہیں ہوتی۔''

''واقعی تمہارا خیال درست ہے۔'' اور اس کے بعد وہ اس درخت تک پہنچ گئے بدرشاہ کو درخت پر چڑھنا بآسانی آتا تھا۔ چنانچہ وہ درخت کی بلندی پر پہنچ گیا اور پھر اس نے وہیں سے آواز لگائی۔

''کامران۔'' اس کی آواز میں خوشی کا عنصر دیکھ کر کامران کو یہ احساس ہوگیا کہ غالباً اس نے بستی تلاش کرلی ہے۔

''کیوں کیا بات ہے؟''

''بستی......''

''کتنے فاصلے پر ہے۔''

''میرا خیال ہے تقریباً ایک کلومیٹر سے زیادہ۔''

''چل سکو گے وہاں تک؟''

''کیوں نہیں۔''

''راستوں کا اندازہ لگایا؟''

''اب راستوں کا اندازہ کون لگائے البتہ میں نے راستوں کی سمت کا اندازہ لگالیا ہے۔''

''تو پھر نیچے آؤ۔'' کامران نے کہا اور بدرشاہ درخت سے نیچے اتر آیا۔ اس کے بعد کامران کو اس کی رہنمائی میں بستی تک پہنچنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے سفر کا آغاز کردیا۔ یہ فاصلہ بڑی خوش اسلوبی سے طے ہوگیا۔ بستی کے آثار تھوڑی دور چلنے کے بعد ہی نظر آنے لگے تھے۔ تقدیر کی رہنمائی پر انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بہرحال اب تک کی تو تمام کوششیں کارگر ثابت ہوئی تھیں۔ ایک جگہ پہنچنے پر ذرا سی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ راستہ دشوار گزار تھا۔ لیکن بہرحال وہ یہاں سے بھی گزر گئے اور اس کے بعد انہیں خود حیرت ہوئی کہ بستی ان سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی وہ پہلے اس تک نہیں پہنچے نہ جانے کیوں بستی اس وقت تاریکی میں ڈوب چکی تھی۔ چھوٹے چھوٹے مکانات چاروں طرف بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچنے کے بعد بدرشاہ رکا اور کہنے لگا۔

''ہاں...... بھئی اب یہ بتاؤ کہ کیا ارادہ ہے؟''

''ابھی تک تو ہم تقدیر کے ارادوں پر انحصار کرتے رہے ہیں اب کیا ارادہ ہوسکتا ہے ہمارا؟''

''مطلب یہ ہے کہ کوئی چکر چلانا ہے یا؟''

''چکر سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' کامران نے کہا اور بدرشاہ ہنسنے لگا پھر بولا۔

''اچھا تم ایسا کرو وہ جو سامنے درخت نظر آ رہا ہے وہاں جا کر بیٹھ جاؤ میں تھوڑی دیر کے بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔'' کامران نے بدرشاہ کی باتیں سمجھنے کی کوشش کی۔ لیکن نہیں سمجھ سکا اور اس نے دونوں شانے ہلا دیئے۔ جس درخت کی طرف بدرشاہ نے اشارہ کیا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر وہ بیٹھ گیا۔ تھکن سے ذہن پر اونگھ سی سوار ہو رہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر کے بعد بدرشاہ واپس آیا تو اس کے پاس ایک گٹھڑی سی تھی۔ وہ گٹھڑی کامران کے سامنے کھولتے ہوئے بولا۔

"کپڑے ہیں۔ چوری کر کے لایا ہوں۔ انہیں پہنو۔ تھوڑی سی کرنسی بھی ہاتھ لگ گئی ہے ایک اچھے خاصے گھر میں داخل ہوا تھا۔ بہر حال مجبوری تھی۔ یہ کام کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن مجبوری انسان سے سب کچھ کرا دیتی ہے۔ دیکھو اندازہ تو یہ ہے کہ یہ لباس تمہارے بدن پر بھی آ جائے گا۔ اور میرے بدن پر بھی، کم از کم قیدیوں کی اس حیثیت سے تو چھٹکارا پا لیں گے۔ جوتوں کا انتظام نہیں ہو سکا اور یہ چیز بڑی مشکل ثابت ہو گی۔" لیکن خیر چلو ایسا بنا لیں گے کہ صورت شکل سے دیہاتی نظر آئیں۔ ایسا ہی لب و لہجہ بھی اختیار کرنا ہو گا۔ یہ کرنسی بھی آگے ہی رکھو اچھی خاصی رقم ہے البتہ صبح کو اس چوری کا یقینی پتا چل جائے گا۔ اگر ہم یہاں سے دور نہیں جاتے تو مشکل پیش آئے گی۔ اس لیے کہ ایک بار پھر تقدیر کا فیصلہ منظور کرو۔ اس رات کو ہمیں آرام نہیں کرنا ہے۔"

کامران نے بدرشاہ کی بات سے اتفاق کیا۔ انہوں نے لباس تبدیل کیے اور آخر کار وہاں سے بھی روانہ ہو گئے۔ بدرشاہ نے آدھی کرنسی کامران کے حوالے کر دی تھی۔ پھر تقریباً کوئی تین میل کا فاصلہ انہوں نے طے کیا تھا کہ اس بار انہیں ایک اور بڑی بستی نظر آئی...... اور اس بستی میں پہنچنے کے بعد انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ رات تقریباً آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اب آدھی رات کو کسی کے گھر کا دروازہ تو نہیں کھٹکایا جا سکتا تھا۔ وہ ایک جگہ آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ لیکن نیند نہیں آئی تھی۔ کامران اور بدرشاہ اس بات سے بہت خوش تھے کہ تقدیر نے ان کی مدد کی ہے اور انہیں راہنمائی حاصل ہوئی ہے۔

صبح کو نہ جانے کہاں سے کھانے کی عجیب خوشبو پائی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھے اور پھر یہ دیکھ کر ان کا دل خوش ہو گیا کہ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک جھونپڑا نما ہوٹل موجود ہے۔ وہاں غالباً پراٹھے پک رہے تھے۔ جیب میں کرنسی ہو، انسان دو دن کا بھوکا ہو اور پراٹھوں کی خوشبو آئے تو اس کی رفتار کتنی تیز ہو سکتی ہے یہ کوئی بھوکا ہی صحیح طور پر اندازہ لگا سکتا ہے۔ قیمہ اور پراٹھے اتنے کھائے کہ حلق تک بھر گیا اور اس کے بعد چائے کی تین تین پیالیاں۔

دکان دار ایک سیدھا سادہ آدمی تھا اس نے اس بات پر غور نہیں کیا اپنے کپڑوں سے، ننگے پیروں سے وہ دیہاتی معلوم ہو رہے تھے۔ چنانچہ اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی زندگی کی ابتدائی آسودگی حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے بعد دن کی روشنی میں وہ اس آبادی کو دیکھنے کے لیے نکلے تو اندازہ ہوا کہ ایک باقاعدہ قصبہ ہے نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔ بدرشاہ نے کامران کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کامران یہاں سے ہمارا سفر علیحدہ ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"دیکھو ہم دونوں مفرور قیدی ہیں یقینی طور پر جس جگہ بھی ان لوگوں کی پہنچ ہو گی وہ ہمارا حلیہ نشر کرا دیں گے۔ اب اگر ہم دونوں ساتھ رہے تو شک کی بہت سی نگاہیں ہم تک پہنچ سکتی ہیں اور پھر ویسے بھی دوست زندگی میں ساتھی جدا ہوتے ہیں۔ ہماری بقا کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لیں۔ میرے ذہن میں پہلے ہی سے یہ بات تھی۔ اسی لیے میں نے کرنسی کا آدھا حصہ تمہیں دے دیا تھا۔ اب اپنی زندگی تلاش کرو۔"

"بدرشاہ کیا تم اسی بستی میں رہو گے؟"

"نہیں میں ایک بس اڈہ دیکھ رہا ہوں۔ جہاں سے بسیں مختلف سمتوں کو جاتی ہیں۔ ہم دونوں کو وہاں سے ایک ایک بس میں بیٹھ کر روانہ ہونا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی مجھے جو کچھ اپنے بارے میں بتا چکے ہو۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارا خود کسی سمت کا کوئی تعین نہیں ہے چنانچہ تقدیر جہاں بھی لے جائے۔"

کامران نے بدرشاہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے بدرشاہ۔ پھر ایسا کرو تم جاؤ۔ میں بھی چلا جاؤں گا۔"

بدرشاہ کی بات خاصی حد تک صحیح تھی وہ جانا چاہتا تھا اور اسے روکنا بے معنی تھا۔ چنانچہ کچھ دیر بعد کامران نے اسے ایک بس میں سوار ہوتے ہوئے دیکھا۔ کامران البتہ ذرا سوچ سمجھ کر کام کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے وہ بستی کے بازاروں میں گھوما۔ بازار آہستہ آہستہ کھلتے جا رہے تھے۔ ایک دکان سے کامران نے سستا سا جوتا خریدا اور جوتا پہننے سے پہلے پیر اچھی طرح دھو لیے۔ وہاں سے آگے بڑھا تو وہ ایک حجام کے پاس پہنچا۔ سڑک چھاپ حجام سے اس نے شیو بنوا لیا۔ بال ترشوائے، آئینے میں دیکھا تو نہ جانے کیا نظر آیا۔ ماضی کی بہت سی کہانیاں تازہ ہو گئی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود یہاں سے جانا تھا۔ کسی بھی سمت کسی بھی جگہ اور ان تمام تیاریوں کے بعد کامران نے بدرشاہ کا فارمولا اپنانا مناسب سمجھا۔ کامران بس کے قریب سب سے پہلے پہنچا اور اس میں بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد بس اسے اس کی منزل کی جانب لے چلی۔

انسان اپنے لیے زندگی کے کیا کیا معیار بناتا ہے۔ کس کس طرح کی زندگی کے بارے میں سوچتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ کامران نے آنکھ کھولی تھی وہ کوئی معیاری ماحول نہیں تھا۔ بس ایک عجیب سی زندگی تھی۔ پھر اس کے بعد زندگی کے رخ بدلتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ اس حال کو پہنچ گیا۔ سچی بات یہ ہے کہ اسے کبھی اپنے بارے میں سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن بس انسان کی سوچیں تو یکساں ہی ہوتی ہیں۔ چاہے وہ کتنا ہی وحشی فطرت کا مالک کیوں نہ ہو۔ کامران ایک سفاک قاتل بھی تھا۔ ایک وحشی انسان بھی تھا۔ وہ سب کچھ تھا۔ کامران جسے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اگر وہ خود بھی اپنے بارے میں سوچ لیتا تو یہ احساس ہوتا کہ واقعی میں ایک عام انسان سے مختلف ہوں۔ آج بھی اس کے ہاتھ کسی کی گردن کاٹتے وقت لرزش نہیں کرتے تھے۔ وہ نہایت سفاکی سے کسی کی بھی گردن کاٹ سکتا تھا۔ کسی کو بھی زندگی سے محروم کر سکتا تھا۔

کامران اور بدرشاہ جس طرح جیل سے فرار ہوئے تھے۔ یہ ان لوگوں کی خوش قسمتی تھی جو وہ ان تک نہیں پہنچ پائے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ جانے کتنے لوگوں کو زندگی سے محروم کر کے وہ دوبارہ ان لوگوں کے قبضے میں جاتا۔ لیکن بہر حال طبیعت ہر وقت خونریزی کی طرف مائل بھی نہیں ہوتی کبھی کبھی انسانیت کا لباس پہننے کو بھی دل چاہتا تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان فطری طور پر بہت اچھا ہوتا ہے وقت اور حالات اسے بد سے بدتر بنا دیتے ہیں۔

بس کے سفر میں کامران کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں اور وہ ایسے چہرے تلاش کر رہا تھا۔ جو اس کی جانب نگراں ہوں، کامران دیکھ رہا تھا کہ کون اس کے بارے میں شبہے کا اظہار کرتا ہے۔ اس

وقت اس کا جو حلیہ تھا وہ ایسا تھا کہ کوئی خاص طور سے اس کی جانب متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کوئی دل کشی نہیں تھی اس کے روپ میں اور یہ اچھا تھا۔ وہ عمدہ لباس پہننا بھی جانتا تھا۔ اچھی زندگی گزارنا بھی آتی تھی اسے، لیکن بس ایسے ہی ٹھیک تھا۔

وقت نے اگر کبھی موقع دیا تو اپنے آپ کو سجانے کی کوشش کروں گا کبھی کبھی اس کے دل میں خیال آتا تھا۔

کیونکہ خواہشیں اس کے دل میں بھی جنم لیتی تھیں۔ وہ ان دولت مندوں کے بارے میں بھی جانتا تھا۔ جو عالی شان کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ عالی شان کاروں میں گھومتے ہیں۔ ان کا معیار زندگی ہی دوسرا ہوتا ہے اور وہ بڑے آدمی کہلاتے ہیں۔ خیر کامران اپنے جیسے دوسرے کسی آدمی کی بات نہیں کرتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو دیکھ کر اس کے دل میں جلن کا احساس ضرور پیدا ہوتا تھا۔

لیکن بہرحال ساری سوچیں تو پوری نہیں ہو جاتیں کہیں نہ کہیں تشنگی رہ جاتی ہے اور یہ تشنگی ہی شاید جرم کی زندگی کی طرف مائل کرتی ہے۔ حالانکہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ضمیر مجرم ہو تو انسان کا خوشیوں سے واسطہ کم ہی رہ جاتا ہے۔ کامران نے بس کنڈیکٹر کو ایک نوٹ دیا اور اس نے باقی رقم ایک ٹکٹ کے ساتھ واپس کر دی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ بس کہاں جائے گی۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کا سفر کتنا طویل ہے۔ لیکن یہ سفر تھا دلچسپ، کئی گھنٹے گزرنے کے بعد بس ایک جگہ رکی، تو وہاں ایک ہوٹل بنا ہوا تھا۔ مسافر اترنے لگے۔ کامران بھی اتر گیا۔ ویرانہ تھا لیکن دور دور کے مناظر بے حد خوشنما تھے۔

مسافر یہاں کھانے پینے کے لیے اترے۔ کامران بھی اتر گیا اور اس کے بعد ہوٹل میں داخل ہو کر اس نے بھی کچھ چیزیں طلب کیں، انہیں کھایا، ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہوا تھا۔ اپنی پسند کی زندگی گزارنا کتنا حسین مشغلہ ہے۔ یہ کیا کہ جیل کی دیواروں کے پیچھے زندگی گزاری جائے۔ وہ نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ بس کی طرف سے اعلان ہوا کہ مسافر واپس آ جائیں۔ بس آگے روانہ ہونے والی ہے۔ پھر دوسری منزل کئی گھنٹے کے بعد کے سفر کے بعد آتی تھی اور کامران یہاں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ نیچے اترا، غالباً درمیان کی کوئی آبادی تھی۔

بس کا سفر ابھی اور طویل تھا۔ کامران اس چھوٹے سے خوشنما ہوٹل میں جا بیٹھا۔ جس کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا کہ بس یہاں تقریباً آدھے گھنٹے رکے گی اور مسافر آرام سے کھا پی لیں، کیونکہ اس کے بعد جو اسٹاپ ہوگا۔ وہ بس کا آخری اسٹاپ ہوگا۔ بہرحال اس زندگی میں کچھ لطف آ رہا تھا۔

چنانچہ کامران پھر ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا اور اس نے وہاں اور بھی کئی گاڑیوں وغیرہ کو کھڑے دیکھا۔ ہوٹل کی ایک میز پر بیٹھنے کے بعد اس نے ویٹر کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ کھانا کھانا چاہتا ہے۔ ویٹر نے اسے کھانوں کے نام بتائے۔ تو اس نے کہا کہ کوئی بھی کھانا لے آؤ۔

کامران کھانا کھانے میں مشغول تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے اس کی نگاہ سامنے کی طرف اٹھی۔ تو اس نے دو افراد کو دیکھا۔ دونوں اسمارٹ نظر آ رہے تھے، عمدہ لباسوں میں ملبوس تھے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ وہ بھی اس کی جانب ہی دیکھ رہے تھے۔ انسان کی چھٹی حس یقینی پوری ہوتی ہے۔ کامران کو اس وقت اس

بات کا احساس ہوا۔ نہ جانے کیوں اسے لگا کہ جیسے ان کی آنکھوں میں کوئی خاص بات ہے۔ دونوں اچھی جسامتوں کے مالک تھے اور خاصے توانا نظر آ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں کامران کے ذہن میں ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ وہ کھانے میں مصروف رہا اور کوئی دس منٹ کے بعد اس سے فراغت حاصل ہو گئی۔ اس نے ویٹر سے چائے طلب کی اب جب زندگی کو سکون دینا ہی ہے تو کیوں نہ پورے اطمینان کے ساتھ یہ کام لیا جائے۔ اس نے چائے کا آرڈر دینے کے بعد کرسی کی پشت سے گردن ٹکائی اور آنکھیں بند کر لیں۔

نہ جانے کیوں وہ دونوں اس کے ذہن میں کھٹک رہے تھے۔ لیکن اس وقت کامران چونک پڑا جب اسے اپنی میز کی کرسیاں کھسکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں اس کے پاس آ گئے تھے اور بے تکلفی سے کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ کامران نے انہیں دیکھا اور اس کی آنکھوں میں ناگواری کے تاثرات پیدا ہو گئے تو ان میں سے ایک جلدی سے بولا۔

''معافی چاہتے ہیں۔ جناب لیکن انسانوں کے درمیان تھوڑی سی دوستی بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔'' کامران خاموش نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ان سے کہا۔

''فرض کیجیے میں پسند نہیں کروں تو؟''

''تب بھی ہم آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہیں گے۔''

''یعنی زبردستی۔''

''آپ اسے زبردستی کہہ لیں۔ لیکن یہ زبردستی نہیں ہے۔''

''آپ کے کہنے سے۔''

''یہی سمجھ لیجیے کہ میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔''

''دیکھیے ہم آپ سے قانون کے نام پر ایک درخواست کرنا چاہتے ہیں۔''

''مطلب؟'' کامران غرا کر بولا۔ جواب میں ان دونوں نے اپنی اپنی جیب سے اپنے شناختی کارڈ نکال لیے اور انہیں اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولے۔

''ہمارا تعلق ڈپریشن پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔ آپ ان پر ہمارے نام اور نشان دیکھ سکتے ہیں اور ہر شریف شہری کا فرض ہے کہ وہ انتظامیہ سے تعاون کرے۔''

کامران کے بدن میں ایک لمحے کے لیے سنسناہٹ دوڑ گئی تھی۔ بزدل نہیں تھا وہ۔ ان دونوں کو با آسانی اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں لے کر زندگی سے محروم کر سکتا تھا۔ لیکن ابھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا۔

''ٹھیک ہے جناب میں پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں اس لیے آپ کے یہ کارڈ دیکھنا میرے لیے بے کار ہے آپ حکم کریں مجھے کیا کرنا ہے؟''

ان میں سے ایک نے پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک تصویر نکالی۔ یہ تصویر اس وقت کی تھی جب اسے جیل بھیجا گیا تھا اور وہاں اس کی یہ تصویر اتاری گئی تھی اور اسے جیل کے ریکارڈ میں رکھا گیا تھا اور ظاہر بات ہے تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ یہ تصویر اس وقت کے چہرے سے بالکل مل رہی تھی۔ تصویر سے

نکالنے والے نے تصویر نکالی اور کامران کے چہرے کے قریب کرتا ہوا بولا۔

''آپ خود یہ تصویر دیکھ سکتے ہیں۔''

''میری تصویر۔'' کامران حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

''آپ تسلیم کرتے ہیں نا کہ یہ آپ ہی کی تصویر ہے۔''

''ہاں یقیناً میری تصویر ہے، مگر یہ آپ کے پاس کہاں سے آئی؟'' کامران نے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ان دونوں کی تیز نگاہیں اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس کی کھوپڑی میں اتر کر اسکی اصلیت جاننا چاہتے ہیں۔

''یہ جیل سے بھاگے ہوئے دو قیدیوں میں سے ایک کی تصویر ہے اور اس شخص کا نام کامران ہے، معاف کرنا ہم نے تمہارا نام نہیں پوچھا۔''

''لوگ مجھے حفیظ کہتے ہیں۔'' اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کہا۔

مسٹر حفیظ! ہماری اپنی زندگی میں ایسے بہت سے واقعات پیش آئے ہیں جب اتفاق سے دو شکلیں ایک جیسی مل گئی ہیں۔ حالانکہ جیل سے بھاگا ہوا قیدی جس کا نام کامران ہے، جیل سے بھاگتے وقت دوسرے حلیے میں تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور اس کا لباس جیل کا تھا اور اس کا حلیہ اس تصویر سے بالکل مختلف تھا۔ لیکن حلیہ درست بھی کیا جا سکتا ہے آپ صرف ہمارا شک دور کریں گے۔ کیا سمجھے۔''

''گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس تصویر کی وجہ سے آپ مجھے جیل سے بھاگا ہوا قیدی قرار دیں گے۔''

''بالکل نہیں قرار دیں گے۔ اگر آپ وہ قیدی نہ نکلے تو آپ کہاں جا رہے تھے؟''

''جی وہ سامنے والی بس کھڑی ہے نا میں اس کا مسافر ہوں ایک جگہ ملازمت کرتا ہوں جہاں سے یہ بس چلی ہے اور جہاں یہ ختم ہوگی وہاں میرا گھر ہے۔ آپ چاہیں تو دیکھ سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے ہم بالکل یہ چاہیں گے۔ لیکن جہاں اس بس کا سفر ختم ہوتا ہے وہیں پولیس ہیڈکوارٹر بھی ہے۔ آپ! اگر آپ کا کوئی سامان اس بس میں رکھا ہو تو اٹھا کر ہماری جیپ میں لے آئیں۔ اصل میں ہمیں یہ تصویر بھی فراہم کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ جیل سے بھاگنے والے دو قیدیوں کو تلاش کیا جائے۔ ان میں سے ایک کی تصویر یہ ہے۔ جو ہم نے آپ کے سامنے رکھی ہے۔ دوسری تصویر بھی اگر آپ دیکھنا چاہیں تو......'' اس نے دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ دوسری تصویر بھی نکال لی......اور ظاہر ہے یہ تصویر بدر شاہ کی تھی۔ کامران نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''حالانکہ میں تنہا ہوں......اور میرے ساتھ کوئی سامان وغیرہ بھی نہیں ہے لیکن پھر بھی مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے میں کسی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔''

''بالکل نہیں...... ہر شریف آدمی ہمارے لیے اتنا ہی قابل احترام ہے جتنے آپ ہیں۔ آپ براہ کرم اٹھیے اور ہمارے ساتھ چلیے لیکن اس فراغت کے بعد بلکہ اس تکلیف دہی کی وجہ سے آپ کا بل بھی ہم خود ادا کریں گے۔'' اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن کامران کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ ظاہر ہے بھاڑ میں سے نکل کر چولہے میں تو جانے سے رہا۔ اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا اور اس نے اپنے آپ کو اس کے لیے

مستعد کر لیا۔ ان کی جیپ اس ہوٹل سے کافی فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی اور اس پر پولیس کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ کامران نے بڑے پر سکون انداز میں ان سے تعاون کیا اور بل بھی انہیں ادا کرنے دیا۔ پھر اس نے کہا۔

''دیکھیے جناب اگر قانون کے محافظ ہیں تو میں بھی قانون کی عزت کرنے والا ایک شہری ہوں۔ آپ کے ساتھ مکمل تعاون کروں گا۔ یہ سب کچھ کر کے آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' انہوں نے کامران کی اس شرافت کا شرافت ہی سے جواب دیا تھا اور اس کے بعد نہایت دوستانہ انداز میں اسے جیپ کی جانب لے چلے تھے۔

ایک انتہائی نازک موڑ آ گیا تھا۔ اگر کامران ذرا بھی غفلت برتتا اور یہ لوگ اسے لے کر پولیس ہیڈکوارٹر پہنچ جاتے تو اتنا کامران بھی جانتا تھا کہ پولیس اس قدر بے وقوف نہیں ہوتی کہ اس کی شناخت نہ کر پاتی۔ اس کی انگلیوں کے نشانات پولیس کے ریکارڈ میں موجود ہوں گے۔ اس کی آواز...... چال ڈھال......اس کا انداز سب کچھ ان کے پاس موجود ہوگا۔ اس وقت ان سے تھوڑا سا تعاون اور اس کے بعد موقع کی تلاش ایک لمحے کے اندر کامران نے اپنے ذہن میں فیصلہ کر لیا تھا اور چونکہ اس نے اب تک ان کے ساتھ بہترین تعاون کیا تھا۔ اس لیے وہ اس کی جانب سے کچھ مطمئن سے ہو گئے تھے۔ ممکن ہے انہیں یہ خیال ہو کہ واقعی کامران وہ شخص نہیں جسکی انہیں تلاش ہے۔

غلط فہمی تو ہر انسان کو ہو سکتی ہے اور چہرے ہر جگہ مشابہت رکھ سکتے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ اس جیپ میں جا بیٹھا۔ جو کچھ فاصلے پر کھڑی تھی اور یہ بھی بہت اچھی بات ہے کہ ان دو کے علاوہ ان کے ساتھ کوئی تیسرا شخص نہیں تھا۔ البتہ کامران یہ سوچ کر حیران تھا۔ پولیس نے جو کچھ بھی کیا تھا۔ نہایت برق رفتاری سے کیا تھا۔ دو مفرور قیدیوں کے فرار کی کہانی ہر جگہ پھیل گئی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اسپیشل پولیس والوں کو ان کی تصویریں تک فراہم کر دی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک شخص نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ دوسرا کامران کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے بعد جیپ چل پڑی۔

بہرحال اپنے آپ کو کامران نے ان لوگوں میں کتنا ہی معصوم اور شریف زادہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن نہ وہ معصوم تھا اور نہ شرافت سے اس کا کوئی تعلق تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ تراش لیا تھا اور اگر واقعی کامران ان کے ساتھ اس شرافت کا برتاؤ نہ کرتا اور اتنے خلوص سے پیش نہیں آتا تو لازمی امر تھا کہ یہ اپنے اختیارات کی بنا پر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال سکتے تھے۔ لیکن اس کے رویے نے انہیں ٹرانس میں لے لیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہوٹل پیچھے رہ گیا۔ بس کے بقیہ مسافر وہیں موجود تھے اور اب نظر نہیں آ رہے تھے۔ سڑک بہت سی جگہوں سے نشیب و فراز میں اترتی تھی اور چڑھتی تھی۔ خوب صورت راستہ نگاہوں کے سامنے تھا۔ خاموشی طویل ہوگئی تو کامران کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔

''آپ کس سوچ میں پڑ گئے جناب؟''

''دیکھیے اگر ایسی کوئی مصیبت انسان کے گلے میں پڑ جائے تو خوف زدہ تو ہوتا ہی ہے۔''

''ہاں آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن آپ کو ہم پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ آپ واقعی ایک شریف

آدمی ہیں اور دنیا کا کوئی بھی شخص کسی بھی شریف آدمی کو پریشان کرنا پسند نہیں کرتا...... آپ نے خود دیکھ لیا کہ آپ کی تصویر ہمارے مفرور قیدی کی...... میرا مطلب ہے آپ کا چہرہ ہمارے مفرور قیدی کی تصویر سے کتنا ملتا ہے۔ ہماری غلط فہمی بھی بے جا نہیں ہے۔''

''بالکل...... بالکل...... میں نے اس بات سے انکار نہیں کیا۔''

''یہ تھوڑا سا تعاون آپ کو ہمارا مستقل دوست بنا دے گا۔ ویسے کیا کرتے ہیں؟''

''بھائی جی! بہت چھوٹا موٹا کاروبار کرتا ہوں یہ جو ہوتے ہیں نا (بٹن اور سلائی کا دوسرا سامان وغیرہ۔) اس کی چھوٹی سی دکان ہے۔ شہر جاتا ہوں سامان لے آتا ہوں بس گزارا ہو جاتا ہے۔''

''ٹھیک...... ٹھیک چلیں آپ کو شہر چھوڑ دیا جائے گا۔ آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ بس ایک دو گھنٹے آپ ہمیں دے دیں گے۔''

''خوشی کے ساتھ۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا اور دور دور تک نگاہیں دوڑائیں۔ دائیں بائیں سامنے پیچھے بسیں کئی بار یہاں سے گزری تھیں۔ کئی بار سامنے آئی تھیں۔ لیکن اس وقت اتفاق سے کم از کم دور دور تک کوئی بس نہ پیچھے تھی نہ آگے۔ کامران بدستور سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا اور اس کے بعد جو اس نے کیا وہ ان لوگوں کی توقع کے برعکس تھا۔ یعنی گردن ہی جھکا دی تھی اور اچانک ہی اس نے ایک زوردار ٹکر برابر بیٹھے ہوئے شخص کی ناک پر ماری اور اس کے حلق سے ایک آواز سی نکل گئی۔ ان لوگوں کو شاید اس کی جسمانی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔ جیل کی زندگی میں انتہائی مشقت کرنے کے بعد اور پہاڑی پتھروں کو ریزہ ریزہ کرنے کے بعد اس کے جسم و جاں میں جو قوت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ان لوگوں کے تصور میں نہیں ہوگی۔

اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی یا اگر نہیں بھی ٹوٹی تو شدید زخمی ہو گئی اور کامران نے اس کو اس کی جگہ سے اٹھایا گردن پکڑی پتلون کی بیلٹ پکڑی اور ڈرائیونگ کرنے والے پر دے مارا اس بات سے بے نیاز ہو کر کہ اس کا کیا بنے گا۔ یا جیپ کا کیا ہوگا۔ البتہ بالکل بے وقوفی سے کام نہیں لیا تھا اس نے۔ اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ جیپ کے دونوں طرف اس وقت کوئی گڑھا اور کھائی نہیں ہے۔ بلکہ درخت لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اندازے کے مطابق ڈرائیونگ کرنے والا اس اچانک افتاد سے بہک گیا اور جیپ سڑک چھوڑ کر درختوں کی طرف لپکی۔ کامران نے اپنے آپ کو بیلنس کر رکھا تھا۔

چنانچہ جیسے ہی جیپ ایک درخت سے ٹکرائی اس نے اپنے جسم کو جھٹکے سے سنبھال کر پھرتی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد اتنی تیزی سے دوڑا کہ اگر کسی ٹورنامنٹ میں حصہ لے رہا ہوتا تو پہلا پرائز اس کا ہی ہوتا۔ لیکن اس کے مدِمقابل بھی سیکورٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنی شرافت سے دھوکا کھا کر انہوں نے جو نقصان اٹھایا تھا۔ ظاہر ہے اس سے ان کے جسم میں ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہوگی۔ لیکن اپنے کو بچانا انہوں نے بھی سیکھا تھا۔ جیپ کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ لیکن تھوڑی دور نکلنے کے بعد کامران نے پلٹ کر دیکھا تو وہ دونوں اسے اپنے پیروں پر کھڑے نظر آئے۔ وہ ایک دوسرے کو سہارا دیے ہوئے تھے اور پھر انہوں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ رخ کامران ہی کی جانب تھا۔

''واہ......'' کامران نے دل میں سوچا اچھے مدمقابل ہیں۔ ذرا بھاگ دوڑ کر مزہ آئے گا۔ لیکن

اس وقت اور مزہ آیا۔ جب کامران نے فائروں کی آواز سنی اور اگر ذرا سا ڈھلان نہ آجاتا تو یقینی طور پر ان کے ریوالور سے چلائی ہوئی گولیاں کامران کے جسم میں سوراخ کر دیتیں۔

''ارے باپ رے...... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔'' کامران کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کے بعد اس نے ڈھلان میں اترتے ہی راستہ بدل لیا اور پھرتی سے بائیں سمت بھاگنے لگا۔ کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ راستے بے شک ناہموار تھے۔ لیکن کامران صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ سیدھے دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اصل میں ان کے ریوالوروں سے خطرہ تھا۔ کامران ایک لمحے کے لیے چھپنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی کامران کے اور ان کے درمیان میں فاصلہ بے حد ہو گیا تھا کہ اگر وہ کنارے تک پہنچیں تو کامران کو خاصی دور نکلنے کا موقع مل جائے گا۔ یہی موقع اس کے لیے فائدہ مند ہو سکتا تھا اور آگے چل کر اسے یہ موقع مل گیا۔ وہ پتھریلی چٹانیں اس کی معاون بن سکتی تھیں۔ جو اس راستے میں بکھری ہوئی تھیں۔

چنانچہ اس نے سب سے پہلے ان پتھریلی چٹانوں کی آڑ لی اور یہاں رک کر اپنا سانس درست کرتا رہا اور پھر اس نے ہلکا سا جھانک کر دیکھا۔ وہ دونوں ابھی ڈھلان کے کنارے تک نہیں پہنچے تھے۔ دونوں ہی زخمی ہوں گے اور برق رفتاری کا وہ مظاہرہ نہیں کر سکیں گے۔ جو اس وقت کامران کر رہا تھا۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد وہ اسے ڈھلان کے سرے پر نظر آئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور دبے ہوئے تھے اور دونوں شانے سے شانہ ملائے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ وہ جس کی ناک زخمی تھی۔ اس نے شاید ناک پر رومال رکھا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے ریوالور تھامے ہوئے تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرف گم ہو گیا ہے۔ پھر جب کامران نے انہیں اتر کر سامنے جاتے ہوئے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اور اس نے سوچا اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔ چنانچہ چٹانوں کے درمیان زگ زیگ راستہ بناتا ہوا کامران آگے کی سمت دوڑنے لگا۔ ہر قیمت پر اسے ان کے چنگل سے نکل جانا تھا اور اس کی رفتار انتہائی تسلی بخش تھی۔ اس کے بعد بہت دیر تک وہ دوڑتا رہا۔ ''اس دوران رک رک کر صورت حال کا جائزہ بھی لیتا رہا تھا۔''

لیکن وہ دونوں بھٹک گئے تھے۔ ہو سکتا ہے واپس بھی چلے گئے ہوں لیکن دشمن کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ اسی قول کے مصداق جس حد تک ہو سکتا تھا آگے بڑھتا رہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد چٹانوں کی گھاس کے عقب میں یا کسی جھنڈ کے پیچھے چھپ کر وہ ماحول کا جائزہ بھی لیتا تھا کہ کہیں وہ اس کا تعاقب تو نہیں کر رہے ہیں لیکن ایسا نہیں تھا۔ پھر اس نے ایک جگہ رک کر سانس لینے کا فیصلہ کر لیا۔

حالات اس کے حق میں تھے۔ اس نے ایک سایہ دار جگہ پر بیٹھ کر زور سے آنکھیں بھینچیں اور گزرتے ہوئے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ یہ اندازہ تو اسے ہو گیا تھا کہ وہ انہیں ڈاج دینے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اب ان کا اس تک پہنچنا مشکل ہے۔ لیکن بہرحال جس طرح انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا تھا۔ اس سے یہ خطرہ بہ دستور باقی تھا اور کامران کوئی احمقانہ غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس کی نگاہ دور ایک ایسی جگہ پر پڑی۔ جسے دیکھ کر نہ جانے کیوں ذہن کے پردوں پر کچھ مٹے مٹے نقوش ابھر آئے تھے۔ یہ ایک کھنڈر تھا۔ ایک ٹوٹا ہوا گھر اور نہ جانے کیوں فاصلہ اچھا خاصا ہونے کے باوجود کامران کو یہ احساس ہوا

اس ٹوٹے ہوئے گھر کو پہلے بھی کبھی دیکھا ہے۔

اس ویرانے میں یہ ایک ہی مکان تھا۔ لیکن اب اسے مکان کہنا بے وقوفی کی بات تھی۔ نہ جانے اس کا ماضی کیا ہوگا۔ کیونکہ خاصے وسیع و عریض حصے میں پھیلا ہوا تھا اور ذہن کے وہ مٹے مٹے سے نقوش مربوط ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اس مکان میں پہلے بھی آچکا تھا۔ بہت پہلے اس وقت وہ استاد سلامت کے ساتھ رہتا تھا اور آخری بار ایک مکان میں گٹر لائن کے ذریعے گھس کر، اس نے ایک فائل چرائی تھی۔ جو سرخ رنگ کے کور میں لپٹی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے بعد باہر آ کر پتا چلا کہ باہر پولیس نے تباہی مچا رکھی ہے۔ استاد سلامت مارا گیا تھا اور کئی لڑکے بھی مارے گئے تھے۔

اور پھر کامران بھاگا اور وہ فائل...... وہ فائل کامران نے اسی کھنڈر میں چھپائی تھی۔ نہ جانے کیوں ذہن کو ایک عجیب سا احساس ہوا تھا اور یہاں وقت گزارنے کی بجائے کامران اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کھنڈرات کی طرف بڑھ گیا۔ کامران کے اوپر نہ جانے کیسا احساس غالب آ گیا تھا جس کے تحت وہ یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ ورنہ کاغذوں کے ڈھیر سے اسے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ مگر اس وقت اس کے دل میں یہ آرزو شدت سے پروان چڑھ رہی تھی کہ ذرا دیکھوں تو سہی۔

گزرے ہوئے زمانے نے کیا کیا رنگ دکھائے ہیں۔ کھنڈر ابھی تک اسی انداز میں پڑا ہوا ہے۔ تو ممکن ہے وہ فائل بھی وہیں موجود ہو حالانکہ اس سے پہلے اسے نہیں معلوم تھا کہ استاد سلامت وہ فائل کیوں حاصل کرنا چاہتا ہے یا اس میں کیا ہے۔ اسے ایسی چیزوں سے پہلے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

کامران کو وہ انگریز بھی یاد تھے۔ جنہوں نے استاد سلامت کو اس کام پر آمادہ کیا تھا ایک عجیب سی کیفیت دل پر طاری ہوگئی۔ لیکن احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے کہا۔ وہ بھی چٹانوں کی آڑ لے کر چل رہا تھا۔ اس کی رفتار بہت سست تھی۔ لیکن اسے یہ بھی خیال تھا کہ اگر زخمی آدمیوں نے سیکورٹی کے دوسرے لوگوں کو ہوشیار کر دیا تو وہ لوگ کچھ ہیلی کاپٹر وغیرہ لے آئے تو اسے آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ آیا! اس کے لیے یہ کھنڈر نہایت مناسب جگہ ہے یہاں محفوظ رہنے کے لیے بہت سے مقامات ہیں۔

کامران کو یاد تھا اس نے دیکھا تھا۔ یہاں کئی دالان بنے ہوئے تھے۔ اس نے اسے گھر کہا تھا۔ لیکن حقیقی معنوں میں یہ گھر نہیں تھا۔ پتلی اینٹوں سے بنی ہوئی ایک قدیم طرز کی عمارت تھی۔ غالباً مغلوں کے دورے اس کا تعلق تھا۔ چونکہ مغلوں ہی کو شوق تھا کہ جگہ جگہ اینٹوں کے ڈھیر لگاتے رہیں اور اپنی نشانیاں چھوڑ جائیں۔

یہ بادشاہ بھی خوب ہوتے ہیں جو دل چاہتا ہے کر لیتے ہیں اور اپنا نام در و دیوار پر لکھ جایا کرتے ہیں۔ کیا حاصل ہوتا ہے؟ اس نام سے۔ کیا تصور ابھرتا ہے۔ ان ناموں کے ساتھ۔ سوائے اس کے کہ واہ واہ دیکھو۔ کیا صاحب ذوق تھے۔ ان تصورات نے فاصلے کم کر دیے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اینٹوں کے اس ڈھیر میں داخل ہوگیا۔ کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا تھا۔

آگے چل کر تین پتلے پتلے ستون جن کے سامنے تین سیڑھیاں، اوپر چبوترہ، چبوترے کے بعد سیدھے دروازے اور بغیر چھت کا دالان۔ بغیر چھت کا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کی چھت اسی وقت گر پڑی تھی جب کامران پہلی بار یہاں آیا تھا اور نیچے اینٹوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ اس کے بعد باہر کی سمت ایک

ٹوٹا پھوٹا دروازہ۔ ایسے دروازے سامنے اور دوسری طرف بھی تھے۔ لیکن باہر کی سمت کا ٹوٹا ہوا دروازہ کامران کے لیے اس لیے باعث دلچسپی تھا کہ وہاں اس نے ایک فائل چھپائی ہوئی تھی۔ وہ فائل یقینی طور پر کسی اہمیت کی حامل تھی اور استاد سلامت کو اس کی ضرورت تھی۔ پتا نہیں کوئی یہاں تک پہنچا یا نہیں؟

فائل کسی کے ہاتھ لگی یا نہیں۔ اپنی دانست میں تو اس نے ایک محفوظ مقام پر چھپایا تھا۔ کامران اندر داخل ہوگیا اور اس کے بعد اس نے ایک جگہ اس فائل کو دیکھا اور جب اس خلاء میں ہاتھ ڈالا تو فائل کا ایک کونا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سانپ کی ایک پھنکار بھی سنائی دی۔ انتہائی خوف زدہ ہوکر فائل کامران نے اوپر کھینچ لی۔

اسے خدشہ تھا کہ کہیں سانپ فائل کے اوپر ہی نہ بیٹھا ہو اور فائل کے ساتھ ساتھ ہی نیچے آ گرے۔ لیکن ابھی اتنی روشنی باقی تھی کہ وہ دیکھ سکتا تھا کہ سانپ فائل کے ساتھ گرا ہے یا نہیں۔ سانپ نہیں گرا تھا۔ لیکن اس کے حساس کانوں نے یہ اندازہ اچھی طرح لگا لیا تھا کہ سانپ وہاں موجود ہے۔ کامران نے فائل کو اٹھایا اور دوڑتا ہوا اسی ڈر سے باہر نکل آیا۔ دل پر ایک دہشت سی سوار ہوگئی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس کھنڈر میں سانپ ہے اور یہاں زندگی گزارنا اپنی جان خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

لیکن دوسری طرف بھی زندگی خطرے میں ہی تھی۔ کم از کم یہ جائزہ لے لیا جائے کہ سیکورٹی کے آدمی اس کی تلاش میں چاروں طرف پھیل گئے ہیں یا نہیں۔ اس کے علاوہ اب تھوڑا سا راستہ بھی ذہن میں آتا جا رہا تھا۔ فائل کو اس نے زور زور سے ہاتھ مار کر جھاڑا اور پھر اس چبوترے پر آ گیا جہاں سے دور دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ لیکن اینٹوں کی چند دیواریں اب بھی قائم تھیں اور وہ ان کے درمیان پناہ لے سکتا تھا۔ سانپ کی پھنکار نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا اور اس سے بچنے کے لیے اس نے انتظامات شروع کر دیے۔

فائل کو ایک جگہ رکھ کر اس نے اینٹوں کے ایسے ٹکڑے اٹھائے۔ جن سے وہ سانپ کا نشانہ لے سکے۔ اگر وہ ادھر آئے اور اس کے بعد اس نے اپنے لیے ایک مناسب ٹھکانا بنا لیا اور وقت گزارنے لگا۔ سورج چھپ گیا۔ کامران نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تقریباً آدھی رات تک یہاں رکے گا اور جب یہ اطمینان ہو جائے گا کہ قرب و جوار میں کوئی نہیں ہے تو پھر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرے گا۔

وہ بستی وہ راستے اسے یاد تھے جن سے گزر کر وہ یہاں تک آیا تھا اور اس کے بعد واپس وہاں پہنچا تھا۔ چنانچہ اچھا خاصا مطمئن ہوگیا۔ رات بڑی برق رفتاری سے آگے بڑھتی رہی۔ کیوں کہ کامران کا پیٹ بھر چکا تھا۔ اس لیے اس وقت بھی اسے کوئی خاص بھوک نہیں تھی۔ آدھی رات کے بعد جس سفر کا آغاز ہوگا وہ بھی اسے بستی تک پہنچا دے گا اور پھر وہاں کھانا وغیرہ کھایا جا سکتا تھا۔ جیب میں بھی مناسب رقم موجود تھی اور کھانا وغیرہ کھایا جا سکتا تھا۔ اس لیے اسے کوئی خاص پروا نہیں تھی۔

بہرحال تھوڑی دیر کے بعد چاند نے سر ابھارا اور پراسرار کھنڈر میں روشنی پھیل گئی اس روشنی میں وقت گزاری کے طور پر اس نے اس فائل کے بند کھولے اور اس میں لگے ہوئے کاغذات دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے اندر اندر اسے احساس ہوا کہ اگر تیز ہوا کے جھونکے چل پڑے تو یہ بوسیدہ کاغذات ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں گے۔ ان کی رنگت کی پیلاہٹ کا رات کی اس روشنی میں صحیح اندازہ تو نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن صفحات اس قدر سخت

تھے۔اس سے احساس ہوتا تھا کہ ذرا سی لغزش سے یہ ریزہ ریزہ ہو سکتے ہیں۔ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''دیکھنا چاہیے کہ ان میں کیا ہے؟''

لیکن یہ دیکھنے کے لیے کسی مناسب جگہ کا انتظام ضروری تھا۔چنانچہ اس نے احتیاط سے اس فائل کو دوبارہ باندھ لیا اور مزید احتیاط کرنے کے لیے اسے ایک جانب رکھ دیا۔وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔حالات بتا رہے تھے کہ کم از کم سیکورٹی والے یہاں تک نہیں پہنچے۔اپنے حافظے کو مجتمع کر کے اس نے ان سمتوں کا اندازہ لگا لیا۔جہاں سے دوڑ کر وہ اور اس کا دوست نعیم یہاں تک آئے تھے اور اس کے بعد یہاں سے نکل گئے تھے۔

کامران کی یادداشت مسلسل اس کا ساتھ دے رہی تھی اور اس نے بستی کی اس سمت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ویسے یہ حقیقت ہے کہ اگر کوئی بلند جگہ اسے مل جاتی تو وہاں سے دیکھتا تو یقینی طور پر اسے بستی کے چراغ اور روشنیاں نظر آ جاتیں۔خیر یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں تھا۔زندگی کی بہت سی گزری ہوئی یادیں دماغ سے گزرتی رہیں اور پھر نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ اچانک ہی اسے اینٹوں پر انسانی قدموں کی آواز سنائی دی اور وہ سہم کر رہ گیا۔اس نے دل میں سوچا۔

''ارے باپ رے اس کا مطلب ہے ان کم بختوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔اب کرنا کیا چاہیے؟'' سانپ کو مارنے کے لیے جو اینٹیں اس نے جمع کی تھیں۔ان میں سے دو اینٹوں کے ٹکڑے اس نے اٹھا لیے۔اس وقت یہی اس کا ہتھیار ہو سکتے تھے اور وہ سانس روکے انتظار کرتا رہا۔پھر سامنے والے ستون کے پاس اسے ایک انسانی سایہ نظر آیا اور اس وقت اس سائے نے بھی اسے دیکھ لیا۔وہ بری طرح سہم گیا تھا۔اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اینٹوں پر سے اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ نیچے گر پڑا۔کامران کو اندازہ ہو گیا کہ وہ تنہا ہی ہے۔چنانچہ اس نے غرا کر کہا۔

''خبردار اپنی جگہ پڑے رہو اگر اٹھنے کی کوشش کی تو تمہارے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں گے۔'' وہ جو کوئی بھی تھا۔اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔البتہ اس نے دونوں ہاتھ ٹکا لیے تھے اور اینٹوں کے ڈھیر ہی پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔کامران سن گن لیتا رہا۔وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ اور کتنے افراد ہیں۔اگر یہ ان دونوں میں سے ایک ہے تو اس کا دوسرا ساتھی کس کیفیت میں ہے۔یا وہ پولیس فورس کی مدد لینے کے لیے گیا ہے؟ یا پھر...... یا پھر...... لیکن اسے کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔کامران آہستہ سے آگے بڑھا اور اس کے بعد اس نے کہا۔

''اٹھ جاؤ...... کھڑے ہو جاؤ۔''

''دیکھو بھائی اگر تم پولیس والے نہیں ہو تو میرے ساتھ اچھا سلوک کرو۔میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے لیے کوئی غلط بات نہیں سوچوں گا۔نہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کروں گا۔''

کامران اس کے الفاظ کو سنتا رہا۔نہ جانے کیوں ایک بار پھر اس کے ذہن میں ایک خلش سی بیدار ہو گئی تھی۔یہ آواز یہ لہجہ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔چاند کی روشنی اتنی تیز تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے نقش اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔دوسرے ہی لمحے اس شخص کے منہ سے آواز نکلی۔

''کامران۔'' اور اب کامران کے ذہن کے بند بھی کھل گئے۔کامران کے ہاتھوں سے اینٹیں گر پڑیں اور اس کے منہ سے نکلا۔

''نعیم خان۔''

''کامران ہی ہے نا تو میرے بھائی؟'' تو کامران ہی ہے نا میری جان۔میرے دوست!'' وہ بری طرح کامران سے لپٹ گیا اور پھر نہ جانے کتنی دیر تک وہ لپٹے کھڑے رہے تھے۔کون کہتا ہے کہ دنیا کا برے سے برا انسان محبت سے دور ہوتا ہے۔محبت ایک آفاقی جذبہ ہے اگر انسان کے دل میں محبت نہ ہو تو انسانیت کا وجود مٹ جائے۔کوئی نہیں تھا اس کا اس دنیا میں لیکن انسان تھا۔بچپن کا ایک ساتھی تھا اور کامران کا دل بے پناہ خوش ہوا تھا۔اس کے مل جانے سے،اس کا مطلب تھا کہ محبت کے افسانے موجود تھے اور وہ بھی کسی کو چاہ سکتا تھا۔بشرطے کہ کوئی چاہنے والا ہے۔

وہ دونوں بڑی دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔پھر نعیم نے کہا۔

''کیسی عجیب بات ہے کامران! تم یقین کرو یہاں تک آئے ہو میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ ایک بار میرا دوست انتہائی برے حالات میں یہاں تک آیا تھا۔کاش آج بھی وہ یہاں پہنچ جائے۔کامران لوگ کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے پورے چوبیس گھنٹے میں ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جب وہ دل سے کسی بات کی آرزو کرے اور اس کی وہ آرزو پوری ہو جائے۔مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ ایسا ہو چکا ہے۔''

''تم پہلی بار یہاں آئے ہو؟''

''دوسری بار۔''

''ہاں...... میرا مطلب ہے اس وقت کے بعد۔''

''ہاں۔اس وقت کے بعد میں پہلی بار یہاں آیا ہوں۔''

''نعیم خان! یہاں سانپ ہے میں اس کی پھنکار سن چکا ہوں۔کیا خیال ہے یہاں سے ہٹ کر کسی اور جگہ چٹان کی آڑ میں بیٹھیں۔'' نعیم خان نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر بولا۔

''ٹھیک ہے چلو۔باہر چلتے ہیں کیوں خطرہ مول لیا جائے۔''

''ہاں......'' کامران نے کہا۔واپس آتے ہوئے کامران نے پر پتھر پر رکھی ہوئی فائل اٹھائی تو نعیم چونک پڑا۔

''یہ...... یہ کیا یہ وہی فائل ہے؟ جسے ہم نے یہاں محفوظ کیا تھا۔''

''ہاں وہی ہے۔''

''میرے خدا...... میرے خدا...... تم اسے ساتھ لیے ہوئے پھر رہے ہو۔یا آج ہی اسے حاصل کیا ہے؟''

''اس دن کے بعد سے آج ہی یہاں پہنچا ہوں اور آج ہی میں نے یہ فائل حاصل کی ہے۔''

''خیر اس سے تو انکار نہیں کہ انسان کی کوششوں سے ہٹ کر الگ ایک ایسی دنیا ہے جہاں اس کی ان کوششوں کا یقین ہوتا ہے۔وہ یہ سمجھتا ہے کہ فیصلے اس نے کیے ہیں۔لیکن فیصلے کہیں اور سے ہوتے ہیں اور

عمل بھی کہیں اور سے ہی ہوتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہتے ہو مجھے تم سے اتفاق ہے۔ میں بھی اس طرف آ پہنچا تھا پھر میں نے یہ کھنڈرات پہچان لیے۔ مجھے یہ فائل یاد آئی اور میں نے یہ فائل یہاں سے نکال لی۔ حالانکہ استاد سلامت کی موت کے بعد ہمارے لیے یہ ساری چیزیں بے معنی ہیں۔"

"دیکھا اس میں کیا ہے؟"

"اتنے بوسیدہ کاغذات ہیں کہ اگر فائل کھول کر دیکھا جائے اور فائل ہاتھ سے گر پڑے یا تیز ہوا چلنے لگے تو ریزہ ریزہ ہو جائیں۔"

"گویا کوئی بہت ہی قدیم دستاویزات ہیں۔"

"ایسا ہی لگتا ہے۔"

"خیر ہمیں اس سے کیا؟"

"مگر میرا دل اسے پھینکنے کو نہیں چاہتا۔"

"نہیں نہیں دیکھیں گے کسی وقت اگر موقع ملا تو اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے کہ آخر اس میں ہے کیا؟ اور جن لوگوں کو اس کی ضرورت تھی وہ کس لیے تھی؟"

نعیم خان گردن ہلانے لگا پھر وہ کامران کو دیکھ کر مسکرایا۔

"اچھا یہ بتاؤ تم نے مجھے ایک نظر میں پہچان لیا تھا؟"

"ہاں...... نعیم خان اور ایک غیر جذباتی انسان ہونے کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ میں نے شاید اپنے دل میں تمہاری بہت بڑی جگہ محسوس کی ہے۔ میں تم سے بہت دوستی اور انسیت رکھتا ہوں۔"

"دوست دل کی بات کہنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ تم یقین کرو میں نے بھی پوری زندگی تمہیں یاد کیا ہے اور شاید ہمارے دلوں کا خلوص ہی تھا جس نے ہمیں ایک بار پھر ایک دوسرے سے ملا دیا۔" کامران نے نعیم خان کی اس بات سے تفاق کیا۔ پھر اس نے نعیم خان سے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کیا کرتے ہو؟ کیا کرتے رہے ہو آج تک؟"

"چوریاں۔" نعیم خان نے جواب دیا۔ کامران نے مسکراتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور کہا۔

"گروپ بنا رکھا ہے؟"

"بالکل نہیں تنہا ہوں۔"

"کوئی ٹھکانا بنایا ہے؟"

"بالکل نہیں ساری دنیا کو بلکہ ساری دنیا کو تو نہیں اپنے ملک کو اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ جس شہر میں دل چاہتا ہے چلا جاتا ہوں۔ چھوٹا موٹا کوئی کام کرتا ہوں۔ بس اتنی رقم حاصل کر لیتا ہوں کہ عیش سے زندگی بسر ہو جائے۔ ویسے ایک بات بتاؤں تمہیں۔ یقین کرو، کبھی کسی مرے ہوئے کو نہیں مارا چوری بھی کی تو ایسی جگہ جہاں مالکوں کے دل کو کوئی دکھن نہ ہو۔ بلکہ وہ کہیں کہ چلو بھاڑ میں جائے جو کچھ بھی گیا۔ سمجھ رہے ہو میری بات اور ہنسی نہیں آئے گی تمہیں یہ سن کر جہاں چوری کرتا ہوں وہاں سے بھی اگر لاکھوں رکھا ہوا تو اتنے

ہی لیتا ہوں کہ اپنا کام چل جائے اور دوسرے کا کام بھی خراب نہ ہو۔ لوگ یقینی طور پر حیرت کرتے ہوں گے۔ مگر بھئی سوچ مختلف ہے۔"

"کیا؟" کامران نے مسکرا کر کہا۔

"میں سوچتا ہوں کہ بہت بڑی رقم آ گئی تو ایک جگہ ٹکنا پڑے گا۔ رقم کو سنبھالنا پڑے گا۔ کہیں ملکوں بھی ہو سکتا ہوں۔"

"ان کھنڈرات میں دوبارہ کیسے آ نکلے؟"

"بس چوری کرنے ایک گھر میں داخل ہوا تھا۔ جگار ہو گئی۔ تم جانتے ہو گھر کس کا تھا۔"

"بھلا میں کیسے جان سکتا ہوں؟"

"ڈی ایس پی صاحب کا۔ پولیس کے افسر اعلیٰ بھلا انہیں کیا مشکل ہو سکتی تھی۔ موبائل لگا دی میرے پیچھے اور میں نے برق رفتاری کا ریکارڈ قائم کیا۔ لیکن رخ اس طرف ہو گیا۔ اب یہ کیا معلوم تھا کہ تقدیر مجھے اس طرف کیوں لا رہی ہے۔"

"واقعی! تقدیر کے کھیل ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"اور اب قصہ چہار درویش کے تحت بلکہ قصہ دو درویش کے تحت تم اپنی سناؤ۔" اس نے پر مزاح لہجے میں پوچھا۔

"یوں سمجھ لو بنیاد تو اپنی بھی غلط ہی ہو گئی تھی۔ استاد سلامت کے ساتھ رہنے والے اس کے سوا کیا کر سکتے تھے جو اس نے سکھایا تھا۔ چنانچہ سمجھ لو کہ ہم بھی ان ہی لائنوں پر سفر کر رہے ہیں۔

"کس پیمانے پر؟" نعیم خان نے سوال کیا اور کامران اسے اس سے بچھڑنے کے بعد کی زندگی کے وقعات بتانے لگا۔ نعیم خان نے اس کے مضبوط بازوؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"لگ رہا ہے واقعی لگ رہا ہے کہ بڑے بڑے کام کرتے رہے ہو۔ خدا تمہاری صحت اور زندگی سلامت رکھے۔ ویسے کوئی چکر وکر چلایا نہیں۔"

"چکر۔"

"میرا مطلب ہے زندگی میں رنگینیوں کا کوئی دخل ہے یا نہیں؟"

"جیل کی رنگینیوں سے فرصت ملتی تو زندگی کی رنگینیوں کے بارے میں سوچتے۔"

"گویا اب تک فارغ البال ہو۔"

"نہیں بال تو میرے سر پر کافی ہیں۔" کامران نے کہا اور نعیم خان ہنسنے لگا پھر بولا۔

"یار! خدا کی قسم! زندگی ایک بار پھر لذتوں سے ہمکنار ہو گئی ہے اور وہ مل گیا ہے جسے کھونے کا غم آج تک تھا۔ آؤ میرا خیال ہے کہ ان کھنڈرات میں وقت نہ گزاریں۔ تم بھی خطرے میں ہو میں بھی خطرے میں ہوں اور جب دو دوست مل جائیں تو بھلا تھکن جیسی چیز کا کیا تعلق کیا تم مجھ سے اتفاق کرتے ہو؟"

"سو فی صدی۔" کامران نے جواب دیا۔

"بس تو پھر اٹھتے ہیں۔" کامران خود بھی یہی ارادہ رکھتا تھا کہ آدھی رات کو یہاں سے نکل

جاؤں۔ چنانچہ کامران نے نعیم خان کے ساتھ وہاں سے قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ فائل انہوں نے اپنے ساتھ ہی لے لی تھی۔

وہ دونوں وہاں سے چل پڑے۔ نعیم خان کے مل جانے سے کامران کو جس قدر خوشی ہوئی تھی۔ وہ بیان سے باہر ہے۔ حالانکہ بدرشاہ بھی بہت عرصہ تک اس کے ساتھ رہا تھا لیکن بدرشاہ سے وہ شناسائی اور قربت نہیں ہوئی تھی۔ جو نعیم سے تھی۔ نعیم خان ایک ہنس مکھ اور کھلنڈرا نوجوان تھا۔ اب اس کی شخصیت اور بھی نکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ راستے میں وہ دونوں باتیں کرتے رہے اور اتنا لمبا سفر ان دونوں نے کیا کہ صبح کا اجالا نمودار ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ان کی خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ جب انہوں نے ایک بستی دیکھی۔ بستی ان کے لیے اجنبی تھی۔ کچے پکے مکان تاحدِ نظر بکھرے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی بناوٹ سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ بستی کافی پسماندہ ہے۔ جو سب سے پہلی چیز انہیں نظر آئی۔ وہ ایک تندور سے اٹھتا ہوا دھواں تھا۔ چھوٹے سے جھونپڑا ہوٹل کے اندر ابتدائی کارروائی ہو رہی تھی۔'' نعیم خان نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''بزرگوں کا کہنا ہے کہ اگر سب سے پہلے صبح کو رزق نظر آ جائے تو اس کا مطلب ہے وہ دن خوشحالی اور خوش بختی کا دن ہے۔ جب کہ میرے پاس اچھی خاصی رقم بھی موجود ہے۔ ویسے تمہیں اس بستی کے بارے میں کچھ اندازہ ہے؟''

''نہیں۔''

''خیر سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔'' وہ دونوں آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے آخر کار بستی میں داخل ہو گئے۔ تندور کے کنارے بیٹھا ہوا شخص آٹا تیار کر کے بیٹھا ہوا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر کچھ دیگچے بجے ہوئے تھے۔ جن کے پیچھے ایک دوسرا آدمی موجود تھا۔ ایک شخص ایک چھوٹی سی میز کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ ایک دو کھانا سرو کرنے والے تھے۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے اور میز پر جا بیٹھے فوراً ہی ویٹر ان کے پاس پہنچ گیا اور اس نے کہا۔

''آج کچھ جلدی نہیں آ گئے بابو۔ کارخانہ تو ابھی ساڑھے سات بجے کھلے گا۔''

''کون سا کارخانہ۔'' کامران نے سوال کیا۔

''نہیں! ہم سمجھے کہ تم کارخانے کے مزدور ہو۔ کیا تم کارخانے میں کام نہیں کرتے؟''

''کیوں نہیں کرتے؟ ہم تو تم سے پوچھ رہے تھے کہ کون سا کارخانہ؟ کیا تمہارا یہ کارخانہ مرا مطلب ہے ہوٹل؟'' کامران کے بجائے نعیم خان نے کہا اور ویٹر ہنسنے لگا۔

''نہیں...... بابو صاحب ہمارا کارخانہ تو پانچ بجے کھل جاتا ہے۔''

''تو کیا کھلا رہے ہو اپنے اس کارخانے سے؟''

''بس جی...... صبح کو تو نہاری ہی ملتی ہے آپ کیا کھاؤ گے؟''

''اور چائے نہیں ملتی؟'' نعیم نے پوچھا۔

''لیجیے بابو صاحب آپ تو شہر والوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔ شہر والے ہی بے چارے روٹی کھانے سے پہلے چائے پیتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں نا بتی...... بتی۔''

''بتی......'' کامران نے تعجب سے کہا۔

''ہاں...... جی ایسا ہی کہتے ہیں نا وہ...... وہ منہ دھونے اور دانت صاف کیے بغیر جو چائے پیتے ہیں اسے بتی نہیں کہتے تو اور کیا کہتے ہیں؟''

''ہاں...... ہاں...... بتی۔'' نعیم خان نے ہنستے ہوئے کہا پھر بولا۔

''نہیں...... نہیں ہمیں بتی نہیں چاہیے بلکہ پہلے کھانا چاہیے اور اس کے بعد بتی پلانا۔'' ویٹر ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ تو کامران نے نعیم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار یہ بتی میں نے پہلی بار سنی ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں یہ ویٹر انگریزوں سے زیادہ سمجھدار ہے۔''

''کیوں؟''

''بیڈ ٹی کو یہ بتی کہہ رہا ہے۔ بیڈ کا مطلب اسپیلنگ کے ساتھ اگر نہ بتایا جائے تو خراب بھی ہوتا ہے یعنی خراب چائے۔ اس نے چائے کی عزت بچا لی ہے۔''

''اوہ۔'' کامران ہنسنے لگا۔ ''کیا خوب صورت لگ رہا ہے اس وقت کا سارا ماحول۔'' وہ دونوں انتظار کرنے لگے ویٹر نے تندور پر بیٹھے نان بائی سے روٹیاں لگانے کے لیے کہہ دیا تھا اور پھر نہاری والے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اتنی دیر میں ایک اور آدمی وہاں داخل ہوا بدن پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔ داڑھی بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی تھی۔

جسامت بہت شاندار تھی۔ جسم کی وجہ سے عمر کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ وہ ان دونوں سے نکلتے ہوئے قد کا مالک تھا۔ لیکن یقینی طور پر اس کی عمر بہت زیادہ تھی۔ چہرے کے نقوش میں ایک اجنبیت سی پائی جاتی تھی۔ آنکھوں میں البتہ ایک شوخی جیسی چمک تھی۔ دوسرا ویٹر جو خالی کھڑا ہوا تھا۔ آگے بڑھا اور اس کے قریب پہنچ کر بولا۔

''اے چلو باہر۔ یار تم صبح ہی صبح کیوں آ مرتے ہو؟ بدن دیکھو پہاڑ جیسا بھیک مانگنے کی عادت پڑ جاتی ہے تو غیرت ہی مر جاتی ہے۔''

''او میرے پیارے بھائی نہ میں نے تجھ سے بھیک مانگی ہے اور نہ ہی مانگوں گا۔ اگر کچھ شریف لوگ نیکیاں کمانا چاہتے ہوں تو تم بیچ میں کیوں آ جاتے ہو؟''

''ڈنڈا مارو بھوتنی والے کو اور بھگا دو یہاں سے۔'' کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔

''چلو ادھر سے چلو یہاں سے باہر نکلو۔''

''ابھی نکل جاؤں گا، بگ باس، بس ایک منٹ ذرا شریف آدمی سے بات کرنے دو۔'' اس نے ان دونوں کی طرف اشارہ کر کے کہا اور نعیم خان جلدی سے بولا۔

''ادھر آؤ بابا جی! ادھر آؤ کیا بات ہے؟'' ویٹر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ شخص ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔

''دیکھو یار صبح کا آغاز ہوتا ہے۔ ننھی ننھی چڑیاں اور پرندے رزق کی تلاش میں نکل آتے ہیں ارے ہم بھی تو ان پرندوں کی مانند ہیں۔ تمہیں دیکھا ادھر آ گئے۔ اب ان سے کہو کہ ڈنڈے وَنڈے نہ

ماریں ہمیں، ہوسکتا ہے کہ تمہارے دل میں رحم آ ہی جائے۔"

"کیا چاہتے ہو؟"

"پیٹ کا یہ دوزخ بھرنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر بیٹھو نا یار! او بھائی بات سن۔" نعیم خان نے اس ویٹر کو پکارا جسے انہوں نے پہلے ہی آرڈر دیا ہوا تھا اور وہ قریب آ گیا۔ بوڑھا آدمی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔

"باباجی کے لیے ایک بہت فرسٹ کلاس پلیٹ بھر کر نہاری لاؤ اور باباجی روٹیاں کتنی کھاؤ گے؟"

"آٹھ...... اگر پلیٹ بھر کر کھلاؤ گے تو؟"

"ارے باپ رے کوئی بات نہیں کھاؤ۔ کھاؤ...... سنا نہیں تم نے آٹھ روٹیاں بھی لے کر آنا۔"

"بابو صاحب! یہ حرام لوگ محنت مزدوری نہیں کرتے۔ کتنی بار ہمارے مالک نے کہا ہے کہ حلیہ ٹھیک ٹھاک کر کے ادھر آ جاؤ برتن صاف کرو ویٹر کا کام کرو تین وقت کی روٹی اور پچاس روپے ہفتہ ملیں گے۔"

"لو کمال کرتے ہو۔ چوبیس روٹیاں کھلاؤ گے مجھے۔ بھگا دو گے چار دن کے اندر اندر تمہاری آمدنی تو میں کھا جاؤں گا۔ اس لیے میں تمہیں تکلیف نہیں دیتا۔ کامران اور نعیم خان ہنسنے لگے بوڑھا خاصا دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔ انہوں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ وہ بیٹھا ہوا لالچی نگاہوں سے روٹیاں لگانے والے کو دیکھتا رہا۔ ویسے اس کی جسامت سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ واقعی آٹھ روٹیوں سے کم نہیں کھاتا ہوگا۔

بہرحال ویٹر آٹھ روٹیاں اس کے لیے چار ہمارے لیے اسی طرح نہاری کی پلیٹیں بھی اس کی نہاری ان کی مقدار سے چار گنا زیادہ تھی وہ جیسے دنیا کو بھول گیا تھا۔ وہ دونوں بھی کھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ کامران کی نگاہیں کئی بار بوڑھے کی جانب اٹھی تھیں اور ہر بار اس کے ذہن میں ایک تاثر ابھرا تھا۔ وہ کسی انوکھی شخصیت کا مالک تھا۔ کھانے سے فراغت حاصل ہوگئی۔ درحقیقت وہ آٹھوں روٹیاں چٹ کر گیا تھا اور نہاری کی بہت بڑی پلیٹ اس طرح صاف ہوگئی تھی، جسے دھونے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ کامران نے اس سے پوچھا۔

"باباجی اور کھاؤ گے؟"

"نہیں۔"

"پیٹ بھر گیا بس چلتے ہیں۔ شکریہ تو سب ہی ادا کرتے ہیں۔ ہم تم کو ایک دعا دیتے ہیں زندگی میں ایک بار جو چاہو وہ پالو۔"

"بیٹھو باباجی۔ بیٹھیں۔ چائے نہیں پئیں گے۔" نعیم خان نے کہا۔ اور وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا پھر جھینپی ہوئی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

"سچ مچ پلاؤ گے یا مذاق کرو گے؟"

"نہیں باباجی۔" نعیم خان نے ویٹر کو اشارہ کیا اور بولا۔

"بابا کے لیے چار کپ چائے لاؤ اور ایک ایک کپ ہمارے لیے۔"

"صاحب ایک بات کہیں برا تو نہیں مانو گے آپ؟" ویٹر بولا۔

"بالکل نہیں برا مانیں گے۔" وہ کاؤنٹر پر جو چاچا جی بیٹھے ہیں نا انہوں نے کہا ہے کہ پہلے آپ سے پیسے لے لیں۔ دیکھیے صاحب! برا نہ مانیے۔ اصل میں۔"

"ایک منٹ ایک منٹ۔" نعیم خان نے کہا اور جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر ویٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"کافی ہوں گے یا اور؟"

"نہیں صاحب۔ کافی ہیں۔" ویٹر نوٹ لے کر آگے بڑھ گیا۔ بوڑھا بابا ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔

"اصل میں قصور ان کا بھی نہیں ہے۔ اس دنیا میں رہنے والے کسی بھی شخص کا قصور نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو سانس لینے والے ہوتے ہیں نا بڑے کمزور ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ہی محور ہوتا ہے۔ اب دیکھو نا وہ بھی دکان سجا کر بیٹھے ہیں۔ کوئی اگر انہیں لوٹ کر چل دے تو کیا کریں گے بے چارے۔ اگر فرض کرو کہ ہمارے ساتھ مار پیٹ بھی کرلیں تو کیا ملے گا انہیں۔ نقصان تو ہو گیا نا۔ جھگڑا الگ۔ بے قصور ہیں۔ وہ بے قصور ہے۔"

"فلسفی معلوم ہوتے ہیں باباجی۔"

"فلسفہ۔" منطق سائنس اور پتا نہیں کیا کیا سب اپنے سر پر ٹوپیوں کی طرح اوڑھ رکھا ہے ہم لوگوں نے۔"

"کچھ پڑھے لکھے ہو باباجی؟"

"نہیں بالکل نہیں۔"

"نام کیا ہے تمہارا؟"

"اصلی نام سنو گے یا تمہاری پسند کا کوئی نام بتا دوں۔"

"اصلی نام بتا دو تو کوئی حرج نہیں ہے۔"

"تو میرا نام پروفیسر سپارکن ہے۔"

"کیا؟"

"پروفیسر سپارکن۔"

"عجیب نام ہے۔ مذہب کیا ہے آپ کا؟"

"انسانیت۔" اس نے جواب دیا۔

"پروفیسر کس چیز کے ہیں۔"

"انسانیت کا۔" وہ پھر بولا۔

"آدمی کافی چالاک ہو۔"

"ہاں مجھے اس بات کا اعتراف ہے۔"

"خیر دل تو چاہتا ہے کہ تم سے تمہارے بارے میں بہت کچھ معلوم کرنے کا لیکن تم سوچو گے کہ تھوڑی سی روٹی کیا کھلا دی ہے۔ دوبارہ بھی تمہارے سر پڑ رہے ہیں۔"

"نہیں میرے بارے میں تم اور کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟ یا پھر اپنے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہو تو مجھ سے رجوع کرو۔"

"اچھا ہمارے بارے میں کیا جانتے ہو تم؟"

"چائے پینے کے بعد زیادہ اچھا رہے گا۔ یہ لوگ سوچیں گے کہ ہم یہاں بلاوجہ تماشا لگا رہے ہیں۔ تم لوگ چائے پی کر میرے ساتھ اٹھو گے وہ دیکھو سامنے جو چبوترا ہے اس چبوترے تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ کیا ٹھنڈی چھاؤں ہوتی ہے وہاں میں تمہیں اپنے بارے میں بہت سی باتیں بتاؤں گا۔"

"گڈ، ٹھیک، بابا جی ویسے ساری باتیں اپنی جگہ لیکن آدمی دلچسپ ہو۔"

"ابھی تو میں نے اپنی دلچسپیوں کو صحیح طور پر بتایا بھی نہیں ہے، کیا سمجھے، جب ساری باتیں سنو گے تو اور مزہ آئے گا تمہیں۔" بوڑھے نے کہا۔

"اس سے پہلے کبھی مفت کی چائے پی ہے؟"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم مفت کی چائے پینے والے ہو۔"

"انسان کی کمزوری ہے...... اس کی بات کا برا کبھی نہیں مانو میں بھی انسان ہوں۔ کمزور ہوں۔ بے وقوفی کی کوئی بھی بات کرسکتا ہوں۔ ارے بھائی کرنے دو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ہاں۔ چلو ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں۔" چائے آگئی۔ ویٹر کو چونکہ سو کا نوٹ مل چکا تھا۔ جو اس کے پورے حساب سے بھی کچھ زیادہ تھا۔ چنانچہ چائے کے ساتھ ساتھ ہی اس نے چودہ روپے انہیں واپس کیے تو نعیم خان نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"کتنے پیسے بنے تمہارے؟"

"چھیاسی روپے صاحب۔"

"ٹھیک ہے چائے تک کا بل ہو گیا۔"

"جی صاحب۔"

"تم بھی کیا یاد کرو گے کہ آج ہمارے بوڑھے بابا کا منہ دیکھا تھا تم نے۔ رکھ لو۔" ویٹر کی آنکھیں واقعی حیرت سے پھیل گئی تھیں۔" اس نے کہا۔

"سارے پیسے رکھ لوں صاحب۔"

"سارے رکھ لو۔" ویٹر کا چہرہ خوشی سے چمکتا جا رہا تھا۔ بوڑھے پروفیسر سپارکن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یار عزت بڑھا دی ہے تم نے۔ اب دیکھو نا۔ تم چلے جاؤ گے، کل سے یہ کمزور انسان اس بات کی دعا مانگے گا کہ ہوٹل میں جو سب سے پہلا آدمی داخل ہو اس کے ساتھ ہی میں بھی اندر آ جاؤں اور اس کی دن بھر کی کمائی صبح ہی صبح ہو جائے۔ پورے دن میں بھی یہ بے چارہ چودہ روپے سے اوپر نہیں کما پاتا ہو گا۔ دو ڈھائی روپے تنخواہ ملتی ہو گی۔ اس کو روزانہ کی، چودہ روپے۔ اس کا مطلب ہے۔ سات دن کی تنخواہ۔ بھئی واہ۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ کل آنے والا نہ تو مجھے کچھ کھلائے گا نہ اسے کچھ دے گا۔ صرف آج ہوتا ہے، آج کر لو، کل کے چکر میں پڑو گے تو ایسے چکراؤ گے کہ چکراتے ہی رہ جاؤ گے۔ کھوپڑی گھوم گھوم کر ایک چکر بن جائے گی۔ آج صرف آج کیا سمجھے۔" اس نے کہا اور گرم گرم چائے حلق میں انڈیلنے لگا۔ "چائے بہت بڑی مزیدار تھی۔" نعیم نے سوالیہ نگاہوں سے کامران کو دیکھا۔ وہ اس کے اس طرح دیکھنے کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ بوڑھے کو اپنے ساتھ لگایا جائے یا نہ لگایا جائے۔

کامران نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی۔ مقصد یہ تھا کہ ہمارا کیا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر اس سے گپ شپ ہی رہے گی ہمیں کون سی اپنی ڈیوٹی پر جانا ہے۔

بہرحال کافی دیر تک یہاں اس ہوٹل میں بیٹھے اور اس کے بعد وہاں سے اٹھ گئے۔ بوڑھا بھی ان کے ساتھ ساتھ ہی اٹھ گیا تھا۔ ویسے ساری باتیں اپنی جگہ لیکن اسکی شخصیت میں کوئی ایسی بات تو تھی۔ جو بڑی عجیب محسوس ہوتی تھی۔ یا تو اس نے اپنا حلیہ ہی ایسا بنا رکھا تھا۔ یا اس طرح کے لوگ بھی ہوتے ہیں مفت کا کھا کھا کر سانڈ ہو جاتے ہیں اور کھانے کے لیے اپنی شعبدہ گری دکھانے سے گریز نہیں کرتے۔

اس نے جس درخت کے بارے میں کہا تھا۔ وہ بھی یہاں سے خاصے فاصلے پر تھا۔ وہ دونوں اس کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ چبوترے پر سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ خاصا شفاف چبوترہ تھا۔ بے گھر و بے در لوگوں کے لیے بہترین پناہ گاہ۔ پورے درخت کا سایہ اس چبوترے کو گھیرے ہوئے تھا۔ درخت بھی خاصا پرانا معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال بوڑھے کے ساتھ جا کر بیٹھ گئے۔ بوڑھے نے کہا۔

"تو دوستو! صورت حال یہ ہے کہ میں نے تمہیں اپنے جال میں پھانس لیا ہے کہ ہوٹل والے جو ہیں نا، یہ مجھے مفت خوروں کا گرو سمجھتے ہیں۔ اب دیکھو نا۔ زندگی میں تھوڑی سی تبدیلی تو ہونی ہی چاہیے۔ یہ بتاؤ دوپہر کا کھانا کھلاؤ گے مجھے؟"

"ابھی کھا لو؟" نعیم طنزیہ انداز میں بولا۔ اور بوڑھا ہنسنے لگا۔

"نہیں، دوپہر کا کھانا دوپہر کو۔"

"ٹھیک ہے بابا کھا لینا۔ کب منع کر رہے ہیں ہم، ویسے اپنے بارے میں اور کچھ نہیں بتاؤ گے؟"

"میں نے تمہارا ماضی بتایا، حال بھی بتایا۔ مشورہ بھی دیا۔" خبردار مجھ سے کبھی مستقبل کے بارے میں مت پوچھنا۔ کیونکہ جو لوگ مستقبل کے بارے میں بتانے لگتے ہیں۔ وہ لوگ جھوٹے ہوتے ہیں۔ مستقبل تو اس بند کتاب میں لکھا ہوتا ہے جس کا ایک ایک ورق آہستہ آہستہ کھلتا ہے اور اپنی داستان بیان کرتا چلا جاتا ہے۔"

"اصل میں رزق بڑی عجیب چیز ہے۔ اس کے لیے انسان اس دنیا میں نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا ہے۔ اچھا تم بتاؤ مجھے تمہارے سامنے اگر دولت کے انبار لگا دیے جائیں تو کیا اس دولت کو ٹھکرا دو گے۔ دیکھو سچائی بڑی اچھی ہوتی ہے سچ بولنے والا بہت سے فائدے میں رہتا ہے۔ بے مقصد جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں میں نے تم سے ایک سوال کیا تھا کہ اگر تمہارے سامنے دولت کے انبار لگا دیے جائیں تو کیا تم انہیں ٹھکرا دو گے؟"

"نہیں۔"

"گڈ! تو تم دونوں کو ایک بات بتا دوں میں کہ دولت تمہاری پہنچ سے باہر نہیں ہے۔ تمہیں، تمہارا مقصد

حاصل ہوسکتا ہے۔ وہ پاسکتے ہو تم جو تمہاری سب سے بڑی آرزو ہو، لیکن پانے کے لیے محنت کرنا ہوتی ہے۔"

"تمہیں کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔" نعیم خان پھر اپنے مذاق پر اتر آیا۔

"روٹی چاہیے روٹی۔"

"اس کے لیے تم کیا کرتے ہو؟"

"تم جیسے بڑے دل والوں کو تلاش کرتا ہوں۔ کچھ دھتکار دیتے ہیں اور کچھ میری توقع پر پورے اترتے ہیں۔"

"خود کوئی محنت کیوں نہیں کرتے؟"

"میرے پیارے دوست! محنت کے مختلف انداز ہوتے ہیں۔ میں جو محنت کر رہا ہوں وہ کرتا ہوں۔ مطلب سمجھ رہے ہو نا میرا۔ میری محنت، بہرحال مجھے کچھ نہ کچھ دے دیتی ہے۔ جیسے روٹی۔" وہ ہنسنے لگے تھے پروفیسر سپارکن بھی ہنسنے لگا نعیم نے کہا۔

"بہرحال پروفیسر! تمہارا حیرت انگیز علم بھلایا نہیں جاسکتا۔ کیا تم ہمارے ساتھ رہنا پسند کرو گے؟"

"کمال کرتے ہو، ایسے اچھے دوست جو کھانا بھی کھلائیں عزت بھی دیں بھلا کون انہیں چھوڑنا پسند کرتا ہے۔ ہاں انہیں خود ہی عقل آجائے تو دوسری بات ہے۔"

"تم ایک دلچسپ آدمی ہو۔"

"نہ صرف دلچسپ بلکہ سمجھ لو جو کھاؤں گا۔ اس کی ادائیگی بھی کروں گا۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً تمہارا تحفظ، تمہیں ان لوگوں سے بچانے کا کام جو تمہاری فکر میں سرگرداں رہتے ہیں اور تمہیں نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔"

"خیر، یہ ایک الگ بات ہے، تم ہمارے لیے قابل احترام ہو، ہم اس حیثیت سے نہیں بلکہ تمہیں اپنے ایک دوست کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔" بوڑھا اپنی جگہ سے اٹھا، سب سے پہلے اس نے ان دونوں کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ اور بولا۔

"چلو اب آرام سے سو جاتے ہیں، سونا صحت بخش چیز ہے۔" اس نے کہا اور اس کے بعد وہیں لیٹ گیا۔ کامران اور نعیم بیٹھے رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد بوڑھے کے خراٹے گونجنے لگے۔ نعیم خان نے کہا۔

"واقعی! یہ ایک اچھا ساتھی ثابت ہوسکتا ہے اور ہم اس پر کوئی شبہ بھی نہیں کرسکتے۔"

یہ لوگ نہ جانے کب تک بوڑھے کے بارے میں بات چیت کرتے رہے تھے اور پھر انہیں نیند آگئی تھی۔ چھاؤں دار درخت ایک آرام دہ بستر ہی محسوس ہوا تھا۔ خوب گہری نیند سوئے۔ جاگے تو شام کے سائے جھک رہے تھے۔ پروفیسر سپارکن اداس بیٹھا ہوا تھا۔

"ہیلو پروفیسر۔" کامران نے پکارا۔

"بھاڑ میں گیا۔" پروفیسر منہ بسور کر بولا۔

"کون؟"

"پروفیسر۔" اس نے کہا۔" اسی دوران نعیم خان بھی اٹھ کر بیٹھ گیا اور ہماری گفتگو سننے لگا۔

"پھر آپ کون ہیں؟" کامران نے کہا۔

"گدھا۔"

"نعیم خان! اٹھو ذرا دیکھو یہ گدھا چبوترے پر کیسے چڑھ آیا اور پروفیسر سپارکن کہاں گئے؟" کامران نے کہا اور نعیم بے اختیار ہنس پڑا پروفیسر نے اسے گھونسا دکھاتے ہوئے کہا۔

"میں اگر چاہتا تو تمہاری جیب سے پیسے نکال کر ہوٹل میں جا کر کھانا کھا سکتا تھا۔ تم نہیں جانتے ایک وقت کا کھانا ترک کرنے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟"

"ارے ارے اوئے۔ سوری پروفیسر۔ آپ اس بات پر ناراض ہو رہے تھے چلیں جلدی کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے پاس کھانا ختم ہوجائے۔ بہت نقصان ہوجائے گا۔"

"میرا جی جلانے کی کوشش مت کرو۔ اب شام ہی کو کھانا مل سکے گا۔ وہ دیکھو! سارے برتن دھو کر اوندھے رکھے ہوئے ہیں اس نے۔"

"پروفیسر! آپ چلے کیوں نہ گئے؟ آپ کھانا کھا لیتے۔ پیسے نکال لیتے ہماری جیب سے۔ اب ہمارے درمیان اتنی گہری دوستی ہوگئی ہے۔ تو بھلا اس بات کی کیا گنجائش ہے کہ آپ انتظار کرتے۔"

"پیسے تو نہیں نکالے تھے۔ تمہاری جیب سے، لیکن گیا تھا اس ذلیل کے پاس۔"

"پھر۔"

"کہنے لگا کوئی ایک بار بے وقوف بنتا ہے۔ بار بار نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہارے بارے میں کہہ رہا تھا۔" پروفیسر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اوہو۔ اچھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہم تمہارے کھانے کے پیسے نہیں دیں گے۔ پروفیسر۔"

"بالکل یہی مطلب تھا۔ دل تو چاہتا ہے کہ...... کہ...... کہ۔" پروفیسر نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"چلیے تھوڑا سا صبر کرلیجیے۔"

"صبر بالکل نہیں کروں گا۔"

"تو پھر؟"

"چائے ہوگی اس کے پاس اور بسکٹ بھی۔"

"ارے ہاں۔ چائے پئیں گے پروفیسر صاحب؟"

"پیو گے نا۔" وہ اچانک خوش ہو کر بولا۔

"بالکل پئیں گے۔"

"تو پھر۔ اٹھو یار۔ جلدی کرو۔" مزے کی چیز تھی یہ پروفیسر بھی۔ وہ اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے بہت سارے بسکٹ منگوا لیے۔ پروفیسر کے ہاتھ کی صفائی دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ بڑی تیزی سے یہ تمام چیزیں ہڑپ کرتا رہا۔ ہوٹل کے ویٹر وغیرہ ان کی طرف سے مشکوک ہی

تھے۔کیونکہ ان کے لباس وغیرہ کوئی خاص نہیں تھے۔ بہر حال یہ سب کچھ ہوا اور اس کے بعد وہ لوگ تمام چیزوں سے فراغت حاصل کر کے بیٹھ گئے۔کامران نے نعیم سے کہا۔

”نعیم خان! اب کب تک یہاں رہنے کا ارادہ ہے؟“

”میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا۔یہاں سے نکلو۔“ پروفیسر نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ یہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔بے کار، ویران، اجاڑ۔“

”پروفیسر کیا آپ بھی ہمارے ساتھ جائیں گے؟“

”ارے تو اب میں یہاں اکیلا لیٹا لیٹا کیا کروں گا۔“ زندگی میں پہلی بار کچھ اچھے دوست ملے ہیں۔تو ان کے ساتھ ہی گزارہ کروں گا۔“ وہ دونوں ہنسنے لگے۔ بہر طور کامران تو پروفیسر سے بہت متاثر ہو گیا تھا۔کیونکہ اس نے کامران کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا۔وہ ایسا تھا کہ جس کا کچھ حصہ کامران خود بھی نہیں جانتا تھا۔ بہر حال انہیں کیا فرق پڑتا۔دنیا میں نکل آئے تھے۔یونہی زندگی گزارنی تھی۔ ذہن میں کون سے منصوبے تھے۔بس آوارگی، پیٹ بھرنا یہی ساری چیزیں۔

اگر یہ پروفیسر سپارکن بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائے تو کیا حرج ہے؟ کم از کم ایک اچھے ساتھی کا اضافہ ہی ہوگا۔ جو کچھ عجیب سی پراسرار قوتوں مالک معلوم ہوتا تھا۔ پھر رات ہو گئی۔ رات کا کھانا بھی انہوں نے یہیں کھایا اور کامران نے پروفیسر سے پوچھا۔

”پروفیسر ایک بات بتائیے؟“

”واہ...... کتنی عزت سے مخاطب کیا ہے۔تمہارا شکر گزار ہوں میں۔ پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”آپ کی زندگی کا مقصد یہ کھانا پینا اور زندگی گزارنا ہے یا کچھ اور بھی؟“ کامران کے ان الفاظ پر پروفیسر سپارکن کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر اس کے بعد اس نے نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔تو اس کی آنکھوں میں ایک تیز چمک لہرا رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان کا اس دنیا میں آنے کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ یہ مقصد خود نہیں جانتا۔لیکن وقت کی تحریر اسے بتاتی ہے کہ اس دنیا میں آنے سے اس کا کیا مقصد تھا؟ مطلب سمجھ رہے ہو گے میرا۔“

میری زندگی کا بھی ایک مقصد ہے اور تم دونوں کا مجھ سے ملنا بھی ایک مقصد ہے۔ وقت سے بہت پہلے تم نے مجھ سے یہ سوال کر لیا۔ میں تو خیر تم لوگوں کی حقیقت جانتا ہوں۔تم میری حقیقت نہیں جانتے۔اب تم نے یہ سوال کر ہی ڈالا ہے تو سچ یہ ہے کہ میری زندگی کا مقصد صرف روٹیاں کھانا اور سو جانا نہیں ہے۔ بلکہ آسمانوں کے مقدس فیصلوں کے مطابق میری زندگی کا بھی ایک مقصد ہے اور تم دونوں کی ملاقات اس عمل کا نتیجہ ہے۔ جو قدرتی طور پر ہو رہا ہے۔

ہنسو گے میری بات پر یقین نہیں کرو گے۔تم دونوں کی فطرت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ دنیا کو بہت آسان سمجھا ہوا ہے تم نے۔تمہارا قصور بھی نہیں ہے۔ جو زندگی تم نے گزاری ہے اس میں دنیا واقعی

آسان ہوتی ہے۔جیل چلے گئے۔ باہر نکل آئے انسانوں سے اپنا حصہ چھینو گے دوبارہ جیل چلے جاؤ گے۔ کیونکہ وہاں کے عادی ہو۔اس لیے تم پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔لیکن دوست! حقیقت یہ نہیں ہے اگر تم واقعی حقیقت دیکھنے کے خواہش مند ہو۔تو مجھ سے اس کا اظہار کرو۔“

”کیا مطلب پروفیسر؟“ کامران نے کہا۔

”میری حقیقت جاننا چاہتے ہو یا اپنا مستقبل؟“

”پروفیسر ایک بات کا تو ہم یقین کر چکے ہیں کہ تم واقعی کچھ سچے علوم جانتے ہو۔لیکن اگر ایسی کوئی بات ہے تو میں سمجھتا ہوں۔تم ہمیں دوست کہہ چکے ہو۔دوستوں کی حیثیت سے ہمیں اپنے بارے میں بتاؤ۔“

”جلدی تو نہیں ہو جائے گی؟“

”نہیں پروفیسر میرے خیال میں جلدی نہیں ہے۔“

”پیسے بھی ہیں تمہارے پاس؟“

”تم پیسوں کے بارے میں بار بار سوال کیوں کرتے ہو؟“ پروفیسر نے ایک غمگین مسکراہٹ سے انہیں دیکھا۔ پھر بولا۔

”اس لیے کہ تمہاری دنیا میں اس حقیر شے کی سب سے زیادہ عزت اور حیثیت ہے۔“

”مگر تم اسے حقیر شے کہتے ہو؟“

”ہاں۔“

”کیوں پروفیسر؟“

”اس لیے کہ یہ حقیر ہے۔ جو چیز انسان کی ذات پر حاوی ہو جائے وہ کوئی اچھی چیز نہیں ہوتی۔“

”لیکن پروفیسر اس کے بغیر ہوٹل کے ملازمین تمہیں دھکے دے کر نکال چکے ہیں۔“ جواب میں پروفیسر کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔

”یہ دھکے کھانا ضروری تھا۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ یہ میری تقدیر کا ایک حصہ ہے۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“

”آ جائے گی۔“ پروفیسر نے جواب دیا۔

”تو پھر کیا ارادہ ہے؟ یہاں سے نکلیں گے؟“

”ہاں...... ریلوے اسٹیشن کے بارے میں جانتے ہو؟“

”نہیں۔“

”میں تمہیں وہاں تک کا راستہ بتاؤں گا۔ پروفیسر بھی ان کی طرح مست مولا تھا۔ رات تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اس نے ان دونوں سے کہا۔

”اٹھو، چلو کافی آرام ہو گیا۔“

''کیا مطلب سو گئے نہیں پروفیسر؟''

''کیا فیصلہ کیا تھا ہم نے۔''

''یہاں سے نکل جانے کا۔''

''بارہ بجے ٹرین آئے گی۔ اس سے پہلے ہمیں اسٹیشن پہنچ جانا چاہیے۔ شرافت سے ٹکٹ خریدنا۔''

''لیکن کہاں کے؟''

''تمہارے ہاں اس جگہ کو وزیر آباد کہا جاتا ہے۔'' پروفیسر نے کہا۔

''وہاں چلو گے؟''

''ہاں۔''

''لیکن کیوں؟''

''دیکھو کچھ سوالات کے جوابات منزل پر پہنچنے کے بعد دیے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے مجھ سے بہت زیادہ سوالات مت کرو۔'' انہوں نے گردن ہلا دی تھی اور وہ ایک اچھا خاصا فاصلہ پیدل طے کر کے ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ پروفیسر کو یہاں کے بارے میں غالباً بہت زیادہ معلومات حاصل تھیں۔ اس نے وزیر آباد کے لیے ٹکٹ خریدے ٹھیک بارہ بج کر دس منٹ پر ایک ٹرین یہاں رکی اور وہ اس کے ایک کمپارٹمنٹ میں سوار ہو گئے تھوڑی دیر کے بعد ٹرین چل پڑی تھی۔

ٹرین میں بیٹھنے کے بعد پروفیسر تو اوپر کی برتھ پر لیٹ کر گہری نیند سو گیا تھا۔ ان دونوں کو البتہ نیند نہیں آ رہی تھی۔ نعیم نے کہا۔

''یار ایک بات بتاؤ۔''

''ہاں! پوچھو۔''

''کیا ہم اپنے آپ کو کسی قدر محفوظ نہیں سمجھ رہے؟''

''مطلب؟''

''یوں لگ رہا ہے جیسے بہت سی نگاہیں جو ہمارا تعاقب کر رہی تھیں اب ہم سے دور ہو گئی ہوں۔''

''کیا واقعی تم بھی ایسا ہی محسوس کر رہے ہو؟'' کامران نے حیرانی سے پوچھا۔

''اور تم؟''

''یقین کرو۔ بالکل یہی احساسات میرے ہیں۔''

''ویسے ایک بات کہوں کامران؟''

''ہاں! کہو۔''

''یہ پروفیسر واقعی ایک پراسرار شخصیت ہے۔''

''اس میں کوئی شک نہیں ہے یار! مجھے تو اس نے دیوانہ کر دیا ہے۔''

''نہیں کچھ ہے۔ کوئی ایسی بات ہے۔ جو اس شخص کے اندر ہے۔ یہ تو بڑی صلاحیتوں والا ہے۔ جس طرح اس نے بیٹھ کر ہمیں ہمارے بارے میں بتایا ہے۔ اگر دکان لگا کر بیٹھ جائے تو تم یہ دیکھو آج کل ان دکانوں سے زیادہ کسی چیز میں کوئی کاروبار نہیں ہے۔ ہر سڑک پر ایک عامل بابا بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ انسان کو دنیا بھر کی کہانیاں سناتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ کہانیاں لوگوں کے لیے پسندیدہ کہانیاں ہیں اور بے شمار حالات کے بھٹکے ہوئے ان کہانیوں کو جاننے کے لیے اچھا خاصا سرمایہ صرف کر دیتے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ چلو خیر دیکھتے ہیں۔ وزیر آباد پہنچ کر بڑے میاں کیا کرتے ہیں؟''

رات گئے کا سفر تھا۔ انہیں اندازہ نہیں تھا پھر رات کا آخری پہر ڈھل چکا تو پروفیسر نیچے اتر آیا۔ اس نے کہا۔

''اب جو اسٹاپ آئے گا وہ وزیر آباد کا ہوگا۔ اور اس وقت پانچ بج کر بیس منٹ ہو رہے ہوں گے۔''

''خواب میں دیکھ رہے تھے؟'' نعیم نے جواب دیا۔

''ہاں ایسا ہی سمجھ لو۔ اچھا ایک بات بتاؤ؟ تم لوگ جو زندگی گزارتے ہو مجھے اس کے بارے میں معلوم ہے۔ کیا اس زندگی میں تم نے اسلحہ وغیرہ کا استعمال بھی سیکھا ہے۔؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اسلحہ چلا سکتے ہو؟''

''اچھی طرح مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''یار ڈاکو ہو، چور ہو۔ ظاہر ہے قلم تو نہیں چلا رہے ہو گے۔ تمہارے کاروبار میں تو اسلحہ نہایت ضروری ہے۔''

''جب تم جانتے ہو تو یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟''

''ایسے ہی بس پوچھ لیا تھا میں نے۔'' اس نے کہا اور اس کے بعد انہوں نے ٹرین کی بریکوں کی آوازیں سنیں۔ پروفیسر سپارکن نیچے اترنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ وہ لوگ بھی اس کے ساتھ دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔ بلکہ سوتے سوتے اس کا ٹھیک وقت پر نیچے اتر آنا بھی اپنی جگہ ایک الگ حیثیت کا حامل تھا۔ لیکن بہت سی باتیں اب تک اتنی پراسرار تھیں۔ اس کی صحیح طور پر سمجھ ہی نہیں آتی تھیں۔

پلیٹ فارم پر جو بورڈ لگا ہوا تھا۔ وہ وزیر آباد کا ہی تھا اور انہوں نے اچھی طرح دیکھا تھا۔ بہر حال یہ سارا مسئلہ اپنی جگہ وزیر آباد کا ریلوے اسٹیشن بہت خوب صورت تھا۔ یہاں درختوں کے جھنڈ لگے ہوئے تھے اور چاروں طرف سے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ صبح کا فرحت بخش ماحول، سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ناشتا کر کے چلو گے یا باہر شہر میں کہیں کرو گے؟''

''بھوک لگ رہی ہے۔''

''وہی کم بخت تو ہے جو ہر وقت لگتی رہتی ہے۔''

''تم کسی ڈاکٹر کو اپنا پیٹ دکھاؤ۔ ہر وقت بھوک کا لگنا۔''

''چھوڑو...... چھوڑو...... طنز مت کرو۔ اچھا خیر کوئی بات نہیں ہے۔ ناشتا میں تمہیں کراؤں گا۔''

''تم؟''

''ہاں...... ہاں...... میں۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' کامران کے بجائے نعیم خان نے کہا۔ وہ ریلوے پلیٹ فارم سے نکل آیا۔ ٹکٹ چیکر کو انہوں نے ٹکٹ دیے تھے۔ باہر نکلنے کے بعد اس نے ایک تانگے والے سے کہا۔

''شام نگر جاؤ گے؟''

''جائیں گے صاحب۔''

''کتنے پیسے لو گے؟''

''بیس روپے۔''

''چلو آ جاؤ۔'' اس نے ان دونوں سے کہا اور وہ تانگے میں بیٹھ گئے۔ کامران نے تانگے میں بیٹھتے ہی پوچھا۔

''یہ شام نگر کیا ہے؟''

''وزیر آباد کا ایک نواحی علاقہ ہے۔ دیکھو گے تو دل خوش ہو جائے گا۔ تانگے کا سفر جاری ہو گیا اور وہ وزیر آباد کا علاقہ دیکھنے لگے۔ تانگہ پہلے چھوٹے بڑے مکانات کے درمیان سے گزرا تھا۔ یہاں تک کہ سڑکوں پر بھی دونوں طرف گھاس ہی بکھری ہوئی تھی۔ بعض جگہ پکی سڑکیں بنی ہوئی تھیں۔ حالانکہ ان پر تانگے وغیرہ چلتے تھے۔ لیکن کیا شفاف ماحول تھا۔ پتا نہیں اس کے لیے کیا طریقہ کار استعمال کیا گیا تھا۔ یا تو وزیر آباد کی انتظامیہ نے یہاں بہت ہی توجہ سے کام کیا تھا۔ یا پھر کوئی ایسی شخصیت یہاں رہتی تھی جس کی وجہ سے وزیر آباد بہت صاف ستھرا نظر آتا تھا۔

یہی کیفیت نواحی علاقوں کی تھی۔ نواحی علاقے کی سڑک بے شک پکی بنی ہوئی تھی لیکن اتنی اچھی سڑکوں کا تصور شہری علاقوں میں بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد پروفیسر کے اشارے پر تانگے والے نے تانگہ ایک ذیلی سڑک پر اتار دیا۔ یہ ذیلی سڑک بھی اپنی مثال آپ تھی۔ بہت ہی شان دار بنی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں طرف درختوں کے جھنڈ سر جوڑے کھڑے ہوئے تھے۔

''کیا عمدہ جگہ ہے؟ بالکل پراسرار کہانیوں جیسی۔'' نعیم نے کہا۔ کامران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کامران اب دن کے اجالے میں اس ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس وقت وہ لوگ حیران ہو گئے جب ذیلی سڑک ایک بڑے سے لوہے کے گیٹ پر جا کر ختم ہو گئی۔ یہ نواحی علاقے میں ایک نہایت خوب صورت مکان تھا۔ جو سرخ سلوں سے بنا ہوا تھا۔ پہاڑی پتھروں کو تراش کر بنایا ہوا یہ عظیم الشان مکان ایک قلعہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا عظیم الشان پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ لیکن بوڑھا پروفیسر سپارکن وہیں اتر گیا اور اس نے کامران کی طرف رخ کر کے کہا۔

''تانگے والے کو بیس روپے دے دو۔''

''ٹھیک ہے۔'' کامران نے تانگے والے کو بیس روپے دیے اور پروفیسر ان دونوں کو ساتھ آنے کا اشارہ کر کے اندر چل پڑا۔

''ارے بابا جی۔ کس کا گھر ہے کیوں جوتے پڑواؤ گے؟'' ہم تو رات کی تاریکی میں لوگوں کے

گھروں میں گھسا کرتے ہیں۔ یہ تم؟''

''آ جاؤ...... آ جاؤ۔ جوتے پڑیں گے تو مجھے آگے کر دینا۔'' اس نے کہا۔ وہ تینوں آگے بڑھتے رہے اور پھر جیسے ہی وہ مکان کے صدر دروازے تک پہنچے چار افراد باہر نکل آئے۔ یہ مقامی لوگ تھے۔ لیکن انہوں نے ادب سے جھک کر انہیں راستہ دیا اور دروازہ کھول دیا۔ نعیم نے حیران نگاہوں سے کامران کو دیکھا۔ بڑے دروازے سے وہ اندر داخل ہوئے تو محسوس ہوا جیسے الف لیلیٰ کے کسی طلسمی محل میں آ گئے ہوں۔ یہ ایک انتہائی عظیم الشان ڈرائنگ روم تھا۔ جس میں موٹا ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔

چاروں طرف ایرانی فرنیچر سجا ہوا تھا۔ چھت میں جگہ جگہ بڑے بڑے روشن فانوس لٹک رہے تھے۔ کیونکہ دروازہ بند کر دینے سے اس جگہ بالکل اندھیرا چھا جاتا ہوگا۔ اندر اتنی ٹھنڈی نرم اور خوش گوار فضا پھیلی ہوئی تھی کہ انسان دیکھے اور دیکھتا ہی رہ جائے۔ پروفیسر نے کہا۔

''اب تم دونوں کو آرام کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائے گا۔ آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے کہا اور اس کے بعد وہ بالکل سامنے بنی ہوئی چوڑی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ سیڑھیوں سے اوپر جا کر دونوں جانب راہ داری تھی اور اس راہ داری میں بے شمار کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ایک دروازہ کھولا اور بولا۔

''دونوں ایک کمرے میں رہنا چاہو تو ایک کمرے میں رہو اور الگ الگ کمرہ چاہو تو اپنی پسند کا کمرا منتخب کر لو۔ یہ سارے کمرے خالی ہیں۔''

''لل...... لیکن پروفیسر؟''

''اب جبکہ پروفیسر پر اعتماد کر کے یہاں تک آ ہی گئے ہو تو جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ اگر کسی بھی مشکل کا شکار ہوئے تو اس کی ذمہ داری میں قبول کروں گا۔ چلو جاؤ اب کمرے میں جاؤ۔ میں بھی تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' ان دونوں کے ہوش و حواس رخصت ہوئے جا رہے تھے۔ لیکن بہرحال وہ اندر داخل ہو گئے۔ بیڈ روم اتنا سجا ہوا تھا کہ ایک تخمینے کے مطابق اس کی سجاوٹ پر ہی لاکھوں روپیہ خرچ ہوا ہوگا۔ ڈبل مسہریاں پڑی ہوئی تھیں۔ کمرے کی وسعت بھی بے پناہ تھی۔ اٹیچڈ باتھ تھا۔ دیواروں پر حسین تصاویر آویزاں تھیں۔ ایک ایسا پراسرار ماحول تھا۔ جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ فرش پر بھی بے حد قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ بیٹھنے کے لیے صوفے پڑے ہوئے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس ماحول کو دیکھنے لگے۔ نعیم نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔

''کامران ذرا میرے بازو پر چٹکی تو بھرو۔''

''نہیں یار ہوش میں ہیں۔ لیکن میں ایک بات محسوس کر رہا ہوں۔''

''کیا؟''

''ابھی تھوڑی دیر کے بعد مکان کا مالک اندر آئے گا اور ہم سے پوچھے گا کہ ہم کون ہیں؟ اور اس کے بعد ہماری جو درگت بنے گی وہ دیکھنے کے قابل ہوگی۔''

''لگتا نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

"تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں نے اس کا استقبال کیا ہے وہ کتنے مودب نظر آ رہے تھے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔"

"تو پھر؟"

"اس کا کیا مطلب ہے؟ یہ تو میں خود بھی نہیں کہہ سکتا۔"

"ایک کام کرتے ہیں۔"

"کیا؟"

"اس وقت تک یہاں گزارتے ہیں جب تک کوئی مصیبت سر پر نہ آن پڑے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" اس کے بعد انہوں نے جوتے وغیرہ اتارے پھر نعیم نے کہا۔

"حلیہ اتنا خراب ہو رہا ہے کہ نہانے کو جی چاہتا ہے۔"

"جاؤ...... پھر نہا لو۔" کامران نے کہا۔

"تم نہیں نہاؤ گے؟"

"ابے کیا ایک ساتھ غسل خانے میں گھسے گا؟" کامران نے نعیم سے کہا۔

"حرج تو کوئی نہیں ہے تم شرماتے ہو تو ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں۔" وہ بولا۔ پھر دروازہ کھول کر اندر گھسا اور دوسرے ہی لمحے باہر نکل آیا۔

"کامران ذرا ادھر آؤ۔"

"کیوں خیریت کیا ہوا؟"

"آؤ تو سہی یار۔" اس نے کہا اور کامران جو ذہنی طور پر خود بھی منتشر تھا دروازے پر پہنچ گیا۔ اسے اندر کا ماحول دکھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو، ذرا دیکھو یہ غسل خانہ ہے؟" واقعی دیکھنے کی جگہ تھی۔ سنگ مرمر کی دیواریں فرش اور جدید ترین نہانے کے آلات جنہیں انہوں نے کبھی تصویروں میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ نعیم نے کہا۔

"بڑے میاں! پھانسی پر چڑھائے بغیر نہیں رہیں گے۔ پتا نہیں کس کے گھر میں گھس آئے ہیں۔"

"اب تم بتاؤ یار۔ سوچ لیا ہے جو ہوگا دیکھیں گے۔ خود سے نمٹیں گے۔" اور پھر نعیم نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کامران واپس آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک ملازم دو جوڑے لیے ہوئے اندر آیا۔ ساتھ میں چپلیں وغیرہ بھی تھیں۔" اس نے کہا۔

"پروفیسر صاحب! نے یہ لباس آپ دونوں کے لیے بھیجے ہیں۔ یہ آپ کے ساتھی کا ہے اور یہ آپ کا۔ یہ لباس پہن لو۔ غسل کر لو پہلے۔ شاید تمہارا ساتھی باتھ روم میں ہے۔"

"ہاں! مگر بھائی میری بات سنو۔" اس شخص نے دونوں ہاتھ جوڑے اور کہا۔

"بس! جناب ضرورت کی باتیں مجھ سے کیجیے۔ آپ یقینی طور پر یہاں اجنبی ہیں کچھ سوالات کرنا چاہتے ہوں گے۔ افسوس آپ کو ان کا جواب نہیں دے سکتا۔" اس نے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا پلٹ کر واپس نکل گیا۔ کامران نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی تھی۔ اس ملازم کے نقوش کچھ عجیب سے تھے

اور اگر کامران کا اندازہ غلط نہیں تھا تو اس کے نقوش اس بوڑھے سے ملتے جلتے تھے۔

بہر حال لباس کی انہیں سخت ضرورت تھی۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ لباس جو آیا ہے۔ یہ کامران اور نعیم کے بدن پر صحیح ہوگا بھی یا نہیں۔" کامران نے دروازہ کھٹکھٹایا تو نعیم بولا۔

"مزہ آ رہا ہے یار۔ تھوڑی دیر ذرا پانی کے ٹب میں پڑا رہنے دو۔" لگ رہا ہے کسی دریا میں تیر رہا ہوں اور یہ دریا ساکت ہو گیا ہے۔ ٹھنڈا میٹھا پانی واہ۔

"پانی والے! تمہارے کپڑے باہر ٹنگے ہوئے ہیں۔ ٹب سے نکل کر قدرتی لباس میں باہر مت آ جانا ہاتھ بڑھا کر کپڑے لے لینا۔"

"کپڑے؟"

"ہاں۔"

"کہاں سے آئے؟"

"بکواس بند۔" کامران نے کہا اور کپڑے وہیں دروازے کے پاس ایک اسٹینڈ پر ٹانگ کر واپس پلٹ پڑا۔ بہر حال حیرتوں کے پہاڑ جوان دونوں پر ٹوٹے تھے ان کی مثال ناممکن تھی۔ وہ کون ہے؟ اس طرح ذلتیں کیوں اٹھا رہا ہے۔ اگر واقعی اس شان دار حویلی کا مالک ہے تو ہوٹل کے لوگوں کا رویہ اس کے ساتھ اتنا برا کیوں تھا اور وہ کس طرح ڈیسٹ بن کر وہاں وقت گزار رہا تھا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ اور اس نے کامران کو جو اس کے ماضی کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ بھی ناقابل یقین تھا۔ خدا کی پناہ، خدا کی پناہ۔ کیا عجیب و غریب بات تھی۔ کافی دیر کے بعد نعیم خان باہر نکلا۔ اپنے لباس کو دیکھ کر ششدر تھا۔ کہنے لگا۔

"یار دیکھو! یہ لباس تو میرے بدن پر اس طرح فٹ آیا ہے۔ جیسے میرے لیے ہی سلوایا گیا ہو۔"

کامران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نعیم خان کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ کامران اپنے کپڑے اٹھائے باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ ایک جھلک پہلے ہی دیکھی اس باتھ روم کی۔ اب واقعی اسے دیکھا تو ہوش و حواس ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔

کیا کیا انوکھی چیزیں یہاں موجود تھیں۔ جدید زمانے سے بالکل ہم آہنگ۔ لباس ایک طرف ٹانگ کر کامران نے اپنا لباس اتارا اور باتھ روم کی ایک ایک شے کو دیکھتا رہا۔ ایک بٹن دبایا تو ایک شاور سے ہلکے دھوئیں کا غبار نکل پڑا۔ ایک لمحے کے لیے تو کامران گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ یہ دھواں تو بہت لطیف اور اپنے اندر پانی کی نمی لیے ہوئے ہے۔ اس کی لطافتیں اس کے بدن کے روئیں روئیں سے تھکن نچوڑنے لگیں اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے تمام مسامات کھلتے جا رہے ہوں۔

دھوئیں میں پہلی بار غسل کیا تھا۔ چند لمحوں کے اندر اندر دھواں پورے باتھ روم میں بھر گیا اور کامران درحقیقت اپنے آپ کو طلسمی دنیا کا شہزادہ دیکھنے لگا۔ بہت دیر تک اس دھوئیں میں رہا اور اس کے بعد بٹن بند کر دیا۔ تو دھواں بھی بند ہو گیا۔ پھر کامران پانی کے ٹب میں جا لیٹا۔ ہلکا گرم پانی مزید لطف دے گیا۔ نعیم خان اگر اتنی دیر تک غسل خانے سے باہر نہیں نکلا تھا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ غسل خانہ تھا ہی ایسی چیز۔ پھر بھی ان تمام چیزوں سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ ذہن پر وہی دباؤ رہا۔ کبھی کبھی

تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے یہ سب ایک پراسرار اور انوکھا خواب ہو۔ آخر بڈھا کیا چیز ہے؟ نعیم خان کئی بار دروازہ بجا چکا تھا۔ آخر کامران لباس پہنچ کر باہر نکل آیا تو نعیم خان نے کہا۔

''اس وقت دو شہزادے اپنی خواب گاہ میں زیر...... زبر زیر کیا کہیں گے یار۔''

''آگے خاموش رہیں گے۔'' کامران نے کہا۔

''بالکل نہیں رہیں گے۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ؟ کیا میں پاگل ہو جاؤں۔''

''تمہاری مرضی ہے۔ میں تو ہو چکا ہوں۔ تم نے وہ دھوئیں والا بٹن دبایا تھا؟''

''دبایا تھا مگر ڈر گیا تھا۔''

''کیوں؟''

''میں نے سوچا کہیں آگ نہ لگ جائے۔''

''تم نے اس دھوئیں میں پانی کی نمی محسوس نہیں کی؟''

''میں اپنی کھوپڑی میں حماقت کی نمی محسوس کر رہا ہوں۔ تمہاری کیا کیفیت ہے؟''

''بس کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔''

''کہیں یہ بوڑھا کوئی پراسرار روح تو نہیں ہے؟''

''روحیں آٹھ روٹیاں نہیں کھاتیں اور ہر وقت پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بھوک بھوک نہیں چیختی رہتیں۔ کیونکہ زندگی سے ان کا تعلق ختم ہو چکا ہوتا ہے اور انہیں بھوک نہیں لگتی۔''

''یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے بھی یہی سنا ہے مگر......''

''میرا خیال ہے اب چھوڑو۔ کچھ وقت کے لیے ذہن کو سکون دو۔'' اس نے کہا تھا کہ ناشتا۔ ابھی کامران کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ وہ ملازم پھر اندر داخل ہوا۔

''ناشتا تیار ہے جناب! عالی جاہ آپ کو طلب کرتے ہیں۔''

''عالی جاہ!؟'' ان دونوں نے بیک وقت منہ پھاڑ کر کہا۔

''آیئے اور پھر انہوں نے ایک بڑی سی ناشتے کی میز پر عالی جاہ کو دیکھا۔ اس وقت عالی جاہ واقعی عالی جاہ نظر آ رہے تھے۔ پروفیسر سپارکن ہی تھا جو کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور بہت شان دار چیزیں۔ نعیم خان ضرورت سے زیادہ بولنے کا عادی تھا کہنے لگا۔

''اب یہ بتاؤ چچا سپارکن کیا ان قابوں سے سانپ اور بچھو برآمد ہوں گے؟''

''تم جو کھانا چاہو گے بس ان کا تصور ذہن میں رکھنا۔'' قابوں کا ڈھکن اٹھاؤ گے تو وہی تمہیں ملے گا۔''

''کیا تم سامری کے پوتے ہو؟'' نعیم خان بولا۔

''سامری! یہ کیا چیز ہوتی ہے؟''

''ہوتی نہیں۔ ہوتا تھا۔''

''کون تھا؟''

''جادوگر۔''

''نہیں میں جادوگر نہیں ہوں۔''

''تو پھر یہ کیا چکر چلایا ہوا ہے تم نے۔''

''بس یوں سمجھو کہ دنیا کی بے ثباتی کا تجزیہ کر رہا ہوں۔ کس قدر ناپائیدار ہے۔ یہ دنیا بے مقصد خواہ مخواہ زندگی کا کوئی مقصد بنایا جاتا ہے اور اس کے بعد انسان اس مقصد کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ کبھی اس مقصد کو پالیتا ہے کبھی نہیں پاتا۔ نہیں پاتا تو دل میں دکھوں کے انبار لگا لیتا ہے۔ چلو ناشتا شروع کرو۔ ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' بہترین ناشتا کر کے وہ شکم سیر ہو گئے تھے۔'' کامران نے کہا۔

''پروفیسر اب تو آپ اپنے بارے میں بتا دیجیے۔''

''کیا بتادوں نام بتا دیا میں نے تمہیں کہ پروفیسر سپارکن ہے۔ یہ سب میری اپنی ملکیت ہے۔''

''تو پھر در بدر کیوں مارے مارے پھر رہے تھے؟''

''یہ بھی بتا چکا ہوں۔''

''تم اتنے ہی امیر آدمی ہو؟''

''نہیں میں بہت غریب آدمی ہوں۔ اتنا غریب کہ تم غربت کی انتہا کے بارے میں بھی اتنا نہیں سوچ سکتے۔''

''خدا تم جیسا غریب ہر ایک کو بنائے۔'' نعیم خان نے کہا اور دونوں ہاتھ منہ پر پھیر لیے۔ کامران کو ہنسی آ گئی تھی۔ لیکن بوڑھا سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''تمہاری عمریں ابھی اتنی ہیں کہ تم میرے الفاظ پر ہنسو گے۔ حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچے والی آنکھ عمر کے تجربے کے ساتھ ہوتی ہے۔ خیر آرام کرو۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے واپس آ گئے۔ لیکن ان کی حیرتیں عروج پر تھیں۔ بوڑھے کو جس عالم میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد تو مذاق میں بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ وہ اتنا دولت مند انسان ہوتا۔ اس حویلی کے اخراجات بھی اتنے ہوں گے کہ ایک دن کا خرچ ایک شخص کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہوگا۔

ملازمین، کھانے پینے کے انبار اور پھر وہ حیرت ناک تصور جس میں اس ہوٹل والے بیروں کے الفاظ شامل تھے۔ جس سے وہ بوڑھے کی ذلت کرتے تھے۔

بہرحال وہ دونوں شدید حیرت میں گم تھے۔ رات گزرنے کے بعد صبح ہوئی۔

اور صبح کا ناشتا بھی اتنا ہی شان دار تھا۔ پروفیسر سپارکن ناشتے پر ان کے ساتھ موجود تھا اور خاموشی سے ناشتا کر رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس نے اس وقت اپنے آپ کو سنوار لیا تھا۔ لباس بھی بہت عمدہ پہنے ہوئے تھا۔ بال وغیرہ بھی ترتیب سے درست کر لیے تھے۔ ناشتا اس نے انتہائی خاموشی سے کیا۔ پھر ان کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ تو کامران نے کہا۔

''ایک بات بتایئے پروفیسر۔''

''ہاں پوچھو۔''

''آپ ہمیں یہاں لے آئے ہیں اور بہ قول آپ کے یہ عمارت آپ کی ملکیت ہے۔ یہ بتایئے

ہم کتنے دن کے مہمان ہیں۔ یہاں عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ مہمان ایک دن دو دن یا تین کے ہوتے ہیں۔ کیا تیسرے دن ہمیں یہاں سے نکل جانا پڑے گا؟"

"یہ تم پر منحصر ہے۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟"

"جلد بازی نہ کرو۔ کہا جاتا ہے کہ ٹھنڈا کر کے کھانا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن جب بات اس قدر حیرت ناک ہو تو ٹھنڈا ہونے کا انتظار بڑا مشکل ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ اچھا خیر چلو کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں اس عمارت کے نظارے کراتا ہوں۔" پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور انہیں ساتھ لے کر چل پڑا۔ اس عمارت کے ہر گوشے کو دیکھ کر دل میں ایک نیا احساس ابھرتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ اس حویلی نما عمارت کی وسعتیں بے پناہ تھیں۔ وہ ایک جگہ پہنچ کر گہرائیوں میں اترنے لگا۔ وہاں سیڑھیاں تھیں اور ایک سیدھا سادہ راستہ تھا۔ پھر وہ تہ خانے میں پہنچ گئے۔ تہ خانے کی وسعتیں اس حویلی کی وسعتوں کا مظہر تھیں۔ یہاں نہ جانے کیا کچھ تھا۔

بوڑھے نے باقاعدہ ایک چابی سے تہ خانے کا دروازہ کھولا تھا اور چابی اسی دروازے میں لگی چھوڑ دی تھی۔ پھر وہ اندر داخل ہوا اور ایک بڑی سی الماری کے پاس پہنچ گیا الماری تقریباً دس فٹ اونچی اور چھ فٹ چوڑی تھی۔ اس نے اس کے پٹ کھولے تو رنگین روشنیوں کا طوفان امڈ پڑا۔ الماری کے مختلف خانوں میں مختلف چیزیں موجود تھیں۔ یہ رنگین روشنیاں سرخ، سبز، نیلی تھیں اور ان میں کچھ ایسی سفید روشنیاں بھی تھیں۔ لگتا تھا ننھے ننھے بے شمار بلب جل رہے ہوں۔

یہ انتہائی اعلیٰ درجے کے ہیرے تھے جنہیں دیکھ کر ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ نعیم خان کو تو جیسے غشی آ گئی ہو۔ بات یہیں تک نہیں تھی۔ سونے کے ڈھیلوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہ خالص سونا تھا جسے پگھلا کر کوئی باقاعدہ شکل نہیں دی گئی تھی۔ بلکہ بس ہموار اور ناہموار ٹکڑوں کی شکل میں۔ یہ الماری کے پورے خانے میں بھرا تھا۔ اس کے بعد سونے کے سکے، پھر نوٹوں کے انبار وہ اس عظیم الشان خزانے کی مالیت کا صحیح اندازہ تک نہیں لگا سکتے تھے۔ کیونکہ ان کے تصورات بھی کبھی اتنی دولت تک نہیں پہنچے تھے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ بوڑھا پروفیسر سپارکن خاموش تھا۔ اس کے بعد اس نے یہ الماری بند کر دی اور بولا۔

"آؤ" وہ سحر زدہ سے اس کے ساتھ چل پڑے اور کافی دیر تک وہ انہیں یہاں مختلف چیزیں دکھاتا رہا۔ بلاشبہ یہ الف لیلیٰ کی رات تھی اور ان کی کیفیت بالکل ان لوگوں کی سی تھی جو سحر میں گرفتار ہو گئے ہوں اور جن کے ہوش و حواس ان کا ساتھ نہ دے پا رہے ہوں۔ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ یہ سب کچھ دیکھتے رہے تھے اور اس وقت بھی چل رہے تھے بس! جب کہ ہوش و حواس بڑی عجیب کیفیتوں کا احساس دلا رہے تھے۔ وہ باہر آ گئے اور بوڑھا اس بار انہیں اپنی خواب گاہ میں لے گیا۔ اس کے چہرے پر ایک پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی اور اس نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ان کے تھکے ہوئے جسم یہی طلب کر رہے تھے کہ انہیں بیٹھنے کا موقع ملے۔ وہ تھکے تھکے انداز میں بیٹھ گئے۔ تو بوڑھے نے کہا۔

"میں تمہارے چہرے پر اضمحلال کی جھلکیاں دیکھ رہا ہوں۔"

"نہیں پروفیسر سپارکن۔ بات پھر وہی آ جاتی ہے کہ تم جس قدر دولت مند ہو اور یہ سب کچھ جو تم نے ہمیں دکھایا ہے ہماری عقل اسے تسلیم نہیں کر رہی اور ہم شدید حیران ہیں۔"

"تمہیں حیرانی کس بات کی ہے؟"

"یہ کہ تم اگر اتنے دولت مند ہو تو پھر وہ کیا تھا۔ جو ہوٹل کے سامنے ہمیں پیش آیا۔"

"وہ کچھ نہیں تھا میں نے کہا نا انسان اپنے آپ کو نہ جانے کیا کیا کچھ سمجھ لیتا ہے۔ جب کہ درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ صرف اس کی سوچ ہے کہ وہ نہ جانے اپنے آپ کو کیا کیا کچھ سمجھ لیتا ہے۔ مطلب سمجھ رہے ہو نا میرا۔ میں صرف تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ میرے پاس ہے اور یہ سب کچھ تمہارے پاس بھی ہو سکتا ہے۔ بولو کیا تم یہ سب حاصل کرنے کے خواہشمند ہو؟"

"دیکھو پروفیسر! ہم انسان ہیں اور انسان بہرطور انسان ہی ہوتا ہے۔ چاہے اپنے آپ کو کتنا ہی ماحول سے بے نیاز کرنے کی کوشش کیوں نہ کرے۔ دولت کا خواہش مند کون نہیں ہوتا ہم بھی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر تمہیں اس دولت کی پیش کش کی جائے تو تم اسے حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرو گے۔"

"بالکل! بھلا انکار کا کیا سوال۔" نعیم خان نے کہا۔

"لیکن میرے عزیز دوستو! یہ بات بھی تمہیں معلوم ہے کہ دولت حاصل کرنے کے لیے محنت کرنی ہوتی ہے۔"

"ہاں بے شک۔"

"میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ محنت ہی سے حاصل کیا ہے اور اگر تم اس کے خواہش مند ہو تو میں اس سب کے حصول کے لیے تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

"کیسے؟ کیا کرنا ہوگا ہمیں؟"

"ہاں، یہ تم سوال کر رہے ہو۔ کچھ کیے بغیر کچھ ملنا ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔"

"کہانیاں سنانے کے بجائے پروفیسر ہمیں وہ طریقہ بتاؤ جس سے ہم یہ سب کچھ حاصل کر سکیں۔"

"تمہیں اس کے لیے نیلی پاتال کا سفر کرنا ہوگا۔"

"کیا مطلب؟"

"نیلی پاتال ایک انوکھی سرزمین جو تمہاری اسی دنیا میں ہے۔ لیکن وہاں کی زندگی۔ تمہاری اس دنیا کی عام زندگی سے بہت مختلف ہے۔ وہاں کچھ اور ہے۔ جو تمہیں دیکھنا ہوگا کیا سمجھے؟"

"لیکن نیلی پاتال کے بارے میں تو ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم۔"

"اس کے بارے میں، میں تمہیں بتاؤں گا۔"

"کب بتاؤ گے؟"

"اس کا بھی ایک وقت متعین ہے۔"

"لیکن اگر ہم......" نعیم خان نے کہا۔ تو پروفیسر سپارکن نے ہاتھ اٹھا کر اسے بات کرنے سے روک دیا۔

"نہیں تم کچھ نہ کہو تو بہتر ہے چونکہ جو کچھ تم کہو گے بے مقصد ہوگا اور اس کی تکمیل نہیں ہو سکے گی۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں اس کے حصول کے لیے کیا کرنا ہے۔"

"میں نے یہی تو کہا تا پروفیسر سپارکن کہ وہ سب کچھ ہمیں کب بتاؤ گے؟"

"بہت جلد۔ بہت ہی جلد۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم انتظار کریں گے۔"

"ہاں انتظار زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ تمہیں تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ اب تم نے یہ سب کچھ دیکھ لیا۔ جاؤ آرام کرو اور اس تصور سے اپنے آپ کو خوشیاں بخشو کہ آنے والے وقت میں یہ سب کچھ تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے ہم اس کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کریں گے۔" اور اس کے بعد پروفیسر سپارکن بھی ان کے ساتھ ہی واپس آ گیا اور اس نے تھوڑی دیر کے بعد انہیں رخصت کر دیا تھا اور وہ دونوں گرتے پڑتے کمرے تک آ گئے اور ایک ہی بستر پر گر پڑے۔ بہت دیر تک ان کے ہوش و حواس ان کا ساتھ نہیں دے سکے تھے اور وہ پریشانی کا شکار رہے تھے۔ پھر نعیم خان نے کہا۔

"آہ...... کاش اس بات سے آنکھ نہ کھل جائے۔"

"کیا مطلب؟"

"یقین کرو۔ لگ رہا جیسے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یقین ہی نہیں آ رہا کہ یہ خواب نہیں ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔"

"لیکن ایک بات اور بھی کہنا چاہتا ہوں، کامران۔"

"کیا؟"

"اس سے پہلے کہ آنکھ کھل جائے کچھ لینا ضروری ہے۔"

"سمجھا نہیں۔"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"تفصیل تو بتاؤ۔"

"کیا ہم شریف لوگ ہیں؟"

"بالکل نہیں! کیوں شرافت کا مذاق اڑاتے ہو؟" کامران نے کہا۔

"واقعی ایسا ہی ہے۔ ہم نے اب تک زندگی میں جو کچھ کیا ہے۔ اس میں کوئی ایسا کام نہیں ہے۔ جس کا تعلق انسانیت سے ہو۔ جب ہم اتنے ہی برے لوگ ہیں تو بلاوجہ اچھا بننے کی کوشش کیوں کریں۔"

"اگر افسانہ نگاری کر رہے ہو تو الگ بات ہے اور اگر کچھ کہنا چاہتے ہو تو بتاؤ۔"

"اس دولت کا حصول جو ابھی ہماری دسترس میں ہے اور ہم صرف خواب نہیں دیکھ رہے۔"

"اس کا فیصلہ تو ہم کر چکے ہیں۔"

"نہیں ابھی اس کا صحیح فیصلہ نہیں کیا ہے ہم نے۔"

"صحیح فیصلے سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"نیلی پاتال یہ کیا چیز ہے؟"

"میری خالہ کا گھر نہیں ہے۔ تم نہیں جانتے اس کے بارے میں۔ تو تمہارا کیا خیال ہے میں جانتا ہوں کیا؟"

"نہیں۔ لیکن بوڑھا کہتا ہے کہ اس دولت کے حصول کے لیے ہمیں کسی نیلی پاتال کا سفر کرنا ہوگا۔"

"ہاں۔"

"وہ سفر کتنا وسیع ہے۔ کتنا طویل ہے۔ نیلی پاتال کہاں واقع ہے؟ نہ تمہیں معلوم ہے نہ مجھے۔ لیکن ایک بات ہم دونوں جانتے ہیں؟"

"یہ کہ اس حویلی کی گہرائیوں میں نیلی پاتال ضرور ہے۔"

"یعنی وہ جگہ جہاں ہم یہ سب کچھ دیکھ کر آئے ہیں۔"

"بالکل میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔"

"بوڑھے کو قتل کرنا ہوگا۔" نعیم نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ کامران پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ نعیم خان کی آنکھوں میں درندگی ابھر آئی تھی۔ اس نے کہا۔

"اور یہ قتل تم کرو گے۔"

"میں۔"

"ہاں۔"

"میں ہی کیوں؟"

"اس لیے کہ تم یقین کرو۔ میں نے ڈاکے ڈالے ہیں۔ میرا مطلب ہے۔ بعض اوقات دن کی روشنی میں بھی بچوں کو یرغمال بنا کر دولت حاصل کی ہے۔ لیکن قتل آج تک نہیں کیا تھا۔"

"اس بوڑھے کو تم قتل کرو گے۔ اسے قتل کرنے کے بعد ہم یہ دولت حاصل کر لیں گے۔"

"کیا یہ آسان ہوگا؟"

"دنیا کا کوئی کام آسان نہیں ہوتا۔ لیکن ایک چیز جو نگاہ کے سامنے ہے۔ اسے چھوڑ کر بوڑھے کی وجہ سے نیلی پاتال کا رخ کرنا ہمارے لیے ایک صحیح عمل نہیں ہوگا۔"

"وہ تو ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن۔"

"یار...... یا تو تم نے مجھے اب تک کی کہانیاں غلط سنائی ہیں یا پھر تم بزدل ہوتے جا رہے ہو۔"

"نہ میں نے کہانیاں غلط سنائی ہیں نہ میں بزدل ہو رہا ہوں لیکن ایک بات میں تم سے کہوں۔ پروفیسر سپارکن کو قتل کر کے مجھے دلی رنج ہوگا۔"

''ہم دونوں چوبیس گھنٹے تک مسلسل روتے رہیں گے۔ میرا وعدہ ہے میری ہچکیاں اور آنسو کسی طرح بند نہیں ہوں گے۔ لیکن اس کے بعد ہم جو زندگی گزاریں گے وہ ہمارے تصور سے بھی باہر ہوگی۔'' نعیم خان ہمیشہ کا مسخرہ تھا اور ایسی باتیں کرتا تھا کہ سنسنی خیز ماحول کے باوجود کامران کو ہنسی آ جاتی تھی۔ کامران نے کہا۔

''غور کرلو۔ نعیم خان۔''

''غور! جتنا کیا جاتا ہے نا انسان اتنا ہی بھٹک جاتا ہے۔ کوئی غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم فیصلہ کریں گے صرف فیصلہ۔''

''تمہارا مطلب ہے بوڑھے کا قتل۔''

''بے حد ضروری۔''

''کب؟''

''اب سے کچھ دیر کے بعد۔ اس وقت جب ہم یہ محسوس کریں گے کہ وہ سو چکا ہے۔''

''اور اس کے بعد۔''

''اس کے بعد اس کی لاش کو ٹھکانے لگا دیں گے۔ پھر ایک ایک کر کے ان ملازموں کا بھی خاتمہ کر دیں گے۔ جو یہاں موجود ہیں۔ یہاں باہر کے لوگ کم سے کم ہی آتے ہوں گے اور بہ ظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بوڑھا بھی باہر کے لوگوں سے بہت زیادہ قربت نہیں رکھتا۔ ایسے عالم میں ہم اسے باآسانی قتل کرنے کے بعد چھپا سکتے ہیں اور پھر ملازموں کو قتل کر کے کچھ عرصہ اس عمارت میں گزاریں گے اور اس کے بعد یہ سارا مال باہر کی دنیا میں منتقل کرلیں گے۔'' بہت دیر تک وہ منصوبہ بندی کرتے رہے اور اس کے بعد کامران نے کہا۔

''ایک بار پھر سوچ لو نعیم خان۔''

''دیکھو کامران۔'' تمام مفکر یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ سوچنے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے عمل کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔''

''تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے یہ کہ پروفیسر سپارکن کو قتل کر دیا جائے۔''

''سو فیصدی۔ اس کے علاوہ اور کوئی ترکیب ہی نہیں ہے۔ تم خود سوچو۔ کیا چیز ہے۔ ہمیں وہاں تک جانے کے لیے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہمیں مستقل طور پر پروفیسر سپارکن کا مرہون منت رہنا پڑے گا اور ہم اسی کے سہارے آگے قدم بڑھا سکیں گے۔ اس کے بجائے یہ جو کچھ ہمیں نظر آ رہا ہے۔ اگر اس میں سے کوئی آدھا حصہ بھی ہمیں مل جاتا ہے۔ تو بس سمجھ لو کہ ہمیں زندگی بھر کچھ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ لعنت بھیج دیں گے ہم جرم کی اس دنیا پر۔ اس ملک کے کسی شہر میں کوئی بڑے آدمی کی حیثیت اختیار کر کے زندگی گزاریں گے۔''

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ نعیم خان کا منصوبہ بہت اچھا اور کامران بھی اس سے منحرف نہیں تھا۔ بس ایک احساس دل میں بار بار ابھرتا تھا۔ وہ یہ کہ پروفیسر سپارکن اتنا برا آدمی نہیں ہے۔ ایک اچھا دوست اور ایک اچھا ساتھی ہے، دولت کے لیے وہ اسے قتل کر کے زیادہ خوشی محسوس نہیں کریں گے۔ تاہم وہ

جس کا نام نعیم خان تھا بہ ظاہر ایک بے ضرر چوہا نظر آتا تھا۔ لیکن درحقیقت بہت خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس بات پر مصر تھا کہ اب پروفیسر سپارکن کو قتل کر دیا جائے۔ پھر جب گھڑی نے پونے بارہ کا وقت دکھایا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئے نعیم خان نے کہا۔

''سب سے پہلے ہمیں ایک ایسے خنجر کی تلاش ہوگی۔ جس کی مدد سے ہم پروفیسر سپارکن کا سر اس کے دھڑ سے الگ کرسکیں۔''

''میں ہاتھوں سے بھی یہ کام کرسکتا ہوں۔''

''نہیں ہم رسک نہیں لیں گے۔'' ویسے میں نے ایسے خنجر دیکھے ہیں۔''

''کہاں؟''

''اس کمرے میں جو بائیں سمت ہے۔ یہ خنجر نوادرات میں سے ہیں۔ لیکن تم نے دیکھا ہوگا۔ میں نے چمڑے کے کیس سے ایک خنجر نکال کر اس کی دھار دیکھی تھی۔ اس وقت مقصد کوئی نہیں تھا۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ بہت جلد مجھے اس خنجر کی ضرورت پیش آئے گی۔''

''تم کمال کے انسان ہو نعیم خان۔''

''نہیں ہم اپنے آپ کو انسان تو نہیں کہہ سکتے۔ ہم نے انسانوں سے الگ ہٹ کر آج تک زندگی گزاری ہے؟ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ ہم انسانوں کی طرح جیتے رہے ہیں۔''

''دیکھو۔ نعیم خان میں نصیحتوں سے سخت گریزاں ہوں۔ نصیحت کرنے والے مجھے احمق لگتے ہیں اگر تم میرے اچھے دوست رہنا چاہتے ہو تو کبھی طنزیہ گفتگو نہ کرنا۔ میں تمہاری زندگی کے بارے میں کچھ نہیں کہتا، ہر شخص کو اپنے طور پر زندگی گزارنا پسند ہے۔ جہاں تک میری زندگی کا تعلق ہے۔ میں اپنے آج تک کے عمل سے مطمئن ہوں اور میرا ضمیر اس کے لیے بالکل داغدار نہیں ہے۔''

''آؤ۔'' نعیم خان نے کامران سے کہا اور وہ اس کمرے کی جانب چل پڑے جہاں سے ان کی اس نئی مجرمانہ زندگی کا آغاز ہونے والا تھا۔

دیواروں پر آویزاں ہتھیاروں کا شوق بھی عجیب ہوتا ہے، ویسے بھی اب تک انہوں نے پروفیسر سپارکن کی یہ جنتی مملکت دیکھی تھی، اس میں ساری ہی چیزیں نوادرات کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ہر چیز کی ایک اپنی قیمت ہوتی تھی، جو خزانہ اس نے ہمیں دکھایا تھا۔ وہ ناقابل یقین مالیت کا حامل تھا۔

''بہر حال وہاں سے انہوں نے اپنی پسند کا وہ خنجر اٹھایا اسے اس کے کیس سے نکال کر دیکھا، بے مثال چیز تھی۔ ایسی کہ ایک ہی وار میں گردن دور جا پڑے۔

وہ ایک بھرپور منصوبے کے تحت، پروفیسر سپارکن کے بیڈروم کی طرف چل پڑے اس وقت ان کے اندر شیطان کا بسیرا تھا اور دل میں سے انسانیت کا ہر تصور مٹ گیا تھا۔ پروفیسر سپارکن نے حالانکہ ان کے ساتھ اب تک بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ لیکن دولت کے حصول کی خواہش خزانوں کی چمک دمک، صدیوں سے انسان کی عقل چھینتی چلی آ رہی ہے۔ وہ بھی اس وقت اس بے عقلی کا شکار تھے، کمرے کے دروازے کو دبا کر دیکھا تو وہ کھل گیا۔

اندر پروفیسر سپارکن شب خوابی کے لباس میں ملبوس گہری نیند سو رہا تھا۔ آنے والے لمحات سے بے خبر۔ ہر خوف سے آزاد، انہوں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔'' اس کے سانسوں کی رفتار بتا رہی تھی کہ اس کی نیند خاصی گہری ہے۔ سوتے میں کسی کو قتل کرنا ایک وحشیانہ عمل تھا۔ لیکن اس سے زیادہ وحشیانہ تصور تو اس قتل کا ہی تھا، بھلا ایسے اقدار کی انہیں کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔ کامران کے جبڑے بھنچ گئے اس نے خنجر کو مٹھی میں دبایا اور آہستہ آہستہ پروفیسر سپارکن کی مسہری کی جانب چل پڑا۔

اس وقت کامران کے دل میں رحم کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ کامران نے خنجر کو تولا۔ پھر اس کے مضبوط ہاتھ پروفیسر سپارکن کی جانب بڑھے اور صرف پلک جھپکنے کی دیر تھی۔ خون کے ایک فوارے کے ساتھ پروفیسر سپارکن کی گردن اس کے شانے سے جدا ہو گئی۔ اس کا بدن ایسے تڑپا کہ گردن اچھل کر نیچے فرش پر جا پڑی۔ وہ پیچھے ہٹ گئے تھے۔ کامران نے نعیم خان کے چہرے پر خوف کے آثار دیکھے تھے۔ پروفیسر کا بدن تڑپ تڑپ کر نیچے آ رہا تھا۔ وہ بہت طاقت ور انسان تھا۔ وہ کمرے کے فرش، دیواروں اور مسہری کے بستر پر خون کا دریا موجزن دیکھتے رہے۔ پھر کامران نے وہ خنجر اسی کے بستر سے صاف کیا اور نعیم خان کو ساتھ آنے کا اشارہ کر کے باہر نکل آیا۔ نعیم خان کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ کامران نے اسے باہر نکلنے کے بعد مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا پھر کہا۔

''کیوں؟...... کیا ہو گیا؟''

''یار کامران! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تو ایک انتہائی سفاک آدمی ہے۔''

''میں نے تم سے کہا تھا نا نعیم خان، ہمیں ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھنا ہو گا۔''

''اور اس کے ساتھ ساتھ ہی تو بہت زیادہ تند مزاج ہے، اسی تندی کے ساتھ میرا جی چاہتا ہے کہ تجھے تندور کہنا شروع کر دیں کیسا لقب ہے یہ؟''

''لقب کو گولی مارو۔ ایسا کرتے ہیں اب اس خزانے کو حاصل کرنے کے لیے۔''

''ایک منٹ...... نعیم خان ایک منٹ......'' کامران نے کہا اور نعیم خان جو سوالیہ نگاہوں سے کامران کو دیکھ رہا تھا کامران نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

''نعیم خان میں نے تمہیں دوسرا مشورہ بھی دیا تھا۔''

''کیا؟'' مجھے یاد نہیں ہے۔''

''ہو سکتا ہے بات میرے ذہن میں ہی ہو، لیکن ایک بات بتاؤ۔'' ہم نے اب تک یہاں جتنا وقت گزارا ہے۔ اس میں ہم نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا ہے کہ پروفیسر سپارکن کے رابطے باہر کے کسی شخص سے بالکل نہیں ہیں۔ وہ ایک تقریباً تنہا آدمی ہے اس کے علاوہ اگر یہاں اور کوئی ہے تو ہم آسانی سے اسے بھی زندگی سے محروم کر دیں گے اور یہیں چھپا دیں گے۔ کیوں نہ اس وقت تک یہیں قیام کیا جائے، جب تک بیرونی دنیا سے ہمارے لیے کوئی کارروائی نہ ہو یا کوئی ایسی شخصیت ہمارے درمیان نہ آئے جسے ہم مشکل محسوس کریں البتہ ایک کام کر لیا جائے۔''

''کیا؟''

''یہ دولت اس جگہ سے منتقل کر کے کسی اور جگہ پوشیدہ کر دی جائے اور اس شاندار وسیع و عریض عمارت میں یہ کام مشکل نہیں ہے۔''

''گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم پروفیسر کی دولت کے ساتھ ساتھ اس مکان پر بھی قبضہ کر لیں۔ یہیں قیام کریں اور یہیں سے زندگی کی عیش حاصل کریں۔

''اور اس کے بعد پرسکون ذرائع اختیار کرتے ہوئے، اپنی پسند کی زندگی گزاریں۔'' نعیم خان مسرور لہجے میں بولا۔

''یہی میں کہنا چاہتا ہوں۔''

''خیال برا نہیں ہے۔ ہم ایسا کر سکتے ہیں۔''

''لیکن دوست ایک بات کہوں۔''

''ہاں...... بولو۔''

''عقلمند انسان وہی ہے جو سب سے پہلے اپنی شخصیت پر کوئی شک نہ آنے دے اور جو کام بھی کرے اس یقین کے ساتھ کرے کہ اس میں اسے شکست ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''مطلب کیا ہے؟''

''پروفیسر سپارکن کی لاش کو سب سے پہلے ٹھکانے لگانا ہے، اس کا بستر، اس کا خون آلود بدن، خون آلود قالین، دیواروں پر پڑے ہوئے خون کے چھینٹے، کیا یہ ساری چیزیں ایسی نہیں کہ کہیں اتفاق سے باہر کی دنیا کا کوئی شخص اندر آ جائے تو ہمارا حلیہ بگڑ جائے۔''

''مطلب یہ ہے کہ پہلے وہاں کی صفائی کر دی جائے۔''

''ٹھیک ہے سو فیصدی۔'' پروفیسر سپارکن کے جسم کو زمین کی گہرائیوں میں اتارنے کے لیے یا اسے نذر آتش کرنے کے لیے کسی مناسب جگہ کو تلاش کرو اور اس کے بعد سب سے پہلا کام یہ کر لو کہ خود دیواروں کو صاف کرو۔ فرش قالین وغیرہ۔''

''لعنت ہے۔'' کامران نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

''کاش اس بات کا بھی خیال رکھ لیا جاتا۔''

''تو کیا ہوتا؟''

''بے وقوف آدمی، قتل کرنے کے لیے ضروری تو نہیں ہے کہ ہر طرف وحشیانہ جدوجہد کا ماحول پیدا کر دیا جائے۔ وہ آسانی سے گردن دبا کر بھی ہلاک کیا جا سکتا تھا۔''

''اس وقت ہمارے ذہن میں یہ منصوبہ نہیں تھا نا۔''

''اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ ہر منصوبے کو ہر لحاظ سے مکمل ہونا چاہیے۔''

''اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔ آؤ پہلے ہم اپنے اس فرض سے نجات حاصل کر لیں۔''

''اور پھر انہوں نے ایک ایسی جگہ تلاش کر لی جہاں پروفیسر سپارکن کے جسم کو گہرائیوں میں اتار کر

روپوش کیا جاسکتا تھا۔ تمام انتظامات کر لیے گئے مکان میں تلاش کر کے ایک ایسا بڑا کپڑے کا تھیلا بھی تلاش کرلیا گیا۔ جس میں پروفیسر سپارکن کے سر اور دھڑ کو یکجا کر کے اس کا منہ باندھا جاسکتا تھا اور پھر اس کے تھیلے کو گہرائیوں میں دفن کیا جاسکتا تھا۔ اس کام سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ پروفیسر سپارکن کی خواب گاہ کی طرف چل پڑے۔

ذہن میں کوئی تصور نہیں تھا۔ کوئی احساس نہیں تھا۔ البتہ نعیم خان کے قدموں میں کامران نے ہلکی سے لرزش محسوس کی تھی اور اس کا خوب مذاق اڑایا تھا۔ نتیجے میں نعیم بری طرح چڑ گیا تھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ میں تم سے کسی طرح کمزور ہوں۔"

"نہیں تو مجھ سے ہر طرح طاقت ور ہے۔ بزدل چوہے۔ چل آ جا۔ فضول باتوں سے گریز کر ایک بات ذہن میں رکھنا تیری حیثیت، ایک مزدور سے زیادہ نہیں ہے۔ بوڑھے کی لاش تیرے ہی شانوں پر اس جگہ تک پہنچے گی۔"

"ارے واہ! تم نے اس کے وزن کا صحیح اندازہ نہیں لگایا کیا۔ کیا میں تنہا اسے اٹھا سکوں گا؟"

"جو کچھ بھی ہو، تیرا بھی کوئی مصرف ہونا چاہیے۔ ورنہ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ خنجر کے ایک ہی وار سے تیری بھی گردن تن سے جدا کردوں۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔ دوست۔"

"چل آگے بڑھ۔" کامران نے نعیم خان کو دھکا دیتے ہوئے کہا اور نعیم جھلائے ہوئے انداز میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ کامران سے کئی قدم آگے بڑھنے کے بعد اس نے دروازہ کھولا اور اندر ہوگیا۔ کامران اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، لیکن پھر اندر سے نعیم کی ایسی دہشت ناک چیخ ابھری کہ کامران کے کان جھنجھنا کر رہ گئے۔ ایک لمحہ انتظار کرنے کے بعد، کامران نے دو لمبی لمبی چھلانگیں لگائیں، کامران کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ نعیم خان کیوں چیخا ہے، کیا صرف خون کی وجہ سے یا کچھ اور ہوا ہے اس کے ساتھ۔

چنانچہ دوسرے لمحے کامران بھی اندر داخل ہوگیا اور پھر بلاشبہ کامران کی آنکھیں بھی ایک دم پتھرا گئی تھیں، سامنے والے صوفے پر پروفیسر سپارکن بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی گردن اس کے شانوں پر جڑی ہوئی تھی۔ ہاں خون کی وہ لکیر جو گردن کٹنے سے بن سکتی تھی۔ بنی ہوئی تھی اور اس پر خون کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا، جمے ہوئے خون کی ایک لکیر سی بن گئی تھی۔ یہ بھی سوچا جاسکتا تھا کہ نعیم خان یا کسی اور نے پروفیسر سپارکن کو صوفے پر بٹھا کر اس کی گردن اس کے شانوں پر رکھ دی ہو۔ لیکن اس کی متحرک آنکھیں، جھپکتی ہوئی پلکیں اور چہرے پر ایک عجیب سا انداز، درحقیقت کامران کی بھی جان کھینچے لے رہا تھا۔ نعیم خان پر تو لرزہ طاری ہو رہا تھا، ایک لمحے کے لیے کامران بھی سکتے کا شکار رہا، دوسرے لمحے کامران نے نعیم خان کے شانے پر ہاتھ مارا اور وہ چونک کر کامران کو دیکھنے لگا۔ پھر اس کے حلق سے آواز نکلی۔

"یہ...... یہ...... یہ۔"

"آؤ۔ بیٹھ جاؤ سامنے۔" آواز پروفیسر سپارکن کی ہی تھی، بولنے کا انداز بھی مشینی نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اپنی گردن پر جمے ہوئے خون کو صاف کرنے لگا۔" پھر اس نے یہ ہاتھ اپنے

کپڑوں سے پونچھ لیا، کامران کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں، فرش، دیواریں، بستر، سب کے سب خون آلود تھا۔ اتنا خون کسی انسان کے جسم سے بہ جائے۔ چاہے کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو، لیکن اس کے اندر یہ کیفیت نہیں بے دار ہوتی اور پھر کیسی احمقانہ سوچ تھی، کامران نے اپنے ہاتھ سے اس کی گردن علیحدہ کی تھی اور اس کے دھڑ کو نیچے گر کر تڑپتے ہوئے دیکھا تھا، پروفیسر سپارکن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے آہستہ سے کہا۔

"اور اب تمہیں یہ بتانے میں عار نہیں ہے کہ میرا نام سپارکو ہے۔" کامران نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ یہ کوئی ایسا انکشاف نہیں تھا جس پر حیرت ہوتی، کامران نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔

"تم زندہ ہو؟"

"یہ سوال حماقت کی حدود میں داخل کرتا ہے تمہیں۔ تمہارے نزدیک زندگی کیا ہے اور موت کیا ہے۔ تمہاری آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں اگر تم مجھے زندہ سمجھتے ہو تو زندہ سمجھو اور اگر زندہ نہیں سمجھتے تو اپنے عمل کو کامیاب سمجھو۔"

"لیکن پروفیسر سپارکن۔"

"ہاں۔ یہ کہہ سکتے ہو تم، پروفیسر سپارکن مرگیا۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" کامران نے کہا۔

"اب میں کہنا چاہتا نہیں ہوں۔ بلکہ کہہ رہا ہوں۔ تم نے دوستی کا وہ عمل ختم کردیا لیکن بے وقوفو! تم کیا سمجھتے تھے۔ کیا میں یہ بات نہیں جانتا تھا کہ تمہیں ایسا کرنا ہے۔ میں نے اسی لیے تمہیں اس دولت کی چمک دکھائی تھی کہ تم اپنی اصلیت پر آ جاؤ۔"

"مگر تم زندہ ہو؟"

"سپارکو کے پورے وجود کے ٹکڑے کر ڈالو، انہیں دنیا بھر میں منتشر کردو جب کہو گے وہ تمہیں آواز دے گا۔ ایسی اور اس شکل میں۔"

"مگر کیسے؟"

"یہی بتانے کے لیے تو میں تمہیں بیٹھنے کی دعوت دے رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ کامران نے نعیم خان کا ہاتھ پکڑا اور صوفے کی جانب بڑھ گیا۔ بدروحوں، جادوگروں اور اس طرح کے دوسرے کرداروں کا تذکرہ بارہا سنا تھا۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ سینہ خوف سے آزاد ہوگیا تھا۔ بھیانک سے بھیانک بات پر ڈر نہیں لگتا تھا اور یہی کامران کی خوبی تھی۔ البتہ نعیم خان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ دونوں بیٹھ گئے۔ بوڑھے کے چہرے پر ایک دلچسپ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"اور اب میں تم کو آسانی سے قتل کردوں گا۔ تمہارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس مکان کے مختلف گوشوں میں دفن کردوں گا۔ کیا سمجھے؟"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔ پروفیسر سپارکن۔"

"میں نے کہا نا پروفیسر سپارکن ایسا نہیں کرسکتا لیکن سپارکو ایسے کرسکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر تم ایسا کر کے دکھا دو۔" کامران نے کہا اور نعیم خان کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی جانب چھلانگ لگا دی، کامران دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔ نعیم خان میرا ساتھ دے رہا تھا وہ دونوں اب اس عمارت سے نکل جانا چاہتے تھے یہ طلسم خانہ انہیں بے حد خوف ناک محسوس ہو رہا تھا لیکن اس وقت ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے اس جگہ جہاں عمارت میں داخل ہونے کا دروازہ تھا۔ ایک دیوار دیکھی۔ خالی دیوار جس میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔

"کچھ غلط فہمی ہو گئی ادھر آؤ۔" کامران نے نعیم خان سے کہا اور وہ دوسری جانب بھاگنے لگے اور اس کے بعد در حقیقت ان کے حواس جواب دینے لگے۔" وہ عمارت کی ہر راہ داری سے گزرے، لیکن عمارت میں ایک بھی دروازہ نہیں تھا۔ کہیں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں سے باہر نکلا جا سکے۔ یہ ناقابل یقین بات تھی کہ ایک کٹا ہوا سر دوبارہ اپنے بدن سے جڑ جائے۔ نعیم خان کا تو پورا وجود پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف و دہشت کے آثار منجمد تھے۔

پھر وہ ایک راہ داری سے مڑے اور ایک بند دروازے کے پاس جا پہنچے۔ یہ آخری جگہ تھی۔ جہاں وہ باہر نکلنے کے لیے کوئی راستہ۔ کوئی کھڑکی یا روشن دان تلاش کرنا چاہتے تھے، باقی عمارت کے تو دروازے ہی ناپید ہو چکے تھے، انہوں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ لیکن سامنے کرسی پر جو شخصیت بیٹھی ہوئی تھی۔ پروفیسر سپارکن کی ہی تھی، وہ خاموشی سے بیٹھا انہیں گھور رہا تھا۔

"تھک گئے ہو تو سامنے بیٹھ جاؤ۔"

"تم ہمیں ہلاک نہیں کر سکو گے پروفیسر سپارکن۔"

"ہاں۔ تمہیں ہلاک کرنا بھی نہیں چاہتا کیونکہ مجھے تم سے ایک اہم کام لینا ہے۔ انتہائی اہم۔"

نعیم خان نے کامران کی طرف اور کامران نے نعیم خان کی طرف دیکھا پھر کامران نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"کیا کام لینا چاہتے ہو تم ہم سے۔"

"دیکھو! نا کوئی چالاکی تمہارے کام آئے گی نہ کوئی ذہانت، تم اس دولت کے خواہش مند تھے نا، یہ ساری دولت، یہ مکان، یہ سب کچھ میں تمہیں اپنی وصیت میں دے کر جا سکتا ہوں۔ تم اسے اپنی ہی ملکیت سمجھو۔ اگر تم مجھ سے اس کا مطالبہ کرتے تو ایک لمحے کے اندر اندر بات ختم ہو جاتی اور میں تم سے کہتا کہ یہ سب تمہارا ہے۔"

"لل...... لل...... لیکن کیوں؟"

"اس لیے کہ مجھے تم سے ایک کام لینا ہے اور وہ کام تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔"

"کیا کام ہے؟"

"وہی میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں، بیٹھو، زندگی میں کبھی نیلی پاتال کا نام سنا ہے۔"

"نیلی پاتال؟"

"ہاں...... تمہاری اس دنیا کی طرح، بس کچھ بدلے ہوئے اصولوں کے ساتھ۔"

"وہ کیا چیز ہے؟"

"ایک علاقہ، ایک مملکت، ایک داستان ہے، ایک قلم رو ہے جس کی کہانیاں تمہاری دنیا کی کہانیوں سے مختلف ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے پھر؟"

"تمہیں نیلی پاتال جانا ہے۔"

"کک...... کیوں؟"

"اس لیے کہ وہاں تمہیں ایک اہم کام سرانجام دینا ہے۔ وہاں کے روحانی پیشوا سپارکو کے لیے۔"

"یعنی تمہارے لیے؟"

"ہاں۔"

"تو پھر؟"

"وہ کام سرانجام دینے کے بعد جب تم واپسی کا سفر کرو گے۔ تو یہ سب کچھ تمہارا ہوگا۔"

"کام کیا ہے؟"

"نہیں کوئی شرط نہیں ہے۔ کوئی ایسی پابندی نہیں لگاؤ گے تم جو میرے لیے ناممکن ہو۔"

"لیکن نیلی پاتال کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔"

"سپارکو کا علم تمہیں اس کے بارے میں سب کچھ بتائے گا۔"

"آخر ہمیں وہاں کیا کرنا پڑے گا۔"

"میں نے کہا نا یہ سب کچھ تمہیں وہاں پہنچنے کے بعد ہی معلوم ہوگا اور سچ جانو اس پاتال میں داخل ہونے کے بعد تم اپنے آپ کو اس وادی سے اجنبی نہیں پاؤ گے۔"

"اور اگر ہم اس سے انکار کر دیں۔"

"تو پھر اسی عمارت کے دروازے کی دیواروں میں تمہاری زندگی کا اختتام ہو جائے گا اور اب صرف ایک فیصلہ کر کے تمہیں جواب دینا ہے۔ اگر میں اس کرسی سے اٹھ گیا تو سمجھ لو کہ تمہارے لیے دنیا ختم ہو جائے گی۔" کامران نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر آہستہ سے کہا۔

"ہمیں منظور ہے۔" نعیم خان نے متحیرانہ نگاہوں سے کامران کو دیکھا تو اس نے نعیم خان سے کہا۔

"تم اگر میری بات سے انحراف کرنا چاہتے ہو تو بے شک کرو۔ لیکن میں صورت حال کو سمجھ چکا ہو۔ نیلی پاتال کا مطلب ہے ایک ایسی سرزمین جہاں ہماری عقل و دانش ہمارا ساتھ نہیں دے گی۔"

"ایسا نہ کہو۔" تم نیلی پاتال میں بھیجے جاؤ گے۔ ان تمام ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ جو تمہیں وہاں پیش آ سکتی ہیں۔"

"بولو نعیم خان کیا کہتے ہو؟"

"بھلا میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ اس کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔"

"آؤ میں تمہیں نیلی پاتال لے چلوں۔" بوڑھا اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے نکلنے کے بعد اس

نے کچھ ایسی چیزیں مہیا کیں جو جنگ وجدل سے تعلق رکھتی تھیں۔ ریوالور، رائفل اور اس کے بعد کہنے لگا۔

''تمہیں گھوڑے نیلی پاتال کے داخلی دروازے پر ہی مل جائیں گے۔''

''اب ہمیں کہاں جانا ہے؟'' کامران نے پوچھا۔

''نیلی پاتال۔''

''میرا مطلب ہے کہ اس تک کے سفر کے لیے کیا ذریعہ اختیار کیا جائے گا۔''

''آؤ...... یہاں تمہیں کوئی دروازہ نہیں ملا نا؟''

''نہیں۔''

''یہاں صرف ایک ہی دروازہ ہے جو نیلی پاتال میں کھلتا ہے۔''

''کیا؟'' کامران نے چونک کر پوچھا۔

''کہاں ہے وہ دروازہ؟'' کامران نے سوال کیا اور بوڑھا ایک کمرے میں داخل ہو کر رک گیا۔ سامنے ہی ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی اس کمرے میں آ چکے تھے۔ لیکن یہ دروازہ یہاں موجود نہیں تھا۔ بوڑھے نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور بولا۔

''آؤ'' کامران اور نعیم خان ڈرتے ڈرتے اس دروازے سے باہر نکلے تھے اور اس کے بعد یوں لگا کہ جیسے ان کے وجود بے پناہ ہلکے ہلکے ہو گئے ہوں۔ ایک لمحے کے لیے تیز ہواؤں کا شور، بادلوں کی گڑگڑاہٹ، بجلی کی چمک ان کی پلکیں جھپک گئی تھیں اور اس کے بعد آنکھیں کھول کر جو منظر انہوں نے دیکھا۔ اسے دیکھ کر ان کے وجود خوف سے کپکپا اٹھے تھے۔

ایک ناقابل یقین وحشت، خوف کا ایک عجیب سا انداز کامران تو خیر پھر بھی بہتر حالت میں تھا۔ لیکن نعیم خان کی حالت زیادہ خراب معلوم ہوتی تھی، وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جن حالات سے وہ گزرے تھے انہیں مدِ نگاہ رکھتے ہوئے کسی بھی شخص کی ذہنی حالت خراب سے خراب تر ہو سکتی تھی۔ جو بیتی تھی ان پر وہ اتنی عجیب اور حیرت ناک تھی کہ اس کے بعد اچھے اچھے اپنے دل و دماغ نہیں سنبھال سکتے تھے۔

چنانچہ وہ پریشانی کے عالم میں کھڑے رہے، ان کی عقل یہ تسلیم نہیں کر پا رہی تھی کہ یہ سب کچھ کیا ہو گیا ایک ایسا گھر جس کے دروازے بند ہو گئے تھے اور اس کے بعد جس دروازے سے انہیں باہر لایا گیا وہ ایک ایسی جگہ کھلتا تھا۔ جسے دیکھ کر بس خوابوں کا گمان ہوتا تھا۔ پتا نہیں کونسا علاقہ ہے۔ بہر حال کامران نے خود ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا۔

''نعیم خان۔''

''ہوں؟'' نعیم خان نے کہا اور پھر اس طرح اچھلا جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو، پھر اس کے منہ سے بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

''یہ...... یہ کیا ہو گیا؟''

''خود کو سنبھالو نعیم خان۔''

''مم مم...... مگر کامران۔''

''ہاں بولو۔''

''کیا تم اپنے آپ کو ہوش و حواس میں محسوس کر رہے ہو؟''

''ہاں...... کیوں نہیں۔''

''کامران مگر میں......''

''نعیم خان میں تم سے پھر کہہ رہا ہوں خود کو سنبھالو۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہم ہیں کہاں؟ ارے باپ رے۔ دیکھو پیچھے تو کوئی مکان بھی نہیں ہے۔''

''سپارکو نے کیا کہا تھا۔''

''کب؟''

''اس نے اس جگہ کا کوئی نام بتایا تھا؟''

''ہاں۔''

''کیا نام بتایا تھا؟''

''نیلی پاتال۔''

''ہاں۔''

''مگر ہم یہاں؟''

''آ چکے ہیں۔''

''مم مگر واپسی...... واپسی کہاں سے ہوگی؟''

''یہ نہ تم جانتے ہو نہ میں۔''

''تت تو پھر؟''

''جیسے حالات ہیں ان کے تحت ہمیں گزارہ کرنا ہوگا۔''

''ارے باپ رے کس مصیبت میں پھنس گئے کامران؟''

''بزرگوں نے بہت ساری باتیں سچ کہی ہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''کہا ہے نا کہ لالچ کا انجام برا ہوتا ہے۔''

''ہاں یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس دولت کو دیکھ کر ہمارے منہ میں پانی بھر آیا تھا لیکن ہم بھول گئے تھے کہ جس شخص نے ہمیں یہ سب کچھ دکھایا ہے وہ بھی کوئی بے وقوف آدمی نہیں ہے بلکہ وہ انتہائی پراسرار شخصیت ہے اور...... اور......'' نعیم خان نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا پھر بولا۔

''مگر اب کیا ہوگا؟''

''دیکھو بزرگوں نے یہ بھی کہا ہے۔'' کہ جب حالات اپنی عقل سے باہر ہو جائیں تو پھر انسان کو وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔''

’’مگر پیارے بھائی یہاں اس ویرانے میں جہاں صرف ہم دونوں ہیں اور ہمارے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ وقت کا انتظار کر کے ہمیں کیا ملے گا؟‘‘

’’تو پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟‘‘

’’میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔‘‘

’’میں تمہیں یہی سمجھا رہا ہوں کہ اپنے آپ کو پریشان کرنا یا خوف زدہ ہونے کی بجائے یہ انتظار کرو کہ وقت ہمارے لیے آئندہ کون سے راستے متعین کرتا ہے۔‘‘

’’پھنس گئے بری طرح پھنس گئے۔‘‘

’’پھنس چکے ہونا۔‘‘

’’اب اس میں شک کہاں رہ جاتا ہے۔‘‘

’’تو بس اب حالات کا انتظار کرو۔‘‘ کامران نے کہا۔ اور نعیم خان خوف زدہ نگاہوں سے کامران کو دیکھنے لگا۔ پھر وہ اپنی جگہ بیٹھ گیا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ کامران کی نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دور دور تک ویرانے بکھرے ہوئے تھے۔ پہاڑی ٹیلے، درختوں کے جھنڈ، پرندے، جانوروں کی آوازیں، یہ ماحول تھا یہاں کا۔ کامران بھی وہیں بیٹھ گیا۔ اب کامران یہ تو نہیں کہہ رہا تھا کہ وہ انسان نہیں فولاد ہے ایک انسان ہونے کی حیثیت سے موجودہ حالات اسے بھی متاثر کر رہے تھے۔

لیکن بہرحال ان حالات سے نجات تو حاصل کرنی ہی تھی۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر انہیں ایک ہلکی سی گھڑگھڑاہٹ سنائی دی اور کامران کی نگاہیں سامنے کی طرف اٹھ گئیں، کوئی نہیں تھا۔ لیکن ان کے سامنے کچھ نم مٹی تھی اور اس نم مٹی پر کامران نے جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں حیرت سے اور پھیل گئیں کسی کے قدموں کے نشانات تھے جو اس نم مٹی پر بنتے چلے آ رہے تھے۔ جیسے کوئی نادیدہ انسان چل رہا ہو۔ کامران نے نعیم خان کو اس کی جانب جان بوجھ کر متوجہ نہیں کیا کیونکہ وہ بہرحال ایک خوف زدہ انسان تھا۔ لیکن قدموں کے یہ نشانات کامران دیکھ رہا تھا۔ جو ان سے چند فٹ کے فاصلے پر آ کر رک گئے تھے اور پھر پروفیسر سپار کی آواز ابھری۔

’’کامران، نعیم خان۔‘‘ نعیم خان تو بری طرح اچھل پڑا کامران چونکہ کسی غیر متوقع واقعہ کا منتظر تھا۔ چنانچہ اس کی یہ کیفیت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن نعیم خان پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

’’ابھی کسی نے مجھے پکارا تھا۔‘‘

’’تمہیں نہیں مجھے۔‘‘

’’ہاں...... کامران...... کامران۔ سوری کامران ہی کہا تھا اس نے کہا۔‘‘

’’ہاں آواز آئی تھی۔‘‘

’’مگر کس کی؟‘‘

’’پروفیسر سپارکن کی۔‘‘

’’میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے پروفیسر سپارکن نہیں بلکہ سپارکو کہو۔ ڈاکٹر سپارکو۔‘‘ آواز نے کہا اور نعیم خان ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

’’تم نے بھی سنی یہ آواز۔‘‘

’’خاموش رہو یار! بک بک کیے بغیر تمہارا گزارہ نہیں ہوتا۔‘‘ کامران نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

’’مگر یہ آواز؟‘‘

’’شٹ اپ پلیز شٹ اپ۔‘‘ کامران نے نعیم خان کو ڈانٹا۔ پھر کہا۔

’’ٹھیک ہے سپارکو، اب تم بتاؤ کیا چاہتے ہو تم؟‘‘

’’ہاں...... میں وہی بتا رہا تھا تمہیں۔ دیکھو میں ایک بار پھر تمہیں تفصیل بتاتا ہوں میرا تعلق اسی نیلی پاتال سے ہے۔ یہ پاتال تمہاری ہی زمین کا ایک حصہ ہے۔ اس پاتال میں جادوگروں کا راج ہے۔ ہر شخص تھوڑا بہت جادو جانتا ہے اور جادوگروں کی اس آبادی میں تمہاری طرح سائنسی ہتھیاروں کے بجائے جادو کی جنگ ہوتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لوگ آتشیں ہتھیاروں سے ناواقف ہیں۔ سب آتشیں ہتھیاروں کا استعمال جانتے ہیں۔ جادوگروں کے مختلف ٹولے ہوتے ہیں یہاں۔‘‘ ہر شخص اپنا اپنا سحر پھونک کر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اقتدار کی یہ جنگ تمہاری دنیا کی جنگ سے مختلف نہیں ہوتی۔ اس میں انسانوں کے ساتھ بدترین سلوک ہوتا ہے۔ خون بہتا ہے۔ گردنیں کٹتی ہیں۔‘‘ سب کچھ ہوتا ہے یہاں۔

نیلی پاتال کے لوگ ایک دوسرے سے واقف رہتے ہیں۔ میں ابھی اپنے بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں اس علاقے کا ایک ڈاکٹر ہوں۔ لیکن میرے خلاف سازشوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ اگر میں یہاں اس پاتال میں رہا تو یقینی طور پر کسی بڑی سازش کا شکار ہو جاؤں گا۔ میں نے اپنے طور پر سوچا اور پھر میں اس نئی دنیا میں داخل ہو گیا جو تمہاری دنیا ہے۔‘‘

سائنس کی دنیا ہے، سائنسی دماغوں کی دنیا ہے۔ کمپیوٹر کی اس دنیا میں، میں نے آ کر یہ سوچا کہ اگر میں اس دنیا کے چند افراد اپنی دنیا میں لے جاؤں تو یقینی طور پر نیلی پاتال کا سحر ان پر اثر انداز نہیں ہوگا اور میری مشکل حل ہو جائے گی اور اس کے لیے اتفاقیہ طور پر میری نظر تم دونوں پر پڑی اور میرے دل نے کہا کہ تم وہ دونوں ہو، جو نیلی پاتال کا سحر توڑ سکتے ہو۔ میری بات سن رہے ہو نا کامران۔‘‘

’’ہاں، میں سن رہا ہوں سپارکو۔‘‘

’’چنانچہ میں نے اس کے لیے انتظامات کیے اور تم سے رابطہ قائم کیا اس کے بعد تمہیں اس جگہ لے آیا اور پھر میں نے تمہیں وہ دکھایا۔ جو تم لوگوں کے لیے باعث دلچسپی ہوتا ہے۔ یعنی چمک دار ہیرے، سونے کے زیورات اور اسی طرح کی دوسری تمام چیزیں دوستو! نیلی پاتال میں ان چیزوں کی کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں ہے۔ یہ صرف تمہاری دنیا کا کھیل ہے۔ یہاں کی کہانیاں بالکل مختلف ہیں۔ یہاں کا ماحول بالکل مختلف ہے چنانچہ میں نے سوچا کہ اگر تم میرے مقصد کے لیے کارآمد ثابت ہوئے تو میں تمہیں یہ سب کچھ دے دوں گا اور تم سے اپنے لیے وہ حاصل کروں گا۔ جو میری عزت و توقیر میں اضافہ کرے اور میری آرزوؤں کی تکمیل کر دے، کیا سمجھے؟‘‘

''مگر تم ہو کہاں۔ سپارکو؟'' کامران کے بجائے نعیم خان نے پوچھا۔

''دیکھو یہ میں تمہیں بتا چکا ہوں، یہاں میرے مخالفوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔

چنانچہ میں روپوش ہو گیا ہوں۔ میں نادیدہ انسان بن گیا ہوں۔ تم ہی نہیں دوسرے لوگ بھی مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ میں تمہیں بھی ایک وقت کے لیے نادیدہ بنا سکتا ہوں۔ لیکن نادیدہ رہ کر تم ہمارے درمیان کام نہیں کر سکتے۔ تمہاری دنیا بالکل اجنبی ہے اور یہاں کا ماحول بالکل الگ۔'' میرے دوستو اب میں تمہیں بتا دوں کہ تم نے دولت کے حصول کے لیے اپنی دانست میں مجھے قتل کر دیا تھا لیکن تم نے دیکھا کہ میرے بدن کا جو حصہ تم نے میرے وجود سے جدا کر دیا تھا۔ وہ میں نے دوبارہ اسی جگہ قائم کر لیا۔

یہاں کے جادوگروں کے لیے یہ مشکل کام نہیں ہے۔ لیکن یہ صرف ان ساحروں کا کام ہے جو اپنے علم میں بے پناہ مہارت حاصل کر چکے ہوں۔ یہ ایک الگ بات ہے، میں تمہیں بتاؤں کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ اگر تم میرے مقصد کی تکمیل کر لو گے تو اطمینان رکھو وہ سب کچھ تمہارا ہوگا۔ جس کے لیے تم نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور آخری بات میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پروفیسر سپارکن یا یہاں کا سپارکو کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔

کامران نے محسوس کیا کہ نہ صرف اسے بلکہ نعیم خان کو بھی اس کی ان باتوں سے خاصا سکون نصیب ہوا تھا۔ نعیم خان کچھ نہ کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''مگر ہم تو یہاں کے بارے میں اور کچھ بھی نہیں جانتے۔''

''میں جو ہوں۔'' میں تمہیں یہاں کی اتنی تفصیل سمجھاؤں گا اور وہ کچھ دکھاؤں گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے پھر جب تم یہاں کے ماحول سے واقف ہو جاؤ گے تو میں تمہیں اپنا مقصد بتاؤں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ بولو میرے کام کے لیے تیار ہو اور اس کے بدلے میں تم جانتے ہو کہ میں تمہیں کیا پیش کش کر چکا ہوں۔''

''کیا اس کام میں ہماری جان جا سکتی ہے۔''

''زندگی کا کوئی بھی مرحلہ ایسا نہیں ہوتا جس میں زندگی کو خطرہ نہ ہو۔ اصل میں یہی تو انسان کا اصل کھیل ہے۔ وہ زندگی کے لیے کوشش اور جدوجہد کرتا ہے اور اس میں کامیابی اور ناکامی حاصل کرتا ہے۔ میرے دوست یہی میرا مقصد ہے اور تمہیں میرے لیے یہی کرنا ہے، لیکن ہوشیاری اوّل چیز ہے۔ تم جس دنیا کے انسان ہو۔ وہ سائنسی دنیا ہے اور سائنسی دنیا کے لوگ پراسرار دنیا سے کہیں زیادہ ذہین ہوتے ہیں اور یہ بات تمہاری دنیا میں رہ کر میں نے جان لی ہے۔''

''اگر تم یہ محسوس کرتے ہو۔ سپارکو کہ ہم تمہارے کام آ سکتے ہیں تو پھر یہ اطمینان رکھو کہ ہم تمہارے کام آنے کے لیے تیار ہیں۔''

''گڈ...... ویری گڈ...... میں بھی یہی چاہتا ہوں بس اور کچھ نہیں۔''

''اب یہ بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''نہیں ابھی تمہیں کچھ نہیں کرنا۔ دیکھو جب تمہیں خوراک کی ضرورت ہوگی تمہیں خوراک مل جائے گی۔ تمہاری ہر ضرورت تمہاری خواہش کے مطابق پوری ہو جائے گی، تمہیں یہاں کی زبان لمحوں میں سکھا دی جائے گی۔ کیونکہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نیلی پاتال کا ایک بہت بڑا ساحر ہوں اور سحر کے عمل سے اچھی طرح واقف ہوں جب تم اس ماحول میں اپنے آپ کو اجنبی نہیں محسوس کرو گے تو پھر تمہیں ہمارے لیے کام کرنا ہوگا۔ کیا سمجھے؟''

''مگر کیا نیلی پاتال کے رہنے والے دو اجنبی افراد کی آمد کو حیرت کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے؟''

''میں تمہیں ایک مقام دوں گا۔ ایک کردار دوں گا۔ یہ میری ذمہ داری ہے اور اس کردار میں بہت سے لوگ تمہارے شناسا ہوں گے۔ تمہارا تعلق ایک بستی سے ہوتا۔ لیکن اس بستی کے اصل کردار جن کی جگہ تمہیں دینی ہے۔ وہاں سے غائب کر دوں گا اور وہ اس وقت تک وہاں نہیں پہنچیں گے جب تک کہ تم اپنا کام سرانجام نہیں دے لو گے۔''

''اگر ایسی بات ہے سپارکو تو ہم تمہارے کام کی تکمیل کے لیے حاضر ہیں۔'' کامران نے کہا اور نعیم خان گہری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ سپارکو چند لمحات تک خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے تم سمجھ لو کہ سپارکو تمہاری خدمت کے لیے حاضر ہے۔''

''ابھی بتاؤ ہمیں کہاں سے کام کا آغاز کرنا ہوگا۔''

''آؤ۔ ابھی تمہیں نادیدہ حیثیت سے ایک ماحول سے روشناس کراؤں۔ اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا۔ خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، جو کچھ ہوگا۔ میرے سحر کے زیر اثر ہوگا اور تمہیں اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' اس کے بعد سپارکو کی آواز بند ہو گئی۔ وہ نہیں سمجھ پائے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ لیکن اچانک ہی چاروں طرف سے شور کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہواؤں کا کوئی بہت بڑا طوفان ان کی جانب لپک رہا ہے۔ نعیم خان گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر واقعی انہیں جھاڑ جھنکھاڑ اڑتے ہوئے نظر آئے گرد و غبار کا ایک طوفان عظیم ان کی جانب اڑا چلا آ رہا تھا۔ نعیم خان نے کامران کا بازو پکڑ لیا۔ تو کامران نے آہستہ سے اس سے کہا۔

''وہ ہمیں بتا چکا ہے کہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔'' نعیم خان یہ سن کر کسی حد تک مطمئن ہو گیا تھا اور پھر یہ طوفان ان کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ لیکن اچانک ہی ان کے قدم زمین سے اکھڑ گئے اور انہیں یوں لگا جیسے وہ فضا میں بلند ہوتے جا رہے ہوں ہواؤں کا یہ طوفان انہیں خاصی بلندی پر لے گیا۔ نعیم خان مضبوطی سے کامران کا بازو پکڑے ہوئے تھا۔ لیکن کامران نہ جانے کیوں مطمئن تھا اور اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ واقعی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

پھر گرد و غبار کا یہ طوفان اچانک ختم ہو گیا اور انہوں نے اپنے جسموں کو زمین پر گرتے ہوئے محسوس کیا۔'' نعیم خان کے حلق سے آواز نکل گئی تھی لیکن انتہائی نرم روی سے ان کے پیروں نے زمین چھو لی۔ وہ ایک بلند و بالا پہاڑی ٹیلے پر کھڑے ہوئے تھے اور ان کے سامنے کا ماحول بالکل صاف شفاف تھا۔ لیکن اس صاف شفاف ماحول میں بھی جو دردناک کیفیت بکھری ہوئی تھی۔ اس نے انہیں چند لمحوں کے لیے حواس باختہ کر دیا اور وہ بڑی پریشانی کا شکار ہو گئے۔

جگہ جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ جھونپڑیاں اور مکانات جلے ہوئے پڑے تھے کہیں کہیں انسانی

کراہیں اور چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ زمین خون سے لالہ زار ہو رہی تھی۔ جلتی ہوئی جھونپڑیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ گوشت جلنے کی چراند پھیلی ہوئی تھی۔ بس کبھی کوئی زندگی سے محروم ہونے والا نظر آ جاتا...... اور بس! آوارہ کتے اور بلی وغیرہ علاقہ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ جگہ جگہ کیڑوں کے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے۔ لیکن یہ تباہی و بربادی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ نعیم خان نے کامران کی طرف دیکھا اور بولا۔

"خدا کی قسم میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

"ہو جاؤ۔" کامران نے نعیم خان کو گھورتے ہوئے کہا۔

"یار تم عجیب آدمی ہو۔" یہ دیکھ رہے ہو۔ یہ سب کیا ہے؟ ذہن کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے صرف تم ہی انسان ہو۔ میں جانور ہوں۔"

"مگر پیارے بھائی......" نعیم خان نے بے بسی سے کہا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

جوں جوں یہ لوگ نیچے اتر رہے تھے۔ ماحول خوفناک سے خوفناک تر ہوتا جا رہا تھا۔ لاشیں، خون، آگ جا بجا بکھرا ہوا سامان، نعیم خان نے لرزتے ہوئے لہجے میں کامران کو آواز دی۔

"کامران......"

"ہوں۔" کامران نے حتی الامکان اپنے لہجے کو پرسکون رکھتے ہوئے کہا۔

"میری طبیعت الٹ رہی ہے۔"

"خود کو سنبھالو نعیم خان۔" کامران نے کہا اور آگے بڑھنے لگا۔ ماحول کا تاثر ایسا نہیں تھا کہ وہ خود کو لاتعلق رکھ سکتا۔ لیکن اس وقت اسے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ یہ سب کچھ جو اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ آخر کیا ہے؟ ایسا لگتا ہے جیسے زندگی بھر اس مصیبت سے چھٹکارا نہیں ملے گا۔ وہ مہذب دنیا کا ایک مہذب انسان بننا چاہتا تھا۔ وہ عام انسانوں کی طرح نوکری چاکری کر کے ایک گھر بنانا چاہتا تھا۔ جہاں اس کی بیوی ہو، بچے ہوں، لیکن وقت اسے دھکیل کر پھر ایسی ہی کسی دنیا میں پہنچا دیتا تھا۔ اس کا مطلب ہے۔ کہ قزل ثنائی کی پیشن گوئی ٹھیک تھی۔ یہ پراسرار حالات کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ اگر یہی سب کچھ تھا تو کرنل گل نواز کو چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ بہر حال اب یہ سمجھنے کی کوئی دقت نہیں تھی کہ وہ دونوں نیلی پاتال میں تھے۔

نعیم خان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

"میں ایک بات کہوں گا نعیم کہ خود کو سنبھالو؟"

"یہ سب کیا ہے کامران؟" وہ لرزتی آواز میں بولا۔

"نیلی پاتال۔" کامران نے کہا۔

"میرا بھی یہی اندازہ ہے نعیم خان نے کہا اور ہماری نظریں ان ٹیلوں کا جائزہ لینے لگیں۔ جن میں غار بکھرے ہوئے تھے۔ پھر اچانک ہی ہمیں ایک اور آواز سنائی دی۔ یہ کسی بچے کے رونے کی آواز تھی۔

نعیم خان نے بھی یہ آواز سن لی تھی اور ادھر ادھر گردن گھما رہا تھا۔ پھر وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں کہ یہ کسی بچے کے رونے کی آواز ہے۔"

"ہاں۔ تجھے قسم کھانے کی کیا ضرورت ہے۔" کامران نے نعیم خان سے کہا۔

"لیکن بچہ...... اوہو...... یہ شاید پہاڑی غار ہیں، خدا کی پناہ ہم نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا

لیکن جو کچھ اب دیکھ رہے ہیں اس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔"

"فضول باتوں سے گریز کرو۔"

"یار تندور تو سچ مچ ہر وقت جلتا رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کبھی تو انسانوں کی طرح بات بھی کیا کرو۔

میں تمہارا دوست ہوں۔"

"اے میرے پیارے دوست کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تو اپنی چونچ بند رکھے۔"

"چلو ٹھیک ہے تم اپنی چونچ کھلی رکھو۔ میرے اوپر کیا فرق پڑتا ہے۔" نعیم خان نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا اور کامران کو ہنسی آ گئی۔ حالانکہ جن مناظر سے وہ گزر رہے تھے انہیں دیکھنے کے بعد ہنسنے کی گنجائش بالکل نہیں تھی۔ ایک عجیب دھن دل میں پیدا ہو رہی تھی۔ پھر وہ اس بچے کی تلاش میں نگاہیں دوڑانے لگے اور انہیں بالکل نہیں پتہ چل سکا کہ وہ کہاں ہے؟ آواز بھی دوبارہ نہیں آئی تھی۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی اچانک ہلکی سی آواز دوبارہ ابھری۔

اور اس بار انہوں نے اس کی سمت کا اندازہ لگا لیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں یہ احساس بھی ہوا تھا کہ جیسے کسی نے بچے کا منہ ایک دم دبا لیا ہو۔ نعیم خان نے انگلی سے اشارہ کیا اور وہ آہستہ آہستہ اس پہاڑ کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ جس میں غار کا دہانہ تھا اور اس دہانے کے اندر یقینی طور پر کسی انسان کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ نعیم خان نے کہا۔

"اور انہیں یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی کہ یہاں جو کچھ موجود ہے یا جو کوئی بھی یہاں آ کر چھپا ہے۔ یہ ان میں سے ایک ہے۔ جن پر یوں ظلم کیا گیا ہے۔"

"اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی شخص مسلح ہو اور ہمیں دشمن کا آدمی سمجھ کر حملہ کر دے۔"

"یار کبھی کبھی تو اتنی شاندار بات کرتا ہے کہ مجھے تری عقل پر حیرت ہوتی ہے۔"

"نعیم خان میں نے تجھ سے کہا ہے کہ جب حالات سنسنی خیز ہوں تو زیادہ بکواس سے گریز کیا کر۔"

"تو نے مجھے اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ خیر یہی سہی۔ اب کیا کریں بول۔"

"ہم اسے آواز دیتے ہیں۔" اور پھر کامران نے زور سے چیخ کر کہا۔

"تم جو کوئی بھی ہو باہر نکل آؤ۔ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔"

لیکن کوئی آواز نہ ابھری۔ ویسے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا انہیں کہ اندر کوئی موجود ہے۔ ایک بار پھر میں نے وہی جملے دوبارہ دہرائے اور پھر اس کا جو رد عمل ہوا واقعی اگر وہ اس کے لیے پہلے سے تیار نہ ہوتے تو یقینی طور پر ہمیں شدید نقصان اٹھانا پڑتا۔ وہ ایک نوجوان عورت تھی مقامی لوگوں کا مخصوص لباس پہنے ہوئے۔ ہاتھ میں نیزہ لیے ہوئے ایک وحشیانہ چیخ کے ساتھ باہر نکلی تھی۔ اور ان کے رخ کا اندازہ لگاتے ہی نیزہ ہم پر کھینچ مارا تھا۔ کامران اور نعیم خان دونوں بیٹھ گئے تھے۔ اور نیزہ اوپر سے گزرتا ہوا دور چلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی

عورت ایک وحشیانہ چیخ کے ساتھ ان پر آ رہی تھی۔ کامران نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ اور وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ اپنا سر بری طرح کامران کے سینے پر مار رہی تھی۔ کامران نے اس کی کلائیوں کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہم دوست ہیں۔ دشمن نہیں ہیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اپنے آپ کو قابو میں کرو۔ اگر ہم تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں تو دوستوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش تم خود بھی نہ کرو۔ اور اگر تم نے بہت زیادہ جدوجہد کرنے کی کوشش کی تو میں گردن دبا کر تمہیں بے ہوش کر دوں گا۔ ہوش میں آؤ۔ ہوش میں آؤ۔'' کامران نے عورت کو پوری قوت سے جھنجھوڑا اور آہستہ آہستہ وہ اپنے حواس قائم کرتی چلی گئی۔ پھر اس نے انہیں دیکھا اور غالباً اسے یہ احساس ہوا کہ ان کے نقوش ان سے مختلف ہیں۔ ویسے کامران نے عورت کی صورت دیکھی تھی اور یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا تھا کہ یہ کون سے علاقے کے نقوش ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان نقوش میں دلکشی تھی۔ ویسے انہوں نے اس قبیلے میں کچھ لاشیں دیکھیں۔ ان کے چہرے صاف ستھرے رنگ گندمی اور نقوش تیکھے تھے۔ پتہ نہیں کون سی جگہ تھی یہ نیلی پاتال اور کہاں اس کا جائے وقوع تھا۔ عورت آہستہ آہستہ ہوش میں آتی چلی گئی۔ وہ انہیں گھورتی رہی اس کی آنکھوں میں خون لہرا رہا تھا۔ کامران نے آہستہ سے کہا۔

''اندر اور کوئی بھی ہے؟''

''کوئی نہیں ہے۔ تم...... تم کہتے ہو۔ تم ہمارے دشمن نہیں ہو۔ دوست ہو۔ تم ہمارے؟''

''ہاں، ہم تمہارے دوست ہیں اور ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہوں نے بستی میں یہ تباہی مچائی ہے۔''

''تو پھر تم کون ہو؟''

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ جو کوئی بھی ہیں کم از کم تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش تو نہیں کریں گے۔ کامران نے کہا اور آہستہ آہستہ وہ اعتدال پر آتی گئی۔ پھر اچانک اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں پھوٹ پڑیں اور اس نے بلکتے ہوئے کہا۔

''اندر میرا بچہ ہے۔ میرا بچہ ہے۔ باقی اور کوئی نہیں ہے اندر۔ صرف میں تھی اور میرا بچہ تھا، اور اب تو مجھے قتل کر دو یا مجھے پناہ دے دو۔ مجھے پناہ چاہیے۔''

''تم فکر نہ کرو۔ تم ہماری پناہ میں ہو۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اور نہ ہی تمہیں نقصان پہنچنے دیں گے۔'' بہ مشکل تمام عورت کو انہوں نے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ انہیں دشمن نہ سمجھے اور اس کے بعد وہ اس کے بچے کو بھی باہر لے آئے۔ نعیم خان نے اس خوبصورت بچے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم یہ بتاؤ بہن کہ کیا تمہارے پاس اس کے کھانے پینے کا بندوبست ہے؟'' بہن کے لفظ نے غالباً اسے مطمئن کر دیا تھا۔ ویسے یہ انسانی زبان عجیب چیز ہوتی ہے۔ زبان کی ایک جنبش انسان کو زندگی بخش دیتی اور دوسری جنبش اسے موت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ عورت نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''نہیں جو کچھ بھی ہے بستی میں رہ گیا ہے...... آہ...... میں...... ادھر...... ادھر نہیں جا سکتی۔ میں وہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتی میرا پورا گھر تباہ کر دیا گیا۔''

''تم یہاں رکو کامران میں وہاں سے کھانے پینے کی چیزیں تلاش کر کے لاتا ہوں۔'' کامران نے ہم خان کو اس بات سے نہیں روکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد نعیم خان تیزی سے دوڑتا ہوا آبادی کی طرف چلا گیا تھا۔ ویسے نعیم خان میں یہ خوبی تھی کہ اگر ہوش و حواس میں ہوتا تو ہر کام میں بڑی مستعدی دکھاتا اور اس وقت اس پر کوئی خوف بھی طاری نہیں ہوتا تھا۔ بہر حال تھوڑی دیر کے بعد نعیم خان واپس آیا تو کھانے پینے کے کافی اشیاء ساتھ لایا تھا۔ بھری پری بستی تھی۔

غالباً وہ جو کوئی بھی تھے۔ صرف اس بستی کو تاراج کرنا چاہتے تھے۔ لوٹ مار انہوں نے ممکن ہے کی ہو لیکن کوئی قیمتی چیز انہوں نے لوٹی تھی۔ غرضیکہ وہ لوگ اس عورت کو سمجھانے بجھانے میں کامیاب ہو گئے اس کا نام توشالہ تھا پھر توشالہ نے انہیں ایک دردناک کہانی سنائی۔ لیکن کہانی سنانے سے پہلے وہ اسے اس کے بچے کے ساتھ بہت دور لے آئے تھے۔ یہ بات انہوں نے اس کے بعد کی تھی۔ جب اس نے بتایا تھا کہ اس کا شوہر اس کا باپ، اور اس کے شوہر کا باپ سب قتل ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے گھر میں تنہا بچی ہے۔ باقی اور اس بستی میں اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ توشالہ کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے آگے آ گئے۔

اور پھر کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد انتہائی احتیاط کے ساتھ انہوں نے ایک پہاڑی غار میں قیام کیا تھا۔ نعیم خان نے عقلمندی سے کام لے کر کھانے پینے کی بے شمار اشیاء اپنے پاس جمع کر لی تھیں اور ایک بڑی گٹھڑی باندھ کر لے آیا تھا۔ اس گٹھڑی سے اس نے کھانے پینے کی اشیاء نکالیں اور بمشکل تمام انہوں نے عورت کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ کچھ کھا پی لے...... کھانے پینے سے اس کے بدن میں جان آ ئی۔ ادھر ان دونوں نے بھی کھا پی کر پیٹ کا دوزخ بھر لیا تھا۔ اس کے بعد توشالہ نے انہیں اپنی بقیہ کہانی سنائی تھی۔ اس وقت رات ہو چکی تھی اور تاحد نظر سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ ان کے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ کامران نے توشالہ سے پوچھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟ جن لوگوں نے بستی میں تباہی پھیلائی ہے۔ کیا ان کا یہاں قریب ہونا ممکن ہے۔''

''میں نہیں جانتی...... میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ آہ! میں کچھ بھی نہیں جانتی۔''

''ان لوگوں کو جانتی ہو جنہوں نے یہ تباہی پھیلائی ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا اس سے پہلے کہ وہ اپنی کہانی کا آغاز کرتی اچانک ہی اس کا بچہ رونے لگا تھا۔

''توشالہ تم پہلے اس بچے کا پیٹ بھرو۔''

اس نے آنسو بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ پھر کھانے پینے کے سامان سے اشیاء تلاش کر کے بچے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ کامران اور نعیم خان اب کافی حد تک پرسکون ہو گئے تھے۔ نعیم خان نے کہا۔

''جب تک توشالہ اپنے بچے کو فیڈ کرا لے تو ہم یہاں کچھ دور چلیں۔ ممکن ہے ہماری موجودگی اسے شرمسار کرے۔''

''ٹھیک ہے۔ آؤ۔'' کامران نے نعیم خان سے کہا اور وہ دونوں توشالہ کے پاس سے دور ہٹ

گئے اور ایک فاصلہ اختیار کر کے بیٹھ گئے۔ نعیم خان گہری سانس لے کر بولا۔

’’کامران، کیا ان تمام چیزوں کو دیکھ کر دل میں دولت کی ہوس کم نہیں ہو جاتی۔‘‘

کامران نے چونک کر نعیم خان کو دیکھا۔ زندگی میں ایسے مواقع بہت کم آئے تھے جب انہوں نے دنیا سے ہٹ کر اپنے بارے میں سوچا ہو۔ وحشت ناک زندگی گزارتے ہوئے بس یہی خیال دل میں رہتا تھا کہ کس نے کیا کیا ہے اور کسے کیا نقصان پہنچایا جائے۔ انسانیت کا کوئی نقصان اگر غلطی سے کر ڈالتے تھے تو اپنے آپ پر حیرت ہوتی تھی کہ یہ کیا کیا ہے۔ اس وقت بھی نعیم خان کے اس جملے نے ذہن میں نجانے کیسے کیسے خیالات پیدا کر دیے تھے۔ کامران اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کچھ لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے ہنس کر کہا۔

’’نعیم خان۔‘‘

’’میں...... تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔‘‘

’’یہ نیلی پاتال ہے۔‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’کیا یہ کوئی جادوئی پاتال ہے۔‘‘

’’بالکل۔‘‘

’’کیا اس وادی میں خیالات کا تبدیل ہو جانا ممکن ہے؟‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’ہم لوگوں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی گہری باتیں سوچی ہیں؟‘‘

’’کبھی نہیں۔‘‘ نعیم خان بھی مسکرا دیا۔

’’لیکن اب سوچ رہے ہیں۔‘‘

’’تو کیا تم بھی وہی سوچ رہے ہو جو میں؟‘‘ نعیم خان نے کہا۔

’’نہیں۔‘‘

’’پھر تم یہ کیسے کہتے ہو؟‘‘

’’تمہاری زبانی سن کر۔‘‘

’’نہیں میری بات کا جواب دو۔‘‘

’’کیا جواب دوں؟‘‘

’’یہ جلی ہوئی بستی ہے۔ بے گور و کفن پڑی ہوئی لاشیں۔ یہ معصوم بچہ جس کی ماں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ یہ دونوں اسی غار میں دم توڑ دیتے اب ان کا کوئی بھی نہیں ہے۔ اس دنیا میں، کیا زندگی اتنی ہی معمولی چیز ہے۔‘‘

’’وہ تو ہے۔‘‘

’’تم نے پہلے کبھی اس بارے میں سوچا تھا؟‘‘

’’بہت کم۔‘‘

’’یعنی سوچا تھا۔‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’کیا سوچا تھا مجھے بتاؤ؟‘‘

’’یہ نعیم خان کہ ہم جو کام کر رہے ہیں اس میں عیش و عشرت بھی ہے۔ حکمرانی بھی ہے کسی کی بات سننے کو نہیں ملے گی۔ کسی کے زیر تحت کام نہیں کریں گے لیکن کام کرتے ہوئے بندوق کی ایک گولی ایک لمحے کے اندر اندر زندگی کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ کیا تم نے کبھی نہیں سوچا؟‘‘

’’سوچا تھا۔‘‘

’’زندگی کی ناپائیداری کے بارے میں تو بات یہاں آ کر ختم ہو جاتی ہے۔‘‘

’’بالکل۔‘‘

’’لیکن انسان کو عمل کے دو راستے اپنانے پڑتے ہیں۔

’’وہ کون سے۔‘‘

’’ایک نیگیٹو، ایک پوزیٹو...... نیگیٹو راستے میں خطرے ہیں اور پوزیٹو میں بھی خطرات ہیں۔ نیگیٹو راستے میں یہ خطرات ہیں کہ پولیس سے مقابلہ ہو جائے کسی کو قتل کرتے ہوئے خود بھی قتل ہو جاؤ یا کوئی اور حادثہ پیش آ جائے...... لیکن پوزیٹو راستے بھی ان خطرات سے خالی نہیں ہیں۔‘‘

’’وہ کیسے؟‘‘

’’بیماریاں، بھوک، بے روزگاری، افلاس، تنگ دستی، یہ تمام چیزیں مل کر زندگی کو کھا جاتی ہیں۔ بس بہت مشکل ہے فیصلہ کرنا۔‘‘

’’ٹھیک کہتے ہو۔‘‘ نعیم خان نے گردن ہلائی۔

’’تم کیا کہہ رہے تھے۔؟‘‘

’’میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم دولت کے حصول کے لیے سرگرداں رہے ہیں۔‘‘

’’نعیم خان میں تمہیں دل کی بات بتاتا ہوں...... دولت میرے لیے کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہی ہے۔‘‘

’’کیا واقعی؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’لیکن خواہش مند تو ضرور ہو گے۔ کہ تمہارے پاس دولت ہو، عیش و عشرت کی زندگی بسر کرو تم۔‘‘

’’ہاں، اس سے کس احمق کو انکار ہے۔‘‘

’’میرا بھی بس اتنا ہی مطلب ہے۔ لیکن یہاں آنے کے بعد نجانے کیوں دل سے یہ احساس مٹتا جا رہا ہے۔‘‘ کامران خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد نعیم خان نے کہا۔

’’لیکن اس کے باوجود تم دیکھو کہ یہ ایک نئی دنیا ہے ہماری دنیا سے بالکل مختلف پتہ نہیں بوڑھا سپارکو کیا چاہتا ہے اور یہاں بھیجنے سے اس کا کیا مقصد ہے۔‘‘ اس سوال کا جواب کامران کے پاس بھی نہیں

تھا۔ چنانچہ اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ تھوڑی دیر کے بعد عورت کی آواز سنائی دی۔

''بھائی بچہ سوچکا ہے اگر تم چاہو تو میں تمہارے پاس آجاؤں......'' نعیم خان نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہم آرہے ہیں تمہارے پاس۔'' کامران نے نعیم خان کے بگڑے ہوئے موڈ کو دیکھا تو حیرت سے کہا۔

''کیا ہوگیا نعیم خان؟''

''اس نے ایک بہت بڑا لفظ استعمال کیا ہے۔''

''عورت نے؟''

''ہاں۔''

''کیا؟''

''بھائی کہا ہے اس نے ہمیں۔''

''تو پھر؟'' کامران نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں، شاید میرے اور تمہارے ذہن میں یہی فرق ہے کامران، شاید میں اس پوری دنیا کا اتنا بڑا انسان نہیں بن سکا ہوں۔ جب کوئی کسی کو بھائی کہہ دیتا ہے۔ خاص طور سے ایک بے بس اور مجبور لڑکی، تو بھائی کے شانوں پر بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوجاتی ہیں اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے بجائے ان سے گریز بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ بہت ہی مشکل۔''

کامران نے حیرت سے نعیم خان کو دیکھا بہرحال اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کہ ہر شخصیت کے دو روپ ہوتے ہیں۔ لیکن اس وقت وہ اس پر غور کرنے کے لیے نہیں آئے تھے۔ وہ عورت کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے کہا۔

''بچہ سوچکا تھا۔ میں نے سوچا تم لوگ انتظار کررہے ہوگے۔''

''تم ہمیں بتاؤ یہ سارا قصہ کیا ہے۔ کیا ہوا ہے یہ؟''

''میں زیادہ تفصیل تو کیا بتاؤں۔ بہت سے معاملات ایسے ہیں جن کا براہ راست مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ صرف سنی سنائی باتیں ہیں اور انہی سنی سنائی باتوں کو میں تمہارے سامنے دہرا سکتی ہوں۔''

''ہاں...... ہاں جو کچھ بھی ہے ہمیں کام کی بات بتاؤ۔ کام کی بات بتاؤ۔'' نعیم نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

لڑکی کی آنکھیں سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔'' اس نے کہا۔

''ہاں...... بات بہت پرانی ہے۔ بہت پرانی ہے جس بستی کو تم نے دیکھا ہے۔ کیا تم اس کا نام جانتے ہو؟''

''نہیں؟''

''اس کا نام کمالیہ تھا۔''

''ٹھیک ہے آگے بڑھو۔''

''کمالیہ پر ایک شخص حکومت کرتا تھا۔ اس کا نام شمونا تھا...... شمونا کے خلاف بغاوت ہوگئی اور شمونا اور اس کے اہل خاندان کو قتل کردیا گیا۔ صرف شمونا کا بیٹا شمبا زندہ بچا وہ کچھ افراد کو ساتھ لے کر پہاڑیوں میں گم ہوگیا اور اس کے بعد بستی کمالیہ پر فرعونا کی حکومت ہوگئی۔

فرعونا، فطرتاً زراعت پیشہ تھا اور اسے صرف اس بات پر غصہ آتا تھا کہ شمونا نے بستی کمالیہ کو فاقہ کشی پر مجبور کردیا ہے۔ وہ نہ خود کچھ کرتا ہے اور نہ کسی اور کو کچھ کرنے دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے کام شروع کردیا اور کمالیہ کے نواحی علاقے میں جہاں پتھریلی اور بنجر زمین پڑی ہوئی تھی۔ فرعونا نے تمام نوجوانوں، بوڑھوں اور بچوں کو زمین کی کھدائی میں مصروف کردیا۔ پھر اس زمین میں دور دراز سے لائی ہوئی مٹی شامل کرکے اسے قابل کاشت بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمالیہ کے چاروں طرف کا علاقہ سرسبز ہوگیا۔'' یہاں باغات لگائے گئے اور اس علاقے پر ایسا نکھار آیا کہ ہر طرف سبزہ لہرانے لگا۔ کھیت، باغات، ترکاریوں کے بڑے بڑے قطعے، یہ بستی قدرت کی دولت سے مالا مال ہوگئی۔

ہر گھر میں خوراک کی قلت ختم ہوگئی مویشیوں کے لیے چراگاہیں تیار ہوگئیں اور دودھ اور اون کی ضرورت بھی پوری ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرعونا کی حکومت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی اور کمالیہ کے محنت کش اپنی محنت کا پھل کھانے لگے۔ ہر شخص خوش تھا۔ ہر ایک کو سہولتیں حاصل تھیں اور سب فرعونا کے گن گانے لگے۔

لیکن فرعونا نے یہ بات نظر انداز کردی کہ شمبا اس کے قبضے میں نہیں آسکا ہے۔ وہ نکل گیا ہے۔ چونکہ فرعونا یہاں کا ہردل عزیز سردار تھا اسلیے ایک رات اسے اطلاع ملی کہ شمونا کا بیٹا...... شمبا، راتوں، رات اس پر شب خون مار کر اس کے اہل خاندان کا قتل کردینا چاہتا ہے۔ اور اپنے خاندان کا بدلہ لینے کا خواہش مند ہے۔ فرعونا جہاں زراعت پیشہ تھا۔ وہیں تمام تر معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے ہوشیاری بھی حاصل کرلی تھی۔

سرداری کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ چنانچہ رات کو جب پوری بستی سوئی تھی، تین گھوڑے بستی کمالیہ کی سرحدوں سے اندر داخل ہوئے سوتی ہوئی بستی پر حملہ کرکے شمبا فرعونا کو قتل کردینا چاہتا تھا۔ اور اس کے بعد کمالیہ پر اپنی سرداری کا اعلان، لیکن سرحد سے کافی دور بڑے پہاڑی ٹیلوں کے درے میں فرعونا کے پوشیدہ افراد نے ان کا استقبال کیا اور ان کی بندوقیں جو چلنے بھی نہیں پائی تھیں ان سے جدا ہوگئیں، آٹھ افراد گرفتار ہوئے۔ باقی بائیس افراد وہیں ڈھیر ہوگئے، گرفتار ہونے والوں میں شمبا بھی تھا۔ بندوقوں کی آواز نے سوئی ہوئی بستی کو جگا دیا تھا اور سب حیران تھے کہ سردار فرعونا کی آواز ابھری۔

''بستی والو! یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔ اپنے گھر روشن کرلو۔ سونے والے سب کچھ کھودیتے ہیں۔ یہ جاگنے کے لمحات ہیں اور پھر بستی والے جاگ گئے اور صبح کے سورج نے زنجیروں میں جکڑے ہوئے شمبا اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا۔ شمبا کی گردن جھکی ہوئی تھی جس وقت اس کا باپ قتل ہوا تھا۔ اور وہ فرار ہوا تھا۔ تو شمبا کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ اب وہ ایک بھرپور نوجوان تھا۔ اور اس کے انگ انگ سے جوانی ٹپکتی تھی۔ بڑے چوک میں کھڑا ہوا تھا اور سردار فرعونا نے ساری بستی کو جمع ہونے کا حکم دیا تھا جب پوری بستی جمع ہوگئی تو سردار فرعونا نے بستی کے لوگوں کو طلب کیا اور ان سے کہا۔

''ایک مقامی شخصیت نے۔ جب کہ مقامی وہ بھی نہیں ہے۔ آؤ تفصیل سے بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔ تمہیں جہاز پر واپس جانے کی جلدی تو نہیں ہے۔''

''نہیں۔''

''تب پھر آؤ...... واقعی بہت سی ایسی باتیں جمع ہوگئی ہیں۔ جو ہمارے درمیان ہونا چاہیے۔'' قزل ثنائی نے کہا۔'' اس شخص سے کامران کی کوئی زیادہ واقفیت نہیں رہی تھی۔ بس کرنل گل نواز کے مہمان کی حیثیت سے اس نے بھی اس کی پذیرائی کی تھی۔ جبکہ کرنل گل نواز نے خود کامران کو اختیار اور اہمیت دے ڈالی تھی۔

''اچھا اب میری ڈیوٹی شروع ہوتی ہے۔ یہ بتایئے مسٹر کامران! کھانا کھائیں گے آپ؟''

''نہیں کھانا۔''

''وقت تو ہو چکا ہے۔''

''بھئی پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب وقت ہو چکا ہے تو کھانے کا بندوبست کیجیے۔'' قزل ثنائی نے اپنی بیوی سے کہا اور شعورہ وہاں سے چلی گئی۔ کامران کو ان لوگوں کی یہاں اس بے تکلفی سے رہائش پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے قزل ثنائی کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بہت خوب صورت ڈرائنگ روم ہے۔ ویسے مسٹر قزل ثنائی! اصولی طور پر مجھے آپ سے اس قدر بے تکلف نہیں ہونا چاہیے۔''

''ایک منٹ ایک منٹ، میں نے بعد میں تمہارے بارے میں خاصی معلومات جمع کی تھیں۔ کرنل گل نواز ہی نے مجھے تمہاری پوری شخصیت کے بارے میں بتایا تھا اور کہا تھا کہ تم کوئی معمولی انسان نہیں ہو۔ بلکہ تمہارا اپنا ایک ماضی ہے اور بس اتفاقات کے ہاتھوں سفر کرتے ہوئے کرنل تک پہنچے ہو۔ اصولی طور پر مسٹر کامران کرنل کو کچھ اور بھی فیصلے کرنے چاہیے تھے۔ لیکن بہرحال اب یہ ان کا معاملہ ہے۔''

''ایک بات بتایئے مسٹر قزل ثنائی۔''

''ہاں...... ہاں پوچھو۔''

''کیا کرنل بھی ہیکل میں موجود ہیں۔''

''ارے نہیں بھئی بالکل نہیں۔ میں تو وہیں تبت میں ان سے الگ ہوگیا تھا۔ بڑے پراسرار اور عجیب و غریب حالات پیش آئے تھے۔ بات اصل میں وہی ہے مسٹر کامران کہ انسان اپنی زندگی کا کوئی تعین نہیں کرسکتا۔ کب تک اس دنیا میں ہے اور کب چلا جائے گا۔ لیکن خواہشات کے پھن اسے ڈستے رہتے ہیں اور وہ اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے زندگی کی بھی پروا نہیں کرتا۔ میں نہ جانے کیسے کیسے واقعات کا شکار ہو چکا ہوں۔ شعورہ میری زندگی کا ایک حصہ ہے ہم دونوں کا ذوق ایک ہی ہے اور یوں سمجھ لیجیے۔ کامران کہ پراسرار واقعات ہماری زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔''

ہم تبت کی سرزمین پر ان پراسرار وادیوں میں بھٹک رہے تھے کہ مجھے ایک بہت ہی قدیم دوست مل گیا۔ وہ بھی وہاں کسی پراسرار عقدے کو حل کرنے کے لیے پہنچا ہوا تھا اور شدید زخمی ہوگیا تھا۔ مجھے اس کی خدمت کا موقع ملا اور وہیں سے میں کرنل گل نواز سے الگ ہوگیا۔ کیونکہ وہ لوگ میرے دوست کی بحالی تک

مجھے وقت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بس سمجھ لو اس کے بعد مجھے اپنے دوست کی زندگی کے لیے بھٹکنا پڑا اور وہ میرے لیے ایک کہانی چھوڑ گیا۔

ایک عجیب و غریب کہانی بس یوں سمجھ لو کہ میں اسی سلسلے میں یہاں مقیم ہوں۔ بڑی عجیب بات ہے شاید تم یقین نہ کرو۔ میرے دوست کی زندگی سے جو واقعات وابستہ تھے ان میں تمہارا ذکر بھی ہے کامران! میرے ان الفاظ پر ہنسو، حیرت کرو یا مجھے پاگل سمجھو۔ حقیقت یہی ہے کہ تمہاری تقدیر میں ان واقعات کو حل کرنے کی ذمہ داری لکھی ہوئی ہے چاہے تم اس سے کتنا ہی بچو۔ میں تمہیں ایک تحریر سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔

یہ بتاؤ میری ان باتوں سے ذہنی کوفت کا شکار تو نہیں ہو رہے۔''

''اصل میں مسٹر قزل ثنائی! میں ان الجھنوں سے نکلنے کا فیصلہ کر چکا ہوں میرے دل میں اتنے سارے راز جمع ہو چکے ہیں کہ اب مزید رازوں کو دفن کرنے کے لیے جگہ باقی نہیں رہی ہے۔''

''تو پھر مجھے اپنا راز دار بنا لو میں تمہیں اپنی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ بتاؤ کیا تم وہ جہاز چھوڑ سکتے ہو۔''

''ہاں...... مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تو ان واقعات سے فرار چاہتا تھا۔ جہاز پر اسمگل ہو کر میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ کپتان اور جہاز کے عملے کے افراد مجھ سے محبت کرتے ہیں اور مجھے اپنے درمیان ہمیشہ کے لیے رکھنا چاہتے ہیں۔''

''یہ تو ہونا ہے۔'' قزل ثنائی جلدی سے بولا۔ اور کامران چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''ہونا ہے۔''

''ہاں...... تم جہاں بھی جاؤ گے تمہیں محبت ملے گی۔ یہ تمہاری زندگی کا حصہ ہے۔ جو بھی تمہیں دیکھے گا۔ تم سے محبت کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ تم وہی سب کچھ لیے پیدا ہوئے ہو اور جب میں نے تمہیں کرنل گل نواز کے ہاں دیکھا تھا۔ تو شعورہ سے تمہارے بارے میں کچھ کہا تھا۔ میں جادوگر ہوں نا کوئی پراسرار قوتوں کا مالک نہ کوئی جادوئی علم میرے قبضے میں ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ کتابوں سے جو علم حاصل کیا ہے۔ وہی میری زندگی بن گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں شعورہ آئے گی اس سے پوچھنا میں نے اس وقت کیا کہا تھا۔ جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔'' قزل ثنائی یہ الفاظ ادا کر رہا تھا کہ شعورہ اندر آ گئی اور وہ مسکرا کر بولا۔

''شعورہ! جب ہم نے پہلی بار کامران کو کرنل گل نواز کی کوٹھی میں دیکھا تھا تو میں نے کیا کہا تھا۔ شعورہ مسکرائی اور بولی۔

''ہم تمہیں ایک بات بتائیں کامران! ہم لوگ کوشش کرتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولیں بعض اوقات ہماری یہ کوششیں ہمیں نقصان بھی پہنچا دیتی ہیں۔ لیکن یقین کرو ہم لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔'' قزل ثنائی نے جب تمہیں دیکھا تھا تو اس کے بعد جب پہلی رات جب ہم سونے کے لیے اپنے بیڈ روم میں گئے تھے تو قزل نے کہا تھا کہ شعورہ یہ بتاؤ یہاں جو کردار موجود ہیں ان میں سب سے عجیب اور انوکھا کردار کون سا ہے۔ تو میں نے امینہ سلفا کا نام لیا تھا۔ قزل ثنائی نے کہا کہ بے شک وہ عورت تاریخ کا کوئی انوکھا اور پراسرار کردار معلوم

ہوتی ہے۔ جس کے لیے دانش اور کئی دوسرے افراد ہم سے رابطہ قائم کر چکے ہیں۔ لیکن تمہیں حیرت ہوگی کہ اس سے بھی زیادہ پراسرار کردار ایک اور یہاں موجود ہے اور اس طرح موجود ہے کہ وہ شاید خود بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے حیرت سے کہا تھا کہ وہ کون ہے؟ تو قزل ثنائی نے کہا کہ کامران۔

مجھے تو اس وقت صحیح طور سے تمہارا نام تک نہیں معلوم تھا۔ میں نے کہا کہ قزل اس شخص کی پراسرار بات کیا ہے۔ تو قزل نے کہا کہ یہ تاریخ کا ایک اہم کردار بننے والا ہے اور حالات اس طرف رخ کر رہے ہیں۔ قزل نے ایک اور پیش گوئی بھی کی تھی۔ شعورہ نے کہا اور کامران حیرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ بولی قزل نے کہا تھا کہ کچھ ایسے پراسرار کردار اس سے ملاقات کر چکے ہیں۔ جو ابھی تک کسی کے علم میں نہیں ہیں۔"

"بعد میں اس کی کوئی توجیہ مسٹر قزل ثنائی نے۔" کامران نے بے اختیار پوچھا۔

"نہیں کر سکا...... میں نہیں کر سکا۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ سرزمین ہمالیہ میں جو واقعات تمہیں پیش آئے ہوئے ہیں۔ وہ کسی کو نہیں پیش آئے ہوں گے۔" کامران کچھ نڈھال سا ہو گیا۔ شعورہ نے کہا۔

"میں کھانا لگاتی ہوں یہی اطلاع دینے آئی تھی۔" کامران نے کہا۔

"مسٹر قزل ثنائی آپ مزید کیا کہنا چاہتے ہیں مجھ سے اس بارے میں۔"

"صرف یہ میرے دوست کہ تم لاکھ ان واقعات سے بھاگنے کی کوشش کرو جو چیز تقدیر کا ایک حصہ بن چکی ہے وہ تمہیں کرنا ہوگا۔ دیکھو میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرا علم صرف کتابی ہے اور صحیح بات بتاؤں تمہیں۔ دنیا کا ہر علم جھوٹا ہو سکتا ہے۔ کتاب کا علم جھوٹا نہیں ہوتا۔ کتاب نے جو کچھ سکھایا ہے۔ انسانیت کے پہلے دن سے لے کر آخری دن تک اسی سے رہنمائی حاصل کرتا چلا آیا ہے۔ چاہے وہ مذہب کے بارے میں ہو چاہے دنیا کے بارے میں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرے گا۔ کتاب کے بارے میں مکمل طور سے مخلص ہو جاؤ۔ تو پھر اس کا اپنا ایک کردار شروع ہوتا ہے۔ یہ اوراق جنہیں تم بے جان کاغذ کے ٹکڑے سمجھتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اوراق بولتے ہیں اور انہی میں راز کائنات پوشیدہ ہے۔ میں نے آج تک کسی پر اپنی علم دانی کا رعب نہیں ڈالا۔ اور نہ ہی میں اس قابل ہوں کہ اپنے آپ کو بہت زیادہ صاحب علم سمجھوں۔ ظاہر کروں۔ لیکن کتابیں بولتی ہیں۔ مجھے بتاتی ہیں۔"

"بعد میں جب میں نے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کیں تو مجھے بہت عجیب و غریب باتیں معلوم ہوئیں۔ اب تم ایسا کرو کہ مجھ سے سنو تا کہ تم سچائیوں کے قائل ہو جاؤ پہلی بات میں تمہیں یہ بتاؤں کہ جو عورت تمہیں یہاں لے کر آئی ہے اور جس نے تمہیں اپنا نام سدرہ بیکان بتایا ہے اور جس کا تعلق یمن سے ہے وہ یوں سمجھ لو کہ انہی لکیروں پر چلتی ہوئی تمہارا تعاقب کرتی ہوئی اس جہاز تک پہنچی تھی اور وہیں سے اس نے تم تک رسائی حاصل کی تھی اور اس نے حالات کے تحت تمہیں پیش کش کی تھی کہ تم اس کا ساتھ دو۔ سمجھ رہے ہو نا تم۔"

کامران پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا ذہن جھنجھنا گیا تھا۔ قزل ثنائی نے کہا۔

"شعورہ کھانا لگا چکی ہوگی۔ دوست کوئی ثبوت نہیں ہے میرے پاس اپنے خلوص کا۔ کوئی ایسی ٹھوس بات یا ایسا کوئی لفظ میں تم سے نہیں کہہ سکتا۔ جس میں تمہیں اپنے خلوص کا یقین دلا سکوں۔ میں تمہیں صرف ایک بات بتاتا ہوں کہ تم جس کام کے لیے مخصوص کیے گئے ہو۔ وہ ہر حالت میں انجام دو گے۔ کیونکہ یہ تقدیر کی تحریر ہے اور کتابوں نے مجھے اس کا علم دیا ہے۔ دل چاہے تو اس سے انحراف کر لو۔ بغاوت کر لو اور کتابوں کو جھوٹ ثابت کرنے کی کوشش کر لو۔ ابتداء میں تمہیں یوں لگے گا۔ جیسے تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہو۔ لیکن حقیقت میں تمہیں کامیابی نہیں حاصل ہوگی۔ بلکہ تم وہ سب کرنے پر مجبور ہو گے جو تمہارے ذریعے ہونا ہے اور اس کا صرف ایک پورشن میں تمہیں یہ بتا دوں کہ تم نے کرنل گل نواز کا ایک بہترین ساتھی ہوتے ہوئے آخر کار کرنل سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اپنے آپ کو اس ماحول سے نکالنے کے لیے اس جہاز پر اسمگل ہو کر چل پڑے ویسے دنیا بہت وسیع ہے اور تم کہیں بھی گم ہو سکتے ہو۔ لیکن سدرہ بیکان کا تمہیں اس جہاز پر مل جانا۔ تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنا۔ تمہارا اس کی جانب متوجہ ہو جانا اور اس کے بعد ہیگل تک پہنچ جانا یہ سب ایک کہانی کا ایک حصہ ہے جو تمہاری زندگی سے وابستہ ہے۔"

اب تم یوں کرو کہ واپس جہاز میں چلے جاؤ، جہاز تمہیں دنیا کے آخری سرے پر چھوڑ دے وہاں تمہیں ایسے کردار مل جائیں گے جو تمہیں اسی طرف گھسیٹ لائیں گے۔ کامران نے کسی قدر جھنجھلاہٹ سے کہا۔

"اور اس کا اختتام کہاں ہوگا؟"

"آہ...... یہی تو آج تک کسی کو نہیں معلوم ہو سکا۔ کوئی کتاب یہ علم نہیں دیتی کہ کسی بھی انسان کا اختتام کیا ہے۔ ہم دنیا کے ایک سرے پر پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی کا آغاز کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہمارا محور صرف ایک ہے اور دنیا کے آخری سرے پر ہماری موت واقع ہوتی ہے۔ دوست یہ راز کائنات کے مالک نے انسانوں کو نہیں دیا۔ بالکل نہیں دیا۔"

"یہ تو عجیب بات ہے۔ گویا میں اپنی پسند کی زندگی نہیں گزار سکتا۔" کامران نے اتنا ہی کہا تھا کہ شعورہ آ گئی۔

"میں نے بہترین کھانا پکایا ہے۔ کامران چاہے تم ہمارے ایک وقت کے مہمان کیوں نہ ہو۔ لیکن ہم تمہیں مخلصانہ طور پر خوش آمدید کہتے ہیں۔" اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اتنے مختصر وقت میں شعورہ نے انتہائی نفیس کھانا تیار کیا تھا۔ کامران نے ذہنی الجھن کے باوجود خوب اچھی طرح یہ کھانا کھایا بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اس ذہنی الجھن نے اس کی بھوک بے انتہا کھول دی تھی۔ اچھی طرح شکم سیر ہوا اور اس کے بعد عمدہ قسم کی کافی پی کر کہا۔

"مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ جیسے اس کھانے میں کوئی خواب آور دوا شامل تھی۔ ہماری گندم کی بات ہے تو بھلا اس سے زیادہ خواب آور دوا اور کیا ہو سکتی ہے۔" چنانچہ کیا مجھے سونے کی اجازت مل سکے گی۔"

"ہاں...... ہاں کیوں نہیں بلکہ یہی مناسب ہوگا کہ تم کچھ وقت آرام کر لو اور پھر کامران کو ایک اعلیٰ درجے کے بیڈ روم میں پہنچا دیا گیا۔ وہ بستر پر لیٹا در حقیقت اسے چکر آنے لگے۔ ہر کردار اپنی جگہ انتہائی پراسرار...... یہ قزل ثنائی جو باتیں بتا رہا ہے یہ تو بڑی سنسنی خیز باتیں ہیں۔ ویسے قزل ثنائی سے اس نے جو

''میری بستی کے لوگو! اس لڑکے کو پہچانتے ہو؟ یہ شمبا ہے۔ شمونا کا بیٹا شمبا، یہ وہ لڑکا ہے۔ جو شمونا کی موت کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا میری بستی کے پانچ معزز بوڑھے افراد کے ساتھ رات کی تاریکیوں میں اس بستی میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر یہ جواب نہ دے تو جواب میرے پاس ہے۔ اور جواب یہ ہے کہ مجھے اور میرے اہل خاندان کو قتل کر کے بستی کی سرداری حاصل کرنا چاہتا تھا۔''

پانچ معزز بوڑھے سامنے آئے اور انہوں نے شمبا سے سوال کیا۔

''اے لڑکے کیا یہ سچ ہے جو سردار فرعونا کہہ رہا ہے؟'' شمبا نے نفرت بھری نگاہوں سے فرعونا کو دیکھا اور پھر بے باکی سے بولا۔

''ہاں! یہ سچ ہے۔''

''افراد جو تیرے ساتھ آئے تھے ان کی تعداد کتنی تھی؟''

''میرے علاوہ انتیس، مجھے ملا کر تیس۔''

''کیا یہ سب مسلح تھے؟''

''ہاں...... ان کے پاس بندوقیں تھیں اور یہ پوری طرح کمالیہ کو آگ اور خون میں لپیٹ دینا چاہتے تھے۔''

''کیوں؟''

''فرعونا سے انتقام لینے کے لیے۔''

''اس کے بعد تو کیا کرتا؟''

''اس کے بعد میں فرعونا اور اس کے اہل خان کے سر اسی بستی کے سرحدی علاقے میں لٹکا دیتا اور میرے آدمی پوری بستی کو محاصرے میں لے لیتے، پھر میں ان لوگوں کو ختم کر دیتا جنہوں نے اس وقت جب وہ میرے باپ کے غدار تھے فرعونا کی مدد کی تھی۔

''اس کے بعد تو کیا کرتا؟''

''اس کے بعد میں ساری بستی کو لوٹ لیتا۔ ان کا سارا خزانہ چھین لیتا اور پھر میرے یہ آدمی بستی پر حکمرانی کرتے، لوگوں کو ایک ایک روٹی کے لیے ترسایا جاتا۔''

''ایسا تو کیوں کرنا چاہتا تھا؟''

''اپنے باپ کی موت کا انتقام لینے کے لیے، اپنی ماں اور اپنے اہل خاندان کی موت کا انتقام لینے کے لیے۔''

''لیکن تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔''

''ہاں......''

''اب تیرے ذہن میں کیا ہے؟''

''کچھ نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''صرف یہ کہ جب کامیابی کی امید نہ رہے تو انسان کو حالات سے سمجھوتہ کرنا چاہیے۔ اب یہ شخص جو کچھ کرنا چاہے۔'' شمبا نے جس انداز میں ان تمام سوالات کے جواب دیے تھے اس نے بستی کے لوگوں کو لرزہ کر دیا تھا۔ وہ حیران تھے اور پریشانی کے عالم میں سردار فرعونا کو دیکھ رہے تھے۔ بستی کے بوڑھوں نے سردار فرعونا سے کہا۔

''یہ آٹھ افراد بھی خطرناک ہیں۔ فرعونا تم نے ان کا ارادہ دیکھ لیا۔ اب بھلا بستی میں کون ہے جو ان کا ہمدرد ہو۔ انہیں فوری طور پر سزائے موت دی جائے۔''

سردار فرعونا نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور بولا۔

''معزز بزرگو! تم نے ایک بات کہی ہے۔''

''کیا؟''

''تم نے کہا ہے۔ کہ اس وقت اس بستی میں ان کا کوئی ہمدرد نہیں ہے۔''

''ہاں پوری بستی والوں سے پوچھ، کیا ایسا کوئی ہے جو ان تمام باتوں کو سننے کے بعد ان سے ہمدردی رکھتا ہو۔''

''ہاں...... ہے۔'' سردار فرعونا نے کہا۔

''کون؟''

''میں۔'' فرعونا بولا۔ اور بستی کے لوگ شدت حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے تھے۔

''کیا کہہ رہا ہے تو سردار فرعونا؟'' بوڑھوں میں سے ایک نے کہا۔

''ہاں...... تم نے دیکھا کہ کیا کڑیل جوان ہے۔ جوانی اس کے انگ انگ سے ٹپک رہی ہے۔ کتنا بے باک اور جواں مرد ہے یہ۔ کتنی دلیری سے اس نے اپنے جرم کا اعتراف کیا ہے اور اپنے آگے کے مقصد بتائے ہیں۔ میرے معزز بوڑھو! ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو، اتنا بڑا بہادر جوان اگر ہماری بستی کا وفادار ہو تو کیا ہم اسے اپنی فوجوں کا سالار نہیں بنا سکتے، میں سردار ہوں تم لوگوں کا۔ تم نے مجھے اتنا حق دیا ہے کہ کبھی کبھی میں تمہارے فیصلوں سے اختلاف کر سکوں۔ بولو کیا تم مجھے اس اختلاف کی اجازت دو گے؟''

''لیکن فرعونا، یہ اختلاف تیرے لیے خطرناک ہے۔''

''زندگی اور موت دیوتاؤں کے فیصلے کی محتاج ہوتی ہے۔ ہم اپنے لیے کوئی راستہ طے نہیں کر پاتے۔ دوستو، معزز بزرگو! میں تمہارے فیصلے سے بس اتنا سا اختلاف کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی شمبا کو سزائے موت نہ دی جائے بلکہ انتظار کیا جائے اسے سمجھایا جائے اور کہا جائے کہ وہ کمالیہ کا وفادار بن کر جیئے۔ دیکھو بستی والو انہیں قتل کر دینا بہت آسان ہے۔ لیکن اگر تم کسی کو زندگی دینے کی اہلیت رکھتے ہو تو اپنا فرض پورا کرو۔ میں یہی فرض پورا کرتے ہوئے انہیں قید خانے میں پہنچا رہا ہوں۔ اس کے بعد میں کوشش کروں گا۔ کہ انہیں سمجھا سکوں۔ ایک اعلان میں اور تمہارے سامنے کرنا چاہتا ہوں۔'' سردار فرعونا نے کہا۔

''میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ اور اگر پہاڑی قبیلے کے اصولوں کے مطابق میں اپنے لوگوں میں ایک پسندیدہ شخصیت کا حامل رہا ہوں۔ تو سرداری میرے کس بیٹے کو ملے گی اور اس کے لیے میرا بڑا بیٹا

حق دار ہے۔ لیکن دوستو یہ سرداری میں نے شمبا کے باپ شمونا سے حاصل کی ہے اس کی برائیوں اور بد عنوانیوں کے نتیجے میں اگر شمبا ایک اچھا انسان بن جاتا ہے اگر وہ کمالیہ کے لیے وہی سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے جو بستی کے اچھے لوگ کیا کرتے ہیں تو آج میں آپ کے سامنے یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں یہ سرداری اپنے بیٹوں کے بجائے شمبا کو دوں گا، میرا شمبا سے یہ وعدہ ہے۔"

چنانچہ بستی والوں کی گردنیں لٹک گئیں، سردار نے اپنے حق کو استعمال کرتے ہوئے یہ فیصلہ سنایا تھا۔ اس لیے اب کسی کے بولنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اور شمبا کو اس کے ساتھیوں کے ہمراہ قید خانے میں پہنچا دیا گیا۔ البتہ فرعونا نے قید خانے پر محافظوں کی تعداد بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

"اور شمبا، یہ بات میں تجھے بتائے دے رہا ہوں۔ کہ اگر اس دوران تم نے کوئی خطرناک قدم اٹھانے کی کوشش کی تو پھر میں تیری زندگی نہیں بچا سکوں گا۔" شمبا نے اسے نفرت سے دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

پھر یوں ہوا کہ سردار فرعونا شمبا کو مستقل طور پر سمجھانے لگا۔ اس نے کچھ بزرگوں کو اس بات پر متعین کیا کہ وہ شمبا کو سمجھائیں اور پھر ان لوگوں نے فرعونا سے کہا کہ شمبا مکمل طور پر خاموش رہتا ہے۔ وہ کسی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتا یہاں تک کہ اکیس دن کے بعد سردار فرعونا نے وعدے کے مطابق شمبا اور اس کے ساتھیوں کو میدان میں طلب کیا اور سردار فرعونا نے تمام لوگوں کو جمع کرنے کے بعد شمبا سے سوال کیا۔

"شمبا اس دوران بڑے بڑے بزرگ تمہیں سمجھاتے رہے ہیں۔ میں نے بھی تجھے زندگی کی سچائی کے راستے دکھائے ہیں۔ اب بول، بتا، کیا تو ہمارے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے کے لیے تیار ہے؟" تو شمبا نے کہا۔

"بستی والو! سردار فرعونا میرے باپ کا قاتل ہے تو میرے گھرانے کا قاتل ہے، سن میں تیری تعلیمات پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں اور اس کے لیے میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں بستی والوں کو بھی معاف کر دوں گا۔ لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے۔ سردار فرعونا!"

"کیا؟" فرعونا نے پوچھا۔

"مجھے تیرا اور تیرے اہل خاندان کا سر چاہیے، تجھے معاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے باپ کے خون کو معاف کر دیا ہے۔ اور میں نے ایسا نہیں کیا، میں تجھے اور تیرے خاندان کو اسی طریقے سے قتل کرنے کا خواہش مند ہوں۔ جس طرح تو نے میرے خاندان کو قتل کیا تھا اور اس خون کو میں بیچنے کے لیے تیار نہیں ہوں، خون کا بدلہ خون بس، یہی میرا اصول ہے، اور یہی میرا ایمان۔"

بستی کے لوگ بپھر گئے۔ ہر شخص نے کچھ نہ کچھ کہنا شروع کر دیا۔ ان میں سے کسی نے کہا۔

"تو اپنے باپ کو ایک مقدس انسان سمجھتا ہے۔ شمبا یہ وہ شخص تھا جس نے پوری بستی کو موت کی نیند سلانا چاہا تھا۔

"سردار فرعونا! اسے اسی وقت موت کی سزا دے دو، ورنہ یہ سمجھ لو کہ تم اپنے لیے ایک سانپ پال لو گے۔ یہ شخص برے باپ کا برا بیٹا ہے اسے زندگی دینے کا یہ مقصد ہے کہ تم نے بستی کے لیے موت قبول کر لی ہے۔"

سردار فرعونا! سوچ میں ڈوبا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پھر اس نے بپھری ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں میں اسے قتل نہیں کروں گا۔ مجھے خوف نہیں ہے اس سے، ہاں آخری فیصلہ میں یہ کر رہا ہوں کہ شمبا اپنے آٹھ ساتھیوں کو لے کر کمالیہ سے اتنا دور نکل جائے کہ ہواؤں کے ساتھ اس کی خوشبو کمالیہ تک نہ پہنچ سکے، اور یہ بات بھی شمبا کو بتائی جا رہی ہے کہ اگر دوبارہ کبھی اس کے قدم بستی کمالیہ کی جانب اٹھے تو اسے زندگی نہیں دی جائے گی۔ پھر کمالیہ کی سرحدوں پر اس کا سر لٹکا ہوگا۔ گھوڑے مہیا کر وان لوگوں کو ہاتھ باندھ کر یہاں سے روانہ کر دو۔"

اور پھر یوں ہوا کہ آٹھ گھوڑے لائے گئے۔ شمبا کو گھوڑے کی پشت پر بٹھایا گیا۔ اور اس کے بعد ان گھوڑوں کو چابک مار دیئے گئے۔ آٹھ گھوڑے کمالیہ کی سرحدوں سے مخالف سمت دوڑنے لگے۔

♥ ...... ♥ ...... ♥

پھر کافی عرصہ گزر گیا، بستی کے لوگ شمبا کو بھول گئے تھے کسی کو یہ یاد نہیں تھا کہ شمبا نامی کسی شخص نے فرعونا کے خلاف بغاوت کی تھی اور فرعونا نے بے شک شمونا اور اس کے خاندان کو قتل کر کے سرداری حاصل کی تھی۔ لیکن اس نے بستی والوں کے لیے بہت کچھ کیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ بستی والے اپنے سردار سے بے انتہا خوش تھے۔ اور پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔

پھر ایک رات جب تمام لوگ خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ بیرونی ماحول میں برف کے ننھے ننھے ذرات سیاہی میں سفیدی پیدا کر رہے تھے کہ بستی کی سرحدوں میں کچھ آہن پوش داخل ہوئے جو سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھے اور ان کے پاس بہترین بندوقیں تھیں۔ فائر کی پہلی آواز پر فرعونا جاگ اٹھا اور اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ کہ ذرا دیکھو کہ وہ کون ہے۔ جس نے سوتے ہوؤں کو جگانے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ بستی میں ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ کہ بے جا فائرنگ کی جائے۔ اور عام لوگوں کو پریشان کیا جائے۔

بہر حال تین چار لوگ اس طرف روانہ کیے گئے جہاں سے فائر کی آواز ابھری تھی۔ وہ لوگ واپس تو نہ آئے البتہ فائرنگ کی آوازیں اور چیخیں ضرور سنائی دی تھیں اور اس کے بعد یہ چیخیں چاروں طرف گونجنے لگیں۔

پوری بستی جاگ گئی تھی اور ہر طرف سے شور و غوغا بلند ہونے لگا تھا۔ جس میں فائرنگ کی آواز بھی شامل تھی۔ آہن پوشوں کے خلاف کچھ بندوقیں استعمال ہوئیں۔ سردار کے آدمی چاروں طرف پھیل گئے۔ لیکن آہن پوش پوری طرح لوہے میں ڈوبے ہوئے تھے کہ گولیاں ان پر بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔ البتہ ان کی طرف سے چلائی جانے والی گولیاں ہر شخص کو زندگی سے محروم کر رہی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی وقت میں مقابلہ کرنے والوں میں سے ایک بھی باقی نہ رہا اور بستی میں جگہ جگہ انسانی لاشیں نظر آنے لگیں۔

اس خونی رات کی صبح رات کی تاریکیوں سے زیادہ تاریک تھی۔ چاروں طرف سے آہ و زاری کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور آہن پوش پوری بستی میں پھیل گئے تھے۔ یہ لوگ کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے؟ اب تک کسی کو کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ خود سردار کو بھی زنجیروں میں جکڑ لیا گیا تھا۔

آہنی لباس والوں نے بستی کے تمام افراد کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ ان لوگوں کی حالت بے حد ابتر

تھی اور تمام لوگ اپنے ساتھیوں اور رشتہ داروں کی موت پر گریہ وزاری کر رہے تھے۔ ان تمام لوگوں کے بھی ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ غرضیکہ ایک ایسی عبرت ناک فضا تھی کہ اسے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

پھر ان آہن پوشوں کا سردار سامنے آیا اور اس نے اپنا تعارف شمبا کے نام سے کرایا۔ مجمعے میں کئی ایک لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے شمبا کے خلاف رائے دی تھی۔ کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ بہرحال شمبا ایک اونچی جگہ پر چڑھ گیا اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''پہچانو مجھے! کمالیہ کے کتو، مجھے پہچانو، میں کون ہوں، شمبا ہوں میں سمجھے، میں وہ ہوں جسے تم لوگوں نے بستی بدر کیا تھا۔ آج میں اپنی تمام قوتوں کے ساتھ واپس آیا ہوں اور آج میں فرعونا سے اپنا بدلہ لوں گا، اور سنواب میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ بستی کے کسی گھر سے رونے کی آواز نہ ابھرے۔ اگر کسی گھر سے بھی آہ وبکا سنائی دی۔ تو پورے گھر کو فنا کر دیا جائے گا۔'' ابھی شمبا نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک زخمی بچہ شدت تکلیف سے رو پڑا اور جانتے ہو شمبا نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ تو شالہ نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور کامران اور نعیم خان اس کی صورت دیکھنے لگے تھے۔ کچھ لمحوں کے بعد تو شالہ نے اپنی آنکھیں کھولی جن میں نمی تیر رہی تھی۔ وہ پھر گویا ہوئی۔ ''شمبا نے اس بچے کو مجمعے کے درمیان بلا کر اپنی بندوق سے پے در پے فائر کئے اور نتیجے میں اس بچے کے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے۔ یہ منظر پورے مجمعے کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ لیکن سب کے سب اس لیے خاموش تھے کہ کہیں شمبا کی اگلی گولی ان کے سینوں کے پار نہ ہو۔'' پھر بستی کے گرد پہرہ بٹھا دیا گیا اور لوگوں کے ہاتھ پیر کھول کر بستی میں چھوڑ دیا گیا۔ لوگ زور سے سانس لینا بھی بھول گئے تھے۔ ہر شخص سہا دبکا بیٹھا تھا اور کسی بچے کی آواز ابھرتی تو اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا جاتا۔ پھر دوسرا حکم جاری ہوا۔

''بستی کے کسی گھر میں چراغ نہ جلایا جائے شمبا کی آمد کا استقبال تاریکیوں سے کیا جائے۔ کہ اب اس کے مخالفوں کی تقدیر میں تاریکی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔''

''سو یہی ہوا۔ آج تیسرا دن تھا۔ کہ بستی کے کسی گھر میں روشنی نہیں کی گئی تھی۔ لیکن شمبا کے احکامات بدستور جاری تھے دو دن تک وہ بستی میں ان لوگوں کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا تھا۔ انہیں میں سردار فرعونا بھی تھا۔ اب بھلا کس کی مجال تھی کہ شمبا کے خلاف ہتھیار اٹھاتا پھر اس کا تیسرا حکم ملا۔

''تمام لوگ اپنے اپنے مال و دولت کے انبار میدان میں ایک جگہ جمع کر دیں اور خبردار اس بات کو ذہن میں رکھا جائے کہ کسی کے پاس کوئی قیمتی شے موجود نہ رہے۔ اجناس وغیرہ کے ذخائر بھی وہیں میدان میں جمع کر دیے جائیں اور ہر وہ شے جو کسی کی ملکیت تھی۔ اب شمبا کی ملکیت میں دے دی جائے کہ جسم کے کپڑوں کے علاوہ کسی کے پاس کچھ باقی نہ رہے اگر اس حکم کی پورے طور سے تعمیل نہ ہوئی اور کسی نے کچھ چھپانے کی کوشش کی تو یہ سمجھ لیا جائے گا کہ وہ ہمارا غدار ہے اور بستی کمالیہ والے غداری کی سزا سے بخوبی واقف ہیں۔''

پورا دن اس حکم کی تعمیل میں گزر گیا ہے۔ میدان میں، ڈھیروں انبار لگ گئے تھے۔ کمالیہ والوں کے پاس بہت کچھ تھا۔ کون جانے شمبا کا کوئی نیا حکم ان کی موت کا پروانہ ہی ہو۔ سب کے سب سہمے ہوئے گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بیچارے کھانا پینا بھی بھول گئے تھے۔ بس بچوں کی شکم سیری کے لیے جو کچھ بھی مل رہا تھا وہ اپنے بچوں کے حلق سے نیچے اتار رہے تھے۔ باقی کسی کے منہ میں کوئی چیز نہیں گئی تھی اور صرف اپنا گزارہ کر رہے تھے۔ اس طرح شمبا شاید ان لوگوں سے اپنی بستی بدر کیے جانے کا انتقام لے رہا تھا اور پوری بستی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میدان میں جمع ہونے والی اشیا کی چھان بین ہو رہی تھی اور اس کی نگرانی کرنے والا شمبا خود تھا اور اپنے کاموں میں مصروف تھا اور ادھر بستی والے جاگ رہے تھے وہ جانتے تھے کہ جو کچھ ہوا وہ وہیں تک محدود نہیں رہے گا۔ پتہ نہیں ظالم شمبا اور کون سے احکامات صادر کرے گا اور ان لوگوں پر کیا کیا مصیبتیں ٹوٹیں گی۔

جو لوگ گرفتار ہو چکے تھے وہ بستی کے دانشور تھے۔ وہی کوئی مشورہ بھی دے سکتے تھے۔ لیکن اب مشورہ دینے والا کوئی بھی نہیں تھا اور پھر بستی کے مکانات میں نقل و حرکت پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ لوگ اپنی مرضی سے دروازوں سے گزر کر نہیں جا سکتے تھے۔ آہن پوش جگہ جگہ ان کی نگرانی کر رہے تھے۔

پوری بستی میں اب کچھ باقی نہ رہا تھا۔ شمبا نے انہیں ہر طرح سے پیس دیا تھا۔ اور اب وہ صرف اپنی موت کے منتظر تھے۔ پھر بستی میں جانے کیا کچھ ہوتا رہا تھا۔ انہوں نے میرے شوہر کو بھی مار دیا تھا اور میں صرف اپنے بچے کی حفاظت کے لیے کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل آئی اور اپنے بچے کے ساتھ ان غاروں میں آ کر چھپ گئی اور پھر تم لوگ یہاں پہنچ گئے اور اب میں تمہارے سامنے ہوں۔'' لڑکی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

واقعی یہ ایک کرب ناک اور عبرت ناک داستان تھی۔ کامران اور نعیم خان بے شک مجرم تھے، لیکن پھر بھی اس عورت کی داستان سن کر نجانے کیوں ایک دکھ کا احساس ہوا تھا اور دل نے یہ کہا تھا کہ انہیں ضرور اس عورت کی مدد کرنی چاہیے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس کی مدد کس طرح کی جائے بہرحال کامران نے کہا۔

''اور لڑکی کیا تم یہ جاننا چاہو گی کہ اس بستی کا کیا ہوا؟''

''ہاں بے شک، کیونکہ میرے ماں باپ بھی وہاں تھے۔''

''ہمیں افسوس ہے، اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ بستی کا ہر گھر جلا ہوا پڑا ہے۔ بستی کے مکینوں کی لاشیں بستی کی گلیوں میں بکھری پڑی ہیں اور اب وہاں کچھ بھی نہیں بچا۔'' کامران کے ان الفاظ کو سن کر لڑکی پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا تھا اور وہ دونوں گھبرا کر اسکی صورت دیکھنے لگے۔ لیکن پھر وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رو پڑی تھی اور کافی دیر تک روتی رہی تھی۔ وہ دونوں یونہی اپنی جگہ بیٹھے رہے تھے۔

پھر نعیم خان اپنی جگہ سے اٹھ کر اس لڑکی کے قریب پہنچ گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

''بس کرو لڑکی! یہ تو ہونا ہی تھا اور اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ لیکن اب تم جس مقصد کے لیے جی رہی ہو وہ پورا کرو یعنی اپنے بچے کی پرورش...... ظاہر ہے تم اپنے بچے کی وجہ سے وہاں سے بھاگی تھیں، اور اب تمہیں اس بچے کے لیے جینا ہے لیکن اس طرح ان غاروں میں تم کیسے جیو گی؟'' لڑکی نے ان الفاظ کو سن کر اپنا سر اٹھایا اور پہلے نعیم خان پھر کامران کو دیکھا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو بھائی، واقعی اب مجھے اس بچے کے لیے جینا ہے۔ میں اپنا سب کچھ اس بچے پر لٹا دوں گی۔ اس کی پرورش کروں گی، اب یہی میرے جینے کا مقصد ہے۔''

"لیکن اس طرح ان غاروں میں؟" کامران نے کہا۔
"نہیں ہم ان غاروں میں نہیں رہیں گے۔ ان غاروں سے نکل کر کچھ دور تک پہاڑی سلسلہ ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ گھنے جنگلوں پر ختم ہوتا ہے اور جنگلوں کی مغربی سمت میں ایک بستی آباد ہے جسے چمن بستی کہتے ہیں۔ تم دونوں مجھے وہاں تک لے چلو گے اور اگر تم نے ایسا کیا تو میرے اوپر بہت بڑا احسان ہوگا۔" لڑکی خاموش ہوگئی تھی اور اب اس بات کی منتظر تھی کہ وہ اس سلسلے میں اس سے کیا کہتے ہیں۔ نعیم خان کامران کی طرف پلٹا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔

زندگی میں لاتعداد جرم کیے تھے۔ برائیاں کی تھیں اور مختلف چکروں سے ہوتے ہوئے یہاں آ پھنسے تھے۔ لیکن بہرحال دل میں یہی خیال تھا کہ اس مظلوم لڑکی کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔ دو تین منٹ اسی طرح گزر گئے۔ غالباً نعیم خان کامران کے اشارے کا منتظر تھا اور کامران نے سر ہلایا اور اس بات کی تائید کی تھی کہ اس کی مدد کرنا ہوگی اور کامران کے اس عمل سے نعیم خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ پھر وہ لڑکی کی طرف پلٹا اور بولا۔

"لڑکی، ہم لوگ تیری مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمیں یہاں سے کب چلنا ہوگا؟"

"کل سورج ڈھلنے کے بعد ہم اپنے سفر کا آغاز کریں گے اور کوشش کر کے ان جنگلوں تک پہنچ جائیں گے۔ تاکہ اگلے دن کی روشنی تپتے پتھروں پر نہ گزرے پھر جنگل سے گزرتے ہوئے ہم اس جگہ کی طرف جائیں گے جہاں چمن بستی آباد ہے۔"

"ٹھیک ہے اب تو بھی آرام کر۔" ابھی نعیم خان نے اتنا ہی کہا تھا کہ لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اور نعیم خان احمقوں کی طرح کامران کی صورت دیکھنے لگا۔ بعض اوقات ایسی ہی بات کہہ جاتا تھا کہ بس سر پیٹنے کو دل کرے، یعنی جس عورت کے ماں باپ شوہر کو کتے کی موت مار دیا گیا ہو۔ اس سے بڑے آرام سے کہہ رہا تھا کہ تم آرام کرو۔

بہرحال وہ دونوں اپنی جگہ بیٹھے رہے لڑکی بھی کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی تھی وہ لوگ بھی خاموش تھے۔ غرض یہ کہ ایک عجیب سی فضا تھی۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ بولی۔

"اور تم لوگ، تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"ہم لوگ، مسافر ہیں اور اتنی دور سے آئے ہیں کہ بہت لمبے عرصے میں ہم نے یہ سفر کیا ہے۔"

"لیکن تم لوگ ہو کون؟"

جو بھی ہیں ہم تیرے ہمدرد ہیں۔"

"شکریہ اے! میرے ہمدردو میں تمہاری کہانی سننے کے لیے اصرار نہیں کروں گی، لیکن اتنا تمہیں بتا دوں کہ تمہیں اس ہمدردی کا صلہ ضرور ملے گا۔" پھر وہ خاموش ہوگئی تھی وہ دونوں بھی اسے تنہائی فراہم کر رہے تھے اور اسی لیے خاموش تھے۔ ظاہر ہے ابھی وہ اس صدمے سے باہر نہیں نکلنے پا رہی تھی۔

اس کے بعد وہ اپنے بچے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ تب کامران نعیم خان سے مخاطب ہوا۔

"کہو نعیم خان! کیسا لگا یہ روپ تمہیں؟"

"یار زندگی واقعی میں اسی چیز کا نام ہے۔"

"کیا جیل کی سلاخوں کے پیچھے یہ سوچا تھا کہ کبھی پروفیسر سپارکو سے واسطہ پڑے گا اور اس کے ذریعے اس انوکھی دنیا میں آنے کا موقع ملے گا اور اب دیکھو اب ایک ایسی جگہ ہم لوگ موجود ہیں جس کا تصور بھی ہمارے ذہنوں میں نہیں تھا۔"

"بہرحال اب جو کچھ بھی ہے۔ فی الحال اس لڑکی کو اس کی منزل مقصود تک پہنچانا ہمارا کام ہے۔ اس کے بعد اس منحوس بوڑھے کو آواز دیں۔ اور اس سے کہیں گے کہ ہمیں اس نیلی پاتال سے باہر لے چل۔ اس سے اچھی وہ جیل تھی جہاں بربریت کا ایسا عالم تو نہ تھا۔"

"ویسے نعیم خان، کچھ وقت یہاں ضرور گزارنا چاہیے۔ اماں بالکل ہی سٹھیا گئے ہو کیا؟"

"میں تمہیں ساٹھ سال کا لگتا ہوں۔"

"مم..... مم...... میرا مطلب ہے۔"

"کیا مطلب ہے پروفیسر سپارکن کو شاید بھول گئے ہو تم۔ کتنی بے دردی سے ہم نے اس کی گردن اتاری تھی اور جب ہم واپس اس جگہ پہنچے تھے تو۔"

نعیم خان اس منظر کو یاد کرنے لگا تھا اور پھر اس پر کپکپی طاری ہوگئی۔

"واقعی یار! جب تک وہ سپارکو نہ چاہے گا، ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے۔ چنانچہ مجبوراً اس وقت تک ہمیں یہاں رہنا پڑے گا۔ جب تک سپارکو ہمیں واپس اپنی دنیا میں لے جائے گا۔"

پھر وہ دونوں ہی خاموش ہوگئے تھے۔ غرضیکہ وقت گزرتا رہا اور وہ وقت آ پہنچا جب انہیں یہاں سے روانہ ہونا تھا اور وہ تینوں اس غار سے نکل آئے تھے۔ پھر لڑکی نے ایک جانب رخ کیا تھا اور وہ دونوں اس کے ساتھ ساتھ چل پڑے تھے۔ بچہ لڑکی کی گود میں ہی تھا اور اس وقت جاگ رہا تھا وہ بہت ہی پیارا بچہ تھا۔

بہرحال سفر کا آغاز ہوا تھا اور ان دونوں نے خود کو تقدیر کے سہارے چھوڑ دیا۔ تقدیر ابھی نجانے کہاں کہاں لے جائے گی اور کیا کیا رنگ دیکھنے پڑیں گے۔

♥ ...... ♥ ...... ♥

سفر طے ہوتا رہا۔ پہاڑی سلسلہ کافی طویل تھا۔ لیکن لڑکی کے کہنے کے مطابق یہ سفر رات کے دوران طے ہو سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ دن کی روشنی میں جنگل تک پہنچ جاتے۔ سو یہی ہوا۔ سورج ابھی پوری طرح نمودار نہیں ہونے پایا تھا کہ انہوں نے کافی فاصلے پر درخت لہلہاتے ہوئے دیکھے تھے۔ ان درختوں میں انہیں ناریل کے درخت بھی نظر آئے تھے اور ہماری رفتار تیز ہوگئی تھی۔

پورے دن کے بعد کوئی کھانے کی پینے کی شے نظر آئی تھی اور اسے دیکھ کر دل بے قابو ہوگیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ جلدی سے وہاں پہنچیں اور ان ناریلوں کو توڑ کر پیٹ کی آگ بجھائیں۔ چنانچہ وہ تینوں ہی تیزی سے دوڑنے لگے۔ بچہ اس وقت کامران کے ہاتھوں میں تھا اور وہ دوڑنے میں احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ تاکہ بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ چند لمحات کے بعد وہ اس جگہ پہنچ گئے تھے۔ جہاں ناریل کے درخت موجود تھے۔ دو منٹ تک نعیم خان رکا رہا۔ پھر اس نے بندروں کی طرح درخت پر چڑھنا شروع کر دیا۔

اس کی پھرتی تو کامران جیل میں بھی دیکھ چکا تھا اور اب پھرتی کا ایک اور مظاہرہ میرے سامنے تھا۔ اس نے نہایت اطمینان سے تین چار ناریل توڑ کر نیچے پھینکے تھے۔ جو توشالہ نے آگے بڑھ کر پکڑ لیے تھے۔ پھر نعیم خان نیچے اتر آیا اور کامران نے بچہ توشالہ کو دے دیا اور وہ دونوں ناریل توڑنے لگے۔ ایک ناریل توشالہ کو دیا اور دوسرے ناریل وہ دونوں لے کر بیٹھ گئے پھر پہلے ناریل کا پانی پیا گیا اور اس کے بعد گودا کھایا گیا اور کچھ دیر کے لیے ایک جگہ بیٹھ گئے۔ ایک انتہائی آرام دہ جگہ تھی اور یہاں کچھ عرصہ باآسانی گزارہ کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ فیصلہ یہ کیا گیا کہ کچھ دیر آرام کیا جائے گا اور اس کے بعد آگے کا سفر شروع کیا جائے گا۔ نعیم خان نے کہا۔

"بے شک یہاں خطرناک جانور ضرور ہوں گے اور ہمیں ان سے بچاؤ کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا ہوگا؟"

"سیدھی سی بات ہے نعیم خان! جب ہم کسی جگہ قیام کے لیے رکیں گے تو ہم دونوں میں سے ایک کو پہرہ دینا ہوگا۔ بے شک ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں لیکن۔"

"ہتھیار ہے۔" لڑکی نے کہا اور دوڑ کر ایک درخت کی آڑ میں پوشیدہ ہوگئی اور جب وہ باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں انتہائی چمکدار خنجر تھا۔ پھر وہ کہنے لگی۔

"بے شک یہ ہتھیار جانوروں سے جنگ کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ لیکن پھر بھی ہم اس سے کئی کام لے سکتے ہیں۔ مثلاً اس کے چوڑے پھل سے درختوں کی شاخیں کاٹ کر اور انہیں نوکدار بنا کر بھالے جیسا بنا سکتے ہیں۔"

"ہاں یہ ایک اچھی ترکیب ہے۔ اور نعیم خان اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ دو تین مضبوط شاخیں کاٹو اور اس خنجر کی مدد سے انہیں نوکدار بنا دو۔"

سو نعیم خان نے ایسا ہی کیا۔ جنگل میں کافی دور اندر چلا گیا تھا اور جب تھوڑی دیر کے بعد واپس لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں شاخوں کا ایک گٹھر موجود تھا۔ پھر اس نے ان کی چھلائی شروع کر دی اور تھوڑی ہی دیر میں چار پانچ شاخوں کو نوکدار بنا دیا تھا اور انہیں احتیاط سے سنبھال کر رکھ لیا گیا تھا۔

بہرحال فیصلہ یہ کیا گیا تھا کہ مزید ایک آدھے گھنٹے تک یہاں رکنے کے بعد آگے کا سفر شروع کریں گے۔ توشالہ کا بچہ نہ صرف خوش شکل تھا بلکہ خوش مزاج بھی معلوم ہوتا تھا اور اس پورے سفر میں اس نے انہیں تنگ نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ درختوں پر موجود پرندوں کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا اور توشالہ اس کی طرف سے مطمئن تھی۔

پھر کچھ دیر بعد انہوں نے سفر کا آغاز کیا۔ طے یہ کیا گیا تھا کہ سورج غروب ہونے تک کا سفر جاری رکھا جائے گا اور اندھیرہ ہونے تک کوئی مناسب جگہ تلاش کر کے وہاں قیام کر لیا جائے گا۔ چنانچہ وہ سفر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی اور انہوں نے ایک ایسے درخت کا انتخاب کیا جو زمین سے بہت اونچا تو نہ تھا لیکن اس کی شاخیں کچھ اس طرح آپس میں جڑی ہوئی تھیں کہ ان پر باآسانی قیام کیا جاسکتا تھا۔ پھر انہوں نے پہلے توشالہ کو اوپر چڑھایا تھا۔ پھر نعیم خان اوپر چڑھا اور کامران نے بچے کو احتیاط سے اونچا کر کے

نعیم خان کو پکڑایا اور اس کے بعد میں خود بھی اوپر چڑھ گیا تھا۔ کھانے پینے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے یہاں کئی پھل دار درخت تھے اور نعیم خان نیچے اتر کر کئی پھل توڑ لایا تھا۔ بہرحال پھل کھا کر انہوں نے پیٹ بھرا اور پھر کامران نے نعیم خان سے کہا۔

"نعیم خان! تم اور توشالہ چاہو تو بھرپور آرام کرو۔ میں جاگ رہا ہوں۔ ویسے توشالہ ہمیں مزید کتنے دن لگیں گے۔"

"بس ایک سورج اور ایک چاند اور ہمیں جنگل کے راستے میں گزارنا ہوگا اور اس کے اگلے سورج چڑھنے تک ہم چمن بستی میں ہوں گے۔"

"ایک سورج ایک چاند۔" نعیم خان حیرانی سے بولا۔

"دنوں کا حساب ہے۔ نعیم خان۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم کل بھی اپنا سفر کریں گے اور پرسوں صبح ہم لوگ چمن بستی میں ہوں گے۔"

"بالکل ٹھیک۔"

"لیکن توشالہ ایک درخواست ہے تم سے۔"

"کیا؟"

"تم بستی والوں پر یہ ظاہر نہیں کرو گی کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم اپنے طور پر کسی طرح بستی میں داخل ہو جائیں گے اور اگر ہم سے ہمارے بارے میں کوئی پوچھے گا تو ہم بھی اسے شمبا کا شکار بتا دیں گے۔"

"ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔"

"میرا خیال ہے۔ اب تم لوگ ستا لو میں جاگ رہا ہوں۔" پھر وہ لوگ خاموش ہوگئے تھے۔ درختوں کی جڑی ہوئی شاخوں کے درمیان یہ لوگ اطمینان سے بیٹھ گئے تھے۔ توشالہ اپنے بچے کو سینے سے چمٹائے ہوئے تھی۔ نعیم خان بھی خاموش تھا۔

پھر کچھ ہی دیر کے بعد دونوں اونگھنے لگے تھے اور کامران آہستگی کے ساتھ درخت سے نیچے اُتر آیا تھا اور درخت کے نیچے ٹہلنے لگا تھا۔ پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ کامران ٹہلنے کے انداز میں واپس آ رہا تھا۔ کہ اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ اسی درخت سے کوئی چیز نیچے آئی ہے اور کامران نے جھٹ گردن اٹھا کر اوپر دیکھا تھا۔ بچے کو نیچے کی طرف آتے ہوئے دیکھ کر اسی سیدھ میں بھاگا اور دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر آرام سے بچے کو کیچ کر لیا۔

بچہ اس آفت سے پریشان ہو کر جاگ گیا تھا اور رونے لگا تھا لیکن میں نے جلدی سے اپنے کندھے سے لگا لیا اور تھوڑی سی تگ و دو کے بعد بچے کو چپ کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ توشالہ شاید گہری نیند سو گئی تھی۔ نعیم خان بھی اپنی جگہ مست تھا اور یقیناً توشالہ کی نیند گہری ہو گئی ہوگی۔ جب ہی اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے اور جس کے نتیجے میں یہ بچہ نیچے آ رہا تھا۔ لیکن بس خدا کو اس بچے کی زندگی عزیز تھی۔ لہٰذا اسے خراش تک نہیں آئی تھی۔

پھر بچہ کامران کے کندھے سے سر لگائے لگائے سو گیا تھا اور کامران مزید کچھ دیر ٹہلنے کے بعد ایک جگہ بیٹھ گیا تھا۔ اسی عالم میں رات گزر گئی اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ دونوں جاگ اٹھے۔ توشالہ نے گھبراہٹ کے عالم میں اپنی گود کی طرف دیکھا اور پھر ادھر اُدھر۔ پھر اس کی نظر نیچے پڑی اور بچے کو کامران کی گود میں دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئی۔

اس کے بعد وہ دونوں نیچے اتر آئے تھے اور توشالہ نے لپک کر بچے کو گود میں لے لیا تھا۔

''وہ دراصل تم گہری نیند سو گئی تھیں۔ چنانچہ اس خیال سے کہ کہیں بچہ نیچے نہ گر پڑے میں اسے لے کر نیچے آ گیا تھا۔''

''بھائی! آپ کا بہت بہت احسان ہے یہ واقعی۔ اگر یہ گر پڑتا تو نجانے اس کا کیا حشر ہوتا۔''

''خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ نعیم خان!''

''یس باس۔''

''ڈیوٹی۔''

''باس پانچ منٹ درکار، ابھی ذخیرہ کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر نعیم خان جنگل میں ایک سمت دوڑ گیا او ر پانچ منٹ میں اس نے کئی طرح کے پھل جمع کر لیے تھے۔ ویسے نعیم خان واقعی بہت پھرتیلا تھا اور اس کا مظاہرہ میں کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔

بہرحال انہوں نے پھلوں کا ناشتا کیا اور اس کے بعد سفر کا آغاز کر دیا۔ پھر دوسرا دن اور دوسری رات بھی گزر گئی۔ تیسرے دن بھی انہوں نے سفر جاری رکھا اور اس وقت جب سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ انہیں ایک بستی کے آثار نظر آنے لگے۔ لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے بڑے مکان اور ان مکانوں کے درمیان لوگ آ جا رہے تھے۔ وہ لوگ اپنی جگہ پر ٹھہر گئے تھے۔ توشالہ کہنے لگی۔

''تھوڑی دور چل کر بستی کا بڑا دروازہ آ جاتا ہے۔ اس بڑے دروازے سے اندر داخل ہو کر بستی میں کہیں بھی جا سکتے ہیں۔''

''توشالہ! کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم اس بڑے دروازے کے بجائے اور کسی جگہ سے اس بستی میں داخل ہوں۔''

''بستی کے چاروں طرف ایک دیوارسی بنی ہے۔ لیکن اس دیوار کو پار کیا جا سکتا ہے۔''

''کس طرح؟'' نعیم خان نے کہا۔

''بھئی زیادہ تر علاقہ جنگل پر مشتمل ہے اور ظاہر ہے جب بستی کے آس پاس درخت نظر آ رہے ہیں۔ تو درخت؛ کر دوسری طرف کودا جا سکتا ہے۔'' کامران نے کہا۔

''ہاں...... بالکل ٹھیک ہے۔'' توشالہ نے تائید کی تھی۔ پھر وہ کہنے لگی۔ ''اور میرے بھائیو! میں تمہاری بے حد شکر گزار ہوں کہ تم نے اس سفر میں میری بھرپور مدد کی۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ اور ہاں ایک اور بات اور۔''

''کیا؟'' نعیم خان نے پوچھا۔

''یوں تو بستی میں تم اپنے طریقے سے داخل ہو گے لیکن خدانخواستہ اگر کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔ شیراک کا نام بے دھڑک لے لینا اور کہنا کہ تم اس کے مہمان ہو۔ اصل میں شیراک اسی بستی کا بہت معزز آدمی ہے اور میرے ماں باپ کا احسان مند۔ کیوں کہ میرے ماں باپ نے ایک مرتبہ اس کی جان بچائی تھی اور اب میں اسی کے پاس رہوں گی اور اسے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دوں گی۔ چنانچہ کوئی بھی افتاد پڑے تو تم بلا جھجک شیراک کے پاس چلے آنا۔''

''ٹھیک ہے۔ تمہاری بہت مہربانی۔'' کامران نے کہا۔

بہرحال لڑکی نے گلوگیر آواز میں ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر بچے کو سینے سے لگائے اس طرف چل رہی تھی جہاں بستی کا دروازہ موجود تھا۔ وہ دونوں اپنی جگہ کھڑے اسے جاتے دیکھتے رہے تھے۔ پھر کامران نے نعیم خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کہو نعیم خان کیا خیال ہے۔ بستی کو اندر سے دیکھا جائے۔''

''ہاں، کوئی حرج نہیں ہے اور ظاہر ہے خطرے کی کوئی بات بھی نہیں ہے۔''

''لیکن ٹھہرو۔''

''کیا ہوا؟''

''اگر ہم توشالہ کے ساتھ بھی بستی میں داخل ہوں تو کیا حرج ہے۔ ظاہر ہے یوں بھی ہم توشالہ کے ساتھ تو نہیں رہیں گے، تو پھر کیوں نہ ہم بستی میں بھی اس کے ساتھ داخل ہوں اور شیراک پر بھی اپنا تاثر قائم کریں۔''

''یہ بات تو ہے۔ پھر اب کیا کریں؟''

''توشالہ کو روکو۔ وہ زیادہ دور نہیں گئی ہے۔ دیکھو وہ جا رہی ہے۔'' کامران نے کہا اور نعیم خان پاگلوں کی طرح دوڑنے لگا۔ آن کی آن میں اس نے توشالہ کو جا لیا۔ توشالہ چونک کر اسے دیکھنے لگی اور پھر بولی۔

''خیر تو ہے میرے بھائی، کیا بات؟''

''توشالہ ہم بہت سی ایسی باتیں نہیں کر سکے ہیں جو کرنا چاہتے تھے کچھ ایسا ذہن الجھا ہے کہ ہم ان باتوں کی طرف توجہ ہی نہیں دے سکے۔'' توشالہ نہ سمجھنے والے انداز میں نعیم خان کو دیکھتی رہی، میں بھی قریب ہی پہنچ گیا تھا۔ کامران نے کہا۔

''اصل میں ہم ان علاقوں میں اجنبی ہیں۔ ہم اپنے آپ کو پوشیدہ تو کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد صورت حال بہت مختلف ہو جائے گی اور ہم آگے کے سفر سے محروم رہیں گے۔''

''میرے بھائیو! تم سے جدا ہونے کو تو میرا دل بھی نہیں چاہتا لیکن میں بے یار و مددگار تمہیں رکنے کی دعوت کیا دیتی۔ بے شک شیراک بہت اچھا انسان ہے لیکن پھر بھی کیا کہا جا سکتا ہے۔''

''ہمیں صرف اتنی مہلت درکار ہے۔ کہ ہم یہاں کے نقشوں سے واقفیت حاصل کر لیں۔''

''میرا خیال ہے۔ شیراک اتنا اچھا انسان تو ہے کہ صورت حال کو سمجھ کر تمہاری مدد کرے اور اس مجھ کوئی شک نہیں کہ بستی میں داخل ہوتے ہی اس بستی کے لوگوں نے توشالہ کو اور انہیں اس طرح تپاک سے

ہاتھوں ہاتھ لیا تھا کہ وہ خود حیران رہ گئے تھے لیکن جب ہر شخص کی پیشکش کو ٹھکرا کر توشالہ نے شیراک کے آگے سر جھکایا تو شیراک نے اس کا سر اپنے چوڑے سینے سے لگا لیا اور بولا۔

''مجھے تیری بستی کی مکمل داستان معلوم ہے توشالہ آہ۔ کاش میں بے بس انسان کوئی ایسا ذریعہ حاصل کر سکتا۔ جس سے تیری اور بستی والوں کی مدد ہو سکتی۔ لیکن تقدیر نے کچھ ذمہ داریاں میرے سپرد کی ہیں۔ تو بھی آ گئی ہے۔ اس سے اچھی تو اور کوئی بات نہیں ہے۔'' شیراک اپنی آبادی میں صاحب ثروت انسان تھا اور اس کی بہت سی زمینیں وہاں موجود تھیں۔

چنانچہ وہ ایک خوشحال حیثیت رکھتا تھا اور اس نے ان سب کی بہترین خاطر مدارات کی۔ اس خاطر مدارات سے فارغ ہو کر توشالہ نے سسکیاں بھرتے ہوئے شیراک کو اپنی کہانی سنانا چاہی تو شیراک نے کہا۔

''نہیں توشالہ مجھے ان دردناک لمحات کے بارے میں کچھ نہ بتا۔ آ میں تجھے دکھاؤں کہ میں کیسے کرب سے گزر رہا ہوں۔'' اور پھر شیراک ان لوگوں کو جہاں لے گیا وہ ایک تہ خانہ تھا۔ اس تہ خانے میں بستر وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو بستروں پر دو قوی ہیکل جوان آنکھیں بند کئے ہوئے دراز تھے۔ توشالہ نے ایک لمحے میں انہیں پہچان لیا۔ ان میں سے ایک جیوا تھا اور دوسرا اس کا بھائی شبان تھا۔ توشالہ کے منہ سے دکھ بھری آواز نکلی۔

''یہ دونوں...... آہ...... یہ دونوں ہماری بستی کے قابل فخر نوجوان۔''

''ہاں بیٹھو میں تمہیں ان کی کہانی سناتا ہوں۔'' شیراک نے کہا اور پھر کچھ لمحے تک جیسے وہ اپنے ذہن میں اس کہانی کو مربوط کرتا رہا اس کے بعد غمزدہ آواز میں بولا۔

''اس وقت شمبا۔ شیطان صفت شمبا بستی میں قہر و غضب کے طوفان برپا کر رہا تھا۔ بستی کے ایک بہت بڑے لیکن تاریک مکان میں ایک عمر رسیدہ بوڑھا، ایک بستر پر بیٹھا ہوا اپنے سامنے موجود خوبصورت نوجوانوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو اس کے پوتے تھے۔ بوڑھا اپنے بیٹے کی موت کے بعد ان دونوں پوتوں کو اپنے سینے پر لگے ہوئے زخموں میں سموئے ہوئے تھا۔ بوڑھے کی بیوی اس کے گھر میں ہی تھی اور اس کی بہو بھی۔ یعنی ان بیٹوں کی ماں۔ یہ خاندان صرف چار افراد پر مشتمل تھا۔ بوڑھے کے پوتے بہت ہی چاق و چوبند اور توانا تھے۔ ان دونوں جوانوں کے علاوہ بوڑھے کی اور کوئی کمائی نہیں تھی۔ اور اس نے ان کی بہترین پرورش کی تھی۔

دونوں ہی چاق و چوبند، پھرتیلے اور بہت ہی خوش مزاج انسان تھے۔ لیکن اس وقت سب پر شمبا کی صورت میں تباہی نازل تھی۔ پھر بوڑھا ان دونوں جوانوں سے مخاطب ہوا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم دونوں کی رگوں میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ہر کام کرنے کے قابل ہو۔ لیکن، میرے بچو! یوں سمجھ لو کہ اس دنیا میں میرا تمہارے سوا اور کون ہے۔ تمہیں کھونے کے بعد میرے پاس جینے کے لیے اور کچھ نہیں ہوگا۔ خیر میری تو زندگی ہی کیا۔ میں تو اپنے آپ کو کسی کے بدلے موت کے لیے بھی پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن اصل مسئلہ تمہاری ماں کا ہے۔''

''بابا! تو نے ہمیں جو تربیت اور طاقت بخشی ہے۔ وہ اس قدر ناکارہ نہیں کہ جو ذمے داری ہم نے اپنے کاندھوں پر لی ہے۔ اسے پورا نہ کر سکیں۔''

''تم دونوں ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن میں اپنے اس کمبخت دل کو کیا کہوں۔ پوری بستی خوف کا شکار ہے اور ہر شخص عقل سے کام لینا چھوڑ چکا ہے۔ اس وقت بھلا کون ہے۔ جو منصوبہ بندی کر سکے۔ ان حالات میں میرے بچو...... میں تمہیں اس کی اجازت کیسے دوں؟''

''دیکھ رہے ہو بابا اس کمینے شمبا نے بستی میں کیا اندھیر مچا رکھا ہے۔ کیا کہا جا سکتا ہے کل کا دن کیا ہو اور وہ کون سا نیا حکم دے دے۔ ہمیں بستی کے لوگوں کے لیے کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں ہلانا چاہیے۔ ورنہ بعد میں ہمارے بارے میں بھی حکم صادر ہو سکتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تاخیر کی صورت میں صرف پچھتاوے رہ جائیں۔''

''میں تم دونوں سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ میرے بچو! اپنی ماں سے اجازت لے لو۔ وہ کیا کہتی ہے۔'' عورت نے گردن اٹھا کر ڈبڈباتی نگاہوں سے اپنے دونوں بیٹوں کو دیکھا اور بولی۔

''اگر میرے دونوں بیٹے بستی کمالیہ میں کام آ سکتے ہیں تو میں سمجھوں گی کہ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔''

''آفرین ہے تجھ پر بہو...... آفرین ہے۔''

''تو پھر بابا ہمیں اجازت دو۔''

''ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ۔ گو کہ تجویز تم لوگوں نے پیش کی ہے۔ اس میں جتنے خطرات ہیں اس کا مجھے اندازہ ہے۔ جس زمین دوز راستے سے تم بستی سے باہر نکلنا چاہتے ہو۔ یہ بارش میں شہر میں جمع ہونے والے پانی کو نکالنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس میں برسوں سے غلاظت بہتی ہے۔ اور غلاظت ایسی بدبودار ہوا پیدا کرتی ہے۔ جو انسانی زندگی کے لیے مہلک ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس زمین دوز گزرگاہ میں حشرات الارض بھی ملیں گے اور تمہارا وہاں سے گزرنا بے حد مشکل ہوگا۔''

''ہم کسی کام کے لیے نہیں جا رہے ہیں بابا۔ ہمیں خوفزدہ نہ کرو۔ ہم ہر قسم کی دشواریوں سے گزر جائیں گے۔ عزم پختہ ہوں تو راستے ربِّ عظیم صاف کر دیتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ بچو ربِّ عظیم تمہارا ساتھ دے میں تمہیں دعاؤں کے علاوہ اور کیا دے سکتا ہوں۔''

دونوں بھائیوں نے خوش ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا اور جیوا نے شبان سے ہاتھ ملایا اور اس کے بعد وہ بوڑھے اور اپنی ماں کے قریب آ گئے۔ دونوں نے ان کی پیشانیاں چومیں۔ ماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر رخساروں تک آ گئے تھے۔ جیوا نے کہا۔

''نہیں ماں...... بہادر بیٹوں کی مائیں انہیں مسکرا کر رخصت کرتی ہیں ہم کوئی شکار کرنے نہیں جا رہے بلکہ بستی کمالیہ کو بچانے کے لیے ایک کوشش کر رہے ہیں۔ شاید ہماری یہ کوشش کارگر ہو جائے۔''

''تم سب سے قریبی بستی جاؤ گے۔ بستی کے سردار کو ساری صورت حال بتا کر اس سے مشورہ لینا کہ کیا کیا جائے؟ صرف ایک بستی کے لوگ اس مصیبت پر قابو پانے میں ناکام رہیں تو کسی دوسری بستی کا رخ کرنا۔ دنیا میں ایسی بہت سی غیرت مند بستیاں موجود ہیں۔ جو مصیبت میں پھنسے ہوؤں کی مدد بھی کرتی ہیں۔''

''ہمارا انتظار کرنا بابا۔ ہم واپس آئیں گے۔ ہم ضرور واپس آئیں گے۔'' شبان نے کہا اور اس کے بعد دونوں وہاں سے رخصت ہو گئے۔ شاید یہاں سے روانگی کی تیاریاں وہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ چنانچہ دونوں نے اپنے اپنے تھیلے اپنے شانوں سے باندھے اور ایسے لباس استعمال کیے جو ان کے راستے میں

رکاوٹ نہ ثابت ہوں۔"

اب گھر سے نکل کر اس جگہ تک جانے کا مسئلہ تھا۔ جہاں زمین دوز راستہ جو گندے پانی کی گزرگاہ تھی۔ شروع ہوتا تھا۔ رات کی تاریکی میں وہ صرف چھپکلیوں کی طرح زمین پر رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ جہاں کہیں بھی آہٹ محسوس ہوتی وہ رک جاتے تھے زمین دوز گزرگاہ کا فاصلہ ان کے گھر سے بہت زیادہ نہیں تھا۔ بس ایک چھوٹا سا راستہ عبور کرنا ہوتا تھا۔ لیکن اس راستے کو عبور کرنے میں کافی وقت لگ گیا۔

چونکہ دشمن شیطان کے جگہ جگہ اپنے گھوڑوں پر سوار گردش کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اس زمین دوز راستے کے دہانے تک پہنچ گئے یہ دہانہ کھلا ہوا تھا اور گندا پانی اس وقت یہاں موجود نہیں تھا۔ کیونکہ وہ صرف برساتی پانی کی نکاسی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور دونوں دہانے میں سے نیچے اتر گئے۔ بوڑھے نے درست کہا تھا۔ یہاں شدید بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن ایک بڑی مشکل کو ٹالنے کے لیے چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنا ہی ہوں گی۔ انہوں نے اپنے چہروں پر کپڑا لپیٹ لیا اور دونوں تاریکی میں آگے بڑھنے لگے۔ ان کے چلنے کی رفتار بے حد سست تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ زمین کے نیچے دور تک نکل آئے۔ شدید بدبو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔

جسم پسینہ پسینہ ہو گئے تھے۔ لیکن دونوں آگے بڑھتے رہے تھے۔ اور انہیں جب یہ احساس ہو گیا کہ وہ دہانہ بہت پیچھے رہ گیا ہے اور اگر وہ یہاں روشنی کر لیں تو انہیں آگے بڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہو گی اور اس روشنی میں انہیں نہیں دیکھا جا سکتا۔ تو دونوں نے اپنے جسم پر بندھے ہوئے تھیلوں میں ہاتھ ڈال کر چربی اور بلور کے بنے ہوئے چراغ نکال لیے جنہیں روشن کر کے روشنی حاصل کی جا سکتی تھی۔ چراغوں نے ان کے راستے آسان بنا دیئے تھے۔ اور شاید تقدیر ان کی مدد پر آمادہ تھی۔

کیونکہ چند ہی گز کے فاصلے پر انہوں نے ایک کالے رنگ کے ناگ کو اپنے راستے میں حائل دیکھا اگر چراغ روشن نہ کرتے تو اس ناگ کے قریب سے گزرنا پڑتا اور اس وقت نہیں کہا جا سکتا تھا کہ موذی جانور ان کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ لیکن روشنی ہوتے ہی سانپ کی تیز پھنکار گونجی تھی اور دونوں ٹھٹھک کر رک گئے تھے۔ تب جیوا نے خنجر ہاتھ میں لے لیا اور اسے نوک کی طرف سے پکڑ کر سانپ کا جائزہ لینے لگا۔ شبان نے آہستہ سے کہا۔

"نشانہ خطا نہیں ہونا چاہیے۔" جیوا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بہترین نشانہ باز تھا۔ اور چاقو پھینک کر مارنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس نے سانپ کے پھن کا نشانہ لیا اور دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ سے نکلنے والا چاقو سانپ کے پھن میں ترازو ہو گیا۔ موذی جانور زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اور وہ مدھم روشنی میں اس کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر جب انہوں نے محسوس کیا کہ سانپ کا جسم ٹھنڈا ہو چکا ہے تو آگے بڑھے اور جیوا نے اپنا چاقو سانپ کے پھن سے نکال کر چاقو کو صاف کر کے دوبارہ اپنے لباس میں رکھ لیا۔

اس کے بعد مدھم روشنی میں وہ دونوں آگے بڑھتے رہے ان کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن وہ دونوں آگے بڑھتے رہے۔ لیکن دونوں جانتے تھے جس مقصد کے لیے انہوں نے یہ سفر اختیار کیا

وہ بہت سے لوگوں کی زندگی کا باعث بن سکتا ہے۔

چنانچہ اپنی تمام تر قوت برداشت سے کام لیتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ بالآخر انہیں اس طویل ترین راستے کا دوسرا سرا نظر آ گیا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ دونوں نے فوراً ہی روشنیاں بجھا دی تھیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ دشمن یہاں موجود ہے یا نہیں تاہم ان کا خیال تو رکھنا ہی تھا۔

دونوں کافی دیر تک وہاں رک کر باہر ہونے والی آہٹوں کا جائزہ لیتے رہے۔ اور پھر انہوں نے کوئی آہٹ نہ پائی۔ تو جیوا نے شبان کے شانوں پر چڑھ کر اوپر قدم رکھا اور باہر کا جائزہ لینے کے بعد دونوں ہاتھ سوراخ پر ٹکا کر اوپر آ گیا۔ پھر اس نے شبان کو بھی اوپر کھینچ لیا اور دونوں بھائی سیدھے کھڑے ہو کر اپنے چہرے سے کپڑے اتارنے لگے۔ اور پھر تازہ ہوا میں گہری گہری سانسیں لینے سے ان کی حالت بہتر ہو گئی۔ اس سفر کے بعد نجانے کیوں انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب وہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لیں گے۔

لیکن آگے کا سفر اتنا آسان نہیں تھا۔ بستی کے چاروں طرف محافظ اپنے گھوڑوں پر سوار گشت کرتے پھرتے تھے یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ یہاں سے کوئی باہر تو نہیں جا رہا۔ ویسے تو آس پاس کسی کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

انہوں نے سمت کا تعین کر کے آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ چھوٹے بڑے ٹیلے ان کو چھپانے میں معاون ثابت ہو رہے تھے یوں بھی آسمان کہر آلود ہو رہا تھا۔ اور روشنی زمین تک نہ پہنچ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ لیکن جو لوگ تاریکی میں دیر تک موجود رہے ہوں وہ کم از کم اس تاریکی میں مدھم سایوں کی موجودگی کا اندازہ ضرور لگا سکتے تھے۔

انہیں ابھی آگے بڑھتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دفعتاً ہی گھوڑوں کی ہنہناہٹ ان کے کانوں میں گونجی اور دونوں کے بدن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ آواز جہاں سے آئی تھی وہاں سے ان کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ قرب و جوار میں کوئی ایسا ٹیلہ بھی نہیں تھا۔ جس کے عقب میں پوشیدہ ہوا جا سکتا تھا۔ دونوں پھرتی سے زمین پر لیٹ گئے اس وقت اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ کار نہیں تھا گھوڑوں کی آوازیں دوبارہ گونجیں اور انہوں نے ان کی سمت کا اندازہ لگایا۔ ایک اونچا ٹیلہ ان سے کافی دور موجود تھا۔

یقیناً گھوڑوں کی آوازیں اسی ٹیلے کے عقب سے آئی تھیں وہ زمین پر سانسیں روکے لیٹے رہے۔ ان کی نظریں ٹیلے کا طواف کرتی رہیں۔ گھڑسوار ٹیلے کے عقب سے برآمد نہ ہوئے۔ جس سے اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ وہاں رکے ہوئے ہیں کچھ دیر بعد شبان نے سرگوشی کی۔

"اب کیا کیا جائے۔ وہ ہمیں یہاں سے آگے بڑھتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں اور ان سے بچ کر آگے نکل جانے کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔"

"اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں کہ ہم انہیں ختم کر دیں۔" جیوا نفرت بھرے لہجے میں بولا۔

"ان کی تعداد کا اندازہ نہیں ہے۔"

"وہ کتنے بھی ہوں۔ ہم ضرور انہیں ختم کر دیں گے۔ تو بے فکر رہ شبان میرا کلہاڑہ ان سب کا خون

چاٹ لے گا۔ اگر ہم اس کوشش میں مر بھی گئے تو برا نہ ہوگا۔ یہ سب ہماری بستی کے لوگوں کے قاتل ہیں۔"

"تو پھر دیر کرنا بے کار ہے۔" شبان بھی پر جوش ہوگیا۔ دونوں نے اپنی کمر سے بندھے ہوئے کلہاڑے سنبھالے اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ البتہ ٹیلے تک پہنچتے ہوئے انہوں نے قدموں کی آوازیں نہیں پیدا ہونے دی تھیں۔ ٹیلے کے عقب میں ان کی خوش قسمتی سے صرف دو محافظ موجود تھے۔ جنہوں نے اپنے آہنی لباس خود اتارے ہوئے تھے اور ٹیلے سے کمر لگائے آرام کر رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر ان کے گھوڑے ہوشیار معلوم ہوتے تھے۔ اور کسی اجنبی کی موجودگی کا احساس کر کے کنوتیاں بدل رہے تھے۔

شبان اور جیوا ان پر موت بن کر جھپٹے اور ان کے وزنی کلہاڑے ان کی کھوپڑی کی ہڈیاں کاٹتے ہوئے گردن میں اتر گئے۔ ان میں سے ایک آخری چیخ ابھری۔ اور فضا میں گردش کرنے لگی۔ شبان اور جیوا نے ہوشیار جنگجوؤں کی مانند سب سے پہلے ان کے ہتھیاروں پر ہاتھ ڈالے اور ان کی بندوقیں قبضے میں کر لیں۔ ان کے کارتوس اپنی تحویل میں لے کر وہ گھوڑوں کی طرف بڑھے اور اچھل کر ان پر سوار ہو گئے۔ لیکن شاید کچھ اور محافظ آس پاس موجود تھے۔ اور شاید کسی وجہ سے ان کی طرف متوجہ بھی ہو گئے تھے کیونکہ دوسرے لمحے کئی فائر ہوئے اور گولیاں ان کے آس پاس سے نکل گئیں۔ انہوں نے سوچا تھا کہ اب انہیں آسانی ہو جائے گی۔ لیکن گھوڑوں کی پشت پر سوار ہوتے ہی ان پر گولیوں کی بارش شروع ہو گئی تھی۔

اس کا قطعی موقع نہیں تھا۔ کہ رک کر جوابی فائر کئے جاتے محافظوں کی سمت کا بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا بے تحاشہ گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ لیکن محافظ تعداد میں کافی معلوم ہوتے تھے اور چاروں طرف سے ان پر یلغار کر رہے تھے۔ گولیوں کی بارش سے اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں پوری طرح ان کی نگاہوں میں ہیں اور وہ بخوبی یہ بات جانتے تھے کہ بھاگنے والے ان کے ساتھیوں میں سے نہیں ہیں۔ جس سمت شبان اور جیوا کو سفر کرنا تھا۔ وہ اب نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

فی الحال ان گولیوں سے بچنے کے لیے وہ بے تحاشا گھوڑے دوڑا رہے تھے اور سمت کا تعین کھو بیٹھے۔ اس وقت نہایت مخدوش حالت پیدا ہو گئی تھی۔ انہیں کافی تشویش لگی ہوئی تھی دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے کا خیال بھی تھا۔ گھوڑے اس وقت بلندیوں کو عبور کر رہے تھے۔ اور ان کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ جبکہ حملہ آور ابھی میدانوں ہی میں تھے اور ان کے قریب پہنچنے کی رفتار زیادہ تیز تھی۔ پھر ایک گولی نے شبان کے گھوڑے کے پاؤں کو زخمی کر دیا۔ گھوڑا لڑکھڑاتا ہوا سر کے بل آ رہا۔ شبان اگر ایک ہوشیار گھڑ سوار نہ ہوتا تو سنگلاخ چٹانوں پر گر کر اس کا بھیجا باہر نکل آتا۔ اور اعضا ٹوٹ پھوٹ جاتے۔

لیکن جیسے ہی گھوڑا زمین بوس ہونے لگا اس نے گھوڑے کی پشت سے چھلانگ لگا دی۔ گھوڑا ڈھلان پر دور تک لڑکھڑاتا چلا گیا اور شبان نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

جیوا نے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ گردن گھما کر شبان کی جانب دیکھا اور پھر صورت حال کی نزاکت محسوس کر کے زندگی کی پرواہ کیے بغیر واپس لوٹا۔ شبان کا گھوڑا تو کافی دور جا چکا تھا اور زمین پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ جیوا نے اپنے گھوڑے کو شبان کے قریب لا کر اپنا ہاتھ سہارے کے لیے پیش کیا اور دوسرے

لمحے شبان کو اپنے گھوڑے پر سوار کر لیا۔ خود جیوا کا گھوڑا بھی بدحواس ہو رہا تھا اور آس پاس سے نکلتے ہوئے دہکتے انگاروں سے خوفزدہ ہو رہا تھا۔ پھر دو سوار اس کی پشت پر آ گئے تھے۔ چنانچہ وہ بری طرح بدکنے لگا۔

شبان نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

"یہ بلندیاں اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو آگے جا کر ختم ہو جائیں گی ہمارے پاس راہ فرار نہیں ہے۔ ان لوگوں نے ہمیں گھیر لیا ہے۔"

"یوں لگتا ہے جیسے ہم دریائے نیل کی طرف جا رہے ہیں۔"

"میرا بھی یہ ہی اندازہ ہے۔"

"مگر اس طرف سے تو ہمارے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"ہاں...... ایسا ہی ہے۔" جیوا نے سرد لہجے میں کہا اور اس دوران میں محافظ انہیں تین سمت سے گھیرے ہوئے مسلسل ان کے پیچھے آ رہے تھے اور اب انہوں نے یہ بلندیاں طے کرنا شروع کر دی تھیں۔ گھوڑا مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ پہاڑی کٹاؤ سامنے آ گیا۔ جس کے آگے راستہ مسدود تھا اور نشیب میں دریائے نیل بہہ رہا تھا۔ پہاڑی چٹانوں سے سر ٹکراتے ہوئے وہ ہولناک آوازیں پیدا کر رہا تھا۔ یہ دریا اس علاقے کا سب سے بڑا دریا کہلاتا تھا اور اسے مقامی زبان میں برف کا دریا کہا جاتا تھا۔ پہاڑوں سے پگھلنے والی برف سے یہ دریا بنا تھا اور اس کا پانی اتنا سرد ہوتا تھا کہ اطراف میں اس سرد پانی کی وجہ سے موسم ہمیشہ سرد رہتا تھا۔

اس دریا میں کودنا ہی موت کو آواز دینا تھا۔ لیکن موت کی آوازیں چاروں طرف سے ابھر رہی تھیں کہ دہکتے ہوئے انگارے ان کے جسموں کو چھو لیں اور وہ بے جان ہو جائیں۔ گھوڑے نے ہنہنا کر واپس پلٹنے کی کوشش کی تو دونوں اس کی پشت سے کود گئے وحشی جانور یہاں آ کر پوری طرح بدک گیا تھا۔ کیونکہ اس نے بھی اپنے سامنے موت کو دیکھ لیا تھا۔ شبان نے جیوا کو دیکھا۔ جیوا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم دریا میں چھلانگ لگا دیں۔" شبان نے گہری سانس لی اور بولا۔

"رب عظیم کی یہ ہی مرضی ہے تو یہ ہی سہی۔ یہاں سے کسی سمت نکلنا یا اپنے آپ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ہمارے لیے ناممکن ہے۔"

"ہاں اگر ہم نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے ان کی تحویل میں دے دیا۔ تو ہم سے وہ ہمارے خاندان کے بارے میں پوچھیں گے اور اس کے بعد ہمارے ماں اور باپ زندہ نہ رہ سکیں گے۔"

"نہیں...... ہم ان کے لیے بدنامی کا باعث یا موت کا سبب نہیں بنیں گے۔ شبان نے کہا اور دونوں بھائیوں نے متفق ہو کر دریا کے کٹاؤ سے نیچے چھلانگیں لگا دیں۔ ان کے جسم یخ بستہ ہواؤں کو چیرتے ہوئے گہرے پانیوں کی جانب سفر کر رہے تھے۔

♥ ...... ♥ ...... ♥

شیراک انہیں یہ کہانی سنا رہا تھا اور وہ حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یقین نہیں

آتا تھا کہ وہ ان پراسرار داستانوں کے ساتھی بن گئے ہیں۔ بھلا ان کا اس انوکھی دنیا سے کیا تعلق۔ نجانے کمبخت سپار کو نے کہاں لا پھینکا تھا۔ جو کچھ نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر دل و دماغ وحشت کا شکار ہو رہے تھے۔ کامران کو سب سے زیادہ نعیم خان پر حیرت تھی۔ کامران کی فطرت تو بہت حد تک تبدیل ہو چکی تھی اور وہ ہر طرح کی صورت حال برداشت کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ لیکن نعیم خان جس پامردی سے ان تمام حالات کا مقابلہ کر رہا تھا اس پر کامران کو حیرت تھی۔ بلکہ وہ تو یہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ نعیم خان اس سے زیادہ مستعد ہے۔ اور اس تمام صورت حال سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد کامران شیراک سے متاثر تھا۔ جو بستی کمالیہ کی کہانی اس طرح سنا رہا تھا کہ جیسے وہ اس کی بستی کی کہانی ہو۔ شمبا نے کمالیہ کو جس طرح تباہ کیا تھا۔ وہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس کے بعد اس بات کی یقینی وضاحت ہو جاتی تھی کہ آنے والے وقت میں بگڑا ہوا سانڈ یا بھوکا شیر کسی بھی جانب رخ کر سکتا ہے۔ چھوٹے آدمی کو جب طاقت مل جاتی ہے تو وہ ہر شخص کے لیے خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ اگر وہ کوئی صاحب ظرف ہوتا اور اس بات کا خیال کرتا کہ ماضی میں اس کے ساتھ رحم اور انصاف سے کام لیا گیا ہو تو شاید اس سے خطرہ محسوس نہ کیا جاتا۔

لیکن اب تو نجانے کون کون سی بستیاں شمبا کے غیظ و غضب کا شکار ہونے والی تھیں۔ بہر حال اس وقت بات صرف کمالیہ کی ہو رہی تھی۔ شیراک نے کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور شمبا کو اپنے ان دو ساتھیوں کی صورت میں جرمن جنھیں باہر جانے والے راستے پر کلہاڑوں سے قتل کر دیا گیا تھا اور یہ بات طے ہو گئی کہ کچھ لوگ یقینی طور پر کمالیہ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں کو بلا کر غضبناک لہجہ میں کہا۔

''کون یہاں سے باہر نکلا ہے؟ اس کے بارے میں مجھے مکمل طور پر معلومات درکار ہیں اور اگر یہ معلومات مجھے چند لمحوں کے اندر فراہم نہ کر دی گئیں تو سمجھ لینا کہ تم لوگوں کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی اور شمبا کے آدمی جانتے تھے کہ شمبا اگر کوئی بات کہہ دیتا ہے۔ تو اسے پورا کرنے کے لیے یقینی طور پر عمل کر ڈالتا ہے۔ چنانچہ وہ قہر اور غضب بن کر بستی والوں پر ٹوٹ پڑے اور ان محافظوں نے پوری بستی کو اپنے گھوڑوں کے پیروں تلے روند ڈالا۔ جو بستی کے ایک ایک شخص کو پیغام دے رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''بستی والو تم میں سے ہر شخص اس میدان میں جمع ہو جائے۔ جو مشرقی کنارے پر وسعتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ہر خاندان الگ الگ ڈیرہ ڈالے اور اگر اس حکم کی تعمیل نہ کی گئی تو شمبا کے حکم پر شام تک بستی میں قتل عام شروع ہو جائے گا۔ بے چارے بستی والے ہر لمحہ ایک نئی مصیبت کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اس نئے حکم پر لرز اٹھے۔

عام خیال یہی تھا کہ وہاں میدان عظیم میں انہیں قتل کر دیا جائے گا اور اگر قتل نہیں کیا جائے گا۔ تو پھر اس طرح اس میدان میں جمع ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ بہر حال جب سورج بلندی پر پہنچا تو پورا میدان کمالیہ کے بے یار و مددگار انسانوں سے بھر چکا تھا۔ اور شمبا کے لڑاکے ان کی ترتیب کر رہے تھے۔ ہر خاندان کو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جمع کیا گیا تھا۔ بوڑھے بچے اور عورتیں تک بے گھر ہو کر

یہاں آ گئے تھے۔ ان کے ہونٹوں سے آہیں نکل رہی تھیں۔ لیکن زور سے رونے کی اجازت کسی کو بھی نہیں تھی۔ چنانچہ ان کی آہ و زاری بالکل بند تھی۔ البتہ آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا تھا۔ تب شمبا غیظ و غضب کا دیوتا بن کر اپنے گھوڑے پر سوار ان کے درمیان پہنچا اور ایک ایک قدم آگے بڑھ کر ان کے خاندانوں کے درمیان چکر لگانے لگا۔ پھر اس نے ان کے سامنے رک کر کہا۔

''رات کو کچھ افراد بستی سے باہر نکلے ہیں اور میرے دو آدمیوں کو قتل کر کے یہاں سے فرار ہو گئے ہیں۔ بعد میں انہوں نے دریا میں چھلانگ لگا کر اپنے آپ کو ہماری گرفت سے محفوظ کر لیا ہے۔ وہ کون ہیں اور ان کا تعلق کون سے خاندان سے ہے۔ مجھے یہ معلومات فوراً چاہئیں اگر یہ معلومات مجھے حاصل نہ ہو سکیں اور یہ نہ پتہ چل سکا کہ وہ کس مقصد سے باہر گئے ہیں اور کس طرح گئے ہیں تو یہ سمجھو کہ اس طرح لوگوں کو قتل کر دوں گا کہ تم لوگوں کو لاشیں اٹھانا مشکل ہو جائے گا۔ دبی ہوئی چیخیں آہیں، اور سسکیاں، بلند ہوئیں۔ تو شمبا نے گرج کر کہا۔

''نہیں رونے کی اجازت نہیں ہے۔ رونے کے لیے تمہارے پاس بہت وقت پڑا ہوا ہے۔ جو کہا جا رہا ہے اس کی تعمیل ہو۔'' شمبا کے خوں خوار سپاہی، ان کے سامنے جا جا کر ان سے سوالات کرنے لگے۔ بستی کے لوگ سہمی ہوئی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے اور یہ جاننا چاہتے تھے کہ ان کے گھروں میں سے کون غائب ہے۔ وہ جو مر چکے تھے ان کی اطلاع تو دوسروں کو مل ہی چکی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ کون ہیں۔ جو بستی سے نکل گئے ہیں۔ تب بوڑھے کے پڑوسی نے بوڑھے کا چہرہ دیکھا اور گردن گھما کر اس کے پوتوں کو تلاش کرنے لگا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ اس کی بہو کے علاوہ کوئی اس کے پاس نہیں ہے۔ چنانچہ اس شخص کے چہرے پر چونکنے کے آثار پیدا ہو گئے۔ چونکہ وہ جانتا تھا کہ بوڑھے کے پوتے شبان اور جیوا کل تک زندہ سلامت موجود تھے۔

لیکن اب وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس کی بے چینی کو بوڑھے نے بھی دیکھ لیا تھا۔ تب ہی دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور بوڑھے کی آنکھیں شیشے کی طرح چمکنے لگیں۔ وہ اپنے ساتھی کو غور سے دیکھ رہا تھا اور ساتھی کے چہرے پر دہشت کے آثار پھیل گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ شمبا کے ساتھی اس جانب آ رہے ہیں۔ پھر انہوں نے بوڑھے کے پڑوسی سے اس کے خاندان کے بارے میں پوچھا، اور وہاں سے چند قدم آگے بڑھ کر بوڑھے کے سامنے پہنچ گئے۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولے۔

''تیرا بیٹا کہاں ہے؟'' سپاہی نے پوچھا۔

''طویل عرصہ قبل وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔'' بوڑھا غمزدہ لہجے میں بولا اور وہ لوگ اسے غور سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ جبکہ بوڑھے کے پڑوسی نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور اس کے اہل خاندان بھی منہ بند کیے خاموش کھڑے رہے تھے سپاہی دوسرے لوگوں سے سوالات کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور جب وہ ذرا دور نکل گئے تو بوڑھے کے پڑوسی نے بوڑھے سے کہا۔

''تیرے دونوں پوتے کہاں ہیں؟''

''کیا خاموشی مناسب نہیں ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے اپنے پوتوں کو ان لوگوں کے خوف سے

چھپا دیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ وہ کمالیہ کے لیے امداد لینے گئے ہیں۔" پڑوسی خاموش ہو گیا تھا۔ سپاہیوں کی یہ پوچھ گچھ رات گئے تک جاری رہی تھی اور تمام دن اس میدان میں کھڑے کھڑے بسر کرنے والے کمالیہ بستی کے لوگوں کو رات گئے اپنے اپنے گھروں میں جانے کی اجازت ملی تھی۔ یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ یہاں سے باہر جانے والے کون ہیں؟ لیکن شمبا جانتا تھا کہ وہ لوگ یقینی طور پر کمالیہ بستی ہی سے تعلق رکھتے ہیں جو اس کے دو ساتھیوں کو قتل کر کے باہر نکل گئے ہیں۔

دو ساتھیوں کو قتل کرنے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یا ان کی موت شمبا کے لیے کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ جن لوگوں نے انہیں قتل کیا ان کے اندر یہ دلیری کہاں سے پیدا ہو گئی اور کہیں یہ دلیری دوبارہ کسی کے دل میں نہ جاگ اٹھے۔ چنانچہ اس کا سدباب کرنا ضروری تھا۔ دوسری صبح اس نے اعلان کیا آخرکار وہ یہ پتہ تو چلا ہی لے گا کہ اس کے دو ساتھیوں کو قتل کر کے بستی سے باہر نکل جانے والے کون تھے؟ لیکن اس کے ساتھ ہی بستی والوں پر جو قیامت ٹوٹے گی وہ ان کے تصور سے بھی باہر ہو گی۔

کمالیہ والے خاموشی سے برداشت کر گئے۔ ان کے اندر اب اتنی سکت نہیں تھی کہ شمبا کی کسی بات کا جواب دے سکیں۔ شمبا نے یہاں کام شروع کر دیا اور نجانے کس کس طریقے سے وہ بستی کمالیہ والوں کو اس سلسلے میں خوفزدہ کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ چنانچہ بہت سے درخت کاٹے گئے اور جگہ جگہ انہیں نصب کر کے پھانسی گھر بنائے جانے لگے کمالیہ کے بدنصیب باشندے یہ نہیں جانتے تھے کہ پھانسی دینے کے لیے کس کس کو منتخب کیا جا رہا ہے۔ یہ اجتماعی پھانسی گھر دو دن میں تیار ہو گئے اور ان میں بڑے بڑے رسے پھندوں کی شکل میں لٹکا دیئے گئے۔ تب شمبا نے اعلان کیا۔

"بستی والو! تمہارے سردار کے باپ نے مجھے شہر بدر کیا تھا اور ذلیل و خوار کر کے اس بستی سے نکالا تھا۔ اس وقت اس کے باپ کے جتنے ہمنوا تھے۔ وہ سب میرے علم میں ہیں اور اب میں انہیں بتاؤں گا کہ شمبا کو اس بستی سے نکالنے کا کیا نتیجہ ہو سکتا تھا۔ گو اس کام میں ایک طویل عرصہ لگا ہے۔ غالباً چودہ یا پندرہ برس کے بعد ہی سہی۔ میں اپنے انتقام کی تکمیل کر رہا ہوں۔ چنانچہ کل شام سورج ڈوبنے کے بعد جب تاریکی چاروں طرف مسلط ہو جائے گی ان تمام لوگوں کو ان پھانسی کے پھندوں میں لٹکا دیا جائے گا اور یوں میرے انتقام کی تکمیل ہو جائے گی۔ کمالیہ والو! ان لوگوں سے اپنا انتقام پورا کرنے کے بعد میں اس بستی کی سرداری کا منصب سنبھالوں گا ہو سکتا ہے۔ تم لوگوں کو وفادار پا کر میں تمہیں معاف کر دوں۔ حالانکہ تمہارا تعلق بھی اسی بستی سے ہے۔ جہاں سے مجھے بے عزت کر کے نکالا گیا تھا۔ لیکن ایک بات کان کھول کر سن لینا کہ اس کے بعد پوری بستی شمبا کی محکوم ہو گی۔ یہاں ہر گھر میں چراغ میرے حکم پر جلے گا اور میرے حکم سے بجھے گا۔ تم سب کو میرے ہر حکم کی تعمیل کرنا ہو گا۔ چنانچہ انتظار کرو۔ اس وقت کا جب ان لوگوں سے تمہاری بستی کو نجات مل جائے۔ جو تمہاری تباہی لے کر آئے گا۔" لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ فرعونا بہت اچھا سردار تھا اور جن لوگوں کو پھانسی کے لیے منتخب کیا گیا تھا وہ بھی بہت معزز اور عزت کرنے والے لوگ تھے۔ اس وقت تو ہر ایک کو اپنی جان کی فکر تھی۔ چنانچہ کون کسی کے لیے روتا۔ رونے کے لیے تو ان لوگوں کے گھرانے ہی کافی تھے۔ جنہیں موت کی سزا دی جا رہی تھی۔ وہ سسک رہے تھے۔ بے آواز رو رہے تھے۔ جو عذاب ان پر نازل

ہوا تھا۔ اس سے بچنے کا کوئی راستہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

بہرحال اب وہ شمبا کے رحم و کرم پر تھے۔ پھر جب دوسرا دن طلوع ہوا تو موت ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے لگی۔ جن لوگوں کے لیے پھانسی گھر بنایا گیا تھا۔ وہ انتظار کرتے رہے۔ ہر شخص کا سینہ غم سے پھٹا جا رہا تھا اور شمبا کے ہرکارے جو قرب و جوار میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ ان لوگوں کو پھانسی گھر کے نزدیک جمع ہو جانے کا حکم دینے لگے اور بدنصیبوں نے اپنی بستی والوں کی موت کا نظارہ دیکھنے کے لیے خود کو تیار کیا۔ وہ لوگ بھیڑ اور بکریوں کی مانند تھے۔ چنانچہ اس طرح چلتے ہوئے وہ پھانسی گھر کے کنارے پہنچ گئے۔

وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ کہ شام کی سیاہیاں تقدیروں پر چھانے لگیں اور موت کے قہقہے گردش کرنے لگے۔ انہیں زنجیروں میں باندھ کر پھانسی گھروں تک لایا گیا اور پھر انہیں اونچی جگہ پر کھڑا کر دیا گیا۔ جو خاص طور سے اس مقصد کے لیے بنائی گئی تھیں۔ شمبا نے مسکراتی نگاہوں سے سب کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر شیطان کی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"کمالیہ والو! ان سب سے نجات۔ تم سب کے لیے نجات ہو گی اور اس کے بعد میری سرداری میں اس بستی میں نئے دور کا آغاز ہو گا۔ دیکھو! موت کس طرح ان کی جانب بڑھ رہی ہے۔" شمبا کے اشارے پر شمبا کے آدمی ان لوگوں کی جانب ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگے اور بستی والوں کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

"لیکن یہ آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے۔ جنہوں نے اچانک ہی شمبا کے ان آگے بڑھنے والے ساتھیوں پر گولیوں کی بارش کی اور انہیں وہیں ڈھیر کر دیا۔ یہ گولیاں نجانے کہاں سے چلائی گئی تھیں افراتفری پھیل گئی۔ شمبا کے ساتھ جو خونخوار محافظ موجود تھے۔ وہ آتش پا ہو گئے اور اس کے بعد شمبا کے اشارے پر قتل عام شروع ہو گیا۔ یوں ساری بستی تباہ ہو گئی اور جگہ جگہ آتش و آہن کے مظاہرے ہونے لگے۔ یہ کہانی ہے بدنصیب کمالیہ کی۔ دو افراد جو دریا میں بہتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے۔ بچا لیے گئے۔ یعنی جیوا اور شبان جو اس بوڑھے کے پوتے تھے اور یہ بچی تو شالہ جنہیں تم لوگ یہاں لے کر آئے ہو......" شیراک دردبھرے انداز میں خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ خداوند عالم ہم کس مصیبت میں پھنس گئے۔ برا ہو اس ذلیل سپارکو کا جو ہمارے لیے اس عذاب کا باعث بنا تھا۔ شیراک نے کہا۔

"معزز مہمانوں! تم تو شالہ کو لے کر یہاں تک آئے ہو۔ حالانکہ میں جانتا ہوں میری بستی کے لوگ اس بات کے خلاف ہو جائیں گے کہ ہم شمبا سے کوئی خطرہ مول لیں۔ لیکن بہرحال دیکھیں گے اور دیکھ کر غور کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ میں تم لوگوں کو پوشیدہ رکھنے کے لیے بھرپور کوشش کروں گا۔" تو نعیم خان نے کامران کو دیکھا اور کامران نے نعیم خان کو اور اس وقت وہ مصلحتاً خاموش ہو گئے۔ لیکن جب انہیں تنہائی مہیا کی گئی تو کامران نے نعیم خان سے کہا۔

"نعیم خان! اس خوفناک مکان میں داخلے کے دروازے کو شاید ہم عمر بھر نہ تلاش کر سکیں۔ جس کے ایک دروازے سے ہم اس پراسرار دنیا میں پہنچے ہیں۔ لیکن اب یہ بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔" نعیم خان

کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔اس نے کامران کی جانب دیکھا پھر بولا۔

''ایک بات بتاؤ گے؟''

''کیا؟''

''دیکھو زندگی میں کیا کچھ نہیں کیا ہم نے جرم وسزا کی دنیا میں ہمارا بڑا نام ہے، کامران......لیکن ایک ایسی دنیا۔ جو ہمارے سامنے آتی ہے تو کیا ہم اس کی دل کشی سے انکار کر سکتے ہیں۔'' کامران نے حیرت سے نعیم خان کی طرف دیکھا اور کہا۔

''یار ساری باتیں اپنی جگہ، ایک بات محسوس کی ہے وہ یہ کہ کم از کم اس دنیا میں آنے کے بعد تو انتہائی بہادر ہو گیا ہے۔'' نعیم خان پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر بولا۔

''بزدل تو میں کبھی بھی نہیں تھا۔ بس تم یوں سمجھ لو کہ ایک تحریک ہوتی ہے انسان کے اندر۔ وہ تحریک اس کی فطرت میں رچ بس جاتی ہے اور پھر وہ اسی تحریک کے زیر اثر کام کرتا ہے۔ دیکھو! میں تمہیں ایک بات بتاؤں ہم اس پراسرار دنیا میں آ گئے ہیں اور وقت کچھ ایسی شکل اختیار کر گیا ہے کہ ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمیں یہاں کسی خاص مقصد کے تحت بھیجا گیا ہے۔ جب یہ ایک خاص مقصد ہماری تقدیر کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ تو کیوں نہ ہم کوئی ایسا کام کریں۔''

''میں یہی تو کہہ رہا تھا۔ نعیم خان کہ اب تیرے اندر ایک انوکھی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ جب کہ تو ہر نئے کام سے بیزاری کا اعلان کرتا تھا۔''

''سچی بات تو یہ ہے کامران کہ سارا کام میرے لیے بڑی دلچسپی کا باعث ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے یہاں کچھ کر کے زیادہ خوشی حاصل ہو رہی ہے اور میری ایک اور رائے بھی ہے۔''

''کیا؟''

''یہ کہ تو خود بھی ان معاملات میں دلچسپی لے ہمارے لیے یہ بڑی دلکشی کے حامل ہیں۔'' کامران گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اگر غور کیا جاتا تو یہ سچ ہے کہ نعیم خان غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ کامران نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو میرے پیارے دوست! اب کیا فیصلہ ہے تیرا؟''

''فیصلہ ہمارا نہیں تقدیر کا ہے۔ البتہ عمل کے بارے میں ہم فیصلے کر سکتے ہیں۔''

''وہ بھی تقدیر ہی کے فیصلے ہوں گے۔ جو ہمارے لیے عمل متعین کریں گے۔''

''بڑی اچھی بات کہی ہے تو نے۔ جو ہم سوچیں گے وہی ہماری تقدیر کی سوچ ہو گی۔''

''تو پھر بتا! کیا سوچا جائے؟''

''میں بتاؤں؟ شیراک بہت اچھا انسان ہے۔ وہ کبھی بھی یہ بات نہیں کہے گا کہ ہم اس کی بستی چھوڑ کر چلے جائیں۔ یہ مہمان نوازی کے آداب کے خلاف بات ہو گی۔ لیکن جس چیز کو ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ کسی اور کے لیے باعث تکلیف ہے۔ ہمیں کیا غرض ہے کہ ہم اس کی تکلیفوں میں اضافہ کر دیں۔ یعنی۔''

''کل دن کی روشنی میں ہم یہ بستی چھوڑ دیں گے۔''

''کہاں جائیں گے؟''

''تقدیر کے فیصلوں کی تلاش میں۔'' نعیم خان نے جواب دیا اور کامران اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ لیکن جب دوسری صبح انہوں نے شیراک سے اپنے مقصد کا اظہار کیا تو شیراک انہیں عجیب سی نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔

''میں جانتا ہوں اور واقعی مجھے وہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ جو میں پچھلی رات کہہ چکا ہوں۔''

''کیا سردار شیراک؟''

''یہی کہ مہمان نوازی کے اصولوں کے مطابق مجھے تمہارے لیے ہر تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن آداب مہمانی کچھ ہوتے ہیں۔ تو آداب میزبانی بھی کچھ ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ دونوں کو اپنا فرض کرنا چاہیے تم اپنا فرض پورا کرنے کے لیے تیار ہو تو ہم بھی اپنا فرض پورا کریں گے۔''

''تمہارا فرض کیا ہے؟''

کہ اب تو شالہ تمہارے پاس پہنچ چکی ہے اور ہمارا بس یہی مقصد تھا۔ تھوڑا سا ہمیں آگے بڑھنے کی اجازت دو۔''

''مگر تم۔''

''نہیں سردار شیراک! اس سلسلے میں ہم تمہاری کسی بات کو نہیں مانیں گے۔''

''مجھے دکھ ہو گا۔''

''لیکن ہمیں نہیں ہو گا اور ہم تمہیں ایک اچھے دوست کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔''

''پھر مجھے بتاؤ تمہارے لیے کیا کروں؟''

''نہیں کچھ بھی نہیں بس یوں سمجھ لو ہم جا رہے ہیں۔''

''ایسے نہیں۔''

''پھر۔''

''تمہیں یہاں سے رات کی تاریکیوں میں جانا پڑے گا۔ تا کہ یہ پتا نہ چلے کہ تم یہاں سے نکلے ہو۔'' انہوں نے سردار شیراک کی مشکل کو سمجھا اور اس کے بعد اس کی بات کو تسلیم کر لیا۔ چنانچہ اس رات انہیں عمدہ قسم کے گھوڑے فراہم کیے گئے، کھانے پینے کی اشیا اور اس کے علاوہ ان علاقوں کے بارے میں تھوڑی سی معلومات اور پھر ہم دونوں نے رات کی تاریکیوں میں اپنے گھوڑے آگے بڑھا دیئے۔

آدھی رات تک یہ سفر جاری رہا۔ چاند کے ساتھ ساتھ وہ اپنی مسافتیں طے کر رہے تھے۔ پھر آدھی رات گزری تھی کہ چاند پر دھندلاہٹیں طاری ہونے لگیں۔ جن علاقوں سے وہ گزر رہے تھے۔ چاندنی میں وہ انہیں بے حد پراسرار نظر آ رہے تھے۔ تاحد نظر سنگلاخ زمین جس پر جگہ جگہ چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ یہاں سبزے کا نام و نشان نہیں تھا۔

♥ ...... ♥ ...... ♥

وہ سب تنکوں کی طرح منتشر ہو گئے تھے۔ علی سفیان، امینہ سلفا، رانا چندر سنگھ، کرنل گل نواز، قزل

ثنائی اور شعورہ، درحقیقت پہاڑوں کی پراسرار وادیوں میں بھٹکتے ہوئے انہیں زندگی کے تلخ ترین تجربات ہوئے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں کردار کامران کا رہا تھا۔ حالانکہ کرنل گل نواز نے کامران کو صرف ایک اچھے ساتھی کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ لیکن بعد میں کامران ایسی پراسرار شخصیت اختیار کرتا چلا گیا کہ وہ سب اس کے لیے مجبور ہو گئے۔ کرنل گل نواز کو آج بھی یقین تھا کہ کامران اس سے مخلص تھا اور یقینی طور پر اس کی شخصیت میں کچھ ایسی باتیں پوشیدہ تھیں جو شاید اس کے علم میں بھی نہیں تھیں۔ بہت عرصے تک وہ ان کے لیے وہاں ان پراسرار وادیوں میں بھی کام کرتا رہا۔ لیکن پھر اس کے بعد وہ گم ہو گیا۔

کرنل گل نواز واقعی بیمار ہو گیا تھا۔ لیکن اس طرح بھی نہیں کہ اس کی حالت بہت زیادہ بگڑ جاتی۔ ہاں! مسلسل ناکامیوں اور موسمی اثرات نے اس کی صحت پر برا اثر ڈالا تھا۔ غرض یہ کہ انہیں وہاں سے واپس پلٹنا پڑا تھا۔ لیکن پھر راستے میں، قزل ثنائی اور شعورہ نے ان سے اجازت مانگ لی۔ قزل ثنائی نے کہا۔

''یہ حقیقت تو واضح ہو چکی ہے کہ اب خزانے ہماری دسترس میں نہیں ہیں۔ چنانچہ اب وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے۔ میں نے اور شعورہ نے اپنے پروگرام ترتیب دے لیے ہیں۔ میں آپ لوگوں سے اجازت چاہتا ہوں۔'' رکنے کی وجہ بھی نہیں تھی۔ البتہ قزل ثنائی نے کرنل گل نواز سے یہ ضرور پوچھا تھا۔

''اب آپ کا کیا پروگرام ہے کرنل؟''

''کچھ مایوسی سی ذہن پر طاری ہو گئی ہے۔ میں تو کم از کم اپنے گھر، وطن واپس جاؤں گا۔''

''ٹھیک آپ اب آرام کریں تو زیادہ بہتر ہے۔'' قزل ثنائی تو چلا گیا لیکن اس کے بعد رانا چندر سنگھ نے اپنے پروگرام میں کچھ تبدیلی کی اور کرنل گل نواز کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا، علی سفیان اور امینہ سلفا بھی ساتھ ہی تھے۔ وہ لوگ مختلف ملکوں میں گھومتے رہے اور اس کے بعد آخرکار کرنل گل نواز کی فرمائش پر یہ افراد وطن واپس چل پڑے۔ قزل ثنائی نے چلتے وقت انتہائی خفیہ طریقے سے ایک بند لفافہ کرنل گل نواز کو دیتے ہوئے کہا تھا۔

''کرنل براہِ کرم وعدے کی پابندی کریں۔ یہ لفافہ آپ اپنے گھر جا کر ہی کھولیں اور اس کے بعد جو کچھ اس میں تحریر ہے۔ اس پر غور کریں اور صحیح فیصلہ کریں۔'' کرنل گل نواز نے لفافہ رکھ لیا تھا۔ وطن واپس آنے کے بعد قزل ثنائی کے الفاظ اس کے ذہن میں کھٹکتے رہے۔ علی سفیان اور امینہ سلفا اس کے ساتھ ہی آئے تھے۔ رانا چندر سنگھ نے اجازت مانگ لی تھی۔ حسن شاہ وغیرہ کا بھی کوئی پتا نہیں تھا۔

بہرحال یہ مہم ایک ناکام مہم قرار دی گئی۔ علی سفیان نے کہا۔

''میں زندگی کا بہترین مشغلہ مہم جوئی سمجھتا ہوں۔ معاف کرنا کرنل، تمہارے ساتھ یہ مہم جوئی کر کے مجھے کوئی خاص فائدہ نہیں ہو سکا۔ اب میں دیکھوں گا کہ کون سی نئی پارٹی بنا سکتا ہوں۔ جو زیادہ موثر ہو۔ چنانچہ میں بھی یہاں سے واپسی کا پروگرام بنا رہا ہوں۔''

کرنل گل نواز نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ البتہ جب شاہ نواز نے اسے تنہائی میں بتایا کہ کامران یہاں آیا تھا تو کرنل گل نواز تو کھول کر رہ گیا۔

''تم نے اسے روکا کیوں نہیں۔''

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایک انتہائی مختصر ملاقات کر کے اور آپ کے بارے میں معلومات حاصل کر کے یہاں سے اس طرح چلا جائے گا۔ میں نے سوچا کہ ظاہر ہے وہ ہمارے پاس ہی رہے گا مگر وہ گم ہو گیا۔''

''وہ کون تھا۔ کیا تھا۔ کچھ پتا نہیں چل سکا۔ کرنل گل نواز نے پھر قزل ثنائی کا دیا ہوا لفافہ کھولا۔ اس میں ایک پرچہ تھا اور اس پرچے نے کرنل گل نواز کو ششدر کر کے رکھ دیا تھا۔ قزل ثنائی نے لکھا تھا۔

عزیز کرنل گل نواز!

میں نہ کوئی جادوگر ہوں نہ کوئی دیوتا نہ درویش، بس میرے پاس تھوڑا سا علم ہے جو مجھے بزرگوں اور کتابوں سے حاصل ہوا ہے۔ میں اس علم سے تکے بازی کرتا رہتا ہوں اور یہ تکے بازی کافی حد تک سچ ثابت ہو جاتی ہے۔ سمجھ لو یہ ہی میرا سرمایہ ہے۔ میں تمہیں تھوڑی سی تفصیل بتانا چاہتا ہوں۔ اس مہم میں میری تھوڑی سی ریسرچ بھی رہی ہے۔ کامران ایک پراسرار کردار ہے۔ وہ اسی دنیا کا سیدھا اور سچا آدمی ہے۔ لیکن کچھ پراسرار قوتوں کی نظروں میں آ گیا ہے اور وہ اس سے کام لے رہی ہیں۔ میں زیادہ نہیں جانتا۔ لیکن خصوصی طور پر ایک نشاندہی کرنا چاہتا ہوں اور یہ نشاندہی علی سفیان کی بیوی امینہ سلفا کے بارے میں ہے۔

امینہ سلفا کو اگر تم کوئی معمولی عورت سمجھتے ہو تو کرنل یہ تمہاری بھول ہے۔ علی سفیان بھی اس کی حقیقت نہیں جانتا وہ صدیوں پرانی ایک روح ہے۔ جو کسی خاص مشن پر کام کر رہی ہے اس کا مشن کیا ہے؟ یہ میں بھی نہیں جانتا اور شاید کوئی بھی نہیں جانتا۔ لیکن وہ انتہائی پراسرار قوتوں کی مالک ہے۔ وہ کامران کے بارے میں بھی جانتی ہے۔

وہ کیا کر رہی ہے؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اس نے علی سفیان کا سہارا اسی لیے پکڑا ہے کہ علی سفیان اپنے کچھ وسائل رکھتا ہے۔

بہرحال وہ کسی کے لیے نقصان دہ نہیں ہے۔ جب تک کہ اس کا اپنا کوئی مفاد مجروح نہ ہو۔ لیکن اگر وہ چاہے تو بہت سے انکشافات کر سکتی ہے۔ تم اس سلسلے میں اگر کوئی کوشش کر سکتے ہو تو ضرور کر لو۔

مخلص

قزل ثنائی

کرنل گل نواز ششدر رہ گیا تھا اور پھر اسے شدید جستجو پیدا ہو گئی۔ اس نے یہ خط علی سفیان کو دکھا دیا اور علی سفیان بھی حیران رہ گیا تھا۔ لیکن اسی رات امینہ سلفا ان پر کھل گئی اس نے علی سفیان سے کہا۔

''علی سفیان۔ کرنل گل نواز کو بلا کر لاؤ۔ ہم لوگ ایک میٹنگ کریں گے۔'' علی سفیان جو قزل ثنائی کے خط کے زیر اثر تھا۔ باہر نکل گیا اور کرنل گل نواز کو بلا کر امینہ سلفا کے کمرے میں آ گیا۔ امینہ سلفا کو دیکھ کر وہ لوگ ششدر رہ گئے تھے۔ امینہ سلفا نے اس وقت روپ ہی بدلا ہوا تھا۔ جب کہ چند ہی منٹ پہلے علی سفیان وہاں سے گیا تھا۔ تو امینہ سلفا دوسرے روپ میں تھی۔ لیکن اس وقت مصر کی کوئی پراسرار حسینہ نظر آ رہی تھی اور اس کے چہرے پر ایک عجیب سی پراسرار کیفیت طاری تھی۔ اس نے ان دونوں کو دیکھا اور اشارہ کیا کہ بیٹھ جائیں۔

پھر اس کے بعد وہ ایک عجیب سے انداز میں پالتی مار کر بیٹھ گئی اور اس نے کہا۔

"علی سفیان تم گواہ ہو اس بات کے...... کہ میں نے آج تک تم سے کوئی غداری نہیں کی تمہارے لیے ایک باوفا عورت رہی ہوں۔ میں نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہاں اس بات کا میں اعتراف کرتی ہوں کہ میری زندگی کا مشن بہت مختلف ہے۔ تم لوگ اسے سمجھ نہ پاؤ گے۔ نہ محسوس کر پاؤ گے۔ علی سفیان میں کسی کی تلاش میں بھٹک رہی ہوں اور یہ تلاش بڑی عجیب و غریب ہے اور اسی کے لیے میں نے تمہارا ساتھ حاصل کیا تھا اور تمہارے ساتھ ان وادیوں میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ لیکن جو کچھ میں تلاش کر رہی تھی وہ مجھے نہیں ملا۔ علی سفیان مجھے اندازہ ہوا ہے۔ کہ زندگی کے راستے بدلے بغیر میں اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ تمہاری زندگی کا مقصد قدیم تبت کی تاریخ کے اس عظیم الشان خزانے کی تلاش ہے۔ میں بھی اس خزانے کے بارے میں تفصیل نہیں جانتی لیکن ایک انکشاف میں تم پر کرنا چاہتی ہوں۔

وہ لڑکا کامران جو بہ ظاہر ایک معمولی شخصیت کا مالک تھا۔ اس خزانے تک پہنچ چکا ہے۔ اس کی آنکھیں اس خزانے کی شناسا ہیں۔ وہ ایک بہت ہی عجیب و غریب کردار ہے۔ یا پھر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ انتہائی پراسرار قوتیں اس کے بارے میں دھوکہ کھا چکی ہیں۔ کیونکہ وہ زمانہ قدیم کے ایک عجیب و غریب کردار کا ہم شکل ہے اور یہ کردار بدھ مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ پوری تفصیل میں تمہیں نہیں بتا سکتی اور نہ ہی میں جانتی ہوں۔ لیکن زمانہ قدیم کا کوئی انوکھا واقعہ اس کی ذات سے منسلک ہے۔ آؤ...... میں تمہیں وہ کیسٹ دوبارہ دکھاتی ہوں۔ جو ہم لوگ لے کر آئے تھے۔"

اینہ سلفا نے تمام تیاریاں کر رکھی تھیں۔ کیسٹ اس کے پاس کہاں سے آئی یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔ لیکن کیسٹ چلنے لگی۔ کرنل گل نواز اور علی سفیان پردے پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ اینہ سلفا کے الفاظ نے انہیں مسحور کر دیا تھا اور وہ اس کی باتوں میں پوری پوری دلچسپی لے رہے تھے۔ پھر اینہ سلفا نے آ کر کیسٹ اس جگہ اسٹل کر دیا۔ جہاں کامران ایک بدھ راہب کے روپ میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ لوگ ششدر رہ گئے۔ کیسٹ پہلے بھی ان کے سامنے آئی تھی لیکن انہوں نے غور نہیں کیا تھا۔ لیکن اب اینہ سلفا نے ان کی نشاندہی کی تو وہ لوگ اس منظر کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ اینہ سلفا کی آواز پھر ابھری۔

"یہ ہے وہ کردار جس کے دھوکے میں کامران کو وہ پراسرار قوتیں اپنا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔ کرنل گل نواز تم گرشک اور سیتا کی بات کرتے ہو۔ علی سفیان کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم کہ گرشک اور سیتا طویل عرصے تمہارے پاس رہ چکے ہیں اور تم نے ان کی مدد کی ہے۔ تمہارے علاوہ اگر کوئی شخص ان کے بارے میں جانتا تھا تو وہ کامران تھا۔ انہوں نے کامران سے رابطہ قائم کر لیا تھا اور اسے دیوتاؤں کی طرح پوجنے لگے تھے پھر اس سفر کے دوران بھی وہ کامران کی راہنمائی کرتے رہے۔ میں نہیں جانتی کہ کامران کہاں ہے۔ لیکن وہ زندہ ہے۔ وہ پراسرار قوتیں اس کے اردگرد بکھری ہوئی ہیں اور وہ آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ تاریخ کا ایک مشن ہے اور وہ پورا نہیں ہو سکا۔ مگر مجھے یہ مشن پورا کرنا ہے۔ اس لیے اب شاید میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں۔" علی سفیان چونک پڑا اور اس نے کہا۔

"تمہارا مطلب کیا ہے۔ اینہ؟"

"میں تم سے رخصت ہو رہی ہوں۔ یہ میرے لیے ضروری ہے۔"

"مگر اس کی ضرورت کیا ہے اینہ؟ تمہارا جو بھی پروگرام ہو میں اس میں تمہارے ساتھ شانہ بشانہ چلنے کے لیے تیار ہوں۔" اینہ مسکرائی اور بولی۔

"تم ایک بہت اچھے انسان ہو علی سفیان، مجھے اپنے جدوجہد کا انداز بدل لینے دو۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد میں دوبارہ تم سے آملوں۔ لیکن اب میرے لیے نئے جہانوں کی تلاش میری مجبوری ہے۔ کرنل بہت اچھے ساتھ کا شکریہ۔" اینہ سلفا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لیکن اینہ تم جا کہاں رہی ہو؟"

"بس علی سفیان جتنا بتا سکتی تھی میں نے تمہیں بتا دیا۔ اگر خزانے کے متلاشی ہو تو کامران کو تلاش کرو۔ وہ خزانے تک جا چکا ہے۔ یہ میرا علم کہتا ہے۔ گرشک اور سیتا بھی اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ وہ نہ جانے کہاں سے کہاں جائے گا۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔" اینہ سلفا نے کہا اور اپنی جگہ سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ علی سفیان جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی طرف دوڑا لیکن دروازے کے باہر خاموش رات پھیلی ہوئی تھی۔ اینہ سلفا کی ہوا کا بھی نشان نہیں تھا۔ علی سفیان دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر رہ گیا۔

کرنل گل نواز اسے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"یار! ساری باتیں اپنی جگہ، مجھے اس سے بہت محبت تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس طرح مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔"

"وہ ایک انتہائی پراسرار کردار تھا۔ علی سفیان تمہیں سنبھلنا ہوگا۔ قزل ثنائی نے جو کہانی سنائی تھی ہیں میرا خیال ہے کہ تم نے اس پر یقین نہیں کیا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں مجھے یقین تھا۔" علی سفیان تھوڑی دیر تک افسردگی سے گردن ہلاتا رہا پھر بولا۔

"خیر میرے لیے وہ صرف ایک عورت تھی۔ ایک بیوی۔ میرا خیال ہے اس سے میرا کوئی روحانی رشتہ نہیں تھا۔ میں اسے بھلانے میں آسانی سے کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن کمال ہے یار! بڑی عجیب بات ہے۔ بڑی عجیب۔" علی سفیان تھوڑی دیر تک افسردہ رہا اس کے بعد اس نے کہا۔

"کیا وہ کامران واقعی ایسی ہی پراسرار شخصیت کا مالک تھا۔"

"خدا کی قسم میں اس کے لیے شدید حیران ہوں۔ کیسی عجیب بات ہے کتنے کردار اس مہم کے دوران ہم سے رخصت ہو گئے۔ جیسے خاور اس کی بیٹی وغیرہ وغیرہ۔" وہ لوگ سوچ میں ڈوب گئے۔ کرنل گل نواز کو واقعی حیرت تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کامران نہ جانے اس وقت کہاں ہوگا اور کامران واقعی زندگی کی مصیبتوں میں گرفتار صحرا گردی کر رہا تھا۔

♥......♥......♥

نعیم خان بالکل مختلف انسان تھا۔ اس کی سوچوں میں زیادہ گہرائی بھی نہیں تھی۔ لیکن کامران جب بھی تھوڑی سی تنہائی حاصل کر لیتا۔ خود پر غور کرنے لگتا۔ وہ خود سے باتیں کرتے ہوئے کہتا تھا۔

"کامران زندگی میں کبھی تو یہ خواہش دل میں ابھری ہوگی کہ تم کبھی صحرا گردی کرو۔ جو واقعات تمہاری زندگی سے چپک گئے ہیں۔ کیا وہ واقعی زندگی کے آخری سانس تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔"

نعیم خان نے اس سے کہا تھا۔

"نعیم خان تم یقین کرو۔ جو کچھ مجھ پر بیت رہی ہے۔ میں قطعی طور پر اس کا اہل نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا کہ تقدیر نے میرے ساتھ یہ کھیل کیوں کھیلا ہے۔ میں تو سیدھی سادی زندگی گزارنے والا ایک نوجوان تھا۔"

"بس تقدیر کے کھیل ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"تقدیر کے کھیل واقعی ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"سفر کی تیسری رات ان کی ملاقات جس شخص سے ہوئی وہ بڑی عجیب و غریب حیثیت کا مالک تھا۔ ایک ایشیائی نوجوان جو کامران کے ہی کے وطن سے تعلق رکھتا تھا اور ان صحراؤں میں کسی خاص مقصد کے تحت بھٹک رہا تھا۔ اس رات موسم بہت شدید تھا۔ ان لوگوں کو صورت حال کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ ان تین دنوں میں انہیں کوئی اور آبادی بھی نہیں ملی تھی۔ جہاں سے وہ اپنے راستوں کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتے۔ نعیم خان تو خیر بہت زیادہ متجسس تھا۔ لیکن کامران کو قزل ثنائی کے الفاظ یاد تھے۔ جو کہتا تھا کہ کامران تم دنیا کے کسی بھی خطے میں پہنچ جاؤ۔ جو مشکل تمہیں درپیش ہے تمہیں اس میں ملوث ہونا ہی پڑے گا۔

کامران سارے کرداروں کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ لیکن پتا نہیں وہ کردار اس کا پیچھا چھوڑیں گے یا نہیں۔

بہرحال اس دھندلائی ہوئی رات میں انہیں جو روشنی نظر آئی وہ آگ کی روشنی تھی اور جو شخص انہیں ملا وہ عجیب و غریب شخصیت کا مالک۔ اس نے مسکرا کر ان دونوں کو دیکھا اور ہنس کر بولا۔

"اس قدر چہرہ شناس ہو چکا ہوں کہ تم لوگوں کے بارے میں ایک لمحے کے اندر اندر بتا سکتا ہوں کہ تمہارا تعلق کہاں سے ہے اور مجھے خوشی ہے کہ میرے ہم وطن میرے ساتھ ہیں۔"

"کیا تمہیں مہذب آبادیوں کے راستے یاد ہیں؟"

"ہاں...... کیوں نہیں۔"

"کیا تم ہمیں بتا سکتے ہو؟"

"بتا سکتا ہوں۔ لیکن تھوڑے سے وقفے کے بعد کیوں کہ اس دوران مجھے تمہاری ہی طرح یہاں بھٹکنا ہے۔ ایک خاص مقصد کے تحت۔"

"میرے دوست اگر تم ہمیں صرف پتا بتا دو کہ ہم کس طرف سے نکل جائیں۔" وہ ہنسنے لگا پھر بولا۔

"نہیں۔ ہر شخص خود غرض ہے۔ میں بھی انہیں خود غرضوں میں سے ایک ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم تھوڑا سا توقف کر لو اور میرے ساتھ ہی مہذب آبادیوں کا رخ کرو۔ میری تنہائی بھی دور ہو جائے گی۔"

"تمہیں کتنا وقت لگ جائے گا۔"

"بہت زیادہ نہیں۔" اور بہ حالت مجبوری کامران اور نعیم خان نے اس کی معیت قبول کر لی اس نے ان لوگوں کی کافی خاطر مدارات کی تھی۔ وہ جنگلوں سے خاصی واقفیت رکھتا تھا اور جانتا تھا کہ شکار کس وقت اور کہاں مل سکتا ہے۔ چوں کہ انہی کا ہم وطن تھا اس لیے باقی سارے معاملات میں بھی اسے کافی واقفیت حاصل تھی اپنے بارے میں اس نے بتاتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... میں کون ہوں کیا ہوں رفتہ رفتہ تمہیں پتا چل ہی جائے گا۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا کہ میں ایک بے ضرر آدمی ہوں۔ میرے ہاتھوں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ کیوں کہ میری زندگی جن واقعات سے دوچار ہو چکی ہے۔ اس کے بعد یہ گنجائش نہیں رہتی ہے کہ میں کسی کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کروں۔ اپنے ماضی کے بارے میں تفصیل میں جانے کے بجائے میں تمہیں اپنے اس سمندری سفر کے بارے میں بتاتا ہوں۔ جس میں ہمارا جہاز ایک خوف ناک حادثے کا شکار ہو گیا اور ایسی خوف ناک تباہی پھیلی کہ خداوند عالم کبھی کسی کو ایسی تباہی نہ دکھائے۔

ہم لوگ جانوروں کی طرح چیختے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ بہ مشکل تمام ایک چھوٹی سی کشتی میرے ہاتھ لگی اور میں نے وہ کشتی سمندر میں گرا دی اور چھوٹی سی کشتی میں مجھے جو کچھ ملا میرے اور میرے دو ساتھیوں کے لیے کافی تھا۔ حادثہ اس طرح اچانک ہوا تھا اور خطرے کی گھنٹی ایک دم بجی تھی کہ سب کے ہی حواس گم ہو گئے تھے۔ جہاز میں ایک بھگدڑ مچ گئی تھی۔ صرف مجھے ہی نہیں بلکہ کسی کو بھی، جہاز کے کپتان کو بھی کھانے پینے کی چیزیں لینے کا خیال نہیں آیا تھا۔ جو ہمارے ہاتھ لگا تھا وہ چند گلے سڑے بسکٹ اور تھوڑا سا پانی تھا۔ بہرحال ہم اس چھوٹی سی کشتی کو لے کر چل پڑے ہم نے بہت سے لوگوں کو جدوجہد کرتے دیکھا تھا۔ لیکن ظالم سمندر نے پتا نہیں کسے زندگی دی اور کسے موت...... ویران سمندر میں صرف تین آدمی تھے۔ جو کشتی میں کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے۔

اس لیے چھوٹی سی کشتی کے الٹ جانے کا خدشہ تھا۔ اس کشتی میں میرے ساتھ جو دوسرے دو آدمی سوار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے ان میں سے ایک انگریز تھا وہ میری ہی طرح ٹام کروسو کا مسافر تھا۔ اس کا نام شاید ڈیمل تھا دوسرا آدمی غرق شدہ جہاز کے ملازموں میں سے تھا۔ پست قامت، قوی ہیکل اور ہکلا۔ میں اس کا نام نہیں جانتا اور ہم پورے آٹھ دن تک اس کشتی میں پڑے رہے۔

دوسرے دن متلاطم سمندر پرسکون ہو گیا۔ ان دو دنوں میں ہم نے آپس میں گفتگو کرنے کی کوشش نہ کی۔ ہم یا تو خاموش بیٹھے افق کی طرف دیکھا کرتے یا پھر آسمان کو گھورا کرتے۔ دن بہ دن بڑھتی ہوئی نقاہت زندگی سے اور مایوس کیے دے رہی تھی۔ ہم اپنے دل میں خوف و ہراس کے لیے بھیانک موت کے منتظر تھے۔

اور چوتھے دن پانی ختم ہو گیا۔ سورج کی تیز تیز کرنیں ہماری جلد کو جلانے لگیں ہماری جلد میں دراڑیں پڑنی شروع ہو گئیں۔ ہماری حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی ہم عجیب عجیب باتیں سوچتے اور ان کا اظہار آنکھوں میں کرنے لگے۔

چھٹے دن بھوک اور پیاس ہمیں نیم جان کر چکی تھی اور اس دن ڈیمل نے اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنایا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہماری آوازیں نقاہت سے اتنی کمزور ہو رہی تھیں کہ ہم سرگوشیوں میں ہی باتیں کر سکتے تھے یاد پڑتا ہے کہ ہماری آوازیں پھٹی ہوئی اور مردہ سی بھی تھیں۔

"اگر تم میری بات مانو تو ہم اپنی بھوک اور پیاس کا علاج کر سکتے ہیں۔" ڈیمل نے کہا۔

"کہو......" میں نے کہا۔

''ہم قرعہ اندازی کرتے ہیں۔'' اس نے کہا ہم تینوں میں سے جس کا نام بھی نکلے گا دوسرے آدمی اسے ذبح کر کے اس کا خون پی لیں گے۔''

''نہیں۔'' میں نے سختی سے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ ''حیران ہوں کہ ایسا ناپاک خیال تمہیں آیا ہی کس طرح! اس سے تو یہ ہزار درجہ بہتر ہے کہ بھوکے اور پیاسے ہی مر جائیں یا ہماری کشتی الٹ جائے اور شارک مچھلیاں ہمیں کھا لیں۔''

''سوچ لو دوست! اس کے علاوہ اور کوئی صورت ممکن نہیں۔ بے شک ہم میں سے ایک آدمی مارا جائے گا لیکن اس کے طفیل دوسرے دو بچ جائیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ قرعہ میرے ہی نام پڑے۔''

میں نے ڈیمل کی یہ تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔ لیکن ہمارا تیسرا ساتھی ڈیمل کے قریب بیٹھا ہوا تھا رات بھر اس سے سرگوشیاں کرتا رہا اور میں اپنے ہاتھ میں کھلا چاقو لیے ساری رات ہوشیار بیٹھا رہا کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کریں تو میں اپنا بچاؤ کر سکوں حالانکہ میں نحیف و نزار تھا اور ان میں سے کسی ایک کا بھی مقابلہ نہ کر سکتا تھا تیسرا ساتھی ڈیمل کو شاید یہی مشورہ دے رہا تھا کہ وہ مجھے ذبح کر ڈالیں کیوں کہ میں اپنے دل میں خوف لیے رات بھر بیٹھا رہا اور میں نے ڈیمل کی تجویز منظور کر لی اور اب ہم تینوں دھڑکتے دل لیے نتیجے کے منتظر تھے......قرعہ اندازی کی گئی اور......قرعہ ہمارے تیسرے ساتھی کے نام پڑا۔

لیکن وہ ہم دونوں سے زیادہ طاقتور تھا چنانچہ اس نے فیصلہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور سچ تو یہ ہے کہ کون آدمی ذبح ہونا پسند کرے گا لیکن ڈیمل اپنی بات پر اڑا ہوا تھا کہ وہ بہر طور اس ملاح کو ذبح کر کے رہے گا۔ اس نے دفعتہً ڈیمل کے منہ پر دو تین گھونسے رسید کر دیے۔ اب وہ دونوں آپس میں گتھ گئے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش میں اٹھ کھڑے ہوئے اور کشتی الٹنے کے قریب ہو گئی۔ میں ملاح کی ٹانگوں سے لپٹ کر اسے گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چونکہ ہم تینوں ایک طرف آ گئے تھے۔ اس لیے کشتی اس طرف سے اتنی جھک گئی تھی کہ پانی اس کے کناروں پر سے گزر کر اندر گرنے لگا۔ کشتی کے جھٹکنے کی وجہ سے ملاح اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا وہ لڑکھڑایا اور ڈیمل کو لے کر کشتی کے کنارے پر گرا۔ کشتی اور جھکی اور وہ دونوں لڑھک کر سمندر میں جا پڑے اور چشم زدن میں وزنی پتھر کی طرح غرق ہو گئے۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت میرے منہ سے ایک بھیانک قہقہہ پھوٹ پڑا تھا۔

میں کشتی میں اوندھے منہ اس طرح لیٹ گیا کہ میری ٹانگیں کشتی کے ایک کنارے تھیں اور تھوڑی دوسرے کنارے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ سمندر کا پانی پی لوں اور اس کی ناقابل برداشت کڑواہٹ سے پاگل ہو کر اپنی مایوس اور الم ناک زندگی کا خاتمہ کر لوں؟ لیکن میں ایسا نہ کر سکا اور خدا جانے کب تک یوں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ حتیٰ کہ دور افق پر نظر آتے ہوئے مٹیالے سے بادبان بھی میرے بدن میں گرمی اور دل میں جوش و ولولہ پیدا نہ کر سکے وہ جہاز (حقیقت میں دو ستونوں والا جہاز ہی تھا) میری طرف ہی آ رہا تھا اور میں بڑی بے قراری سے اسے اپنے قریب آتے دیکھ رہا تھا۔ موجوں کے تھپیڑے کھا کر میری چھوٹی سی کشتی دائیں بائیں ڈول رہی تھی۔ اس کے ساتھ میرا سر بھی ڈول رہا تھا۔ چنانچہ افق اور جہاز کے

دونوں بادبان بھی ڈولتے نظر آ رہے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو یقیناً مجھے چکر آ جاتے لیکن اس وقت تو میں جیسے پتھر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ مجھے یہ خیال بھی نہ آیا کہ اسی جہاز کے کپتان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے اپنی قمیص اتار کر ہوا میں ہلاتا۔

اس کے بعد مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ مجھ پر ایک طرح کی غنودگی طاری ہو گئی اور جب دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو ایک کیبن میں بستر پر لیٹے پایا۔ البتہ کچھ دھندلا سا احساس ہے کہ کسی نے مجھے جہاز کے عرشہ تک پہنچایا تھا یہ بھی یاد ہے کہ ایک عجیب سا خدوخال والا چہرہ، جس پر جھائیاں پڑی ہوئی تھیں عرشہ کے جنگلے سے جھکا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی یاد ہے کہ اس آدمی کے بال سرخ تھے اس کے علاوہ میں نے اپنی آنکھوں کے قریب ہی ایک دوسرا کالا اور بھیانک چہرہ دیکھا تھا جس کی آنکھوں میں عجیب سی حیوانی چمک تھی۔ اس وقت میں نے خیال کیا تھا کہ وہ یا تو میرا وہم تھا یا پھر میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا لیکن جب میں نے اس کالے بھیانک چہرے والی عجیب ہستی کو دیکھا تو مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ کوئی کڑوی کسیلی چیز میرے حلق میں انڈیلی گئی تھی اور بس۔

میں نے اپنے آپ کو جس کیبن میں پایا وہ چھوٹا اور غلیظ تھا۔ کالے بالوں اور چھوٹی کالی مونچھوں والا ایک نوجوان، جس کا نچلا ہونٹ نسبتاً بڑا تھا، مجھ پر جھکا میری نبض ٹٹول رہا تھا ہم دونوں کوئی ایک منٹ تک خاموشی سے ایک دوسرے کی صورت تکتے رہے اس نوجوان کی آنکھیں کچھ عجیب سی تھیں۔ پرنم، غیر جذباتی اور ہلکے سبز رنگ کی۔

عین اسی وقت کیبن کی چھت پر سے گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ جیسے کوئی لوہے کا وزنی پلنگ گھسیٹ رہا ہو۔ پھر گھٹی گھٹی غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی خون خوار درندہ غرا رہا ہو۔ اس کی آواز سنتے ہی وہ نوجوان، جو میری نبض دیکھ رہا تھا بے چینی سے پہلو بدل کر بولا۔

''اب طبیعت کیسی ہے؟''

''اچھی ہے شکریہ۔'' میں نے جواب دیا۔

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میں اس کیبن میں کس طرح آ گیا۔ معلوم ہوتا ہے اس نے میرے چہرے سے میری دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ کیوں کہ وہ فوراً ہی میرا ہاتھ تھپتھپا کے بولا۔

''ہم نے تمہیں ایک کشتی میں سے اٹھایا ٹام کروسو بھوک اور پیاس سے تم نیم جان ہو رہے تھے۔ تمہاری کشتی میں کچھ عجیب سے نشانات تھے۔ جیسے دو آدمیوں نے کشتی لڑی ہو۔''

اور اسی وقت میں نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ افوہ! کیسا سوکھ گیا تھا وہ! محض چمڑے اور ہڈیوں کا مجموعہ......اور مجھے پچھلے واقعات یاد آ گئے ڈیمل کا مشورہ اور اس کی اور ملاح کی غرقابی۔

''لو...... یہ پی لو۔'' اس نوجوان نے کوئی سرخ رنگ کا مشروب مجھے پینے کے لیے دیا۔ وہ ٹھنڈا تھا۔ لیکن اس کے چند گھونٹوں نے میرے حلق سے نیچے اترتے ہی بدن میں قوت و توانائی کی روح سی دوڑا دی۔

''یہ تمہاری خوش قسمتی ہے دوست۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں ایک ایسے جہاز نے بچایا جس کے مسافروں میں ایک ڈاکٹر بھی ہے۔''

''وہ ایک عالم بے خودی میں بولتا چلا جا رہا ہے کہ دفعتہ اسے ہوش آ گیا اور وہ چونک کر بولا۔

''میں ذرا باورچی کی خبر لے آؤں۔ کم بخت نے اب تک کھانا تیار کیا کہ نہیں۔'' کیبن کی چھت پر پھر وہی پرندہ غرایا اور اس دفعہ اس کی غراہٹ بڑی بھیانک اور وحشیانہ اور لرزا دینے والی تھی۔

''یہ کیسی آواز ہے؟'' میں نے پوچھا۔ لیکن میرا معالج کوئی جواب دیئے بغیر باہر چلا گیا چند منٹوں بعد ہی وہ ایک پیالہ اٹھائے آیا جس میں گرم گرم بھنا ہوا گوشت تھا۔ اس نے گوشت کا پیالہ ایک ڈبل روٹی میرے سامنے رکھ دی گوشت کی خوشبو نے میرے نتھنوں میں پہنچتے ہی مجھے ایسا بے چین کیا کہ میں درندے کی غراہٹ بھول کر ندیدوں کی طرح، کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

ایک دن کے آرام اور ایک رات کی پرسکون نیند کے بعد مجھ میں اتنی توانائی آ گئی کہ میں اپنے بستر پر سے اٹھ کر کیبن کی دیوار پر بنے ہوئے چھوٹے گول روشن دان کے سامنے کھڑا ہو سکا۔ سمندر پرسکون تھا اور جہاز نہایت سبک رفتاری سے نامعلوم منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ روشن دان کے سامنے کھڑے ابھی مجھے چند منٹ ہوئے تھے کہ وکرم بھاٹیہ آ گیا میں نے اس سے پہننے کے لیے کپڑے مانگے۔ کیوں کہ میرے کپڑے پھٹ گئے تھے انہوں نے اپنے کپڑے مجھے دے دیے جو میرے جسم پر ڈھیلے تھے۔

''اس کا کپتان بڑا ہی واہیات اور بے پروا آدمی ہے۔ وکرم بھاٹیہ نے کہا۔

''اس وقت وہ اپنے کیبن کے فرش پر نشے میں دھت پڑا ہے۔''

''کہاں جا رہا ہے یہ جہاز؟''

''ہوم کراس۔ لیکن پہلے یہ مجھے اپنی منزل تک پہنچا دے گا۔'' وکرم بولا۔

''کون سی منزل ہے تمہاری؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک جزیرہ۔'' وہ بولا۔

''کون سا جزیرہ......؟''

''خدا جا۔ زیون سا جزیرہ۔''

''کیا مطلب......؟''

''بھئی وہ جزیرہ جہاں میں رہتا ہوں۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے، اس جزیرے کا کوئی نام نہیں۔ اس لیے میں کیا بتاؤں کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟''

اور وہ اپنا نچلا ہونٹ لٹکا کر عجیب نظروں سے میری صورت تکنے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی منزل کا پتا بتانا نہیں چاہتا تھا چنانچہ میں نے بھی اس کے متعلق کچھ پوچھنا، کم از کم اس وقت مناسب نہ سمجھا بہر حال یہ آدمی یعنی وکرم بھاٹیہ اس وقت مجھے بڑا پراسرار معلوم ہو رہا تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اس کی ذات سے ضرور کوئی راز وابستہ ہے۔

جب میں کپڑے بدل چکا تو ہم دونوں کیبن سے باہر آ گئے۔

باہر آئے تو زینے پر ایک آدمی راستہ روکے کھڑا تھا۔ وہ کہیں آگے جھانک رہا تھا اور ہماری طرف اس کی پشت تھی۔ تاہم میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ بڑا ہی بدقطع آدمی تھا۔ پستہ قامت، کبڑا اور بے ڈھنگا۔ دوسری

عجیب بات یہ تھی کہ اس کی گردن بولتے وقت اس کے ہونٹوں کے کونوں پر تھوک جمع ہو جاتا تھا اور اس کی زبان بھی غیر محسوس طور سے تتلاتی تھی۔

''کون سا جہاز ہے یہ؟'' میں نے کمزور اور پھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''چھوٹا سا تجارتی جہاز ہے اس جہاز کا کپتان، جو اس کا مالک بھی ہے نرا احمق آدمی ہے اور یوپارک نام ہے اس کا؟ بہر حال اگر سمندر پرسکون ہو تو یہ جہاز سفر کرنے کے لیے برا نہیں میں بھی ایک مسافر ہوں۔''

اس وقت پھر میرے کیبن کی چھت پر وہی درندہ غرایا۔ ساتھ ہی کسی آدمی کی خوف زدہ آواز سنائی دی اور پھر کسی دوسرے آدمی کی آواز آئی جو پہلے کو انگریزی میں گالیاں دے رہا تھا۔

''تم نیم جاں تھے۔'' میرے معالج نے جلدی سے کہا۔ ''بلکہ یوں قریب المرگ تھے لیکن میں نے چند خاص دوائیں تمہارے بدن میں داخل کر دیں۔ اپنے اس ہاتھ پر یہ سوجن دیکھ رہے ہو نا؟ یہ میں نے انجکشن دیے تھے کوئی تیں گھنٹوں تک تم بے ہوش پڑے رہے۔''

میرے دماغ میں جو جھنجھناہٹ سی معلوم ہو رہی تھی وہ اب کم ہونے لگی تھی اور میں پچھلے واقعات اور اپنی موجودہ حالت کے متعلق بغیر کسی الجھاؤ کے سوچ سکتا تھا۔ دفعتہ کئی کتوں کے بھونکنے کی آواز سے میرے خیالات کے تار و پود بکھر گئے۔

''ذرا بھوک معلوم ہو رہی ہے۔ کیا اب میری حالت اس قابل ہے کہ میں کچھ کھا سکوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' اس وقت شاید گوشت تیار ہو گا۔''

''بس تو میں تھوڑا سا کھا لوں گا۔''

لیکن اس نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین ہوں کہ تم اس کشتی میں اکیلے کیوں تھے؟ کیا گذری تم پر؟''

اور میرا خیال ہے کہ میں نے اس کی آنکھوں میں شک کی جھلک دیکھی تھی۔ کتے پھر بھونکنے لگے۔

''لعنت ہے، کیا گڑ بڑ مچا رکھی ہے ان کتوں نے۔'' وہ بے چین سا ہو کر چیخا اور فوراً اٹھ کر کیبن سے باہر چلا گیا۔

اور میں نے اسے کسی کو ڈانٹتے سنا اور یہ جسے میرا معالج ڈانٹ رہا تھا کوئی عجیب سی زبان تھی جو میری سمجھ میں نہ آئی۔ اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ وہ آواز جو میرے معالج کی ڈانٹ کا جواب دے رہی تھی۔ کچھ غیر انسانی سی تھی پھر ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی کسی کو پیٹ رہا ہو۔ لیکن میں نے خیال کیا کہ میرے کانوں نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میرا معالج کسی کو ایسے بے دردی سے کیوں پیٹنے لگا؟ پھر اس نے چیخ کر کتوں کو خاموش کیا اور واپس کیبن میں آ گیا۔

''ہاں تو تم مجھے اپنی کہانی سنانے والے تھے؟'' وہ دروازے میں سے ہی بولا میں نے اسے بتایا کہ میرا نام دانش ابراہیم ہے اور یہ کہ میں طبیعات کا طالب علم رہ چکا ہوں وہ بڑی دلچسپی سے آگے کی طرف جھک گیا۔

"میں بھی ایسا ہی طالب علم تھا اور اب بھی اس سائنس کی اس شاخ سے دلچسپی ہے۔" اس نے کہا۔ "افوہ! کتنے جانوروں پر تجربات کیے تھے! لیکن دس سال ہوئے کہ......" وہ بولتے بولتے رک گیا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو اور چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "خیر! تو یہ بتاؤ کہ تم اس کشتی میں کہاں سے آ گئے اور اکیلے کیوں تھے؟"

میں نے اپنے مصائب کی کہانی مفصل طور سے سنا دی۔ وہ میری صاف گوئی سے مرعوب و مطمئن نظر آتا تھا۔ اس نے پھر طبیعات کا موضوع چھیڑ دیا اور بڑے فخریہ انداز میں اعلان کیا کہ وہ خود بھی علم حیات کا طالب علم رہ چکا ہے۔ لیکن اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے زمانے کا کمزور ترین طالب علم رہا ہوگا۔ سر کے بال غیر معمولی طور پر سے موٹے اور حد درجے سیاہ تھے۔ یہ بے ڈھنگا آدمی گہرے سبز رنگ کے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ کتے جنہیں میں دیکھ نہیں سکتا تھا، زور زور سے غرائے اور وہ کبڑا آدمی گویا انتہائی خوف کے عالم میں بے اختیار پیچھے ہٹا۔ وہ سیدھا مجھ پر آیا۔ اس خیال سے وہ مجھ سے ٹکرا نہ جائے میں نے اپنے دونوں ہاتھ اسے روکنے کے لیے آگے کر دیے۔ میرے ہاتھوں کا اس کے بدن سے چھونا تھا کہ وہ حیوان کی پھرتی سے اچھل کر ہماری طرف گھوم گیا اور میں بہ مشکل اپنی چیخ روک سکا۔

یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہوّا ہو، جس سے مائیں اپنے بچوں کو ڈرایا کرتی ہیں۔ اس کا نہایت مکروہ، ڈراؤنا اور سیاہ چہرہ دیکھ کر میں کئی قدم پیچھے ہٹ گیا اور واقعی اس کا عجیب چہرہ تھا۔ اس کی پیشانی اندر کو دھنسی ہوئی تھی اور جبڑے آگے کی طرف بڑھے ہوئے جیسے کسی جانور کی تھوتھنی ہو۔ اس کا منہ نیم وا تھا اور انتہائی نوک دار درندوں کے سے، اس کے دانت منہ سے جھانک رہے تھے۔ ایسے دانت کسی انسان کے ہو ہی نہیں سکتے اس کی آنکھیں اتنی سرخ تھیں کہ جنہیں عام اصطلاح میں "خونی آنکھیں" کہا جاتا ہے اور اس کے سیاہ و مکروہ چہرے سے عجیب طرح کی گھبراہٹ ہویدا تھی۔

"ہٹ جا راستے سے خبیث کہیں کا۔" وکرم بھاٹیہ نے ڈانٹ کر کہا اور وہ سیاہ چہرے والا آدمی کچھ کہے بغیر ایک طرف ہٹ گیا۔

میں زینے پر چڑھنے لگا۔ حالانکہ میں اس بھیانک آدمی کے چہرہ کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن بار بار میری نظر اس کی طرف اٹھ جاتی تھی، وکرم بھاٹیہ اس بھیانک آدمی کے پاس چند لمحوں کے لیے رکا رہا۔

"تم یہاں کیا جھک مار رہے ہو؟" وہ اس بھیانک آدمی سے کہہ رہا تھا، تمہارا کام وہاں ہے، جاؤ وہاں۔"

"وہ...... وہ...... مجھے اپنے قریب آنے ہی نہیں دیتے۔" بھیانک آدمی نے جواب دیا۔ اس کی آواز بھی عجیب تھی۔ مصنوعی غیر فطری اور انسانوں کی آواز سے نمایاں طور پر مختلف۔

"قریب نہیں آنے دیتے!" وکرم بھاٹیہ نے غصہ سے کہا۔

"لیکن میں کہتا ہوں کہ جاؤ۔"

وہ کچھ اور بھی، کہنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت اسے میری موجودگی کا احساس ہوا اور وہ غصہ سے بولا۔

میں دو چار سیڑھیاں چڑھ کے وکرم بھاٹیہ کے انتظار میں رک گیا تھا اور وہیں کھڑا حیرت سے اس بھیانک آدمی کی بدصورتی کا جائزہ لے رہا تھا میں نے ایسا مکروہ، بھیانک اور غیر متناسب چہرہ کبھی خواب میں بھی نہ

دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مجھے کچھ دھندلا سا احساس تھا کہ ایسا چہرہ میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں اور دماغ پر زور ڈالنے سے مجھے یاد آیا کہ جب مجھے ٹائم کروسو کی کشتی میں نیم جاں حالت میں اٹھایا جا رہا تھا تو مجھے گھڑی بھر کے لیے ہوش آ گیا تھا اور میں نے اسی بھیانک چہرے کو اپنی آنکھوں کے قریب دیکھا تھا اور جسے اب تک میں اپنا وہم یا خواب سمجھے ہوئے تھا۔

وکرم بھاٹیہ نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تو میں بہ مشکل اس بھوت پر سے اپنی نظریں ہٹا سکا...... خدا جانے کیوں اس آدمی کو دیکھتے ہی ایک طرح کا ان جانا خوف میرے دل میں جاں گزیں ہو گیا۔ کوشش کے باوجود میں اس خوف سے نجات حاصل نہ کر سکا۔

ہم عرشہ پر پہنچے۔ میں نے اسے کیبن میں پڑے پڑے اوپر سے آتی ہوئی آوازوں کے سہارے، عرشہ کو جیسا سمجھا تھا وہ اس سے قطعی مختلف تھا اتنا گندا عرشہ، کسی مچھلیاں پکڑنے کے جہاز کا بھی نہ رہا ہوگا۔ عرشے پر باسی اور سڑے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں کے علاوہ کوئی خاص طرح کی سبزی سی بدبودار دھجیاں سی بکھری پڑی تھیں۔ ایک مستول سے کئی شکاری کتے بندھے ہوئے تھے۔ جو ہمیں دیکھتے ہی اچھلنے اور غرانے لگے۔ دوسرے مستول کے قریب ایک آہنی پنجرہ رکھا ہوا تھا۔ جس میں زبردست تیندوا بند تھا۔ پنجرہ اتنا چھوٹا تھا کہ تیندوا اس میں بہ مشکل کھڑا ہو سکتا تھا۔ تیندوے کے پیچھے، جہاز کی دیوار کے قریب، بہت سے ڈربوں میں خرگوش بند تھے۔

اور پھر ایک دوسرے پنجرے میں (ایک اونٹ جیسے جانور) کو گویا ٹھونس دیا گیا تھا پورے عرشے پر اگر کوئی انسان تھا تو وہ جہاز راں تھا جو پہیے کو، جس سے جہاز کا رخ بدلا جاتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے پکڑے بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

ہم لوگ اس جہاز راں کے قریب سے گزرتے ہوئے عرشے کے انتہائی سرے پر پہنچے اور جنگلے پر کہنیاں ٹیک کر، جہاز کے چلنے کی وجہ سے اٹھی ہوئی، ہلکی ہلکی لہروں کا رقص دیکھنے لگے سمندر پر سکون تھا اور ہوا کے فرحت بخش جھونکے چل رہے تھے۔

"یہ سب کیا ہے یار! کچھ دیر بعد میں نے وکرم بھاٹیہ سے پوچھا۔ "کہیں یہ تیرتا ہوا چڑیا گھر تو نہیں۔"

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"آخر جانور اس جہاز پر کیوں ہیں؟ ان کی موجودگی میری تو سمجھ میں نہیں آئی اگر یہ سامان تجارت ہے تو واقعی عجیب سامان ہے۔ کیا واقعی جہاز کا کپتان ان جانوروں کو چند ایک جزائر اور شہروں میں فروخت کرنا چاہتا تھا۔"

"معلوم تو کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔" وکرم بھاٹیہ نے بڑی بے زاری سے کہا اور پھر میری طرف سے منہ پھیر کر جنگلے پر جھک گیا۔

یکا یک زینے کی طرف سے ایک غیر انسانی چیخ سنائی دی۔ پھر کوئی بے تحاشا گالیاں بکنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سیاہ چہرے والا بھیانک آدمی انتہائی بدحواسی کے عالم میں چڑھ آیا۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے ایک دوہرے بدن کا آدمی بھاگا آ رہا تھا۔ جو سر پر کپتان کی ٹوپی رکھے ہوئے تھا۔ اس بھیانک آدمی کو دیکھتے

ہی کتے، جو مجھ پر بھونک بھونک کر تھک گئے تھے پھر بھونکنے اور غرانے لگے۔ وہ اس بھیانک آدمی پر جھپٹنے کی کوشش میں زنجیریں توڑنے لگے تھے۔ جن سے وہ بندھے ہوئے تھے۔ کتے کو یوں غصے میں دیکھ کر وہ بھیانک آدمی آگے بڑھنے کی ہمت نہ کرسکا۔

اور میں نے دیکھا کہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس اثنا میں وہ موٹا جو سر پر کپتان کی ٹوپی رکھے ہوئے تھا اور جس کے بال سرخ تھے اس بھوت کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس نے اپنا زبردست گھونسا بھوت کی گردن پر رسید کیا اور وہ جھٹکا کھاتے ہوئے بیل کی طرح لڑکھڑا کر کتوں کے سامنے گرا۔ اسے گرتے دیکھ کر سرخ بالوں والا آدمی خوشی سے چلا اٹھا اور پھر اس کے منہ سے گالیوں کا سیلاب سا بہہ نکلا۔

سرخ بالوں والے آدمی کو دیکھتے ہی وکرم بھاٹیہ نے ''بس بہت ہوا...... بس بہت ہوا۔'' کہہ کر چلانا شروع کردیا۔ لیکن سرخ بالوں والے پر اس کے چلانے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ یا تو وکرم بھاٹیہ کی کوئی حقیقت ہی نہ سمجھتا تھا۔ یا پھر بہرہ تھا۔ اس عرصے میں جہاز کے دوسرے ملازم بھی وہاں آگئے تھے۔

وہ سیاہ چہرے والا بھوت کتوں کے سامنے پڑا عجیب طرح کی غیر انسانی آواز میں چیخ رہا تھا اور کتے تھے کہ اپنی تھوتھنیاں مار مار کر اسے اور بھی سہائے دیتے تھے۔ ملاح وہاں جمع ہوگئے تھے اس بھوت کو بچانے کے بجائے خوشی سے تالیاں پیٹ پیٹ کر چلا رہے تھے۔ گویا یہ ان کے لیے ایک دلچسپ کھیل تھا۔

وکرم بھاٹیہ نے دانت بھینچ کر زیرلب ایک گالی بک دی اور وہاں سے ہٹ آیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔

اپنی قوت جمع کر کے سیاہ چہرے والا بھوت بھی اٹھا۔ لرزتے قدموں سے جنگلے کے قریب پہنچا اور سمندر کی طرف منہ کر کے جانوروں کی طرح ہانپنے لگا۔ وہ بار بار گردن گھما کر کتوں کی طرف دیکھ لیتا تھا اور اس وقت اس کی آنکھوں سے عجیب طرح کا خوف ٹپکنے لگتا تھا اور اس کا اوپر کا ہونٹ جیسے خود بہ خود دانتوں کو کھینچ جاتا تھا۔ سرخ بالوں والا آدمی کھڑا نہیں رہا تھا۔

''دیکھیے کپتان صاحب۔'' وکرم بھاٹیہ نے سرخ بالوں والے آدمی کی کہنی پکڑ کر کہا۔

''آئندہ ایسا نہ ہو۔'' کپتان دفعتہً وکرم بھاٹیہ کی طرف گھوم گیا۔ میں وکرم بھاٹیہ کے پیچھے کھڑا تھا۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں عادی شرابیوں کی طرح سرخ تھیں اور شاید اس وقت بھی وہ پیے ہوئے تھا۔

''ایسا ہی ہوگا۔ ہزار بار ہوگا۔'' اس نے نہایت مکروہ آواز میں کہا اور چند ثانیوں تک وکرم بھاٹیہ کو گھورتے رہنے کے بعد بولا۔

''حرامی۔''

''وہ جیسا بھی ہے اس جہاز کا مسافر ہے۔'' وکرم بھاٹیہ نے کہا۔ ''اور میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ پھر کبھی اس پر ہاتھ نہ اٹھانا۔''

''جہنم میں جائے وہ مسافر اور اس کے ساتھ تم خود بھی۔'' کپتان لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''یہ میرا جہاز ہے میرا۔ میں جو چاہوں کرسکتا ہوں۔ تم کون ہوتے ہو مجھ پر حکم چلانے والے۔ میں اس بحری مملکت کا بادشاہ ہوں۔''

میرا خیال تھا کہ کپتان کو نشے میں دیکھ کر وکرم بھاٹیہ اس معاملے کو زیادہ طول نہ دے گا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں اور کپتان کے قریب جا کر بولا۔

''کپتان صاحب! میں آخری بار تمہیں خبردار کیے دیتا ہوں کہ آئندہ سے میرے آدمی کے ساتھ برا سلوک نہ کیا جائے جب سے ہم اس جہاز پر سوار ہوئے ہیں۔ تمہاری ناانصافیوں کو صبر اور سکون سے برداشت کرتے آئے ہیں۔ لیکن برداشت کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے۔''

''تیز شراب کے نشے نے کپتان کی قوت گویائی چند ثانیوں تک گویا سلب کردی اور بڑی کوشش کے بعد وہ صرف ''حرامی کے بچے'' کہہ سکا۔

میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وکرم بھاٹیہ کا غصہ بڑا تیز ہے اور وہ بڑی کوششوں سے اپنے آپ کو روکے ہوئے ہے۔ بات بڑھتے دیکھ کر میں نے بیچ میں پڑنا مناسب سمجھا۔ کیوں کہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ کپتان اور وکرم بھاٹیہ ایک دوسرے پر گھونسے چلا رہے ہوں گے۔

''یہ آدمی پیے ہوئے ہیں۔'' میں نے وکرم بھاٹیہ کو پیچھے کھینچتے ہوئے کہا۔ ''اس پر تمہاری باتوں کا کم از کم اس وقت کوئی اثر نہ ہوگا۔''

''یہ ہر وقت پیے رہتا ہے۔ لیکن یہ بہانہ اسے مسافروں کی ہتک کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔''

''یہ میرا جہاز ہے۔'' کپتان دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ کوٹ کر چیخا۔ ''ہمیشہ صاف رہتا تھا اور عرشہ تو آئینے کو بھی شرماتا تھا اور اب دیکھو تم نے اس کی کیا درگت بنا رکھی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ وہ جگہ بھی اتنی گندی نہ ہوگی جہاں پورے شہر کا کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے۔ واہ! کیا مسافر ہیں میرے جہاز کے بھی۔'' کپتان نے پھر کہا۔

''تمہاری اجازت کے بعد ہی یہ جانور اس جہاز پر چڑھائے گئے تھے۔'' وکرم بھاٹیہ نے آہستہ سے کہا۔

''کاش! میں تمہارے اس جہنمی جزیرے سے واقف نہ ہوتا۔ کبھی میں نے اسے دیکھا بھی نہ ہوتا...... اور...... اور ان جانوروں کی کیا ضرورت ہے تمہیں؟ کیوں لیے جا رہے ہو انہیں اور تمہارا وہ آدمی...... اسے آدمی کون کہہ سکتا ہے۔ وہ تو...... وہ تو...... جانور...... اور...... اس کا چہرہ...... افوہ......! تم اسے؟''

''بہرحال اسے اپنے حال پر چھوڑ دو۔'' وکرم بھاٹیہ نے نرمی سے کہا اور کپتان کے قریب سے ہٹ آیا۔ لیکن موخر الذکر اب جھگڑا کرنے پر تلا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ آگے بڑھ کر نہایت توہین آمیز لہجے میں چیخا۔

کان کھول کر سن لو اگر تمہارا وہ شیطان ساتھی پھر اس طرف آیا تو خدا کی قسم میں اس کا پیٹ چیر کر انتیں سمندر میں پھینک دوں گا...... تم کون ہوتے ہو مجھ پر حکم چلانے والے؟ یہ میرا جہاز ہے میرا۔'' وہ پھر اپنا سینہ کوٹنے لگا۔ ''میں اس کا کپتان ہوں اور مالک بھی اور مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں۔ یہاں میرے بنائے ہوئے قوانین پر عمل ہوتا ہے...... میں قانون ساز ہوں یہاں کا، کیا سمجھے۔ تم کیا اور تمہاری حیثیت کیا؟ میں نے اس جہنمی جزیرے سے امریکہ تک دو آدمیوں کو لے جانے اور پھر وہاں سے چند جانوروں کو لانے کا معاملہ طے کیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک کالے منہ والا شیطان اور ایک......''

اوراس نے نے وکرم بھاٹیہ کو گالی دی۔ موخرالذکر گھونسا تان کر کپتان کی طرف لپکا۔ لیکن میں نے اسے پکڑلیا۔

"کیا کر رہے ہو۔ وکرم بھاٹیہ۔" میں نے کہا۔ "یہ آدمی اپنے ہوش میں نہیں۔ منہ نہ لگو اس کے۔"

کپتان کے جو منہ میں آ رہا تھا بکے جا رہا تھا۔ وہ وکرم بھاٹیہ کی ماں بہن اور پورے خاندان سے عجیب عجیب طرح کے رشتے جوڑ رہا تھا۔

"شٹ اپ۔" میں چیخا۔ کیوں کہ میں نے دیکھا کہ وکرم بھاٹیہ کا چہرہ دہک رہا تھا اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اسی جگہ کپتان کا گلا گھونٹ دے گا۔

اور کپتان کی گالیوں کا ہدف اب میں تھا۔ وہ گالیوں میں ایسی نئی نئی اصطلاحیں وضع کر رہا تھا کہ مجھ جیسا ٹھنڈے مزاج کا آدمی بھی غصہ کی لہر محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا اور کپتان۔

"شٹ اپ" کہتے وقت میں یہ بھول گیا تھا کہ میں ایک غرق شدہ جہاز کا بے سہارا مسافر ہوں اور یہ کہ کپتان نے از راہ کرم مجھے اپنے جہاز میں جگہ دی تھی اور میں نے کرایہ بھی ادا نہ کیا تھا۔ مجھے یاد دلائیں اور پھر میری سات پشتوں تک کی خبر لے ڈالی۔

بہرحال میں ایک زبردست جھگڑے کو جس کا انجام خون خرابہ ہوتا ہے بروقت دبا دینے میں کامیاب رہا تھا۔

اوراس دن سورج غروب ہونے کے کچھ ہی دیر بعد، ہمارا جہاز لنگر انداز ہوا اور دور سمندر پر ایک داغ سا نظر آ رہا تھا۔ وکرم بھاٹیہ نے بتایا کہ وہی جزیرہ اس کی منزل ہے جزیرہ کے حصے سے دھوئیں کی ایک باریک سی لکیر آسمان کی نیلاہٹوں تک اٹھی ہوئی تھی۔

جب دور وہ جزیرہ نظر آیا تو کپتان عرشہ پر نہیں تھا۔ مجھ پر غصہ اتار چکنے کے بعد وہ اپنے کیبن میں چلا گیا اور اس وقت شاید اس کے فرش پر نشے میں چُور پڑا تھا۔ اس کی جگہ کپتان کے فرائض وہ دبلا پتلا آدمی انجام دے رہا تھا۔ جسے میں جہاز کا رخ بدلنے کے پہیے پر مستعد دیکھا تھا۔ یہ آدمی بھی وکرم بھاٹیہ سے خفا معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نے ہم دونوں کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ ہم نے اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا، کھانے کے درمیان میں نے اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے میری طرف سے منہ پھیر لیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس آدمی کو بلکہ جہاز کے ہر ملازم کو وکرم بھاٹیہ اس کے سیاہ چہرے والے خدمت گار اور جانوروں سے سخت نفرت تھی۔ وکرم بھاٹیہ نے ان جانوروں کے متعلق مجھے کچھ نہ بتایا تھا۔ حالانکہ میں وکرم بھاٹیہ اور ان جانوروں کے متعلق سب کچھ جان لینے کے لیے بے چین تھا۔ لیکن خود میں نے بھی اس سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

کھانے سے فراغت پا کر میں اور وکرم بھاٹیہ عرشے پر آ گئے۔ شفاف آسمان پر تارے جگمگا رہے تھے۔ رات خاموش تھی۔ البتہ کبھی کبھی جانوروں کے پہلو بدلنے کی ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دے جاتی تھی۔ تیندوا اپنی اگلی ٹانگوں میں منہ چھپائے سو رہا تھا۔ کتے خاموش تھے۔ شاید وہ بھی سو رہے تھے۔ وکرم بھاٹیہ نے سگریٹ نکال کر ایک مجھے پیش کیا اور ایک اپنے منہ میں دبا لیا۔

اور اب وہ مجھ سے میرے وطن کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اس کے لہجے میں حسرت و یاس اور بے چینی جھلک رہی تھی۔ وہ اس آدمی کی طرح وطن کے متعلق باتیں پوچھ رہا تھا۔ جس کی زندگی اس ملک میں بڑی خوش گوار گزر رہی ہو اور پھر اسے اچانک ہی وہاں سے چلے آنا پڑا ہو اور دوبارہ وطن کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی ہو اور میں اسے اپنے وطن کی باتیں بتانے لگا اور میں نے دیکھا کہ وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ شاید وہ ان آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو پلکوں تک آ گئے تھے۔ میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر جزیرے کی طرف دیکھا۔ جو وکرم بھاٹیہ کی منزل تھی اور خیالات میرے ذہن میں امنڈ کر آ رہے تھے۔

وکرم بھاٹیہ کون ہے؟ وہ اپنا گھر بار وطن چھوڑ کر اس دور افتادہ جزیرے میں کیوں پڑا ہوا ہے۔ کیا وہ مجرم ہے؟ کوئی خونی جو قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے بھاگ آیا ہو۔ لیکن ان سوالوں کے جواب میرے پاس نہ تھے۔

وکرم بھاٹیہ کوئی بھی ہو۔ میرے لیے تو وہ ایک فرشتہ تھا۔ جو آسمان کی ان دیکھی اور ان جان وسعتوں سے محض میری جان بچانے کے لیے اتر آیا تھا۔ کل وہ اس جہاز سے رخصت ہو جائے گا اور پھر میرے لیے اس کا وجود اور عدم وجود برابر ہوگا۔ عام حالات میں یہ خیال مجھے مطمئن کر دیتا تھا۔ لیکن حالات غیر معمولی تھے۔ اول تو یہی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وکرم بھاٹیہ جیسا مہذب اور تعلیم یافتہ آدمی اس جزیرے میں کیوں پڑا ہوا ہے اور پھر کپتان کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔

واقعی وکرم بھاٹیہ کو ان جانوروں کی کیا ضرورت تھی اور جب میں نے پہلے ان جانوروں کے متعلق پوچھا تھا تو اس نے ان سے اپنی بے تعلقی ظاہر کی تھی۔ آخر کیوں ...... اور اس کے سیاہ خدمت گار کا نرالا پن......؟ وہ کسی طرح انسان معلوم ہی نہ ہوتا تھا اور ان سوالات نے وکرم بھاٹیہ کے گرد اسرار کا ایک حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اس کی ذات میرے لیے ایک ناقابل حل معمہ بن کر رہ گئی تھی۔ میرا تصور عجیب عجیب بھیانک تصویریں مجھے دکھانے لگا اور میری زبان لڑکھڑا گئی۔ اب میں رک رک کر بول رہا تھا۔ شکر ہے کہ وکرم بھاٹیہ نے اس فوری تبدیلی کو محسوس نہ کیا۔

اور آدھی رات تک ہم وطن کی باتیں کرتے رہے اور جب اس موضوع سے اکتا گئے یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وکرم بھاٹیہ بھی اکتا گیا تو ہم خاموش ہو گئے۔ ہم جنگلے پر کہنیاں ٹکائے اپنے اپنے خیالات میں گم خلا میں گھورتے رہے۔ رات پرسکون اور خشک تھی۔

"وکرم بھاٹیہ۔" میں نے کچھ دیر کے بعد کہا اگر میں کہوں کہ تم نے مجھے دوسری زندگی بخشی ہے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ میں تمہارا احسان تا عمر نہ بھولوں گا۔"

"ارے کیا احسان اور کیسی بات۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ تو ایک اتفاق تھا اور بس۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ تمہاری قسمت اچھی تھی۔"

"تم کچھ بھی کہو۔ میں تو یہ ہی سمجھتا ہوں کہ خدا نے تمہیں فرشتہ بنا کر میری جان بچانے کے لیے بھیجا تھا۔ تمہارا شکریہ۔"

"یہ رسمی باتیں رہنے دو یار میں کہہ چکا ہوں کہ یہ اتفاق تھا اور بس تم بیمار تھے میں نے تمہارا علاج

کیا۔ تم بھوکے تھے اور میں نے تمہیں کھانا کھلایا۔ میری جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا وہ بھی ہمدردی سے مجبور ہو کر ایسا ہی کرتا۔ اس کے علاوہ اس میں میری ایک ذاتی غرض بھی پوشیدہ تھی۔ میں بے حد اکتا گیا تھا اور کسی مہذب آدمی سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر اس دن میری طبیعت مکدر ہوتی، میرا مزاج بگڑا ہوا ہوتا اور مجھے تمہارے حال پر رحم نہ آ گیا ہوتا تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت تم کہاں ہوتے۔"

"تم کچھ بھی سمجھو میں تو......"

"اتفاق۔ میرے دوست اتفاق، جسے ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ انسانوں کی قسمتیں بدل دیتا ہے۔ ذرا سوچو تو کہ میں یہاں کیوں ہوں؟" کیا وجہ ہے کہ میں تمہاری طرح خوش و خرم انسان ہونے کے بجائے ایک بیزار اور اداس آدمی ہوں۔ کیوں میں دنیا کے جھمیلوں اور اس کی دلچسپی سے کٹ سا گیا ہوں۔ اتفاق...... میرے دوست میں اتفاق کا شکار ہوں۔ ایک رات دس منٹ کے لیے اتفاقاً میری عقل رخصت ہو گئی اور معاملہ ختم۔ وہ بولتے بولتے رک گیا۔

"اچھا پھر؟"

"پھر کچھ نہیں۔"

چند ثانیوں تک خاموشی کا وقفہ رہا۔ پھر وہ ہنس پڑا۔

"دانش! یار اس تاروں بھری رات میں کوئی خاص بات ہے کہ آدمی جذباتی بن کر اپنے متعلق ہی باتیں کرنے لگتا ہے۔ میں احمق ہوں۔ نرا احمق...... لیکن میں اپنے متعلق باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے سامنے اپنے دل کی بھڑاس...... لیکن نہیں۔"

"مجھ پر اعتبار کرو۔ تمہارا راز قیامت تک میرے سینے میں دفن رہے گا۔" چند ثانیوں تک وہ کچھ سوچتا رہا۔

"نہیں یار۔" "اپنا دکھڑا رونے سے کیا فائدہ ہوگا......" "اس طرح میری زندگی تو نہ بدل جائے گی؟ بہتر ہے کہ راز کو راز ہی رہنے دیا جائے اپنا راز ظاہر نہ کرنا عقلمندی کی علامت ہے۔ اگر میں نے تمہیں اپنی کہانی سنائی بھی تو مجھے کیا مل جائے گا۔ چند لمحوں کا عارضی سکون۔ اس کے بعد وہی مایوسی اور وہی بے زاری۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ وہ شاید مجھے اپنی کہانی سنا دینا چاہتا تھا۔ لیکن وہ ڈر رہا تھا۔ خدا جانے کس سے ڈر رہا تھا۔ میں نے بھی اسے مجبور کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ چنانچہ میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔ مجھ سے کوئی دس قدم دور ایک سیاہ سایہ وکرم پر جھکا ہوا تھا۔ یہ وکرم بھاٹیہ کا وہی سیاہ چہرے والا خدمت گار تھا۔ اس نے گردن گھما کر ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا اور میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی لہر سی دوڑ گئی۔

اس کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں بلی کی آنکھوں کی طرح اس کی آنکھوں میں وہی نیلی چمک تھی جو رات کو بلی شیر یا دوسرے درندوں کی آنکھوں میں آ جاتی ہے اور مجھے وکرم بھاٹیہ کا وہ ملازم کوئی درندہ یا...... عفریت معلوم ہوا اور مجھے بھوتوں اور چڑیلوں کی طرح وہ سب کہانیاں یاد آ گئیں جو میں بچپن میں اپنی دادی سے سنا کرتا تھا اور وہی بچپن کا خوف بھی لوٹ آیا جو میں ان کہانیوں کو سن کر محسوس کیا کرتا تھا۔

"نہیں یار اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔" میں نے دل میں سوچا۔ "وہ بھوت پریت تو؟

نہیں، تمہاری ہی طرح کا انسان ہے۔ البتہ ذرا بد صورت ہے بے چارا۔"

اور اسی وقت وکرم بھاٹیہ کی آواز سنائی دی۔

"رات بہت ہو چکی ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اب ہمیں چل کر سونا چاہیے۔"

"چلو۔" میں نے کہا۔

میرے کیبن کے سامنے پہنچ کر وکرم بھاٹیہ نے مجھے شب بخیر کہا اور اپنے کیبن کی طرف چلا گیا۔

اور اسی رات صبح ہونے تک میں بھیانک خواب دیکھتا رہا۔ بھوتوں اور چڑیلوں کے خواب، عجیب طرح کے درندوں کے خواب، جو ہماری طرح دو ٹانگوں پر چلتے تھے اور جن کی آنکھیں اندھیرے میں ہیروں کی طرح چمکتی تھیں۔ میں چونک کر اٹھتا تو میرا پورا بدن ٹھنڈے پسینے میں شرابور ہوتا اور کیبن کی دیوار پر ٹنگی ہوئی پوٹلی کسی کا بھیانک سر بن جاتی اور کواڑوں کے دروازے اور روشن دان میں سے آتی ہوئی چاندنی کے سائے پھیل اور سکڑ کر چڑیلوں کی طرح ناچنے لگتے۔ میں گھبرا کر آنکھیں بند کرتا تو تصور میں وکرم بھاٹیہ کے سیاہ چہرے والے ملازم کو اپنی ساری ہیبت ناکی کے ساتھ اپنے سامنے لا کھڑا کرتا۔

اور پھر کتوں نے غرانا شروع کیا اور صبح تک غراتے رہے۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں ساری رات بھیانک خواب دیکھتا رہا تھا اور صبح ہونے سے شاید دو چار گھنٹے پہلے سو گیا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی ایک پھٹی ہوئی آواز کانوں میں پڑی عرشہ پر موجود آدمی چیخ چیخ کر کسی کو کوئی ہدایات دے رہا تھا۔ آیا خدا جانے اس پر حکم چلا رہا تھا۔ میں آنکھیں مل کر سوچنے لگا کہ میں کہاں ہوں؟ اوٹ پٹانگ خوابوں نے دماغ سن کر دیا تھا اور کوئی بات یاد نہیں آ رہی تھی۔

دفعتہً پیروں کی چاپ سنائی دی کوئی دوڑ رہا تھا۔

اور پھر کوئی بھاری چیز لڑھکا دی گئی اور اس گڑگڑاہٹ سے میرے کیبن کی ساری دیواریں لرز اٹھیں۔ پھر آہنی زنجیروں کی کھنک سنائی دی اور پانی کا چھپاکا سا ہوا۔ جیسے کوئی چیز سمندر میں گری ہو۔ ساتھ ہی سمندر کا پانی میرے کیبن کے روشن دان کے شیشے سے ٹکرایا میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

میں کیبن سے باہر آیا اور تیزی سے زینہ چڑھ کر اوپر پہنچا۔ جہاز کا کپتان میری طرف پشت کیے کھڑا تھا اور سورج کی پہلی کرنوں میں اس کے بے ترتیب سرخ بال سونے کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ جہاز کے آخری مستول سے ایک مضبوط راستہ بنا ہوا تھا۔ تیندوا بے چارا خوف کے مارے ایک کونے میں دبک گیا تھا۔

"نیچے اتارو۔" کپتان چلایا تھا۔ "اتارو جانوروں کو ہم جہاز کو ان سے پاک کر دیں گے ہائے! ہائے! کتنا صاف تھا میرا جہاز۔"

"کپتان میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔ چنانچہ میں نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا کہ وہ ہٹ جائے تو میں بھی عرشہ پر پہنچ جاؤں۔ وہ پھرکی کی طرح میری طرف گھوم گیا اور میں نے دیکھا کہ وہ اس وقت بھی نشے میں تھا۔

"اوئے!" وہ چیخا اور اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ "یہ تو ہمارے مسٹر دانش......"

"دانش ابراہیم......" میں نے لقمہ دیا۔

"جہنم میں گیا۔ دانش۔" وہ بولا۔

"شٹ اپ۔"

"یہ ہے تمہارا نام۔ مسٹر شٹ اپ۔" اس بے وقوف شرابی کو جواب مزید دینا مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ میں خاموش رہا۔ لیکن اس نے اب جو حرکت کی تھی وہ خلاف توقع تھی۔ اس نے اس زینے کی طرف اشارہ کیا جس پر سے ہو کر مسافر پلیٹ فارم پر سے جہاز میں اور جہاز سے پلیٹ فارم پر آتے جاتے ہیں۔ اس زینے پر وکرم بھاٹیہ کھڑا سفید بالوں والے ایک دوسرے دہرے بدن کے آدمی سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ آدمی جامنی رنگ کی میلی پتلون اور میلی سی قمیص پہنے ہوئے تھا۔

"اس طرف...... مسٹر شٹ اپ...... اس طرف۔" کپتان زینے کی طرف اشارہ کر کے گرجا۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب......؟ مطلب یہ کہ اب رخصت ہو جاؤ اس جہاز سے...... میرے خدا! کتنا گندا کر رکھا ہے۔ میرا جہاز۔ اب ہم اس کی صفائی کریں گے اور کان پکڑتا ہوں کہ کبھی اس جہنمی جزیرے کے قریب سے بھی نہیں گزروں گا۔ ہاں تو مسٹر شٹ اپ۔ اس طرف...... اس طرف۔"

میں احمقوں کی طرح کپتان کی صورت تکنے لگا اور بجلی کی سی تیزی سے ایک خیال دماغ میں کوند گیا...... ایسے جھگڑالو شرابی کے ساتھ تنہا سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے گھوم کر سوالیہ نظروں سے وکرم بھاٹیہ کو دیکھا۔

"نہیں ہم تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے۔" وکرم بھاٹیہ کے سفید بالوں والے ساتھی نے کہا۔

"آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے کر جائیں گے؟" میں نے خوف زدہ نظروں سے وکرم بھاٹیہ کے ساتھی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسا کرخت چہرہ جس سے حد درجہ مستقل مزاجی کے آثار ظاہر ہوں میں نے کبھی کسی کا نہ دیکھا تھا۔

"دیکھو بھئی۔" اب میں کپتان سے مخاطب ہوا۔

"ایک لفظ نہیں سننا۔" کپتان نے منہ بنا کر کہا۔ "اتر جاؤ اس جہاز سے...... فوراً۔ ہمارا جہاز جانوروں اور...... اور...... آدم خوروں کے لیے نہیں ہے چلو اترو مسٹر شٹ اپ اگر یہ لوگ تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاتے تو ہم کیا کریں۔ کود جاؤ سمندر میں اور تیر کر اس جہنمی جزیرے تک پہنچ جاؤ ڈوب جاؤ۔ لیکن ہمیں بخشو! تم میں سے ایک آدمی بھی ہمیں اپنے جہاز پر نہیں چاہیے۔ بہر حال تم اس جہاز سے اسی وقت اترو گے۔ چاہے اپنے دوستوں کے ساتھ جاؤ، چاہے اکیلے۔"

"وکرم بھاٹیہ!" میں نے بے کس و بے سہارا فریادی کی طرح فریاد کی۔

اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر اپنے سفید بالوں والے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ اب وہ اس آدمی کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"افسوس ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" وکرم بھاٹیہ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"بہت اچھا میں خود مسٹر شٹ اپ کی مدد کروں گا۔" کپتان پیر پٹخ کر بولا۔ اور اب جہاز میں ایک عجیب طرح کا ڈرامہ کھیلا جانے لگا۔ میں باری باری ہر ایک کے سامنے گڑگڑانے لگا پہلے وکرم بھاٹیہ کے سفید بالوں والے ساتھی کے سامنے گڑگڑایا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلے اس نے نفی میں سر ہلایا تو کپتان کے سامنے میں گھٹنوں کے بل جھک گیا کہ وہ مجھے اپنے جہاز سے نہ اتارے اس کے منہ پھیر لینے سے میں نے ایک ملاح سے التجا کی کہ وہ کپتان سے میری سفارش کر دے۔ وکرم بھاٹیہ بے تعلق اور خاموش کھڑا تھا۔ ایسی ذلت و خواری کبھی میں نے محسوس نہ کی ہوگی جیسی کہ اس وقت میں محسوس کر رہا تھا۔

"مسٹر شٹ اپ! تمہیں ابھی اور اسی وقت ہمارے جہاز سے اترنا ہوگا۔" کپتان بس یہی کہتا رہا۔

"اور نہایت شرمندگی محسوس کرتے ہوئے میری آنکھیں پرنم ہو گئیں کپتان مجھے دھکاتا رہا، وکرم بھاٹیہ اور اس کا ساتھی میری طرف سے منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ ملاح سامان نیچے اتارتے رہے اور میں ایک طرف کھڑا اپنی قسمت کو روتا رہا کسی کو میری حالت پر رحم نہ آیا۔ میں جنگلے پر کہنیاں ٹیک کر جھک گیا کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ خدا جانے کیا ہونے والا تھا؟ وکرم بھاٹیہ بھی مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ کپتان اپنے جہاز میں رکھنا نہیں چاہتا تھا اور میں، خدا جانے میرا کیا ہونے والا تھا۔

بادبانوں والی ایک لمبی سی کشتی جہاز سے لگی کھڑی تھی اور جہاز سے سامان کو کشتی میں رکھ رہے تھے۔ یوں کہ کشتی جہاز سے اسی طرح اڑا دی گئی تھی کہ جہاز کے ابھرے ہوئے پہلو نے اس کا بہت حصہ چھپا لیا تھا۔

"وکرم بھاٹیہ اور اس کے ساتھی نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔ گویا وہ میری موجودگی کو فراموش کر چکے تھے۔ اس وقت جہاز کا کپتان بھی میری طرف متوجہ نہ تھا۔ وہ اپنے ملازموں کو سامان اتارنے کے متعلق ہدایت دے رہا تھا اور ان کی مدد کرنے کے بجائے انہیں اور بوکھلا دیتا تھا۔ میں جنگلے پر کہنیاں ٹیکے کھڑا تھا اور اپنی بے بسی پر رو پڑنے کو جی چاہتا تھا۔ آج میں نے ناشتہ بھی نہ کیا اور اب مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر کپتان نے مجھے جہاز سے جبراً نکالنا چاہا تو میں نہ تو اس کا مقابلہ کر سکوں گا اور نہ وکرم بھاٹیہ اور اس کے ساتھی کو ہی مجبور کر سکوں گا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔ عجیب حالت تھی۔ میری اور میں خاموش کھڑا تقدیر کے فیصلے کا منتظر تھا۔

آخر کار وکرم بھاٹیہ کا سب سامان کشتی میں پہنچا دیا گیا اور اب ایک عجیب طرح کی جدوجہد شروع ہوئی۔ کپتان نے چیخ کر کہا اور دو تین ملاح مجھے اس زینے کی طرف دھکیلنے لگے جس پر وکرم بھاٹیہ اور اس کا ساتھی چند منٹ پہلے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ لیکن اب وہ وہاں نہ تھے۔ میں نے ہاتھ پاؤں چلائے ایک ملاح کے منہ پر دو ایک گھونسے بھی رسید کیے۔ لیکن وہ مجھے گھسیٹ کر زینے تک لے ہی گئے اور اس جدوجہد کے باوجود میں یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکا کہ وکرم بھاٹیہ کے ساتھ جو لوگ کشتی میں بیٹھے ہوئے تھے ان کے چہرے کالے اور بھورے تھے۔ ان کی کشتی سامان سے بھر گئی تھی اور وکرم بھاٹیہ کے عجیب چہرے والے ساتھی اسے تیزی سے جزیرے کی طرف لے جا رہے تھے۔

کشتی جہاز سے دور ہٹ گئی تھی اور اب عین میرے نیچے بہتا ہوا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اگر میں نے اپنے دونوں پاؤں جہاز کی دیوار پر لٹکا کے اپنے آپ کو پوری قوت سے پیچھے دھکیل دیا ہوتا تو ملاح یقیناً

مجھے سمندر میں پھینک دیتے۔ ہم لوگ ایک دوسرے پر گرے اور وکرم بھاٹیہ کے عجیب چہروں والے ساتھی خوشی سے چلا اٹھے فوراً ہی میں نے وکرم بھاٹیہ کی آواز سنی وہ انہیں ڈانٹ رہا تھا۔ گالیاں بکتا ہوا کپتان اور دو تین ملازم اپنے ساتھیوں کی مدد کو دوڑے۔

میں بے تحاشا لاتیں چلا رہا تھا اور چیخ بھی رہا تھا۔ لیکن کپتان کی آواز میری آواز پر غالب آ گئی۔ وہ اپنے ملازموں کو نہایت شرم ناک قسم کی گالیاں دے رہا تھا۔ کپتان کی گالیاں سن کر آخر کار ملازموں کی رگ حمیت پھڑکی اور یہ مجھ پر یوں جھپٹے جیسے شکاری کتے لومڑی پر۔ ان سب نے مل کر مجھے اٹھا لیا اور اٹھائے ہوئے جہاز کے پچھلے حصے کی طرف بھاگے۔ جہاز کی دم سے ٹام کروسو کی کشتی بندھی ہوئی تھی۔ جو نصف کے قریب سمندر کے پانی سے بھر گئی تھی۔ اس میں نہ تو چپوار تھے اور نہ اشیائے خوردونوش۔ میں نے اس خطرناک کشتی میں سوار ہونے سے صاف انکار کر دیا اور احتجاج کے طور پر اپنا بدن اکڑا کے جہاز کے عرشہ پر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ اب کپتان نے عاجز آ کر مجھے کشتی میں پہنچانے کی ایک انوکھی ترکیب سوچی۔ اس کی ہدایت کے مطابق ملاحوں نے میرے ہاتھ پاؤں مل کر ایک مضبوط رسے سے باندھ دیے بالکل اسی طرح کہ ذبح کرتے وقت گائے کی چاروں ٹانگیں باندھ دی جاتی ہیں اور اس طرح مال مویشی کی طرح مجھے کشتی میں اتارا گیا اور پھر رسہ کاٹ دیا گیا جس سے وہ کشتی بندھی ہوئی تھی۔

کشتی آہستہ آہستہ جہاز سے دور ہونے لگی اور میں نے حسرت سے دیکھا کہ جہاز کے بادبان کھول دیے گئے ہیں۔ اس کا پچھلا پنکھا پانی میں گھوما۔ کپتان کی پھٹی ہوئی آواز سنائی دی اور جہاز مخالف سمت میں چل دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔

شروع شروع میں مجھے تو یقین ہی نہ آیا کہ جو کچھ ہو چکا ہے وہ حقیقت میں کشتی کے پیندے میں بھرے ہوئے پانی میں بیٹھا دیوانوں کی طرح سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو چکی تھیں اور اعضا بے جان سے ہو گئے تھے۔ میری پھر ویسی ہی حالت تھی۔ جیسی کہ ٹام کروسو کی غرقابی کے بعد ہو گئی تھی۔ میں پھر اسی کشتی میں اکیلا اور بھوکا پڑا تھا۔ میں نے جزیرے کی طرف دیکھا وہ کشتی جس میں وکرم بھاٹیہ تھا۔ اب بہت ہی چھوٹی نظر آ رہی تھی۔

رفتہ رفتہ میرا دماغ کام کرنے لگا۔ مجھے اپنی حالت زار کا احساس ہوا کہ میں زندگی سے دور تھا اور موت سے قریب...... زندگی کی کوئی امید نہ تھی۔ اب کوئی معجزہ ہی مجھے بچا سکتا تھا۔ اگر کشتی کسی طرح جزیرے تک پہنچ جائے تو شاید میں بچ جاؤں۔ لیکن اس کی امید بہت کم تھی۔ کیوں کہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ کشتی میں چپوار نہ تھا اور وہ ہوا اور موجوں کے رحم و کرم پر تھی۔ آپ بھولے نہ ہوں گے کہ وکرم بھاٹیہ نے مجھے اس کشتی میں سے نیم جان حالت میں اٹھایا تھا اور اس کے بعد میں ہوش میں آ گیا تھا۔ چنانچہ نقاہت اب تک باقی تھی اور پھر میں بھوکا بھی تھا۔ اگر میں کمزور اور بھوکا نہ ہوتا تو شاید اتنی جلد ہمت نہ ہارتا۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا اور بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اس کے پیندے میں جمع پانی پر گھونسے مارنے لگا اور نہایت خضوع سے میں نے اپنی موت کی دعا کی۔

لیکن جب جزیرے والوں نے دیکھا کہ ظالم کپتان نے واقعی مجھے اپنے جہاز سے نکال باہر کیا

تو انہیں میری حالت پر رحم آ گیا۔ میری کشتی کو موجیں جزیرے کی طرف ہی لیے جا رہی تھیں اور وہ ترچھی بہہ رہی تھیں اور میں نے پاگل کر دینے والی خوشی کی لہریں محسوس کرتے ہوئے دیکھا کہ جزیرے والوں نے اپنی کشتی کا رخ میری طرف پھیر دیا۔ کشتی میرے قریب آئی اور میں نے دیکھا کہ وکرم بھاٹیہ کا، سفید بالوں والا ساتھی کشتی کی پچھلی نشست پر کتوں اور سامان کے بیچ میں بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور چہرے کی کرختگی میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔ وکرم بھاٹیہ کے سیاہ چہرے والا بھوت خدمت گار تیندوے کے پنجرے کے قریب دبکا بیٹھا عجیب نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔

کشتی میں تین دوسرے آدمی بھی تھے اور عجیب حیوانی چہرے تھے ان تینوں کے۔ شکاری کتے ان کی طرف دیکھ دیکھ کر غرا رہے تھے۔ وکرم بھاٹیہ جو کشتی کے رخ پھیرنے کا ڈنڈا پکڑے بیٹھا تھا اپنی کشتی کو میری کشتی کے قریب لے آیا۔ وہ کشتی سامان اور پنجروں سے اتنی بھر گئی تھی کہ اب اس میں ایک تنکا بھی نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ وکرم بھاٹیہ نے میری کشتی کے اگلے حصے سے بندھا ہوا رسا اپنی کشتی کے پچھلے حصے سے باندھ لیا۔

اس عرصے میں خوشی کی وہ لہریں جو میں نے محسوس کی تھیں۔ مدھم پڑ چکی تھیں۔ چنانچہ میں نے جذبات کی فراوانی سے رندھی ہوئی آواز میں اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اسے بتایا کہ میری کشتی نصف پانی سے بھری ہوئی ہے اور اس کے غرق ہو جانے کا خدشہ ہے وکرم بھاٹیہ نے کچھ کہے بغیر ایک ڈوئچی میرے ہاتھ میں پکڑا دی اور تھوڑی دیر میں، اپنی کشتی میں سے پانی الٹنے میں مصروف رہا۔

جب پورا پانی پھینک چکا تو معلوم ہوا کہ کشتی خاصی مضبوط تھی اور اب میں اطمینان سے بیٹھ کر وکرم بھاٹیہ کے ساتھیوں کا جائزہ لے سکتا تھا۔

سفید بالوں والا آدمی بہ دستور مجھے گھور رہا تھا اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس وقت وہ بے چین اور متوحش ہے جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے نظریں جھکا کر کتوں کے سر سہلانے لگا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ وہ دوہرے بدن کا مضبوط آدمی تھا ماتھا بلند اور چہرے کے نقوش قدرے پھیلے پھیلے سے۔ پپوٹوں کے اوپر کی جلد ڈھیلی ہو کر دیدوں پر لٹک آئی تھی۔ اس کے ہونٹوں کے کونے پھیلی ہوئی ٹھوڑی کی طرف جھکے ہوئے تھے اور دونوں کونوں پر گہرے گہرے قوسین تھے۔ چہرے مہرے سے وہ چڑچڑا اور زبردست قوت ارادی کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ وہ وکرم بھاٹیہ سے اتنی نیچی آواز میں باتیں کر رہا تھا کہ میں سن نہ سکتا تھا۔

اس آدمی پر سے ہٹ کر میری نظریں دوسرے تین آدمیوں پر مرکوز ہو گئیں وہ عجیب آدمی تھے۔ وہ جن کے صرف چہرے ہی دیکھ سکتا تھا۔ بڑے گھناؤنے چہرے تھے ان تینوں کے۔ میں بڑے غور سے بڑی دیر تک ان کے چہرے دیکھتا رہا۔ لیکن کراہیت کا اثر زائل نہ ہوا۔ حالانکہ اس گھن اور کراہیت کا سبب میں اس وقت سمجھ نہ سکا۔ وہ تینوں مجھے صرف بھورے آدمی معلوم ہوئے لیکن بھورا رنگ ایسا مکروہ کہاں ہوتا ہے۔ ایک دوسری عجیب بات یہ تھی کہ ان کے پورے بدن پر حتیٰ کہ ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں اور ناخنوں پر بھی کچھ میلی سفید پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مصر کے کسی قدیم قبرستان سے تین ممیاں زندہ ہو کر نکل آئی ہوں۔ سروں پر بے ڈھنگی پگڑیاں باندھے ہوئے تھے اور ان پگڑیوں کے نیچے سے ان کی تھوتھنیاں جھانک رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی وحشیانہ چمک تھی۔ بیٹھے ہوئے قد و قامت میں عام

انسانوں سے بڑھ کر معلوم ہوتے تھے۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ حقیقت میں وہ طویل القامت نہ تھے۔ بلکہ بات یوں تھی کہ ان کا دھڑ عام انسانوں کی بہ نسبت لمبا تھا اور بدن کا نچلا حصہ یعنی ان کی ٹانگیں، حیرت انگیز حد تک چھوٹی تھیں صرف یہی نہیں بلکہ گھٹنوں کے نیچے سے ان کی ٹانگیں مڑی ہوئی تھیں۔

قصہ مختصر یہ تینوں انسان کے بجائے کوئی دوسری ہی مخلوق معلوم ہوتے تھے۔ بدہیت بدوضع، بد صورت گھناؤنے اور تینوں کے پیچھے وکرم بھاٹیہ کا وہ سیاہ چہرے والا خدمت گار بیٹھا تھا۔ جس کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی تھیں۔

جب میں ان تینوں شیطانوں جیسی صورتوں والے آدمیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تو پہلے ایک پھر دوسرے اور پھر تیسرے نے میری طرف سے منہ پھیر لیا اور اب وہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے اپنی طرف یوں گھورتے دیکھ کر وہ بے چینی محسوس کرنے لگے تھے۔ چنانچہ میں ان پر سے نظر ہٹا کر جزیرے کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ ایک نیچا اور سرسبز جزیرہ تھا۔ جس میں تاڑ کے درخت بہ کثرت معلوم ہوتے تھے۔ جزیرے کے کسی نظر نہ آنے والے مقام سے سفید دھوئیں کا ایک ستون سا کافی اونچائی تک بلند ہوتا چلا گیا تھا اور پھر اوپر جا کر دھند کی طرح پھیل گیا تھا اور اب ہماری کشتی دو راستوں کی آغوش میں تھی۔ ساحل ریتیلا اور بھورا تھا اور بہ تدریج سطح سمندر سے کوئی ساٹھ ستر فٹ بلند ہوتا چلا گیا تھا۔ یہ ڈھلوان اوپر تک خود رو درختوں پودوں اور جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور اس ڈھلان پر جزیرے کی چوٹی اور کنارے کے بیچ میں پتھروں کی ایک چوکور دیوار بنی ہوئی تھی اور اس دیوار کے پیچھے شاید گھر تھے جس کی چھتیں میں اپنی کشتی میں بیٹھے بیٹھے دیکھ سکتا تھا۔

کنارے پر ایک آدمی وکرم بھاٹیہ اور اس کے ساتھیوں کی آمد کا منتظر کھڑا تھا اور میرا خیال ہے کہ میں نے جھاڑیوں کے پیچھے سے دوسرے بدہیت لوگوں کو بھی جھانکتے دیکھا تھا۔ لیکن جب ہماری کشتیاں کنارے کی طرف بڑھیں تو میں انہیں نہ دیکھ سکا شاید وہ چھپ گئے تھے۔

وہ آدمی جو کنارے پر کھڑا تھا۔ درمیانے قد کا تھا اور اس کا چہرہ بھی کالا تھا۔ اس کا منہ خوف ناک حد تک بڑا تھا اور ہونٹ گویا تھے ہی نہیں۔ ہاتھ غیر معمولی طور پر لمبے تھے۔ جو اس کے بدقطع جسم کے دونوں طرف کٹی ہوئی ٹہنیوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ اس کی ٹانگیں بھی لمبی اور گھٹنے کے قریب سے مڑی ہوئی تھیں۔ اس کا بڑا سا سر بڑے بے ڈھنگے پن سے اس کے سینے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی کمر خمیدہ تھی۔ وہ بھی وکرم بھاٹیہ اور اس کے سفید بالوں والے ساتھی کی طرح جامنی رنگ کی پتلون اور سفید قمیص پہنے ہوئے تھا۔

جب ہماری کشتیاں اور قریب پہنچیں تو وہ عجیب الخلقت شخص کنارے پر ریت اڑا کر بھاگنے اور بندروں کی سی مضحکہ خیز حرکتیں کرنے لگا۔

وکرم بھاٹیہ نے کہا اور تینوں شیطان صورت ملاح اور وکرم بھاٹیہ کا کالے چہرے والا خدمت گار بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چاروں عجیب حیوانی پھرتی سے سمندر میں کود پڑے اور کشتی کو کنارے کی طرف کھینچنے لگے۔ وکرم بھاٹیہ نے کشتی کا رخ اس بندرگاہ کی طرف پھیر دیا۔ جو ساحل کاٹ کر بنائی گئی تھی۔ کنارے پر

اچھل کود کرتا ہوا ایک عجیب الخلقت شخص اب ہماری طرف دوڑا۔ تینوں بھورے آدمی پھر کشتی پر چڑھ آئے اور بادبان اتارنے کے بعد کنارے پر کود پڑے اور اس عجیب الخلقت کی مدد سے کشتی میں سے سامان اٹھا اٹھا کر کنارے پر ڈھیر کرنے لگے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ تینوں شیطان صورت ملاحوں کے جسم پر کپڑے کی پٹیاں بندھی ہوئی تھی۔

چنانچہ میں ان کے ہاتھ پاؤں حتیٰ کہ ناخن اور انگلیاں بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ ان کی چال دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ چلتے وقت ان کی ٹانگیں کچھ عجیب طرح سے حرکت کرتی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کہ وہ غلط جگہ جوڑ دی گئی ہیں وہ وکرم بھاٹیہ کا سفید بالوں والا ساتھی کتوں کو لے کر کشتی سے اترا تو وہ ان عجیب آدمیوں کو دیکھ کر بے تحاشہ بھونکنے اور غرانے لگے۔ اب وکرم بھاٹیہ بھی کشتی سے اتر آیا اور وہ بھی سامان اتارنے میں مصروف ہو گیا۔ میں ایسی ناتوانی محسوس کر رہا تھا کہ ان کی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔

دفعتہً کتوں پر جیسے جنون سوار ہو گیا اور وکرم بھاٹیہ کے سفید بالوں والے ساتھی کے ہاتھ سے زنجیریں چھڑا کر ان عجیب آدمیوں کی طرف بھاگے اور اگر اس سفید بالوں والے آدمی اور میں نے دوڑ کر ان کتوں کو نہ پکڑ لیا ہوتا تو وہ ان بھوتوں میں سے ایک آدھ کو بھنبھوڑ ڈالتے اور میری حرکت کے بعد ہی سفید بالوں والے آدمی کو میری موجودگی کا احساس ہوا۔

"معلوم ہوتا ہے تم صبح سے بھوکے ہو۔" اس نے گونج دار آواز میں کہا۔

"مجھے واقعی افسوس ہے کہ مجھے پہلے یہ خیال نہ آیا۔ تم ہمارے مہمان ہو بن بلائے ہی سہی اس لیے تمہارا خیال رکھنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔"

اور اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں چند ثانیوں تک وہ میری آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ جیسے میرے باطن کا جائزہ لے رہا ہو۔

"وکرم بھاٹیہ نے مجھے بتایا ہے۔" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

"تم تعلیم یافتہ ہو اور سائنس کی تعلیم بھی پائی ہے۔ تم نے...... کون سی سائنس سیکھی ہے۔"

"حیاتیات کا طالب علم رہ چکا ہوں۔"

"واہ...... واقعی بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہم بھی حیاتیات داں ہیں یعنی میں اور وکرم بھاٹیہ اور یہ جزیرہ ایک طرح کا حیاتیاتی مستقر ہے۔ یہاں سے کافی مسالہ لے جایا جاتا ہے۔" اور ان عجیب آدمیوں کی طرف دیکھا جو اس وقت تیندوے کا پنجرا اتارنے میں مصروف تھے۔

"میں نہیں کہہ سکتا کہ تمہیں کب تک یہاں رہنا پڑے گا۔" اس نے کہا۔ "کیوں کہ یہ جزیرہ عام بحری راستے سے ہٹ کر ہے۔ کبھی کبھی سال دو سال میں ایک دفعہ کوئی بھولا بھٹکا جہاز اس طرف آ نکلتا ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ وکرم بھاٹیہ کے قریب پہنچا اور کچھ اشارے کر کے سامنے نظر آتی ہوئی چار دیواری کی طرف جو ایک چھوٹا قلعہ تھا چلا گیا۔ وکرم بھاٹیہ کے بھوتوں جیسے چہروں والے خدمت گار یا شاید ملازم سامان اٹھا اٹھا کر ایک چھوٹے پہیوں والے ٹھیلے میں رکھ رہے تھے۔ لاما کا پنجرہ اور خرگوشوں کے کابک کشتی میں ہی تھے۔ جب تیندوے کا پنجرہ بھی لادا جا چکا تو وکرم بھاٹیہ میرے پاس آیا۔

''معاف کرنا یار۔'' اس نے کہا اب تک میں تم سے کوئی بات نہ کرسکا۔ دراصل وہ کپتان ایک الو تھا۔ اگر تم جہاز پر رہ جاتے تو خدا جانے وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتا؟ یہ اچھا ہی ہوا کہ ہم تمہیں یہاں لے آئے۔''

''اور دوسری دفعہ بھی تم ہی نے میری جان بچائی۔'' میں نے کہا۔

''اب پھر کہیں شکریہ ادا نہ کرنے لگ جانا۔ یہ جزیرہ بڑا ہی واہیات ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تم بعد میں یہاں آنے پر پچھتاؤ۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو اس جزیرے پر قدم رکھنے سے پہلے ہی سوچ لیتا۔ آدمی......'' یک لخت وہ خاموش ہوگیا۔ چند ثانیوں کے بعد موضوع بدل کر بولا۔

''آؤ! پہلے خرگوش کا کابک اتار لیں۔'' اور ہم ایک کابک کنارے پر لے آئے اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہائی نہ رہی کہ وکرم بھاٹیہ نے کابک کا دروازہ کھول کر اسے اوندھا دیا۔ کوئی بیس خرگوش پکے پھلوں کی طرح کابک میں سے ٹپک پڑے۔ وکرم بھاٹیہ نے ہنکار کر انہیں جھاڑیوں کی طرف بھگا دیا۔

''جاؤ! اور اپنی نسل بڑھاؤ۔'' اس نے ایک سرگوشی کے عالم میں کہا۔ ''تاکہ ہمیں بہت سا گوشت مل سکے۔ پچھلے کئی مہینوں سے یہاں گوشت کی کمی ہوگئی ہے۔''

عین اسی وقت سفید بالوں والا دوہرے بدن کا آدمی چند بسکٹ اور ایک تھرماس میں چائے لیے آگیا۔

''لو بھئی چائے...... پیٹ کی آگ بجھالو ذرا۔'' اس نے پہلی دفعہ بے تکلفی سے دوستانہ لہجے میں کہا۔

میں بسکٹ چبانے اور چائے پینے لگا۔ وکرم بھاٹیہ اور اس کا سفید بالوں والا ساتھی خرگوش کے دوسرے کابک اتارنے میں مصروف ہوگئے انہوں نے پچاس کے قریب خرگوش آزاد کردیے صرف تین کابک تیندوے کے پنجرے کے ساتھ حصار یا قلعہ میں پہنچا دیے گئے۔

جہاز ٹام کروسو کی غرقابی کے بعد مجھ پر اتنی کچھ بیت چکی تھی اور میں ایسے ایسے خلاف توقع حادثات سے گذر چکا تھا کہ اب کوئی چیز مجھے زیادہ حیرت زدہ نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ اگر میں سیدھا سیدھا اور عام حالات میں اس جزیرے میں آیا ہوتا تو یہاں ایک ایک چیز مجھے حیران کردیتی۔ میں لاما کے پنجرے کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا کہ وکرم بھاٹیہ تیر کی طرح میرے پاس آیا۔

''ابراہیم...... اس حصار میں جانے کی ممانعت ہے۔''

میں نے دیکھا کہ سامان کا بکس اور تندوے کا پنجرہ حصار کے دروازے کے باہر رکھا ہوا تھا۔ واقعی اس چھوٹے سے قلعے میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ گھوم کر دیکھا تو کشتی خالی کی جاچکی تھی اور وہ تینوں پٹیاں بندھے بھورے آدمی اسے کنارے پر کھینچ رہے تھے۔ سفید بالوں والا دوہرے بدن کا آدمی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہماری طرف آ رہا تھا۔ قریب آتے ہی اس نے وکرم بھاٹیہ سے کہا۔

''اب ان بن بلائے مہمان کا مسئلہ درپیش ہے کہاں رکھا جائے انہیں؟''

''یہ بھی تو سائنس دان ہیں۔'' وکرم بھاٹیہ نے آہستہ سے کہا۔

''میں وہ کام کرنے کے لیے بے چین ہوں۔ اب نیا مال آ گیا ہے۔ تو میں ذرا تاخیر نہیں کرسکتا۔'' سفید بالوں والے نے گردن سے حصار کی طرف اشارہ کیا اور اس کی آنکھوں مں عجیب طرح کی چمک آ گئی۔

''بے شک تم بہت بے چین ہوگے۔'' وکرم بھاٹیہ نے بڑی خاکساری سے کہا۔

''میں جلد از جلد اپنا کام شروع کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن ہم اپنے بن بلائے مہمان کو نہ تو ''وہاں'' بھیج سکتے ہیں اور نہ ہمارے پاس اتنا وقت ہی ہے کہ ان کے لیے ایک جھونپڑا بنا دیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ فی الحال ہم ان پر بھروسہ بھی نہیں کرسکتے۔''

''اب میں آپ کے اختیار میں ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ حالانکہ میں نہیں جانتا کہ ''وہاں'' سے ان کا کیا مطلب تھا۔

''میں خود بھی اسی مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔'' وکرم بھاٹیہ نے سر کھجا کر کہا۔ ''میرے کمرے کا دروازہ باہر کھلتا ہے اور......''

''بالکل ٹھیک۔'' سفید بالوں والے آدمی نے یوں خوش ہوکر کہا۔ جیسے کوئی اہم عالمی مسئلہ حل ہوگیا ہو۔'' ابراہیم صاحب! معاف کرنا بھئی کہ میں ہر بات کو ایک اسرار بنا دیتا ہوں۔ کم از کم تمہیں تو ایسا ہی معلوم ہوگا۔ لیکن خود تعلیم یافتہ اور عقل مند ہو اور سمجھ سکتے ہو کہ یہاں بن بلائے آ گئے ہو۔ ہماری یہ چھوٹی سی رہائش گاہ مجھے اعتراف ہے کہ ایک طرح کا پراسرار مکان ہے۔ لیکن یہاں بہت زیادہ بھیانک چیزیں نہیں ہیں لیکن ابھی چونکہ ہم سے پوری طرح واقف نہیں۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' میں نے خوش دلی سے کہا۔ ''ابھی آپ مجھ پر بھروسا نہیں کرسکتے اگر میں آپ کی بے اعتباری پر اعتراض کروں یا برا مانوں تو یہ میری حماقت ہوگی۔''

''میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ تم واقعی عقل مند ہو۔'' اس نے کہا اور ہونٹ مروڑ کر مسکرایا۔ میں ان مردہ دل! گھنے، آدمیوں میں سے تھا جو کبھی مسکراتے نہیں اور اگر مجبوراً مسکراتے ہیں تو صرف اپنے ہونٹوں کے کونوں سے گویا مسکرانا سیکھ رہے ہوں۔ بے چارے۔

ہم حصار کے صدر دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اس دروازے کے کواڑ چوبی اور چوکھٹا آہنی تھا۔ دروازے میں تالا پڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دور تک ہم دروازے کے پہلو میں چلتے رہے اور اب ایک چھوٹے سے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ دروازہ بھی حصار کی دیوار میں ہی تھا اور صدر دروازے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سفید بالوں والے نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چابیوں کا گچھا برآمد کیا۔ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ چابیوں کا گچھا اور مقفل دروازے...... میرے لیے تو یہ بھی ایک اسرار تھا۔ خصوصاً یہ بات کہ دروازے بڑی احتیاط سے بند کیے گئے تھے۔

میں بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے دروازے سے گذر کر ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کمرے میں تھوڑا سا فرنیچر تھا۔ لیکن اتنا بے آرام نہ تھا۔ اس چھوٹے سے کمرے کا عقبی دروازہ جو باہر کھلنے والے دروازے کے مقابل تھا۔ اس وقت نیم وا تھے اور میں اس کے پیچھے چھوٹا سا صحن دیکھ سکتا تھا۔ وکرم بھاٹیہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر وہ عقبی دروازہ بند کردیا۔ کمرے کے ایک نیم تاریک کونے میں ایک جالی اور جھولا بندھا ہوا تھا اور چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ جس میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور اس کے شیشے اندھے ہو رہے تھے۔ اس کا رخ سمندر کی طرف تھا۔ اس کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوکر سمندر کی ویران وسعتوں پر نظر

دوڑائی جا سکتی تھی۔ بہت ممکن ہے کسی کے لیے سمندر کا نظارہ دلچسپ ہو۔ لیکن مجھے تو اسے دیکھتے ہی وحشت سی ہونے لگتی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے پچھلے واقعات یاد آ جاتے تھے۔

''ابراہیم...... یہ کمرا ہے تمہارا۔'' سفید بالوں والے نے کہا۔ ''اس عقبی دروازے کو میں دوسری طرف سے مقفل کر دوں گا۔ مبادا کوئی ناگہانی حادثہ نہ ہو جائے بہرحال احتیاط لازمی ہے۔ اور اس کے بعد اس نے میری توجہ ایک اونچی پشت والی کرسی اور کتابوں کی الماری کی طرف مبذول کرائی جو جالی دار جھولے کے قریب تھی۔ اسی الماری میں لاطینی اور یونانی زبان کے عمل جراحی کے متعلق کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ افسوس ہے کہ میں ان زبانوں سے واقف نہیں۔ چند انگریزی کتابیں بھی تھیں۔

سفید بالوں والا سامنے کے دروازے سے باہر چلا گیا۔ گویا وہ میری موجودگی میں عقبی دروازہ کھولنا چاہتا تھا۔ جس کے پیچھے خدا جانے کون سے اسرار تھے۔

''ہم کھانا اسی کمرے میں کھاتے ہیں۔'' وکرم بھاٹیہ نے کہا اور پھر کچھ سوچ کر وہ فوراً ہی سفید بالوں والے کے پیچھے کمرے سے باہر چلا گیا۔

''مارکوس۔'' میں نے وکرم بھاٹیہ کی آواز سنی اور ایک عجیب نام کی طرف پہلے کوئی دھیان نہ دیا۔ لیکن جب میں الماری کے سامنے کھڑا کتابیں الٹ پلٹ رہا تھا تو دفعتہً یہ عام نام لاشعور کی گہرائیوں میں سے ابھر کر سطح زمین میں آ گیا۔

''مارکوس۔'' یہ نام میں نے پہلے کہاں سنا تھا؟''

میں کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر وہ بسکٹ چبانے لگا۔ جو ناشتے کے بعد بچ گئے تھے۔ مارکوس...... مارکوس...... دماغ پر لاکھ زور ڈالنے کے باوجود مجھے یاد نہ آیا کہ پہلے میں نے یہ نام کہاں سنا تھا؟''

کھڑکی میں سے مجھے سمندر نظر آ رہا تھا۔ ویران اور پٹیاں بندھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک سامان کا بڑا سا گٹھڑ الڑھکاتا ہوا حصار کی طرف لا رہا تھا۔ جہاں وہ آڑ میں جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا...... عقبی دروازے میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔ سفید بالوں والے نے حسب وعدہ اسے مقفل کر دیا تھا تا کہ میں کسی ناگہانی حادثے کا شکار نہ ہو جاؤں۔ یہاں کون سا حادثہ ہو سکتا تھا؟ کیا خطرہ تھا یہاں۔ اس سفید بالوں والے کا مقصد کیا تھا؟ میں الجھ گیا۔ فوراً ہی شکاری کتوں کی آواز سنائی دی۔ وہ بھونک نہیں رہے تھے۔ بلکہ کچھ عجیب ڈھنگ سے غراتے ہوئے فوں...... فوں کر رہے تھے۔ میں ان کتوں کے پیروں کی چاپ اور وکرم بھاٹیہ کی آواز سن رہا تھا۔ جو انہیں پچکار پچکار کے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ گم نام، اور دور افتادہ جزیرہ، یہ حصار، مقفل عقبی دروازہ، اور یہاں کی ہر چیز کے متعلق اور ان دونوں آدمیوں کی حد سے بڑھی ہوئی راز داری نے مجھے الجھن میں ڈال دیا اور میں ان چیزوں اور اسی عجیب نام...... مارکوس کے متعلق سوچنے لگا۔ نام مجھے جانا پہچانا معلوم ہوتا تھا۔ یقیناً یہ نام میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ لیکن کب اور کہاں؟ یہ یاد نہیں آتا تھا اور پھر میں سفید پٹیاں بندھے غیر شخص اور بدصورت آدمیوں کے متعلق سوچنے لگا۔ چلنے کا انداز اور اعضاء کی ایسی حرکت کسی انسان کی تو ہو نہیں سکتی اور مجھے یاد آیا کہ ان آدمیوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی تھی۔ حالانکہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ لیتے تھے۔

اور ان کے دیکھنے کا انداز بھی ناتجربے کار وحشیوں کا تھا۔ میں سوچنے لگا وہ کون سی زبان بولتے ہوں گے؟

یہ سب کے سب نرالے آدمی، ضرورت سے زیادہ کم گو معلوم ہوتے تھے۔ لیکن میں نے ان کی آوازیں تو سنی تھیں اور عجیب آوازیں بھیانک اور غیر انسانی، کیا ہو گیا تھا انہیں اور پھر مجھے وکرم بھاٹیہ کا کالے چہرے والا خدمت گار یاد آ گیا۔ جس کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی تھیں۔

اور میں ابھی اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ وہ ایک ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ میرے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ ایک چائے دانی میں چائے اور ایک رکابی میں ابلی ہوئی سبزی۔ اس وقت وہ سفید کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس نے جھک کر ٹرے میرے سامنے میز پر رکھ دی اور...... اور...... انتہائی خوف اور حیرت نے میرے اعضاء مفلوج سے کر دیے۔ جب وہ جھک کر ٹرے رکھ رہا تھا۔ تو دفعتاً اس کے دونوں کان جو بالوں کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ جیسے اچھل کر بالوں سے باہر نکل آئے۔ میں نے حیرت اور خوف سے دیکھا کہ اس کے کان بلی کے کانوں کی طرح اوپر اٹھے ہوئے اور نوک دار تھے۔

صرف یہ ہی نہیں بلکہ ان پر ملائم بال بھی تھے۔

''آپ کا ناشتا جناب!'' اس نے غیر انسانی آواز میں کہا۔ میں نے جواب نہ دیا۔ سکتے کے عالم میں بیٹھا ہوا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی صورت تکتا رہا۔

وہ پلٹ کر چلا گیا۔ میری نظریں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ دفعتہً بجلی کی سی تیزی سے ایک فقرہ میرے ذہن میں کوند گیا...... ڈاکٹر مارکوس کے بتائے ہوئے...... آگے کیا تھا......؟ آگے کیا تھا......؟ اور فوراً ہی دوسرا جملہ سطح ذہن پر ابھر آیا۔

''ڈاکٹر مارکوس کے بنائے ہوئے بھوت۔'' اور پھر ظالم ڈاکٹر مارکوس......'' میرا ذہن دس سال پیچھے گھوم گیا......'' ظالم ڈاکٹر مارکوس اور مجھے یاد آیا کہ دس یا بارہ سال پہلے ایک پمفلٹ چھپا تھا۔ جس کی سرخی یہی تھی۔ ''ظالم ڈاکٹر مارکوس'' ...... اور پھر مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس وقت میں کم عمر لڑکا تھا اور اسکول میں پڑھتا تھا۔ ڈاکٹر مارکوس کی عمر اس وقت پچاس سال کے لگ بھگ ہوگی۔

''ڈاکٹر مارکوس...... ہندوستان کا مشہور ترین ماہر الاعضاء تھا۔ علم تشریح کا ماہر اپنے چڑچڑے پن اور غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے سائنسی دنیا میں مشہور تھا۔ کیا وکرم بھاٹیہ کا سفید بالوں والا ساتھی۔ وہی ڈاکٹر مارکوس ہے؟

اس نے نقل خون کے متعلق حیرت انگیز حقائق شائع کیے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعد میں معلوم ہوا تھا کہ وہ روگی اور کم نشوونما پائے ہوئے بچوں پر بہت قیمتی اور کامیاب تجربات کر رہا تھا کہ یکایک اس کے خلاف ایک ہلڑ مچ گیا۔ ایک اخبار نویس، اس یقین کے ساتھ کہ وہ نہایت سنسنی خیز باتوں کا انکشاف کرے گا۔ ڈاکٹر مارکوس کا معاون اور شاگرد بن کر اس کی تجربہ گاہ میں پہنچ گیا۔ اس اخبار نویس نے پمفلٹ شائع کیا تھا۔ جس نے پورے ملک میں ایک آگ سی لگا دی تھی اور آخرکار ڈاکٹر وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ جس دن یہ پمفلٹ چھپا اس کے دوسرے ہی دن ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے گویا جلتی پر تیل کا کام دیا۔

ہوا یوں کہ ایک اعضاء بریدہ کتا ڈاکٹر مارکوس کی تجربہ گاہ سے بھاگ نکلا اور ڈاکٹر مارکوس کے ظالمانہ تجربات کا جیتا جاگتا ثبوت لوگوں کو مل گیا۔

اسی اخبار نویس کا ماموں یا چچا ایک کثیر الاشاعت روزنامے کا ایڈیٹر تھا چنانچہ اس نے ڈاکٹر مارکوس اور اس کے تجربات کے متعلق ایک اشتعال انگیز اداریہ لکھا اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ شروع ہی سے کم عقل جذباتی لوگ سائنس دانوں اور ان کے تجربات کی مخالفت کرتے آئے ہیں۔ لیکن ایڈیٹر نے اپنے بھتیجے کے چشم دید واقعات بیان کرنے کے بعد لکھا کہ ڈاکٹر مارکوس کے تجربات اتنے ظالمانہ اور انسانیت سوز تھے کہ کوئی بھی انہیں برداشت نہیں کرسکتا۔ ثبوت کے طور پر اس نے اعضاء بریدہ کتے کا واقعہ پیش کیا۔ جو ڈاکٹر مارکوس کی تجربہ گاہ سے بھاگ نکلا تھا اور جس پر مارکوس تجربہ کررہا تھا۔

نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ پورے ملک میں مارکوس کے خلاف غم وغصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اگر مارکوس اپنے تجربات سے دستبردار ہوجاتا تو شاید یہ طوفان تھم جاتا۔ لیکن اس نے وطن چھوڑنا قبول کرلیا۔ یہ نہ قبول کیا کہ اپنے تجربات کو نامکمل چھوڑ دے۔ اس کے ملک سے رخصت ہونے کے بعد سے آج تک کسی کو اس کا کوئی پتا نہ چلا کہ وہ کہاں گیا۔

اور مجھے یقین ہوگیا کہ وہ وکرم بھاٹیہ کا سفید بالوں والا ساتھی وہی جلاوطن ڈاکٹر مارکوس ہے اور میں نے سمجھ لیا کہ تیندوے اور دوسرے جانور کا جو یہاں لائے گئے ہیں کیا حشر ہوگا عین اسی وقت ایک عجیب سی بو میری ناک میں داخل ہوکر تیر کی طرح دماغ میں جا لگی۔ یہ بو مقفل عقبی دروازے کے پیچھے سے آرہی تھی۔ یہ بو میرے لیے نئی نہ تھی۔ یہ دافع عفونیت کی بو تھی۔ اگر آپ کبھی آپریشن کے کمرے میں گئے ہوں تو آپ کی ناک بھی اس مخصوص بو سے واقف ہوگی...... تو میرے کمرے کے پیچھے ڈاکٹر مارکوس کا آپریشن تھیٹر تھا۔

عین اسی وقت تیندوے کے غرانے کی آواز آئی یہ آواز میرے کمرے کے عقبی دروازے کے پیچھے سے آرہی تھی۔ چنانچہ ظاہر ہوا کہ تیندوے کو حصار میں پہنچا دیا گیا تھا...... پھر ایک کتا چیخ پڑا۔ جیسے اس کی پسلیوں پر لات جمادی گئی ہو۔

''زندہ جانوروں کی چیر پھاڑ کا عمل کسی دوسرے سائنس دان یا سائنس کے طالب علم کے لیے اتنا بھیانک نہیں ہوسکتا۔'' میں نے سوچا۔

''پھر اس قدر رازداری کی کیا ضرورت تھی؟''

اور مجھے وکرم بھاٹیہ کے سیاہ چہرے والے خدمت گار کی اندھیرے میں چمکتی ہوئی آنکھیں اور اس کے نوک دار کان یاد آگئے اور میرے خیالات بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگ نکلے۔ ان الٹے سیدھے اور بھیانک خیالات سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن ان اخبارات نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔

آخر یہ سب کیا تھا؟ کیا مطلب تھا۔ ان باتوں کا؟ ایک دور افتادہ جزیرے میں ایک مقفل حصار ایک علم تشریح کا ماہر اور یہ عجیب چہروں والے بدہیت، گھناؤنے اور مڑی ہوئی ٹانگوں والے بھیانک آدمی اور چند کتے اور لاما اور وہ آزاد کیے ہوئے خرگوش...... آخر یہ سب کیا تھا؟ کیا تھا......؟''

''اوہو میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتی تمہارے پاس کون سا خزانہ ہے جو تم تشویش کا شکار ہو۔''

''اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ اس سے ہوشیار رہا جائے۔''

''تمہیں اس کی اجازت ہے ہوشیار رہنے کا کام تم سنبھال لو۔'' ریٹا نے تلخ لہجے میں کہا کامران کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ گفتگو اس کے بارے میں کی جارہی ہے۔ لیکن اس پر اعتراض کرنے والا پا نہیں کون تھا۔ اس کے دل میں تجسس تھا کہ کم از کم اس شخص کو دیکھے تو سہی۔ چنانچہ اس نے رخ بدل لیا اور لمبا چکر کاٹ کر اس خیمے کے سامنے آگیا زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ریٹا باہر نکل آئی اس کے ساتھ وہ نوجوان بھی تھا۔ یہ نوجوان اسے پہلی ہی نگاہ میں بڑا دلچسپ محسوس ہوا تھا۔ اچھے قد وقامت کا مالک تھا اور شاید اسے والٹر کہہ کر متعارف کرایا گیا تھا۔ والٹر، کامران کے بارے میں تشویش کا شکار تھا۔ کامران نے سوچا کہ چلو رقیب روسیاہ بھی ہونا چاہیے۔ حالانکہ رقابت کا جواز کوئی بھی نہیں تھا۔ رات کے کھانے پر جب سب جمع ہوئے تو کامران کو بھی ساتھ بٹھایا گیا۔ والٹر اسے مسلسل گھور رہا تھا۔ کھانے کے دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی لیکن کھانے سے فراغت حاصل کرکے والٹر چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گیا۔

''ہیلو آپ کا نام کامران ہے نا۔''

''جی۔ خیریت۔''

اصل میں مجھے مشرق اور مشرقی لوگ بہت پسند ہیں آپ بھی مشرقی ہیں میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیجیے۔'' کامران اگر والٹر کی ریٹا سے بات چیت نہ سن لیتا تو شاید اس کے دل میں مذاق اڑانے کا تصور نہ آتا۔ لیکن مسٹر والٹر ذرا کچھ کھسکے ہوئے تھے۔

''آپ کیا کرتے ہیں۔''

''جادو۔'' کامران نے جواب دیا۔

''کیا جادو؟''

دوپہر کا ایک بجا ہوا تھا کہ وکرم بھاٹیہ کمرے میں آیا۔ صبح سے اب تک میں کھڑکی کے سامنے ہی بیٹھا سوچتا رہا تھا۔ وکرم بھاٹیہ کے پیچھے اس کا وہی سیاہ چہرے والا خدمت گار کھانے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں آیا۔ میں نے کن انکھیوں سے اس عجیب آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ بے چین نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وکرم بھاٹیہ نے بتایا کہ کھانا وہ میرے ساتھ ہی کھائے گا اور یہ کہ مصروف ہونے کی وجہ سے کھانے میں شریک نہیں ہوسکے۔

''مارکوس......!'' میں نے کہا۔ ''یہ نام میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔''

''لعنت ہے۔ ! ضرور سنا ہوگا۔'' اس نے ہونٹ چبا کر کہا۔

بے خیالی میں منہ سے نکل گیا۔ بہرحال، میرے خیال میں یہ ایک نام تمہاری بہت سی الجھنیں دور کرے گا اور یہاں کے بہت سے اسرار، اسرار نہیں رہیں گے...... کیا پیو گے، وہسکی؟

''میں شراب کو چھوتا تک نہیں۔''

"ہاں......تم دانش ابراہیم ہو، پکے مسلمان بلکہ کاش! میں بھی تمہاری طرح پرہیز گار ہوتا۔ ایک طرح کی لعنت ہے یہ شراب بھی۔ لیکن توبہ کرنے سے کیا ہوگا۔ جب چور گھوڑا چرا ہی لے گئے تو پھر اصطبل کو مقفل رکھنے سے کیا حاصل۔ یعنی یہ لعنتی شراب ہے۔ جس کی چاہت نے مجھے اس جزیرے میں لا پھینکا۔ جب مارکوس نے مجھے وطن سے باہر لے جانے کی پیش کش کی تھی۔ تو اس وقت میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہا تھا۔ لیکن یہ عجیب......"

"وکرم بھاٹیہ۔" جب اس کا سیاہ چہرے والا خدمت گار چلا گیا تو میں نے جلدی سے کہا۔ "تمہارا یہ ملازم......"

"ہاں۔ کیا ہوا اس بے چارے کو؟" اس نے بے تعلقی سے پوچھا۔

"اس کے کان نوک دار ہیں۔"

وہ لقمہ منہ میں رکھ کر چند ثانیوں تک میری صورت تکتا رہا۔

"نوک دار کان!" وہ بولا۔

"ہاں اوپر کو اٹھتے ہوئے اور ان پر ملائم بال بھی ہیں۔"

وہ وہسکی کا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر گیا۔

"لیکن میرا تو خیال......یعنی اس کے بال کانوں کو چھپائے رہتے تھے۔"

"صبح جب وہ ناشتہ میرے سامنے رکھ رہا تھا۔ تو مجھے اس کے کان نظر آ گئے تھے اور اس کی آنکھیں بھی اندھیرے میں چمکتی ہیں۔"

اس اثناء میں وکرم بھاٹیہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر سنبھل چکا تھا۔

"شروع سے ہی مجھے کچھ شک سا تھا۔" اس نے قدرے ہکلا کر کہا۔ "کہ اس کے کانوں میں ضرور کوئی خاص بات ہے۔ جب ہی تو وہ انہیں بالوں کے نیچے چھپائے رکھتا ہے۔ تو کیسے تھے اس کے کان؟"

صاف ظاہر تھا کہ وکرم بھاٹیہ سب کچھ جانتا ہے۔ لیکن بن رہا ہے۔ بہر حال میں اسے جھوٹا اور مکار ثابت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے جواب دیا۔

"نوک دار، ذرا چھوٹے اوپر کو اٹھتے ہوئے روئیں دار۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ پورا کا پورا ایک عجیب آدمی ہے۔"

دفعتہً کوئی جانور انتہائی تکلیف کے عالم میں چیخ اٹھا۔ اس لرزا دینے والی چیخ کی آواز عقبی مقفل دروازے کے پیچھے سے آئی تھی۔ یقیناً یہ تینڈوے کی چیخ تھی۔ میں نے دیکھا کہ وکرم بھاٹیہ کو پھریری سی آ گئی۔

"اچھا؟" اس نے ہونٹ دبا کر مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کہاں سے پکڑ لائے اس آدمی کو؟"

"وہ......وہ...... واقعی بہت بدصورت آدمی ہے۔ معلوم نہیں کہ کس ملک کا ہے؟ بہر حال بہت مخلص ہے اور ہم ایک دوسرے سے مانوس بھی ہو چکے ہیں۔ تو کیا خیال ہے۔ تمہارا اس کے متعلق؟"

"معاف کرنا یار وکرم بھاٹیہ! میں تو تمہارے اس ملازم کو انسان سمجھتا ہی نہیں وہ تو کوئی اور ہی چیز ہے۔ وہ عجیب اور بالکل ہی مختلف مخلوق کے اختلاط کا نتیجہ ہے۔ میں وہمی اور ڈرپوک نہیں ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب وہ میرے قریب ہوتا ہے تو ایک طرح کا خوف میرے دل پر مسلط ہو جاتا ہے۔ جیسے...... جیسے...... مجھے کسی خوں خوار درندے کے سامنے چھوڑ دیا گیا ہو۔ تمہارا یہ ملازم کسی درندے سے مشابہہ ہے جیسے ایک جانور کے اعضا دوسرے جانور کے جسم سے جوڑ دیے ہوں۔ مجسم شیطان ہے وہ۔"

"اوہ......اس کا تو مجھے کبھی خیال نہیں آیا تھا۔" وکرم بھاٹیہ نے لقمہ نگل کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے جہاز کا کپتان اور دوسرے ملاحوں نے شاید تمہاری طرح ہی محسوس کیا تھا اور اسی لیے انہیں میرے ملازم سے بھی نفرت ہوگئی تھی۔"

تینڈوا پھر چیخا اور اس دفعہ میں اس بری طرح اچھل پڑا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اذیت پہنچا رہا ہو۔ سخت اذیت۔ وکرم بھاٹیہ نے جھرجھری سی لی اور زیر لب ایک گالی بک دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب ہماری کشتیاں ساحل کی طرف بڑھ رہی تھیں تو وہاں منتظر کھڑے ہوئے عجیب الخلقت دو پائے کے متعلق پوچھ کر اور وکرم بھاٹیہ کو گھیر کر اس سے اُگلوا لوں۔ ابھی میں بات شروع کرنے کے متعلق سوچ رہا تھا کہ تینڈوا پھر چیخا اور چند منٹوں تک چیختا رہا۔

"اور تمہارے وہ ملاح اور کنارے پر منتظر کھڑا ہوا آدمی!" میں نے کہا۔ "کس نسل سے ہیں یہ لوگ؟"

"بہت اچھے آدمی ہیں۔" وکرم بھاٹیہ نے بھنوؤں کو سکیڑ کر بے خیالی میں کہا۔ تینڈوا پھر چیخا اور یہ چیخ پچھلی چیخوں سے بھی بھیانک تھی۔ وکرم بھاٹیہ خالی خالی نظروں سے میری طرف چند ثانیوں تک دیکھتا رہا۔ پھر وہسکی کا ایک جام چڑھایا اور موضوع بدل کر دوسری باتیں کرنے لگا۔ پہلے اس نے شراب کے نقصانات گنائے۔ پھر کہا "میں اس مشروب کے نقصانات سے واقف ہونے کے باوجود اسے ترک نہیں کر سکتا۔" اور پھر اس نے بڑے جوش سے کہا۔ "اگر وہ نہیں ہوتا تو میں کبھی کا مر چکا ہوتا۔ چنانچہ اس نے مجھے حیاتِ نو بخشی تھی۔ وغیرہ۔ میں بیچ میں "ہوں" "ہاں" کرتا رہا اور اس طرح کھانا ختم ہوا۔ وکرم بھاٹیہ کا سیاہ چہرے اور نوک دار کانوں والا ملازم کمرے میں داخل ہوا اور ٹرے اٹھا کر عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتا ہوا چلا گیا۔ وکرم بھاٹیہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی کمرے سے نکل گیا۔

تینڈوا جس کے اعضا کی شاید قطع و برید کی جا رہی تھی۔ مسلسل چیخ رہا تھا۔ دوپہر ڈھلتے ڈھلتے ان چیخوں میں شدت پیدا ہوگئی ابتدا میں چیخیں صرف تکلیف دہ تھیں۔ لیکن اب وہ حواس پر چھا رہی تھیں۔ وہ ناقابل برداشت ہوگئیں لرزا دینے والی اور ناقابل برداشت۔ میں اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں کو بھینچ لیا اور آخر کار میں نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں۔

لیکن چیخیں پھر بھی سنائی دیتی رہیں۔ ان کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ دھوپ میں بلا کی تیزی تھی لیکن میں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ میں حصار کے دروازے کے سامنے پہنچا وہ پھر مقفل کر دیا گیا تھا۔ دروازے کے سامنے سے گزرتا ہوا میں آخری سرے پر پہنچا اور ایک طرف مڑ گیا۔

باہر چیخیں اور بھی زور سے سنائی دے رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے دنیا کی ساری تکلیفوں اور عذابوں کو قوتِ گویائی مل گئی ہو۔ اگر میری جگہ کوئی پتھر دل آدمی ہوتا تو وہ بھی ان چیخوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یقیناً وہ بھی میری طرح بھاگ نکلتا کسی ایسی جگہ کی تلاش میں جہاں تک یہ چیخیں پہنچ نہ پائیں۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں سامنے نظر آتا ویران سمندر، سرسبز درخت، جھاڑیاں اور حصار میں سے آتی ہوئی چیخوں کی آوازیں۔

ایک عجیب دنیا تھی یہ جس میں، میں اپنے آپ کو پا رہا تھا۔ پریشان اور برہم۔ میں اندھا دھند آگے بڑھتا چلا گیا۔

یہ جانے بغیر کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ سبزے سے ڈھکی ہوئی ڈھلان پر چڑھتا رہا۔ بلند اور گھنے درختوں میں گزرنے کے بعد میں ایک چشمے پر پہنچ گیا اور اب اسی چشمے کے کنارے چلتا ہوا میں نیچے اتر رہا تھا یا تو میں حصار سے بہت دور آ گیا تھا۔ یا پھر گھنے درختوں اور گنجان جھاڑیوں نے حصار کی طرف سے آتی ہوئی آواز کو کہیں آگے بڑھ کر روک لیا تھا۔ بہرحال اب مجھے تیندوے کی چیخیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔

ہوا بند تھی لیکن یہاں جنگل میں گھنے درختوں کی چھاؤں میں خاصی ٹھنڈک تھی اور گہری خاموشی۔ حتیٰ کہ پتوں کی سرسراہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دفعتہً ہلکی سی سرسراہٹ نے اس موت کی سی خاموشی کو توڑ دیا۔ فوراً ہی خرگوش دائیں طرف کی جھاڑیوں میں سے نکل آیا اور چند ثانیوں تک مونچھیں ہلا ہلا کر مجھے دیکھتا رہا اور پھر بائیں طرف کی جھاڑیوں میں گھس گیا۔

خدا جانے میں حصار سے کتنی دور آ گیا تھا کہ اس وقت شدید تھکن محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ تھوڑے سے پس و پیش کے بعد میں وہیں گھاس پر بیٹھ گیا۔

یہ بہت خوبصورت جگہ تھی۔ وہ چشمہ جس کے کنارے کنارے چل کر میں یہاں آیا تھا۔ لمبی لمبی گھاس کے نیچے چھپ گیا تھا لیکن جہاں چھدری گھاس تھی۔ وہاں اس کا بلورین پانی درختوں کے پتوں میں سے چھن چھن کر آتی ہوئی کرنوں میں چاندی کی طرح جگمگاتا نظر آ رہا تھا۔ چشمے کے دوسرے کنارے سے گھنے درختوں اور گنجان بیلوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا اور نظریں افق تک پہنچنے سے پہلے ہی سبز پودے میں الجھ کر رہ جاتی تھیں اور جگہ جگہ سرخ و سفید پھول قمقموں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ تھوڑی دیر تک میں اس مسحور کن منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا لیکن فوراً ہی وکرم بھاٹیہ کا سیاہ چہرے والا ملازم یاد آ گیا۔ میں اس کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کی صورت تصور میں سے نکلتی ہی نہ تھی۔ اسی کے متعلق سوچتے سوچتے وہیں نرم نرم گھاس پر سو گیا۔

خدا جانے میں کب تک سوتا رہا۔ دفعتہً کوئی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی یہ آواز چشمے کے دوسرے کنارے سے آ رہی تھی چند ثانیوں تک تو مجھے لمبی لمبی گھاس اور سبزے کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔ یکا یک چشمے والے کنارے پر کوئی چیز نمودار ہوئی۔ ابتدا میں تو میں معلوم نہ کر سکا کہ وہ کیا تھی۔ اس نے اپنا سر جھکایا اور چشمے سے پانی پینے لگا۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ کوئی آدمی تھا جو چوپائے کی طرح چاروں ٹانگوں پر جھکا منہ سے پانی پی رہا تھا۔

"اور میں اس جنگل سے جلد از جلد نکلنے کے خیال سے پلٹ کر اندھا دھند بھاگا۔" میں جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا۔ اس لیے کہ جلد از جلد حصار میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں اس جنگل میں محفوظ نہ تھا لیکن حصار شاید دور تھا کیونکہ تیندوے کی چیخیں سنائی نہیں دے رہی تھیں چنانچہ میں چاہتا تھا کہ کم سے کم کھلی جگہ میں ہی پہنچ جاؤں اور ایک حد تک اپنے آپ کو محفوظ تصور کر سکوں۔ خرگوش شکاری کسی جھاڑی یا درخت کے پیچھے سے اچانک مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔

"میں بھاگا چلا جا رہا تھا کہ درختوں اور جھاڑیوں کے بیچ میں چھوٹی سی کھلی جگہ دیکھ کر رُک گیا۔ اگر میں یوں نہ رُک گیا ہوتا تو میرا دوسرا قدم مجھے اس کھلی جگہ میں پہنچا دیتا اور پھر...... پھر...... پھر خدا جانے کیا ہوتا؟

کسی زلزلے یا طوفان باد و باراں سے بہت سے درختوں کے گر جانے کی وجہ سے جنگل کے بیچ میں یہ چھوٹا سا گھاس کا قطعہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس قطعے کے دوسرے کنارے سے پھر گھنا جنگل شروع ہو کر جزیرے کے انتہائی سرے تک چلا گیا تھا۔

اس کھلی جگہ میں عین میرے سامنے گرے ہوئے درخت کے ایک تنے پر تین آدمی بیٹھے تھے۔ وہ میری موجودگی سے بے خبر تھے۔ یہ بھی نیم حیوان اور نیم انسان تھے۔ حیران ہوں کہ اس جزیرے کے ان عجیب الخلقت باشندوں کو کیا کہوں۔ جو انسان تھے نہ حیوان ان میں سے ایک عورت معلوم ہوتی تھی اور مرد کی کمر کے گرد بندھی ہوئی کپڑے کی پتلی پٹی کے علاوہ ان کے بدن پر دوسرا لباس نہ تھا اور میں نے حیرت سے دیکھا کہ ان کی جلد کی رنگت زردی مائل بادامی تھی۔ پہلے کبھی میں نے کسی کی جلد کا ایسا عجیب رنگ نہیں دیکھا تھا۔ ان کے چہرے بے ڈھنگے اور چربی دار تھے ان کی ٹھوڑیاں نہ تھیں۔ پیشانی اندر کی طرف دھنسی ہوئی اور سر پر سور کے سے سخت اور چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ ان میں سے ایک اپنے دونوں ساتھیوں سے کچھ کہہ رہا تھا اور دوسرے وہ ایسی دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہے تھے کہ میرے پیروں کی چاپ اور جھاڑیوں کی سرسراہٹ نہ سن سکے۔ یا اگر سنی بھی ہوگی تو انھوں نے اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ اپنے سر اور کندھے دائیں بائیں جھلا رہے تھے جیسے انھیں وجد آ گیا ہو۔

بولنے والی آواز گہری کھردری اور رقت آمیز تھی۔ حالانکہ میں اس کی آواز صاف طور سے سن سکتا تھا۔ لیکن سمجھ نہ سکا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ یکا یک اس کی آواز باریک اور لہجہ تیز ہو گیا اور وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی اس کے دونوں ساتھی بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اب وہ تینوں ہم آہنگ ہو کر کوئی سمجھ نہ آنے والی زبان میں ایک گیت گا رہے تھے اور اس کی تال پر اپنا سر اور اپنے پورے جسم کو ایک خاص دھن میں دائیں بائیں جھلا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی ٹانگیں بھی غیر معمولی طور پر چھوٹی تھیں اور پنجے لمبے اور بے ڈھنگے تھے۔ وہ تینوں ٹانگیں اچھال اچھال کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر ایک دائرے میں گھومنے لگے۔ ان کی چڑچڑی سی آواز میں ایک خاص قسم کا ترنم پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کوئی گیت گا رہے تھے۔ جس کے ہر شعر کے آخر میں "آلو یا شاید بالولہ تھا۔" خوشی سے ان کی آنکھیں چمکنے اور حیوانوں کے سے چہرے دمکنے لگے۔ ان کے بے ہونٹ منہ سے رالیں نکلنے لگیں اور جب میں دم بہ خود کھڑا ان کی حرکتیں دیکھ رہا تھا کہ وہ انسان ہونے

کے باوجود مجھے کیوں گھناؤنے اور خوں خوار معلوم ہوتے تھے۔ کیا بات تھی کہ یہ لوگ مجھے بیک وقت انوکھے اور پھر بھی جانے بوجھے معلوم ہوتے تھے۔

اور ان سوالوں کے جواب مجھے مل گئے۔ وہ تینوں، جو کوئی پراسرار آدمی تھے۔ دھڑ لمبا اور ٹانگیں چھوٹی تھیں۔ بہت چھوٹی کوئی ایک منٹ تک ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر وہ مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتے رہے اور جھاڑیوں میں گھس گئے ٹہنیاں ٹوٹنے کی آواز آئی جو دور ہوتی گئی اور پھر غائب ہوگئی۔ ان کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک میں ان ہی جھاڑیوں کی طرف منہ کیے بیٹھا رہا۔ جس میں وہ گھسے تھے۔ میری نیند ہوا ہوگئی تھی۔

دفعتہً مجھے اپنی پشت کی طرف سے ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں اچھل پڑا جلدی سے مڑ کر دیکھا تو ایک خرگوش کی سفید لرزتی ہوئی دم سبز جھاڑیوں میں غائب ہو رہی تھی۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہی جنگل تھا۔ وہی مسحور کن منظر، لیکن اس میں نیم انسان اور نیم حیوان مخلوق کو دیکھنے کے بعد اس میں کوئی دلکشی زندہ نہ رہ گئی تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا اور ساتھ ہی تکلیف دہ احساس ہوا کہ میں نہتا تھا۔

پھر میں نے سوچا کہ وہ نیم حیوان آدمی وحشیوں کی طرح ننگا نہ تھا۔ بلکہ کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ چناں چہ...... میں نے اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے تسلی دی۔ تھوڑا بہت مہذب ضرور تھا۔

تاہم میں گھبراہٹ اور بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اب میں وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں ٹھہرنا خطرے کو دعوت دینا تھا۔ چنانچہ میں دائیں طرف چل دیا۔ لیکن حالت یہ تھی کہ خوفزدہ نظروں سے درختوں اور جھاڑیوں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ کہ شاید ان کے پیچھے وہ چھپے ہوئے ہوں گے۔

لیکن عجیب آدمی تھا وہ میں نے سوچا ''آدمی'' سوال تو یہی ہے کہ کیا حقیقت میں وہ آدمی ہی تھا۔؟ اگر آدمی تھا تو چاروں ٹانگوں پر کھڑے ہو کر منہ سے پانی کیوں سڑپ رہا تھا۔

دفعتہً کسی جانور کی لرزا دینے والی چیخ نے میرے حالات کے تار و پود بکھیر دیے۔ اس چیخ کو تیندوے کی چیخ سمجھ کر میں بے اختیار اٹھا اور جس طرف سے آواز آئی اس کی مخالف سمت چل دیا۔ میں پھر چشمے پر کھڑا تھا۔ کچھ سوچے بغیر میں چشمے میں اتر پڑا اور اسے عبور کر کے گویا عالم خواب میں دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ میں خالی الذہن سا جھاڑیوں اور گھنے درختوں میں گھس گیا اور چلتا رہا۔

سامنے سبز سبز گھاس کے عین وسط میں گہری سرخی دیکھ کر میرے پیر خود بہ خود تھم گئے ہمت کر کے آگے بڑھا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ ایک خاص طرح کے کگر متے تھے میرے ہونٹ مسکراہٹ کی صورت میں پھیل گئے اور اس وقت تک پھیلے رہے۔ جب تک کہ ایک منحوس چیز نظر نہ آگئی۔ جھاڑیوں کے قریب ایک مردہ خرگوش پر بڑی بڑی نیلے رنگ کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ خرگوش کا سر اس کے جسم سے الگ پڑا تھا۔ اور اس کا گلا کسی نے چبا سا ڈالا تھا۔ گھاس پر پڑے ہوئے خون کے دھبے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ خرگوش کو تھوڑی دیر پہلے ہی مارا گیا تھا۔

خرگوش کے جسم پر پڑے ہوئے نشانات سے پتہ چلتا تھا۔ کہ یکایک جھپٹ کر پکڑ لیا گیا ہوگا اور فوراً ہی اس کی گردن مروڑ ڈالی گئی ہوگی۔ میں سوچ رہا تھا۔ کہ ایسا ظالمانہ کام کس نے اور کیوں کیا ہوگا؟ اس

بے ضرر جانور سے کسی کو کیا پرخاش ہو سکتی تھی۔

اب تک جنگل میں مجھے کوئی درندہ نظر نہ آیا تھا۔ تو پھر...... تو پھر...... وہ آدمی جسے میں نے پانی سڑپتے دیکھا تھا وہاں۔ یہ اسی کا کام تھا۔ اس کا چہرہ غیر انسانی تھا۔ کسی درندے جیسے حیوان صفت آدمیوں میں اکیلا اور نہتا تھا...... اور وہ جھاڑیوں جیسے روپ بدلنے لگے۔ میرا تصور انہیں عجیب بھیانک شکلوں میں دیکھنے لگا۔ درختوں اور پودوں کے سائے بھی کچھ کچھ نظر آنے لگے۔ ہلکی سی سرسراہٹ کی آواز بھی بھیانک بن گئی اور نظر نہ آنے والے عفریت کی خونی آنکھیں مجھے گھورنے لگیں اور میں اس جنگل سے جلد از جلد نکلنے کے خیال سے پلٹ کر اندھا دھند بھاگا میں جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا۔ اس کے لیے جلد از جلد حصار شاید دور تھا۔ کیوں کہ تیندوے کی چیخیں سنائی نہیں دے رہی تھیں میں چاہتا تھا کہ کم از کم کھلی جگہ میں ہی پہنچ جاؤں اور ایک حد تک اپنے آپ کو محفوظ تصور کر سکوں۔ خرگوش شکاری کسی جھاڑی یا درخت کے پیچھے سے اچانک مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔

وہ تینوں پراسرار جنگلی ناچ رہے تھے بہ ظاہر انسان معلوم ہوتے تھے۔ یعنی ہماری طرح دو ٹانگوں پر چلتے تھے۔ لیکن ان کے چہرے انکے ہاتھ اور ان کی حرکتیں کسی جانور سے حیرت انگیز مشابہت رکھتی تھیں حتیٰ کہ ان کی آوازیں بھی کسی جانور کی سی تھیں۔ میں غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور اب معلوم ہوا کہ کیا بات تھی۔ ہر چند کہ وہ دو ٹانگوں پر کھڑے تھے۔ ہر چند کہ ان کے جسم کی ساخت انسانوں کے جسم کی بے ڈھنگی نقل تھی۔ لیکن وہ تینوں جنگلی سور سے مشابہ تھے۔

اس حقیقت کے انکشاف نے مجھ پر سکتہ طاری کر دیا۔ وہ تینوں جو وحشیوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ سور نما آدمی تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں اور کیا کہوں۔ ویسی ہی تھوتھنیاں اور بدن پر ویسے ہی ناپاک سخت بال وہ تینوں میری موجودگی سے بے خبر ناچتے رہے۔ دفعتہً ان میں سے ایک نے ہوا میں چھلانگ لگائی۔ پھر دوسرے اور تیسرے نے اس کی تقلید کی اور اب وہ دیوانوں کی طرح چھلانگیں لگا کر عجیب آواز میں ''غرر غرر'' کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا پیر پھسلا اور وہ سنبھلنے کی کوشش میں ایک لمحہ کے لیے اپنے ہاتھوں اور پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ حالاں کہ وہ جلدی سے اٹھ کر ناچنے لگا تھا۔ لیکن اس ایک لمحے ہی میں میں نے دیکھ لیا کہ وہ سور تھا۔ ہو بہو سور جیسا! مجھے ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے اور خاموشی سے پلٹ کر چل دیا۔

میں بڑی احتیاط سے چل رہا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ خشک پتے میرے پیروں تلے دب کر ہلکی سی آواز دے اٹھتے اور میں پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگتا کہ وہ تینوں میرا پیچھا تو نہیں کر رہے اور اس کھلی جگہ سے کافی دور نکل جانے کے بعد ہی میرے خوف میں ذرا کمی واقع ہوئی اور اب میں قدرے اطمینان اور بے خوفی سے جھاڑیوں کو ہٹاتا آگے بڑھتا رہا۔ اس وقت مجھے صرف ایک ہی خیال تھا کہ جلد سے جلد میں ان نفرت انگیز جانداروں سے دور چلا جاؤں اور میں اپنی دھن میں ایسا مگن تھا کہ میں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ اب میں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر چل رہا ہوں۔ جو جنگل کے عین وسط سے گزر رہی تھی۔

اور تھوڑی دور چلتے رہنے کے بعد ایک اور کھلی جگہ میں پہنچ گیا۔ اس میدان کے دوسرے کنارے سے جنگل پھر شروع ہو جاتا تھا۔ پگڈنڈی جس پر میں چل رہا تھا۔ اس میدان کو قطع کرتی ہوئی سامنے کے جنگل

میں گھس گئی تھی۔ جب میں اس میدان سے گزر رہا تھا۔ کہ اتفاقاً میری نظر دائیں طرف اٹھ گئی اور میں چونک پڑا۔ مجھ سے کوئی تیس گز دور جھاڑیوں کے پیچھے بے ڈھنگی ٹانگیں میرے متوازی چل رہی تھیں۔ لیکن اس طرح کہ چاپ سنائی نہیں دیتی تھیں۔ اس کے بدن کا اوپری حصہ جس کی دو ٹانگیں تھیں۔ گنجان بیلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ چلتے چلتے رک گیا میرا خیال تھا۔ کہ اس طویل ٹانگوں والے نے مجھے دیکھا نہیں ہے۔ چناں چہ جب وہ آگے بڑھ جائے گا۔ یا کسی طرف چلا جائے گا۔ تو میں اپنی راہ لوں گا۔ لیکن یہ دیکھ کر میرے بدن میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ کہ میرے رکتے ہی وہ بھی رک گیا۔ میں خوفزدہ ہوا اور اپنے سر پر پاؤں رکھ کر اندھا دھند بھاگنے سے بہ مشکل روک سکا۔

میں نے بیلوں کے الجھے ہوئے بال کی طرف غور سے دیکھا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد ہی اس کا اوپری جسم دیکھنے میں کامیاب ہو گیا اور مجھے اسے پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ یہ وہی عفریت تھا جسے میں نے چشمے سے چوپایوں کی طرح پانی پیتے دیکھا عین اسی وقت اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا نیم تاریکی میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں زبردست روشنی سے منور تھیں۔ اس نے فوراً میری طرف سے منہ پھیر لیا۔ ایک ثانیہ تک وہ اپنی جگہ کھڑا رہا اور پھر بیلوں کو گھسیٹتا اور جھاڑیوں کو کچلتا ہوا بھاگا...... اب میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن محسوس کر رہا تھا۔ کہ وہ کہیں قریب ہی چھپا مجھے دیکھ رہا ہے۔

لیکن وہ ہے کون؟ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور وہ میرے ساتھ کیوں چل رہا ہے اس سوال کا جواب ایسا بھیانک ملا کہ میں کانپ گیا۔ میں نہتا تھا۔ ایک معمولی لکڑی بھی میرے پاس نہ تھی۔ پھر اس سے بچنے کے لیے اندھا دھند بھاگنا بھی حماقت تھی۔ بہت ممکن ہے۔ اس طرح میں کسی دوسری مصیبت میں پھنس جاؤں۔ بہر حال ایک بات تو صاف تھی کہ وہ حیوان ہو یا انسان یا کوئی بھوت اس میں مجھ پر حملہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اگر ہوتی تو وہ مجھ پر حملہ کر چکا ہوتا۔ چنانچہ اسی خیال سے اپنی ہمت بندھا کر میں اس طرف چل دیا جس طرف وہ عین قریب گیا تھا۔ میں اس کے سامنے اپنے اس خوف کا اظہار کرنا نہ چاہتا تھا۔ جو میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈک کی لہر دوڑا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے خوفزدہ دیکھ کر وہ حملہ کرنے کی ہمت کر بیٹھے اور یہی ایک خیال تھا۔ جس نے میرا رخ اس طرف پھیر دیا۔ جس طرف کہ وہ گیا تھا۔ میں بیلوں سے الجھتا اور جھاڑیوں میں پھنستا بہ ظاہر بڑی دلیری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن دل کا خدا ہی حافظ تھا اور پھر میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ مجھ سے کوئی بیس گز دور کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہمت کر کے میں چند قدم اور اس کی طرف بڑھا۔

''کون ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔ اس نے مجھ سے نظریں ملانے کی کوشش کی۔

''کوئی نہیں۔'' اس نے جواب دیا اور چھلانگیں مارتا ہوا بھاگا۔ کچھ دور تک بھاگتے رہنے کے بعد اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اس کی آنکھیں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ حالاں کہ میرا دل جیسے اچھل کر حلق میں پھنس گیا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اس خطرے کا مقابلہ کیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں اور اسی میں میری بہتری بھی تھی۔ اگر میں ذرا بھی خوف کا مظاہرہ کرتا تو وہ یقیناً میرے چیتھڑے بکھیر دیتا۔ چناں چہ میں مٹھیاں بھینچ کر اس کی طرف بڑھا اور وہ بھاگا اور چھلاوے کی طرح شام کے دھندلکے میں غائب ہو گیا اور اب پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ دن ختم ہو چکا تھا۔ افق پر تاریکی پھیلنے لگی تھی۔

درختوں کے نیچے دھندلکا سمٹنے اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ایک تنہا مکھی میرے سر پر بھنبھنا رہی تھی۔ اس جنگل میں تو رات گزار نہیں سکتا تھا۔ یہ خودکشی کے مترادف تھا۔ یہ بھوتوں کا جنگل تھا۔ ان بھوتوں کا جو پل بھر میں ٹکڑے کر سکتے ہیں۔ حصار ہر چند کہ دارالعقوبت تھا۔ لیکن پورے جزیرے میں وہی ایک جگہ تھی۔ جہاں میں محفوظ تھا چنانچہ ان جھاڑیوں کی طرف جن کے پیچھے وہ چھلاوہ غائب ہوا تھا۔ دیکھے بغیر اپنے خیال میں اسی راستے پر چل دیا۔ کہ جس سے یہاں تک آیا تھا۔ میں جلد از جلد چشمے تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہاں سے میں بڑی آسانی سے حصار تک پہنچ سکتا تھا۔

جزیرے میں وہ میرا پہلا دن تھا اور ایک دن میں بلکہ آخری چند گھنٹوں میں، میں نے ایسی عجیب چیزیں دیکھی تھیں جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوں گی اور میرے لیے وہ ایک خواب پریشان ہی تو تھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو چھوٹے سے ہموار میدان میں پایا۔ یہاں درخت چھوٹے چھوٹے تھے اور آسمان نظر آ رہا تھا۔ اندھیرا اتر چکا تھا اور آسمان پر تارے ایک ایک کر کے روشن ہونے لگے تھے۔ درخت اور جھاڑیاں جو دن کی روشنی میں گہری سبز تھیں۔ اب سیاہ پراسرار نظر آ رہی تھیں۔ میں آگے بڑھا۔ درخت بھوتوں کے سائے اور جھاڑیاں الجھے ہوئے بالوں والی چڑیلیں نظر آنے لگیں۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ درخت چھوٹے اور جھاڑیاں گنجان ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر میں ایک ریتلے میدان سے گزرا وہاں عجیب پیلی پیلی اور نرم ریت تھی وہ شاید گندھک کا برادہ تھا۔

اس گندھک کے میدان سے گزرنے کے بعد میں پھر گنجان جھاڑیوں میں تھا کہ دفعتہً مجھے اپنے دائیں طرف سے کوئی آواز سنائی دی۔ میں رک گیا۔ کوئی آواز آ رہی تھی یا شاید میرا وہم تھا۔ میں پھر چلنے لگا۔ آواز پھر سنائی دی میں رک گیا۔ آواز بھی رک گئی۔

چناں چہ میں اس آواز کو اپنے پیروں ہی کی چاپ سمجھا۔ لیکن احتیاط میں جھاڑیوں سے ذرا ہٹ کر چلنے لگا۔ اور دس قدم کے بعد اچانک پیچھے گھوم جاتا۔ تاکہ اگر کوئی میرا پیچھا کر رہا ہو۔ تو اسے دیکھ لوں۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ اسکے باوجود میری چھٹی حس مجھے اپنے قریب ہی کسی ہستی کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ اب میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی میں قدرے بلند مقام سے گزر رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر میں دفعتہً پیچھے گھوما...... اور اس دفعہ میں نے کچھ اور دیکھا۔

اندھیرے افق کے پس منظر میں مجھے اپنے پیچھے ایک بے ڈول سایہ نظر آیا۔ جو میرے گھومتے ہی جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ اب کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ چمپئی رنگ کے چہرے والی عفریت میرا پیچھا کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسری بھیانک حقیقت کا انکشاف ہوا۔ میں راستہ بھول گیا۔ کچھ دور تک میں انتہائی خوف کے عالم میں دیوانوں کی طرح بھاگتا رہا۔ عفریت میرا پیچھا کرتا رہا۔ میرا تعاقب کرنے والا یا تو مجھ پر حملہ کرنے کی جرات نہ رکھتا تھا۔ یا پھر مناسب موقع کا منتظر تھا۔ احتیاط میں جھاڑیوں سے حتی الامکان دور دور ہی چل رہا تھا اور بار بار گھوم کر پیچھے دیکھ لیتا اور کان لگا کر سنتا اور کوئی آواز نہ سن کر اپنی ڈھارس بندھاتا۔ تاکہ وہ سایہ جو میں نے دیکھا تھا۔ یا تو پیکر خیالی تھا یا میرے تعاقب سے باز آ گیا تھا اور پھر سمندر کا شور سنائی دیا اور میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ یکایک مجھے اپنے پیچھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی

ٹھوکر کھا کر گرا ہو۔ میں نے جلدی سے گھوم کر دیکھا درختوں کے سائے میں ایک دوسرا سایہ حرکت کرتا نظر آیا۔ وہ سایہ فوراً ہی درختوں کے سائے میں گم ہوگیا میں کان لگا کر سننے لگا۔ مگر کوئی آواز نہ آرہی تھی۔

کچھ بھی تو نہیں۔ وہم ہے میرا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور اس طرف چل دیا جس طرف سے سمندر کے شور کی آواز آرہی تھی۔

کوئی ایک منٹ تک چلتے رہنے کے بعد میں گھنے جنگل سے نکل آیا۔ یہاں درخت چھدرے چھدرے تھے اور ایک پتلی سی چٹان سمندر میں دور تک چلی گئی تھی۔ رات خاموش تھی اور آسمان شفاف' جگمگاتے ہوئے تاروں کا عکس سمندر کے گدلے پانی میں لرز رہا تھا۔ ایک طرف پتھریلے ساحل سمندر کے پانی نے گھس گھس کر بلور کی طرح چمکا دیا تھا۔ مشرقی ساحل حدنظر تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ لیکن مغربی ساحل کو ایک اونچی راس نے چھپا لیا تھا اور اب مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر مارکوس کی بندرگاہ اور حصار مغرب کی طرف تھا۔

پیچھے کے جنگل میں سے ٹہنیوں کے ٹوٹنے اور جھاڑیوں کے سرسرانے کی آواز آئی۔ میں نے گھوم کر کالے کالے نظر آتے ہوئے درختوں کی طرف دیکھا مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ یوں کہیے کہ بہت کچھ نظر آیا۔ کیوں کہ تاروں کی روشنی میں مجھے ہر سایہ بھیانک اور خوف ناک روپ میں نظر آرہا تھا۔ کوئی ایک منٹ تک میں درختوں اور جھاڑیوں کے سایوں کو گھورتا ہوا اور انہیں عبور کرنے کے لیے مغرب کی طرف چل دیا اور ابھی میں نے اپنا پہلا قدم اٹھایا تھا کہ ان سایوں میں سے ایک نے جنبش کی اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور پیر من من بھاری ہو رہے تھے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہی کھاڑی کا موڑ نظر آیا۔ میں رک گیا میرا تعاقب کرتا ہوا سایہ مجھ سے کوئی بارہ گز کے فاصلے پر رک گیا۔ کنارے کے آخری موڑ پر ایک ہلکی سی ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر آرہی تھی۔ روشنی کا وہ لرزاں نقطہ تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ اس پر پہنچنے کے لیے مجھے پھر جھاڑیوں اور درختوں کے بیچ سے گزرنا تھا۔ اب جو میرا تعاقب کر رہا تھا۔ اسے ذرا صاف طور سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ کوئی جانور نہ تھا۔ کیوں کہ وہ دو ٹانگوں پر کھڑا تھا۔ میں نے بولنے کے لیے منہ کھولا۔ لیکن آواز حلق میں اٹک گئی۔

میں نے بھر کوشش کی۔

''کون ہے؟'' میری آواز پھٹی ہوئی اور کھردری تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمت کر کے میں نے ایک قدم اس کی طرف بڑھایا۔ اور وہ وہیں کھڑا رہا۔ البتہ کچھ سمٹ سا گیا تھا۔ پھر میں آگے بڑھا اور پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔ پھر بجلی کی سی تیزی سے ایک خیال میرے ذہن میں کوند گیا۔ اپنی نظریں اس سائے پر سے ہٹائے بغیر میں نے جھک کر وہ پتھر اٹھا لیا۔ میرے پتھر اٹھاتے ہی وہ ہوشیار کتے کی طرح اچھل کر اندھیرے کی چادر میں روپوش ہوگیا۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں جب کتے میرے پیچھے دوڑتے تھے۔ تو میں اپنے رومال کی فلاخن بنا کر ایک بڑی سی اینٹ رکھ لیا کرتا تھا اور ان کی طرف پھینکا کرتا تھا اور اس وقت بھی میں نے یہ ہی کیا۔

اس سے لیس ہو کر میں سامنے نظر آتے ہوئے درختوں کے جھنڈ کی طرف چلا۔ چند منٹوں بعد ہی اس جنگل کے سامنے کھڑا تھا۔ میں اس میں گھستا ہوا ڈر رہا تھا اور میرا یہ ڈر بے جا نہ تھا وہ جو میرا تعاقب کر رہا

تھا جھاڑیوں کے پیچھے سے مجھ پر اچانک حملہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس جنگل کو عبور کیے بغیر میں بندرگاہ اور حصار تک بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بہت دیر تک اپنی ہمت بندھاتا رہا اور پھر مٹھیاں بھینچ کر بھاگتا ہوا اس جنگل میں گھس گیا۔

میں بھاگتا رہا۔ میری سانس پھول گئی پیر جواب دینے لگے تھے۔ میں بھاگتا رہا۔ آخر کار میں اس جنگل سے نکل کر ساحل پر آگیا اور کوئی دوسرا بھی ٹہنیاں توڑتا اور جھاڑیوں کو پھلانگتا میرے پیچھے ساحل پر آگیا۔

مارے خوف کے میرے حواس گم ہوگئے اور میں ساحل پر بھاگنے لگا۔ بھاگتے ہوئے نرم پیروں کی چاپ میرا پیچھا کر رہی تھی اور مارے خوف کے میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور میں نے اپنی رفتار دگنی کر دی۔ سامنے آتے ہوئے ایک پتھر کے پیچھے سے ٹھگنے قدوقامت کے دو چار سائے نکلے اور دو ٹانگوں پر چوکتے ہوئے جھاڑیوں میں گھس گئے۔ کس قدر بھیانک گھڑی تھی۔ میں اس سنسان ساحل پر دیوانوں کی طرح بھاگا جا رہا تھا اور موت میرا تعاقب کر رہی تھی۔

اس رات اور اس گھڑی کو میں مرتے دم تک نہ بھول سکوں گا۔ میں سمندر کے اتنے نزدیک بھاگا جا رہا تھا۔ کہ سمندر کا پانی بار بار آگے بڑھ کر میرے قدم چوم لیتا تھا۔ میں برابر اسکے پیروں کی چاپ سن رہا تھا۔ جو میرا پیچھا کر رہا تھا۔ اور یہ چاپ دم بہ دم میرے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ دور بہت دور ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر آرہی تھی۔ رات خاموش اور اندھیری تھی اور بھیانک موت میرا پیچھا کر رہی تھی۔

تھپ...... تھپ...... موت کے قدموں کی چاپ قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اب میری سانس پھول رہی تھی اور میری رانوں میں جیسا کہ کسی نے سیسہ اتار دیا تھا۔

وہ ٹمٹماتی ہوئی روشنی اب کافی دور تھی۔ اور میں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں سوچا کہ حصار تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ بھوت جو میرا پیچھا کر رہا تھا۔ مجھے دبوچ لے گا اور میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر آخری کوشش کی اور میں بھاگتے بھاگتے یکا یک رک کر گھوما اور جو میرے پیچھے بھاگا آرہا تھا۔ اپنے آپ کو فوراً نہ روک سکا اور اپنے زور پر ہی بھاگتا ہوا میرے قریب آگیا میں نے دیکھا کہ وہ چوپایوں کی طرح چاروں ٹانگوں پر بھاگ رہا ہے اور میرے گھومتے ہی وہ سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

ایک منٹ ضائع کیے بغیر میں نے اپنا ہاتھ جس میں رومال تھا۔ تیزی سے گھمایا۔ اور رومال کے دونوں سروں کو جو میری مٹھی میں تھے چھوڑ دیے۔ رومال کے گوپے میں سے پتھر زوں کر کے نکلا اور عفریت کی دائیں کنپٹی پر پڑا۔ اس کی کھوپڑی ٹن سے بجی وہ عفریت لڑکھڑا کر سیدھا مجھ پر آیا۔ میں تو ساحل پر تھا اور منہ پانی میں میں اس سیاہ ڈھیر کے قریب رہنے کی جرات نہ کر سکا۔ میں نے خوفزدہ نظروں سے ایک دفعہ اس کی طرف دیکھا۔ وہ بے ہوش تھا۔ لیکن خوف تھا کہ وہ بہت جلد ہوش میں آجائے گا۔ کیوں کہ اس کا چہرہ پانی میں تھا۔

چناں چہ میں اس ٹمٹماتی ہوئی روشنی کی طرف تیزی سے چلا۔ جو دور سے نظر آرہی تھی اور ابھی میں تھوڑی دور ہی چلا تھا کہ تیندوے کی چیخیں سنائی دیں۔ اس آواز سے گھبرا کر میں بھوتوں کے اس جنگل میں گھس پڑا مگر اب یہی چیخیں میرے لیے زندگی کا پیغام لا رہی تھیں۔ تیندوے کی وہ آواز جس سے بچنے کے لیے میں جزیرے کے طلسمات میں جا پھنسا تھا۔ اب میرے بدن میں زندگی و توانائی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ کس قدر حیرت انگیز تضاد تھا۔ اب میری ٹانگیں بالکل ہی جواب دے گئی تھیں اور میں بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔

آخر میں، میں اپنی قوت سمیٹ کر حصار کی طرف بڑھا، میں نے سنا کہ کوئی آواز مجھے پکار رہی تھی۔

حصار کے قریب پہنچ کر دیکھا کہ وہ ٹمٹماتی ہوئی روشنی جو میں نے دو میل کے فاصلے پر دیکھی تھی۔ میرے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے میں سے آ رہی تھی۔ حصار کے دائیں طرف کے کونے سے ایک آواز مجھے پکار رہی تھی۔

"دانش...... دانش۔" اور یہ وکرم بھاٹیہ کی آواز تھی۔

میں بھاگتا رہا پھر میں نے وکرم بھاٹیہ کی آواز سنی اور چند منٹوں بعد ہی اندھیرے میں اس سے ٹکرا گیا۔

"ارے کہاں تھے تم؟" وکرم بھاٹیہ نے پوچھا۔

"میں اور مارکوس دن بھر اتنے مصروف رہے کہ تمہارا خیال ہی نہ آیا ابھی کوئی آدھ گھنٹے پہلے ہی یاد آیا کہ اس جزیرے میں ہم دو کہ علاوہ ایک تیسرا آدمی بھی آ گیا ہے جو ہمارا مہمان ہے۔"

"وہ مجھے کمرے میں لے آیا۔" میں اونچی پشت والی کرسی میں ڈھیر ہو گیا۔ لالٹین کی مریضانہ روشنی میری آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔

"یہ تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔" اس نے کہا۔ "تم ہمیں خبر کیے بغیر ہی جزیرے کی سیر کرنے نکل پڑو گے۔ میں ڈرتا تھا...... کہ...... کہ ارے یہ کیا ہوا......؟

میری قوت برداشت جواب دے گئی میرا سر سینے پر جھک گیا۔ وکرم بھاٹیہ نے جلدی سے تھوڑا پانی میرے حلق میں ٹپکا دیا۔

"خدا کے لیے......" میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ دروازہ بند کرو۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری مڈبھیڑ ہمارے جزیرے کے...... آہ ہم...... میرا مطلب ہے کہ تم نے شاید کچھ عجائبات دیکھ لیے ہیں۔" اس نے کہا اور دروازہ بند کر کے اندر سے تالا لگا دیا اور پھر اس نے تھوڑا سا پانی اور دیا۔ جسے میں ایک فرمانبردار بچے کی طرح پی گیا۔ وکرم بھاٹیہ نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا۔ بلکہ کہا صرف یہ کہ کھانا کھالوں۔ حالاں کہ مجھے ذرا بھوک نہ تھی۔ لیکن وکرم بھاٹیہ کے مجبور کرنے پر میں نے تھوڑا سا کھا لیا۔

میں بے ہوش ہوا چاہتا تھا۔ مجھ پر غنودگی چھا رہی تھی۔ میں نے وکرم بھاٹیہ کو بڑبڑاتے ہوئے سنا۔

"غلطی اصل میں میری ہی تھی۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے چاہیے تھا کہ پہلے میں تمہیں خبردار کر دیتا۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اس کمرے سے تم کب نکلے۔ کس طرف گئے۔ کیا دیکھا تم نے؟" میں نے اسے پورا واقعہ سنا دیا۔

"وکرم یہ سب کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم کچھ زیادہ ہی گھبرا گئے ہو۔ ورنہ میرے خیال میں یہ اتنی بھیانک بات نہیں ہے۔ جتنی کہ تم سمجھ رہے ہو۔ اس ایک دن میں ہی تمہارے ساتھ اتنے عجیب واقعات ہو گئے ہیں کہ تم۔"

عین اسی وقت تیندوا بڑی بھیانک آواز میں چیخا۔

"لعنت ہے۔" وکرم بھاٹیہ نے دانت پیس کر کہا۔ یہ جگہ تو جہنم سے بھی بدتر ہے۔"

"وکرم!" میں نے کہا۔ "سچ بتاؤ وہ کون تھا جو میرا تعاقب کر رہا تھا۔ آدمی تھا یا درندہ؟"

"بہتر ہے کہ تم اس وقت سو جاؤ اگر تم آج رات نہ سوئے تو صبح تک یقیناً پاگل ہو جاؤ گے۔"

میں وکرم بھاٹیہ کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ کون تھا جو میرا تعاقب کر رہا تھا؟" میں نے ذرا کڑک کر پوچھا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بجھ سی گئیں اور رنگ فق ہو گیا۔

"تمہارے بیان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "کوئی بھوت پریت تھا۔"

بے چینی اور سنسنی کی ایک لہر مجھے کپکپاتی ہوئی گزر گئی۔ میں دھپ سے کرسی پر گر پڑا اور دونوں ہاتھوں سے میں نے اپنا سر تھام لیا۔ تیندوا پھر چیخنے لگا۔ وکرم بھاٹیہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پیچھے کھڑا ہوا اور اس نے اپنے ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیے۔

"دیکھو ابراہیم دانش!" اس نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "تمہاری غلطی تھی کہ تم ہم سے پوچھے بغیر ہمارے اس آسیب زدہ جزیرے میں تفریح کو نکل پڑے۔ بہر حال جو کچھ ہونا تھا۔ ہو چکا۔ لیکن یہ جزیرہ اتنا بھیانک نہیں ہے۔ جتنا کہ تم سمجھ رہے ہو۔ دراصل ہوا یہ ہے کہ پے در پے واقعات سے تمہارے اعصاب متاثر ہوئے ہیں اور تم بہت گھبرا گئے ہو۔ چناں چہ اس وقت تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن یہ تیندوا تمام رات چنگھاڑتا رہے گا اور تم نہ سو سکو گے۔ چناں چہ میں تمہیں ایک دوا دیتا ہوں۔ جو تمہیں صبح تک سلائے رکھے گی تمہیں پُرسکون نیند کی سخت ضرورت ہے۔ ورنہ تم پاگل ہو جاؤ گے۔"

اور وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے چلا گیا اور منٹوں بعد ہی وہ کانچ کا پیمانہ لیے ہوئے لوٹا۔ جس میں کالے رنگ کی کوئی سیاہ شے تھی۔ کچھ کہے بغیر میں نے وہ دوا پی لی۔ وکرم بھاٹیہ نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور جالی دار جھولے میں لٹا دیا۔

"کیا کروں؟" میں نے سوچا۔

"اور فوراً مجھے فرار ہو جانے کا خیال آیا۔ میرے کمرے کا دروازہ جو باہر کی طرف کھلتا تھا اور میں آسانی سے فرار ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا۔ کہ مارکوس زندہ آدمی ہی کی چیر پھاڑ کر رہا تھا۔ کسی دوسرے ڈاکٹر کے لیے یہ بات ممکن ہو یا نہ ہو۔ لیکن ڈاکٹر مارکوس کے لیے یہ بات ممکن تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس بدنصیب آدمی کو میز پر تڑپتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب سے میں نے ڈاکٹر مارکوس کا نام سنا تھا۔ جزیرے کے بدصورت باشندوں کا تعلق اس سے ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شروع ہی سے مجھے شک تھا کہ جزیرے کے باشندے کی بدصورتی اور بے چینی میں ڈاکٹر مارکوس کا ہاتھ ہے اور وہ شک یقین میں بدل گیا۔

وہ عجیب طرح کے جان دار۔ جنہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ ڈاکٹر مارکوس کے کسی گھناؤنے تجربے کا شکار تھے اور اب بجلی کی سی تیزی سے یہ بھیانک خیال میرے ذہن میں آیا۔ وکرم بھاٹیہ اور مارکوس مجھے اس لیے اپنے ساتھ لائے ہیں کہ مجھ پر کوئی بھیانک تجربہ کریں اور میری بھی شکل و صورت بگاڑ کر ان حیوان نما آدمیوں کے ساتھ جزیرے میں چھوڑ دیں۔ اس خیال نے مجھے لرزا دیا۔

"نہیں میں ڈاکٹر مارکوس کو اپنے اوپر تجربہ نہیں کرنے دوں گا۔ میں حیوان بننا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے

اپنے آپ کو بچانا ہے۔ بہر طور پر بچانا ہے۔ میں نے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ شاید کوئی ہتھیار مل جائے۔ جس سے میں اپنی حفاظت کرسکوں۔ لیکن وہاں کوئی ہتھیار نہ تھا۔

چناں چہ میں نے یہ کیا کہ کرسی پر اپنا پیر رکھ کر اس کی ہتھی پوری قوت سے کھینچی...... تھوڑی سی کوشش کے بعد ہتھی اکھڑ گئی۔ اسے اتفاق کہیے یا میری خوش قسمتی کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس میں لگی ہوئی ایک کیل بھی نکل آئی۔ خاصی لمبی اور نوکدار کیل تھی۔ اور جس نے اس معمولی سی ہتھی کو ایک جان لیوا ہتھیار بنا دیا تھا۔

دفعتاً مجھے باہر کی طرف سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے وکرم بھاٹیہ کھڑا ہوا تھا۔ غالباً وہ اس دروازے کو باہر سے مقفل کر دینا چاہتا تھا۔ اس خیال نے کہ یہ لوگ مجھے قید کرنا چاہتے ہیں مجھے پاگل کر دیا اور میں کیل دار ہتھی اٹھا کر وکرم بھاٹیہ کی طرف لپکا۔ میں نے اس پر وار کر دیا۔ وہ اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ ایک لمحے تک میں کشمکش و پیچ کے عالم میں کھڑا رہا اور پھر حصار کے نکڑ کی طرف بھاگا۔

"ابراہیم۔" میں نے وکرم بھاٹیہ کی آواز سنی۔ "یہ کیا پاگل پن ہے۔"

"اگر میں رکا تو وہ مجھے پکڑ کر کمرے میں بند کر دے گا اور پھر مارکوس کا تجربہ......" میں نے سوچا اور پھر اپنی رفتار تیز کر دی۔ وکرم بھاٹیہ حصار کے نکڑ پر نمودار ہوا۔

"ابراہیم! بھگوان کے لیے رک جاؤ" وہ چلایا اور میرے پیچھے بھاگا۔

اس دفعہ میں شمال مشرق کی طرف اندھا دھند بھاگ رہا تھا کل میں مغربی جنگل میں گھسا تھا۔ چنانچہ اس طرف یعنی شمال مشرق کی طرف میرے خیال میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وکرم بھاٹیہ کے ساتھ اس کا سیاہ چہرے والا ملازم بھی جس کے کان نوکدار تھے۔ جس کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی تھیں میرا تعاقب کر رہا تھا۔ میں ڈھلان پر چڑھتا ہوا جزیرے کی چوٹی پر پہنچا اور مشرق کی طرف ایک سنگ ستانی گھاٹی میں گھس گیا۔

میں تقریباً ایک میل تک رکے بغیر بھاگتا رہا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اب مجھے وکرم بھاٹیہ اور اس کا ملازم کہیں نظر نہ آ رہے تھے اور نہ ہی ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ چنانچہ میں بے ڈر ہو کر ساحل کی طرف چلا، فرنوں کے جھنڈ میں لیٹ کر میں لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ ایک ڈیڑھ میل تک اندھا دھند دوڑنے کی وجہ سے بالکل ہی تھکا مارا تھا۔

اس لیے اس جگہ میں بہت دیر تک پڑا رہا۔ میرے چاروں طرف پھیلا ہوا خوفناک منظر اور چاروں طرف خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں تنہا ایک مچھر کی بھنبھناہٹ تھی۔ جس نے مجھے تلاش کر لیا تھا۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کوئی زبردست سانس لے رہا ہو۔ غور سے سننے پر معلوم ہوا کہ وہ سمندر کا شور تھا۔ جسے ہوا کے جھونکے آرام گاہ تک لے آئے تھے۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد وکرم بھاٹیہ کی آواز سنائی دی۔ جو مغرب کی طرف سے آ رہی تھی۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا اور اس کی آواز نے مجھے چونکا کر یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ سارے جزیرے میں ان کے چیر پھاڑ کرنے والوں یعنی وکرم بھاٹیہ اور مارکوس کے بنائے ہوئے حیوان نما آدمیوں کے علاوہ اور کوئی

نہ بستا تھا۔ ان باشندوں کو ڈاکٹر مارکوس اور وکرم بھاٹیہ میرے خلاف استعمال کر سکتے تھے۔ میرے پاس اس کیل دار ہتھے کے علاوہ اور کوئی ہتھیار نہ تھا۔

چناں چہ کسی آخری نتیجے پر پہنچے بغیر میں فرنوں کے جھنڈ میں اس وقت تک پڑا رہا جب تک پیاس نے مجھے بے چین نہ کر دیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کھانا کہاں سے حاصل کروں۔ یہ کہ نباتات کے متعلق میری معلومات صفر تھی اور میں نہیں جانتا تھا کہ اس جنگل میں اُگے ہوئے کس درخت کا پھل مجھے توانائی بخش سکتا ہے اور کون سا موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔ خرگوش پکڑنے کا بھی میرے پاس کوئی سامان نہ تھا۔ آخرکار انتہائی مایوسی کے عالم میں میرے خیالات کا رُخ جزیرے کے حیوان نما باشندوں کی طرح پھر گیا اور میں سوچنے لگا کہ کیا کوئی اور میری مدد کر سکتا ہے۔ میں ان کی حرکتیں یاد کر کے کوئی امید افزا نتیجہ حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

ابھی میں انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ کہ شکاری کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ خطرہ قریب تھا۔ اگر میں وہیں چھپا رہتا تو پکڑا جاتا۔ چنانچہ میں کیل دار ہتھی لے کر اپنی کمین گاہ سے نکل آیا اور اس طرف چل دیا۔ جس طرف سے کتوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں خاردار جھاڑیوں کے جھنڈ میں گھستا چلا گیا۔ جب میں اس جھنڈ سے باہر نکلا تو میرے کپڑے تار تار تھے۔ بدن پر ان گنت خراشوں میں سے خون رس رہا تھا اور میں ایک ندی کے ڈیلٹا کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ کچھ سوچے بغیر ندی میں اتر گیا۔

اور مغرب کی طرف چل پڑا۔

جلد ہی میں نے اپنے آپ کو ایک چشمے کے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے پایا میں کنارے پر چیڑ کے جنگل میں گھس گیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد رُک کر اپنا دم درست کرنے لگا۔ چند منٹوں بعد ہی خاردار جھاڑیوں کے دوسری طرف سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ صرف ایک کتے کی آواز تھی۔ جو بھونک کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اطمینان کی سانس لے کر سوچا۔

کہ اب وکرم بھاٹیہ اور مارکوس مجھے نہ پا سکتے تھے۔

منٹ پر منٹ گزرتے رہے۔ خاموشی گہری ہوتی چلی گئی۔ آخر میری ہمت بندھنے لگی۔ خوف اور مایوسی کا احساس اب اتنا شدید نہ تھا۔ میں اس احساس کی حدود سے آگے نکل چکا تھا۔ اور اب صرف زندگی اور موت کا سوال درپیش تھا۔ خوف اور مایوسی نے انتہا کو پہنچ کر مجھے کسی بھی خطرے کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔ حتیٰ کہ میں ڈاکٹر مارکوس سے بھی دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس کے علاوہ جب میں چشمے میں بھاگ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ اگر میں پکڑا گیا اور اگر مارکوس نے مجھ پر تجربہ کرنا چاہا تو میں اس عذاب سے بچنے کے لیے سمندر میں کود پڑوں گا۔ بے شک میں خودکشی کر لوں گا اور ایسا کرنے سے مجھے کوئی نہ روک سکتا تھا۔

اور جس وقت میں چشمے میں بھاگ رہا تھا۔ مجھے یہ بھی خیال آیا۔ کہ اسی وقت میں اپنے آپ کو غرق کر کے اپنے سب دکھوں کا ایک ہی وقت میں خاتمہ کر لوں۔ لیکن پھر شوق تحقیق نے مجھے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ اس جزیرے کے عجائبات دیکھے اور ان کے بارے میں پوری پوری معلومات حاصل کیے بغیر میں مرنا

نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنی عجیب وغریب مہم کو ادھوری چھوڑنا نہ چاہتا تھا اور موت تو بہر حال آنی ہی ہے۔

خاردار جھاڑیوں کے جھنڈ میں سے اندھا دھند گزرنے کی وجہ سے میرا جو حشر ہو گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں بری طرح درد کر رہے تھے۔ مجھے آرام کی ضرورت تھی۔ میں ٹانگیں پھیلا کر لیٹنا اور ایسی انگڑائی لینا چاہتا تھا کہ میری پسلیاں چیخ اٹھیں۔ میں نے یونہی درختوں اور بیلوں پر نظر دوڑائی اور ایک درخت کی گھنی بیل کے سبز پتوں میں سے ایک سیاہ چہرہ جھانکتا ہوا نظر آیا۔ وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی بندر نما انسان ہے۔ جسے میں نے ساحل پر جب ہماری کشتیاں قریب آ گئی تھیں۔ دیوانوں کی طرح بھاگتے اور مضحکہ خیز حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔ وہ بیل کے پیچھے سے نکل کر درخت کی ٹہنی پر بیٹھ گیا اور سر ہلا ہلا کر جانے کیا کیا کہنے لگا۔ مجھے تو صرف تم تم کی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں کیل دار ہتھیار مضبوطی سے پکڑے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ درخت سے کود کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑی دلچسپی سے مجھے دیکھنے لگا۔ یہ بندر نما آدمی مجھے اتنا گھناؤنا اور بھیانک نہ معلوم ہوا۔ جتنے کہ وہ حیوان آدمی معلوم ہوئے تھے۔

"تم......" اس نے کہا "کشتی میں؟"

تو ثابت ہوا کہ وہ انسان تھا۔ کم سے کم وکرم بھاٹیہ کے سیاہ چہرہ والے ملازم سے تو انسان تھا۔ کیوں کہ وہ بول سکتا تھا۔

"ہاں میں وہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں ہی کشتی میں بیٹھ کر یہاں آیا تھا۔ جب تم کنارے پر منتظر کھڑے تھے۔"

"اوہ...... منتظر۔" اس نے یوں حیرت سے کہا جیسے "منتظر" کا لفظ اس کے لیے بالکل نیا ہو۔ وہ بہت دیر تک میری صورت تکتا رہا اور پھر میرے پورے بدن کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے کئی دفعہ مجھے سر سے پیر تک دیکھا۔ کسی خاص بات نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس کی نظر میرے ہاتھوں کی انگلیوں پر گڑ گئی۔ وہ بہت دیر تک میرے ہاتھوں کو دیکھتا رہا اور پھر اپنے ہاتھوں کی انگلیاں گننے لگا۔

"ایک...... دو...... تین...... چار...... پانچ! اوہ...... حیرت سے اچھل پڑا۔ میں اس کی حیرت کا سبب نہ سمجھ سکا۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ان حیوان نما آدمیوں میں سے اکثر کے ہاتھ ناقص تھے اور بعضوں کی تو تین تین انگلیاں تھیں۔ جیسا کہ میں کہہ رہا ہوں کہ میں اس بندر نما آدمی کی اس حرکت کو نہ سمجھ سکا تھا۔ چناں چہ اس کی اس حرکت کو میں نے "خوش آمدید۔" پر مجبور کرتے ہوئے جواباً میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اور وہ مارے انبساط کے جھوم جھوم گیا پھر اس نے بڑی دلچسپی سے میری طرف دیکھا اور حیرت انگیز پھرتی سے جھاڑیوں اور بیلوں کے جھنڈ میں گھس گیا۔

میں بھی اس کے پیچھے جھنڈ میں جا گھسا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ایک درخت سے رسے کی طرح لٹکتی ہوئی بیل کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑے انتہائی خوشی کے عالم میں جھولے کھا رہا تھا۔

"سنو تو۔" میں نے کہا۔

وہ الٹی قلابازی کھا کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"مجھے کچھ کھانے کو ملے گا؟" میں نے پوچھا۔

"کھانے کو...... کھانے کو!" وہ بولا۔ "ہم آدمی ہیں۔ ہم کھاتے ہیں۔ وہاں جھونپڑوں میں جھونپڑوں میں۔"

"کہاں ہیں جھونپڑیاں؟"

"وہ!" اس نے حیرت سے کہا۔

"میں اجنبی ہوں۔"

"اجنبی! اجنبی...... ! وہ اجنبی۔" وہ بڑبڑایا اور پلٹ کر ایک طرف چل دیا۔

"آؤ...... آؤ......" اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں اس کے پیچھے ہو لیا۔

میں نے سوچا کہ جھونپڑیاں تو ان حیوان نما آدمیوں کی رہائش گاہ ہوں گی۔

اور پھر میں نے پر امید ہو کر سوچا کہ بہت ممکن ہے۔ کہ میں ان میں سے کئی ایک کو اپنا دوست بنا لوں۔ لیکن اس وقت مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ یہ حیوان نما آدمی انسانی جذبات سے ذرا بھی واقف نہ تھے۔ چوں کہ وہ انسان تھے ہی نہیں۔ اس لیے انسانیت اور انسانی جذبات انہیں ورثے میں نہیں ملے تھے۔

میرا بندر نما دلبر اپنے لمبے لمبے ہاتھ ہلاتا میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا اسے یاد ہو گا۔ کہ وہ پہلے کون تھا اور اس جزیرے میں کیسے پہنچا۔

"تم کب سے یہاں مقیم ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کب سے؟ مقیم...... مقیم! میں نے سوال دہرایا۔ تو اس نے اپنے ایک ہاتھ کی دو انگلیاں دبا کر تین میری آنکھوں کی سامنے نچائیں۔ معلوم ہوا کہ وہ بالکل ہی فاتر العقل نہ تھا۔ میں اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگا اور معلوم ہوا کہ میں اپنے سوالوں سے اسے بیزار کیے دے رہا تھا۔ جب میں نے اس سے دو چار سوال پوچھے تو وہ مجھ سے دور ہٹ کر ایک درخت سے لٹکتے ہوئے پھلوں کی طرف کودا اور مٹھی بھر پھل توڑ کر ان کے چھلکے اُتارے اور گودا بڑے مزے سے کھانے لگا۔ میں نے اپنے دل میں خوشی اور اطمینان کی لہر محسوس کی۔ کھانے کا مسئلہ ایک حد تک حل ہو گیا تھا۔ یعنی میں بھی اس درخت کے پھل کھا سکتا تھا۔ میں نے اس سے سوالات پوچھے جن کے جواب اس نے کچھ الٹے سیدھے دیے ایک دو جواب کچھ ٹھیک بھی تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ رٹے رٹائے جملے طوطے کی طرح بولے جاتا تھا۔

میں اس کی حرکتیں دیکھنے اور اس کی باتیں سننے میں ایسا منہمک تھا۔ کہ میں نے اس بات پر غور ہی نہ کیا کہ ہم کس طرف اور کہاں جا رہے تھے؟ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہم جلے ہوئے بھورے درختوں کے جھنڈ میں سے گزر کر ایک کھلی جگہ میں آ گئے۔ اس میدان میں کچھ زردی مائل بھورے پرت جمے ہوئے تھے۔ اور پورے میدان میں دھواں سا منڈلا رہا تھا۔ جو آنکھوں اور ناک میں گھس کر جلن پیدا کر دیتا تھا۔ بائیں طرف نیچی نیچی چٹانوں کا سلسلہ تھا۔ جن کے پیچھے سمندر نظر آ رہا تھا۔ راستہ اس کھلی جگہ کے عین وسط میں سے گزرتا ہوا ایک کہنائے میں اُتر گیا تھا۔

چند لمحوں کے بعد ہی ہم اس کھنائے میں تھے۔

کبھی کسی زلزلے کی وجہ سے چٹانی سلسلے میں یہ کافی بڑی دراڑ پیدا ہوگئی ہوگی۔ اس کھنائے میں اندھیرا تھا اور اس میں آتش فشانی راکھ بچھی ہوئی تھی۔ جس میں ٹخنوں ٹخنوں تک پاؤں دھنس جاتے تھے۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے۔ کھنائے کی چٹانی دیواروں کی چوٹیاں ایک دوسرے کے قریب ہوتی گئیں اور پھر آپس میں مل گئیں۔ اب ہمارے سر پر آتش فشانی چٹان کی مضبوط چھت تھی اور اس کے نیچے گھور اندھیرا۔

''مگرا!'' میرے راہبر نے کہا۔

اور میں چلتے چلتے رُک گیا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ وہاں اندھیرا تھا۔ یا شاید مجھے اندھیرا معلوم ہو رہا تھا۔ کیوں کہ میں روشنی سے آیا تھا اور میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھ نہ سکتی تھیں۔ میں کچھ نہ دیکھ سکتا تھا۔ البتہ عجیب طرح کی آوازیں سن رہا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

دفعتہً ایک عجیب طرح کی بُو نے دماغ پراگندہ کر دیا اور ایسی بو تھی جو بندروں اور دوسرے جانوروں کے گندے پنجروں میں سے اٹھتی ہے۔ سامنے کھنائے کی چوٹیاں پھر کھل گئی تھیں اور دھوپ درختوں اور جھاڑیوں پر ناچ رہی تھی۔ اس دھوپ کا عکس کھنائے کی تاریکی کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ بڑا ہی بھیانک مقام تھا وہ۔ جہاں میں کھڑا تھا۔

یکلخت کسی سرد سی لچکیلی چیز نے میرے ہاتھ کو چھوا۔ میں اچھل پڑا اور دیکھا کہ میرے قریب ہی زردی مائل کوئی دھندلی چیز کھڑی تھی۔ یہ چیز ایسی تھی۔ جیسا کھال کھینچا ہوا بچہ لیکن اس کا چہرہ جیسا تھا اور ویسی ہی تھوتھنی۔ اس ثناء میں میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں اور میں تھوڑا تھوڑا دیکھنے لگا تھا۔ ریچھ جیسے چہرے والا پست قد اور گھناؤنا جان دار سامنے کھڑا بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا اور میرا بندر نما راہبر غائب تھا۔

وہ جگہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ ایک کھنائے یا چٹانی سلسلوں کے بیچ میں ایک تنگ سی گزرگاہ تھی۔ جس کی دیواروں سے لگ کر اُگی ہوئی جھاڑیوں نے جگہ جگہ تاریک بھٹ سے بنا دیے تھے۔ یا شاید جھاڑیوں کو ترتیب سے کاٹ کر بھٹ بنائے گئے تھے۔ ان بھٹوں میں سے گذرتے ہوئے راستہ بہ مشکل تین گز چوڑا ہوگا اور اسی راستے پر پھلوں کے سڑے ہوئے چھلکے، درختوں کے پتے اور ڈنٹھل پڑے ہوئے تھے اور انہی سڑی ہوئی چیزوں سے بو اٹھ رہی تھی۔

زردی مائل ریچھ جیسی تھوتھنی والا جانور ابھی میرا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ میرا بندر نما راہبر ایک قریب بھٹ کے دروازے میں نمودار ہوا اور ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے اپنی طرف بلانے لگا۔ ابھی میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا تھا کہ دوسرے بھٹ سے ایک زبردست ڈیل ڈول کا بے ہنگم جان دار نکل کر راستے کے بیچ میں کھڑا ہو گیا اور گھور گھور کر مجھے دیکھنے لگا۔ اس دیو کو دیکھ کر میں ایسا خوفزدہ ہوا کہ میری گھگھی بندھ گئی اور جی چاہا کہ بھاگ جاؤں یہاں سے۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ اب اوکھلی میں سر دے ہی دیا تو دھماکوں سے کیوں ڈروں۔ میں نے بھاگ جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں ان عجیب الخلقت لوگوں کے متعلق پوری پوری معلومات لیے بغیر وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ چناں چہ میں نے کیل دار ہتھیار مضبوطی سے پکڑا' آگے بڑھا

اور اس بھٹ میں جس کے دروازے میں سے یہ نمودار ہوا تھا۔ داخل ہو گیا۔

بھٹ نیم دائرے میں بنا ہوا تھا اور شہد کی مکھیوں کی نصف چھتے کی شکل کا تھا۔ سامنے چٹانی دیوار تھی۔ جس کے قریب ناریلوں کا انبار لگا ہوا تھا اور ایک طرف لکڑی اور پتھر کے بے تکے برتن بے ترتیب پڑے تھے۔ ایک بڑا قلہ یا اس کے جیسا کوئی برتن ایک ٹیڑھی ٹانگوں والی پائی پر رکھا ہوا تھا۔ بھٹ تاریک اور سرد تھا۔ ایک کونے میں کسی چیز کا ایک کالا سا ڈھیر پڑا تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو اس ڈھیر میں سے آواز آئی۔

''یاؤ'' اور معلوم ہوا کہ یہ بھی کوئی جان دار تھا۔ میں ایک طرف پالتی مار کر بیٹھ گیا اور میرے بندر نما راہبر نے ایک کٹا ہوا ناریل فوراً ہی میری طرف بڑھا دیا بھٹ کی تاریکی میں میرا دم گھٹ رہا تھا اور تیز بدبو، ذہن پریشان کیے دے رہی تھی۔ لیکن بھوک کا احساس ان سب احساسات پر غالب تھا۔

چناں چہ میں نے بندر نما راہبر سے ناریل لے لیا۔ اور اس کے گودے کے قتلے حتی الامکان سکون واطمینان سے کھانے لگا۔ ریچھ جیسی تھوتھنی والا پست قد جان دار بھٹ کے دروازے میں کھڑا تھا۔

اسکے پیچھے کوئی دوسرا جان دار کھڑا تھا۔ جس کے چہرے کا رنگ بادامی تھا اور آنکھیں چمک دار۔ دونوں بڑی دل چسپی سے میری ایک ایک حرکت دیکھ رہے تھے۔

''یاؤ'' کونے کے پراسرار ڈھیر میں سے پھر آواز آئی۔

''یہ آدمی ہے میری طرح...... پانچ'' میرا بندر نما راہبر بولا۔

''آدمی...... آدمی...... آدمی میری طرح۔''

''چپ۔'' پراسرار کالا ڈھیر بولا۔

اور پھر خاموشی چھا گئی۔ موت کی سی خاموشی۔ میں ناریل کے قتلے چباتا رہا۔ میں آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس پراسرار کالے ڈھیر اور دوسرے سایوں میں کوئی تمیز نہ کر سکتا تھا۔ کہ ان میں کون سا سایہ جان دار ہے اور کون سا غیر جان دار۔

''آدمی ہے...... سچ مچ آدمی۔'' پراسرار کالے ڈھیر نے پھر کہا۔ ''رہنے آیا ہے۔''

بندر نما راہبر نے میری طرف دیکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سوال کا جواب میں دوں۔ ''میں آدمی ہوں۔ تمہارے ساتھ رہنے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''واہ...... واہ...... آدمی ہے...... آدمی...... اسے قانون سیکھ لینا چاہیے۔ یہ ضروری ہے ہر آدمی کو قانون سیکھ لینا چاہیے۔'' آواز نے کہا۔

اور اب میں اندھیرے میں اس کالے ڈھیر کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ پالتی مارے بیٹھا تھا۔ بس اس کے سوا میں کچھ اور نہ معلوم کر سکا اور پھر میں نے دیکھا کہ بھٹ کے دروازے میں دو سر نمودار ہوئے۔ کیل دار ہتھیار پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ اندھیرے میں سے آواز آئی۔

''کہو۔ چار ٹانگوں سے چلنا گناہ ہے۔''

اس کے آخری الفاظ میں نے سنے کیوں کہ میرا دھیان بھٹ کے دروازے کی طرف تھا۔

''کہو...... کہو! چار ٹانگوں سے چلنا گناہ ہے۔'' آواز نے پھر کہا۔

میں گڑبڑا گیا۔

"کہو جو کہا جائے تم بھی کہو۔" میرے بندر نما راہبر نے کہا۔ اور بھٹ کے دروازے میں سے جھانکنے والے نے بھی دھمکی آمیز لہجے میں میرے راہبر کی بات دہرائی اور مجھے وہ وقت یاد آ گیا۔ جب میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لڈو لے کر بسم اللہ پڑھی تھی۔ آج پھر میری گویا یہی تقریب تھی۔

بہرحال مجھے احساس ہوا کہ میری خیریت اسی میں ہے کہ میں احمقانہ انداز میں الفاظ دہراتا چلا جاؤں اور اب ایک ناقابل فہم تقریب ادا کی جانے لگی۔ اندھیرے میں سے آتی ہوئی آواز جو الفاظ کہتی اسے ہم سب جھوم جھوم کر دہراتے اور وہ عجیب الخلقت لوگ الفاظ کو دہراتے وقت ایک وجد کے عالم میں اپنے زانوں کو بھی پیٹتے جاتے تھے۔ ان کے دیکھا دیکھی میں بھی ایسا ہی کر رہا تھا۔ وہ اندھیرا بھٹ، دروازے میں کھڑی ہوئی عجیب مخلوق اور کالے پراسرار ڈھیر میں سے آتی ہوئی آواز۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میں کسی دوسری ہی دنیا میں پہنچ گیا ہوں اور یوں کہہ رہی تھی وہ آواز، جس کے ہر لفظ کو ایک کورس کی شکل میں دہرایا جا رہا تھا۔

"چاروں ٹانگوں سے چلنا گناہ ہے کیوں کہ ہم آدمی ہیں۔
درختوں پر ناخن گھسنا اور چھیلنا گناہ ہے۔ کیوں کہ ہم آدمی ہیں۔
دوسرے آدمی کو جھنجوڑنا گناہ ہے کیوں کہ ہم آدمی ہیں۔
گوشت اور مچھلی کھانا گناہ ہے۔ کیوں کہ ہم آدمی ہیں۔"

اور جب ان معمولی قسم کے امتناعی احکامات کی فہرست ختم ہوئی تو پھر ایسے امتناعی احکامات کی فہرست جنہیں کوئی تصور میں بھی نہیں لا سکتا۔ یہ احکامات کسی پاگل دماغ کی اختراع معلوم ہوتے تھے اور ان پر عمل کرنا میرے خیال میں کسی انسان کے بس کا روگ نہ تھا۔ بہرحال ان امتناعی احکامات کو بھی دہراتے اور پاگلوں کی طرح جھومتے رہے۔ بہ ظاہر میں جوش و خروش اور احترام سے وہ الفاظ دہراتا رہا تھا لیکن دل ہی دل میں، میں ہنس رہا تھا اور دل کا حال کون جان سکا ہے اور اگر ان وحشیوں کو معلوم ہو جاتا کہ میں دل میں ان کے قوانین کا مذاق اڑا رہا ہوں۔ تو وہ یقیناً میرے ٹکڑے کر دیتے چند منٹوں بعد الفاظ کی ترتیب بدل گئی اور ہم دوسرا گیت گانے لگے۔

"اس کا گھر عذاب کا گھر۔

وہ جلاتا ہے وہ مارتا ہے...... وہ بناتا ہے...... وہ بگاڑتا ہے۔ وہ زخمی کرتا ہے...... وہ اچھا کرتا ہے۔"

اور اسی طرح ہم بہت دیر تک "وہ" کی مدح سرائی کرتے رہے۔ بہت ممکن ہے ان حیوان نما آدمیوں کے لیے اس کا کوئی مطلب ہو۔ لیکن میرے لیے تو یہ پوری تقریب بے معنی اور احمقانہ تھی۔ "وہ بجلی چمکاتا ہے اور وہ بجلی کی چمک ہے۔ ہم نے جھوم کر گایا۔ وہ سمندروں کا آقا ہے۔ وہ زمینوں کا آقا ہے وہ بادلوں کا آقا ہے۔"

اور ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک بھیانک حقیقت کا احساس ہوا۔ ڈاکٹر مارکوس نے ان لوگوں کو حیوانوں جیسا بنا دینے کے بعد ان کے ذہنوں پر اپنی قوتوں کا اثر جما دیا اور اب یہ لوگ اس مارکوس کو خدا سمجھتے

بے شک یہ مارکوس کی قوتوں کی تعریف تھی۔ یہ حیوان نما لوگ اسے اپنا معبود سمجھتے تھے۔ میں اسے اپنا معبود بنا لینے کو تیار نہ تھا۔ لیکن مجھے اپنی جان عزیز تھی۔ مجھے اپنے چاروں طرف بیٹھے اور کھڑے ہوئے ہستیوں کے لمبے ناخنوں اور خونخوار نوک دار دانتوں کا احساس بھی تھا۔ چناں چہ میں اپنے دل میں نفرت و غصہ لیے اپنی مرضی کے خلاف مارکوس کی تعریف میں گیت گا رہا تھا۔

"وہ آقا ہے۔ آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کا۔"

اور آخر کار یہ "مداح سرائی" ختم ہوئی اور میرے بندر نما راہبر کا چہرہ چکنے چکنے پسینے سے چمکنے لگا اس عرصے میں میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں اور میں نے بھی انتہائی کونے میں بیٹھے ہوئے جان دار کو دیکھا۔ یہی وہ جان دار تھا۔ جو مجھے شروع شروع میں کالا ڈھیر معلوم ہوا تھا اور یہی جان دار قانون کا ورد کرتا تھا۔ اس کا قد آدمی کا سا تھا۔ لیکن اس کے بدن پر لمبے لمبے بھورے اور گھنے بال تھے۔ کیا تھا وہ! اور یہ سب کیا تھا ذرا اپنے آپ کو دنیا کے سب سے زیادہ گھناؤنے اور بھیانک لنگڑے لنجھوں اور پاگلوں میں تصور کیجیے اور پھر آپ شاید ہی اس وقت کی حالت کو ایک حد تک سمجھ سکیں گے۔

"اس کی پانچ ٹانگیں ہیں پوری پانچ میری طرح۔" میرا بندر نما رہبر بولا۔

اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ کونے میں بیٹھا ہوا بھورا جان دار میری طرف جھکا۔

"چاروں ٹانگوں سے چلنا گناہ ہے۔" اس نے کہا اور اپنے عجیب طرح کے پنجوں سے میری انگلیاں پکڑ لیں۔ یوں معلوم ہوا جیسے ہرن کے کھروں کو کسی عمل سے پنجے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ میں حیرت سے چیخ پڑا۔ اس کا چہرہ میرے اور قریب آیا اور وہ میرے ناخن دیکھنے لگا۔ وہ اور جھکا اور اس کا چہرہ بھٹ کے دروازے سے آتی ہوئی دھندلی روشنی میں آ گیا اور میں کانپ اٹھا۔ اس کا چہرہ نہ آدمی کا تھا اور نہ جانور کا بلکہ بے ترتیب بھورے بالوں کا ایک گٹھا سا تھا۔ جس میں حرکت کرتے ہوئے تین دھبے اس کی آنکھوں اور منہ کا پتہ دے رہے تھے۔

"اس کے ناخن چھوٹے ہیں۔" وہ بولا۔ "اور اچھا ہے۔ کیوں کہ کئی ایک آدمی بڑے ناخنوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہو گئے تھے۔"

اس نے میرے ہاتھ چھوڑ دیے اور میں نے فوراً کیل دار ہتھیار پکڑ لیا۔ جو میں نے اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔

"جڑیں کھاؤ۔ پتے کھاؤ گوشت نہ کھاؤ یہی ہے اس کی مرضی۔" میرے بندر نما راہبر نے کہا۔

"میں قانون گو ہوں۔" بھورے بالوں والا بھوت بولا۔ "نئے آدمی میرے پاس لائے جاتے ہیں۔ کہ میں انہیں قانون سکھاؤں اور میں یہاں اندھیرے میں بیٹھ کر قانون بتاتا ہوں۔"

"سچ ہے۔" دروازے میں کھڑے ہوئے حیوان نما آدمیوں میں سے ایک نے کہا۔

"اور جو لوگ قانون شکنی کرتے ہیں۔ عذاب پاتے ہیں۔ کوئی اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔"

"کوئی نہیں بچ سکتا۔" حیوان نما انسانوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"کوئی نہیں ہیں...... کوئی نہیں ہیں۔" میرا بندر نما راہبر بولا۔ "دیکھو ایک دفعہ مجھ سے گناہ ہو گیا

تھا۔ میں بولنے کے بجائے بندر کی طرح ''خوں......خوں'' کرنے لگا تھا۔ چناں چہ دیکھو میرے ہاتھ گرم سلاخ سے داغ دیے گئے۔ وہ عظیم ہے وہ بڑا ہے۔ کوئی بچ نہیں سکتا۔'' بھورے بالوں والے بھوت نے کہا۔

''کوئی بچ نہیں سکتا۔'' حیوان نما لوگوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسروں کی طرف دیکھتے ہوئے دہرایا۔

''ہر وہ آدمی جو بُرے ارادے رکھتا ہے۔'' قانون گو نے کہا۔ ''ہم نہیں جانتے کہ تمہارے ارادے کیا ہیں۔ لیکن جان لیں گے کئی لوگ جان دار چیزوں کا پیچھا کرنا چاہتے ہیں۔ چھپ کر دیکھنا اور جھپٹنا چاہتے ہیں۔ مارنا اور کاٹنا چاہتے ہیں۔ خون چوسنا چاہتے ہیں اور یہ سب برے ارادے ہیں۔ دوسرے آدمی کو بھنبھوڑنا گناہ ہے۔ کیوں کہ آدمی ہیں۔ گوشت اور مچھلی کھانا گناہ ہے کیوں کہ ہم آدمی ہیں۔''

''کوئی بچ نہیں سکتا۔'' دروازے میں کھڑے ہوئے ایک اور جان دار نے کہا۔

''ہر وہ آدمی جو بُرا کام کرتا ہے۔ سزا پاتا ہے۔'' قانون گو بولا۔ ''کئی لوگ چھالیں چھیلتے ہیں جڑیں کریدتے ہیں اور زمین سونگھ سونگھ کر چلتے ہیں۔ یہ بُرے کام ہیں اور ان کی سزا مقرر ہے۔''

''کوئی بچ نہیں سکتا۔'' میرے بندر نما رہبر نے پنڈلی کھجا کر کہا۔

''کوئی بچ نہیں سکتا۔'' سب نے کہا۔

''عذاب سخت ہے اور یقینی ہے چناں چہ قوانین سیکھ لو۔''

بھٹ میں شور مچ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک سؤر نما آدمی نے ریچھ جیسی تھوتھنی والے کے کان میں کچھ کہا۔ جسے میں نہ سن سکا۔ بھٹ کے دروازے میں جتنے بھی حیوان نما آدمی کھڑے تھے۔ وہ سب کے سب وہاں سے ایک خوف اور گھبراہٹ کے عالم میں بھاگے۔ میرا بندر نما رہبر بگولے کی طرح بھٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے قانون گو چلا اور اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ دیو ہیکل تھا اور اس کے بدن پر بھورے اور سفید بال تھے۔ اب میں بھٹ میں اکیلا رہ گیا۔

چند ثانیوں کے بعد میں بھی اٹھ کر، اس گڑ بڑ کی وجہ معلوم کرنے کے لیے دروازے کی طرف چلا اور ابھی میں دروازے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ شکاری کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔

اور میں دوسرے ہی لمحے کیل دار ہتھیار مضبوطی سے پکڑے بھٹ کے باہر کھڑا تھا میرے سامنے تقریباً حیوان نما آدمیوں کی بال دار اور گھناؤنی پشتیں تھیں۔ وہ اچک کر کہیں آگے دیکھ رہے تھے۔ سر ہلا ہلا کر ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ دوسرے حیوان نما آدمی اپنے اپنے بھٹ کے دروازوں میں سے جھانک رہے تھے۔

فرار کی کوئی راہ نہ تھی۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور دائیں طرف مجھ سے کوئی چھ گز آگے چٹانی دیوار میں ایک تنگ شگاف نظر آ گیا اور میں اس شگاف کی طرف بھاگا۔

''رک جاؤ۔'' مارکوس چلایا۔ ''لیکن جب میں نہ رُکا۔ تو اس نے حکم دیا۔ ''پکڑ لو اسے۔'' حیوان نما آدمیوں میں سے پہلے ایک، پھر دوسرا اور تیسرا میری طرف گھوم لیا۔ تھوڑی دیر بعد ان سب کے منہ میری طرف تھے۔ ان کے حیوانی دماغ جو بہت دیر میں کوئی بات سمجھ سکتے تھے۔

میں نے اس بھورے چہرے والے کو، جو راستہ روکے کھڑا تھا۔ اپنے کندھے سے دھکا دیا۔ اس وقت وہ مارکوس کی بات سمجھنے کے لیے ہمہ تن اس طرح متوجہ تھا چناں چہ میرا دھکا لگتے ہی وہ اپنے پیچھے کھڑے ہوئے۔ دوسرے حیوان نما آدمی پر گرا گرتے گرتے اس نے ہاتھ چلایا اور مجھے پکڑنا چاہا۔ لیکن میں غوطہ مار کو نکل گیا ریچھ جیسی تھوتھنی والا پستہ قد آدمی مجھ پر جھپٹ پڑا۔

میں نے کیل دار ہتھے سے اس پر وار کر دیا۔ نوک دار کیل اس کے گال پر خراش لگا گئی۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ پیچھے ہٹا اور دوسرے ہی لمحے میں اس ڈھلوان شگاف میں بھاگا جا رہا تھا۔ شگاف کے دہانے پر سے شور کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''پکڑ لو......پکڑ لو۔'' یہ شگاف چٹانی دیوار میں ایک قدرتی چمنی سا تھا جو اوپر ہی اوپر چڑھتا چلا گیا تھا۔ بھورے چہرے والے زبردست حیوان نما آدمی شگاف کے دہانے میں نمودار ہوا اور چند قدم آگے بڑھ کر رک گیا اور عجیب طرح سے ہاتھ پاؤں ہلانے لگا۔ وہ بے چارا اس تنگ شگاف میں پھنس گیا تھا۔

''آگے بڑھو۔'' اس کے پیچھے کھڑے ہوئے، حیوان نما لوگ چلا رہے تھے۔ میں ٹھوکریں کھاتا اور لڑھکنے سے بال بال بچتا آخر کار اوپر پہنچ گیا۔ یہ جگہ حیوان نما آدمیوں کے گاؤں کے مغربی سمت میں تھی۔

میں نے اس گندھک کے میدان کو جسکے متعلق پہلے کسی جگہ لکھ رہا ہوں۔ دیوانوں کی طرح بھاگ کر عبور کیا اور اب میں ڈھلوان اتر رہا تھا۔ اس ڈھلوان پر درخت یوں ایک دوسرے سے ملے کھڑے تھے۔ کہ ہر گھڑی ان سے ٹکرا جانے کا خدشہ لگا رہتا تھا۔ اس جنگل کو عبور کرنے کے بعد میں نرسلوں کے جھنڈ میں بھاگا جا رہا تھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ پورا گاؤں کا گاؤں میرا تعاقب کر رہا تھا نرسلوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی مارکوس، وکرم بھاٹیہ اور حیوان نما آدمی شاید بہت قریب آ گئے تھے۔ دفعتہً دائیں طرف سے شکاری کتے کے بھونکنے کی آواز آئی اور اس طرف سے مارکوس اور وکرم بھاٹیہ کی آوازیں سنائی دیں وہ دونوں مجھے پکار رہے تھے۔ میں بائیں طرف مڑ گیا اور اسی وقت میں نے وکرم بھاٹیہ کی آواز سنی۔

''اپنی جان بچانے کے لیے بھاگو......'' خدا جانے یہ میرا وہم تھا یا واقعی میں نے اس کی آواز سنی تھی۔ میں اندھا دھند بھاگا جا رہا تھا۔ کہ میرا پیر پھسلا اور میں گرتے گرتے بچا۔ سخت اور خشک خطہ ختم ہو چکا تھا اور اب میں چکنے چکنے کیچڑ پر بھاگ رہا تھا۔ پہلے کیچڑ ٹخنوں تک آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں بید کے جنگل میں تھا۔ جس کے عین وسط میں ایک چھوٹی پگڈنڈی گذرتی تھی۔ میرا تعاقب کرنے والوں کی آوازیں قریب آ گئیں پھر دائیں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ایک جگہ بلی کے قد و قامت کے تین عجیب طرح کے جانور جھاڑیوں میں سے نکلے اور میری ٹانگوں سے ٹکراتے ہوئے سامنے کی جھاڑیوں میں گھس گئے۔ پگڈنڈی جس پر میں بھاگا جا رہا تھا۔ بید کے جنگل میں سے نکل کر سیدھی سیدھی اوپر چڑھتی گئی تھی اور پھر بید کے دوسرے جنگل میں گھس گئی تھی۔

پھر وہی پگڈنڈی ایک گہرے پہاڑی نالے کے متوازی کسی طرح چلی گئی تھی دفعتہً وہ مڑی اور میں ایسا اندھا دھند بھاگ رہا تھا کہ میں نے یہ موڑ نہ دیکھا اور جب دیکھا تو اپنے آپ کو روک نہ سکا

اور میرا قدم خلاء میں پڑا نیچے کچھ نہ تھا۔ میں سنبھل نہ سکا اور قلا بازیاں کھاتا۔ پہاڑی نالے کے پیندے میں اُگی ہوئی خاردار جھاڑیوں میں گرا۔ بڑی کوششوں کے بعد اٹھا تو میرے ایک کان کی لو چر گئی تھی۔ پورا چہرہ زخمی تھا اور ہر زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ جگہ جہاں میں گرا تھا۔ گاڑھی گاڑھی دھند سے پر تھی اور ایک چشمہ خاردار جھاڑیوں کی جڑوں میں سے نکل کر تیزی سے نشیب کی طرف بہا جا رہا تھا۔ یہ دھند اس چشمے کے پانی سے اُٹھ رہی تھی۔

لیکن اس وقت میں اتنا گھبرایا ہوا تھا۔ کہ میں نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ میں دائیں طرف گھوم گیا اور چشمے کے کنارے کنارے چل پڑا میرے گھٹنوں میں سخت چوٹیں آئی تھیں اور دونوں ہتھیلیاں زخمی تھیں۔ اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید ہمت ہار بیٹھتا۔ لیکن میں آخر وقت تک اپنی زندگی کے لیے جدوجہد کرنا چاہتا تھا۔

چنانچہ یہ سوچ کر کہ چشمے کے کنارے چلتا ہوا ساحل پر پہنچ جاؤں گا۔ میں لنگڑاتا ہوا چل پڑا اور جب میں بہت آگے نکل گیا۔ تو ایک بھیانک حقیقت کا انکشاف ہوا۔ وہ کیل دار ہتھیار جو میرے بچاؤ کا کمزور لیکن واحد ذریعہ تھا۔ پہاڑی نالے میں گرتے وقت میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور اب میں بالکل نہتا تھا۔

یکا یک نالہ تنگ ہو گیا۔ اتنا تنگ کہ چشمے کے کنارے چلنا بہت مشکل تھا۔ چناں چہ میں چشمے میں اتر گیا۔ لیکن فوراً ہی ایک چیخ کے ساتھ اچھل کر چشمے سے باہر آ گیا۔ اس کا پانی قریب اُبل رہا تھا۔ میں چٹانی دیوار پر اُگی ہوئی جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ چشمے کے کنارے پر قدم قدم بڑی احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔ پھر ایک طرف مڑ گیا اور اب اس کے دہانے میں افق کو دیکھا اور سمندر کا شور سن سکتا تھا۔

میرا پورا بدن تپ رہا تھا۔ ہر زخم اور ہر خراش میں سے کسی نے جیسے مرچیں بھر دی تھیں میری سانسیں سینے میں نہ سما رہی تھی۔ البتہ میرا تعاقب کرنے والوں کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ یا تو بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ یا پھر تھک کر لوٹ گئے تھے۔ امید کی ننھی سی کرن میرے مایوس دل کی تاریکی میں رینگ آئی اور میں نے سوچا کہ ابھی میں اپنے آپ کو غرق نہ کروں گا۔ ابھی مجھے زندہ رہنا ہے۔

میں نے گھوم کر پہاڑی نالے میں غور سے دیکھا کان لگا کر سنا...... نہیں کوئی آواز نہیں، مکھیوں کی بھنبھناہٹ کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"خدایا میں بچ گیا تھا۔"

"کوئی بچ نہیں سکتا۔" مجھے قانون گو کے الفاظ یاد آ گئے۔

اور فوراً کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ پھر شور وغل کی آوازیں آنے لگیں اور پھر چابک کا ایک سڑا کا سنائی دیا...... آوازیں دم بدم قریب ہوتی گئیں۔ پھر کہیں اُوپر سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ وہ مدھم ہونے لگیں...... پھر وہ ہی خاموشی...... وہ لوگ واپس چلے گئے تھے۔ تعاقب ختم ہو چکا تھا۔

اور اب مجھے معلوم ہوا کہ حیوان نما آدمیوں سے کسی بھی طرح کی امید وابستہ کرنا حماقت تھی۔ وہ مارکوس کے غلام تھے۔ اس کے بندے تھے۔ وہ اس کی مرضی کے خلاف میری کوئی مدد نہ کر سکتے تھے۔ چناں چہ بھوتوں اور شیطانوں کے اس پر اسرار جزیرے میں اکیلا اور تنہا تھا۔ یہاں کا ایک ایک باشندہ میری جان کا

دشمن تھا۔ کس قدر قابل رحم حالت تھی میری۔

جیسے جیسے میں آگے بڑھتا گیا۔ گرم پانی کا چشمہ پھیلتا گیا۔ آخر کار وہ گیلی ریت میں تبدیل ہو گیا۔ جس پر جگہ جگہ گھاس اُگی تھی۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر۔ کیڑے اور دوسرے گھناؤنے آبی کیڑے گھاس میں سے نکلتے اور بھاگتے ہوئے دوسرے کنارے پر اُگی ہوئی گھاس میں جا گھستے میں کئی گز تک اس چشمے کے کنارے کنارے چلتا رہا۔

اب میں محفوظ ہوں۔ میں نے سوچا اور جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کی طرف چلا اور پھر مجھے خیال آیا کہ اس جزیرے سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ وہ لوگ یقیناً اب بھی مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے میں نہتا تھا اور میں جزیرہ چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ چناں چہ وہ لوگ ضرور مجھے پکڑ لیں گے۔ میں زندگی سے مایوس ہو گیا۔

اور اس مایوسی کے عالم میں مجھے خیال آیا وہ لوگ اب بھی مجھے پورے جزیرے میں تلاش کر رہے ہوں گے اور حصار خالی ہو گا۔ چنانچہ کیوں نہ میں وہاں پہنچ جاؤں۔ دیوار کسی نہ کسی جگہ سے ضرور کمزور ہو گی۔ جہاں سے میں ایک وہ پتھر اکھاڑ کر حصار میں گھس سکتا ہوں اور وہاں حصار میں مجھے ضرور کوئی ہتھیار مل جائے گا اور پھر میں اپنی حفاظت کر سکوں گا۔

اور اس خیال کے آتے ہی میں اندازاً حصار کی طرف چلا مجھے یقین تھا کہ سمندر کے کنارے چلتا ہوا۔ میں حصار تک پہنچ جاؤں گا اور یقیناً اسے خالی پاؤں گا۔ سورج مغرب کی طرف ڈھل گیا۔ لیکن دھوپ میں خاصی تیزی تھی۔ سمندر میں مدوجزر کی ابتدا ہو چکی تھی اور گندا پانی ساحل پر خاصی دور تک چڑھ آیا تھا کچھ ہی دور آگے بڑھنے کے بعد ساحل جنوب کی طرف مڑ گیا تھا اور اب سورج میری دائیں جانب تھا۔

میں بڑے اطمینان سے آگے بڑھ رہا تھا۔ کہ دفعتہً ساحل کی جھاڑیوں میں جیسے جان سی پڑ گئی وہ جیسے اپنے آپ کو جھنجھوڑنے لگیں اور پھر ان میں سے ایک اور پھر دوسرا حیوان نما آدمی نکل نکل کر ساحل پر آ کھڑے ہوئے پھر مارکوس کا سفید چہرہ نظر آیا۔ اس کے پیچھے وکرم بھاٹیہ تھا۔ انہیں دیکھتے ہی میں رک گیا۔

وہ ایک دوسرے کو ہدایتیں دیتے میری طرف بڑھے وہ حیوان نما آدمی چکر کاٹ کر میری پشت کی طرف نمودار ہوا اور میرے اور جھاڑیوں کی بیچ میں حائل ہو گیا۔ وکرم بھاٹیہ سیدھا میری طرف آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے کتے کو چمکارتا ہوا مارکوس تھا اور ان دونوں کے ہاتھوں میں لمبے لمبے چرمی چابک تھے۔

ایک لمحے تک میں بت بنا کھڑا رہا۔ پھر مجھے جیسے ہوش آ گیا۔ میں گھوم کر بھاگا اور سمندر میں اتر گیا کنارے پر پانی بہت کم تھا۔ چناں چہ میں اس وقت تک آگے بڑھتا رہا۔ جب تک پانی میری کمر تک نہ آ گیا۔ یہ جگہ ساحل سے کوئی تیس گز دور تھی اور وہاں پہنچ کر میں اپنا تعاقب کرنے والوں کی طرف گھوم کر کھڑا ہو گیا وکرم بھاٹیہ کنارے پر کھڑا حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور بال بے ترتیب تھے۔ مارکوس بڑے مغرورانہ قدم اُٹھاتا ہوا وکرم بھاٹیہ کے قریب آ کھڑا ہوا۔ کتا جس کی زنجیر مارکوس کے ہاتھ میں تھی۔ میری طرف دیکھ کر برابر بھونک رہا تھا۔ اور حیوان نما لوگ جھاڑیوں کے قریب کھڑے حیرت اور دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟ دانش ابراہیم۔" وکرم بھاٹیہ بولا۔

"کیا کر رہا ہوں۔؟ تم پوچھتے ہو کہ میں کیا کر رہا ہوں؟ تو سنو میں اپنے آپ کو غرق کر دینا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ وکرم بھاٹیہ اور مارکوس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"کیوں؟" مارکوس نے پوچھا۔

"اس لیے کہ تمہارے ہاتھوں اذیت پانے سے موت بدرجہا بہتر ہے۔"

"دیکھا...... کیا کہا تھا میں نے؟" وکرم بھاٹیہ نے مارکوس کی طرف گھومتے ہوئے کہا۔ مؤخر الذکر نے نیچی آواز میں کچھ جواب دیا۔ جسے میں سن نہ سکا۔

"لیکن تمہیں یہ خیال آیا ہی کیوں...... کہ میں تمہیں اذیت دوں گا۔ میں کوئی......" مارکوس نے کہنا شروع کیا۔

"مارکوس! مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہ کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "خدا کی قسم عذاب کے فرشتے بھی تم سے پناہ مانگتے ہوں گے۔"

"مارکوس! کانوں سے سنا غلط ہو سکتا ہے۔ آنکھوں دیکھا نہیں۔ تمہارے آپریشن تھیٹر میں میں نے جو نظارے دیکھے ہیں۔ اس نے مجھے شیطنیت کا یقین دلایا ہے اور اس کا ثبوت وہ کھڑے ہوئے بدصورت آدمی ہیں۔"

"دشش! چپ رہو یار!" وکرم بھاٹیہ نے جلدی سے کہا۔

"کیوں چپ رہوں۔" میں نے کڑک کر کہا۔ "میں کہوں گا۔ ضرور کہوں گا۔ یہ بدصورت اور گھناؤنی ہستیاں پہلے کیا تھیں؟ میری اور تمہاری طرح انسان تھے یا نہیں اور اب دیکھو تم لوگوں نے انہیں کیا بنا دیا۔ میں ان کے جیسا نہیں بننا چاہتا کہ مارکوس مجھے بھی ان لوگوں جیسا بنا دے۔" اور میں نے وکرم بھاٹیہ کے پیچھے کھڑے ہوئے۔ اس کے سیاہ چہرے والے ملازم اور جھاڑیوں کے قریب کھڑے ہوئے حیوان نما آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"کبھی یہ لوگ بھی میری اور تمہاری طرح انسان تھے۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ تاکہ حیوان نما آدمی بھی سن سکیں۔ "لیکن اب وہ نہ انسانوں کی صف میں ہیں اور نہ حیوانوں کی۔ تم نے کسی شیطانی عمل سے اس کی جسمانی ساخت، شکل وصورت، اور دماغوں کو تبدیل کر کے انہیں غلام بنا لیا ہے اور تم ان کے معبود بن بیٹھے ہو سنو بدہیت لوگو سنو!" میں نے حیوان نما آدمیوں کو مخاطب کیا۔ "میری بات غور سے سنو تمہارے آقا تم سے ڈرتے ہیں۔ پھر کیوں ان سے دب کر رہتے ہو۔ یہ صرف دو ہی ہیں اور تمہاری تعداد۔"

"ابراہیم! خدا کے لیے چپ رہو۔" وکرم بھاٹیہ چلایا۔

اور وہ دونوں شور مچانے لگے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بدہیت بندے میری باتیں سنیں اور دور کھڑے ہوئے حیوان نما آدمی اپنے لمبے لمبے ہاتھ لٹکائے اور شاید سر جھکائے میری باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں چیخ چیخ کر پرجوش تقریر کر رہا تھا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ میں نے کیا کہا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ میں نے ان حیوان نما آدمیوں کے دماغوں کو جھنجھوڑ کر یہ بات ان کے ذہن

نشین کرانی چاہی تھی کہ وکرم بھاٹیہ اور مارکوس کو فوراً مارنا چاہیے۔ ان سے ڈرنا اور ان کو اپنا معبود سمجھنا حماقت ہے۔ دوسرے لفظوں میں، میں انہیں بغاوت پر اکسا رہا تھا۔ انہیں اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا۔ کہ وہ میری سرکردگی میں مارکوس اور وکرم بھاٹیہ کا خاتمہ کر سکیں اور میں نے دیکھا کہ ایک حیوان نما آدمی میری تقریر ٹھیک سے سننے کے لیے چند قدم آگے بڑھ آیا۔ دوسروں نے اس کی تقلید کی۔ میں غالباً ان کی ذہنی قوتیں بیدار کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میرا دل اس معمولی سی خوشی سے ناچ اٹھا۔ میری سانس پھول گئی تھی۔ چناں چہ میں اپنا دم درست کرنے کے لیے خاموش ہو گیا۔

"دانش ابراہیم پہلے میری بات سُن لو۔" مارکوس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا "اور پھر تمہارا جو جی چاہے کرو۔"

"بہت اچھا۔ کہو۔"

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور پھر سوچ کر انگریزی زبان میں کہا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو ابراہیم...... یہ لوگ کبھی انسان نہ تھے...... یہ حیوان تھے۔ میں نے ایک خاص عمل جراحی سے انہیں انسانی شکل وصورت دے دی۔ یقین مانو دانش! یہ سب جانور تھے تم باہر آ جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے تجربات کی پوری روداد سناؤں گا۔"

میں نے ایک قہقہہ لگایا۔

"مارکوس!" میں نے کہا۔ "میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ جتنا کہ تم مجھے سمجھتے ہو تمہاری یہ کہانی بے بنیاد ہے تم انہیں حیوان کہتے ہو حالاں کہ یہ لوگ بول سکتے ہیں۔ جھونپڑیاں بنا سکتے ہیں اور کمال ہے کہ کھانا بھی پکا سکتے ہیں۔"

"تم نے انہیں حیوان سے انسان نہیں بنایا ہے۔ مارکوس! مجھے یقین ہے کہ یہ کبھی انسان تھے۔ جن کی شکل وصورت تم نے کسی عمل جراحی سے بگاڑ دی ہے نہیں مارکوس میں تمہاری باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔"

جہاں تم کھڑے ہو۔ اس سے چند قدم ہی آگے پانی گہرا ہے اور پھر شارک مچھلیاں بھی بہت ہیں۔"

"وہی تو میری راہ ہے۔ اس طرح میرے مصائب کا خاتمہ ایک ہی وقت میں ہو جائے گا۔"

"ٹھہرو" مارکوس نے چیخ کر کہا اور اپنی جیب سے کوئی سیاہ چمک دار چیز نکال کر ساحل کی ریت پر پھینک دی۔

"یہ بھرا ہوا پستول ہے۔ وکرم بھاٹیہ بھی اپنا پستول یہیں پھینکے دیتا ہے۔ اب ہم کنارے پر سے ہٹ کر دور چلے جاتے ہیں۔ تم باہر آ کر دونوں پستول اٹھا لو پھر تم اپنے آپ کو محفوظ سمجھ سکو گے نا؟"

"یہ بھی تمہاری کوئی چال ہو گی۔" میں نے کہا۔

"دانش! بے وقوف نہ بنو اور صورت حال پر غور کرو۔ اوّل تو تم بن بلائے مہمان ہو ہم تمہیں اپنی مرضی سے یہاں نہیں لائے اگر وکرم بھاٹیہ تمہاری سفارش نہ کرتا۔ اگر ہم تم پر کوئی تجربہ کرنا چاہتے تو گزشتہ رات ہی تمہیں بے ہوشی کی دوا اس طرح پلا دیتے کہ تمہارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ ہم نے دو دفعہ تمہاری جان بچائی ہے اور یہ بھی سن لو کہ تمہیں جزیرے میں بھٹکنے نہ دیا۔ تمہاری تلاش میں نکلے

اور تلاش کر لیا اور یہ ایسا ہم نے محض تمہاری بہتری کے لیے کیا ہے یہ جزیرہ کم از کم تمہارے لیے پر اسرار ہے اس کی ہر جھاڑی اور ہر درخت کے پیچھے تمہاری موت چھپی ہوئی ہے۔ ہم تمہاری بھلائی چاہتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو اسی وقت گولی مار دیتے۔ لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اس کے بجائے ہم نے اپنے پستول یہاں پھینک دیے ہیں۔''

''اگر تمہارا یہ کہنا سچ ہے تو تم نے اپنے حیوان نما آدمیوں کو میرے پیچھے کیوں لگا دیا تھا۔''

اس لیے کہ ہمیں یقین تھا کہ ہم تمہیں پکڑ لیں گے اور تمہیں خطرے سے محفوظ رکھنے کی یہی ایک صورت تھی اور یہی وجہ ہے کہ جب تم خطرے کی حدود سے نکل گئے۔ تو ہم اس راستے سے ہٹ گئے جس سے تم گئے تھے۔ تاکہ یہ حیوان زمین سونگھ سونگھ کر تمہارا تعاقب نہ کر سکیں۔''

''مارکوس کے دلائل قابل قبول تھے۔ لیکن فوراً مجھے کچھ یاد آ گیا۔

''لیکن'' میں نے کہا۔ ''تمہاری تجربہ گاہ میں ایک میز پر پٹیاں بند کیا ہے۔ وہ......''

''وہ تیندوا تھا۔''

''دانش!'' وکرم بھاٹیہ نے کہا۔ ''تم نہایت اعلیٰ درجے کے گدھے ہو۔ ساحل پر آ کے یہ پستول اٹھا لو اور پھر جو کچھ پوچھنا ہے پوچھو تمہاری یہ حماقت ہے کہ تم وہاں کمر کمر پانی میں کھڑے چلا رہے ہو۔ ہم سب کی تمہاری میری اور مارکوس کی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔''

میں چند ثانیوں تک سوچتا رہا۔

''بہت اچھا'' میں نے کہا وکرم بھاٹیہ نے کہا۔ ''ہمارا وقار اور رعب خاک میں مل جائے گا۔''

''تو پھر ان درختوں کے پاس چلے جاؤ۔''

''بے اعتباری کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔'' وکرم بھاٹیہ نے کہا۔ بہر حال وہ دونوں ان حیوان نما آدمیوں کی طرف گھوم گئے۔ جو میری تقریر سننے کے لیے آگے بڑھ آئے تھے۔ وکرم بھاٹیہ نے اپنا چابک تڑخ سے ہوا میں بجایا اور حیوان نما آدمی کوک بھرے کھلونوں کی طرح ایک دم سے گھوم کر انتہائی خوف کے عالم میں لرزاں و ویراں جھاڑیوں کی اور درختوں کی طرف بھاگے۔ جب وہ جھاڑیوں اور درختوں کے پیچھے جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے تو مارکوس اور وکرم بھاٹیہ کنارِ آب سے کافی دور ہٹ گئے اور میری طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو گئے۔ میں ساحل پر آ گیا میں نے دونوں پستول اٹھائے اور ان کا معائنہ کرنے لگا کہ بھرے ہوئے ہیں یا مجھے دھوکا دیا گیا ہے۔ وہ بھرے ہوئے تھے۔ مزید اطمینان کے لیے میں نے ایک پستول کی نالی ساحل پر پڑے ہوئے ایک پتھر کی طرف کر کے لبلبی دبا دی۔ زبردست دھماکے سے جنگل گونج اٹھا اور پستول کی گولی مضبوط پتھر سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اسکے بعد بھی میں چند ثانیوں تک کشش و پنج کے عالم میں کھڑا رہا۔

''بہت اچھا میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔'' میں نے کہا اور دونوں ہاتھوں میں پستول پکڑ کر ان کی طرف بڑھا۔

''ہاں اب آئے راہ پر۔'' مارکوس نے کہا۔ ''لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تمہاری حماقت نے پورا دن ضائع کر دیا۔''

اور اب وہ میرے آگے چلے حیوان نما آدمیوں کا گروہ جھاڑیوں کے پیچھے حیران کھڑا تھا۔ میں ان کے قریب سے بہ ظاہر پر سکون اور اطمینان سے گزر گیا۔ وہ لوگ اپنی جگہ پر کھڑے حیرت اور دلچسپی سے مجھے دیکھتے رہے۔ لیکن ایک حیوان نما آدمی میرے پیچھے چلا۔ حیوان نما آدمی یقیناً میری باتوں پر غور کر رہے تھے۔ ممکن ہے۔ وہ پہلے جانور رہے ہوں لیکن میں نے پہلے کبھی جانوروں کو کسی بات پر یوں انسانوں کی طرح غور کرتے نہ دیکھا تھا اور آپ نے بھی دیکھا ہے کبھی؟ یقیناً نہیں...... چناں چہ پھر میں ڈرنے لگا۔

''کیسے یقین کر لوں کہ یہ پہلے انسان نہ تھے؟'' میں دل میں بولا اور میرا جی چاہا کہ مارکوس اور وکرم بھاٹیہ پر گولی چلا دوں اور اگر ان حیوان نما آدمیوں میں ہوں جو خدا جانے میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ اکیلے رہ جانے کا خوف نہ ہوتا تو میں مارکوس اور وکرم بھاٹیہ کو وہیں ڈھیر کر دیتا۔ بہر حال وہ دونوں میری طرح ہی مکمل انسان تھے اور ان حیوان نما انسانوں سے زیادہ میرے رفیق ہو سکتے تھے۔ اور یہ بھی ایک خیال میری ڈھارس بندھائے ہوئے تھا۔ ورنہ میں ضرور کوئی احمقانہ حرکت کر بیٹھتا۔

اور جب ہم کھانا کھا چکے تو مارکوس نے کہا۔ ''حسب وعدہ تمہیں سب کچھ سمجھائے دیتا ہوں۔ یقین مانو! آج تک میرا سابقہ تم جیسے ضدی آدمی سے نہیں پڑا اور نہ کبھی کسی گیدڑ بھبکیوں سے متاثر ہوا ہوں اور یہ بھی سن لو کہ اگر دوبارہ تم نے خودکشی کر لینے کی دھمکی دی تو میں تمہیں نہیں بچاؤں گا۔ چاہے تمہاری موت سے مجھے کوئی نقصان ہی کیوں نہ پہنچ جائے۔ شروع سے ہی اپنا ذاتی فائدہ پیش نظر رکھنے کا عادی رہا ہوں۔ لیکن تمہارے معاملے میں اپنا اصول بدل دوں گا۔

وہ میرے کمرے میں کھڑکی کے سامنے رکھی ہوئی اونچی پشت والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور جلتا ہوا سگار اس کی موٹی موٹی انگلیوں میں پھنسا ہوا تھا اور ہوا کے جھونکے سے جھولتی ہوئی لالٹین کی روشنی اس کے سفید بالوں اور چہرے کے کرخت خدوخال کو نمایاں کر رہی تھی۔ میں مارکوس کے سامنے اس سے جتنی دور بیٹھ سکتا تھا۔ بیٹھا تھا ہم دونوں کے بیچ میں چھوٹی سی میز پر پڑی تھی اور میں اب تک اپنے ہاتھ میں ایک بھرا ہوا پستول لیے تھا۔ وکرم بھاٹیہ کمرے میں نہ تھا اور میرے خیال میں یہ اچھا ہی تھا۔ کیوں کہ ان دونوں کی موجودگی میں اپنے آپ کو ذرا کم محفوظ سمجھتا تھا۔

''تو اب تو تمہیں یقین آیا کہ جس پر عمل جراحی کر رہا ہوں اور جسے تم آدمی سمجھ رہے ہو وہ دراصل تیندوا ہی ہے؟'' مارکوس نے پوچھا۔

یہاں میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ حصار میں آتے ہی مارکوس مجھے اپنی تجربہ گاہ یا آپریشن تھیٹر میں لے گیا تھا اور مجھے وہ جان دار دکھایا تھا۔ جو پٹیوں میں لپٹا پڑا تھا اور جسے میں آدمی سمجھ رہا تھا اور وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔

''بے شک وہ تیندوا ہی ہے۔'' میں نے سر ہلا کر کہا۔ ''اور زندہ بھی ہے۔ لیکن اس کا جسم اس طرح سے چیر پھاڑا گیا ہے اور اس کے اعضاء کی اس طرح قطع و برید کی ہے کہ کبھی کوئی انسان اپنے جانی دشمن کے ساتھ بھی ایسا سلوک نہیں کرتا۔ یہ بڑا ظلم ہے۔

''بس بھئی تم اپنے ان رحیمانہ جذبات کو اپنے تک ہی رکھو'' مارکوس نے کہا۔ ''کم سے کم میرے

سامنے ان کا اظہار بے فائدہ ہے۔ مجھے احساس ہے کہ وہ انتظار تمہارے لیے بھیانک ہوگا۔ شروع شروع میں وکرم بھائیہ کی بھی ایسی ہی حالت ہوگئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ ایسے بھیانک نظاروں کا عادی ہوگیا۔ اچھا اب خاموش بیٹھو اور غور سے سنو۔ میں علم تشریح پر ایک بسیط لیکچر دیتا ہوں۔ سنو اور اعمال و اعضاء سمجھنے کی کوشش کرو۔ جو باتیں میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ وہ کوئی اور نہ بتا سکے گا۔"

اور وہ آنکھیں نیم وا کر کے اپنے تجربات کی روداد سنانے لگا۔ انداز ابتدا میں اکتائے ہوئے آدمی کا سا تھا۔ جیسے وہ بادل ناخواستہ پرانی داستان سنا رہا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد ہی وہ ذرا گرما گیا اور اب وہ ایک جوش و فخر کے ساتھ بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ اسکی تمام تشریحات اور دلائل سیدھے سادھے اور قابلِ قبول تھے کہ کبھی اسکا لب ولہجہ طنزیہ ہوجاتا اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آجاتی۔ میں نے مارکوس کو غلط سمجھا تھا۔ چناں چہ تھوڑی دیر بعد ہی میرا سر شرم سے جھک گیا۔

"ابراہیم! ایک ماہر سرجن کسی بھی جان دار کو جس طرح چاہے تبدیل کر سکتا ہے۔" مارکوس نے کہا۔ "میں حیران ہوں کہ مجھ سے پہلے کسی سرجن نے ایسے تجربات نہ کیے۔ حالاں کہ معمولی سا کام ہے یہ...... یعنی پٹھوں اعضا اور زبان کی ایک ڈھنگ سے قطع و برید تعجب ہے کہ مجھ سے پہلے کوئی اس کام کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ خیر یہ تو غالباً تم جانتے ہی ہو کہ آپریشن کے ذریعہ آنکھوں کا بھینگا پن دور کیا جا سکتا ہے اور اسی طرح سرجری کے ذریعہ کسی کے بدن میں تبدیلی کرنا بہت ہی معمولی بات ہے۔ یعنی پست قامتی کو بلند قامتی میں تبدیلی کرنا۔ موٹاپے کو لاغری میں تبدیل کرنا اور یہ دونوں چیزیں خاص غددوں کے افعال بدل دینے سے ممکن ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ مدھم ہوتی ہوئی آنکھوں کو دوبارہ روشن کرنا اور مڑی ہوئی ٹانگوں کو سیدھی کرنا وغیرہ یہ سب آپریشن عام ہیں اور مجھے یقین ہے تم ایسے آپریشن کے متعلق سن چکے ہوگے۔ حتیٰ کہ سرجری کا یہ کمال ہے کہ اندھے کو آنکھیں اور بگڑے ہوئے پھیپھڑے والے کو نئے پھیپھڑے مل جاتے ہیں۔"

"یہ سب درست ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہارے وہ حیوان نما آدمی......؟"

"ذرا صبر سے کام لو۔ اپنے وقت پر ہر بات صاف ہوجائے گی۔ بقول تمہارے میرے یہ حیوان نما آدمی جسمانی تغیر تبدیلی کا ادنیٰ نمونہ ہیں سرجری کے ذریعہ اس سے بھی بہتر نتائج پیدا کیے جا سکتے ہیں اور کیے جائیں گے۔ اس خاص قسم کی سرجری کی تکمیل میرے ہاتھوں ہوگی۔ میرے بھائی یہ حیوان آدمی ہیں۔ جو تم نے اس جزیرے میں دیکھے ہیں میری ابتدائی مشق کا نتیجہ ہے سرجری کے ذریعہ صرف صورت بگاڑی ہی نہیں سنواری جا سکتی ہے۔ سرجری گویا دو دھاری تلوار ہے۔ لیکن اس کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ غالباً تم نے کسی آپریشن کے متعلق سنا ہوگا۔ کہ کسی جانور یا انسان کی ناک ٹوٹ گئی یعنی بالکل ہی بیکار ہوگئی اب اس کی دوسری ناک تو اگ نہیں سکتی اور اسے چہرے پر ہی رہنے دیا جا سکتا ہے۔ چناں چہ سرجن یہ کرتا ہے کہ ناک کاٹ ڈالتا ہے۔ اور زخمی کی پیشانی کی تھوڑی سی جلد کاٹ کر ناک کی جگہ سی دیتا ہے۔ زخم مندمل ہونے پر اسی کی جس کی ناک ٹوٹ کر بے کار ہوگئی تھی۔ شکل وصورت بالکل ہی تبدیل ہوجاتی ہے۔ یہ چھوٹے پیمانے پر جسمانی ترمیم ہوئی یعنی جسم کے ایک حصہ کو کاٹ کر اسی جسم میں دوسری جگہ لگا دیا جائے۔ اسی طرح دو الگ الگ جان داروں کے تازہ کٹے ہوئے اعضاء کو جوڑنا ممکن ہے۔ یعنی کسی ایک جان دار کے خواہ وہ کسی نسل سے

ہو۔ اعضاء کو یا کسی حصہ کو دوسرے جان دار کے جسم سے جوڑا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی ممکن ہے کہ گینڈے کا سینگ بیل کے ماتھے پر اور چوہے کی دم بلی کے سر پر لگا دی جائے۔ سؤر کے اعضاء ریچھ کو اور بندر کے اعضاء بھیڑ کو لگائے جا سکتے ہیں اور اس طرح ایک ہوشیار سرجن بالکل نئی قسم کے اور ہیبت ناک جانور بنا سکتا ہے۔"

"ہیبت ناک جانور بنا سکتا ہے!" میں نے کہا۔ "تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ۔"

"بالکل یہ مخلوق جو تم نے اس جزیرے میں دیکھی درحقیقت تبدیل کیے ہوئے جانور ہیں جس طرح ایک بت تراش پتھر کو کاٹ چھانٹ کر اسے نت نئی شکلیں دے سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک سرجن جان داروں کے اعضاء کی قطع برید کر کے کایا پلٹ سکتا ہے اور میری زندگی کا حصہ یہی عمل سیکھنے میں صرف ہوا ہے سالہا سال تک میں علم سیکھتا اور تجربات کرتا رہا ہوں۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ میں نے اپنی عمر اسی کے لیے وقف کردی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم حیران ہو رہے ہو۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ سب باتیں صدیوں سے علم تشریح کی کتابوں میں موجود ہیں۔ لیکن کسی نے ان کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش نہیں کی۔ میں پہلا آدمی ہوں۔ جو اس خاص عمل کی طرف متوجہ ہوا۔ میں جانوروں کی صرف ظاہری شکل وصورت ہی نہیں بلکہ ان کے اعضاء کے اعمال وافعال بھی بدل دیتا ہوں میں نے تجربات کی ابتدا نقل وخون سے کی تھی اور یہ تجربات عام ہیں۔ بہرحال اب تم سمجھ گئے ہوگے۔ کہ جانوروں کے جسم کے ایک حصہ کو دوسرے جسم کے حصہ سے جوڑنا ممکن ہے۔ اس طرح دو الگ الگ جانوروں کے جسم کے بھی حصہ کو جوڑنا ممکن ہے۔ لیکن اس کے باوجود آج تک کسی نے اس میدان میں تجربات نہیں کیے حالاں کہ ہر سرجن جانتا ہے کہ کسی بھی جانور کی جسمانی ساخت بدلی جا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ میں اس عمل کی طرف متوجہ ہوا۔ ابتداء میں جیسا کہ تم سمجھ گئے ہوگے' میں چوری چھپے یہ تجربات کرتا رہا اور آخر مجھے اپنی محنتوں کا پھل مل گیا۔"

"لیکن؟" میں نے کہا۔ "یہ جانور بولتے بھی تو ہیں۔"

اور وہ مجھے سمجھانے لگا کہ سرجری سے جانوروں کی نہ صرف جسمانی ساخت بلکہ ہر چیز بدل جاتی ہے۔ یعنی اس کی کایا پلٹ کردی جاتی ہے۔ ایک سؤر کو اس عمل کے بعد سکھایا پڑھایا جا سکتا ہے۔ اس کی ذہنی قوتوں کی نشوونما کی جا سکتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کی جنسی زندگی بھی تبدیل کی جا سکتی ہے اور اس طرح ایک نئی مخلوق پیدا ہوتی ہے جو انسانوں سے قریب تر اور جانوروں سے دور ہوجاتی ہے بہ ظاہر میں نے مارکوس کی اس بات سے اتفاق کیا۔ لیکن میں اس کی اس تشریح سے مطمئن نہ تھا۔ میں اس کا یہ آخری فارمولا سمجھ نہ سکا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ جانوروں کو انسانی شکل کیوں دیتا ہے جب کہ وہ کہیں کوئی دوسری شکل بھی دے سکتا تھا۔ میرے خیال میں اس کا یہ عمل کہ انسان کے ڈھانچے کو اپنے تجربات کا "ماڈل" بنانا صرف انسانوں کی توہین پر مبنی تھا اور ایک طرح انسانیت سوز بھی تھا۔

اس نے اعتراف کیا کہ انسانی ساخت کا انتخاب اس سے اتفاقاً ہوگیا۔

میں بھیڑوں کو لاما اور لاما کو بھیڑوں میں تبدیل کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے اس لیے ایسا نہیں کیا۔ میرے خیال میں انسانی ڈھانچے میں ایک خاص فنکارانہ بات ہے' جو کسی فنکار کو متاثر کر سکتی ہے چناں چہ مجھے بھی متاثر کیا اور میں نے اپنے نمونوں کے لیے غیر شعوری طور سے انسانوں کا ہی ڈھانچہ پسند کیا

لیکن میں نے صرف آدمی ہی نہیں بنائے ایک دفعہ......اور وہ ایک دو منٹ تک خاموش رہا......"سال...... افوہ...... کتنے جلد گزر گئے...... اور تمہیں بچانے کی کوشش میں، میں نے اپنا پورا دن ضائع کر دیا اور تمہیں سمجھانے میں ایک گھنٹہ اور ضائع کر رہا ہوں۔"

"لیکن ایک بات میں نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔

"اپنے تجربات کی وجہ سے تم۔ان بے زبان جانوروں کو جو سخت عذاب دیتے ہو۔وہ کہاں تک درست ہے؟" میرے خیال میں تو یہ معاف کرنا تمہاری خود غرضی اور ظلم ہے۔آخر تم نے اس کے لیے اپنے آپ کو کس بنا پر حق بجانب سمجھ لیا ہے۔میں تمہارے تجربات کی مخالفت نہیں کر رہا ہوں۔لیکن یہ سخت عذاب جو تم......"

"بات یہ ہے کہ تمہارے اور میرے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔تم شاید مادہ پرست ہو۔جو میں نہیں ہوں۔"

"میں قطعی مادہ پرست نہیں ہوں۔" میں نے ذرا گرم ہو کر کہا۔

"میرے نزدیک تو بہرحال یہی تکالیف اور اذیت کا خیال تمہارے اور میرے خیال میں چند فاصلے قائم کرتا ہے۔جب تک تم کسی کی درد بھری چیخیں بے چینی اور ہمدردی کی لہر محسوس کیے بغیر سن نہ سکو گے جب تک تم سخت دلی سے کسی کو تڑپتے نہ دیکھ سکو گے اور جب تک خود اپنی تکلیف کا احساس تمہیں بے چین کرتا رہے گا۔تب تک مجھے کہنا پڑتا ہے کہ تم میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔تمہیں معلوم نہیں کہ جانور درد اور تکلیف کو کیوں اور کس طرح محسوس کرتے ہیں۔"

"اگر ہم بھی جانوروں کی طرح تکلیف محسوس کرنے لگیں تو پھر ہم میں اور ان میں کیا فرق رہ جائے گا اور تکلیف شاید ہماری اور تمہاری دنیا میں یونہی سی ہے۔ممکن ہے کسی میں درد تکلیف کا کوئی وجود نہ ہو۔اس دنیا میں بھی یہ چیز کہاں، اسے کون محسوس کرتا ہے۔تم کہو گے ہر وہ شے جو زندہ ہے غالباً تم میری بات سمجھتے نہیں۔بہت اچھا دیکھو......" اور اس نے اپنی جیب سے ایک تیز چاقو نکالا اور کرسی پر اس طرح بیٹھ گیا۔کہ میں مارکوس کی ایک ران لالٹین کی روشنی میں بہ خوبی دیکھ سکتا تھا۔اس نے اپنی ران میں ایک جگہ کا انتخاب کر کے چاقو کا پھل دستے تک اتار دیا۔اور پھر آہستہ آہستہ واپس کھینچ لیا۔

"دیکھا دانش! تمہیں یقین نہ آئے گا۔لیکن مجھے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی۔"

بہرحال اس سے کیا ثابت ہوا مارکوس؟"

"یہی کہ پٹھے درد محسوس نہیں کرتے البتہ جلد میں درد محسوس کرنے کی قابلیت ہے مگر معمولی سی۔ پوری ران میں صرف چند مقامات ایسے ہیں جو درد محسوس کر سکتے ہیں۔ایسی جگہ جو درد محسوس کرتی ہے۔وہاں چھوٹی سی پن بھی چبھو دی جائے تو تم تکلیف سے بلبلا اٹھو گے۔درد ایک طرح سے شیر ہے جو ہمیں خبر دار کرتا ہے اپنے آپ کو بچانے کی ہم میں تحریک پیدا کرتا ہے اگر درد نہ ہو تو ہم اپنے آپ سے بے پروا ہو جاتے۔چناں چہ ہم درد محسوس کرتے ہیں۔لیکن ہر پٹھا...... میرا مطلب حتیٰ کہ جنسیاتی عمل بھی تکلیف دہ نہیں ہوتا۔تم کو یہ سن کر شاید تعجب ہوگا کہ بصریاتی اعصابات میں بھی درد تکلیف محسوس کرنے کی قابلیت نہیں ہے یہ ہی وجہ ہے کہ اندھے آدمی اپنی آنکھوں میں کسی طرح کی تکلیف محسوس نہیں کرتے۔حالاں کہ ان کے بصری اعصابات ختم ہو چکے ہوتے ہیں۔اس طرح سے سمعی عصبات مجروح ہو جائیں تو تم بہرے ہو جاؤ گے اور یہ بہرہ پن تمہیں کوئی تکلیف نہیں دے گا۔اس طرح بعض چھوٹے قسم کے جانور مثلاً مچھلیاں کبھی کوئی تکلیف محسوس نہیں کرتیں۔

اب رہا انسان تو وہ جتنا زیادہ تعلیم یافتہ اور ہوشیار ہوگا اتنا ہی اپنے آپ کو درد اور تکلیف سے بچا سکے گا۔وہ اپنے بدن کے ان حصوں کو جو درد محسوس نہیں کرتے درد کا سوال رہ ہی کہاں جاتا ہے۔

دانش میں بھی قدامت پسند ہوں خدا کی قدرتوں کا معائنہ میں نے تم سے زیادہ کیا ہے اس کی بناوٹوں کو میں نے اپنے طور سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور سمجھا ہے میری عمر خدا کی قدرتوں کو سمجھنے میں گزری ہے میرے مقابلے میں تم یوں سمجھو کہ تتلیاں پکڑتے رہے ہو۔چناں چہ درد کا تکلیف کے قانون کو سمجھ لینے کے بعد میں جنت اور دوزخ کے تصور کو تسلیم نہیں کرتا۔کیوں کہ آدمی اگر درد اور تکلیف کے قوانین کو سمجھ جائے تو ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے اور پھر جنت کی راحتوں اور دوزخ کے عذابوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔یہ میرا خیال ہے۔چناں چہ اس لیے شروع میں لوگ مجھے ڈاکٹر شیطان کہا کرتے تھے۔تم چاہو تو مجھے کافر کہہ لو۔حالاں کہ میں زمانے کے وجود کا قائل ہوں لیکن عاقبت کے عذابوں اور راحتوں کا قائل نہیں ہوں۔بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔بہرحال اس طرح میں نے اپنے طور پر تحقیق کی جو میرے خیال میں مجھے صحیح راستے پر اور دوسروں کے خیال میں غلط راستے پر لے آئی۔فطرت کو میں نے جس طرح سمجھنے کی کوشش کی کسی نے نہیں کی۔رفتہ رفتہ میں اپنے تحقیق اور تجربات کا میدان وسیع کرتا گیا۔پہلے میں اپنے آپ سے ایک سوال پوچھتا خود ہی اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا اور اس کوشش میں ایک سوال پیدا ہو جاتا۔کیا وہ ممکن ہے؟ کیا یوں ہو سکتا ہے؟ کیا یوں نہیں ہو سکتا؟

بہ ظاہر یہ سوالات معمولی ہیں۔لیکن تم نہیں جانتے کہ تحقیق کے لیے یہ کتنی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کے جواب تلاش کرنے کی کوشش میں۔میں کہاں سے کہاں جا پہنچتا اور نتیجہ وہ چیز جس پر تم تجربہ کر رہے ہوتے ہو۔چیز نہیں بلکہ ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔

میں معلوم کرنا چاہتا ہوں صرف یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کسی بھی جان دار میں ملائمیت کی حد کہاں تک ہے۔یعنی کسی بھی زندہ چیز میں دوسرے روپ میں ڈھلنے کی صلاحیت کہاں تک ہے۔یعنی کسی بھی زندہ جسم میں کتنی لچک ہے اور اس لچک کے سہارے اسے کہاں تک تبدیل کیا جا سکتا ہے اور یہ ہی شوق تحقیق جس نے میرے رحیمانہ اور ہمدردانہ جذبات کو مردہ کر دیا ہے۔

"لیکن یہ بڑی مذموم حرکت ہے۔" میں نے کہنا شروع کیا۔

"اب تک میں نے اس معاملے کے اخلاقی پہلو پر غور نہیں کیا ہے اور کرنا بھی نہیں چاہتا۔فطرت کا مطالعہ کرنے والا فطرت کی طرح ہی بے درد ہوتا ہے۔میں فطرت کا مطالعہ کرتا رہا۔محض اپنے سوالات کے جواب حاصل کرنے کے لیے اور دیکھو میرے سوالوں کے جواب زندہ اور مجسم جواب ان جھونپڑیوں میں موجود ہیں۔جہاں تھوڑی دیر پہلے تم چھپے بیٹھے تھے...... مجھے اور وکرم بھاٹیہ کو یہاں آئے گیارہ سال ہو چکے ہیں۔جب ہم یہاں آئے تو ہمارے ساتھ چھ ملازم تھے اور اس وقت یہ جزیرہ غیر آباد اور ویران تھا۔مجھے

جزیرے کی وہ خاموشی اچھی طرح یاد ہے۔ ہر جگہ خاموشی تھی۔ جنگل میں اور گھاٹیوں میں موت کی سی خاموشی کا راج تھا۔ یہاں کوئی نہ رہتا تھا۔ کوئی جانور تک نہ رہتا تھا۔ یہ جزیرہ گویا میرا ہی منتظر تھا۔ یہ سب واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں گویا ابھی کل کی بات ہو۔''

''ہمارا سامان اتارا گیا اور اس حصار کی بنیاد رکھی گئی۔ ہمارے ملازموں نے کھنائے کے قریب اپنے لیے جھونپڑیاں بنالیں اور میں نے اپنا کام شروع کیا۔ ہم بہت سے جانور اپنے ساتھ لائے تھے۔ میں نے پہلا تجربہ ایک بھیڑ پر کیا۔ ایک دن اور ایک رات تک اس کے اعضاء کی قطع و برید کرتا رہا۔ لیکن دوسرے دن میرا وہ ہاتھ جس میں جراحی کا چاقو تھا۔ ذرا سا بہک گیا اور بھیڑ مر گئی۔

میں نے دوسری بھیڑ پر تجربہ شروع کیا اور اس کے بدن پر پٹیاں باندھ کر اسکے زخم مندمل ہو جانے کا انتظار کرنے لگا۔ شروع میں، میں اپنے تجربے سے مطمئن تھا۔ کیوں کہ وہ تبدیل شدہ بھیڑ مجھے مکمل انسان معلوم ہوتی تھی لیکن دوسرے دن جب میں اسے دیکھنے گیا تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ بھیڑ مجھے بھولی نہ تھی اسے یاد تھا کہ میں اسے دو دن تک اذیت پہنچاتا رہا تھا۔ چناں چہ مجھے دیکھتے ہی وہ چیخنے چلانے لگی۔ وہ مجھ سے ڈرنے لگی۔ حالاں کہ اس کی جسمانی ساخت انسان کی سی تھی۔

لیکن اس میں بھیڑ کی صفات بہ دستور موجود تھیں۔ میں جتنے غور سے اس چیز کو دیکھتا جو نہ انسان تھی اور نہ جانور۔ اتنی زیادہ مجھے بے ڈھنگی اور نفرت انگیز معلوم ہوتی آخر کار میں برداشت نہیں کر سکا اور میں نے اسے مار ڈالا۔ یہ بزدل اور بودے جانور میرے تجربے کے لیے مناسب نہ تھے۔ تبدیلی کے بعد بھی ان میں بھیڑوں کی صفات بہ دستور باقی رہتی تھی۔ چنانچہ ان جانوروں کو انسان بنانا فضول تھا۔''

چنانچہ اب میں نے ایک گوریلے کا انتخاب کیا اور بڑی احتیاط اور کاوش سے اس پر کام کرتا رہا۔ شب و روز کی ان تھک محنتوں اور کئی مشکلات سے گزرنے کے بعد میں نے اپنا پہلا آدمی بنایا۔ گوریلے کے دماغ کو نئی طرح سے ڈھالنے کی ضرورت تھی اور میں اس طرف متوجہ رہا۔ کیوں کہ اس کی جسمانی ساخت تو انسان سے ملتی جلتی تھی ہی۔ لیکن اس کی ذہنی قوتوں کو بڑھانا اور بدلنا تھا۔ جب میں اپنا کام کر چکا تو میرا خیال تھا کہ میرا بنایا ہوا یہ پہلا آدمی حبشیوں کی کسی نئی نسل کا آدمی معلوم ہوگا۔ وہ میرے سامنے بے حس و حرکت پڑا تھا۔

سر سے پیر تک پٹیوں میں لپٹا ہوا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ زندہ ہے تو میں وہاں سے ہٹ کر وکرم بھاٹیہ کے پاس آیا۔ وہ اس وقت تمہاری طرح ہی خوفزدہ اور گھبرایا ہوا تھا۔ جب میں گوریلے کو انسان میں تبدیلی کر رہا تھا۔ وکرم بھاٹیہ نے اس کی کراہیں سنی تھیں۔ جیسی کہ تم نے انسان بنتے ہوئے تیندوے کی سنی تھیں۔ اتنی جلد میں وکرم بھاٹیہ کو اپنا راز دار نہیں بنا سکتا تھا۔ لیکن ہمارے ملازم مجھ سے کچھ کٹ سے گئے تھے اور مجھ سے ڈرنے لگے تھے۔ چناں چہ مجبوراً مجھے وکرم بھاٹیہ کو اپنے تجربات میں شریک کرنا پڑا ہمارے ملازم اتنے خوفزدہ ہوئے کہ میرے اور وکرم کے سمجھانے کے باوجود وہ یہاں رہنے کو تیار نہ ہوئے اور ایک دن موقع ملتے ہی فرار ہو گئے۔ لیکن بعد کا واقعہ ہے۔

خیر میں نے اپنے بنائے ہوئے پہلے آدمی کو چار پانچ مہینے تک تعلیم و تربیت دی۔ میں نے اسے

اردو زبان سکھائی، گنتی سکھائی تھی۔ کہ وہ الف بے پڑھنے لگا۔ لیکن اس معاملہ میں بڑا کند ذہن تھا۔ ج، ح، خ میں تمیز نہ کر سکتا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ جب اس نے نیا روپ پایا یوں کہہ لو نیا جنم لیا تو اسکا دماغ بالکل صاف تھا اور اسے اپنے پچھلے جنم کے واقعات یاد نہ تھے یعنی وہ کیا تھا۔ وہ کیا کرتا تھا۔ قصہ مختصر کہ جب اس کے زخم بالکل مندمل ہو گئے اور وہ ذرا ذرا بولنے لگا تو میں اسے لے کر اپنے ملازموں کے پاس گیا۔ اور ایک نیا آدمی کہہ کر اس کا تعارف کرایا۔

شروع شروع میں تو وہ اس سے ڈرتے رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس سے مانوس ہو گئے۔ چناں چہ اپنے نئے آدمی کو اپنے ملازموں کے پاس چھوڑ آیا کہ وہ اسے تہذیب وغیرہ سکھائیں اور یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ میرے نئے آدمی نے بہت جلد سب باتیں سیکھ لیں اور اپنے لیے ایک جھونپڑی بھی بنائی جو ہمارے ملازموں کی بنائی ہوئی جھونپڑیوں سے بدرجہا بہتر اور آرام دہ تھی۔

ایک دن میں چہل قدمی کرتا ہوا جنگل کی طرف جا نکلا اور وہاں ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ میرا بنایا ہوا ایک آدمی ایک درخت کے تنے پر بیٹھا دانت نکال نکال کر ہمارے ایک ملازم کو ڈرا رہا تھا۔ میں نے اسے ڈرا دھمکا کر اسے نیچے اتارا اور اسے سمجھایا کہ یوں درختوں پر اچھلنا اور دانت نکالنا بڑی غیر انسانی اور شرمناک بات ہے۔ میں نے اسے سمجھا بجھا کر جھونپڑیوں کی طرف بھیج دیا۔ لیکن اس واقعہ کے بعد انکشاف ہوا کہ میرا تجربہ نامکمل تھا۔ گوریلے میں بندر جیسی صفات بہ دستور موجود تھیں۔

چنانچہ میں نے اپنے تجربات کی روداد شائع کرنے کا خیال اس وقت تک اٹھا رکھا جب تک کہ کوئی چیز نہ بنا لیتا۔ ایک ایسی چیز جس میں کوئی خامی نہ ہو اور یہی میری منزل مقصود ہے۔ میں اس منزل مقصود تک پہنچ کر ہی دم لوں گا۔

''خیر یہ تو ہے میری پوری داستان ہمارے ملازم کبھی کے مر چکے تھے۔ ایک کشتی میں سے لڑھک کر سمندر میں جا پڑا۔ دوسرے نے اپنے زخمی ہونے پر کسی زہریلی بوٹی کا عرق پیا اور مر گیا۔ تین ہماری کشتی لے کر فرار ہو گئے اور میرا خیال ہے وہ بھی مر گئے ہوں گے اور چھٹا جو بچ رہا تھا مارا گیا۔ بہرحال ان کی کمی میں نے اپنے بنائے ہوئے حیوان لوگوں سے پوری کر لی ہے۔''

''لیکن اس چھٹے ملازم کا کیا ہوا۔ وہی جو مارا گیا؟'' میں نے کہا۔

''بات یوں ہے کہ...... بہت سے حیوان لوگ بنا چکنے کے بعد میں نے ایک چیز بنائی۔'' مارکوس ہچکچانے لگا۔

''پھر؟''

''وہ جان دار بھی مارا گیا۔''

''میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''ہاں اسی جان دار نے چھٹے ملازم کو مار ڈالا۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ اس نے کئی حیوان لوگوں کا بھی خاتمہ کر دیا۔ ہم کوئی چار دن تک اس خونی کا تعاقب کرتے رہے۔ جو حصار میں سے اتفاقاً بھاگ نکلا تھا۔ میں کیا بنانا چاہتا تھا اور وہ کیا بن گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں نہ تھے وہ زمین پر لڑھکتا ہوا چلتا تھا۔ اس کی گردن

سانپ کی طرح لمبی تھی۔ جو بدن سے آگے آگے بل کھاتی رینگا کرتی تھی اور اس کا چہرہ بہت ہی ڈراؤنا تھا۔ چند روز تک وہ جنگل میں چھپا رہا۔ جو بھی اس جنگل کے قریب سے گزرتا۔ وہ اچانک اس پر حملہ کر دیتا اور اسے مار کر پھر جنگل میں گھس جاتا۔ آخر کار ہم نے اس کا خاتمہ کر ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بھاگ کر جزیرے کے شمالی حصے میں چلا گیا۔ جہاں وہ چھپا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر ہم نے تعاقب کرنے والی جماعت کے دو حصے کیے۔ کہ اسے کسی طرح نرغے میں لے لیا جائے کہ وہ بھاگ نہ سکے۔ ہمارا چھٹا ملازم دوسری جماعت کے ساتھ تھا اور اس کے پاس دو نالی بندوق بھی تھی۔

بہر حال جب ہمیں اپنے ملازم کی لاش ملی تو یہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ بندوق کی دونوں نالیاں نہ صرف موڑ دی گئی تھیں بلکہ انہیں دانتوں سے کتر لیا گیا تھا۔ غالباً اب تم نے اس خونی کی طاقت کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔ خیر وہ خونی وکرم بھاٹیہ کی بندوق کا نشانہ بنا اور اس کے بعد میں نے جانوروں کو انسانی شکل میں ڈھالنے کا فیصلہ کیا اور قسم کھائی کہ کبھی کوئی نئی طرح کا جانور بنانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں نے یہ قول تمہارے آدمی کے ڈھانچے کو ماڈل کیوں بنایا ہے۔

وہ خاموش ہو گیا میں بھی خاموش تھا۔

"تو۔" کچھ دیر بعد اس نے کہا' کوئی بیس سال سے' اور ان بیس سالوں میں نو سال وطن کے بھی شامل ہیں۔ میں یہ تجربات کر رہا ہوں۔ بہ ظاہر کامیاب تجربات کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ان میں کوئی خامی باقی رہ گئی ہے اور یہی خامی ہے جو مجھے اکساتی رہتی ہے۔ میں مکمل' ہر طرح مکمل انسان بنانا چاہتا ہوں۔ جانوروں کو انسانی ڈھانچے میں ڈھال لینا۔ اب میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لیکن بعض بعض جانوروں کے پنجوں کو ہاتھوں میں تبدیل کرنے میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور سب سے بڑا مشکل کام ہے۔ ذہنی قوتوں کا بدلنا۔ اب جانوروں کی قوتیں' آدمی بن جانے کے بعد بھی کچھ زیادہ نہیں ابھرتیں۔ حالاں کہ میں آپریشن کے دوران ان کے دماغوں پر ہی زیادہ توجہ دیتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا دماغ جانوروں جیسے نہیں رہتے۔ لیکن انسانوں کے سے بھی نہیں رہتے۔

خیر یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن میرے تجربات میں ایک ایسی خامی رہ گئی ہے جسے میں آج تک نہ تو دور کر سکا اور نہ ہی سمجھ سکا۔ میں اس وقت تک تجربات کرتا رہوں گا۔ جب تک کہ یہ خامی دور نہیں کر لیتا۔ یعنی میں ان کی نفرت نہیں بدل سکتا۔

ابتدا میں ان کی حیوانی فطرت دبی رہتی ہے اور پھر یکا یک ابھر آتی ہے۔ میں اب تک یہ معلوم نہیں کر سکا کہ ان کی جبلتوں کا مخزن جسم میں کس جگہ جمع ہوتا ہے اور کس طرح ان کی جبلتیں بدلی جا سکتی ہیں۔ میرے بنائے ہوئے آدمی تمہیں بے ڈھنگے اور گھناؤنے معلوم ہوتے ہوں گے اور مجھے بھی ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ میں نے ایک مکمل انسان بنا لیا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے۔ میرا یہ یقین ڈانواں ڈول ہونے لگتا ہے اور مجھے اپنے بنائے ہوئے آدمیوں میں ان کی حیوانی فطرتیں نظر آنے لگتی ہیں۔

اور یہ تو ایک مشہور کہاوت ہے کہ لومڑی اپنا رنگ تو بدل سکتی ہے۔ لیکن اپنی جبلتیں نہیں بدل

سکتی۔ لیکن میں اس کہاوت کو غلط ثابت کر کے رہوں گا۔ ہر دفعہ میں جب بھی کسی نئے جانور پر تجربہ کرتا ہوں تو بڑے یقین کے ساتھ اپنے آپ سے یہ کہتا ہوں کہ اس دفعہ میں ایک عظیم چیز' ایک مکمل انسان بنا لوں گا۔ لیکن پھر میں دیکھتا ہوں کہ آہستہ آہستہ اس کی حیوانی فطرتیں نمایاں ہونے لگتی ہیں میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ ایک انسان بنانے کے لیے لاکھوں کروڑوں سال چاہییں۔ لیکن تم نے دس سال میں جو کچھ بنا لیا ہے۔ وہ کوئی سو سال میں بھی نہیں بنا سکتا اور اس طرح اپنی ہمت بندھا کر میں دوسرے جانوروں پر تجربہ کرنے میں لگ جاتا ہوں۔"

چند ثانیوں تک خاموشی کا وقفہ لیا۔

"لیکن اب میرا کام قریب الختم ہے۔ میری محنت کا پھل ملنے والا ہے۔ یہ تیندوا جس پر اب......"

"وہ پھر اپنے اصلی روپ میں آ جاتے ہیں۔" اس نے گویا اپنے آپ سے کہا۔ "اس حصار سے باہر جانے کے بعد ان کی وحشیانہ عود کر آتی ہیں۔ وہ درندہ جو عمل جراحی کے وقت سو گیا تھا۔ پھر بیدار ہونے لگتا ہے۔ پھر وہ جانور بننے لگتے ہیں۔"

خاموشی کا طویل وقفہ رہا۔

تو پھر تم ان حیوانوں کو کہانے میں چھوڑ آتے ہو۔ جہاں وہ چرتے پھرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں خود ہی چلے جاتے ہیں۔ جب مجھے ان میں وحشیانہ صفات نظر آتی ہیں تو انہیں حصار سے نکال دیتا ہوں اور وہ ان بھٹوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ سب مجھ سے اور دار العقوبت سے ڈرتے ہیں۔ وہ حیوان لوگ جو بھٹوں میں رہتے ہیں۔ خود انسانوں کی اور ان کے افعال انسانی کی بھونڈی نقل ہیں۔ نہ تو وہ انسان ہیں اور نہ ہی جانور' انہیں انسان اور جانور کی درمیانی کڑی سمجھو۔ ان کی حرکتیں عجیب مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ ایسی حرکتیں جنہیں نہ تو کوئی انسان کرتا ہے اور نہ جانور۔ ان کی حرکات کچھ جانوروں کی اور کچھ انسانوں کی سی ہوتی ہیں۔ وکرم بھاٹیہ کو ان حیوان لوگوں سے خاصی دلچسپی ہے۔

چنانچہ وہ ان کے اعمال و افعال کے متعلق بہت زیادہ معلومات رکھتا ہے۔ اس نے دو ایک کو ہماری خدمت کے لیے سدھایا بھی ہے۔ وکرم بھاٹیہ ان حیوان لوگوں میں سے کئی ایک کو خاص طور سے پسند کرنے لگا۔ ہم نے انہیں چند قوانین سکھا دیے ہیں جنہیں وہ طوطے کی طرح رٹا کرتے ہیں اور ایک حد تک ان پر عمل کرتے ہیں۔ ان میں اتنی سمجھ بوجھ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے لیے جھونپڑے بنا لیے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنی روح کی گہرائیوں میں جھانکتے ہیں تو انہیں اپنا پچھلا روپ نظر آتا ہے اور پھر وہ جانور بننے لگتے ہیں۔ تمہارے لیے یہ حیوان لوگ کتنے ہی دل چسپ کیوں نہ ہوں۔ میرے لیے ایک مجسم مضحکہ ہیں۔ ان کی ایک ایک حرکت گویا مجھے بدکتی معلوم ہوتی ہے کہ تم نے انہیں کچھ بھی نہ رہنے دیا۔ میری کل امیدیں اس تیندوے سے وابستہ ہیں۔ میں نے اس کی جبلتیں بدلنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اس کی کھوپڑی اور دماغ پر میں نے زیادہ وقت صرف کیا ہے۔ چنانچہ ہو سکتا ہے۔ کہ جب تیندوے کی پٹیاں کھلیں تو وہ مکمل انسان ہو۔"

"ہاں تو دانش!" چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد مارکوس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کیا اب بھی تم مجھ سے بدظن ہو؟"

اور جواب میں میں نے دونوں پستول اس کی طرف بڑھا دیے۔

"نہیں اپنے پاس ہی رکھو۔" اس نے مسکرا کر کہا اور پھر ایک طویل جمائی لے کر بولا۔

"تمہارے یہ دو دن عجیب گزرے ہیں۔ یعنی عجیب طرح کے واقعات سے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان مسلسل واقعات اور خود تمہارے متضاد جذبات کے ہیجان نے تمہیں تھکا مارا ہوگا۔ چنانچہ بہتر ہے کہ اب تم سو جاؤ۔ چند گھنٹوں کی پرسکون نیند تمہیں پرسکون کر دے گی۔ شکر ہے سب باتیں صاف ہو گئیں۔" مارکوس چند ثانیوں تک کھڑا مجھے دیکھتا رہا اور پھر عقبی دروازہ کھول کر حصار میں چلا گیا۔ اب اس دروازے کو مقفل رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

میں نے اٹھ کر باہر کھلتا ہوا دروازہ بند کیا اور پھر بیٹھ کر ڈاکٹر مارکوس کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ خدا جانے کیا بات تھی کہ مارکوس نے جو کچھ کہا تھا۔ اس سے آگے میں سوچ ہی نہ سکتا تھا۔ میری ساری ذہنی قوتیں جیسے ایک دائرے میں مقید ہو کر رہ گئی تھیں۔ کمرے کی کھڑکی میں اندھیرا جھانک رہا تھا اور باہر سکوت طاری تھا اور جیسے کسی آسیبی اثر نے مجھے پتھر کا کر دیا تھا۔ اپنی جگہ سے ہل تک نہ سکتا تھا۔ آخر کار بڑی کوششوں کے بعد میں اٹھا بتی بجھائی اور جالی دار جھولے میں لیٹ گیا۔ کمرے کی تاریک فضا میں بھیانک ہیولے رقص کرتے رہے۔ اندھیرا گہراتا رہا۔ باہر ہوا سسکیاں بھرتی رہی اور...... خدا جانے میں کب سو گیا۔

دوسرے دن سویرے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ مارکوس نے حیوان لوگوں کی جبلتوں کے متعلق جو باتیں کہی تھیں۔ انہیں میں بھولا نہ تھا۔ میں نے فوراً ہی جالی دار جھولے میں سے نکل کر دیکھا اور یہ اطمینان کر کے کہ وہ مضبوط ہے اور آسانی سے ٹوٹ نہیں سکتا۔ میں نے کھڑکی کی سلاخوں کا معائنہ کیا وہ بھی خاصی مضبوط تھیں۔ میری یہ حرکت بہت ممکن ہے آپ کو مضحکہ خیز، بزدلانہ معلوم ہو۔ لیکن مارکوس کے یہ کہنے کے بعد کہ حیوان لوگوں کی فطرت نہیں بدلتی، میرے دل میں ان کی طرف سے ایک طرح کا خوف جاگزیں ہو گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ بھی دروازے کے کواڑوں اور کھڑکی کی سلاخوں کی مضبوطی کی طرف سے مطمئن ہوئے بغیر اس کمرے میں سکون سے نہ رہ سکتا۔

دفعتاً وکرم بھاٹیہ کے سیاہ چہرے والے ملازم کی آواز سنائی دی۔ میرا ہاتھ بے اختیار پستول پر جا پڑا۔ میں نے پستول جیب میں رکھ کر ایک ہاتھ سے جیب میں ہی پکڑے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔

"سلام صاحب۔" اس نے وحشیانہ انداز میں کہا اور اپنے دونوں بے ڈھنگے ہاتھوں پر ناشتے کی کشتی سنبھالے کمرے میں آ گیا۔ آج ناشتے میں ایک نئی چیز شامل تھی۔ بھنا ہوا خرگوش جو بڑی اناڑی پن سے پکایا گیا تھا۔ وکرم بھاٹیہ اپنے حیوان ملازم کے پیچھے ہی تھا۔ اس نے میرے اس ہاتھ کی طرف دیکھا۔ جس سے میں جیب میں پستول پکڑے ہوئے تھا۔ وہ سمجھ کر مسکرانے لگا۔

تیندوا جس پر مارکوس نے تجربہ کیا تھا۔ اب آرام کر رہا تھا۔ مارکوس اس پر عمل جراحی پورا کر چکا تھا اور تیندوے کے پورے جسم پر پٹیاں کس دی گئی تھیں کہ زخم مندمل ہو جائیں اور اعضا کو جس طرح موڑا گیا ہے۔ اسی حالت میں رہیں۔ دوسرے لفظوں میں مارکوس آج فرصت سے تھا۔ لیکن چوں کہ وہ تنہائی پسند واقع

ہوا تھا۔ اس لیے ہمارے ساتھ ناشتے میں شریک نہ ہوا۔

پہلا لقمہ منہ میں رکھتے ہی میں نے حیوان لوگوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کس بات نے ان وحشیوں کو مارکوس اور وکرم بھاٹیہ کو حملہ کرنے سے اب تک روکے رکھا ہے اور یہ کہ اگر واقعی ان میں وحشیانہ صفات بہ دستور موجود ہیں تو وہ آپس میں ہی کیوں ایک دوسرے کو نوچ کھسوٹ نہیں ڈالتے۔

وکرم بھاٹیہ نے بتایا کہ اس کی اور مارکوس کی سلامتی کا انحصار ان لوگوں کی محدود ذہنی قوتوں پر تھا۔ ہر چند کہ ان کی سمجھ بڑھ گئی تھی اور ہر چند کہ ان کی وحشیانہ صفات بہ دستور قائم تھیں۔ لیکن مارکوس نے چند مخصوص خیالات ان کے دماغوں میں اس طرح ٹھونس دیے تھے کہ وہ کسی طرح اپنے دماغوں سے ان خیالات کو دور نہیں کر سکتے تھے۔ گویا ان کو ہپناٹائز کر لیا گیا تھا۔ ان کے ذہنوں کو جکڑ لیا گیا تھا۔ چند باتوں کے متعلق انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ بری ہیں اور ایسا کرنے والا۔ شدید عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس طرح ممنوعات کی ایک طویل فہرست ان کے ذہن نشین کر دی گئی تھی۔ ان ممنوعات یا بری باتوں کی ان کی ذہنی قوتوں کے تار پود کے ساتھ اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ وہ ان پر غور کر لے اور ان احسانات کی خلاف ورزی کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا تھا۔ تاہم بعض باتوں میں حیوان لوگوں کی جبلتیں اور مارکوس کا پیدا کردہ یقین آپس میں ٹکرا جاتے تھے اور بعض دفعہ ان کی حیوانی جبلتیں مارکوس کے پیدا کردہ یقین پر غالب آ جاتی تھیں اور وہ چوری چھپے "گناہ" کر گزرتے تھے اور اس کا علاج نہ وکرم بھاٹیہ کے پاس تھا اور نہ مارکوس کے پاس۔ وہ ان باتوں کو جنہیں حیوان لوگ قوانین کہتے تھے۔ مسلسل رٹتے رہتے تھے۔ لیکن جب ان کی حیوانیت ابھر آتی تو وہ ان قوانین کو توڑنے سے دریغ نہیں کرتے۔

چنانچہ وکرم بھاٹیہ اور مارکوس حیوان لوگوں پر کڑی نظر رکھتے اور کوشش کرتے کہ ان کے منہ کو خون نہ لگ جائے اور اسی لیے وہ دونوں بھی زیادہ تر سبزیاں ہی ابال کر کھاتے تھے۔ آپ جانیے اگر کوئی درندہ ایک دفعہ بھی خون کا مزہ چکھ لے تو وہ خونخوار بن ہی جاتا ہے اور پھر نتیجہ معلوم!

وکرم بھاٹیہ نے بتایا کہ شام ہوتے ہی گویا یہ صفت حیوان لوگوں میں ان کی پرانی فطرت زور پکڑنے لگتی ہے۔ ان میں سویا ہوا درندہ پن بیدار ہو جاتا ہے اور مارکوس کے سکھائے ہوئے قوانین ان کے لاشعور میں دفن ہو جاتے ہیں اور وہ رات میں ایسے ایسے کام کر گزرتے ہیں جن کا دن میں تصور بھی نہیں کر سکتے اور مجھے اس جزیرے میں اپنی پہلی رات یاد آ گئی۔ جس چیتے جیسے آدمی نے میرا پیچھا کیا تھا اور میں اس کی کھوپڑی پر پتھر مار کر اپنے آپ کو بچا سکا تھا...... لیکن اس جزیرے میں میرے قیام کے ابتدائی دنوں میں قانون شکنی کے بہت کم نہ ہونے کے برابر واقعات ہوئے تھے۔ رات ہوتے ہی پورے جزیرے میں سکوت طاری ہو جاتا تھا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں جزیرے کا حدود اربع اور حیوان لوگوں کے متعلق چند ضروری باتیں بتا دوں کہ آگے کہانی کے تسلسل میں فرق نہ آئے۔

یہ جزیرہ جس کا کوئی نام نہ تھا اور جس کے آس پاس میلوں تک کوئی دوسرا جزیرہ نہ تھا۔ آتش فشاں تھا۔ اس کا رقبہ تقریباً آٹھ مربع میل ہوگا۔ بعض اوقات زلزلے کے نامعلوم جھٹکے محسوس ہوتے تھے اور کبھی کبھی

چٹانوں کی کسی دراڑ سے دھواں نکلنے لگتا تھا۔لیکن ایسا بہت کم محسوس ہوتا تھا۔صرف گرم پانی کا چشمہ خوابیدہ کوہ آتش فشاں کی اٹل نشانی باقی رہ گیا تھا۔جب مارکوس اور وکرم بھاٹیہ یہاں آئے تو یہ جزیرہ بالکل ہی ویران اور غیر آباد تھا۔

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ مارکوس نے اس جزیرے کا کس طرح پتا لگایا۔لیکن اب اس کی آبادی ان عجیب وغریب ساٹھ یا اس سے کچھ زیادہ' حیوان لوگوں پر مشتمل تھی۔اس تعداد میں وہ حیوان شامل نہیں ہیں۔جو جھاڑیوں کی جڑوں میں رہتے ہیں اور مارکوس کے ابتدائی تجربات کا نتیجہ ہیں اس جزیرے میں آنے کے بعد سے لے کر میرے آنے تک مارکوس نے ایک سو بیس کے قریب حیوان لوگ بنائے تھے۔جن میں سے کئی ایک طبعی موت مرے اور کئی ایک کو اس بے ہاتھ پاؤں کے خونی شیطان کی طرح مار ڈالا گیا جس کا ذکر مارکوس نے کیا تھا۔

ہاں ایک بات اور بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ان حیوان لوگوں میں ''عورتوں'' کی تعداد بہت کم تھی اور حالاں کہ مارکوس نے حیوان لوگوں کو جنسی تعلقات سے پرہیز کی تاکید کر دی تھی۔لیکن سال دو سال میں ان کے بچے پیدا ہو ہی جاتے تھے۔جن میں سے اکثر پوری طرح جانور ہوتے تھے۔چناں چہ مارکوس ان بچوں پر عمل جراحی کر کے انہیں انسانی شکل وصورت دے دیتا تھا۔اس طرح ایک بات سے ظاہر ہوا کہ مارکوس کے تجربات حیوانوں کی تولید وتناسل پر بھی اثر انداز ہوتے تھے۔

ان حیوان لوگوں کی شکل وصورت بیان کرنا کم از کم میرے لیے ناممکن ہے۔تاہم میں الفاظ کے ذریعہ ایک خاکہ کھینچنے کی کوشش کرتا ہوں۔آپ اپنے تصور کی مدد سے اس میں رنگ بھر لیجیے۔سب سے نمایاں چیز ان کے دھڑ اور ٹانگوں کی ناموزونیت تھی۔یعنی چھوٹی مڑی ہوئی ٹانگیں آنکھیں ان کے بے ڈھنگے پن کی ایسی عادی ہو گئیں کہ مجھے خود اپنی ٹانگیں عجیب اور انوکھی معلوم ہونے لگیں اور میں اپنے آپ پر شرمانے لگا۔دوسری نمایاں چیز ان کا اندر کو دھنسا ہوا چہرہ اور پھر ان کی کمر کا غیر انسانی جھکاؤ۔حتیٰ کہ بندر آدمی کی کمر میں بھی وہ سیدھا پن نہیں تھا۔جو انسان کے جسم کو خوب صورت اور باوقار بناتا ہے۔بعض کی گردنیں گویا تھی ہی نہیں۔

چنانچہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے سر کندھوں پر دھرا ہوا ہو۔بعض کے کندھے کچھ عجیب ڈھنگ سے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ان کے ہاتھوں جو کبھی ان کی اگلی ٹانگیں تھیں بے جان سے لٹکتے رہتے تھے۔کئی ایک حیوان لوگوں کے بدن پر بھورے بھورے بال تھے۔

اب رہے ان کے چہرے تو ایسا بد شکل آدمی کبھی کسی کے تصور میں بھی نہ آیا ہوگا۔دھنسا ہولما تھا' آگے کو نکلے ہوئے جبڑے' چپٹی ناک' اور نتھنے بیچ میں سے اوپر اٹھے ہوئے' کھڑے نوک دار کان' سر پر چھوٹے چھوٹے اور اکثروں کے نرم بال اور ترچھی چمک دار آنکھیں۔حیوان لوگ ہنس نہیں سکتے تھے۔البتہ بندر آدمی ہونٹ پھیلا کر مسکرانے کی نقل کر لیتا تھا۔ان مشترکہ باتوں کے علاوہ ان کے سروں کی ساخت میں تھوڑا سا مگر نمایاں فرق تھا۔ہر حیوان آدمی کا سر اس کا اصل کا پتا دیتا تھا۔یعنی آپ ان کے سروں کو دیکھ کر یہ معلوم کر سکتے تھے کہ یہ چیتا تھا۔ریچھ یہ سؤر' اور یہ نسل جس پر عمل جراحی کر کے اسے آدمی کی طرح دو ٹانگوں پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔اس کے علاوہ ان کی آوازیں بھی ایک سی نہ تھیں۔چیتے کی آواز میں غراہٹ تھی اور سور کی

آواز میں کھڑ کھڑاہٹ اسی طرح دوسرے حیوان لوگوں کی آوازوں کو تصور کر لیجیے ان کے ہاتھ ناقص اور بے جان سے ہوتے تھے۔

ان حیوان لوگوں میں سے دو بہت خوف ناک اور خطرناک تھے۔ایک تو وہی چیتا آدمی تھا۔جس نے میرا تعاقب کیا تھا اور دوسرا ایک عجیب مخلوط حیوان آدمی تھا۔جسے لکڑ بھگا سور کے اعضا جوڑ دیے گئے تھے اور پھر وہ بھورے بالوں والا آدمی تھا۔جو کشتی لے کر آیا تھا۔

اور پھر وکرم بھاٹیہ کا ملازم خاص جس کا چہرہ ریچھ کا تھا اور پھر ایک دوسرا ایسا عجیب جان دار جسے بکرے اور گوریلے کے اعضا جوڑ کر بنایا گیا اور جو سالمیر (سانپوں کا دیوتا جس کی شکل انسان۔کان، دم اور ٹانگیں بکرے کی ہوتی تھیں۔جیسا معلوم ہوتا تھا۔ان کے علاوہ تین سو مرد اور تین سو عورتیں' ایک گینڈا گھوڑا مرد (جو گینڈے اور گھوڑے کے اعضا کا مجموعہ تھا) اور چند دوسری حیوان عورتیں تھیں۔جن کی اصلیت معلوم نہ کر سکا۔اس کے علاوہ چند بھیڑیے مرد ایک ریچھ آدمی' ایک کتا' آدمی اور پھر ایک ریچھ لومڑی تھی۔جس کے بدن سے سخت بو اٹھتی تھی۔اس ریچھ لومڑی عورت سے مجھے شروع ہی سے نفرت تھی۔

شروع شروع میں' میں ان حیوان آدمیوں سے ڈرتا رہا۔کیوں کہ میں جانتا تھا کہ ان کی حیوانی جبلتیں بدلی نہیں گئیں۔لیکن رفتہ رفتہ میں ان سے مانوس ہوتا چلا گیا۔وکرم بھاٹیہ ان کے ساتھ بڑا دوستانہ سلوک کرتا تھا۔وہ اتنے عرصے سے ان کے ساتھ تھا۔

یہ بد صورت اور بے ڈھنگے حیوان آدمی اسے عام انسانوں جیسے ہی معلوم ہوتے تھے۔مہذب زندگی اب اس کے لیے خواب وخیال بن چکی تھی۔سال میں ایک دفعہ وہ ڈاکٹر مارکوس کے ایجنٹ کی حیثیت سے یورپ جاتا اور ضرورت کے جانور خرید کر واپس چلا آتا اور میرے خیال میں وہاں بھی وہ کسی مہذب آدمی سے نہ ملتا تھا۔

چنانچہ جب میں اس جزیرے میں آیا تو اسے بہت مسرت حاصل ہوئی۔میں نے نے بھی دیکھا کہ وکرم بھاٹیہ کو بعض حیوان لوگوں سے ایک خاص قسم کا لگاؤ بھی ہو گیا تھا اور ان کی بہت سی باتیں پسند تھیں۔ابتدا میں اس نے اپنے اس رجحان کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کی۔لیکن زیادہ دنوں تک نہ چھپا سکا۔میں نہیں جانتا کہ حیوان آدمیوں سے اس کے اس خاص لگاؤ کی وجہ کیا تھی۔

وکرم بھاٹیہ کا سیاہ چہرے والا ملازم دوسرے حیوان لوگوں کے ساتھ کھائی میں بنے ہوئے بھٹوں میں نہ رہتا تھا۔بلکہ حصار کے پیچھے ایک خشک نالے میں رہتا تھا۔ہر چند کہ یہ سیاہ چہرے والا ملازم بندر آدمی کی طرح ہوشیار نہ تھا۔لیکن وکرم بھاٹیہ نے اسے ایک خاص تربیت دی تھی۔اور وہ دیکھنے میں بھی دوسرے حیوان لوگوں سے زیادہ آدمی معلوم ہوتا تھا۔وکرم بھاٹیہ نے اسے کھانا پکانے کے علاوہ دوسرے گھریلو کام بھی سکھا دیے تھے۔یہ ملازم تین جانوروں کا مجموعہ تھا۔ریچھ' کتا' بیل' لیکن وہ ریچھ زیادہ تھا۔

وہ بڑا مخلص اور جان نثار تھا۔بلکہ میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ وکرم بھاٹیہ کی پوجا کیا کرتا تھا اور جب مئوخر الذکر کبھی اس کی پیٹھ تھپتھپاتا یا پیار سے اسے پکارتا تو وہ مارے خوشی کے ناچنے لگتا۔لیکن جب وکرم بھاٹیہ نشے میں ہوتا تو وہ اپنے وفادار ملازم کو پیٹنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔لیکن وہ اپنے آقا کے قریب سے

نہ ہنتا۔ اسے پٹنے کی کوئی پروا نہ تھی۔ اسے تو اپنے آقا کا قرب چاہیے تھا۔ بس......

میں کہہ چکا ہوں کہ رفتہ رفتہ ان حیوان لوگوں سے مانوس ہو گیا اور ان کی وہ باتیں جو مجھے ابتدا میں غیر انسانی اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھیں بعد میں ایسی نہ معلوم ہوئیں۔ اگر وکرم بھاٹیہ اور مارکوس اس جزیرے میں نہ ہوتے تو شاید میں بھی ان کی طرح نیم انسان اور نیم حیوان بن جاتا۔ میں کبھی کسی حیوان آدمی کو جنگل میں لکڑیاں چیرتے یا کوئی دوسرا کام کرتے دیکھتا تو بہ مشکل اپنے آپ کو یقین دلا سکتا کہ میں اس سے مختلف اور بہتر ہوں یا پھر یوں ہوتا کہ کسی حیوان آدمی کو دیکھ کر میں سوچنے لگتا کہ اسے پہلے بھی کہیں میں نے دیکھا ہے۔

شاید اپنے وطن میں' شاید اپنے محلے میں' شاید اپنے گھر میں' اور اس خیال سے پیچھا چھڑانے اور اپنے آپ کو یقین دلانے کے لیے کہ اس حیوان آدمی کو میں نے صرف اس جزیرے میں ہی دیکھا ہے۔ لاکھ جتن کرنے پڑتے مجھے خوف ہوتا تھا کہ میں حیوان لوگوں جیسا بنتا جا رہا ہوں۔ چنانچہ ہر رات سونے سے پہلے میں اپنی ایک ایک حرکت یاد کرتا اور سوچتا کہ کہیں وہ حیوان لوگوں سے ملتی جلتی تو نہیں۔ لیکن پھر ان کی اندھیرے میں چمکتی ہوئی آنکھیں' ان کے بے ڈھنگا پن ان کے بدن پر بال' چپٹی ناک اور دھنسا ہوا ماتھا' وغیرہ یاد کر کے اپنے آپ کو یقین دلا کر ہی میں سو سکتا تھا۔ لیکن خواب میں وہ بھٹ میں رہتے اور چشمے سے منہ لگا کر پانی پیتے تھے اور جب میں چونک کر اٹھتا تو میرا پورا بدن ٹھنڈے پسینے میں شرابور ہو جاتا یوں معلوم ہوتا جیسے کچھ ہونے والا تھا۔ خدا جانے کیا ہونے والا تھا۔

میں چوں کہ مصنف اور ادیب ہوں۔ اس لیے کہانی کا تسلسل قائم نہ رکھ سکا اور اس اصل قصہ سے ہٹ کر شاید بہت سے غیر ضروری اور بہت آگے کی باتیں کہہ گیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں۔ کہ وہ باتیں جو پچھلے باب میں بیان کی گئی ہیں۔ ضروری تھیں۔ اول تو اس لیے کہ اس طرح آپ مارکوس کے بنائے ہوئے حیوان لوگوں کی خصلتوں اور خود میرے جذبات سے واقف ہو گئے ہوں گے اور دوم اس لیے کہ آگے کہیں کہانی کا سلسلہ نہ ٹوٹے گا۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر میں وکرم بھاٹیہ کے ساتھ گرم چشمے کا منبع اور وہ جگہ دیکھنے گیا جہاں سے بخارات خارج ہوتے تھے۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں لمبے لمبے چابک تھے اور جیبوں میں بھرے ہوئے پستول' جنگل میں سے گزرتے وقت ہم نے خرگوش کی آواز سنی وہ بڑی خوف زدہ آواز میں "چیں چیں" کر رہا تھا۔ ہم رک کر سننے لگے لیکن پھر کوئی آواز سنائی نہ دی۔ اس لیے آگے بڑھ گئے۔ چند عجیب طرح کے چھوٹے چھوٹے جانور جن کا رنگ پیلا اور پچھلی ٹانگیں لمبی تھیں۔ ایک جھاڑی میں سے نکلے اور پھدکتے ہوئے دوسری جھاڑی میں گھس گئے۔

وکرم بھاٹیہ نے بتایا کہ یہ مارکوس کے بنائے ہوئے ابتدائی نمونوں کے بچے تھے۔ لیکن ان میں خراب عادت تھی کہ خود اپنے ہی بچوں کو کھا جاتے تھے۔ ان جانوروں کو پہلی بار میں نے اس رات دیکھا تھا جب چیتا آدمی میرا پیچھا کر رہا تھا اور دوسری دفعہ گزشتہ کل ہی دیکھا تھا۔ جب میں حصار سے فرار ہو گیا تھا۔ ان میں سے ایک جانور ایک گرے ہوئے درخت کی جڑ میں گھس گیا تھا۔ وکرم بھاٹیہ نے آگے بڑھ کر

اسے پکڑ لیا۔ وہ بلی کی طرح غرانے اور پچھلی ٹانگیں چلانے لگا ایک دفعہ اس نے میری کلائی پر کاٹ بھی لیا۔ لیکن اس کے دانت اتنے چھوٹے تھے کہ مجھے معلوم نہیں ہوا۔ وکرم بھاٹیہ نے بتایا کہ یہ جانور خاصا "نفاست پسند" واقع ہوا ہے اور کیچڑ وغیرہ میں اپنا بل نہیں بناتا۔

چشمے کے منبع تک جاتے وقت ہم نے ایک درخت پر ناخنوں کے نشانات دیکھے۔ کسی حیوان آدمی نے اپنے ناخن تیز کیے تھے۔ وکرم بھاٹیہ نے میری توجہ ان نشانات کی طرف مبذول کرائی۔

"قانون کی رو سے درختوں پر ناخن گھسنا اور چھال چھیلنا گناہ ہے۔" اس نے کہا۔ "اور تم دیکھ ہی رہے ہو کہ حیوان لوگ اس قانون کا کتنا لحاظ کرتے ہیں۔"

"مجھے ٹھیک سے یاد نہیں لیکن کچھ دھندلا سا احساس ہے کہ اس درخت سے چند قدم آگے ہی ہماری ملاقات سالمیر (بکرے اور گوریلے کا مجموعہ) اور بندر آدمی سے ہو گئی۔ ان دونوں نے بڑے ادب سے وکرم بھاٹیہ کو سلام کیا۔

"سلامتی ہو ان دونوں پر جو چابکیں رکھتے ہیں۔"

"اور اب تیسرا چابک والا بھی آ گیا ہے۔" وکرم بھاٹیہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "چنانچہ اب کبھی کوئی شرارت نہ کرنا۔"

"تو کیا اسے بتایا نہیں گیا؟" بندر آدمی نے پوچھا۔ "تو کہہ رہا تھا اسے بھی آقا بنایا ہے۔"

سالمیر نے کچھ عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر بولا۔

"اس تیسرے چابک والے کا جو سمندر میں گھس جاتا ہے۔ چہرہ بہت پتلا اور سفید ہے۔"

"ہاں لیکن اس کے ہاتھ میں پتلا چابک ہے۔ جس کا ایک ہی لڑا کا چمڑی ادھیڑ دیتا ہے۔" وکرم بھاٹیہ بولا۔

"لیکن کل اس کے بدن سے خون اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔" سالمیر نے کہا تم اور تمہارا آقا ایسا کبھی نہیں کرتے۔"

"زیادہ بک بک نہ کرو۔" وکرم بھاٹیہ نے ڈانٹ کر کہا۔

"خود تمہارے بدن سے خون اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں گے۔"

"لیکن اس کی پانچ انگلیاں ہیں۔" بندر آدمی بولا۔ "یہ مجھ جیسا ہی تو ہے۔"

"دانش ابراہیم چلو یہاں سے۔" وکرم بھاٹیہ نے جھنجلا کر کہا اور ہاتھ پکڑ کر مجھے آگے گھسیٹ لیا۔

"لیکن وہ بولتا نہیں ہے۔" سالمیر نے کہا۔ "آدمیوں کی تو آواز ہوتی ہے وہ بولتے ہیں۔"

"کل اس نے مجھ سے کھانے کی کوئی چیز مانگی تھی۔" بندر آدمی نے کہا۔ "وہ کھانے کی چیزوں سے بھی واقف نہیں۔"

"پھر خدا جانے وہ کیا کہتے رہے۔ میں نے سالمیر کے ہنسنے کی آواز سنی یا یوں کہیے کہ قہقہہ نما آواز سنی کیوں کہ وہ لوگ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ہنسنا جانتے ہی نہ تھے۔ یا ہنس نہ سکتے تھے۔"

اور جب ہم گرم پانی کے منبع اور وہ دراڑ جہاں سے بخارات نکلتے تھے۔ دیکھ کر لوٹ رہے تھے تو

ہمیں جنگل میں ایک مردہ خرگوش پڑا ملا۔ اس کے صحیح معنوں میں چیتھڑے اڑا دیے گئے تھے۔ سینے پر کا گوشت غائب تھا اور ریڑھ کی ہڈی چبا ڈالی گئی تھی۔

''ارے!'' وکرم بھاٹیہ مردہ خرگوش دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ پھر اس نے اپنی ٹانگ سے خرگوش کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بڑبڑایا۔ ''اف دانش ابراہیم۔ اس سے تم کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو؟''

''معلوم ہوتا ہے تمہارے کسی گوشت خور حیوان آدمی کی پرانی عادت عود کر آئی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''دیکھ نہیں رہے ہو اسکی ریڑھ کی ہڈی چبالی گئی ہے اور سینے کا گوشت کھا لیا گیا ہے۔''

''وکرم بھاٹیہ چند ثانیوں تک سکتے کے عالم میں کھڑا رہا اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا اور ہونٹوں کے کونے کانپ رہے تھے۔''

''یہ بہت برا ہوا ابراہیم!'' اس نے لرزاں آواز میں کہا۔

''میں پہلے بھی ایک مردہ خرگوش دیکھ چکا ہوں۔''

''کب......؟''

''جس دن یہاں آیا تھا۔''

''کیا دیکھا تھا تم نے......؟''

''ایک مردہ خرگوش جس کا سر دھڑ سے الگ پڑا تھا۔''

''تم نے کیا کہا۔ جس دن تم یہاں آئے تھے۔''

''ہاں اسی دن شام کو میں تیندوے کی چیخوں سے گھبرا کر اپنے کمرے سے نکل آیا تھا اور بے سوچے سمجھے جنگل میں جا گھسا تھا۔ جھاڑیوں کے اس جنگل میں جو حصار کے پیچھے ہے اور وہیں میں نے مردہ خرگوش دیکھا تھا۔ اس کا سر دھڑ جسم سے جدا پڑا تھا۔

وکرم بھاٹیہ کے منہ سے حیرت اور خوف کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

اور میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ تمہارے کون سے حیوان آدمی کا یہ کام ہو سکتا ہے۔ یقین سے تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن مجھے اسی پر شک ہے۔ کیوں کہ میں نے اسے چشمے سے پانی پیتے دیکھا تھا۔

''یعنی منہ لگا کر۔''

ہاں!

''قانون کی رو سے اس طرح سر پنا گناہ ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ جب مارکوس! ان حیوان لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے تو وہ قانون شکنی سے نہیں ڈرتے۔''

''اور اسی حیوان آدمی نے میرا پیچھا کیا تھا۔''

''بے شک یہ اسی کا کام ہوگا۔ کیوں کہ تم تو جانتے ہو کہ گوشت خور جانور اپنا شکار کھانے کے بعد پانی پیتا ہے۔...... یہ بہت برا ہوا...... اس کے منہ کو خون لگ گیا ہے یہ برا ہوا۔''

اور اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا کہ شاید وہ خون کشیدہ حیوان آدمی کہیں قریب ہی چھپا ہوا نظر آ جائے۔

''ابراہیم! اگر تم اسے دوبارہ دیکھو تو کیا پہچان لو گے؟''

وکرم بھاٹیہ نے پوچھا۔ جیب سے پستول نکال کر اس نے اس کا معائنہ کیا اور یہ اطمینان کر کے کہ وہ پورا بھرا ہوا ہے۔ اسے پھر جیب میں رکھ لیا۔

''بے شک پہچان لوں گا جب وہ میرا پیچھا کر رہا تھا۔ تو میں نے اسے ایک پتھر مار کر بے ہوش کر دیا تھا۔ اس کے ماتھے پر زخم کا نشان ہوگا۔''

''لیکن پھر ہمیں ثابت کرنا ہوگا۔'' وہ خرگوش کے پاس کھڑا رہا تھا مگر میں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ نہ دیکھا ہوتا تو شاید میں اکیلا آگے نکل کر پھر کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔''

''اب چلو گے بھی یا یہیں کھڑے خرگوش کا ماتم کرتے رہو گے؟'' میں نے کہا اور جیسے وہ چونک پڑا۔ آہستہ آہستہ چل کر میرے قریب آیا اور نہایت نیچی آواز میں بولا۔

''تم جانتے ہو دانش! کہ حیوان لوگوں کو ہر قسم کے گوشت سے نفرت دلا دی گئی ہے لیکن اگر کسی نے خون چکھ لیا ہے تو......''

اور وہ خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک ہم دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔

''حیران ہوں کہ کیا ہوا ہوگا؟'' اس نے گویا اپنے آپ سے کہا۔ ''کل مجھ سے بھی ایک حماقت ہو گئی۔ میں نے اپنے ملازم کو خرگوش صاف کرنے کی ترکیب بتائی تھی اور پھر میں نے اسے ہاتھ چاٹتے دیکھا تھا۔ افوہ! میرے وہم گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ بڑی غلطی ہو گئی یار!''

خاموشی کا طویل وقفہ رہا۔

''لیکن ہمیں اس معاملے کو زیادہ بڑھنے نہیں دینا چاہیے ورنہ...... میں مارکوس سے کہوں گا۔''

اور ڈاکٹر مارکوس نے بھی اس معمولی سی بات کو (یہ میرے نزدیک ایک معمولی سی بات تھی) بہت زیادہ اہمیت دی۔

''ہمیں اس ننگ خون چشیدہ کو عبرتناک سزا دینی چاہیے۔ تاکہ دوسرے ایسی حرکت نہ کریں۔'' مارکوس نے کہا۔ ''یقیناً یہ چیتے آدمی کا ہی کام ہے۔ لیکن ہم اس کا جرم کس طرح ثابت کریں گے؟ کاش کہ تم گوشت سے پرہیز کرتے۔ وکرم بھاٹیہ تمہاری یہ لت ایک نہ ایک دن ہم پر تباہی لے آئے گی۔''

''میں بے وقوف گدھا ہوں اور کیا کہوں؟'' وکرم بھاٹیہ نے کہا۔ ''جو کچھ ہونا تھا ہو چکا...... اور خود تم نے مجھے گوشت کھانے کی اجازت دی تھی۔''

''بہر حال ہمیں فوراً اس معاملے کو ختم کر دینا چاہیے مارکوس نے کہا۔'' وکرم بھاٹیہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو تمہارا ملازم کیا ہمارا ساتھ دے گا؟''

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وکرم بھاٹیہ نے کہا۔

اور دوپہر کا کھانا کھا کر میں، مارکوس وکرم بھاٹیہ اور ہمارا ریچھ ملازم حصار سے نکل کر جنگل کی طرف چلے۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم تینوں کے ہاتھ میں چابک تھے اور ریچھ ملازم کے ہاتھوں میں ایک آہنی تاروں کا بنڈل اور دوسرے ہاتھ میں لکڑیاں چیرنے کی کلہاڑی لیے تھا۔ ڈاکٹر مارکوس اپنے ایک

کندھے سے ایک نرسنگا لٹکائے ہوئے تھے۔

اور پھر جنگل میں ٹہنیاں چٹخنے کی آوازیں آئیں۔ پھر پیروں کی چاپ سنائی دی۔ پھر بھنبھناہٹ کی آوازیں آنے لگیں اور تین چار منٹ بعد ہی بدصورت حیوان لوگ ہر چہار طرف کی جھاڑیوں میں سے نکل نکل کر میدان میں آنے لگے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر میں اپنے دل میں خوف کی لہر محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن مارکوس اور وکرم بھاٹیہ اپنی جگہ بڑے پرسکون اور اطمینان سے کھڑے تھے۔ سب سے پہلے مجھے سالمیر نظر آیا۔ پھر ٹہنیوں کو توڑتا اور جھاڑیوں کو روندتا وہ زبردست اور عجیب حیوان آدمی جو گینڈے اور گھوڑے کا مجموعہ تھا۔ پھر دو سو عورتیں اور پھر وہ ریچھ لومڑی عورت آئی۔ جس کی آنکھیں سرخ تھیں اور جس کے بدن سے سخت بدبو اٹھتی تھی اور پھر دوسرے حیوان لوگ۔ ایک ایک کرکے آگئے اور آتے ہی انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

''وہی ہے جو بناتا ہے اور وہی ہے جو مٹاتا ہے۔''

وہ ہم سے کوئی تین گز دور رک گئے اور زمین پر سے خاک اٹھا اٹھا کر اپنے ماتھے پر چڑھانے لگے۔ ہم تینوں اپنے ریچھ کے ساتھ ان بھیانک حیوان لوگوں میں کھڑے تھے۔

''اکسٹھ باسٹھ ترسٹھ'' مارکوس نے انہیں شمار کیا۔ ''اور چار دوسرے کہاں ہیں؟''

''چیتا آدمی بھی غائب ہے۔'' میں نے کہا۔

''مارکوس نے نرسنگا پھونکا اور حیوان لوگ انتہائی خوف کے عالم میں سجدہ ریزہ ہو گئے اور پھر بید کے جنگل میں سرسراہٹ ہوئی اور فوراً ہی چیتا آدمی نکل کر سامنے آگیا۔ اس نے مارکوس کو سجدہ کیا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا اس کا ماتھا زخمی تھا۔ سب سے آخر میں بندر آدمی آیا اور اب اس میدان میں پورے جزیرے کے لوگ جمع تھے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' مارکوس نے کہا اور فوراً ہی بھورے بالوں والے قانون گو نے بڑھ کر سجدہ کیا۔

''قانون کہو۔'' مارکوس نے حکم دیا۔

اور قانون گو قانون کہنے اور دوسرے حیوان لوگ ایک کورس میں اس کے کہے ہوئے الفاظ دہرانے لگے اور جب انہوں نے کہا۔ ''گوشت اور مچھلی کھانا گناہ ہے کیوں کہ ہم آدمی ہیں۔'' تو مارکوس نے فوراً اپنا ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش ہو جانے کا حکم دیا اور اس میدان میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ میرے خیال میں ان لوگوں نے سمجھ لیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ کیوں کہ ان میں سے ہر ایک کے چہرے سے خوف و ہراس کے آثار ہویدا تھے۔

''یہ قانون توڑا گیا ہے۔'' مارکوس نے رعب دار آواز میں کہا۔

''کوئی نہیں بچ سکتا۔'' ایک حیوان آدمی نے کہا جس کے بدن پر سفید بال تھے۔

''کوئی نہیں بچ سکتا۔'' حیوان لوگوں نے سجدہ ریز ہو کر دہرایا۔

''کون ہے وہ؟ اس نے پھر کڑک کر پوچھا۔

''جانور ہے وہ قانون توڑتا ہے۔'' حیوان لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

مارکوس نے چیتے آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہ اسے گھورتا ہی رہا۔ مارکوس کی تیز تیز

نظر چیتے آدمی کی روح کو چھید رہی تھی کہ موخر الذکر بے چین ہوا تھا۔

''جو قانون توڑتا ہے۔'' مارکوس نے ہماری طرف گھومتے ہوئے کہا۔ ''وہ عذاب میں مبتلا ہوتا ہے۔'' حیوان لوگ بولے۔

''اسے دارالعقوبت میں پہنچا دیا جاتا ہے۔'' بندر آدمی بولا۔ ''سنا تم نے...... اس لیے۔'' مارکوس نے چیتے آدمی کی طرف گھومتے ہوئے کہا۔

''اس عرصے میں جب کہ مارکوس کا چہرہ ہماری طرف تھا۔ چیتا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ دانتوں میں کھینچ گئے تھے اور اس کے نوک دار مڑے ہوئے دانت نظر آرہے تھے۔ جیسے ہی مارکوس اس کی طرف گھوما۔ چیتے آدمی نے یکا یک اس کی طرف حملہ کردیا۔ ایک انجانا اور بے بنیاد خوف ہی حیوان لوگوں کو مارکوس اور وکرم بھاٹیہ پر حملہ کرنے سے روکے ہوئے تھا۔ لیکن اب چیتے آدمی نے اس کی ہمت کر ڈالی۔ تو وہ سب بھی نیم دائرہ بنا کر ہماری طرف بڑھے یا خدا جانے مجھے ایسا معلوم ہوا۔ میں نے جلدی سے اپنا پستول نکالا اور آگے بڑھتے ہوئے حیوان لوگوں پر اندھادھند تین گولیاں چلا دیں دو حیوان آدمی مردہ ہو کر گرے اور دوسرے جہاں تھے۔ وہیں کھڑے ہو گئے۔

عین اس وقت میں نے مارکوس کو گرتے اور پھر لڑھکنیاں کھاتے ہوئے دیکھا۔ چیتے آدمی نے اس کے منہ پر بڑے زور کا تھپڑ رسید کیا تھا۔ دفعتہً حیوان لوگ چیخنے چلانے لگے اور میں سمجھا کہ وہ بغاوت پر آمادہ ہیں۔

چیتا آدمی بگولے کی سی تیزی سے میرے قریب سے گزرا وکرم بھاٹیہ کا ریچھ ملازم اس کا تعاقب کر رہا تھا اور اس وقت میں نے دیکھا کہ لکڑ بگھے آدمی کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ حملہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سالمیر بھی غصہ وار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا اور عین اسی وقت جب کہ ہماری قسمتوں کا فیصلہ ہو جانے والا تھا۔ دفعتہً مارکوس کا پستول گرجا اور گولی حیوان لوگوں کے سروں پر سنسناتی ہوئی گزر گئی اور وہ لوگ میکانکی طور سے گھوم گئے۔ جس طرف کو گولی گئی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ جیسے کسی مقناطیسی کشش سے اسی طرف گھوم گیا اور دوسرے ہی لمحے چیختے چلاتے حیوان لوگوں کے ساتھ چیتے کا تعاقب کر رہا تھا۔

وکرم بھاٹیہ کا ریچھ ملازم ہم سے بہت آگے اور بھاگتے ہوئے مجرم کے بہت قریب تھا اور اس کے پیچھے بھیڑیا عورتیں اپنی زبان لٹکا کر بھاگ رہی تھیں۔ ان کے پیچھے سور مرد تھے۔ جو انتہائی خوشی کے عالم میں ''غرغر'' کر رہے تھے۔ ان کے پیچھے سفید جلد والے بیل آدمی تھے اور مارکوس بہت سے حیوان لوگوں کے حلقے میں بھاگ رہا تھا اور ہاتھ میں بھرا ہوا پستول لیے تھا اور اس کے سفید بے ترتیب بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ لکڑ بھگا آدمی میرے شانہ بشانہ بھاگ رہا تھا اور وہ بار بار کنکھیوں سے میری دیکھ رہا تھا اور شاید اس کے منہ میں پانی بھر آتا تھا اور ہمارے پیچھے دوسرے حیوان آدمی تھے۔

چیتا آدمی بید کے جنگل میں گھستا چلا گیا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ وکرم بھاٹیہ کا ریچھ ملازم اس کے بہت قریب تھا۔ چنانچہ چیتا آدمی اپنے ہاتھوں میں بید کی ٹہنیاں پکڑ کر چھوڑتا جاتا۔ جو ریچھ ملازم کے

چہرے پر چٹاچٹ لگتی تھیں۔لیکن موخرالذکر بڑی دلیری سے اس کا تعاقب کرتا رہا۔بید کے جنگل کے بعد کوئی پاؤ میل تک کھلا میدان تھا اور میدان کے دوسرے کنارے سے پھر جھاڑیوں اور درختوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔چیتا آدمی اس کے پیچھے ہم اس جنگل میں گھسے، یہ جنگل گھنا تھا۔لٹکتی ہوئی بیلیں ہماری گردنوں سے لپٹ جاتی تھیں اور خاردار جھاڑیاں نہ صرف کپڑے پھاڑ رہی تھیں۔بلکہ جسم کو زخمی بھی کر رہی تھیں۔لیکن چیتے آدمی کو اس کے جرم کی سزا دینا ضروری تھا۔تاکہ ہم محفوظ رہ سکیں۔چنانچہ ہم اس کے تعاقب سے باز نہ آئے۔

"دیکھا وہ کم بخت یہاں سے چاروں ٹانگوں سے دوڑتا ہوا گیا ہے۔" مارکوس نے کہا۔جواب مجھ سے ذرا ہی آگے تھا۔

"کوئی بچ نہیں سکتا۔" اس حیوان آدمی نے کہا جو بھیڑیے اور ریچھ کا مجموعہ تھا۔

اس گھنے جنگل سے نکلے تو ہم ایک سنگستانی اور ناہموار میدان میں تھے اور اب ہم مجرم کو بہ خوبی دیکھ سکتے تھے۔وہ چاروں ٹانگوں پر بڑی سبک رفتاری سے بھاگ رہا تھا۔وہ بار بار گردن گھما کر ہماری طرف دیکھ لیتا تھا۔وہ اب تک کپڑے پہنے تھے۔چہرے سے گھوڑا بہت آدمی بھی معلوم ہوتا تھا۔لیکن وہ چار ٹانگوں پر چیتے کی طرح تیز رفتاری سے بھاگ رہا تھا اور اس کے کندھے بھی چیتے کی طرح ہی حرکت کر رہے تھے۔

اس نے ہوا میں ایک زبردست چھلانگ لگائی اور زرد رنگ کی خاردار جھاڑیوں کے پیچھے جا کر ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔وکرم بھاٹیہ کا ریچھ ملازم ان جھاڑیوں سے زیادہ دور نہ تھا۔

ہم میں سے کئی ایک کے بھاگنے کی رفتار اب پہلی سی نہ رہی تھی۔کیوں کہ ہم تھک گئے تھے اور اب ہم نیم دائرے میں بھاگنے کے بجائے ایک قطار میں بھاگ رہے تھے۔لکڑ بگھا آدمی اب بھی میرے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔وہ بار بار کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتا اور اس کی تھوتھنی کا گوشت کانپنے لگتا۔اس کے حیوانی دماغ میں خدا جانے کون سے خیالات پروان چڑھ رہے تھے۔

چیتا آدمی اس راس کی طرف بھاگا جہاں سے اس نے میرا تعاقب شروع کیا تھا اور وہ اس جزیرے میں میری پہلی رات تھی۔ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی اور خدا جانے مجھ میں اتنی قوت کہاں سے آگئی کہ میں ٹھوکریں کھاتا اور جھاڑیوں میں الجھتا سب سے آگے نکل آیا لیکن نہ اس قدر آگے کہ میں تعاقب کرنے والوں سے الگ اور ان کی نظروں سے اوجھل ہوتا۔میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا اور میرا دل اس بری طرح دھڑک رہا تھا۔جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔لکڑ بھگا آدمی بہ دستور میرے ساتھ دوڑ رہا تھا اور فرط انبساط سے غرا رہا تھا۔

اور آخر کار تعاقب ختم ہوا ہم نے مجرم کو جزیرے کی سنگستانی کونے میں گھیر لیا۔مارکوس نے چابک بجایا اور ہم صف بستہ ہو کر آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔حیوان لوگ اتنا شور مچا رہے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ہم اپنا حلقہ تنگ کرتے گئے۔چیتا آدمی جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا اور ہم اسے دیکھ نہ سکتے تھے اور ہماری صف کے دونوں سرے جھاڑیوں کی دوسری طرف آپس میں مل گئے مجرم اب ہمارے نرغے میں تھا۔

"ہوشیار...... سنبھل کے کہیں وہ اچانک حملہ نہ کر دے۔" جھاڑیوں کی دوسری طرف سے وکرم بھاٹیہ کی آواز سنائی دی۔میں ایک بلند مقام پر تھا اور وکرم بھاٹیہ اور مارکوس جھاڑیوں کے دوسری طرف نشیب

میں۔آہستہ آہستہ ہم اپنا دائرہ تنگ کرتے گئے۔چیتا آدمی جو گنجان اور قد آدم جھاڑیوں میں کہیں چھپا ہوا تھا، اور خاموش تھا۔

اور جب میں ڈھلان اتر رہا تھا تو میں نے اسے دیکھ لیا وہ دو جھاڑیوں کے بیچ میں دبکا ہوا تھا اس کی چمک دار آنکھیں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔میں چلتے چلتے رک گیا۔

"دارالعقوبت...... دارالعقوبت' جھاڑیوں کے پیچھے سے بندر آدمی کی آواز سنائی دی۔

اور میں نے سوچا کہ اس چیتے آدمی کو پھر سخت اذیت پہنچائی جائے گی۔وہ پھر مارکوس کی تجربہ گاہ میں میز پر تڑپے گا۔ہر چند کہ وہ خطرناک تھا۔ہر چند کہ وہ چیتے کی طرح جھاڑیوں میں دبکا ہوا تھا۔لیکن نیم انسان تو تھا کم از کم درد اور تکلیف محسوس کرنے کی صلاحیت تو رکھتا تھا۔اس کی حالت پر رحم آگیا۔چنانچہ میں نے اپنا پستول نکالا اور مجرم کی پیشانی کو نشانہ بنا کر گولی چلا دی۔

اس عرصے میں لکڑ بگھے آدمی نے اس کو دیکھ لیا تھا۔وہ خوشی کی ایک چیخ کے ساتھ آدمی پر جھپٹا اور اپنے خوں خوار دانت اس کے حلق میں پیوست کر دیے۔میرے چاروں طرف جھاڑیوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور حیوان لوگ آگے کی طرف گھس آئے۔

"ابراہیم! ہم اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔" مارکوس چلایا اور حیوان لوگوں کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھ آیا۔

لکڑ بھگا آدمی اب تک چیتے آدمی کو دبوچے ہوئے تھا۔مارکوس نے چابک مار مار کر اسے وہاں سے ہٹایا وکرم بھاٹیہ اپنے ریچھ ملازم اور دوسرے حیوان لوگوں کو چیتے آدمی سے جواب تڑپ رہا تھا۔دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔لیکن وہ تھے کہ مارے اشتیاق کے آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔بھورے بالوں والا قانون گو پھنکار کر آگے بڑھ آیا اور جھک کر تڑپتے ہوئے چیتے آدمی کو دیکھنے لگا۔

"ابراہیم! لعنت ہے یار! ہم اسے گرفتار کرنا چاہتے تھے۔" مارکوس نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ گھبراہٹ میں' میں نے گولی چلا دی۔" میں نے کہا۔حالاں کہ حقیقت یہ نہ تھی۔

تھکن اور اشتعال نے مجھے نیم جاں سا کر دیا تھا۔چنانچہ میں پلٹا اور حیوان لوگوں کے ہجوم میں سے راستہ بناتا ڈھلان کی چوٹی کی طرف چلا۔میں تنہائی چاہتا تھا۔یہ ڈھلان چڑھتے وقت میں نے مارکوس کی آواز سنی تھی۔وہ حیوان لوگوں کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔میں نے گردن گھما کر دیکھا۔تین بیل آدمی چیتے آدمی کی لاش گھسیٹتے ہوئے سمندر کی طرف لے جا رہے تھے اور دوسرے حیوان لوگ ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

میں نے ڈھلان کی چوٹی پر پہنچ کر نیچے دیکھا۔حیوان لوگوں کا ہجوم ساحل پر مؤدب کھڑا تھا اور تینوں بیل آدمی چیتے آدمی کی لاش کو کندھوں پر اٹھائے سمندر میں اتر پڑے تھے اور آج پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ جزیرے کے حالات معمول پر نہ تھے۔نمایاں طور پر نہ سہی لیکن حالات میں خفیف تغیر ضرور ہوا تھا۔میں نے حیوان لوگوں کی آنکھوں میں بغاوت کی چنگاری دیکھی تھی۔حالاں کہ اس وقت وہ وکرم بھاٹیہ اور مارکوس کو اپنے حلقے میں لیے جھوم جھوم کر قانون کے الفاظ دہرا رہے تھے۔لیکن مجھے شک ہو گیا تھا۔کہ چیتے آدمی کے

مارکوس پر حملہ کرنے کے بعد ان حیوان لوگوں کے دلوں کی حالت مختلف ہوگئی تھی۔

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ لکڑ بگھے آدمی کے منہ کو بھی خون لگ گیا تھا۔ وہ چیتے آدمی کے جرم میں برابر کا شریک تھا اور اس وقت وہ ایک پتھر پر کھڑا جھوم جھوم کر قانون کہہ رہا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے قریب کھڑے ہوئے بندر آدمی سے سرگوشیاں بھی کرتا جاتا تھا۔ خدا جانے کیا بات تھی کہ فضا میں خوف سا محسوس ہو رہا تھا اور خطرے کی بو پا رہا تھا۔ میں نے نشیب کی طرف نظر کی۔ سرسبز جنگلات اور ان کے پیچھے مچلتا ہوا سمندر۔ لیکن وہ مسحور کن منظر اس وقت مجھے بھیانک معلوم ہوا اور وہ جزیرہ موت کا جزیرہ۔ کچھ ہونے والا تھا۔ کیا؟ اس سوال کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ لیکن میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کچھ ہونے والا تھا۔

اس جزیرے میں آئے ہوئے مجھے چھ ہفتے ہوئے تھے کہ مارکوس اور اس کے تجربات سے نہ صرف تھک گیا بلکہ مجھے اس سے نفرت بھی ہوگئی۔ میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوا۔ حالاں کہ مارکوس میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتا تھا۔ شاید اس خیال نے کہ اس کے تجربات بڑے انسانیت سوز تھے اور وہ جانوروں کو سخت اذیت پہنچاتا تھا۔ مجھے اس سے متنفر کر دیا تھا اور نفرت کا یہ جذبہ میرے دوسرے تمام جذبات پر حاوی تھا۔ چنانچہ اب مجھے ایک خیال آیا تھا۔ کسی بھی طرح شیطانوں کے اس جزیرے سے نکل کر انسانوں میں پہنچ جاؤں اور مجھے اپنے پر رونق بازاروں اور دوستوں کی یاد ستانے لگی۔

اس جزیرے میں میرا کوئی دوست نہ تھا۔ آپ کہیں گے وکرم بھاٹیہ تو تھا۔ تو عرض ہے کہ ہماری دوستی گہری نہ تھی۔ بلکہ ایسی تھی جیسے ہمارے یہاں۔ ''صاحب سلامت۔'' کہتے ہیں اور سبب اس کا غالباً یہ تھا کہ وکرم بھاٹیہ کوئی گیارہ سال سے حیوان لوگوں میں رہ رہا تھا اور وہ مجھ سے زیادہ انہی حیوان لوگوں سے ملتا تھا۔ پھر اسے شراب کی بری لت تھی۔ خیر اس کی اس لت کو برداشت کر لیتا۔ لیکن حیوان لوگوں سے اس کی دوستی مجھے بری طرح کھٹکتی تھی۔ چناں چہ کئی دفعہ وہ اکیلا ہی ان سے ملنے چلا گیا۔ کیوں کہ میں حیوان لوگوں سے حتی الامکان دور ہی دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ میرا زیادہ تر وقت ساحل پر گزرتا تھا تا کہ میں جزیرے کو خیر باد کہہ سکوں۔ لیکن کوئی جہاز نہ آیا۔ یہاں تک کہ ایک دن ہم پر ایک آفت ٹوٹ پڑی۔ جس نے صورت حال کو حد سے زیادہ نازک بنا دیا تھا۔

اس جزیرے میں آتے ہوئے مجھے ساتواں یا آٹھواں ہفتہ تھا کہ وہ بھیانک حادثہ ہوا اور اس وقت اگر میرا حافظہ غلط نہیں کر رہا تھا تو صبح کے چھ بجے ہوں گے۔ تین حیوان آدمی جنگل سے لکڑیاں گھسیٹ گھسیٹ کر حصار میں لا رہے تھے اور اس گڑبڑ سے میری آنکھ کھل گئی۔ ورنہ عموماً میں سات بجے اٹھا کرتا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر حصار کے صدر دروازے میں جو اس وقت کھلا تھا۔ کھڑا سگریٹ پی رہا تھا کہ مارکوس کہیں باہر سے آیا۔ اس نے مسکرا کر مجھے صبح بخیر کہا اور ایک لمحہ بھی رکے بغیر حصار میں چلا گیا۔ فوراً ہی میں نے تالے میں کنجی گھومنے کی آواز سنی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا کہ مارکوس اپنے آپریشن ہال کا دروازہ کھول رہا تھا۔ اس جزیرے اور خصوصاً اس حصار میں ان سات آٹھ ہفتوں کے قیام نے میرا دل بھی اتنا سخت کر دیا تھا کہ اب تیندوے کی چیخیں مجھے اتنا پریشان نہ کرتی تھیں۔ چنانچہ جب تیندوے نے ایک دفعہ مڑ کر دیکھا تک نہیں کہ کیا ہو رہا تھا۔ لیکن ایک بات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ تیندوے کی چیخ میں آج کوئی نئی بات تھی جیسے کوئی لڑاکا عورت انتہائی غصے کے عالم میں چیخی ہو۔

اور پھر جو کچھ ہوا۔ آج تک میں یہ نہ سمجھ سکا کہ کیا تھا۔ بہر حال میں نے پہلے ایک دل ہلا دینے والی چیخ اور پھر کسی کے گرنے کا دھماکہ سنا۔ مڑ کر دیکھا تو ایک بھیانک چہرہ مجھ پر دھنسا چلا آ رہا تھا اور عجیب چہرہ تھا وہ جو نہ انسان تھا اور نہ کسی جانور کا۔ بلکہ کسی دوزخی عفریت کا سا بھورا اور شاخ در شاخ خراشوں سے پُر جن سے خون کے سرخ سرخ قطرے ٹپک رہے تھے اور بے پپوٹوں کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ سیدھا مجھ پر آیا میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے لیکن اس کا تھپڑ میرے سینے پر پڑا۔ میں اس ضرب کی تاب نہ لا کر بائیں پہلو پر گرا۔ خون آلود پٹیوں میں لپٹے ہوئے عفریت نے مجھ سے ٹھوکر کھائی۔ میں بے جان پوٹ کی طرح لڑھکنے لگا اور وہ مجھے پھلانگ کر جنگل کی طرف بھاگا۔ مارے درد کے میرے خون میں آتش بازی کے انار سے چھوٹنے لگے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن بائیں پہلو پر گر پڑا۔ میرا ہاتھ ٹوٹ گیا تھا اور پھر مارکوس نمودار ہوا۔ اس کی پیشانی سے خون ٹپک رہا تھا۔ جس نے اس کے کرخت چہرے کو اور بھی بھیانک بنا دیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں پستول پکڑے تھا۔ وہ میری طرف کوئی دھیان دیے بغیر تیندوے کے پیچھے بھاگا کیوں کہ وہ عفریت جو میرا ہاتھ توڑ کر بھاگا۔ تیندوا ہی تھا۔

میں دوسرا ہاتھ ٹیک کر بہ وقت تمام اٹھا خون آلود پٹیوں میں بندھا ہوا تیندوا ساحل پر بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے مارکوس تھا۔ تیندوے نے مڑ کر دیکھا تو عذاب کے فرشتے کو اپنے پیچھے ہی آتا دیکھ کر اس نے اپنی رفتار تیز کر دی وہ چھلانگیں بھرتا بھاگ رہا تھا اور ہر چھلانگ اسے مارکوس سے دور لیے جا رہی تھی۔ آخر کار وہ جھاڑیوں کے قریب پہنچ گیا۔ دفعتہً مارکوس نے گولی چلا دی لیکن اس کا نشانہ خطا کر گیا اور دوسرے ہی لمحے تیندوا جھاڑیوں میں غائب ہو گیا اور مارکوس بھی ان جھاڑیوں میں گھس کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھا ان جھاڑیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ جن کے پیچھے تیندوا اور مارکوس غائب ہوئے تھے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی میرے ٹوٹے ہوئے ہاتھ میں ناقابل برداشت ٹیسیں اٹھیں اور میں کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ عین اسی وقت حصار کے دروازے پر وکرم بھاٹیہ نمودار ہوا۔ وہ بھی ہاتھ میں پستول لیے تھا۔ غضب ہو گیا۔ ابراہیم! اس نے یہ دیکھے بغیر کہ مجھے سخت تکلیف ہے۔ کہا۔ وہ تیندوا زنجیریں توڑ کر بھاگ نکلا اور پھر یہ دیکھ کر میں نے اپنا ہاتھ پکڑے ہوئے ہوں۔ بولا۔

''ارے کیا ہوا؟''

میں دروازے میں کھڑا تھا۔ میں نے کراہ کر جواب دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرا ٹوٹا ہوا ہاتھ پکڑ لیا۔

''یہ آستین پر کیا خون ہے؟'' اس نے میری آستین کی قیص اوپر چڑھا دی پستول جیب میں رکھا اور میرا ہاتھ دبا کر دیکھا تو میں چیخ پڑا وہ مجھے اندر لے گیا۔

میں نے ناقابل برداشت ٹیسوں کو برداشت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پورا واقعہ سنا دیا۔ اس عرصے میں اس نے ہڈی بٹھا کر میرے ہاتھ پر پٹی کس دی۔ گردن پر پٹی باندھ کر ہاتھ اس میں لٹکا دیا۔

میرا ہاتھ بری طرح درد کر رہا تھا۔ لیکن میں نے اس واقعہ کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ تیندوا جس پر مارکوس تجربہ کر رہا تھا۔ اتفاقاً بھاگ گیا تھا اور بس۔ میرے خیال میں یہ کوئی اہم واقعہ نہ تھا۔ اس جزیرے

میں پہلے بھی ایسے واقعات ہو چکے تھے۔ لیکن میں کیا جانتا تھا کہ یہی معمولی سا واقعہ جزیرے کی فضا کو بدل دے گا۔ ہاتھ کا درد بڑھتا جا رہا تھا اور اس بڑھتے ہوئے درد کی پہلی ٹیس نے میرے پورے بدن میں آگ سی لگا دی تھی کہ وکرم بھاٹیہ آ گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ راکھ کی طرح ہو رہا تھا اور اس کا نچلا ہونٹ اس طرح لٹک گیا تھا کہ اس کے مسوڑھے تک نظر آ رہے تھے۔

"دونوں کا کہیں پتا نہیں۔" اس نے آتے ہی کہا۔ "مارکوس کو میری مدد کی ضرورت ہو گی۔ خدا جانے وہ تینندوے کا تعاقب کرتے ہوئے کس طرف گیا تھا۔ وہ چند ثانیوں تک میری صورت دیکھتا رہا اور پھر بولا۔ "بہت زیادہ طاقت ور ہے۔ تینندوا۔ خدا کی قسم ایک ہی جھٹکے میں اس نے زنجیریں توڑ کر اپنے آپ کو آزاد کرا لیا۔"

وہ کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پھر میری طرف مڑ کر بولا۔

"ابراہیم! میں مارکوس کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ ایک زائد پستول میرے پاس ہے۔ وہ میں تمہیں دیے دیتا ہوں۔ شاید تمہیں اس کی ضرورت پڑ جائے۔"

اور اس نے اپنی جیب سے پستول نکال کر میرے سامنے میز پر رکھ دیا اور کچھ کہے بغیر باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی میں اٹھا اور پستول لے کر دروازے میں جا کھڑا ہوا۔

اور یہ کچھ عجیب صبح تھی۔ وہ بے چین کر دینے والی ہوا بند تھی۔ آسمان شفاف اور سمندر پر سکوت تھا۔ صبح کا یہ بھیانک سناٹا میرے حواس پر چھایا جا رہا تھا۔

میں نے سیٹی بجانے کی کوشش کی لیکن کوئی آواز نہ نکلی۔ شدید اضطراب نے مجھے وہاں کھڑا رہنے بھی نہ دیا۔ چنانچہ میں دروازے کے سامنے سے ہٹ کر حصار کے کونے پر پہنچا اور ان جھاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جنہوں نے وکرم بھاٹیہ اور مارکوس کو نگل لیا تھا۔

اور پھر دور ساحل کے انتہائی سرے پر ایک حیوان آدمی نمودار ہوا۔ وہ ساحل پر دیوانوں کی طرح بھاگتے اور سمندر میں اتر کر پانی اڑانے لگا۔ میں پھر حصار کے دروازے جا کھڑا ہوا اور چند ثانیوں بعد بے چینی کی لہریں محسوس کر کے دوبارہ حصار کے کونے پر پہنچا اور اب میں دروازے سے حصار کے کونے تک گویا۔ ایک مستعد سنتری کی طرح پہرہ دے رہا تھا اور ایک دفعہ میرا خیال ہے کہ میں نے وکرم بھاٹیہ کی آواز سنی۔ میں ٹہلتے ٹہلتے رک گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ وکرم بھاٹیہ کی آواز کہیں دور سے آ رہی تھی۔

"مارکوس......س......س......س......" وہ چیخ رہا تھا۔

ہاتھ کا درد ذرا کم ہو گیا تھا۔ لیکن میرا پورا بدن پھنک سا رہا تھا اور مارے پیاس کے حلق خشک ہو رہا تھا۔ سورج کافی بلند ہو رہا تھا اور میرا لمبا سایہ سمٹ کر ذرا سا رہ گیا تھا۔ دور پرے مجھے ایک انسانی سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ میں نے سائے کو اس وقت تک دیکھتا رہا۔ جب تک کہ وہ میری نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ خدا جانے کون تھا؟ کوئی حیوان آدمی ...... مارکوس، وکرم بھاٹیہ......وہ دونوں مارکوس اور وکرم بھاٹیہ اب تک واپس کیوں نہیں آئے؟

وہ آئیں گے بھی یا نہیں......؟ دفعتہً تین آبی پرندے کوئی نایاب چیز حاصل کرنے کے لیے آپس میں لڑ پڑے۔ خالی خالی نظروں سے ان پرندوں کو دیکھتا رہا۔

دفعتہً دوسرا دھماکہ سنائی دیا۔ ساتھ ہی ایک چیخ ...... پھر وہی خاموشی۔ میں گھبرا گیا۔ خدا جانے کیا ہوا تھا؟ کیا ہونے والا تھا...... پھر تیسرے دھماکے کی آواز آئی اور یہ آواز بہت قریبی تھی۔

میں دوڑ کر حصار کے کونے پر پہنچا۔ وکرم بھاٹیہ انتہائی بدحواسی کے عالم میں حصار کی طرف بھاگا آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور اس کی پتلون گھٹنوں پر سے پھٹ گئی تھی۔ اسکے پیچھے اس کا ریچھ ملازم اور بھورے بالوں والا ایک حیوان بھاگ رہا تھا۔

ریچھ ملازم کے ہونٹوں کے کونے پر سرخ سرخ داغ مجھے اتنی دور سے بھی نظر آ رہے تھے۔

"وہ آیا کہ نہیں؟" وکرم بھاٹیہ نے اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان پوچھا۔

"کون مارکوس؟" میں نے جواب دیا۔ نہیں۔

"خدا کے لیے دانش ابراہیم!" وکرم بھاٹیہ نے کہا۔ "حصار میں چلو جلدی۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ سب پاگل ہو رہے ہیں۔ خدا جانے انہیں ایک دم سے کیا ہو گیا ہے......!" چلو اندر چلو...... ذرا دم درست کر لوں تو پورا واقعہ سناؤں برانڈی...... برانڈی...... کہاں ہے؟"

وہ لنگڑاتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا اور کرسی میں دھنس گیا۔ اسکا ریچھ ملازم دروازے کے درمیان میں لمبا لمبا لیٹ کر کتے کی طرح ہانپنے لگا۔ میں نے برانڈی میں پانی ملا کر گلاس وکرم بھاٹیہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ جسے وہ ایک سانس ہی میں چڑھا گیا۔ چند منٹوں بعد اس کا دم درست ہوا تو اس نے پوری روداد مجھے سنا دی۔

وہ مفرور تینندوے اور مارکوس کے پیروں کے نشانات دیکھ دیکھ کر آگے بڑھتا رہا۔ جگہ جگہ خون کے پڑے ہوئے دھبے اور جھاڑیوں میں اٹکے ہوئے تینندوے کی پٹیوں کے ٹکڑے وکرم بھاٹیہ کی رہبری کرتے رہے۔ لیکن جب وہ اس چشمے پر پہنچا جہاں میں نے چیتے آدمی کو پانی سڑپتے دیکھا تھا تو وہاں اسے نشانات نہ ملے۔ کیوں کہ وہ جگہ پتھریلی تھی اور جھاڑیاں بھی گنجان نہ تھیں۔

چنانچہ اٹکل پچو بڑھتا اور مارکوس کو آوازیں دیتا رہا۔ اس کی آواز سن کر قریب کے درختوں میں سے ریچھ ملازم ہاتھ میں کلہاڑی لیے نکل آیا۔ وہ وہاں لکڑیاں کاٹ رہا تھا اور تینندوے کے فرار سے بے خبر تھا۔ چنانچہ اب وہ دونوں مل کر مارکوس کو تلاش کرنے اور اسے آوازیں دینے لگے۔ انکی اس حرکت میں کوئی خاص بات تھی۔ جس نے وکرم بھاٹیہ کو چونکا دیا۔ اس نے اشارے سے انہیں بلایا تو وہ اس کے پاس آنے کی بجائے پشت پھیر کر بھاگ پڑے۔ پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ وکرم بھاٹیہ نے انہیں آوازیں دیں۔ لیکن ان دونوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔

وکرم بھاٹیہ نے سوچا کہ ضرور کوئی غیر معمولی بات ہو گئی ہے۔ چنانچہ وہ اس کھنائی کی طرف چلا جہاں حیوان آدمیوں کے بھٹ تھے۔

یہ ایک اور نئی بات تھی۔ چناں چہ وکرم بھاٹیہ خطرہ محسوس کر کے الٹے پاؤں حصار کی طرف لوٹ پڑا۔ راستے میں اس کی مڈبھیڑ ان دو سواروں سے ہو گئی۔ جنہیں میں نے ایک رات اور وہ اس جزیرے میں میری پہلی رات تھی۔ دیوانوں کی طرح ناچتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان دونوں کے منہ سے خون ٹپک رہا تھا اور

آنکھیں شیطانیت سے چمک رہی تھیں۔وکرم بھاٹیہ کو دیکھتے ہی وہ دونوں جم کر کھڑے ہو گئے۔ان کے چہروں سے عجیب وحشیانہ اور نفرت وحقارت کے جذبات ہویدا تھے۔وکرم بھاٹیہ نے اپنا چابک بجایا اور وہ دونوں دفعتہً اس پر جھپٹ پڑے۔پہلے کبھی کسی حیوان آدمی نے مارکوس یا وکرم بھاٹیہ پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وکرم بھاٹیہ نے فوراً گولی چلادی۔ایک خاک وخون میں لڑھکنے لگا۔دوسرے پر وکرم بھاٹیہ کا ریچھ ملازم جا پڑا۔وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔آخر کار ریچھ ملازم اس باغی پر چڑھ بیٹھا اور اپنے تیز نوکیلے دانت اس کے حلق میں چبھو دیے۔وکرم بھاٹیہ نے گولی چلا کر اس سور آدمی کا بھی خاتمہ کر دیا۔لیکن اپنے ریچھ ملازم کو سور آدمی سے اٹھانے میں اسے بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔وہ اس سور آدمی کا خون چوس رہا تھا اور کسی صورت اس سے الگ نہ ہوتا تھا۔

اور پھر دونوں‘ وکرم بھاٹیہ اس کا ریچھ ملازم‘ حصار کی طرف بھاگتے راستے میں ریچھ ملازم ایک جھاڑی میں گھس پڑا اور فوراً ہی چھوٹے سے اسلوٹ (بلی نما جانور) آدمی کو باہر گھسیٹ لایا۔اس کے منہ پر بھی خون لگا ہوا تھا اور اس کی ایک ٹانگ بھی زخمی تھی۔

اسلوٹ آدمی ریچھ ملازم کی گرفت سے چھوٹ کر پلٹ پڑا۔وکرم بھاٹیہ نے اسے بھی گولی ماردی۔

”آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔کیا مطلب ہے اس کا؟“ وکرم بھاٹیہ نے سر ہلایا کر گویا اپنے آپ سے کہا اور پھر برانڈی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وکرم بھاٹیہ برانڈی کا تیسرا جام بھی چڑھا چکا تو مجھے مناسب معلوم ہوا کہ اب اسے روک دوں۔کیوں کہ شراب اپنا اثر دکھانے لگی تھی اور میں نہیں جانتا تھا کہ وہ مدہوش پڑا رہے اور میں اکیلا پریشان ہوتا پھروں۔میں نے اس سے کہا کہ مارکوس ضرور کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔چنانچہ ہمیں جلد از جلد اس کی مدد کو پہنچنا چاہیے۔وکرم بھاٹیہ نے مخمور آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔پہلے تو وہ انکار کرتا رہا۔لیکن پھر اس نے میرا مشورہ مان لیا۔ہم نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور پھر ہم تینوں‘ میں وکرم بھاٹیہ اور اس کا ریچھ ملازم‘ مارکوس کی تلاش میں نکل پڑا۔

دوپہر گرم اور خاموش تھی۔ریچھ ملازم آگے آگے چل رہا تھا۔اس کی کمر میں عجیب طرح کا انسانی خم آ گیا تھا۔سر آگے کی طرف جھک گیا تھا اور وہ حیوانی پھرتی سے دائیں بائیں جھاڑیوں میں جھانکتا جاتا تھا۔وہ نہتا تھا وہ کلہاڑی جس سے وہ لکڑیاں چیرا کرتا تھا۔سور آدمیوں سے مقابلہ کرتے وقت کہیں گر گئی تھی۔اب اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔سوائے اس کے تیز نوکیلے دانتوں کے سور آدمیوں کا مقابلہ کرتے وقت بھی اس نے اپنے دانتوں ہی سے کام لیا تھا۔اس کے پیچھے وکرم بھاٹیہ اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے اور منہ لٹکائے چل رہا تھا۔وہ مجھ سے خفا تھا کہ میں نے اسے جی بھر کر شراب پینے نہ دی تھی۔حالاں کہ اتنی سی شراب بھی اپنا اثر دکھا رہی تھی اور وہ لڑکھڑا رہا تھا۔میرا دایاں ہاتھ گلے کی پٹی میں تھا اور دائیں ہاتھ میں پستول پکڑے تھا۔

ہم لوگ جزیرے کے شمال مغربی جنگل میں گھستے چلے گئے۔دفعتہً ملازم چلتے چلتے رک

گیا۔وکرم بھاٹیہ جو اپنی دھن میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔اس سے ٹکرا گیا۔

درختوں کے پیچھے سے قدموں کی چاپ اور بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں......وہ ہماری طرف ہی آ رہے تھے۔

”وہ مر گیا۔“ گونج دار لرزتی ہوئی آواز نے کہا۔

”ہاں۔ہم نے بھی دیکھا۔“ بہت سی آوازوں نے کہا۔

”ہم یہاں ہیں...... یہاں......“ وکرم بھاٹیہ نے چیخ کر کہا۔

”کیا کر رہے ہو یہ...... بے وقوف!“ میں نے وکرم بھاٹیہ کو پیچھے دھکیل کر کہا اور پستول کا گھوڑا چڑھا کر مستعد کھڑا ہو گیا۔

دفعتہً درختوں کے پیچھے خاموشی چھا گئی۔حیوان لوگ چلتے چلتے رک گئے تھے۔چند لمحوں بعد ٹہنیاں چٹخنے کی آواز آئی‘ لانبی لانبی جھاڑیوں اور بیلوں میں سرسراہٹ ہوئی اور کوئی نصف درجن چہرے ہماری طرف جھانکنے لگے اور عجیب چہرے تھے جو عجیب طرح دمک رہے تھے ریچھ ملازم آہستہ آہستہ غرانے لگا۔میں نے بندر آدمی اور ان دو بیل آدمیوں کو جو کشتی لے کر وکرم بھاٹیہ کو لینے جہاز تک آئے تھے۔پہچان لیا۔پھر وہ حیوان آدمی وہ تھے جن کی جلد پر بدنما داغ دھبے تھے اور ان کے بیچ میں بھورے بالوں والا قانون گو تھا۔جو وکرم بھاٹیہ اور ریچھ ملازم کے ساتھ حصار میں بھاگتا ہوا آیا تھا۔

لیکن خدا جانے کب وہ واپس جنگل میں چلا گیا اور اس دفعہ اسکے چہرے کے لمبے لمبے بھورے بالوں میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔پہلے کبھی ہم نے اس کی آنکھوں میں ایسی چمک نہ دیکھی تھی۔چند ثانیوں تک کوئی نہ بولا۔پھر وکرم بھاٹیہ نے ہچکی لے کر پوچھا۔

”کس نے کہا کہ وہ مر گیا؟“

بندر آدمی نے سوالیہ نظروں سے بھورے قانون گو کی طرف دیکھا۔

”وہ مر گیا۔“ قانون گو بولا۔”ان لوگوں نے دیکھا۔“

”اس طرف۔“ قانون گو نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”کیا اب بھی قانون باقی ہے؟“ بندر آدمی بولا۔”کیا اب بھی یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔باقی ہے؟“

”ہاں وہ مر گیا۔“ بیل آدمی بولا۔”کیا اب بھی قانون باقی ہے؟ اے چابک والے دوسرے آقا بتاؤ اب بھی قانون ہے......؟ وہ مر گیا وہ مر گیا۔“ قانون گو نے بڑے یقین سے کہا اور وہ سب کے سب عجیب نظروں سے ہمیں گھورنے لگے۔

”ابراہیم! وکرم بھاٹیہ نے میری طرف دیکھ کر کہا۔اس کی آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں وہ یقیناً وہ مر چکا ہے۔“

میں وکرم بھاٹیہ کے پیچھے کھڑا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ صورت حال کافی خطرناک ہو گئی ہے وکرم بھاٹیہ نشے میں ہونے کے باعث اس قابل نہیں تھا کہ صورت حال کو سمجھ سکتا چنانچہ میں چند قدم آگے بڑھ کر حیوان لوگوں کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اونچی آواز میں بولا۔”وہ مرا نہیں ہے۔“

ریچھ ملازم نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور میں اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈک کی لہر محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے ہمت کر کے کہا۔

”وہ مرا نہیں ہے لیکن اس نے اپنا جون بدل لیا ہے اور وہ ایک مقررہ مدت تک تمہاری نظروں سے اوجھل رہے گا۔ وہ وہاں ہے۔“ میں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ تمہیں دیکھ اور تمہاری باتیں سن سکتا ہے۔ بے شک تم اسے نہیں دیکھ سکتے لیکن وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ سرکشی نہ کرو۔ قانون پر عمل کرو اور اس سے ڈرو جو بناتا ہے اور بگاڑتا ہے۔“

میں نے گھور کر حیوان آدمیوں کی طرف دیکھا اور وہ گھبرا کر سمٹ سے گئے۔

”وہ بڑا ہے۔ وہ عظیم ہے۔“ بندر آدمی نے خوف زدہ نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور وہ دوسری چیز؟“ اس نے پوچھا۔ میری مراد تیندوے سے تھی۔

”دوسری چیز۔ جس پر پٹیاں بندھی تھیں۔ جن سے خون ٹپک رہا تھا اور جو روتی چیختی بھاگ رہی تھی وہ بھی مر گئی۔“ بھورے بالوں والا قانون گو بولا۔

”چلو یہ اچھا ہوا۔“ وکرم بھاٹیہ بڑبڑایا۔

لیکن دوسرے چابک والے آقا نے ابھی کہا تھا کہ......“ بھورا قانون گو بولا۔

”کیا کہا تھا؟“ میری گرفت پستول پر مضبوط ہو گئی۔

یہی کہ وہ مر چکا ہے۔ وکرم بھاٹیہ کا دماغ بالکل ہی ماؤف ہو گیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں حیوان لوگوں کو کیوں یقین دلا رہا ہوں کہ مارکوس مرا نہیں ہے۔

”وہ مرا نہیں۔“ وکرم بھاٹیہ بولا۔ ”بے شک وہ نہیں مرا۔ میں زندہ ہوں تو وہ بھی زندہ ہے۔“

چند آدمیوں نے قانون توڑا تھا۔ چنانچہ ان کا مرنا ضروری تھا۔ وہ چیز جس پر پٹیاں بندھی تھیں اسی لیے ماری گئی جو قانون توڑے گا اسی طرح مارا جائے گا اور اب ہمیں اس جگہ لے چلو جہاں اس کا وہ جسم پڑا ہے۔ جس کی اب اسے ضرورت نہیں۔ ہاں کہاں ہے۔ وہ جسم جسے وہ چھوڑ چکا ہے۔“ اس طرف ہے وہ جسم جس کی آقا کو ضرورت نہیں رہی۔“ بھورے بالوں والے قانون گو نے کہا۔

اور ان حیوان لوگوں کی رہبری میں ہم جنگل میں گھس پڑے۔ دفعتہً ایک چھوٹا سا زرد جان دار جھاڑیوں میں سے نکلا اور ہماری ٹانگوں سے ٹکراتا ہوا دوسری طرف بھاگا چلا گیا۔ اس کے پیچھے ہی ایک دوسرا وحشی جانور تھا۔ جسکے بدن پر بھورے بھورے داغ تھے۔ اس وحشی کو میں نے آج سے پہلے نہ دیکھا تھا۔ بھورا قانون گو گھبرا کر ایک طرف ہو گیا۔ ریچھ ملازم کو زمین پر ڈھیر کر دیا۔ وکرم بھاٹیہ نے جلدی سے گولی چلا دی۔ لیکن نشانہ خطا ہو گیا۔ وہ وحشی ہم پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ وکرم بھاٹیہ ایسا خوف زدہ ہوا کہ پستول پھینک کر فرار ہونے کے لیے پلٹا۔

میں نے پستول کی لبلبی دبا دی۔ گولی وحشی کے سر کو چھوتی ہوئی درخت کے تنے میں پیوست ہو گئی۔ میں نے فوراً ہی دوسری گولی چلائی۔ جو اس کے دونوں آنکھوں کے بیچ لگی اس کے بھیانک چہرے کے دو خال مسخ ہو گئے۔ لیکن وہ بڑا ہی سخت جان تھا۔ وہ مجھے دھکیلتا ہوا آگے بڑھا اور وکرم بھاٹیہ کو دبوچ کر

اوندھے منہ گرا۔ وکرم بھاٹیہ تڑپتے ہوئے وحشی کے بوجھ تلے کراہ رہا تھا۔

دوسرے حیوان لوگ فرار ہو چکے تھے اور وہاں میں ریچھ ملازم کے ساتھ اکیلا کھڑا رہ گیا تھا۔ وکرم بھاٹیہ وحشی کی بوجھل لاش کو اپنے پیر سے دھکیل کر اٹھا۔ اس واقعہ نے اس کا نشہ ہرن کر دیا تھا اور اس کے حواس خطا ہو رہے تھے۔ بھورے قانون گو ڈرتا جھاڑیوں میں سے نکلا۔

”دیکھو!“ میں نے مردہ وحشی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور جان لو کہ قانون باقی ہے۔ یہ ہے سزا قانون توڑنے والے کی۔“

بھورا قانون گو وحشی کی لاش کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر سر ہلا کر بولا۔

”وہی ہے۔ جو مارنے والی آگ اور کڑک بھیجتا ہے۔“

دوسرے حیوان لوگ بھی جھاڑیوں میں سے نکل آئے اور دور کھڑے ہو کر خوف زدہ نظروں سے وحشی کے بے جان جسم کو دیکھنے لگے۔ جب ان کے حواس ذرا ٹھکانے ہوئے تو میں نے ان کو جلد چلنے کو کہا۔ جہاں مارکوس کی لاش پڑی تھی۔

آخر کار ہم جزیرے کی شمالی مغربی حد تک پہنچ گئے اور چند قدم چلنے کے بعد ہی تیندوے کی لاش کے سامنے کھڑے تھے۔ اس سے چند قدم آگے وہ لاش پڑی تھی۔ جس کی ہمیں تلاش تھی۔ نرسلوں کے بیچ میں وہ اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ کلائی تک چبا ڈالا گیا تھا اور اس کے سفید بال خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ اس کی کھوپڑی زنجیر کی مار سے جگہ جگہ سے پچک گئی تھی۔ یہ اسی زنجیر کی مار کے نشان تھے۔ جس سے تیندوا بندھا ہوا تھا اور جسے توڑ کر وہ بھاگا تھا۔ نرسلوں اور گھاس پر خون کے دھبے تھے۔ وکرم بھاٹیہ نے جھک کر اس کی لاش سیدھی کی چہرے پر وہی کرختگی اور وہی رعب گویا منجمد ہو گیا تھا۔

اور ان چھ حیوان لوگوں کی مدد سے کیوں کہ مارکوس کی لاش خاصی وزنی تھی۔ ہم اس کو اٹھا کر حصار کی طرف لے چلے۔ اندھیرا آہستہ آہستہ اتر رہا تھا اور تارے ایک ایک کر کے روشن ہونے لگے تھے۔ راستے میں ہم نے کسی حیوان آدمی کی چیخیں سنیں۔ جیسے کوئی اسے بھنبھوڑ رہا ہو۔ ایک دفعہ ایک اسلوٹ جانور جھاڑیوں میں سے نکل کر ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا چند ثانیوں تک ہمیں ٹکر ٹکر دیکھتا رہا اور پھر جھاڑیوں میں گھس گیا۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ کسی نے ہم پر حملہ نہیں کیا۔

حصار کے دروازے کے سامنے مارکوس کی لاش رکھ کر حیوان لوگ چلے گئے۔ ریچھ ملازم بھی ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد میں اور وکرم بھاٹیہ مارکوس کی لاش کو حصار میں گھسیٹ لائے۔ دروازہ بند کر کے اندر سے تالا ڈال دیا اور پھر مارکوس کی لاش لکڑیوں کے انبار پر رکھ دی...... اس کام سے فرصت پانے کے بعد اس کی تجربہ گاہ میں گئے اور ہر وہ چیز تلف کر دی جو سانس لے رہی تھی۔

ان کاموں سے فرصت پانے کے بعد ہم نے ہاتھ منہ دھویا اور رات کا کھانا کھانے کے بعد کمرے میں آئے تو آدھی رات ہو چکی تھی ہم صورت حال پر غور کرنے لگے۔ وکرم بھاٹیہ کا نشہ تو اتر چکا تھا۔ لیکن اس کا دماغ شاید اب بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ کیوں کہ اس کے خیالات الجھے ہوئے تھے اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ شروع سے ہی مارکوس کے زیر اثر رہا تھا۔ اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ اگر مارکوس مر گیا تو

کیا ہوگا؟ بلکہ شاید اسے کبھی یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ مارکوس بھی مر سکتا ہے۔ چنانچہ اس حادثے نے اس کے دماغ کی بنیادیں ہلا دی تھیں اور وہ نہیں جانتا تھا کہ مارکوس کے بغیر کیا کرے۔ وہ کچھ عجیب طرح کی بے سمجھ بچے کی سی باتیں کر رہا تھا۔

''بے حد واہیات جگہ ہے یہ دنیا۔'' دفعتہً وہ جوش میں آکر بولا۔ ''الجھی ہوئی اور واہیات...... میری زندگی...... ہونہہ۔ میری کوئی زندگی رہی ہی نہیں۔ میں سوچا کرتا تھا کہ میری زندگی کا آغاز کب ہوگا۔ کچھ عجیب طرح کی زندگی گزری ہے۔ سولہ سال پہلے پروفیسر صاحبان اور نرسیں مجھ پر دھونس جماتی رہیں۔ پانچ سال میڈیکل کالج میں گزرے جہاں نہ اچھا کھانا ملتا تھا اور نہ اچھا کپڑا اور نہ کسی بات کی آزادی تھی۔ میں نے کبھی اچھا کھانا نہیں کھایا۔ کبھی اچھے کپڑے نہیں پہنے۔ کبھی کسی سے بات نہیں کی۔ لعنت ہے اور پھر اس جزیرے میں آ گیا اور دس سال سے یہاں ہوں۔ کس قدر بے کیف رہی ہے میری زندگی دانش! ہم صابن کے ان بلبلوں کی طرح ہیں جنہیں ایک بچہ اپنی دلچسپی کی خاطر پھونکنی کے ذریعہ فضا میں بکھیر دیتا ہے۔''

''ان فلسفیانہ باتوں کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا کر رکھو۔'' میں نے کہا۔ ''فی الحال ہمیں اس جزیرے سے نکلنے کی کوئی تدبیر سوچنی ہے۔ ورنہ ہماری قبریں یہیں بن جائیں گی۔''

''کیا فائدہ ہوگا۔ دانش ابراہیم! کم سے کم میں تو انسانی برادری سے خارج ہو ہی چکا ہوں۔ میں کہاں جا سکتا ہوں؟ اور کس طرح اپنی زندگی بسر کر سکتا ہوں؟ کوئی ذریعہ کوئی سہارا نہیں ابراہیم! مہذب دنیا تمہیں تو خوش آمدید کہہ سکتی ہے۔ مجھے نہیں۔ پھر ہم مارکوس کی لاش کو یوں ہی کیسے رہنے دے سکتے ہیں کہ حیوان لوگ اسے کھالیں۔ وہ میرا محسن و مربی تھا اور پھر حیوان لوگوں کا کیا ہوگا؟''

''خدا جانے کیا ہوگا؟ میرے خیال میں تو وہ حیوان آدمی جو درندے تھے۔ اپنی اصلیت پر آجائیں گے۔ لیکن ہم ان سب کو قتل تو نہیں کر سکتے۔ غالباً تم یہی کرنا چاہتے ہو کیوں؟ بہر حال وہ لوگ تبدیل ہو جائیں گے ان کی اصلیت ظاہر ہو جائے گی وہ پھر پہلے جیسے ہی خون خوار درندے ہوں گے۔ ایسا ہونا ضروری ہے۔ ایسا ہو کر رہے گا۔''

''اور وہ یوں ہی بکتا رہا۔ یہاں تک کہ میں غصے میں چیخ اٹھا۔

لعنت ہے۔ وہ بھی چیخا اور تم اندھے ہو رہے ہو شاید کہ اتنا بھی نہیں دیکھا کہ میں تم سے زیادہ پریشان ہوں اور تم ہو کہ الٹا مجھ پر غصہ اتار رہے ہو۔

پھر وہ اٹھ کر برانڈی کی بوتل لے آیا اور میرے سامنے بیٹھ کر جام پر جام چڑھانے لگا۔ میں بے بس اور مایوس بیٹھا اس کی یہ حماقت دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہونے لگیں اور وہ اول فول بکنے لگا۔ وہ حیوان لوگوں اور خصوصاً اپنے ریچھ ملازم کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا۔ اس نے کہا کہ ریچھ ملازم ہی وہ آدمی ہے۔ جو اس کا بہت زیادہ خیال رکھتا ہے۔ بلکہ اس سے محبت بھی کرتا ہے۔ ورنہ کسی کو اس کی پرواہ نہیں۔ خود غرض دنیا والے اسے بھلا چکے ہیں......'' اور پھر دفعتہً اسے خیال آیا۔

''لعنت ہے یار......'' وہ چلایا اور برانڈی کی بوتل کی گردن پکڑ کر اٹھا۔ اس کا ارادہ سمجھ کر میں کانپ گیا۔

''وکرم۔'' میں نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ ''لیکن تم اپنے اس جانور ملازم کو تو شراب پلانا نہیں چاہتے؟''

''جانور۔ کون جانور......؟'' وہ چیخا۔ ''تم خود جانور ہو۔ وہ تم سے زیادہ میرا خیال رکھتا ہے۔ وہ میرا دوست ہے۔ میرا ہمدم و مونس ہے اور یہ سراسر ناانصافی ہے کہ میں جو پیوں اسے نہ دوں۔''

''خدا کے لیے وکرم پاگل ہوئے ہو کیا؟''

''ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔'' وہ گرجا اور پستول نکال کر اس کی نالی میرے سینے پر رکھ دی۔

''بہت اچھا جو جی چاہے کرو۔ میں نے کہا اور دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ میں نے سوچا کہ جب وہ دروازے سے گزر رہا ہوگا سو اچانک اسے دبوچ لوں گا۔ لیکن پھر مجھے اپنے ٹوٹے ہاتھ کا خیال آیا اور میں ایسا کرنے سے باز رہا۔

''تم جانور بن چکے ہو۔ چنانچہ تمہارا حشر بھی ان حیوان لوگوں کے ساتھ ہوگا۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

اس نے دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ چاند کی مردہ سی روشنی اندر رینگ آئی رات خاموش تھی اور فضا گھٹی گھٹی سی۔ آسمان کی نیلاہٹوں میں چاند مردے کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ پہلے کبھی کوئی رات مجھے اتنی بھیانک نہ معلوم ہوئی تھی۔

''ابراہیم! تم اول درجے کے گدھے ہو۔ ہر وقت اپنے آپ کو الٹے سیدھے خیالات سے ڈرایا کرتے ہو۔ جو کچھ ہونا ہے۔ ہو کر رہے گا ہو سکتا ہے کہ آج کی رات ہماری آخری رات ہو۔ کیوں نہ آج جی بھر کر مزے اڑا لیے جائیں۔ آؤ! جشن مناؤ۔ کیا معلوم کل کیا ہو۔''

اور وہ باہر نکل کر پکارنے لگا۔

''میرے دوست کہاں ہو؟''

''تین سائے ساحل پر نمایاں ہوئے۔ ان میں سے ایک سفید کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ دوسرے دو اس کے پیچھے تھے۔ وہ وہیں کھڑے ہو کر میرے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر حصار کے کونے پر ایک خمیدہ سایہ نظر آیا۔ وہ ہماری طرف آ رہا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ریچھ ملازم تھا۔

''پیو۔'' وکرم بھاٹیہ چلایا! ''امرت پیو اور انسان بن جاؤ۔ ہاں یہ بات ہوئی میں مارکوس سے زیادہ ہوشیار ہوں۔ ان وحشیوں کو آدمی بنانے کی یہ ترکیب اس کے ذہن میں آئی ہی نہ تھی۔ آؤ...... پیو۔'' وہ ہاتھ میں بوتل لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ گیا ریچھ ملازم اس کے پیچھے تھا۔

میں چند قدم آگے بڑھ کر دیکھنے لگا۔ وکرم بھاٹیہ ان تین سایوں سے جو ساحل پر کھڑے تھے۔ چند قدم دور تھا۔ کہ اس نے اپنے ریچھ ملازم کو خالص برانڈی کا پہلا جام دیا۔ وہ تینوں سائے آگے بڑھے اور وکرم بھاٹیہ اور اس کا ملازم ان سایوں میں گڈمڈ ہو گئے۔ اب وہاں ایک بڑا سا دھبہ نظر آ رہا تھا۔

''گاؤ۔'' میں نے وکرم بھاٹیہ کی آواز سنی۔ ''سب مل کر کہو۔ لعنت ہے۔ دانش خشک ابراہیم پر ہاں یہ ٹھیک ہے۔ دانش خشک کہو۔''

اور وہ سیاہ دھبہ بکھر کر پانچ سایوں میں تقسیم ہوگیا اور اب وہ پانچوں سائے ریتیلے ساحل کی طرف چلے ان میں سے ہر ایک اپنی بھدی آواز میں مجھے صلواتیں سنا رہا تھا۔

پھر میں نے وکرم بھاٹیہ کی آواز سنی..... ''دائیں طرف۔'' اور وہ دائیں طرف مڑ کر درختوں کے لمبے لمبے سایوں میں مدغم ہوگئے۔ وہ ساحل کے جنگل میں گھس گئے تھے۔ ان کے چیخنے چلانے کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ آوازیں مدہم ہونے لگیں اور پھر غائب ہوگئیں۔

رات کا قدرتی سکون ان وحشیوں کی چیخوں سے درہم برہم ہوگیا تھا۔ دوبارہ مسلط ہوگیا۔ چاند ذرا سا مغرب کی طرف جھک گیا تھا اور پورے چاند کی رات تھی۔ وہ اور اس کی چاندنی میں سمندر کا پانی بھورا بھورا سا نظر آرہا تھا۔ پراسرار اور گمبھیر سمندر اور حصار کی دیوار کے سائے کے بیچ میں ریت پر پڑے ہوئے آتش فشانی سنگ ریزے ہیروں کی طرح چمک رہے تھے اور میرے کمرے میں لالٹین کی مریضانہ روشنی کمرے کو روشن کر رہی تھی۔

میں نے کمرے میں گھس کر دروازہ اندر سے مقفل کیا اور صحن میں آگیا۔ جہاں مارکوس کی لاش لکڑیوں کے انبار پر جانوروں کی لاشوں کے ساتھ پڑی ہوئی تھی۔ جن پر مارکوس تجربات کر رہا تھا۔ یعنی شکاری کتا اور چند دوسرے جانور۔ جن کا خاتمہ میں نے اور وکرم بھاٹیہ نے مارکوس کی موت کے بعد کر دیا تھا اور بڑا بھیانک منظر تھا۔ وہ..... مارکوس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں وہ اپنی بے نور آنکھوں سے جیسے زرد چاند کو گھور رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور اس کے سفید بالوں پر خون جم گیا تھا۔ میں ندی کے کنارے پر بیٹھ کر صورتحال پر غور کرنے لگا۔

اور میں نے سوچا صبح ہوتے ہی میں اشیائے خورد نوش کا کافی ذخیرہ ایک کشتی میں رکھ کر لکڑیوں کے اس انبار کو آگ لگا دوں گا۔ جس پر مارکوس اور جانوروں کی لاشیں پڑی تھیں اور پھر کشتی کو سمندر میں دھکیل کر تن تنہا چل پڑوں گا۔ وکرم بھاٹیہ یقیناً میرے ساتھ نہ آئے گا۔ ان حیوان لوگوں میں رہتے ہوئے وہ خود بھی نیم حیوان بن گیا تھا اور انسانوں میں' مہذب انسانوں میں رہنے کے قابل نہ تھا۔ خدا جانے میں کب تک وہیں بیٹھا اس جزیرے سے نکلنے کی تدبیروں پر غور کرتا رہا۔ کہ دفعتہً شور وغل کی آوازوں سے میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وکرم بھاٹیہ واپس آرہا تھا۔ یہ آوازیں ساحل کی طرف سے آرہی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے حیوان لوگ پاگل ہوگئے تھے۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے پھر کچھ ٹھوکنے اور لکڑیاں چیرنے کی آواز آئی۔ شور وغل اور بھی بڑھ گیا۔ لیکن میں نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ دفعتہً سب مل کر کوئی واہیات گیت گانے لگے۔

میں پھر اس جزیرے سے نکلنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ میں اٹھا اور لالٹین لے کر سائبان میں پہنچا جہاں بہت سے چھوٹے پیپے اور بکس وغیرہ رکھے تھے۔ یہ سائبان گودام کا کام دیتا تھا۔ ایک بکس کھول کر دیکھا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ بسکٹوں کے بکس تھے۔ یکا یک میرے پیچھے شعلہ سا روشن ہوگیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا صحن خالی پڑا ہوا تھا جسکے عین بیچ میں لکڑیوں کے انبار پر مارکوس اور جانوروں کی لاشیں جیسے ایک دوسرے کو انتقامانہ گرفت میں لیے پڑی تھیں پھر وہی شعلہ سا چمکا جو اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ کیا ہے۔

بہر حال یہ شعلہ یا جو کچھ بھی تھا وہ۔ کہیں باہر روشن تھا چنانچہ میں دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں اپنی ضرورت کی چیزیں الگ کر رہا تھا اور ایسا کرتے ہوئے مجھے کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ کیوں کہ میرا ایک ہاتھ بیکار تھا وقت تیزی سے گزرتا رہا اور آخر کار صبح کے آثار نظر آنے لگے۔

حیوان لوگوں کا وحشیانہ گیت ختم ہو چکا تھا اور اب ایک عجیب وغریب طرح کا شور وغل سنائی دے رہا تھا۔ وہ پھر گیت گانے لگے..... چند ثانیوں بعد ہی یہ گیت بھی شور وغل میں تبدیل ہوگیا اور میں نے وکرم بھاٹیہ کی آواز سنی۔

''ہاں...... اور...... اور......'' پھر جیسے وہ کسی سے جھگڑنے لگا پھر ایک چیخ سنائی دی اور اب وہ سب کے سب غصہ اور خوف سے چلانے لگے...... دفعتہً پستول چلنے کی آواز آئی۔

میں اپنے کمرے کی طرف بھاگا اور جب میں صحن میں سے گزر رہا تھا تو سائبان میں رکھے ہوئے کئی پیپے اور بکس خود بہ خود لڑھک گئے۔ لیکن میں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ کیا ہوا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور ساحل کی طرف دیکھنے لگا۔

ساحل پر کشتی گھر کے قریب الاؤ سا جل رہا تھا اور اسکے گرد چند دھندلی دھندلی سی شبیہیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ دفعتہً میں نے وکرم بھاٹیہ کی آواز سنی وہ انتہائی خوف زدہ آواز میں مجھے پکار رہا تھا۔ میں نے جلدی سے پستول لیا اور الاؤ کی طرف بھاگا۔ میں نے پھر دھماکہ سنا اور دیکھا کہ وکرم بھاٹیہ کی پستول کی نالی سے نکلی ہوئی آتشیں زبان دور تک زمین کو چاٹتی چلی گئی۔ چنانچہ ظاہر ہوا کہ وہ زمین پر گر پڑا تھا یا گرا دیا گیا تھا۔ میں اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر چیخا اور ہوا میں دو تین فائر کر دیے۔

جب میرے پستول کی گونج فضا میں تحلیل ہوگئی تو میں نے کسی کو چیختے سنا۔ آقا...... آقا...... اور ساتھ ہی ایک پر ایک پڑی ہوئی شبیہیں گھبرا کر الگ ہوگئیں۔ الاؤ کی آگ ایک دم بھڑک کر بجھ گئی اور ان گنت چنگاریاں جگنوؤں کی طرح فضا میں بکھر گئیں حیوان لوگ انتہائی بدحواسی کے عالم میں بھاگے اور میں بھگوڑوں پہ اندھا دھند گولیاں چلانے لگا۔ وہ بھاگ کر ساحل کے جنگل میں گھس گئے اور اب میں ساحل پر پڑے ہوئے کالے ڈھیر کے قریب پہنچا۔

وکرم بھاٹیہ ریت پر چت پڑا ہوا تھا اور اس کے سینے پر بھورے بال والا دیوہیکل قانون گو جرچھا پڑا ہوا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ لیکن اب تک اس کے دونوں پنجے وکرم بھاٹیہ کے حلق میں پیوست تھے۔ قریب ہی وکرم بھاٹیہ کا ریچھ ملازم اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کی گردن ادھڑی ہوئی تھی اور برانڈی کی بوتل کی ٹوٹی ہوئی گردن اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ دو دوسرے حیوان آدمی الاؤ کے قریب پڑے تھے۔ ایک مر چکا تھا اور دوسرا جس کے جسم کا نچلا حصہ الاؤ میں پڑا تھا۔ بری طرح کراہ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنا سر زمین پر پٹختا۔ اپنی ٹانگیں الاؤ کے دہکتے ہوئے انگاروں پر سے کھینچنے کی کوشش کرتا اور پھر بے دم ہو کر کراہنے لگتا۔

میں نے بھورے قانون گو کی لاش وکرم بھاٹیہ پر لڑھکا دی۔ وکرم بھاٹیہ کا چہرہ سیاہ ہو رہا تھا اور وہ بڑی مشکل سے سانس لے سکتا تھا۔ میں دوڑ کر سمندر سے چلو میں پانی بھر لایا اور وکرم بھاٹیہ کے منہ پر چھینٹے دینے لگا اور اپنے کوٹ کو تکیہ سا بنا کر اس کے سر کے نیچے رکھ دیا وہ حیوان آدمی جو آدھا انگاروں پر پڑا

تھا۔ بھیڑیا آدمی تھا۔ جو لرزا دینے والے انداز میں کراہ رہا تھا اور سر اور ہاتھ پٹخ رہا تھا۔ میں اس کی تکلیف نہ دیکھ سکا اور پستول کی گولی اس کی کھوپڑی میں پیوست کردی۔ وہ تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔ دوسرا حیوان آدمی جو الاؤ کے قریب مردہ پڑا تھا۔ بیل آدمی تھا۔ وکرم بھاٹیہ کا ریچھ ملازم بھی مر چکا تھا اور خود وکرم بھاٹیہ کی بھی آخری سانسیں تھیں۔

دوسرے حیوان لوگ جنگل میں گھس کر میری نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے اور میں وکرم بھاٹیہ کے قریب بیٹھا اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔

الاؤ سرد ہوتا جا رہا تھا۔ لکڑیاں انگاروں میں اور انگارے راکھ میں تبدیل ہو رہے تھے۔ خدا جانے ان لوگوں کو اتنی بہت سی خشک لکڑیاں کہاں سے مل گئیں تھیں!

صبح کی روشنی پھیلنے لگی تھی اور تارے یکے بعد دیگرے غائب ہوتے جا رہے تھے مشرقی افق سے روشنی اتر رہی تھی اور مغربی افق کی طرف جھکا ہوا چاند پھیکا پڑ گیا تھا۔ کتنی بھیانک صبح تھی وہ!

یکا یک مجھے اپنی پشت کی طرف سے ہلکا سا دھماکا اور ساتھ ہی "شوں" کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور میرے منہ سے بے اختیار خوف و مایوسی کی چیخ نکل گئی۔ سفید ہوتے ہوئے افق کے پس منظر میں کالے کالے دھوئیں کے ستون سے حصار سے بلند ہو رہے تھے اور دھوئیں کے ان ستونوں میں سرخ سرخ شعلے زبانیں لپکا رہے تھے۔ حصار جل رہا تھا۔ دفعتہً مارکوس کی تجربہ گاہ کی چھت جل اٹھی اور پھر میرے کمرے کی کھڑکی سے شعلوں کا ترچھا فوارہ سا پھوٹ پڑا۔ پورا حصار جل رہا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ میں نے سوچا اور دماغ پر ذرا سا ہی زور ڈالنے سے مجھے ان سوالوں کے جواب مل گئے اور مجھے یاد آیا کہ جب میں پستول کا دھماکا سننے کے بعد اپنے کمرے کی طرف بھاگا تھا تو صحن عبور کرتے وقت میں نے اپنے پیچھے پیپوں کے گرنے کی آواز سنی تھی۔ اب معاملہ صاف تھا۔ وکرم بھاٹیہ کی مدد کو جاتے وقت افراتفری میں مجھ سے لالٹین گر گئی تھی۔

اب یہاں سے نکلنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ میں نے سوچا۔ بسکٹوں کے بکس اور ضرورت کی وہ سب چیزیں جو میں نے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے الگ کی تھیں۔ نذر آتش ہو چکی تھیں۔ لیکن بہر کیف مجھے اس لعنتی جزیرے سے نکلنا تھا۔ میں نے پرامید نظروں سے اس طرف دیکھا جہاں کشتیاں رکھی رہتی تھیں اور جسے ہم "کشتی گھر" کہتے تھے۔ کشتیاں غائب تھیں۔ میرے قریب ہی دو کلہاڑیاں پڑی تھیں اور الاؤ کے اردگرد خشک لکڑی کے ٹکڑے پڑے تھے۔ وکرم بھاٹیہ نے کشتیاں چروا کر الاؤ سلگایا تھا۔

مارے غصے اور مایوسی کے میں پاگل ہو گیا تھا اور میرا جی چاہا کہ اس مرتے ہوئے آدمی کی کھوپڑی پھاڑ دوں اور اس کے بھیجے کو جس میں اتنے احمقانہ خیالات پلتے تھے۔ نکال کر الاؤ میں جلا ڈالوں۔ عین اسی وقت وکرم اپنا ہاتھ ہلا کر اس طرح کراہا کہ میرا غصہ فوراً ہی اتر گیا۔ اس نے ایک منٹ کے لیے آنکھیں کھول دیں۔

میں نے اس کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا۔ اس نے پھر اپنی آنکھیں کھولیں چند ثانیوں تک آسمان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر میری طرف دیکھ کر فوراً ہی نظریں جھکالیں۔

"مجھے معاف کر دینا دوست۔" اس نے کہا۔ شاید اسے بولنے میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ آہ......یہ......دنیا......یہ......لعنتی......"

اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس وقت پانی کے چند قطرے اس کے حلق میں ٹپکا سکتا تو شاید وہ بچ جاتا۔ لیکن وہاں نہ پانی تھا اور نہ کوئی برتن کہ میں چشمے سے پانی بھر لاتا۔ وکرم بھاٹیہ کا بدن بھاری ہوگیا اور میرے دل میں مایوسیاں اترتی چلی گئیں۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا وہ بے نور تھیں۔ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا اس کا دل خاموش تھا۔ وکرم بھاٹیہ مر چکا تھا۔ افق مشرق سے سرخ سرخ اس شیطانی جزیرے کی بھیانک صبح طلوع ہو رہی تھی۔

میں وکرم بھاٹیہ کے سر کو تکیے پر رکھ کر اٹھا۔ میرے سامنے تاحد نظر ویران سمندر پھیلا ہوا تھا اور میرے پیچھے جزیرہ تھا۔ شیطانوں کی بستی اور ہرے بھرے جنگل جو حیوان لوگوں کو اپنی آغوش میں لیے تھے۔ حیوان لوگ...... جو اس وقت بھی کہیں قریب ہی چھپے مجھے دیکھ رہے ہوں گے اور دائیں طرف حصار جل رہا تھا۔ دھوئیں کے ستون اوپر پہنچ کر پھیل رہے تھے اور دھوئیں کی راکھ اور پانچ لاشیں پڑی تھیں اور ایک لاش سے جس کا نچلا حصہ الاؤ کے انگاروں پر پڑا تھا' گوشت کے جلنے کی بو اٹھ رہی تھی۔

اور میں اس شیطانی جزیرے میں اکیلا تھا۔

اور تھوڑی دیر بعد سامنے کی جھاڑیوں میں سے تین حیوان آدمی نکل کر خمیدہ پشت اور ٹیڑھی ٹانگیں ان کے سر کندھوں میں دھنسے ہوئے تھے اور آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ اپنے بے ڈھنگے پیر ہلاتے ہچکچاتے، ڈرتے......میری طرف بڑھے۔

میں ان حیوان لوگوں کی طرف منہ کر کے کھڑا ہوگیا۔ آج اور اسی وقت میری قسمت کا فیصلہ ہو جانے والا تھا۔ میرا ایک ہاتھ فی الحال بے کار ہو چکا تھا اور میں ان حیوان لوگوں کے جزیرے میں اکیلا تھا۔ میری جیب میں پستول تھا۔ جس میں سے دو تین گولیاں صرف ہو چکی تھیں۔ حصار جل رہا تھا اور اس میں رکھا ہوا گولا بارود بھی جل چکا تھا۔ ساحل پر وہ دو کلہاڑیاں پڑی تھیں۔ جن سے کشتیاں چیری گئیں تھیں۔

ہمت......پتھر کو پانی کر دینے والی ہمت کی ضرورت تھی۔ میں نے گھور کر ان حیوان آدمیوں کی طرف دیکھا جو میری طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور وہ اپنی تھوتھنیاں اوپر اٹھا کر ہوا میں خدا جانے کیا سونگھنے لگتے تھے۔ میں دوڑ کر بھیڑیے آدمی کی لاش کے قریب پہنچا اور اس کے نیچے دبا ہوا وکرم بھاٹیہ کا چابک گھسیٹ لیا۔ چابک سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے "سٹاں" سے ہوا میں چابک بجایا تو وہ تینوں حیوان آدمی رک کر میری طرف دیکھنے لگے۔

"سلام کرو۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "جھک جاؤ۔" وہ ہچکچانے لگے۔ ان میں سے ایک ذرا سا جھکا۔

"جھک جاؤ۔" میں نے پھر کڑک کر کہا اور چند قدم ان کی طرف بڑھا۔ حالاں کہ دل کا خدا ہی حافظ تھا۔ لیکن میں ان کے سامنے کم ہمتی کا مظاہرہ کر کے خود اپنی موت کو دعوت دینا نہیں چاہتا تھا۔ پہلے

ایک، پھر دوسرا اور پھر تیسرا میرے سامنے جھک گیا۔

میں ان کی طرف منہ کیے۔ الٹے قدموں چلتا ہوا لاشوں کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"ان لوگوں نے قانون توڑا تھا۔ میں نے بھورے بالوں والے آدمی قانون گو کی لاش پر اپنا ایک پاؤں رکھ کر کہا اور دیکھو یہ مارے گئے حتیٰ کہ قانون گو بھی اور تمہارا دوسرا چابک والا آقا بھی...... آؤ...... اور عبرت پکڑو۔"

"کوئی نہیں بچ سکتا۔" ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر قانون گو کی لاش کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں کوئی نہیں بچ سکتا۔" میں نے کہا۔ "چنانچہ میری بات سنو اور میرا حکم مانو۔"

وہ سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"وہیں کھڑے رہو۔" میں گرجا۔

اور میں نے دونوں کلہاڑیوں اٹھا کر اپنی بغل پٹی سے لٹکا لیں۔ پھر وکرم بھاٹیہ کے ہاتھ سے پستول چھڑا کر اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس میں چند گولیاں ابھی باقی تھیں اور جب میں نے وکرم بھاٹیہ کی جیبوں کی تلاشی لی تو خوش قسمتی سے چھ کارتوس مل گئے۔

"اٹھاؤ اسے۔" میں نے چابک سے وکرم کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ "اور سمندر میں ڈال دو۔"

وہ لرزتے کانپتے آگے بڑھے وہ اب بھی وکرم سے ڈر رہے تھے۔ لیکن اس سے زیادہ میرے خون آلود چابک سے سہم رہے تھے۔ چنانچہ ان کی طرف سے تھوڑی ہچکچاہٹ اور میری طرف سے غصہ کے مظاہرے کے بعد وکرم بھاٹیہ کی لاش اٹھا کر سمندر میں اتر گئے۔

"آگے...... اور آگے۔" میں نے چابک لہرا کر کہا۔

وہ آگے بڑھے...... اور آگے...... یہاں تک کہ پانی ان کی بغلوں تک آ گیا اور وہاں پہنچ کر وہ میری طرف دیکھنے لگے۔

"بس ڈال دو۔" میں نے حکم دیا۔

اور دوسرے لمحے وکرم بھاٹیہ کی لاش زیر آب تھی۔ میرے حلق میں پھندے سے پڑ گئے اور آنسو پلکوں میں اٹک کر رہ گئے۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے گلوگیر آواز میں کہا اور وہ لوگ اس سگ گزیدہ کی طرح جسے پانی میں پھینک دیا گیا ہو۔ تیزی سے باہر نکل آئے۔ کنارے پر آ کر وہ خوف زدہ نظروں سے اس طرف دیکھنے لگے۔ جہاں وکرم بھاٹیہ کی لاش پھینکی گئی تھی۔ گویا انہیں خوف تھا کہ وہ ابھی سمندر میں سے نکل کر انہیں اس بے ادبی کی سزا دے گا۔

اور دوسری لاشیں بھی سمندر میں پھینک دی گئیں۔ لیکن وہ ان لاشوں کو پھینکنے کے لیے اس جگہ نہ گئے جہاں وکرم بھاٹیہ کی لاش پھینکی گئی تھی۔ ان چار لاشوں کو وہ اس جگہ سے کوئی تیس گز دور مشرق کی طرف پھینک آئے۔

اور جب وہ وکرم بھاٹیہ کے ریچھ ملازم کی لاش پھینکنے جا رہے تھے تو میں نے اپنے پیچھے پیروں کی

چاپ سنی۔ مڑ کر دیکھا تو لکڑ بگھا آدمی مجھ سے کوئی بارہ گز دور کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اوپر کا ہونٹ دانتوں میں کھینچ گیا تھا اور دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔

میں نے فوراً چابک پھینک کر پستول نکال لیا۔ میں اسے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ میں اس کی طرف سے مطمئن نہ تھا اور اب پورے جزیرے میں وہی ایک خطرناک آدمی رہ گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جب تک یہ زندہ ہے میں کوئی کام سکون سے نہیں کر سکوں گا۔ لیکن کوئی بہانہ تلاش کیے بغیر میں اسے مار بھی نہ سکتا تھا۔

"جھک جاؤ۔" میں نے کڑک کر کہا۔

اس کا اوپری ہونٹ کھینچ گیا۔ اس کے خون خوار دانت نظر آنے لگے۔ وہ غرا کر بولا۔ "کون ہوتے ہو تم...... میں......"

میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے جلدی سے پستول اٹھا کر لبلبی دبا دی۔ لکڑ بھگا آدمی چیخ کر ساحل پر ٹیڑھا ترچھا بھاگا۔ میرا نشانہ خطا کر گیا تھا۔ میں نے پھر گھوڑا چڑھایا۔ اس عرصہ میں وہ بھاگتا ہوا مجھ سے کافی دور چلا گیا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا دوسرا نشانہ بھی خالی جائے۔ کیوں کہ میرے پاس کارتوس بہت کم رہ گئے تھے۔ وہ بھاگتے وقت بار بار گردن موڑ کر میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ وہ جلدی ہی دھوئیں میں گھس کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دھواں اٹھ اٹھ کر ساحل پر پھیل رہا تھا۔

میں چند ثانیوں تک کھڑا اس دھوئیں کو دیکھتا رہا۔ جس نے میرے جانی دشمن کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ پھر مڑ کر اپنے فرمانبردار تین حیوان آدمیوں کو دیکھا اور ریچھ ملازم کی لاش پھینک دینے کا اشارہ کیا۔ پھر اس جگہ پہنچ کر جہاں لاشیں پڑی تھیں۔ خون کے دھبوں پر ریت ڈال دی۔

میں نے ہاتھ ہلا کر ان تین حیوان آدمیوں کو رخصت کر دیا اور جھاڑیوں میں گھس گیا کہ اطمینان وسکون سے صورتحال پر غور کر سکوں۔

سب سے پہلے جس خطرناک حقیقت کا احساس ہوا وہ یہ تھی کہ اب پورے جزیرے میں ایک بھی ایسی جگہ نہ تھی جہاں میں آرام کر سکتا اور رات کو سو سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جزیرے میں آنے کے بعد میری جسمانی قوت عود کر آئی تھی اور حالات نے مجھے دلیر بھی بنا دیا تھا۔ لیکن نازک حالات اور اپنی استعداد سے زیادہ کام کے بوجھ مجھے اعصابی ہیجان میں مبتلا کر سکتا تھا۔

چنانچہ اسکے علاوہ کوئی صورت نہ تھی کہ میں اس کہانے میں جاؤں۔ جہاں حیوان لوگوں کے بھٹ تھے اور انہیں اپنا دوست بنا کر انکے ساتھ رہنے لگوں۔ لیکن کوئی غیبی آواز مجھے ایسا کرنے سے منع کر رہی تھی۔ حیوان لوگوں کی طرف سے میں مطمئن نہ تھا۔ چنانچہ میں جھاڑیوں سے نکل کر ساحل پر چل پڑا اور جلتے ہوئے حصار کے عقب میں پہنچ کر اس چٹان کی طرف ہو لیا جو سمندر میں دور تک چلی گئی تھی۔ اس چٹان پر بیٹھ گیا اور گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹیک کر سوچنے لگا کہ کسی مدد کے آنے تک میرے زندہ رہنے کی کیا صورت ہو گی۔ لیکن کوئی صورت نظر نہ آئی۔ میں الجھ گیا۔

اور مجھے وکرم بھاٹیہ کے الفاظ یاد آ گئے۔ یہ حیوان آدمی پھر اپنی اصلیت پر آ جائیں گے۔ وہ پھر تبدیل ہو جائیں گے۔ وہ پھر پہلے جیسے ہی خونخوار درندے ہوں گے۔ ایسا ہونا ضروری ہے اور مارکوس نے کیا

کہا تھا۔یہی کہ وہ ان کی ظاہری شکل وصورت تو بدل سکا ہے مگر ان کی جبلتیں نہیں بدل سکیں اور مجھے لکڑ بھگا آدمی یاد آ گیا۔اگر میں نے اس کا خاتمہ نہ کر دیا تو وہ خود موقع ملتے ہی میرا خاتمہ کر دے گا۔قانون گو مر چکا تھا اور یہ واقعی برا ہوا تھا۔اس کے علاوہ حیوان لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ "چابک والے" بھی مر سکتے ہیں انہیں مارا جا سکتا ہے اور یہ اور بھی برا ہوا تھا۔

کیا وہ سامنے کی جھاڑیوں میں منتظر بیٹھے تھے کہ میں وہاں سے گزروں تو وہ اچانک مجھ پر جھپٹ پڑیں؟ کیا وہ میرے خلاف کوئی سازش کر رہے تھے اس وقت۔کیا لکڑ بھگا آدمی انہیں میرے خلاف اکسا رہا تھا اور ان سوالوں کے جواب میں ایک طرح کا شدید خوف میرے دل میں اترتا چلا گیا اور تصور میری موت کو نت نئے روپ میں مجھے دکھانے لگا۔کبھی تو میں دیکھتا کہ لکڑ بھگا آدمی میرے حلق میں اپنے خونخوار دانت کھبوئے غرا رہا ہے۔ پھر دیکھا کہ حیوان آدمی میری لاش کو جنگل میں گھسیٹتے پھر رہے ہیں۔اور......اور......اور۔"

آبی پرندوں کی چیخیں سن کر میں چونکا۔وہ ساحل پر پڑی ہوئی کسی چیز پر لڑ جھگڑ رہے تھے۔اس چیز کو سمندر کی موجوں نے ساحل پر لا پھینکا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ کیا چیز تھی۔یقیناً وکرم بھاٹیہ کی لاش تھی۔لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہاں جا کر پرندوں کو بھگا دیتا۔

لیکن میں عبرت ناک منظر دیکھ بھی تو نہ سکتا تھا۔چناں چہ میں سمت مخالف میں چل پڑا اور ساحل پر چلتا ہوا اچانک اس کہنائے کے سامنے پہنچ گیا۔جس میں حیوان لوگوں کے بھٹ تھے۔یہی خلاف توقع بات ہوئی تھی۔میں نہیں جانتا تھا کہ جنگل میں سے گزرے بغیر ساحل پر چل کر بھی اس کہنائے کے سامنے پہنچا جا سکتا تھا۔جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں یہ خلاف توقع بات ہوئی تھی۔چنانچہ میں دم بخود رہ گیا اور یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ قسمت مجھے کشاں کشاں موت کے سامنے لے آئی ہے۔

ساحل کے انتہائی سرے پر کوئی نصف میل دور جھاڑیوں اور تاڑ کے درختوں کا جنگل تھا۔اس جنگل میں سے ایک حیوان آدمی نکل کر میری طرف آیا۔میں نے اسے پہچان لیا۔وہ ان تینوں آدمیوں میں سے ایک تھا۔جنہوں نے وکرم بھاٹیہ اور حیوان آدمیوں کی لاشیں سمندر میں پھینکی تھیں۔بے شک وہ فرماں بردار تھا۔لیکن خوف وہراس نے مجھے ایسا دیوانہ بنا دیا تھا کہ میں کسی پر بھروسہ نہ کر سکتا تھا اور صحیح معنوں میں اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگا تھا۔چناں چہ میں نے فوراً اپنا پستول نکال لیا اور اس حیوان آدمی کے دوستانہ اشارے سمجھنے کے بعد بھی میں نے اپنا پستول والا ہاتھ نہ جھکایا وہ رک کر چند ثانیوں تک مجھے دیکھتا رہا اور پھر ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا۔

"چلے جاؤ۔" میں چلایا۔

اس حیوان آدمی کا خوشامدانہ انداز کتے سے ملتا جلتا تھا اور جب میں نے اسے چلے جانے کا حکم دیا تو وہ اس کتے کی طرح پیچھے ہٹا جسے اس کا مالک ڈرا دھمکا کر راستے سے واپس گھر بھیج رہا ہو۔وہ چند قدم پیچھے ہٹ کر مجھے دیکھنے لگا۔

"چلے جاؤ۔" میں دیوانوں کی طرح چلایا۔"میرے قریب آنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"نہ آؤں؟" اس نے خوشامد سے پوچھا۔

"نہیں۔جاؤ۔" میں نے ہوا میں چابک بجایا۔

لیکن وہ وہیں کھڑا رہا۔میں چابک اپنے دانتوں میں دبا کر جھکا اور میں نے ایک پتھر اٹھا لیا اور اس طرح حیوان آدمی کو لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔وہ جیسے بادل نخواستہ جنگل کی طرف چلا گیا۔

اب میں نرسلوں اور بید کے جنگل میں گھس کر بیٹھ گیا۔جو کہنائے اور ساحل کو ایک دوسرے سے الگ کرتا تھا۔میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وکرم بھاٹیہ اور مارکوس کی موت اور دارالعقوبت کی بربادی کا اثر حیوان لوگوں پر کیسا ہوتا ہے اور اس جنگل میں چھپ کر میں یہ بات بڑی آسانی سے معلوم کر سکتا تھا۔کیوں کہ یہ جگہ کہنائے اور ساحل کے بیچ میں تھی اور اب مجھے بزدلانہ غلطی کا احساس ہوا۔اگر میں گھبرا نہ گیا ہوتا تو مارکوس کی موت کے فوراً بعد یعنی سورج طلوع ہونے سے پہلے اس کا جان نشین بن جاتا اور مزے سے مارکوس کی طرح ہی ان حیوان لوگوں پر حکومت کرتا۔لیکن برا ہوا اس گھبراہٹ کا کہ ایسا کرنے کا مجھے کوئی خیال ہی نہ آیا اور اب وقت نکل چکا تھا۔اب کچھ نہ ہو سکتا تھا۔حصار اور اس کے ساتھ مارکوس کی لاش بھی جل چکی تھی اور حیوان لوگ غالباً میری کمزوری سے واقف ہو چکے تھے۔وہ مجھ سے بہت ممکن ہے ڈرتے ہوں۔لیکن اتنا نہیں جتنا کہ مارکوس اور وکرم بھاٹیہ سے ڈرتے تھے۔

دوپہر کے قریب چند حیوان لوگ آئے اور ساحل پر دھوپ میں بیٹھ گئے۔میں نرسلوں اور بید کے جنگل میں چھپا انہیں دیکھتا رہا۔یہاں تک کہ بھوک اور پیاس کی شدت میرے خوف پر غالب آ گئی اور میں پستول سنبھال کر جنگل سے نکل کر ان حیوان لوگوں کی طرف بڑھا پہلے ایک نے جو بھیڑیا عورت تھی۔میری طرف دیکھا۔پھر وہ سب میری طرف دیکھنے لگے۔کسی نے اٹھ کر مجھے سلام نہ کیا اور میں نے بھی ان پر رعب جمانے کی کوشش نہ کی۔کیوں کہ بھوک اور پیاس نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔یا یوں کہیے کہ بھوک اور پیاس نے مجھے مسکین اور بزدل بنا دیا تھا۔

"مجھے کھانا چاہیے۔" میں نے مسکینوں سے لہجے میں کہا۔"کھانا یہاں کہاں! جھونپڑی میں ہے۔" اس حیوان آدمی نے حقارت سے کہا جو سانڈھ اور ریچھ کا مجموعہ تھا۔

میں ان کے قریب سے ہٹ کر ویران کہنائے میں گھس گیا۔ایک خالی سے بھٹ میں مجھے تھوڑے سے پھل مل گئے۔میں قبل از تاریخ کے وحشیوں کی طرح انہیں کھانے لگا۔بھوک کی بے چینی ختم ہوئی تو خشک ٹہنیوں اور پتوں سے بھٹ کا دروازہ بند کر کے ستانے کے لیے لیٹ گیا۔میرا منہ دروازے کی طرف تھا اور ہاتھ میں پستول پکڑا ہوا تھا۔میرے پپوٹے بوجھل ہو کر خود بہ خود بند ہونے لگے۔

میں سونا نہ چاہتا تھا۔لیکن آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔چنانچہ میں نے یہ سوچ کر آنکھیں بند کر لیں کہ اگر کسی نے بھٹ میں گھسنے کی کوشش کی تو ان خشک ٹہنیوں اور پتوں جن سے میں نے دروازہ بند کیا تھا۔کھڑکھڑاہٹ سے میری آنکھ کھل جائے گی اور میں بہت جلد میٹھی نیند سو گیا۔

نیند ایک مہربان ماں جو زندگی کی تمام مشکلات کو اپنے دامن میں سمیٹ کر سکون کی وادیوں میں پہنچا دیتی ہے۔یہ ہی میٹھی نیند میرے دل ودماغ کو پرسکون کرتی رہی اور پھر جب بیدار ہوا تو بھٹ میں گھپ اندھیرا

تھا اور میرے اس ہاتھ میں جس کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی ٹیسیس اٹھ رہی تھیں۔ میں کراہ کر اٹھ بیٹھا۔ بھٹ کے باہر کوئی پھٹی پھٹی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بھٹ کے دروازے پر میں نے جو خشک ٹہنیوں اور پتوں کی باڑ لگائی تھی وہ غائب تھی۔ لیکن میرا پستول بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔

حقیقتاً بڑی ہی گہری نیند آئی تھی۔ پھر اچانک ہی مجھے اپنے بالکل ہی قریب کسی کی سانس سنائی دی اور میں گھبرا گیا۔ نہ جانے کون ہے۔ جو میرے قریب ہی لیٹا ہوا ہے سب سے پہلی کوشش میں نے یہ ہی کی تھی کہ اپنے قریب لیٹے ہوئے وجود سے تھوڑا سا فاصلہ اختیار کرلوں۔ میں نے انتہائی آہستگی سے اپنے جسم کو سمیٹا۔ اچانک کوئی لچکیلی گرم اور گیلی چیز میرے ہاتھ کی پشت پر رینگنے لگی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی لمبی لپلپاتی زبان میرا ہاتھ چاٹ رہی ہو۔ میرے پورے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور پستول کا رخ اندھیرے میں بیٹھی ہوئی اس مخلوق کی طرف کر کے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں آقا۔" جواب ملا۔

"کیا ہے؟"

"وہ سب کہتے ہیں کہ اب کوئی آقا نہیں رہا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آقا ہے۔ ایک آقا ہے۔ کیوں کہ میں ان کی لاشوں کو سمندر میں پھینک آیا تھا۔ جنہیں آپ نے مارا تھا۔ اے سمندر میں چلنے والے آقا۔ میں آپ کا غلام ہوں۔"

"تو تم وہی ہو جس سے میں ساحل پر ملا تھا۔"

"ہاں وہی ہوں آقا۔ آپ نے مجھے چلنے کا حکم دیا تھا۔" ایک لمحے کے لیے سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ یہ حیوان جیسا آدمی یقیناً وفادار ہے۔ اگر نہ ہوتا تو سوتے ہوئے یہ آسانی سے میری فاتحہ کر سکتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ جسے وہ چاٹنے لگا۔ اس خوف اور مایوسی کے عالم میں اس وفادار حیوان کا ساتھ میرے لیے غنیمت تھا۔

"دوسرے کہاں ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"وہ سب بے وقوف ہیں۔ آقا پاگل ہو گئے ہیں اس وقت بھی وہ وہاں کھڑے آپس میں صلح مشورے کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آقا مر گیا۔ دوسرا چابک والا مر گیا اور تیسرا جو سمندر میں چلتا ہے۔ ہماری طرح ہی ہے۔ اب ہمارا کوئی آقا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہ چابک والے رہے اور نہ عذاب کا گھر۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ پھر ہم قانون پر عمل کریں گے۔ میں جانتا ہوں آقا...... میں سب کچھ جانتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"آپ ایسا کیجئے آقا سب کو فوراً مار ڈالیے۔"

"ہاں میں ایسا ہی کروں گا لیکن ابھی نہیں۔ اس کے علاوہ بس اسی کی جان بخشی جائے گی۔ جن کی تم

سفارش کرو گے۔"

"آقا کی مرضی میری مرضی ہے۔ جسے آقا چاہیں مار ڈالیں۔"

"نہیں ابھی انہیں زندہ رہنے دو۔ تاکہ وہ جی بھر کر گناہ کرلیں اور پھر ہم انہیں سخت سے سخت سزا دیں۔ ابھی ان سے کچھ کہنا بھی مناسب نہیں۔"

"لیکن ان میں سے ایک نے گناہ کیا ہے اور میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ جب کبھی میرے سامنے آئے گا تو مارا جائے گا، چنانچہ جب میں اس کی طرف اشارہ کر کے کہوں کہ ہاں یہی ہے۔ تو فوراً اس پر جھپٹ پڑنا۔ اب میں ان آدمیوں کے پاس جاؤں گا جو صلح مشورے کر رہے ہیں۔" میرا غلام فوراً اٹھ کر بھٹ سے باہر نکلا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ رات گہری ہو چکی تھی اور علاقے کے انتہائی سرے پر الاؤ جل رہا تھا۔ الاؤ کی دھندلی چھاؤں میں بہت سے وجود چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کالے دبیز پردے کا جنگل ہو۔ اس پردے پر شعلوں کے سائے ناچ رہے تھے۔ چاند طلوع ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی آسمان کے کنارے پر ہی لٹکا ہوا تھا اور اس کی کرنیں آبادی کی دیواروں پر اگی ہوئی خودرو جھاڑیوں میں ہی الجھ کر رہ جاتی تھیں۔ نیچے نہ پہنچ پاتی تھیں۔

"وہ مرا نہیں ہے۔ وہ اب بھی تمہیں دیکھ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "عذاب کا گھر بے شک نہیں رہا۔ لیکن وہ پھر بن سکتا ہے اور تم نے اگر سرکشی کی تو یقیناً بن جائے گا۔ تم آقا کو نہیں دیکھ سکتے لیکن وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔" یہ الفاظ میں نے کچھ ایسی آواز میں اور کچھ ایسے یقین کے ساتھ کہے کہ وہ سب گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ جیسے خوف کا دیوتا۔ اندھیرے کی چادر میں نکل آئے گا۔ ایک جانور چاہیے۔ کسی بھی شکل میں ہو۔ خونخوار اور چالاک تو ہو سکتا ہے۔ لیکن چھوٹا نہیں۔"

"پٹی بندھے ہوئے ہاتھ والا آدمی عجیب سی بات کہتا ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"یقین کرو!" میں نے اپنی آواز کو پر رعب بناتے ہوئے کہا۔ "آقا پھر آئے گا۔ عذاب کا گھر پھر بنے گا۔ چانچہ افسوس جو لوگ سرتابی کریں گے۔ اس کا حشر کتنا برا ہو گا۔ میرے ان الفاظ سے وہ خوفزدہ ہو گئے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ میں کلہاڑی سے زمین کرید کرید کر اپنی لاپرواہی اور بے خوفی ظاہر کر رہا تھا۔ حالانکہ دل کی جو حالت تھی وہ میں ہی جانتا تھا اور میں نے دیکھا کہ وہ سب خوفزدہ نگاہوں سے میری کلہاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

پھر ایک دوسرے آدمی نے کچھ پوچھا اور سب تیزی سے ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ میری ہمت بندھ چکی تھی اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ کہ میرا تیر نشانے پر لگا ہے۔ اب میں بالکل خوفزدہ نہیں تھا اور خاصی رعب دار آواز میں برابر بولے جا رہا تھا۔ میں نے ایک گھنٹے سے کم وقت میں ان لوگوں کو یقین دلایا کہ خوف کا دیوتا زندہ ہے۔ شروع شروع میں چند لوگوں نے اعتراض کیا لیکن میں نے مناسب اور موضوع جواب دے کر ایک حد تک ان کے شکوک رفع کر دیئے۔ میں اپنے دشمنوں کا منتظر تھا۔ خاص طور سے وہ لکڑ بگھا۔ جو ان سب میں سے سب سے زیادہ خوفناک تھا۔

لیکن وہ نہ آیا اور جب چاند ڈھلنے لگا تو وہ انگڑائیاں اور جمائیاں لینے لگے۔ جب وہ جمائیاں لیتے تو

ان کے تیز اور نوکیلے دانت الاؤ کی روشنی میں چمکتے اور میرا پچھلا خوف ابھر آتا۔ میں سوچنے لگتا کہ ان پر کہاں تک بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ آخر کار وہ ایک ایک کر کے اپنی بھٹوں کی جانب چل پڑے اور میں نے بھی ایک محفوظ ٹھکانہ تلاش کر لیا۔ اس طرح میں اس جزیرے میں طویل ترین قیام کے لیے تیار ہو گیا اور اس رات سے لے کر اس جزیرے میں میرے آخری دن تک ایک ایسا واقعہ ہوا جو بیان کرنا ضروری ہے۔ اس طویل ترین قیام کے دوران میں نے بہت سے خوفناک واقعات دیکھے۔ لیکن ان سب کی تفصیل بیان کرنا میرے خیال میں دلچسپ نہیں۔ اس قیام کی بہت سی یادیں ایسی تھیں جنہیں میں بھلانا چاہتا تھا۔

بہر حال لکڑ بگھا آدمی تو کبھی میرے سامنے آتا ہی نہیں تھا۔ میری کلہاڑی اور میرے وفادار کتے سے آدمی ڈرنے لگے۔ حالانکہ میں خود ان سے ڈرتا تھا۔ لکڑ بگھے سے میرا وفادار غلام بھی سخت نفرت کرتا تھا اور رات کو ہوشیار سوتا تھا۔ کہ کہیں دشمن بے خبری میں حملہ نہ کر دے۔ میرا وفادار غلام جانتا تھا کہ ہمارے دشمن کے منہ کو خون لگ گیا ہے اور وہ جنگل میں خرگوشوں اور دوسرے چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ادھیڑتا پھرتا ہے۔ اس نے جنگل میں بھٹ بنالیا تھا اور وہیں اکیلا رہتا تھا۔ لیکن ہمیں یہ کبھی نظر نہ آیا۔

کئی دفعہ میں اس بھٹ کی طرف بھی گیا۔ لیکن وہ توقع سے زیادہ ہوشیار اور چالاک تھا۔ بہر حال یہ زندگی گزرتی رہی اور یہاں کے ماحول میں سوچنے سمجھنے میں بڑا فرق آ گیا۔ پھر بارشوں اور طوفان کا موسم شروع ہوا۔ میں اس دوران اپنے فرار کا منصوبہ بھی کامیاب بنانا چاہتا تھا اور آخر کار میں ایک بیڑا بنانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اب اس بیڑے کو سمندر تک لے جانے کا مسئلہ درپیش تھا اور میں کوشش کر رہا تھا کہ کچھ ہو جائے۔

پھر ایک دن میں اپنے حصار سے باہر نکلا ہی تھا۔ کہ کوئی ٹھنڈی سی چیز میری ایڑی سے ٹکرائی میں نے دیکھا تو چھوٹا سا آدمی ٹکر ٹکر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے منہ سے کراہ کی سی آواز نکلی اور وہ جھاڑیوں کی طرف بھاگنے لگا۔ گویا وہ مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں مڑے تڑے پودوں کے درمیان سے گزرتا ہوا آگے بڑھا تو میں نے دیکھا۔ میرا وفادار غلام مرا پڑا ہے اور لکڑ بگھا قسم کا آدمی اپنے دونوں پنجے اس کے حلق میں چبھو کر خوشی سے اس کا گوشت چبا رہا ہے جب میں آگے بڑھا تو اس نے خونی گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا اور اس کے ہونٹ کھنچ گئے اور دانت نظر آنے لگے۔ جو خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ یوں غرا رہا تھا جیسے میرا مذاق اڑا رہا ہو۔ وہ ایک مکمل درندہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ لیکن اس کے کان کھڑے ہو گئے اور ذرا پیچھے کی طرف جھک گئے۔ چاروں ٹانگوں پر یوں بیٹھ گیا جیسے جست لگانے والا ہو۔

میں نے پستول کی نال اب اس کی پیشانی کی طرف کر کے گولی چلا دی۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور مجھ پر سوار ہو گیا۔ اس نے اپنے خوفناک ہاتھ سے میرا گلا پکڑ لیا اور میرے منہ پر زور کا تھپڑ رسید کیا لیکن خوش قسمتی سے میرا نشانہ کامیاب ہوا۔ دوسری گولی اس کی دونوں آنکھوں کی وسط میں پیوست ہو گئی، وہ بے جان ہو گیا۔ میں نے شدید غصے کے عالم میں اپنے غلام اور اس کی لاش جلا دی۔

میں جانتا تھا کہ اب اس جزیرے میں رہنا انتہائی خطرناک ہے۔ بہر حال وہ مبارک دن طلوع ہوا جو میرے لیے حیات کی نوید لایا۔ میں ساحل پر ٹہل رہا تھا کہ جنوب مغربی افق پر بادبان نظر آئے چھوٹے سے بادبان تھے۔ وہ شاید کوئی کشتی تھی۔ میں نے جلدی سے وہ لکڑیاں جلائیں جو میں نے پہلے ہی سے ساحل پر جمع

کر رکھی تھیں۔ اس الاؤ اور دھوپ کی تپش میں کھڑے ہو کر میں اسی کشتی کا انتظار کرنے لگا۔

گھرے اندھیرے نے اتر کر کشتی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں ساری رات وہیں بیٹھا رہا اور جب سورج طلوع ہوا تو میں نے اپنے بدن پر سے آخری چیتھڑا اتار کر ہوا میں لہرایا۔ لیکن کشتی میں جو کوئی بھی تھا۔ اس نے میری طرف نہ دیکھا۔ میں چٹان پر بیٹھ گیا اور امید وبیم کے عالم میں کشتی کی طرف دیکھنے لگا۔

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں تیر کر وہاں تک پہنچ جاؤں۔ لیکن یہ بھی ایک خطرناک بات تھی۔

آخر کار اس کے علاوہ اور کوئی تدبیر نہ رہی کہ میں سمندر میں تیر کر اس کشتی تک پہنچوں اور جب پھر میں کشتی پر پہنچا تو مجھے اندازہ ہوا کہ کشتی پر جو دو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ زندگی سے بہت دور چلے گئے ہیں وہ دونوں مر چکے تھے اور انہیں مرے ہوئے اتنا عرصے گزر چکا تھا۔ کہ ان کے بدن خشک ہو چکے تھے۔ جب میں نے ان کی لاشیں باہر گھسیٹیں تو ان کے اعضاء الگ ہو گئے۔ ان میں سے ایک کے بال جہاز کے کپتان کی طرح سرخ تھے۔

بہر حال کشتی سمندر میں آگے بڑھنے لگی اور اس کے بعد وہ تیزی سے لہروں کے سہارے آگے بڑھتی رہی۔ وہ جزیرہ غروب ہو گیا تھا۔ جو سورج کے پس منظر میں سبز دھبہ نظر آ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی میری یادداشت بھی واپس آ گئی تھی۔

ایک دم اپنے ماضی کا احساس ہوا تھا۔ وہ ماضی جو میرا اپنا تھا اور جو اس خوفناک جزیرے پر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ میں خود پر حیران ہونے لگا۔ اب میرے چاروں طرف بے کراں سمندر تھا اور سر پر شفاف آسمان آہستہ آہستہ رات کی کالی زلفیں بکھرنے لگیں اور آسمان پر تارے آنکھیں جھپکانے لگے۔ سمندر پرسکون تھا رات خاموش تھی اور میرا ذہن سوچ کی گہرائیوں میں سفر کر رہا تھا۔"

کہانی در کہانی، در کہانی۔ لیکن یہ بات کامران کے ذہن میں پوری طرح آ گئی تھی کہ اگر کوئی انسان اپنے آپ کو پراسرار واقعات میں ملوث سمجھے اور یہ سوچے کہ زندگی میں صرف وہ ہی ایک ایسا شخص ہے جو اس طرح کی الجھنوں میں گرفتار ہے۔ تو یہ حماقت ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں کیسے کیسے حالات واقعات بکھرے پڑے ہیں۔ کامران بھی ایسی ہی سوچوں میں گرفتار تھا۔ اس وقت وہ ایک قطعی اجنبی ملک کے اجنبی شہر میں ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔

اب بہت سے ایسے احساسات اس کے ذہن میں آتے تھے۔ جو اسے ماحول سے باغی کر دیتے تھے۔ نہ جانے کیا کیا الجھنیں دامن گیر رہتی تھیں۔ قزل ثنائی شعورہ ثنائی نے جو پیشن گوئی کی تھی۔ وہ بڑی عجیب سی تھی۔ لیکن اپنے آپ کو ان کے کہے ہوئے الفاظ سے دور کرنے کی ہر کوشش ناکام ہی رہی تھی۔ وقت کی کہانی اسی ترتیب سے جاری تھی اور وہ یہ سوچتا تھا کہ ایسا کون سا عمل ہو۔ جس سے اسے ان مشکل حالات سے نجات مل سکے۔ ہر ممکن کوشش تو کر لی تھی۔ ہر عمل تو کر ڈالا تھا۔ لیکن کہیں بات ہی نہیں بنتی تھی۔ وہ اپنے طور پر ایک صحیح راستہ اختیار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ممکن نہیں ہو سکا اور پھر اس شام واقعات نے ایک اور رخ اختیار کر لیا۔

وہ ہوٹل سے باہر نکلا تھا اور چہل قدمی کرتا ہوا۔ ایک فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے

اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کامران نے پلٹ کر دیکھا۔ تو اس کا پورا ذہن جھنجھنا کر رہ گیا۔ یہ حسن شاہ تھا۔ جو پورے اعتماد اور مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اعتماد اسے اس بات کا تھا کہ اس نے صحیح آدمی کے شانے پر ہاتھ رکھا ہے۔ کامران منہ سے کچھ نہ بول سکا۔ تو حسن شاہ نے کہا۔

"اب تم یہ تو نہیں کہو گے کہ تم نے مجھے نہیں پہچانا۔"

"حسن شاہ میں بڑی سنسنی محسوس کر رہا ہوں۔"

"شاید اسی لیے یہ چھوٹا سا ہوٹل بنایا گیا ہے؟" حسن شاہ نے بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جہاں واقعی ایک چھوٹا سا خوبصورت ہوٹل نظر آ رہا تھا۔ وہ پھر بولا۔

"آؤ۔"

"ہاں چلو میں بیٹھنا چاہتا ہوں۔" پب کی ایک خوبصورت کرسی پر بیٹھ کر حسن شاہ نے ویٹر کو عمدہ قسم کی کافی اور کچھ لوازمات لانے کے لیے کہا۔

کامران دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ حسن شاہ بولا۔

"نہیں یار! یہ انداز مردوں کو زیب نہیں دیتا۔"

"اس وقت حسن شاہ تم مجھے کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔" کامران نے کہا اور حسن شاہ ہنس پڑا۔

"گویا۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو......"

"ہاں...... حقیقت یہ ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں اپنے دل کی باتیں۔"

"دوست تمہارے دل کی باتیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہیں۔"

"لگ تو یہی رہا ہے کہ اب مجھے مجھ سے زیادہ میرے شناسا جانتے ہیں۔"

"بالکل صحیح لگ رہا ہے تمہیں۔ اصل میں یہ نہ پوچھنا کہ یہ دعویٰ کیوں کیا جا رہا ہے۔"

"میں تو ابھی کچھ نہیں پوچھوں گا۔ پہلے تمہارے مل جانے کا یقین تو کر لوں۔"

"یقین کر لو...... کہ میں تمہیں مل چکا ہوں۔"

"مگر کیسے؟"

"تمہاری نشاندہی کی گئی ہے۔ باقاعدگی کے ساتھ۔"

"کیا مطلب؟" ایک اور سنسنی خیز بات کہہ دی تم نے۔"

"اب تم اسے جو بھی سمجھو۔ لیکن میں نے جو کہہ دیا ہے۔ وہ ایک بہت بڑا سچ ہے۔ تمہاری نشاندہی کی گئی ہے۔"

"کس نے کی ہے؟" کامران نے سوال کیا لیکن اسی وقت ویٹر نے ان کے آگے لوازمات لگانے شروع کر دیئے تھے۔

"ان کی ضرورت نہیں تھی اس وقت۔"

"ہے۔ جب انسان پر حیرت کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو اس غلبے کو دور کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ معدے کی خاطر مدارت کی جائے۔ چلو! شروع ہو جاؤ۔"

"میں نے ایک سوال کیا تھا۔" کامران بولا۔

"تمہارے ہر سوال کا جواب تمہیں مل جائے گا۔ تم جان بوجھ کر مجھ سے بھاگے تھے۔"

"ہاں...... میں جان بوجھ کر تم سے نہیں۔ بلکہ ان حالات و واقعات سے بھاگا تھا اور آج تک بھاگ رہا ہوں۔"

"غلطی کر رہے ہو۔ اپنے آپ کو بھٹکا رہے ہو۔"

"نہیں بالکل نہیں۔ اچھا ہاں...... جلدی سے تم مجھے یہ بتاؤ۔ کرنل صاحب اور رانا چندر سنگھ کا کچھ پتہ چلا؟"

"ہاں چل گیا ہے۔"

"خیریت سے تو ہیں وہ لوگ؟"

"بالکل خیریت سے ہیں۔"

"کیا وطن واپس پہنچ چکے ہیں؟"

"کافی ٹھنڈی ہو جائے گی۔" حسن شاہ نے کہا اور کامران چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"مجھے لگتا ہے۔ تم اس سوال سے گریز کر رہے ہو۔"

"کوئی گریز نہیں کر رہا۔ بس میں چاہتا ہوں کہ تم بالکل فٹ ہو جاؤ۔" کامران نے خاموشی سے کافی کی پیالی اپنی طرف سرکالی۔ حسن شاہ پلیٹیں اس کی طرف بڑھا بڑھا کر اس کی خاطر مدارت کرنے لگا تھا۔

کامران کا ذہن واقعی چکرایا ہوا تھا۔ حسن شاہ اس طرح اس اجنبی شہر میں اسے مل جائے گا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ بہر حال وہ دیر تک کھانے پینے میں مصروف رہے۔ اس دوران مکمل خاموشی طاری رہی تھی۔ حسن شاہ نے البتہ کتنی ہی بار کن انکھیوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا تھا۔

کافی کی دو پیالیاں پینے کے بعد اس نے کہا۔

"یار! میں اب ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ ویسے تو کسی کا کہیں بھی پہنچ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہوتی۔ لیکن تم نے چند الفاظ کہہ کر مجھے حیران کر دیا ہے۔ تم کہہ رہے تھے کہ میری باقاعدہ نشاندہی کی گئی ہے۔

"ہاں۔"

"کس نے میری نشاندہی کی۔"

"امینہ سلفانے!" حسن شاہ نے کہا اور کامران کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔

"اور حیران کرو مجھے اور حیران کرو۔"

"نہیں اب ایسا کرو کہ تم کہیں اور چل کے حیران ہونا۔ تم کتنے ہی مصروف ہو۔ کہیں بھی جانا ہو تمہیں۔ آؤ...... میرے ساتھ چلو۔"

"نہ میں مصروف ہوں اور نہ ہی مجھے کہیں جانا ہے۔ چلو کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟" کامران نے کہا اور حسن شاہ نے ویٹر کو اشارہ کر کے بل طلب کیا۔ رقم ادا کر کے کامران کے ساتھ باہر نکل آیا۔ پھر اس نے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا تھا اور اس کے بعد وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر چل پڑے تھے۔

کامران راستے دیکھ رہا تھا۔ بہر حال مختلف راستوں سے گزرنے کے بعد ٹیکسی ایک چھوٹے سے

خوش نما مکان کے سامنے رک گئی۔ حسن شاہ نے بل ادا کیا اور کامران کو لیے ہوئے اندر داخل ہوا۔ کامران نے اب اپنے آپ کو پوری طرح سنبھال لیا تھا۔ لیکن پھر اسے جو پہلا شخص نظر آیا اسے دیکھ کر ایک بار پھر اس کے دل و دماغ پر ایک عجیب و غریب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ رانا چندر سنگھ تھا۔

رانا چندر سنگھ کامران کو دیکھ کر مسکرا دیا اور تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

"ہیلو کامران ڈیئر! بہت عرصے کے بعد تم سے ملاقات ہو رہی ہے۔"

"آؤ...... آؤ...... آ جاؤ۔" وہ واپس پلٹ پڑا اور کامران اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ حسن شاہ بھی ساتھ ساتھ ہی تھا۔ ڈرائنگ روم میں واقعی بہت سے دھماکے موجود تھے۔ کرنل گل نواز اور امینہ سلفا۔ دونوں بیٹھے ہوئے آپس میں کسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ گل نواز اچھل کر کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے کامران کو اس طرح سینے سے لپٹایا کہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

کامران اس کی محبت کو محسوس کر رہا تھا اور خود بھی خاموش تھا۔

"اگر میں تم سے یہ کہوں کامران کہ درحقیقت تم مجھے اپنے بیٹوں ہی کی طرح عزیز ہو۔ تو بات عجیب تو لگے گی۔ لیکن کیا کیا جائے۔ انسان محبتوں کے شکنجے میں اسی طرح جکڑ جاتا ہے۔ میرے بیٹے تمہیں تندرست و توانا دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔"

"اور مجھے بھی۔" امینہ سلفا بھی مسکراتی نگاہوں سے کامران کو دیکھ رہی تھی۔ کامران کی نگاہیں ادھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ علی سفیان نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال کیا کیا تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ کچھ نہیں پتہ تھا۔ البتہ کرنل گل نواز نے امینہ سلفا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یوں سمجھو اس طرح تمہارے سارے گناہ دھل گئے۔"

"ہوں میں اپنے آپ کو گنہگار نہیں سمجھتی۔ تم اگر یہ الفاظ ادا کر کے خوش ہو تو ٹھیک ہے مجھے اعتراض بھی نہیں ہے۔"

"بیٹھو۔ کامران! یہ بتاؤ تھکن محسوس کر رہے ہو؟"

"سب سے بڑی ذہنی تھکن میرے لیے یہ ہے کہ میں صورتِ حال سے ناواقف ہوں۔"

"امینہ سلفا کا یہ کہنا ہے کہ تم واقعات سے گھبرا کر راہِ فرار اختیار کر چکے ہو۔"

"ہاں ایسا ہی ہے، کرنل صاحب! اب میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میں تو ایک سیدھا سادھا انسان تھا۔ سادگی سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ کچھ حادثے ہوئے میری زندگی میں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے مجرم بننے سے بچا لیا۔ لیکن اس کے بعد جو زندگی مجھے ملی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میری جیسی حیثیت کے کسی آدمی کو ایسی زندگی ملی ہو۔"

"دیکھو! حیثیت تم کس چیز کو کہتے ہو؟" رانا چندر سنگھ نے سوال کیا۔

"رانا صاحب! آپ لوگ بڑے بڑے دولت مند لوگ ہیں۔ بڑی حیثیتوں کے مالک۔ لیکن میں تو زندگی میں بہت ہی پسماندہ وقت گزارتا رہا ہوں۔ کرنل صاحب! اگر مجھے اپنے ساتھ یہاں نہ لے آتے۔ تو میں ان کے کارخانے چلا رہا ہوتا۔ میری ذہنی پہنچ اتنی ہی تھی۔"

"نہیں میرے دوست اگر تمہاری ذہنی پہنچ اتنی ہی ہوتی تو جس طرح تم نے ہر قسم کے واقعات کو

شکست دی ہے۔ اس طرح شکست نہ دے پاتے۔ ایک بہت بڑی ٹیم بنائی تھی ہم نے بڑے خطرناک لوگ اس ٹیم میں شامل تھے۔ میں دانش وغیرہ کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ لیکن تم نے سب کو دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا۔ تمہاری حیثیت معمولی تھی ہی نہیں یہ الگ بات ہے کہ وقت آہستہ آہستہ تمہیں ان راستوں پر لے کر آیا۔ جو اصل میں تمہارے راستے تھے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔"

"کامران کچھ واقعات تمہیں بتانے ہیں۔ لیکن میں اپنی طرف سے تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ خزانے نہ پہلے میری منزل تھے نہ اب ہیں۔ اللہ کا دیا میرے پاس سب کچھ موجود ہے۔ میری پشتیں آرام سے بیٹھ کر کھا سکتی ہیں۔ بس یہ تو ایک جنون ہوتا ہے۔ مہم جوئی کا، جنون جو نہ جانے کیسے کیسے گل کھلا دیتا ہے تم یہ سمجھ لو کہ وہ وقت بھی گزر گیا اور جس طرح بھی گزرا یہ ایک الگ بات ہے۔ لیکن میں اب تم سے یہ کہتا ہوں کہ میری طرف سے تم مکمل آزاد ہو۔ اپنے طور پر فیصلے کرو۔ وطن واپس جانا چاہو اور اس سلسلے میں میری کوئی مدد درکار ہو تو تم سمجھ لو کہ میں ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔ زندگی گزارنے کا جو بھی راستہ تمہیں پسند ہو۔ ان میں سے کوئی تمہیں اس کے خلاف مجبور نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میرے آدمی ہو۔" کامران خاموشی سے کرنل گل نواز کی صورت دیکھتا رہا۔ رانا چندر سنگھ نے کہا۔

"کرنل صاحب جو پیشکش تمہیں کر چکے ہیں۔ کامران ہم سب ان کے ہمنوا ہیں واقعی، کوئی کسی کی زندگی پر اجارہ داری نہیں کر سکتا۔ تم ہمارے غلام نہیں ہو کہ ہم تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف مجبور کر سکیں۔ لیکن اب امینہ سلفا کے ذریعے جو کچھ پتہ چلا ہے۔ ہم چاہتے ہیں وہ تمہارے علم میں لائیں۔"

"جی رانا صاحب!" کامران نے کہا۔

سب سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ امینہ سلفا ان لوگوں کے ساتھ موجود تھی۔ یہ اجتماع بڑا ناقابلِ یقین سا تھا۔ امینہ سلفا اس دوران بالکل غیر متعلق سی کیفیت میں بیٹھی رہی تھی۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر اس نے کہا۔

"اس کے بعد ایک بار پھر میں پیشکش کروں گی کہ اگر کامران تھکے ہوئے ہیں تو انہیں کچھ آرام کے لیے دیا جائے۔ بعد میں ان سے بات چیت ہو سکتی ہے۔"

"میں بالکل نہیں تھکا ہوا۔ البتہ کچھ سوالات میرے ذہن میں ضرور ہیں۔"

"میں یہ ہی کہنا چاہتی تھی۔ تم کرنل صاحب کے آدمی ہو۔ کرنل صاحب! سے تنہائی میں بیٹھ کر بات چیت کرو۔ جو کچھ بھی تمہارے ذہن میں ہے اس پر گفتگو کر لو تا کہ بعد میں ہم بالکل یکسو ہو کر اپنے کام کر سکیں۔"

"ٹھیک ہے پھر ہم اس کام کو کل کے لیے اٹھا کر رکھتے ہیں۔" کامران خود بھی اس بات کے لیے متفق ہو گیا تھا۔ حسن شاہ رانا چندر سنگھ باقی اور دوسرے لوگ اس کے لیے کسی بھی طرح غیر نہیں تھے۔ لیکن امینہ سلفا کی شخصیت ایسی تھی کہ جب تک اس کی تفصیلات سامنے نہ آ جائیں صورتِ حال ذرا الجھی ہوئی ہی رہتی۔ اس لیے اس نے یہ وقت لے لیا تھا اور پھر کرنل گل نواز کے ساتھ تنہائی نصیب ہوئی۔ تو پہلے اس نے یہ سوال کیا۔

"سب سے پہلی بات آپ مجھے یہ بھی بتائیے کرنل صاحب کہ کیا یہ سب کچھ آپ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ کوئی ایسا دباؤ تو نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔تم نے یہ وقت اسی لیے لیا ہے کہ اس صورتِ حال کو معلوم کرو۔اصل میں تھوڑی سی گڑ بڑ ہوگئی۔اس وقت سے سمجھ لو جس سے تم ہم سے جدا ہوئے میں کچھ بیمار ہوگیا تھا۔وطن واپس جانے کے بجائے میں ان لوگوں کے ساتھ باہر نکل آیا خاص طور پر رانا چندر سنگھ مجھے اپنے ساتھ لے آیا اور اس نے میرا علاج کرایا۔یعنی ہم لوگ وطن واپس گئے ہی نہیں ابھی تک تمہاری ضرورت بھی میں شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس بات کا احساس میرے دل میں تھا کہ تم سب زیادہ الجھنوں میں پھنس گئے ہو۔میں تمہیں ایسے نہیں چھوڑ سکتا تھا لیکن بے بسی تھی۔

"بڑی مشکل سے مجھے حسن شاہ کے ذریعے تمہارے بارے میں تفصیلات معلوم ہوئیں اور بس سمجھ لو ہم اسی وقت سے تمہاری تلاش میں تھے۔"

"آپ لوگ مجھ تک پہنچے کیسے؟"

"یہ عورت امینہ سلفا اکثی بہت سی باتیں تم نے سنی ہیں پہلے تو میں یہ ہی سوچتا تھا کہ یہ ایک بہت بڑی ڈرامہ باز عورت ہے۔لیکن نہیں یہ واقعی اس کائنات کی ایک پراسرار ہستی ہے۔میں نے جتنا کچھ دیکھا ہے۔اس کے بعد میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا اس نے تمہاری نشاندہی کی ہے اور ہم لوگ یوں سمجھ لو کہ تمہارا تعاقب کرتے کرتے یہاں تک پہنچے ہیں۔حسن شاہ کے بارے میں بھی اسی نے بتایا تھا۔حسن شاہ ہمیں تلاش کر رہا تھا اور اس کی راہنمائی میں ہم لوگ اس تک پہنچے اور وہ ہم تک۔

پھر اس کے بعد تمہارے سلسلے میں یہ بتاتی رہی اور ہم ان تمام جگہوں سے گزرتے رہے۔جہاں جہاں سے تم گزرے تھے اور آخر یہاں تک پہنچ گئے۔"

"یہ بتاتی رہی؟"

"ہاں...... یہ واقعی بہت سے پراسرار علوم کی ماہر ہے۔"

"علی سفیان کہاں ہے؟" کامران نے سوال کیا۔

"چلا گیا...... واپس چلا گیا۔ان دونوں کے درمیان جدائی ہوگئی۔"

"یعنی......؟"

"بھئی سیدھی سی بات ہے۔یہ اتنے بڑے لوگ ایسے واقعات کو چھوٹی موٹی حیثیت دیتے ہیں۔اس نے اسے طلاق دے دی اور اس نے خوشی سے طلاق لے لی۔اب یہ اپنے کسی مقصد کے لیے گامزن ہے اور کامران اس نے ایک خاص بات کہی ہے۔وہ یہ کہ اسے تمہاری ضرورت ہے۔وہ کہتی ہے اس کا اپنا جو مشن ہے۔کامران اس مشن کا ایک خاص حصہ بن گیا ہے۔خاص بات میں تمہیں بتاؤں کہ گرشک اور سیتا بھی ہم سے آملے ہیں۔"

"اوہ...... میرے خدا" کامران نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔بولا۔

"وہ کہاں ہیں؟"

"وہ ہمارے ساتھ نہیں ہوتے۔ان کی شخصیتیں بالکل مختلف ہیں اور وہ اپنے ٹھکانے بھی الگ ہیں۔ہاں ہماری ضرورت پر وہ ہم سے آ ضرور ملتے ہیں۔"

"بڑی سنسنی خیز بات ہے۔"

"کامران تمہارے بارے میں امینہ سلفا بڑے بڑے انوکھے انکشافات کرتی رہی ہے۔" اسی وقت باہر سے دستک سنائی دی اور کرنل گل نواز دروازے کی طرف دیکھنے لگا پھر بولا۔

"کون ہے۔آجاؤ؟" امینہ سلفا کو دیکھ کر وہ دونوں چونک پڑے تھے۔امینہ سلفا کے چہرے پر ایک انتہائی پراسرار کیفیت طاری تھی۔اس نے کہا۔

"نہیں کرنل! جو حصہ میرا ہے۔وہ مجھ تک رہنے دو اور تم جانتے ہو کہ عدم تعاون اچھی چیز نہیں ہوتی۔"

"سوری امینہ! سوری۔"

"بس اتنا ہی کہنا چاہتی تھی میں۔" وہ خاموشی سے باہر نکل گئی تو کرنل گل نواز نے کہا۔

"دیکھا تم نے میں جو کچھ تمہیں بتانے جا رہا تھا۔وہ نہیں چاہتی کہ ابھی تمہیں بتایا جائے اور اس کمبخت کو نہ جانے کیسے خبر ہوگئی۔معافی چاہتا ہوں۔وہ تو ہمارے الفاظ تک سن لیتی ہے۔سوری امینہ سلفا سوری۔" کرنل واقعی متاثر نظر آ رہا تھا۔کامران بھی بہت سی سوچوں میں ڈوب گیا لیکن۔یہ حقیقت تھی کہ کامران جس طرح بھٹیوں میں تپا تھا۔اب وہ کندن بن چکا تھا۔

چھوٹی موٹی بات کو خاطر میں لانا۔اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔بہر حال دوسرے دن۔تمام امور سے فارغ ہونے کے بعد امینہ سلفا، رانا چندر سنگھ خود، حسن شاہ کرنل گل نواز کے ساتھ بیٹھ گئے۔ایک وسیع و عریض ہال نما کمرہ تھا۔جس میں اس وقت یہ نشست ہو رہی تھی۔کرنل گل نواز نے کہا۔

"ہاں امینہ سلفا۔اب تم کھل کر ساری داستان بیان کر دو جو تم نے ہم سے کہی۔تمہاری خواہش کے مطابق میں نے کامران کو ایک لفظ نہیں بتایا ہے۔بلکہ تم تو جانتی ہوگی۔" امینہ سلفا نے اپنی پراسرار آنکھیں اٹھائیں۔ان میں نرم کیفیت نظر آ رہی تھی۔اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں تم سب کی شکر گزار ہوں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں آج کل صرف اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے کام کرتی رہی ہوں۔میں نے کبھی کسی دوسرے کے بارے میں نہیں سوچا۔صرف اپنے مقصد کے لیے مصروف عمل رہی۔میرے ماضی کی داستان تھوڑی بہت تم لوگوں کے علم میں آ چکی ہے۔لیکن وہ اس وقت کی بات ہے۔جب میرے کچھ معاملات منظر عام پر آ چکے تھے۔اس وقت میں اندر اور باہر سے ایک سچ ہوں۔تم لوگوں کو اپنا راز دار بنا کر میں۔تمہاری مدد سے کام کرنا چاہتی ہوں اور یہ بھی تاریخ کا حصہ ہے۔اس تاریخ کا حصہ جس کا اب آغاز ہوگا اور جو شروع ہونے والی ہے۔یہ بہت ہی اتفاقیہ عمل ہے کہ یہ ایک کردار جس کا نام کامران ہے۔صرف ایک چھوٹی سی بات پر بہت بڑی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔میں اس شخص کی اب پوری کہانی جانتی ہوں۔سادہ سی زندگی گزارنے والا ایک سادہ سا نوجوان جو ایک مضبوط کردار کا حامل ہے وہ کبھی کسی عورت کے جال میں نہیں پھنسا۔کیوں کہ اس کا اپنا ایک کردار ہے۔اگر ایسا ہو جاتا تو شاید اس کی ذات کو شدید نقصان پہنچ جاتا۔

اس کے ساتھ وہ واقعات پیش آئے اور اس کے بعد وہ جس طرح کرنل گل نواز تک پہنچا۔وہ ایک دھندلی سی کہانی ہے۔لیکن سارے کے سارے تار اسی طرح سے ملتے ہیں۔دلچسپ واقعات اس وقت سے

شروع ہوئے جب کرنل گل نواز نے اتفاقیہ طور پر مل جانے والے دو کرداروں کو جن کا نام گرشک اور سیتا ہے۔ اپنے گھر میں پناہ دی اور وہ دونوں کامران کی جانب اس وجہ سے متوجہ ہو گئے کہ کامران بدھ مت کی تاریخ کے ایک ایسے کردار کا ہم شکل ہے۔ جو ایک مخصوص علاقے میں لوک کہانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کردار بدھ مت کے ایک مخصوص قبیلے کا حصہ ہے۔ سارے بدھ مت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ اس شخص کا ہم شکل ہے۔ جو کہیں خلاؤں میں گم ہو گیا ہے اور بدھ عقیدے کے مطابق ست گاتا کی ایک حکمران اس کے انتظار میں سو گئی ہے۔ یہ پاتال پرمتی کا عکس ہے۔ جس سے وہ محبت کرتی تھی اور اس نے اپنے آپ کو ہی نہیں۔ بلکہ پورے شہر کو اس انتظار میں سلا دیا ہے کہ پاتال پرمتی اسے آ کر جگائے گا۔ وہ اپنے آپ کو اس کی ستی کہتی ہے۔ بس یہ لوک داستانیں ہیں۔ جو پاتال پرمتی سے متعلق ہیں، دھرم وستونیہ۔ اس کردار کا اصل نام ہے اور پاتال پرمتی کی ست وتی۔ پرکھنہ کی گہرائیوں میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔

ستی پرکھنہ جو دھرم دھنی کہلاتی تھی۔ یہ باتیں تم لوگوں کو سمجھ میں نہی آ رہی ہوں گی۔ کیوں کہ ان کا تعلق بدھ مت کی لوک داستانوں سے ہے۔ بہرحال مسئلہ کہنے کا یہ ہے کہ گرشک اور سیتا نے جب کامران کو دیکھا تو وہ یہی سمجھے کہ یہ پاتال پرمتی ہے۔ یعنی دھرم وستونیا۔ وہ آج تک اسے یہ ہی سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں اس کا اپنا کردار اس کے اپنے ذہن میں سو گیا ہے۔ البتہ اس بات سے میں انکار نہیں کر سکتی کہ یہ شخص بہت پراسرار ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ کبھی کبھی میں خود بھی شدید حیرت کا شکار ہو جاتی ہوں یہ سوچ کر کہ کہیں یہ واقعی تاریخ کا وہی کھویا ہوا کردار تو نہیں ہے۔

دیکھو بہت باتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جو انسانی ذہن کی پہنچ سے بہت آگے نکل جاتی ہیں اور اس کی بتائی ہوئی جگہ بیٹھ گیا۔ اب امینہ سلفا کی پشت پر تھی۔"

"کامران! وہ سامنے سفید دیوار پر دیکھو اور رانا چندر سنگھ اور کرنل گل نواز میں اس خلیے کو کرید رہی ہوں جس میں کامران کا دیکھا ہوا خزانہ محفوظ ہے۔ تم دیوار پر نگاہیں جما دو اور پھر کائنات کا سب سے حیرت انگیز منظر سامنے آ گیا۔ دیواروں پر مٹے مٹے نقوش ابھر رہے تھے اور اس کے بعد اس غار کی تصویر جس میں خزانہ محفوظ تھا۔ سب سحر زدہ نگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ کامران خود بھی پورے ہوش و حواس میں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خزانہ اس وقت ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ جسے دیکھ کر اس نے بمشکل تمام اپنے دل و دماغ پر قابو رکھا تھا۔

بہرحال یہ سب کچھ بڑا حیرت انگیز تھا۔ جو تھوڑی دیر میں ختم ہو گیا۔ وہ سب گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ بمشکل تمام کرنل گل نواز کی آواز ابھری۔

"کامران یہ کوئی شعبدہ تو نہیں ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گے میرے بیٹے۔"

"نہیں کرنل! یہ سب کچھ میں دیکھ چکا ہوں اور اسے نظر انداز کر کے چلا آیا ہوں۔"

"آہ...... کیا...... واقعی؟" رانا چندر سنگھ نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

پھر ایک دم سنبھل گیا۔ اس نے کہا۔

"خدا کی قسم لوگ کامران کا دماغ نکال کر لے جائیں گے۔ اگر یہ بات منظر عام پر آ گئی تو۔"

"ہاں امینہ سلفا اس چیز کو منظر عام پر لا سکتی ہے۔"

"میں کبھی نہیں لاؤں گی۔ چوں کہ میں بھی بتا چکی ہوں تمہیں کہ خزانہ میری منزل نہیں ہے۔ میں تو ست گاتا تک پہنچنا چاہتی ہوں جہاں میری زندگی کا سب سے گہرا مقصد چھپا ہوا ہے۔" رانا چندر سنگھ نے چونک کر امینہ سلفا کو دیکھا اور کہا۔

"کیا نام لیا تم نے؟"

"ست گاتا۔" رانا چندر سنگھ دماغ پر زور دینے لگا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے نقوش نمودار ہو گئے تھے۔ پھر اچانک اس نے خود کو سنبھالا اور بولا۔

"امینہ سلفا ست گاتا سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" امینہ بھی حیران نگاہوں سے رانا چندر سنگھ کو دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔

"کیوں خیریت؟"

"ہاں خیریت ہے۔ یہ نام میرے لیے اجنبی نہیں ہے ست گاتا...... ست گاتا۔ بالکل صحیح ہے۔ ہر میت سنگھ میرا گہرا دوست ہے اور ہر میت سنگھ نے ہی مجھے وہ تمام تفصیل بتائی تھی۔ میں نے اس لڑکی کو بھی دیکھا ہے جس کا نام الاتشا ہے۔ شاید وہ آج بھی شہباز خان کی حویلی میں مجھے مل جائے۔

شہباز خان کا بیٹا شہروز اوہ...... مائی گاڈ......" امینہ سلفا کے چہرہ پر ایکدم سرخی سے آ گئی تھی اس نے کہا۔

"نہیں تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے، وقت کہتا ہے کہ ایک بار پھر ہم اپنے دیس کا رخ کریں۔ وقت ہمیں ایک بار پھر ہمالیہ کی ترائیوں میں لے جانا چاہتا ہے۔ میں تمہیں ہر میت سنگھ سے اس کی داستان سنوانا چاہتا ہوں۔" امینہ سلفا نے آنکھیں بند کر لیں۔ کامران اب بھی حیران حیران سا بیٹھا ہوا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور سنسنی خیز نگاہوں سے رانا چندر سنگھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"رانا میں نے بہت دور تک دیکھ لیا ہے۔ ہمیں ست گاتا کی تلاش کے لیے ہر میت سنگھ تک پہنچنا ہوگا۔"

"اگر یہ سب لوگ چاہیں تو......"

"بھئی سچی بات بتاؤں میں تو وہ کروں گا جو کامران مجھ سے کہے گا۔ اس بچے کو میں نے بڑی تکلیفوں کا شکار کیا ہے۔ میں تو اس سے سخت شرمندہ ہوں۔" کامران ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھا۔ امینہ سلفا نے نگاہیں اٹھائیں اور بولی۔

"کامران قزل ثنائی اور شعورہ نے تمہیں یہ بات بتائی تھی کہ تم اس وقت تک سکون کی وادیوں تک نہیں جا سکتے، جب تک کے تاریخ کے کچھ مسئلے حل نہ ہو جائیں۔ تم ہی پاتال پرمتی کی ساحرہ کو زندگی دے سکو گے اور تم ہی اس کو واپس لا سکو گے۔ جو تمہارا ہم شکل ہے۔"

"ہاں...... میں واقعی اپنے دماغ میں کچھ تبدیلیاں محسوس کر رہا ہوں، بہرحال جیسا تم پسند کرو۔ کرنل آپ کیا چاہتے ہیں۔"

"بیٹے میں نے تو اب تم سے کہہ دیا۔ تم اگر یہ کہو کہ ہمیں وطن واپس جانا ہے۔ تو میں ان سب سے

رابطے توڑ کر تمہارے ساتھ وطن واپس چلتا ہوں۔ لیکن اگر تمہیں کوئی اتنا بڑا کام کرنا ہے تو پھر دوسری بات ہے۔"

"کرنل میں تیار ہوں۔ بس اتنا کہنا کافی تھا۔ تیاریاں مکمل ہوئیں سفر طے کیا گیا اور وہ انتہائی حسین وجمیل وادی میں جا پہنچے جہاں بہت تھوڑی سی آبادی تھی۔ راستے میں رانا چندر سنگھ ان لوگوں کو شہباز خان اور ہرمیت سنگھ کے بارے میں بتاتا رہا۔

"چھوٹی موٹی ریاستیں ہیں۔ ہرمیت سنگھ اور شہباز خان کے خاندانوں میں بہت پرانی دشمنی چل رہی تھی۔ لیکن جب وہ دشمنی دوستی میں تبدیل ہوئی۔ تو وہ ایسے دوست بن گئے کہ ان کی مثالیں دی جانے لگیں۔ دونوں کے دونوں شاندار جوان تھے اور ان کی جوانی کی داستانیں ریاستوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں ہی اپنے اپنے فن کے ماہر تھے۔ ایک طرف شہباز خان ایک شاندار شکاری تھا۔ تو دوسری طرف مہم جوئی ہرمیت سنگھ کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ زندگی کے اچھے دن گزار رہے تھے اور جن علاقوں میں رہتے تھے۔ ان کی اپنی کہانیاں بھی بڑی عجیب تھیں۔ روایات کا ایک جنگل جس کی پوری تفصیل آج تک نہیں معلوم ہو سکی تھی۔

جب شہباز خان نے اس کا تذکرہ کیا۔ تو ہرمیت سنگھ نے کہا۔

"ہمارے قدم اس جنگل میں داخل ہوئے ہیں۔ واقعی وہ بہت ہی عجیب جگہ ہے۔ لیکن میں نے اس کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر لی ہیں اور بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ دریا کے ساتھ ساتھ کی آبادیوں میں سب سے بڑی آبادیاں ڈاکوؤں کی ہیں۔ وہ کشتیوں کے ذریعے دریا میں سفر کر کے چھوٹی چھوٹی بستیوں تک پہنچتے ہیں اور لوٹ مار کر کے پھر کشتیوں میں واپس جا کر جنگلات میں جا چھپتے ہیں۔ پولیس نے کئی بار ادھر کی کوشش کیں گھنے جنگلوں میں زیادہ دور تک نہیں جا سکی۔ دریائی راستے بھی انتہائی خطرناک ہیں اس کے علاوہ اندرونی علاقوں میں بہت سے جنگلی قبیلے آباد ہیں۔ جن کی بے شمار کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ یہ لوگ بیرونی دنیا کے لوگوں کو پسند نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس وہاں کوئی بڑی کارروائی نہیں کر سکی۔"

"آہ...... ایسی جگہ تو قابلِ دید ہوگی۔ افسوس یہ ہے کہ اب تک ہم وہاں کیوں نہیں گئے۔" شہباز خان نے دلیری سے کہا۔

"اصل میں پتا جی کبھی وہاں جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ بلکہ اگر انہیں خبر بھی ہو گئی تو ہمیں تھانے میں بند کرا دیں گے۔"

پھر خاموشی سے خصوصی تیاریاں کی گئیں۔ ریل کا طویل سفر طے کیا گیا بسوں کا سفر ہوا اور بالآخر دونوں چکوتری پہنچ گئے۔ دریائے سلہری چکوتری کے گرد ہنسلی بن کر گزرتا تھا۔ چکوتری انتہائی پسماندہ ہونے کے باوجود قدرتی حسن سے مالا مال تھا۔ خوش نما مناظر سے آراستہ سرسبز و شاداب آبادی جو زیادہ سے زیادہ چار سو مکانات پر مشتمل تھی آمدنی کے ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ بس کھیتی باڑی پر ہی گزارہ ہوتا تھا۔ جنگلی پھلوں کی بہتات تھی اور ایسے ایسے پھل ہوتے تھے۔ جو پورے ایشیاء میں کہیں نہ پائے جاتے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں کچھ پھل لذیز بھی ہوں۔ لیکن چکوتری والوں کے پاس انہیں دوسرے شہروں میں بھیجنے کے وسائل نہ تھے۔ اس لیے وہ وہیں تک محدود تھے۔ البتہ وہ یہاں کے لوگوں کی غذائی ضروریات پوری کرتے تھے۔

یہاں انہیں مستان ملا جو ایک بیس بائیس سالہ نوجوان تھا۔ سنہری رنگت کا مالک تن و توانا۔ گو پستہ قد

تھا۔ لیکن بدن فولاد کا بنا ہوا تھا لگتا تھا۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا۔

"ام شرونٹ شر، امارا فادر انگریز کا شرونٹ، آپ بولے ام آپ شرونٹ۔"

"ہمارے ساتھ جنگل میں چلو گے؟ صرف شکاری ہو یا کچھ اور کام بھی جانتے ہو؟"

"ام کک شر...... سب کام کرے گا۔"

"تو پھر تم ہمارے ساتھ چلے گا!" شرمیلے نوجوان نے معاوضے کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن اس کے اہل خانہ کو چند جوڑے کپڑے اور تھوڑی سی کرنسی دی گئی تو وہ شادی مرگ کی سی کیفیت کا شکار ہو گئے۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ ان کے لیے ہے۔ مستان خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا تھا۔ ویسے بھی قدرتی حسین بستی میں رہنے والے قدرتی حسن سے مالا مال تھے لیکن دنیاوی طور پر ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ لباس کی شکل میں ان کے بدن پر دھجیاں نظر آتی تھیں۔ نسوانیت کی دولت سے مالا مال نوجوان لڑکیاں عموماً درختوں کی چھالوں اور چوڑے پتوں کے لباس میں ملبوس نظر آتی تھیں۔ لیکن وہ زیور حیا سے آراستہ تھیں اور ان میں سے کسی کی آنکھ میں بے باکی نظر نہ آتی تھی۔ وہ شرمیلی نظریں جھکا کر چلنے کی عادی تھیں کہ ہوس کی آنکھ خود ہی شرمندہ ہو جائے۔ چنانچہ مستان کے ساتھ سوبار سلہری کے جنگلوں کا سفر شروع ہو گیا اور اس سفر کا آغاز ہی دل نشین تھا۔

صبح سورج نکلتے ہی ان کے قدم ان جنگلات میں داخل ہو گئے اور جوں ہی انہوں نے جنگل میں قدم رکھا تھا بارش شروع ہو گئی۔ سفر شروع کرنے سے قبل مستان کو ایک جوڑا کپڑے دیئے گئے تھے جو موٹے کپڑے کی ایک پتلون اور شرٹ پر مشتمل تھا۔ گو دونوں کپڑے مستان کے بدن پر ڈھیلے تھے اور لمبے تھے۔ لیکن مستان انہیں پہن کر سحر زدہ سا ہو گیا تھا۔ اس نے پتلون کے پائینچے الٹ کر ایک سُتلی سے کس کر باندھ لیے تھے۔ قمیض بھی چونکہ ڈھیلی تھی۔ اس لیے ایک سُتلی کمر پر باندھ پر اسے بھی فٹ کر لیا تھا۔ جوتے اور ہیٹ چکوتری میڈ ان تھے۔

مستان خود کو اس انگریز سے کم نہ سمجھ رہا تھا جس کے پاس اس کا باپ نوکر تھا۔ ہرمیت سنگھ نے کہا تھا۔ "کاش ہم اپنے ساتھ بہت سے پرانے کپڑے لے آتے۔ ان لوگوں کو کس قدر خوشی ہوتی۔"

"کیا معلوم تھا۔" شہباز نے کہا۔

جنگل تھوڑی ہی دور چل کر کھلے ہو گئے تھے۔ اس لیے یہاں بارش کی شدت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن جب وہ کسی ایسی جگہ پہنچتے جہاں درخت چھدرے ہوتے تو یوں لگتا جیسے آسمان کے سوتے کھل گئے ہوں۔ پانی دھاروں کی شکل میں گرتا نظر آتا۔

"یہ بارش پریشان کن ہو سکتی ہے۔" ہرمیت سنگھ نے کہا۔

"کیوں؟"

"علاقے اجنبی ہیں کون جانے آگے کیا ہو۔" ہرمیت سنگھ بولا۔

"آگے کیا ہے یہ ہی دیکھنے کے لیے تو ان علاقوں میں داخل ہوئے ہیں ورنہ ادھر آنے کی کیا ضرورت تھی۔" شہباز خان نے بے خوفی سے کہا اور ہرمیت سنگھ خاموش ہو گیا۔ گہرے سیاہ بادلوں کی وجہ سے

دن کی روشنی بھی رات کے اندھیرے میں تبدیل ہوگئی تھی۔ لیکن یہ اندھیرا اتنا نہ تھا کہ بینائی متاثر ہوتی۔ وہ اس دن کے سفر میں دور تک نکل جانا چاہتے تھے۔ سامان ان کے شانوں پر لدا ہوا تھا اور وہ مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ حالانکہ مستان نے ان کا تمام سامان اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن انہوں نے اسے روک دیا تھا اور سامان کے تین بیگ بنائے تھے۔ یہ بیگ بے حد وزنی تھے۔ لیکن کچھ دور چل کر انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مستان ان معاملے میں ان سے کہیں زیادہ مضبوط تھا۔

جنگل کا حسن ان کے سامنے عیاں تھا۔ بارش کی وجہ سے جانوروں میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی اور وہ اِدھر سے اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ راستے میں شہباز خان نے کہا۔

''کوئی فرق محسوس کر رہے ہو۔ ہرمیت۔''

''ہاں...... نمایاں، اس کی ابتدا ہی شاندار ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ آگے کے مناظر زیادہ دلچسپ ہوں گے۔''

''یاد ہے کہ ہم ایک بار ہمالیہ کی ترائیوں کے علاقے میں گئے تھے۔ وہاں کے جنگلات ان جنگلات سے کچھ ملتے جلتے تھے۔''

''رات کا وقت تھا۔ مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا میں نے سوچا کہ خاص قسم کی جنگلی گھاس ہے۔'' ہرمیت بھی ہنستا ہوا بولا۔

''مستان نے سیٹی بجانا شروع کر دی تھی اور تھوڑی دیر بعد ان دونوں نے بھی اس کے سروں سے سر ملانا شروع کر دیئے۔ پہلی آواز پر مستان کی سیٹی رک گئی تھی۔ لیکن اس کے بعد وہ کچھ سست ہو گیا تھا۔ آسمان سے گھٹاٹوپ اندھیرے اترتے رہے اور جب گھڑیوں نے شام نے سات بجائے تو وہ رک گئے۔ گویا قیام کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ درختوں کے پتوں سے بارش کے قطرے چھن رہے تھے۔ اس لیے آگ جلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ تھرماس میں چائے موجود تھی۔ جو بالکل تازہ جیسی تھی۔ عمدہ قسم کے بریڈ رول چائے کے ساتھ لطف دینے لگے۔ خوراک بھی کئی مرحلوں میں تقسیم کر لی گئی تھی۔ ابتدائی سفر میں ایسی چیزیں جو گھریلو طور پر تیار کی گئی تھیں اور کئی دن تک کارآمد رہ سکتی تھیں۔ اس کے بعد خشک اشیاء کا دور آتا تھا۔ پھر خشک کیے ہوئے پھل البتہ اس دوران شکار کیے ہوئے گوشت کو فوقیت دی جاتی تھی اور ساتھ لائی ہوئی خوراک محفوظ رکھی جاتی تھی۔

ابتداء میں ہرمیت سنگھ نے گوشت سے پرہیز کیا تھا۔ لیکن یہ بہت پرانی بات تھی۔ ایک بار اس نے انتہائی بھوک کے عالم میں آنکھیں بند کر کے بھنا ہوا گوشت کھایا تھا اور تھوڑا سا کھانے کے بعد آنکھیں کھول لی تھیں۔

''تیری ایسی کی تیسی شہباز تو نے مجھے پہلے کیوں نہ کھلایا یہ تو بہت عمدہ ہے۔''

''تمہارے دھرم میں نہیں کھاتے اس لیے میں نے مجبور نہیں کیا۔''

''مگر یار یہ تو بہت مزیدار ہے۔''

''تو پھر شروع کر دو!''

''شروع کر دو اب تو یہ ہی چلے گا۔'' پیٹ کا دوزخ بھرا تو آرام کی سوجھی ہرمیت سنگھ نے مستان سے کہا۔

''مستان تم رات کو کس وقت تک جاگ سکتے ہو؟''

''شارا نائٹ جاگے گا شر، آپ لوگ آرام سے شو جاؤ۔''

''اور کل صبح کیا ہوگا؟''

''آگے مارچ کرے گا۔''

''سوؤ گے نہیں؟''

''کل سو جائے گا۔ آج آپ لوگ سو جاؤ۔''

''ہاں تا کہ تمہارا کام آج ہی ہو جائے اور تمہیں زیادہ دور سے اپنی بستی واپس نہ جانا پڑے۔'' ہرمیت سنگھ دانستہ بڑبڑایا لیکن شہباز نے اس کے الفاظ سن لیے تھے۔

''کیا مطلب؟'' وہ بھی آہستہ سے بولا۔

''بھائی اس امکان کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا کہ مسٹر مستان ہمیں آرام سے سلا دیں اور جب ہماری نیند گہری ہو جائے تو خود اطمینان سے ہمارا سامان لے کر رفو چکر ہو جائیں۔ ابھی تو ان پر اعتبار کرنے میں بھی وقت لگے گا۔''

''اوہ...... ایسا لگتا تو نہیں ہے۔ تاہم تمہارا کہنا بھی درست ہے تو پھر کیا کیا جائے۔''

''وہی جو آج تک کرتے رہے ہیں۔ سوتا جاگتا رہا جائے۔ آج تو بارش نے زیادہ دور نہ جانے دیا۔ کل زیادہ سفر کریں گے اور پھر کوئی پسندیدہ آرام گاہ نظر آتے ہی قیام کریں گے۔''

''پھر یوں کیا جائے کہ ابتدائی چند گھنٹے آرام کر لیں اور پھر دوسرے پہر میں جاگ اٹھیں گے اور مسٹر مستان کو سلا دیں گے۔ ویسے بھی یہ بارش پورے طور سونے نہ دے گی۔ مستان کو بندوق دے دی گئی اور وہ مستعد ہو گیا دونوں آرام کرنے لگے تھے۔

بارش کے جلترنگ کے ساتھ مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دن میں بھی کبھی کبھی شیروں کی دھاڑ بھی سنائی دے جاتی تھی لیکن یہ آوازیں نہ تو ان کے لیے خوف کا باعث تھیں۔ نہ خطرناک وہ ان آوازوں سے آشنا تھے اور جانتے تھے کو کونسی آواز کب خطرناک ہوتی ہے۔ البتہ بارش پریشان کر رہی تھی اور کافی تیز ہو گئی تھی۔ گو ان کے پاس بارش سے بچنے کا بندوبست بھی تھا۔ لیکن پھر بھی اس عالم میں نیند تو نہیں آ سکتی تھی۔ وقفے وقفے سے دونوں آپس میں گفتگو کرنے لگتے۔ مستان پتھر کے بت کی مانند بندوق پر پلاسٹک ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بدن میں جنبش تک نہ تھی۔ کئی بار تو انہیں شبہ ہوا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے سو گیا ہے ایسے اوقات میں اسے آواز دی گئی۔ تو وہ چاق و چوبند لہجے میں بولا۔

میں جاگتا شر! آپ آرام سے سو جاؤ'' اور اس کے آرام سے سو جانے کے مشورے پر انہیں ہنسی آ گئی تھی۔

رات اسی عالم میں گزرتی رہی۔ دوسرے پہر کے بعد تو بارش کی ایسی جھڑی لگی کہ صبح تک اس کا زور ٹوٹا۔ لیکن صبح روشنی کی پہلی کرن نمودار ہوئی تو بارش رک گئی۔ وہ لوگ معمولات سے فراغت پانے کے بعد آگے بڑھنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ گو بارش کی وجہ سے جنگل خطرناک ہو گیا تھا۔ لیکن ان ہی خطرات سے کھیلنے کیلئے

تو وہ اپنی پرسکون سکونت چھوڑ کر وحشت ناک جنگلوں میں آ گئے تھے۔ بارش سے بڑھ جانے والے خطرات نے کیا کچھ لطف دیا تھا۔ یہ ایک مہم جو ہی جان سکتا ہے۔ جنگل جل تھل ہو رہے تھے اور جنگلی جانور بھیگی بلی بنے ہوئے تھے دو دن کے سفر میں انہیں کئی خطرناک جانور نظر آئے۔ جو پریشان حال ان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

مستان مست فطرت کا مالک تھا۔ وہ انہیں کی مانند اس سفر میں دلچسپی لے رہا تھا۔ بارش رک گئی تھی اور چند لمحات کے لیے سورج بھی نظر آیا تھا۔ لیکن صرف چند لمحات کے لیے۔ اس کے بعد پھر درختوں کی چوٹیاں سیاہ ہونے لگیں تھیں۔

''بارش ابھی ہو گی۔'' شہباز خان نے کہا اور یہ جملے ابھی پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ بارش کے قطرے نمودار ہو گئے۔ اور ایک بار پھر یہ قطرے موسلا دھار شکل اختیار کر گئے۔ لیکن سفر میں بارش کے علاوہ اور کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے اسے جاری رکھا۔ دونوں نے برساتیاں اوڑھ لی تھیں۔ جنہوں نے ان کے شانوں کو بھی ڈھک لیا تھا۔ البتہ تیسری بڑی برساتی موجود نہ تھی۔ اس کی کسر ایک اور واٹر پروف کپڑے نے پوری کر دی تھی اور مستان نے اسے اپنے سر کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ جنگل میں بارش کے شور کے علاوہ اور کوئی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔

''جنگلوں کا یہ سلسلہ کتنا طویل ہے؟''

''ناٹ ٹاویل کھائر ناک ڈینجرڈ ینجر۔'' مستان نے جواب دیا۔ وہ لفظ طویل نہیں سمجھ سکا تھا۔

''تو نے انگریزی کہاں سے سیکھ لی بھائی۔''

''اوہ...... شر امارا فاڈر انگریز کا شرونٹ ام تمارا شرونٹ شر۔''

''یہ آدمی شرونٹ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔'' ہرمیت سنگھ گہری سانس لے کر بولا۔

''لوشر آئی۔ ایم کک آپ شکار کرے گا۔ ام کک کرے گا۔'' مستان نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

بارش رکے گا تو ہم شکار کرے گا۔ بھائی ویسے اگر تو انگریزی نہ بولے تو تیری مہربانی ہو گی۔'' شہباز خان نے ہنستے ہوئے کہا اور مستان سامنے دیکھنے لگا اگر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی تو وہ اسے نظر انداز کر دیتا تھا۔

گھڑیوں کی سوئیاں آگے بڑھتی جا رہی تھیں آسمان سے گویا نالے چل رہے تھے البتہ حیرت ناک بات یہ تھی کہ جنگل میں پانی نہیں جمع ہوا تھا۔ بلکہ تیز دھاریں درختوں کے درمیان بل کھاتی عقبی سمت نکل رہی تھیں۔ دن کا وقت تھا۔ لیکن بجلی کے کوندے صاف محسوس ہو رہے تھے۔ بادل بھی خوب گرج رہے تھے۔ وہ صبر و سکون سے آگے بڑھتے رہے۔ نہ جانے کتنا سفر اسی طرح طے ہو گیا۔ پھر درختوں کی ہیئت تبدیل ہونے لگی تھی۔

بارش کا شور بدستور تھا۔ لیکن اچانک ان کے کانوں نے ایک اور شور سنا اور ایک لمحے کے لیے ان کے قدم ٹھٹھک گئے۔ یہ بارش کا شور نہیں تھا۔ بلکہ ایک عجیب و غریب سا خوفناک شور تھا۔ جس میں جانوروں کے چلانے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ ہاتھی کی چنگھاڑ کے ساتھ بھینسوں کے ڈکرانے کی آوازیں۔ پھر اچانک دل دہلا دینے والا تڑاخا ہوا اور فضاء میں ایک مسلسل گرج سنائی دینے لگی۔ اس گرج میں درختوں کے ٹوٹنے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ گو یہ آوازیں کافی دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں لیکن رفتہ رفتہ آگے بڑھتی محسوس

ہو رہی تھیں۔ اب انہیں سنبھلنا پڑا تھا۔

''شہباز...... یہ پانی کا شور ہے۔'' ہرمیت سنگھ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''کوئی طوفانی ریلا۔'' ہرمیت سنگھ نے اتنا ہی کہا تھا کہ یکدم ان سے کچھ فاصلے پر بائیں سمت انہیں اونچے درختوں کی چوٹیاں سرنگوں ہوتی دکھائی دیں۔ ان کے موٹے تنے تڑخ تڑخ کر ٹوٹ رہے تھے اور میلے دھندلکے میں پانی کی ایک طوفانی دیوار برق رفتاری سے اپنی زد میں آنے والے ہر شے کو سمیٹتی ہوئی ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس وقت مستان کی دہشت زدہ آواز ابھری۔

''آرباناشو...... آرباناشو لکشو، لکشو...... آرباناشو۔''

اس کے ساتھ ہی مستان ان کی برساتیاں کھینچتا ہوا ایک سمت دوڑ پڑا۔ لیکن ان کی رفتار پانی کی رفتار سے تیز نہ تھی۔

پانی کی مہیب دیوار ہولناک گرج کے ساتھ قریب سے قریب آتی جا رہی تھی اور اب مستان کے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود بھی جانتے تھے کہ موت نے اچانک انہیں تاک لیا ہے اور موت برق رفتاری سے ان کی طرف لپک رہی ہے۔ اس حالت میں فطری طور پر انہیں پانی کی مخالف سمت دوڑنا تھا۔ لیکن یہ کوئی حل نہیں تھا۔ کیونکہ پانی چند ہی لمحات میں ان تک پہنچنے والا تھا اور پانی کا یہ طاقتور ریلا جس نے بڑے بڑے درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ کر اپنے بہاؤ میں لے لیا تھا۔ انہیں کیا خاطر میں لاتا۔ وہ جان توڑ کر دوڑ رہے تھے۔ مستان کی رفتار ان سے بھی تیز تھی اور شاید اس کے ذہن میں کچھ تھا۔ کیونکہ اچانک ہی اس نے سیدھ میں دوڑتے دوڑتے رخ تبدیل کیا تھا اور رک کر چیخا تھا۔

''بلا کا شائی ہو۔ لکشو لکشو۔''

اس کے ناقابل فہم الفاظ پہلے ان کی سمجھ میں نہ آئے تھے۔ لیکن اندازے سے انہوں نے سمجھ لیا تھا۔ کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس وقت بھی وہ بے اختیار اس کی تقلید میں رخ بدلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بلاشبہ اس وقت مستان نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ ورنہ وہ درخت ان کی نگاہ میں نہیں آیا تھا۔ جس کا تنا تقریباً نو فٹ کے دائرے میں تھا اور جس کی لاتعداد شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئے تھیں۔ یہ شاخیں بھی عام درختوں کے موٹے تنوں سے کہیں زیادہ موٹی تھیں۔ مستان دوڑ کر کسی بندر ہی کی مانند درخت کے تنے پر چڑھ گیا۔ ہرمیت سنگھ نے رک کر شہباز کا ہاتھ پکڑا اور اسے درخت پر چڑھا کر خود بھی اوپر چڑھنے لگا اور وہ ان شاخوں کے پھیلاؤ میں پھیل گئے۔ پانی کی بلندی کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ زیادہ بلندی پہ پہنچ جایا جائے۔ درخت پر پہنچنے کے بعد البتہ وہ ایک دوسرے کا خیال نہ کر سکے طوفان برق رفتاری کے ساتھ ہر شے کو ڈھکتا ہوا۔ اس درخت پر لپکا اور اس قوت سے اس سے ٹکرایا کہ پورا درخت ہل گیا۔ اس کا سارا تنا پانی سے ڈھک گیا اور پھر شاخیں بھی پانی میں ڈوبنے لگیں۔

ریلا آگے بڑھ گیا تھا۔ خوفناک گرج سماعت کی برداشت سے کہیں زیادہ تھی۔ ان کے ذہن گم ہو گئے تھے اور کچھ دیر کے لیے۔ وہ ایک دوسرے سے قطعی بے خبر ہو گئے تھے۔ البتہ اب ریلا آگے بڑھ گیا تو

کیفیت بہتر ہوئی۔ پانی اب بھی درخت کو ٹکریں مارتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور اور اس کے جلو میں نہ جانے کیا کیا تھا۔ درختوں کے ٹوٹے ہوئے تنے، شاخیں۔ ان شاخوں میں لپٹے ہوئے سانپ، ننھے ننھے کمزور جانور جو پانی کی ضرب سے مر ہی گئے تھے۔ دیوہیکل درندے اور نہ جانے کیا کیا۔ آنکھیں کھولنا مشکل ہو رہا تھا۔ تاہم شہباز خان نے ہرمیت سنگھ کو تلاش کیا وہ قریب کی دوسری چوڑی شاخ پر تھا اور پتوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

''مستان...... مستان کہاں ہے؟'' شہباز حلق پھاڑ کر چیخا۔

''ام ادر ہے شیر۔'' شہباز کو اپنے عقب سے آواز سنائی دی اور اس گردن گھوم گئی۔ مستان ایک اور چوڑی شاخ پر اُگے ہوئے دوشاخے کو پکڑے پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوا تھا اور شہباز سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہرمیت سنگھ نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور پھر پھدکتا ہوا احتیاط کے ساتھ اس شاخ کی طرف بڑھنے لگا۔ جس پر شہباز بیٹھا ہوا تھا۔ خوردنی سامان کے تھیلے کی وجہ سے اسے دقت ہو رہی تھی۔ لیکن وہ سنبھلتا ہوا بالآخر شہباز کے پاس پہنچ گیا۔ پانی اب بھی جھاگ اڑاتا درختوں سے ٹکراتا گزر رہا تھا اور اس کے ساتھ بہنے والی بہت سی چیزوں کو اس مضبوط درخت کے سہارے رکنے کا موقع مل گیا تھا۔ چنانچہ تنے کے گرد لکڑیوں کا پھیلاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے اور مستان دوسری شاخ پر تھا۔ لیکن ان سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ لیکن سب کی زبانیں گنگ تھیں۔ وہ کچھ ایسے اعصابی دباؤ کا شکار ہو گئے تھے کہ زبانیں ہلانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ان کی وحشت سے پھٹی ہوئی آنکھیں پانی کی حشر سامانیاں دیکھ رہی تھیں۔ پانی کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا ایک تیندوا پوری قوت سے درخت کے تنے سے ٹکرایا اور اس کے نوکیلے پنجوں نے درخت کے تنے کو پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن پانی کی ایک طوفانی لہر اسے تیز رفتاری سے بہاتی ہوئی لے گئی۔ لمبے لمبے ناگ درخت کے تنے سے ٹکراتے اس کی جانب لپکتے لیکن پانی کی قوت کے آگے بے بس ہو جاتے وہ گہری گہری سانسیں لے کر اپنے اعصاب کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ رفتہ رفتہ پانی کا زور ٹوٹنے لگا۔ درخت کا تنا بدستور پانی سے ڈھکا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے پانی اس تنے سے نیچے نہیں جائے گا۔ البتہ اس کا زور ٹوٹنے سے اب یہ آس بندھ گئی تھی کہ اس کی بلندی اس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ تناور درخت نے ان کی زندگی کو بچانے میں اپنا کردار ادا کر لیا تھا اور مستان کی نگاہوں نے خوب کام کیا تھا۔

نہ جانے اس نے یہ درخت کب اور کیسے دیکھ لیا اور پھر اس بات کے امکانات بھی تھے کہ بس بے تحاشا دوڑتے ہوئے اسے یہ درخت نظر آ گیا تھا اور بروقت ہی اس کی جانب دوڑنے کی سوجھ گئی تھی۔ ریلے کی توڑ پھوڑ کی آواز اب کافی دور سنائی دے رہی تھی اور رفتہ رفتہ اس طرف سکون ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن پانی کے بہاؤ میں اب بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ جب تک یہ ریلا اپنے سارے حجم کے ساتھ پھیل نہیں جاتا۔ پانی ساکت نہ ہو سکے گا۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں بس سلب ہی ہو گئیں تھیں۔

چنانچہ ابھی اس طرف ذہن نہیں گیا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور کیا ہوگا...... پھر جب پانی کی رفتار کی آواز نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ تو سماعت واپس آنے لگی۔ تو ذہن میں اب بھی شدید سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ لیکن غیر معمولی اعصاب کے مالک دونوں دوست خود کو سنبھالنے میں مصروف تھے۔ ہرمیت سنگھ نے شہباز خان کے بازو پر ہاتھ رکھا اور گہری سانس لے کر پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''کہو شہباز! یہ منظر کیسا لگا؟'' جواب میں شہباز کا قہقہہ ابھرا اور اس نے کہا۔

''ہماری زندگی کا سب سے بیش قیمت اور ہولناک منظر تھا یہ۔''

''اگر یہ درخت ہمیں نہ ملتا تو کیا ہوتا؟''

''پانی کے گھوڑے پر سواری کا لطف آتا اور پھر کسی درخت سے ٹکرا کر چند سرخ لکیروں کے ساتھ فنا ہو جاتے۔'' شہباز نے بے خوفی سے جواب دیا اور ہرمیت سنگھ گردن ہلانے لگا۔ پانی کا بہاؤ اب تقریباً بالکل ختم ہو گیا تھا اور بس ہلکی ہلکی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ وہ لوگ درختوں کی شاخوں پر خود کو سنبھالے بیٹھے ہوئے تھے کہ اوپر سے مستان کی آواز ابھری۔

''شر کچھ کھانے کو مانگتا ابھی چائے گرم ہے؟''

''خدا کی پناہ...... یہ شخص پاگل پن میں ہم سے کسی طور کم نہیں......''

''ویسے اس کی تجویز بہت عمدہ ہے۔ اس وقت گرم چائے دنیا کی سب سے بڑی نعمت محسوس ہوگی۔ نکالی جائے......''

''ضرور......'' شہباز خان نے کہا اور وہ اپنے سامان کے تھیلے ٹٹولنے لگے تھرماس میں بس اتنی چائے تھی کہ وہ آخری بار پی لیں۔ اس کے بعد چائے کا تصور فی الحال ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ نیچے پانی کی زمین تھی اور درخت پر آگ جلانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مستان کو بھی اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنے تھیلے سے چائے کا تھرماس نکال لے...... انسانی جسم کی ضرورت کس قدر عجیب ہوتی ہے۔ یہاں ایک طوفان برپا تھا اور وہ لوگ چائے کے گرم گرم گھونٹ اپنے معدے میں اتار رہے تھے۔ چائے کے چند گھونٹ لینے کے بعد ہرمیت سنگھ نے اوپر منہ کر کے پوچھا۔

''جنگل کے بے وقوف، یہ پانی کہاں سے آیا اور تو ایک بے تکی زبان سے کیا چیخا تھا؟'' جواب میں مستان کے دانت نکل پڑے اور اس نے کہا۔

''شر میں بولا تھا پانی آ رہا ہے۔ بھاگو...... بھاگو ایشا لگتا ہے کہ دریا سلہری کے کنارے ٹوٹ گئے یہ پانی ادھر شے ہی آیا۔''

''کیا سلہری ادھر سے گزرتا ہے؟''

''لیش شر...... لیش شر۔'' مستان نے جواب دیا اور ہرمیت سنگھ گہری گہری سانسیں لینے لگا پھر بولا۔

''مگر اب کیا ہوگا؟''

''میں بولتا شر کہ پانی اتر جائے گا اور ہم آگے جائے گا۔''

''چیز یہ بھی عمدہ ہے۔ خوب تلاش کی ہم نے۔'' شہباز خان نے چائے کا ایک اور گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

وہ اب بھی پانی کی حشر سامانیاں دیکھ رہے تھے۔ بہنے والی چیزیں اب بھی سست روی سے آگے بہہ رہی تھیں۔ چائے پینے کے بعد انہیں کچھ اعصابی سکون نصیب ہوا۔ تو انہوں نے آرام کے لیے بہتر جگہ کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ لیکن یہی شاخ سب سے غنیمت تھی۔ کیونکہ چوڑی تھی اور اس میں جگہ جگہ دوشاخ اُگے

ہوئے تھے اوران دوشاخوں کی وجہ سے نیچے گرنے کا خطرہ بھی نہیں تھا۔ ویسے نیچے گرنا بھی اس وقت موت ہی کے مترادف تھا۔ چونکہ پانی میں جھاڑیوں میں لپٹے ہوئے لاتعداد حشرات الارض نظر آ رہے تھے۔ جو بظاہر تو مردہ محسوس ہوتے تھے۔ لیکن کون جانے ان میں سے کون سا زندہ ہے۔ کئی سانپوں کو انہوں نے درخت پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

لیکن یہ اس وقت کی بات تھی۔ جب پانی کا بہاؤ تیز تھا۔ اس بات کو بہرحال ذہن میں رکھنا تھا کہ کہیں کوئی ایسا سانپ اور نہ چڑھ آئے۔ جو ان کے لیے باعث ضرر ہو اور یہ گفتگو کرنے کے بعد انہوں نے رائفلیں سنبھال لیں تھیں۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ لیکن ہلکی اور رائفلوں کو انہوں نے برساتیوں کی آڑ میں ہی رکھا تھا۔ تاکہ کارتوس سرد نہ ہو جائیں۔

بہرحال بڑی خوفناک کیفیت تھی اور شاید اس کیفیت کو وہ مرتے دم تک فراموش نہیں کر سکتے اب تک انہوں نے لاتعداد جنگلوں میں شکار کھیلے تھے۔ بہت سے ہولناک مناظر سے گزرنا پڑا تھا اور زندگی بچانے کے لیے شدید جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ لیکن اس سے زیادہ ہولناک منظر ان کی زندگی میں اور کوئی نہیں تھا۔

وہ جانوروں کی طرح درخت کی شاخوں سے چمٹے ہوئے تھے اور نیچے تاحدِ نگاہ پانی بہہ رہا تھا۔ درخت کے تنے پر جس حد تک وہ اوپر چڑھے تھے۔ اس سے یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ پانی کی گہرائی کتنی ہے اور یہ گہرائی بے حد ہولناک تھی۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ بارش ایک بار پھر رک گئی تھی۔ لیکن آسمان پر بادلوں کا بسیرا تھا اور کبھی کبھی ان کی گڑگڑاہٹ سنائی دے جاتی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ بارش پھر ہو گی، مستان کے کہنے کے مطابق اگر دریائے سلہری کے کنارے بہہ نکلے تھے۔ تو ان کے بہنے کا انداز جیسا طوفانی تھا۔ اس کا جائزہ تو یہ لوگ لے ہی چکے تھے۔ مزید بارش نے اگر ایک بار پھر دریا کو طوفانی شکل اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تو اس بات کے امکانات بھی تھے کہ یہ تناور درخت اپنی جگہ قائم نہ رہ سکے گا۔

یقیناً پانی کا کوئی ریلا اسے اپنی جگہ سے اکھاڑ بھی سکتا ہے۔ حالانکہ عام حالات میں اس درخت کو ایک محفوظ عمارت کی حیثیت دی جا سکتی تھی۔ بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ طاقتور تھا۔ لیکن بادل گڑگڑاتے رہے اور صرف خوفزدہ کرتے رہے۔ اس کے بعد بارش نہیں ہوئی تھی۔ البتہ رات تیزی سے جھکتی چلی آ رہی تھی۔ مستان تو شاید اپنی جگہ سے ہلنے کی جرأت نہیں کر پا رہا تھا۔ ویسے اسے بھی مضبوط شاخ مل گئی تھی۔ بھوک معدے میں گڑبڑ پیدا کرنے لگی تھی اور دونوں مہم جوؤں نے بھوک دور کرنے کے لیئے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

پانی ابھی تک درخت کے تنے سے نیچے نہیں اترا تھا اور اندازہ ہو رہا تھا کہ ابھی اس کا زور نہیں ٹوٹا ہے۔ خوفناک سیلاب اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ بہرحال اب انہوں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

چنانچہ کھانے کی تیاریاں کی گئیں اور معدے کو تھوڑی بہت تقویت پہنچائی گئی کہ جسمانی قوتیں بحال رہیں۔ اس کے بعد مکمل خاموشی چھائی رہی وہ بات کرنے میں عار محسوس کر رہے تھے۔ اس وقت اسے جنگل کہنا بھی مضحکہ خیز تھا۔ بس یوں لگتا تھا جیسے سمندر میں درخت اگ آئے ہوں یا وہ کسی وسیع و عریض جھیل میں لٹکے ہوئے ہوں۔ گو وہ دونوں مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ لیکن انسان تھے اور ان واقعات سے متاثر تھے۔

چنانچہ ان کے ذہنوں پر تھکن طاری تھی اور زیادہ باتیں کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ یہی ذہنی تھکن غنودگی میں ڈھل گئی اور غنودگی نیند میں تبدیل ہو گئی۔ چوڑی شاخوں پر عالم نیند میں وہ کیسے قائم رہے۔ یہ سوال ناقابل جواب ہے۔ یہ کام کسی اور کا ہے اور جس کا کام اسی کو ساجھے اس کا مظاہرہ بھی سامنے آ گیا۔

سورج چمک اٹھا تھا اور ہر شے روشن ہو گئی تھی کہ اچانک ہی مستان کی چیخوں نے خاموش ماحول میں ہلچل مچا دی۔ وہ نہایت بھیانک آواز میں چیخا تھا اور اس کی مسلسل چیخوں سے ہی وہ جاگ اٹھے تھے۔ بے خیالی میں دونوں ہی نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی اور ایک لمحے میں خود کو سنبھال لیا ورنہ پانی میں گر پڑتے۔ البتہ اس جھٹکے سے سنبھل کر انہوں نے مستان کی ہولناک چیخوں کی سمت کا تعاقب کیا تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ مستان اسی اوپر والی شاخ پر لمبا دراز تھا اور تقریباً ڈھائی انچ موٹا اور نہ جانے کتنا لمبا پیلے رنگ کا سانپ اس کے بدن سے لپٹا ہوا تھا۔

سانپ کے پیلے بدن پر گہرے کتھی رنگ کے گول دھبے پڑے ہوئے تھے اور اس کا موٹا بدن شاخ اور مستان کے بدن سے لپٹا ہوا تھا۔ مستان کی وحشت ناک چیخیں ابھرتی رہیں۔ اور ہرمیت سنگھ نے سنبھل کر رائفل اٹھالی۔ لیکن شہباز نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا وہ عجیب سے نظروں سے مستان کو دیکھ رہا تھا۔ مستان کے ہاتھ بے بسی سے جنبش کر رہے تھے اور اس کا گلا بیٹھا جا رہا تھا۔ سانپ کے خوف سے اس پر نیم بے ہوشی سی طاری ہو گئی تھی جب کہ سانپ آہستہ آہستہ اپنے بل کھول رہا تھا۔ ہرمیت سنگھ اور شہباز خان ساکت نگاہوں سے سانپ کی یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔

سانپ نے اپنے بل کھول دیئے اور مستان کا بدن نیچے لٹکنے لگا۔ تب ہی اس نے ایک دم چیخ کر شاخوں کو پکڑ لیا اور تب ہی سانپ نے اپنا بقیہ جسم بھی اس کے بدن سے کھول دیا پھر وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا اور ایک اور شاخ پر رینگتا ہوا بلندی کی جانب چلا گیا۔ ہرمیت سنگھ نے ایک حیرت بھری گہری سانس لی۔ پھر وہ دونوں ہی مستان کو زور زور سے آوازیں دینے لگے۔ مستان اب بھی چیخ رہا تھا۔ اگر وہ شاخوں کو مضبوطی سے نہ پکڑ لیتا تو یقیناً نیچے پانی میں گر پڑتا۔ اس موقع پر شہباز خان نے اپنی جگہ سے جنبش کی اور چوڑی شاخ سے دوسری شاخ پر اور پھر وہاں سے اس شاخ پر پہنچ گیا۔ جس پر مستان موجود تھا۔ اس نے مستان کے لباس کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں جکڑا اور پھر مستان کے رخسار پر زور زور سے تھپڑ رسید کرنے لگا۔

''ہوش میں آؤ مستان! ہوش میں آؤ ورنہ نیچے پانی میں گر پڑو گے مستان نے دہشت بھری آنکھوں سے شہباز خان کو دیکھا اور پھر کھکھیائے ہوئے لہجے میں چیخا۔

''سانپ، سانپ۔''

''سانپ کے بچے اپنے آپ کو سنبھالو ورنہ نیچے پانی میں گر پڑو گے سانپ چلا گیا۔'' شہباز نے کہا اور مستان کی آواز رک گئی۔ اس نے اردگرد کے ماحول کو دیکھا اور پھر جلدی سے اپنے بدن کو شاخ پر سیدھا کر لیا۔

''آؤ نیچے اتر آؤ بڑے مزے سے شاخ پر لیٹ کر سو گئے تھے۔ اس سانپ کا شکریہ ادا کرو۔ جس نے تمہیں اپنے بدن کا تحفظ دیا ورنہ نیند کے عالم میں تم نیچے پہنچ جاتے۔''

بہ مشکل تمام مستان شہباز کے ساتھ نیچے اتر کر اس شاخ پر پہنچا تھا۔ جس پر ہرمیت موجود تھا۔

سانپ کی یہ کارروائی ناقابل یقین تھی اور بلاشبہ اس کی نیت پر شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو مستان کے جسم کے گرد لپیٹ کر صرف اور صرف اسے نیچے گرنے سے بچایا تھا اور اس کے جاگ جانے کے بعد اپنا فرض پورا کر کے اوپر چلا گیا تھا۔ یہ تینوں اس واقعہ سے اس قدر متاثر تھے کہ دیر تک اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں کر سکے اور خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہے مستان تو بہت سہما ہوا تھا۔

پھر ہرمیت سنگھ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''یہ باتیں اگر سمجھ میں آجائیں۔ تو قانون قدرت ہی کیوں نہ سمجھ آجائے۔'' شہباز خان نے جواب دیا۔ اس کے بعد پیٹ کی جانب توجہ دی گئی۔ پانی درخت کے تنے سے اس نشان سے جو اس کا آخری نشان تھا۔ تقریباً چھ انچ نیچے چلا گیا تھا اور اندازہ یہ ہوتا تھا کہ اب اس کے اترنے کا وقت ہو چکا ہے۔ دن بھی چمکدار تھا۔ جس کی بناء پر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ بارش فی الحال نہیں ہو گی درختوں کے پتوں سے نیلا شفاف آسمان جھلک رہا تھا۔ انہوں نے اس مہربان درخت کی شاخوں پر نگاہیں دوڑائیں اور پھر ایک اور ہولناک کیفیت سے دوچار ہو گئے۔ اس شاخ سے زیادہ سے زیادہ بیس گز کے فاصلے پر ایک موٹی شاخ بھی پھیلی ہوئی تھی۔ جو نیچے جھک کر پانی تک پہنچ گئی تھی اور اس کا آخری سرا پانی کو چھو رہا تھا۔ لیکن اس شاخ پر ایک ہولناک شے نظر آئی تھی اور یہ ہولناک شے ایک بہت ہی لمبے قامت کا شیر تھا۔ جو بلی کی طرح پنجوں کے بل شاخ پر بیٹھا ہوا تھا اور اپنے جسم کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کی پیلی خونخوار آنکھیں ان تینوں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ خاموشی سے بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔

غالباً طوفان کے کسی حصے میں وہ پانی میں بہتا ہوا تیرتا ہوا اس شاخ تک پہنچا تھا اور اس نے شاخ پر پناہ لی تھی۔ لیکن اب اس کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ وہ کسی قدر بھوکا ہے اور اپنی خوراک کو تاک رہا ہے۔ تینوں نے بیک وقت اسے دیکھا تھا۔ اور سہم کر ساکت ہو گئے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے کھانے پینے کے چکر میں ان کی جسم جنبش کرتے رہے تھے۔ ہرمیت سنگھ نے آہستہ آہستہ رائفل سنبھالی اور غیر محسوس انداز میں اس کا جائزہ لینے لگا۔ تاکہ شیر کو اپنا نشانہ بنالے۔ لیکن شہباز کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے ہرمیت سنگھ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک لیا اور سرد لہجے میں بولا۔

''نہیں ہرمیت ہم اس پر فائر نہیں کریں گے۔''

''کک کیوں اس کی آنکھوں کو دیکھ رہے ہو۔ وہ ہماری گھات میں ہے۔''

''نہیں تم نے شاید غور نہیں کیا اس وقت اس کی آنکھوں میں کوئی ضرر رساں کیفیت نہیں ہے۔ بلکہ وہ زبان حال سے ہمیں سمجھا رہا ہے کہ نہ وہ ہمارے لیے خطرناک ہے اور نہ ہمیں اس کے لیے خطرہ بننا چاہیے۔''

''تم جذباتی گفتگو کر رہے ہو شہباز۔''

''نہیں ہرمیت سنگھ غور کرو اس سانپ پر جس نے مستان کے بدن کو پانی میں گرنے سے بچایا تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت سامنے آئی ہے۔ زندہ رہے تو اس کیفیت کو رقم کریں گے۔ اس وقت یوں لگتا ہے جیسے اس آفت زدہ علاقے میں سب جان دار ایک دوسرے کے ہمدرد ہو گئے ہوں ہمارے جاگتے وقت شیر اس شاخ پر نہیں آیا اور اگر رات کو پہنچا ہے تو یہ ہماری بو سے ناآشنا نہ ہوگا۔ یہ صرف پناہ گزین ہے اور اس پر گولی چلانا مردانگی نہیں ہے۔ اس نے جانور ہو کر انسانیت کا ثبوت دیا ہے، تو ہم انسان ہو کر درندگی کا ثبوت کیسے دے سکتے

ہیں، تاہم اس کی طرف سے مستعد رہو۔ اگر اس کے اندر وحشت پاؤ تو پھر ہم بھی وحشت خیزی میں اس سے کم نہ ہوں گے۔''

ہرمیت سنگھ رک گیا اس نے رائفل آہستہ سے اپنے رانوں پر رکھ لی لیکن بڑا عجیب سا ماحول بن گیا تھا۔ وہ شیر پر نگاہیں جمائے ہوئے بیٹھے تھے اور شیر خاموشی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ دونوں ہی اپنے اپنے طور پر مستعد تھے۔ وقت نہ جانے کس طرح گزر رہا تھا۔ مستان بالکل خاموش تھا۔ نہ جانے کیوں انہیں یہ احساس تھا کہ اگر ان کے جسموں کو جنبش ہوئی تو پھر کچھ شروع ہو جائے گا۔ پانی آہستہ آہستہ نیچے اتر رہا تھا اور وہ دن گزرتا جا رہا تھا۔

آسمان پر دوبارہ بادل نہیں چھائے تھے۔ نہ جانے وقت انہیں یہ کہانی سنا کر ان سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ وقت کی کہانی سورج کے ساتھ سفر کرتی رہی اور ان کی شکاری زندگی میں ایک ایسے ناقابل فہم اور ناقابل فراموش باب کا اضافہ ہوا تھا۔

جسے واقعی کبھی نہیں بھلایا جاسکتا تھا۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ شیر نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی تھی اور شاید اب وہ مطمئن بھی ہو گیا تھا کہ اس کے سامنے اس جیسے ہی موجود ہیں اور اعلیٰ ظرفوں سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ پانی کی سطح اب تناور درخت کی جڑ تک پہنچ گئی تھی۔

لیکن ابھی پانی کافی باقی تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرنے لگی۔ نیند کا کسی کی آنکھ میں شائبہ نہیں تھا۔ ان کے سامنے ایک وحشی درندہ موجود تھا۔ اس سے پہلے اس درندے کو انہوں نے جنگل میں مختلف اشکال میں دیکھا تھا۔ پھر اس وقت چاند پوری آب و تاب کے ساتھ نکل آیا تھا اور درختوں کے پتوں سے روشنی چھن چھن کر زمین تک پہنچ رہی تھی کہ دفعتہ انہوں نے شیر کے جسم میں جنبش دیکھی اور ہرمیت سنگھ نے آہستہ سے رائفل گود سے اٹھالی۔ شیر درخت کی شاخ پر دو قدم آگے بڑھا اور اس کے بعد اس نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ ساتھ ہی اس کے گرج بھی ابھری تھی۔ ان کی نگاہیں شیر پر جمی رہیں۔ شیر پانی سے بچتا ہوا چھلانگیں لگاتا دور چلا جا رہا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ نگاہوں سے روپوش ہو گیا۔

ہرمیت سنگھ نے گہری سانس لے کر رائفل گود میں رکھ لی تھی اور اس کے بعد اس نے درخت کی شاخ سے پشت ٹکا دی۔ شیر کی اس کارروائی نے یہ بھی بتا دیا کہ اب پانی کا خطرہ نہیں ہے۔ کیونکہ حیوانی حسیات اس سلسلے میں انسانوں سے زیادہ تیز ہوتی ہیں۔

یہ رات پرسکون گزری تھی۔ لیکن انہوں نے رات میں درخت سے نیچے قدم نہیں رکھا تھا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی مستان نے سب سے پہلے نیچے چھلانگ لگا دی اور پھر خوشی سے چیخا۔

''شر، شر، نیچے اتر آیئے۔ پانی فنش ہو چکا ہے۔'' دونوں مسکراتے ہوئے نیچے آگئے۔

''درخت کی طرف رخ کر کے اس سانپ کا تو شکریہ ادا کر دو مستان۔ جس نے تمہاری جان بچائی تھی۔''

''لیش شر...... لیش شروہ ہو گیا۔ میں اس کو تھینک یو کر لیا۔''

مستان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر اچانک اپنا بیگ شانوں پر کسنے لگا۔ شہباز اور ہرمیت سنگھ بھی نیچے آگئے۔ وہ ہولناک وقت نکل گیا تھا جس نے انہیں زندگی سے دور کر کے موت کے قریب کر

دیا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھ گئے۔ اس علاقے کی مٹی میں یہ خوبی تھی کہ اس زبردست بارش کے باوجود اس میں کیچڑ نہیں پیدا ہوئی تھی۔ لیکن جنگل میں جو ہولناک مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ دل لرزا رہے تھے۔ چند ہی قدم چلے تھے کہ انہوں نے طوفان کی ہولناک تباہ کاریوں کا نظارہ کیا۔ جو درخت جڑوں سے اکھڑ کر پانی کے ساتھ بہہ گئے تھے۔ ان کی جڑوں کی جگہ گہرے گڑھے ہوگئے تھے اور ان میں پانی بھرا ہوا تھا۔

جھاڑ جھنکار ٹوٹے درختوں کی شاخوں نے بعض جگہ راستے بالکل بند کردیئے تھے اور ان پر سے بڑی مشکل سے گزرا جا سکتا تھا۔ پھر سب سے زیادہ ہولناک اس میں پھنسی ہوئی جانوروں کی لاشیں تھیں۔ نیل گائے، بارہ سنگھے، ہرن، تیندوے اور بعض جگہ شیر بھی سب اس آفت کا شکار ہوئے تھے اور زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ شہباز نے اداس لہجے میں کہا۔

''بڑی ہولناک طغیانی تھی۔ خدا نے ہمیں خصوصی طور پر اس درخت کا سہارا عطا فرمایا تھا۔ ورنہ ہمارا ٹھکانہ کہاں ہوتا۔''

''اس میں کوئی شک نہیں ہم پانی کے ساتھ نہیں دوڑ سکتے تھے۔ آخر کہاں تک جاتے۔''

''ویسے اب سفر کی رفتار تیز کرنی ہوگی۔ یہ ضروری ہے۔ ورنہ لاشیں سڑنے لگیں گی اور تعفن کے ساتھ جراثیم پیدا ہو جائیں گے۔ ہرمیت سنگھ نے شہباز خان کی اس بات سے اتفاق کیا تھا۔ اب یہ اس کی دلیری تھی کہ ان حالات کا شکار ہونے کے باوجود انہوں نے واپسی کے لیے نہیں سوچا تھا۔ جب کہ آگے ہی کا رخ اختیار کیا تھا۔

رفتار تیز کردی گئی اور راستے کی مشکلات کے باوجود شام ہونے تک وہ کافی دور نکل آئے تھے۔ اب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا اور ان خطرناک راستوں پر سفر جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ لیکن یہ خوش گوار رات نہیں تھی۔ دن بھر تیز دھوپ پڑی تھی۔ اس لیے اطراف میں پڑی ہوئی لاشیں سڑنے لگی تھیں۔ ان میں ہلکا ہلکا تعفن شروع ہوگیا تھا۔ جو صبح ہونے تک اور بڑھ گیا۔ چنانچہ جونہی کچھ اجالا ہوا انہوں نے فوراً دوبارہ سفر شروع کردیا۔ جس کی تیاری پہلے ہی کرلی گئی تھی اور اب سفر دوڑنے کے سے انداز کا تھا۔ مستان ہر حالت میں تعاون کرتا تھا۔ سب سے آگے وہی دوڑ رہا تھا۔ حالانکہ وہ اسے کئی بار تیز رفتاری سے چلنے سے منع کر چکے تھے کہ کہیں کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔ پھر اس وقت گھڑیاں دوپہر کا ایک بجا رہی تھیں۔ جب انہوں نے اچانک محسوس کیا کہ اس طرف تباہ کاری کے آثار نہیں تھے۔ خشک زمین شروع ہوگئی تھی اور جنگل بھی بہتر حالت میں تھا۔ یہاں وہ چند لمحات کے لیے رک گئے۔ شہباز اور ہرمیت دونوں ہی صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے شہباز نے کہا۔

''تم نے صورتِ حال کا جائزہ لیا ہرمیت۔''

''ہاں اندازہ ہوتا ہے کہ دریا کا رخ بائیں سمت ہے اور دائیں سمت کے علاقے اس کی زد میں نہیں آئے۔ اس سیلاب کا آغاز بائیں سمت سے ہی ہوا ہے۔''

''یہ علاقہ زد میں نہیں آیا۔''

''میرے خیال میں ہمیں سیدھے ہی بڑھنا چاہیے۔ شام تک کافی دور نکل جائیں گے۔ اس فیصلے کے بعد وہ آگے بڑھ گئے۔ تقریباً پینتالیس منٹ سفر کرنے کے بعد اچانک درختوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ درختوں

کے دوسری طرف چٹانی سرزمین تھی۔ ناہموار اور خشک، ماحول پر کچھ پیلاہٹ سی سوار تھی اور اس کی وجہ بھی معلوم ہوگئی تھی۔ چٹانیں اور زمین بالکل پیلی تھیں لیکن اس زردی میں اور جو کچھ نظر آیا تھا۔ وہ لرزہ خیز تھا۔ وسیع وعریض چٹانی میدانوں میں ہر طرح کے جانوروں کے غول کے غول نظر آ رہے تھے ننھے معصوم جانور ساکت ایک دوسرے میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان میں چیتل، سانبھر، بھورے ہرن وغیرہ تھے۔ ان کے اطراف میں کہیں کہیں چیتے اور شیر بھی نظر آ جاتے تھے۔ ہاتھیوں کا ایک غول خاندانوں کی شکل میں نظر آیا۔

عجیب منظر تھا۔ بے حد عبرتناک یہ سب کچھ سیلاب کے پناہ گزین تھے اور سیلاب آتے ہوئے انہیں بچ کر ادھر بھاگ آنے کا موقع مل گیا تھا۔ زندگی سب کو عزیز تھی۔ چنانچہ سب ہی دوڑ پڑے تھے اور موت کے اس مرحلے سے نکلنے کے بعد ایک بار پھر طاقت کا قانون لاگو ہوگیا تھا۔ جب یہ کمزور جانور وحشی جانوروں کے رحم وکرم پر تھے وہ وحشی جانور تھرائے تھرائے پھر رہے تھے۔ جنگل کا خوف معصوم جانوروں کو واپس جانے سے روک رہا تھا۔

اور ادھر بھی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی نسلوں کے ساتھ ایک دوسرے میں گھسے سر نہوڑائے کھڑے تھے۔ وحشی درندے تو اس وقت انہوں نے برتری کا اظہار ترک کردیا تھا اور ایک دوسرے سے تعاون کر رہے تھے جنگل میں واپس جانا ضروری بھی کیا تھا۔ خوراک کے ذخائر تو یہاں خود ہی جمع ہوگئے تھے۔ نتیجے میں چند ادھ کھائی لاشیں بالکل سامنے ہی نظر آ رہی تھیں۔

اس عبرتناک منظر نے انہیں گھائل کردیا اور وہ سکوت کے عالم میں اسے پتھرائی نظروں سے دیکھتے رہے۔ ان کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ زبان حال سب کہہ رہی تھی۔ خاموشی کے اس طلسم کو مستان نے توڑا۔

''شر اس طرف جانا ڈینجر ہے۔'' اور وہ چونک پڑے۔ شہباز خان نے گہری سانس لے کر ہرمیت سنگھ کو دیکھا۔

''اس قانون کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟'' ہرمیت سنگھ بولا۔

''یہ راز خدا ہی جانتا ہے۔''

''کیا یہ قانون فطرت کے ہر گوشے میں رائج نہیں ہے۔''

''آؤ......اس طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں درختوں کے درمیان ہی سفر کرنا ہوگا۔''

شہباز خان نے ہرمیت کے اس سوال کو ٹال دیا اور پھر دائیں سمت مڑ گیا۔

''اس طرف بھی نہیں۔'' ہرمیت سنگھ بولا اور شہباز رک گیا۔

''کیوں؟''

''دریائے سلہری بائیں سمت ہے۔''

''تو پھر؟'' شہباز نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''تم زمنی طور پر الجھے ہوئے ہو۔ شہباز خود کو سنبھالو۔'' دائیں سمت کے جنگل سیلاب سے پاک ہیں۔ متاثرہ علاقے کے سارے جانور اس طرف جمع ہوں گے اور اس وقت جھنجھلائے ہوئے ہوں گے۔''

''اوہ! ہاں ٹھیک ہے۔'' شہباز نے اعتراف کیا اور انہوں نے درختوں کے اختتامی سلسلے کے

کنارے کنارے سفر شروع کر دیا۔ ایک عجیب سی اداسی ان پر طاری ہوگئی تھی۔ کمزور جانوروں کی بے بسی نے انہیں بے حد مضمحل کر دیا تھا۔ وہ بے چارے موت سے بچنے کے لیے موت کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ اب ان کے لیے کون سا راستہ ہے۔

جنگل میں کنارے کنارے سفر کرتے ہوئے رات ہوگئی۔ عجیب سفر تھا جس میں انہیں پرندوں کی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ جنگل میں ایک بھیانک سناٹا مسلط تھا اور اس سناٹے سے سخت وحشت ہو رہی تھی۔ رات کو ضروریات سے فارغ ہو کر دونوں باتیں کرنے لگے۔ شہباز نے کہا۔

''میدانی سلسلہ نہ جانے کتنا طویل ہے۔ کیا سارے میدان ان سے بھرے ہوں گے۔''

''کل دن کی روشنی میں ہم ایک بار پھر کناروں کی طرف سفر کریں گے۔''

''جنگل کی وسعت کے بارے میں کیا اندازہ ہوا ہے؟''

''سو بار سلہری کے بارے میں جو کچھ سنا ہے۔ اس سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہم ابھی تو اس کے سرے پر ہی ہیں۔ اس کی داستانوں میں تو بہت کچھ ہے۔''

''لیکن تمہارا خیال کیا ہے۔ اگر ہم ان داستانوں کی تلاش میں سرگراں ہوئے تو ہمیں کتنا وقت لگ جائے گا'' شہباز خان کے اس سوال پر ہرمیت سنگھ نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی وہ کہنے لگا۔

''تم پہلے اس قدر جذباتی نہیں تھے خان۔ میرا خیال ہے تم پر میدانی مناظر دیکھنے کے بعد بالکل ہی غیر متوقع طور پر کیفیت طاری ہوئی ہے واپس چلنا چاہتے ہو......''

''نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمیں زیادہ وقت تو نہیں ہوا۔ لیکن تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ مجھ پر ایک کہولت سی سوار ہوگئی ہے اور ذہن عجیب سی پراگندگی کا شکار ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے یوں کرتے ہیں کہ ان جنگلوں سے نکل کر ہم چند روز مکمل طور پر آرام کریں گے اور ایک چھوٹا کیمپ کسی مناسب جگہ لگا لیں گے پھر اپنے لیے کچھ تفریحات بھی تلاش کریں گے اس سیلاب نے تو سارے منصوبے خراب کر دیئے چنانچہ کچھ اپنے لیے بھی کریں گے۔ پھر آگے کے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہیں۔''

''مجھے تم سے اتفاق ہے۔'' ہرمیت سنگھ نے کہا اور اس کے بعد وہ دونوں خاموش ہو گئے مستان ان سب میں بہتر تھا کہ اسے کسی چیز کی فکر ہی نہیں تھی۔ چنانچہ لمبی تان کر سو گیا تھا۔ کیونکہ اب تو جنگلی درندوں کا خوف بھی نہیں تھا۔ کوئی بھولا بھٹکا ہی ادھر آ نکلے تو دوسری بات ہے۔ ورنہ یہ جنگل تو بالکل ہی خالی ہو چکے تھے۔

دوسری صبح سورج کی روشنی نے انہیں گدگدایا۔ تو انہیں احساس ہوا کہ رات کی نیند بہت گہری تھی۔ جاگے اور معمولات سے فراغت کے بعد پروگرام کے مطابق انہوں نے جنگلوں کے سروں کو ٹٹولنے کا فیصلہ کیا اور ایک بار پھر رخ تبدیل کر لیا گیا۔

درختوں کا سلسلہ تقریباً دو فرلانگ چلنے کے بعد ختم ہو گیا تھا اور وہی سیاہی مائل چٹانیں کھلے میدانوں میں بکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں جن کے درمیان زمین کچھ بھربھری سی تھی۔ البتہ اس طرف انہوں نے جانوروں کو نہیں دیکھا تھا۔ غالباً وہ سلسلہ یہاں تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ چنانچہ ہمت کر کے وہ کھلے میدان میں نکل

آئے۔ دھوپ خاصی تیز تھی۔ لیکن چونکہ اتنے دن تک نمی میں اور اندھیروں میں سفر کرتے رہے تھے۔ اس لیے یہ چمکدار دھوپ انہیں بہت اچھی لگی۔

اور پھر کوئی خطرہ بھی سامنے نہیں آیا تھا بلکہ میدانوں کی زندگی معمول کے مطابق تھی اور پتھروں میں پائے جانے والے حشرات الارض جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔

خاص قسم کی زہریلی جھاڑیوں، جن میں تھوہر، ناگ پھنی اور ایسی ہی چیزیں شامل تھیں اور دور دور تک بکھری ہوئی تھیں اور ان پر پیلاہٹ چڑھی ہوئی تھی۔ بھربھری مٹی کو انہوں نے ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا تو انہیں ایک عجیب سا احساس ہوا۔ ایسی مٹی عام طور پر غور کرتے رہے۔ لیکن اس کی چکنائی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکے اور جو بات سمجھ میں نہ آئے اسے نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

سورج سر سے گزرتا رہا اور پھر مستان نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''شرشر سلہری۔''

بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن پھر انہوں نے کچھ آبی پرندے دیکھے۔ جو مخصوص پرواز کر رہے تھے۔ تب وہ لوگ سمجھے کہ مستان دریائے سلہری کے بارے میں کہہ رہا ہے۔ انہوں نے بے اختیارانہ انداز میں ہی دریا کی طرف رخ کیا تھا۔ حالانکہ یہی ہولناک دریا تھا جس کی تباہ کاری نے انہیں لرزا دیا تھا۔ دریا کا فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ لیکن جب وہ اس کے قریب پہنچے تو حیران رہ گئے۔ اسے دریا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ تو کوئی چھوٹی ندی معلوم ہوتی تھی۔ جو بے حد شفاف تھی اور اس کے کنارے سرسبز تھے۔ مستان بھی اسے دیکھ کر حیران ہو گیا۔

''جو کچھ بھی ہے۔ یہاں قیام بہتر رہے گا۔'' شہباز خان نے کہا اور دریا کے کنارے ایک عمدہ جگہ تلاش کر لی گئی۔ یہاں سے دریا کا نظارہ بے حد خوبصورت تھا۔ آبی پرندوں کی ڈاریں پرواز کر رہی تھیں۔ غول کے غول کنارے پر اتر جاتے اور ذرا سی آہٹ پر پھرامار کر اڑ جاتے تھے ان کی بھانت بھانت کی آوازیں کانوں کو خوشگوار لگ رہی تھیں۔ شاید اس لیے کہ وہ زندگی کی بدترین بے قدری دیکھ چکے تھے۔ کئی دن کے بعد آگ جلا کر چائے بنائی گئی اور پھر شفاف پانی میں خوب کلیلیں کی گئیں۔ سارا دن خوشگوار گزرا تھا اور ذہن سے اداسی ڈھل گئی تھی۔ پھر رات ہوگئی اور وہ آرام کرنے لگے۔

اسی دوران بہت سی باتیں بھی ہوئی تھیں۔ پھر چاند نکل آیا اور چاندنی نے دریا کو روشنی سے رنگ دیا۔ خان کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ چنانچہ ہرمیت سنگھ کے مشورے پر ایک بار پھر چائے بنائی گئی اور خوشگوار نرم ماحول میں چائے کا لطف بڑھ گیا۔ وہ دریا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً شہباز نے کچھ دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہرمیت اِدھر دیکھو نگاہ کا دھوکہ ہے یا......'' ہرمیت سنگھ، شہباز کے اشارے کی سمت دیکھنے لگا چاندنی کے سائے میں دریا کے شفاف بہاؤ پر کچھ سیاہی نظر آ رہی تھی جو آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کوئی دریائی جانور نہیں ہے۔'' ہرمیت سنگھ نے کہا۔

شہباز نے اپنی چائے حلق میں انڈیل لی اور اٹھ کر کنارے کی طرف چل پڑا۔ ہرمیت بھی اس کا پیچھا کرتا ہوا وہاں آ گیا تھا۔ وہ اس شے کے قریب آنے کا انتظار کرتے رہے۔ روشنی خوب پھیلی ہوتی تھی اور اس روشنی میں کافی فاصلے سے ہی انہوں نے اس چوڑی سی کشتی نما چیز کو دیکھ لیا تھا۔ جو بے حد عجیب تھی۔ گھاس

پھونس کا بنا ہوا ایک تختہ جس پر کوئی انسانی جسم نظر آ رہا تھا۔ یہ جسم اس تختے پر دراز تھا۔ اس کے قریب ہی کوئی شے ہل رہی تھی۔

''ہرمیت تم رسی لے آؤ۔ ہم اسے کنارے پر لائیں گے۔'' شہباز بولا۔

''مگر یہ ہے کیا؟''

''اللہ جانے میں پانی میں جا رہا ہوں۔ تم رسی پھینک دینا میں اسی میں باندھ دوں گا۔'' شہباز نے کہا۔ اور ہرمیت سنگھ تیزی سے سامان کی طرف دوڑ گیا۔ شہباز پانی میں کود گیا۔ تختہ سست رفتاری سے قریب آتا جا رہا تھا۔

شہباز نے حیران نگاہوں سے دیکھا۔ وہ انسانی جسم جو کسی نوجوان عورت کا تھا اور روشنی میں اس طرح چمک رہا تھا۔ جیسے اس پر روغن مل دیا گیا ہو۔ اوپر حصے پر کسی خاص لکڑی سے تراشے ہوئے ٹکڑوں کو پرو کر پھیلا دیا گیا تھا۔ جس سے اس کی بدن پوشی ہو گئی تھی۔ بدن کے کچھ حصوں پر رنگین مٹی سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ گردن میں ایک سنہرا سانپ لپٹا ہوا تھا۔ جو روشنی میں کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ سر کے سیاہ لمبے بال پتلی پتلی چوٹیوں کی شکل میں گوندھ کر لکڑی کی کیلوں کے ذریعہ اس تختے میں ٹھونک دیئے گئے تھے۔ اس کے نقوش بڑے سحر انگیز تھے۔ چہرہ پرسکون اور آنکھیں بند تھیں لیکن اس تختے پر وہ تنہا نہ تھی ایک اور جاندار کا وجود اس پر موجود تھا۔ وہ ایک تقریباً چھ ماہ کی بچی تھی۔ جو عورت کی بغل میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی گردن سے لے کر گھٹنوں تک گھاس باندھ کر اس کا بدن ڈھک دیا گیا تھا۔ بچی جاگ رہی تھی اور اس کے حلق سے معصوم آوازیں نکل رہی تھیں۔ چاندنی رات میں یہ پراسرار منظر بڑا سحر انگیز تھا۔

شہباز خان کا ذہن کسی انجانے اسرار میں جکڑا جا رہا تھا کہ کنارے سے ہرمیت سنگھ کی آواز نے اسے چونکا دیا!

ہرمیت سنگھ دوبارہ رسی پھینک چکا تھا لیکن شہباز خان اس سحر انگیز منظر میں گم تھا۔ تب ہرمیت سنگھ نے اسے پکارا۔

''شہباز، کیا کر رہے ہو رسی کیوں نہیں پکڑتے۔''

تب شہباز چونکا اور اس نے ہرمیت سنگھ کی طرف دیکھا۔ ہرمیت سنگھ نے تیسری بار رسی پھینکی تو اس نے اس کا سرا پکڑ لیا۔ پھر اس سرے کو اس تختے سے باندھ دیا۔ ہرمیت سنگھ اشارہ پا کر رسی کھینچنے لگا تھا۔ شہباز نے بھی تختے کو سہارا دیا۔ اسے کنارے تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی، ہرمیت سنگھ نے اسے خشکی پر گھسیٹ لیا۔ پھر قریب سے یہ سب کچھ دیکھ کر ہرمیت کے ہونٹ بھی سکڑ گئے تھے۔

''مائی گاڈ یہ سب کیا ہے؟''

''خدا جانے۔''

''بچی جاگ رہی ہے۔'' ہرمیت سنگھ بولا اور اسی وقت شہباز خان چونک کر بچی کو دیکھنے لگا۔ اچانک اسے احساس ہوا تھا کہ بچی بھوکی ہے۔ لیکن اس احساس کی وجہ کیا تھی۔ شہباز کو اس کا کوئی اندازہ نہیں ہوا۔ حالانکہ وہ بچوں کی نفسیات اور ان کے انداز سے بالکل ناواقف تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔